اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

رجسٹرڈ نمبر جی ۳۶۳

قیمت العلم جوبلی نمبر حصہ اول ۱۰/-

" " " حصہ دوم ۸/-

العلم ینادی باعلیٰ صوتہ انا سلطان العالم

(علم اونچی آواز سے اعلان کرتا ہے کہ دنیا کا بادشاہ میں ہوں۔ قول حضرت علیؑ)

العلم کراچی

سہ ماہی

جلد ۲۲ شمارہ ۱ | جنوری تا مارچ ۱۹۷۶ء | فون دفتر ۶۱۱۱۹۶ مکان ۶۱۱۳۶۹

فہرست

(الف)

سلور جوبلی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ۲۷ تا ۳۰ اگست ۱۹۷۵ء

(مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی)

جوبلی کا خیر مقدم

جناب مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی اسلام آباد۔ جناب ناصر الدین ناصر لاہور
جناب حاتم علوی صاحب کا تار از پشاور۔ جناب الطاف احمد خیری صاحب سابق سکریٹری اسٹ
کونسل ریاست بہاولپور۔ جناب صادق زاہد صاحب ایبٹ آباد۔ جناب پروفیسر محمد حامی ا
خاں کراچی۔ جناب ڈاکٹر سید عبدللہ لاہور۔ سرتاج شاہ عالم صاحب پشاور۔ مولانا فضل مح
صاحب۔ مجلس ترقی اردو پشاور۔ مولوی حضور عالم صاحب (علیگ) حیدرآباد سندھ۔ م
حمید اللہ خاں۔ ماڈل کالونی کراچی۔ پروفیسر محمد معین الدین دردائی ایم اے کراچی۔ جہ
احسان دانش۔ لاہور۔ جناب مولانا اسمٰعیل ذبیح صاحب پشاور، مولانا نعیم صدیقی صاح
ایڈیٹر سیارہ لاہور۔ جناب رفیق احمد چودھری صاحب۔ تار از میرپور خاص۔ نواب
مشتاق احمد خاں صاحب۔ لاہور۔ جناب اشفاق احمد ڈائرکٹر مرکزی اردو بورڈ لاہور
وفیسر عبدالسلام خورشید۔ لاہور۔ جناب حسن حبیب صاحب، پرنسپل پاکستان ایڈمنسٹ
... اف کالج لاہور۔

... طبات برائے جوبلی

جشن سلور جوبلی

۲۱ تا ۱

افتتاحی اجلاس۔ ۲۷ر اگست ۱۹۷۵ء

جناب عبدالحفیظ پیرزادہ مہمانِ خصوصی کی آمد اور استقبال۔ آغاز اجلاس از تلاوت کلا
رسم گل پوشی۔ نذرانہ مطبوعات کانفرنس۔ سپاس نامہ۔ ڈاکٹر فرید الدین بقائی صدر استقب
تقریر خیر مقدم مسٹر علی حسن علی عبدالرحمٰن بیرسٹر۔ تقریر سید الطاف علی بریلوی
تقریر جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب صدر کانفرنس۔ تقریر مہمانِ خصوصی۔ ت
سپاس، جناب سید حسین امام صاحب، اختتام اجلاس اور چائے نوشی۔

اجلاس شعبۂ ابتدائی ثانوی و اعلیٰ تعلیم

اجلاس

شعبۂ تصنیف و تالیف و تحقیق علمی کے مسائل

اجلاس

شعبۂ قومی زبان ذریعۂ تعلیم

صدر: پروفیسر ڈاکٹر محمدؐ طاہر فاروقی۔ پشاور

جناب پروفیسر شاکر عظیم ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ گورنمنٹ لیاقت کالج ملیر کراچی۔ مولانا ماہر القا
جناب انیس الرحمٰن خاں صدر آن ٹرینڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کراچی۔ اُردو اصطلاحات اور سا
کی تعلیم۔ پروفیسر حفیظ الرحمٰن صدیقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج کراچی۔ ذریعۂ تعلیم کا مس
مقالہ پروفیسر محمدؐ خلیل اللہ پرنسپل وفاقی گورنمنٹ اُردو کالج کراچی۔ تقریر جناب میجر آفتاب ح
تقاریر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور ڈاکٹر ابو الخیر کشفی۔ خطبۂ صدارت۔

اجلاس

شعبہ قومی تعلیم اور اس کا نصب العین

۲۰۱ تا ۱۱۶

صدر: جسٹس قدیر الدین احمد صاحب

رزلیوشن ۱ طلبہ اور قومی خدمت۔
رزولیوشن ۲ پبلک ذہن میں انتشار سے گریز
رزولیوشن ۳ اختیارات کے تو سیائے جانے اور ان کی غیر ضروری مرکزیت کے د
رزولیوشن ۴ لائق اساتذہ
رزولیوشن ۵ معیارِ تعلیم

بزم مشاعرہ

صدارت:۔ عزت مآب مولانا کوثر نیازی صاحب

تبصرے و تاثرات

جناب اخلاص حسین زبیری ایم۔اے۔ جناب مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی۔ اسلام آباد۔ جناب مولانا اسمٰعیل ذبیح صاحب پشاور۔ جناب مولانا ملک جمال الدین صاحب راولپنڈی جناب نواب مشتاق احمد خاں صاحب لاہور۔ عالی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب ناظم انجمن ترقی اردو لاہور۔ جناب حکیم شرف الحق صاحب راولپنڈی۔ جناب پروفیسر وقار احمد رضوی جامعہ کراچی۔ الحاج محمد زبیر صاحب۔ جناب شبیر علی صاحب کاظمی، جوائنٹ سکرٹری انجمن ترقی اردو پاکستان۔ عالی جناب پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب، پروفیسر شیر محمد گریوال لاہور۔ جناب محمد حنیف شاہد انچارج اورینٹل سیکشن پنجاب پبلک لائبریری لاہور۔ جناب مولوی حضور عالم صاحب (علیگ) حیدر آباد۔ جناب ڈاکٹر محمد نذیر رانجھا راولپنڈی۔ جناب مولوی سلیم عبداللہ صاحب کراچی۔ جناب علی اصغر شاہ صاحب سفارتخانہ برما۔ پروفیسر رحمت فرخ آبادی ایم۔اے سکھر۔ پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی جامعہ کراچی۔ جناب پروفیسر معین الدین دردائی ایم اے کراچی۔ جناب پروفیسر صادق زاہد ایبٹ آباد، رئیس القلم حضرت رئیس امروہوی روزنامہ "جنگ"

اداریہ

"شکر و سپاس"

از

(سید الطاف علی بریلوی)

دوش ایں مژدہ بگوشِ گُل و ریحاں آمد
کہ بہار آمد و بسیار بہ سا ماں آمد
(شبلی)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے سہ ماہی آرگن "العلم" کا سلور جوبلی نمبر حصہ دوم نذرِ ناظرین کرتے ہوئے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ رسالہ کا حصہ اول جو اہم تصاویر ـــــ خوبصورت ٹائٹل اور چار سو صفحات پر مشتمل تھا۔ ہم نے ۲۷ تا ۳۰ اگست ۱۹۷۵ء کی تقریباتِ جوبلی سے چند روز قبل شائع کیا تھا۔

یہ خصوصی نمبر ہر طبقہ و خیال کے ذی علم اصحاب نے پسند کیا۔ اور قریب آٹھ ماہ کا عرصہ گذرنے کے باوجود ملک کے طول و عرض سے اس کی مانگ جاری ہے۔ کیونکہ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش کی قومی و ملی تحریکات نیز علی گڑھ اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات کے موضوعات پر اسے ایک یادگار دستاویز قرار دیا گیا اور ہم ان تمام معزز لکھنے والوں اور رفقائے دفتر کے بدل ممنون ہیں جن کی بلند پایہ تخلیقات اور گوناگوں کاوشوں کی بدولت ہم ایک اچھی چیز دنیائے علم و ادب کے سامنے پیش کر سکے۔

اب حصہ دوم بظاہر اجلاس ہائے جوبلی کی روداد ہے لیکن اہلِ ذوق نے بامعانِ نظر اس کا مطالعہ کیا تو ہم عصر مفکرین و ماہرینِ تعلیم اور مشاہیر علمائے علم و ادب کی تقاریر و مقالات کا یہ مجموعہ انشاءاللہ ایک جہانِ دانش و بینش ثابت ہوگا۔

وہ تمام لوگ جنہوں نے اس نظر افروز گلدستہ کو سجانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ان کے ہم صمیم قلب سے شکر گزار ہیں۔

عالی جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب، صدر کانفرنس کے زیر قیادت جملہ عہدہ داران و ارکانِ ادارہ اور مسز آمنہ کمال پرنسپل سرسید گرلس کالج اور ان کے اسٹاف نے ہر کام میں جس عملی جوش و مسرت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ناقابل فراموش ہے۔ اسی طرح جواں سال و جواں فکر ڈاکٹر فریدالدین بقائی، صدر مجلسِ استقبالیہ اور ان کے شائستہ رفقائے کار نے جس بے لوث طریقہ پر تعاون کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

مندرجہ بالا تمام حضرات اور خواتین کی حسن کارکردگی ہی کا نتیجہ تھا کہ سرسید گرلس کالج کمپونڈ میں ۲۷ اگست ۱۹۷۵ء کا افتتاحی اجلاس اور ۳۰ اگست کا شاندار مشاعرہ نیز کانفرنس کی اپنی عمارت یوسف میموریل ہال میں سہ روزہ جلسہ ہائے شعبہ جات گوناگوں کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے۔

لیکن تسبیح کے امام یا کسی مرصّع غزل کے ایک دو شاہکار اشعار کے مانند اصلی بہار جناب عبدالحفیظ پیرزادہ اور مولانا کوثر نیازی وفاقی وزرائے کرام کی تھی جن کی بدولت جوبلی کی چہار روزہ تقریبات دن عید رات شب برات کا سماں پیش کر رہی تھیں۔

جناب پیرزادہ صاحب نے اپنے فاضلانہ خطبۂ افتتاحیہ میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات کو سراہتے ہوئے اُس کو مالی بحران سے نجات دلانے کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ بھی اِس حد تک پورا ہو گیا کہ ۶۵-۱۹۶۴ء کے بعد سے ادارہ کی وفاقی گورنمنٹ گرانٹ میں پاک بھارت

دو جنگوں کے پنجہ میں پندرہ ہزار روپئے سالانہ کی جو کمی واقع ہو گئی تھی اس کو بحال کر دیا گیا اور ۷۶-۱۹۷۵ء کی اضافی گرانٹ ۳ر اپریل ۱۹۷۶ء کو ہمارے بنک اکاؤنٹ میں جمع ہو گئی۔ زیر نظر رسالہ کے آئندہ اوراق میں مالی مشکلات کے سلسلہ میں ہماری گذارشات کو اب اس معارف پروری کی روشنی میں ملاحظہ فرمایا جائے۔

مالیات ہی کے ضمن میں یہ خوش آئند اطلاع بھی دینی ہے کہ کانفرنس کی سلور جوبلی کا رواں مالی سال ۷۶-۱۹۷۵ء، گورنمنٹ آف سندھ کی سرپرستیٔ خاص کے اعتبار سے بھی بہت مبارک ثابت ہوا۔

پاکستان کے علمی و تحقیقی اداروں کو وفاقی گرانٹوں کے علاوہ صوبائی حکومتوں کی جانب سے بھی معتد بہ سالانہ گرانٹیں ملتی ہیں۔ خاص صوبۂ سندھ میں "سندھی ادبی بورڈ" اور "انجمن ترقی اردو" اس کی درخشاں مثال ہیں ہم بھی کافی عرصہ سے اس خصوص میں کوشاں تھے۔ چنانچہ اللہ کا احسان ہے کہ:۔

(۱) ۱ر دسمبر ۱۹۷۵ء کو جناب عبد اللہ بلوچ صاحب وزیر محنت، سماجی بہبود و اوقاف نے کانفرنس میں قدم رنجہ فرمایا اور آپ کی عنایت و سفارش کے نتیجہ میں

(الف) محکمۂ اوقاف سندھ نے ایک ہزار روپئے سالانہ کی گرانٹ منظور کر کے ۷۶-۱۹۷۵ء کی امدادی رقم ۲۲ر جنوری ۱۹۷۶ء کو ارسال کر دی۔

(ب) جناب عبد اللہ بلوچ صاحب ہی کی سفارش پر حسب الحکم عالی جناب غلام مصطفےٰ جتوئی وزیر اعلیٰ، وزارت تعلیم گورنمنٹ آف سندھ نے پانچ ہزار روپئے کی غیر متوالی گرانٹ مرحمت فرمائی۔

---

(۲) قبل ازیں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کو سندھ گورنمنٹ سے صرف ایکہزار روپئے سالانہ ملا کرتے تھے۔ بڑی خوشخبری ہے کہ صوبہ کے ہر دل عزیز چیف منسٹر جناب غلام مصطفےٰ جتوئی صاحب نے ۱۰ر مارچ ۱۹۷۶ء کو ہماری درخواست مورخہ ۹ر جولائی ۱۹۷۴ء پر اس گرانٹ کو بیس ہزار روپئے سالانہ کر دینے کا آرڈر ثبت فرمایا۔ اور اسی روز عزت مآب جناب پیار علی الانا وزیر تعلیم نے بھی اس پر توثیقی ہدایت بنام سکریٹری صاحب وزارت تعلیم (جناب سید پناہ علی شاہ (عیک)) سپرد قلم کر دی۔ جس کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

جس مالی بحران کا گذشتہ گیارہ سال سے ہم شکار تھے۔ اس سے معقول حد تک نجات ملنے کی صورت میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس جیسے برصغیر کے قدیم فعال ادارہ کو حیاتِ نو حاصل ہو گی۔ اور اس کے جملہ کارکن تعلیمی و علمی میدان میں بیش از بیش خدمات انجام دینے کی سعیٔ بلیغ کریں گے۔ انشاء اللہ!

آخر میں اُن مخیر احباب اور بزرگوں کی سپاس گزاری بھی ازبس ضروری ہے جنہوں نے تقریبات جوبلی کے پیش نظر اخراجات کے لئے گراں قدر عطیات ارزانی فرمائے۔ ان حضرات کی فہرست رسالہ کے صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ فرمائیے۔

یادش بخیر! ادارہ کے قدیم سرپرست جناب مرزا ممتاز حسن قزلباش مرحوم (سابق چیف منسٹر ریاست خیرپور) کے برادر نسبتی جناب مرزا شبیر حسن قزلباش ایڈووکیٹ کراچی نے ایک ہزار روپئے سالانہ دینا منظور فرمائے ہیں۔ اور ۳ر جنوری ۱۹۷۶ء کو آپ کا سالِ رواں کا عطیہ بمدرست ہو گیا۔ آپ کی بیگم عزیزہ ارجمند قزلباش نے بھی کانفرنس لائبریری کو قیمتی فرنیچر عطا کیا ہے۔

جزاکم اللہ فی احسن الجزا

سید الطاف علی بریلوی

عالی مرتبت غلام مصطفےٰ جتوئی۔ وزیر اعلیٰ سندھ

عزت مآب عبداللہ بلوچ۔ وزیر محنت، سماجی بہبود و اوقاف سندھ
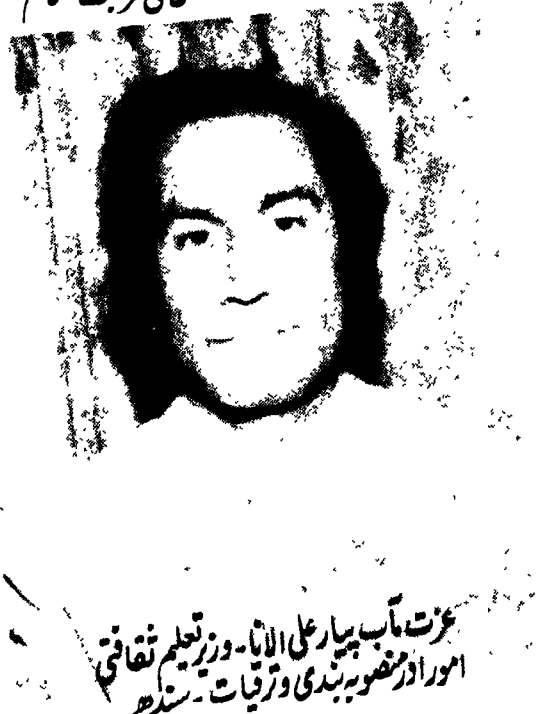
عزت مآب پیار علی الانا۔ وزیر تعلیم ثقافتی
امور اور منصوبہ بندی و ترقیات۔ سندھ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

کی

لائبریری ۔ ریڈنگ روم اور میوزیم

جس طرح علی گڑھ میں سرسید علیہ الرحمۃ کی ١٨٨٦ء میں بنا کردہ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا ایک شاندار کتب خانہ تھا اسی طرح اپریل ١٩٥١ء میں جب اس ادارہ کا کراچی میں "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے احیا ہوا تو اجرائے سہ ماہی مجلہ "العلم" انعقاد مجالس و مذاکرات علمی و تعلیمی ۔ قیام سرسید گرلس کالج اور شعبۂ تصنیف و تالیف کے ماسوا اس کے صدر دفتر بمقام سندھ مدرسہ (اپریل ١٩٥١ء تا مئی ١٩٥٦ء سعیدہ منزل رضویہ کالونی (جون ١٩٥٦ء تا دسمبر ١٩٧١ء) اور اب ذاتی عمارت واقع بی ۔ روڈ ۔ ناظم آباد کراچی' میں جنوری ١٩٧٢ء سے "یوسف میموریل لائبریری" کے نام سے ایک فری پبلک لائبریری قائم ہے جس میں سال بسال جملہ علوم و فنون پر کثیر تعداد میں کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا ہے اور ان کی تعداد دس ہزار سے متجاوز ہو گئی ہے ۔ بڑی تعداد میں انگریزی' اُردو اور دیگر زبانوں کے ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل بھی مہیا کئے جاتے ہیں ۔ ہر موسم میں آرام دہ خوبصورت ہال اور نفیس فرنیچر اس پر مستزاد ہے جس کے نتیجہ میں لائبریری کی مقبولیت روز افزوں ہے ۔ دور دور سے طالبان علم اور علمائے تحقیق جوق در جوق مطالعہ کے لئے آتے ہیں ۔

اوقات دفتر کانفرنس کے بعد ۴½ بجے شام سے ۹ بجے شب تک لائبریری ریڈنگ روم اور میوزیم کھلا رہتا ہے ' جن خواتین و حضرات کو اب تک علم نہ ہو تشریف لا کر استفادہ فرمائیں ۔

ع صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

سیّد الطاف علی بریلوی

سکریٹری

مہمانِ خصوصی کا خیر مقدم، جسٹس قدیرالدین صاحب اور ڈاکٹر بقائی صاحب نمایاں ہیں۔
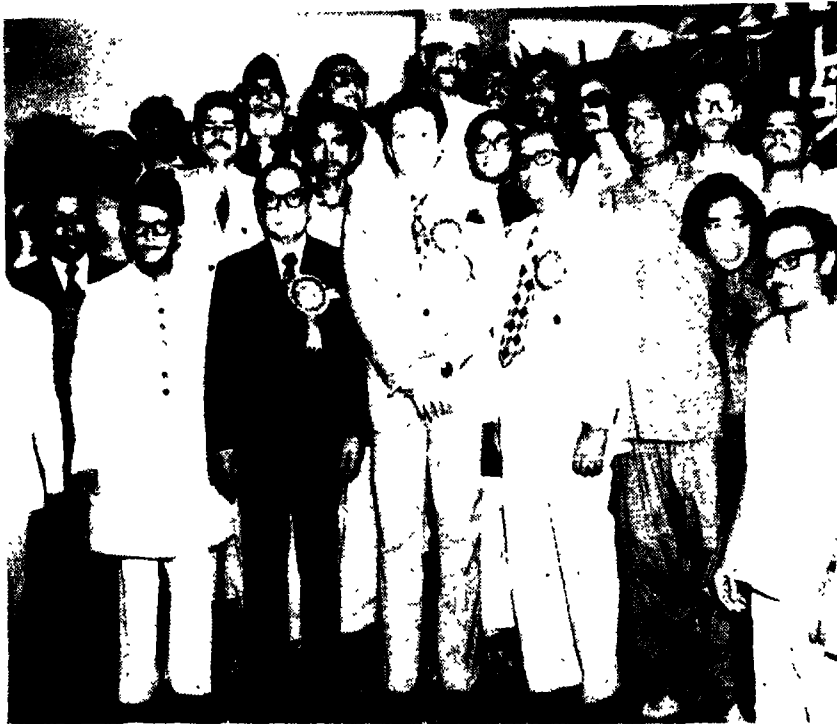
مہمان خصوصی اجلاس جوبلی کے کارکنوں کے ساتھ

ڈائس پر (بائیں سے)
جناب سید حسین
امام نائب صدر کانفرنس
جسٹس قدیر الدین احمد صاحب۔
صدر۔ پیرزادہ صاحب۔
ڈاکٹر فریدالدین بقائی۔
صدر استقبالیہ
حسن علی عبدالرحمٰن
بیرسٹر۔ آنریری جنرل سکریٹری۔
الحاج ایم۔ ایچ۔ یحییٰ (علیگ
سکریٹری استقبالیہ سامنے
سپاس نامہ رکھا ہوا ہے۔
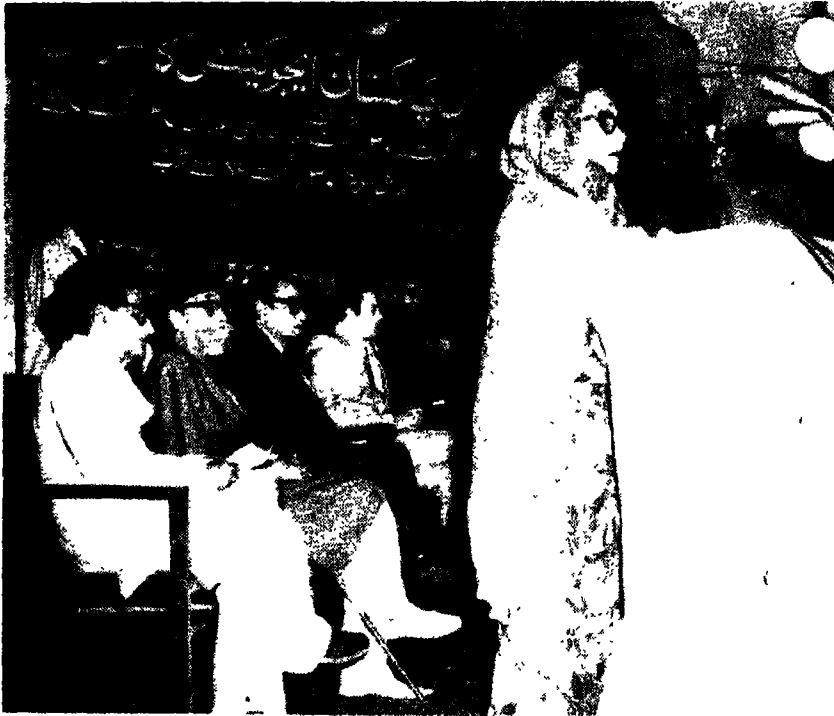
بیگم سید عبدالحفیظ سکریٹری شعبۂ تعلیم نسواں کانفرنس۔ افتتاحی اجلاس میں تلاوتِ
کلام پاک فرما رہی ہیں

جناب مرزا علی اظہر برلاس چیئرمین کانفرنس اکیڈمی ہ ے مطبوعات کا سٹ مہمان خصوصی کو نذر کر رہے ہیں

اجلاس میں خواتین کے اجتماع کا ایک حصّہ

شرکا۔ اجلاس عام

مزید شرکا، اجلاس عام

چائے نوشی

خدا حافظ! مہمانِ خصوصی جناب عبد الحفیظ پیرزادہ رخصت ہو رہے ہیں

شعبۂ ابتدائی، ثانوی و اعلیٰ تعلیم داہنے سے جناب شبّیر کاظمی جناب اسمٰعیل میمن ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن
صدر اجلاس اور جسٹس قدیر الدین احمد صدر کانفرنس
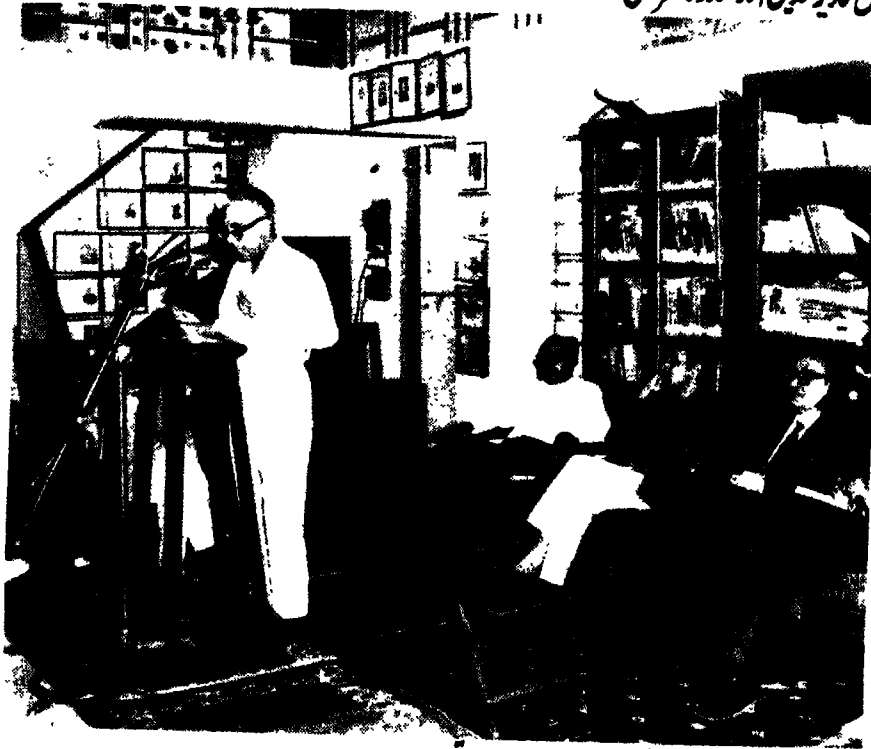
جناب ڈاکٹر عبدالعزیز شعبۂ تعلیمی میں مقالہ پڑھ رہے ہیں

اجلاس شعبۂ تعلیمی میں خواتین کا اجتماع

اجلاس "شعبۂ تصنیف
وتالیف اور تحقیق علمی
کے مسائل"
جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی
وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی
تقریر صدارت فرما رہے ہیں

اجلاس، شعبۂ "قومی زبان ذریعۂ تعلیم
پروفیسر ڈاکٹر طاہر فاروقی.
صوفۂ صدارت پر رونق افروز
ہیں پروفیسر خلیل اللہ
پرنسپل اُردو کالج
مقالہ پڑھ رہے ہیں۔

اجلاس شعبۂ "قومی زبان"، کے سکریٹری پروفیسر محمد ایوب قادری مقررین کا تعارف کرا رہے ہیں

اجلاس "شعبۂ قومی زبان" کی کچھ سامعین

شعبۂ قومی زبان جناب شان الحق حقی مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ پیچھے صوفہ پر علامہ عرشی (راولپنڈی) بائیں جانب مولانا ملک جمال الدین (راولپنڈی) اور جناب جمشید پانی پتی تشریف فرما ہیں۔

جناب میجر آفتاب حسن شعبہ "قومی زبان" میں تقریر فرما رہے ہیں
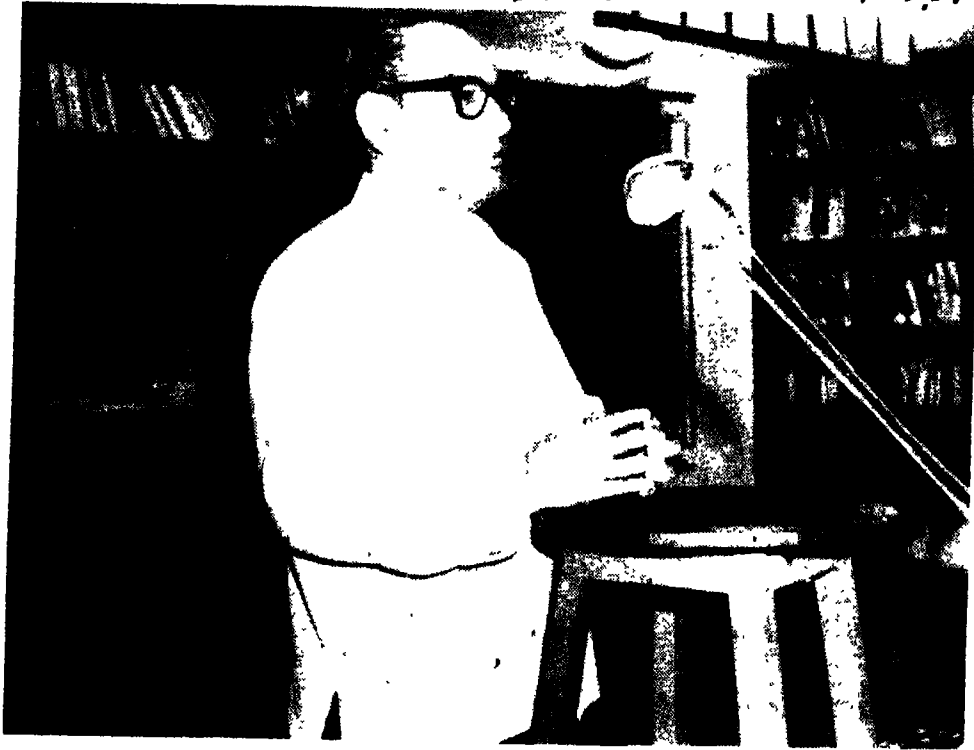
اجلاس شعبہ "قومی تعلیم اور اس کا نصب العین" جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب تقریر صدارت فرما رہے ہیں

اجلاس شعبۂ "قومی تعلیم" میں ڈاکٹر منظور احمد صدر فلاسفی ڈپارٹمنٹ جامعہ کراچی تقریر کر رہے ہیں
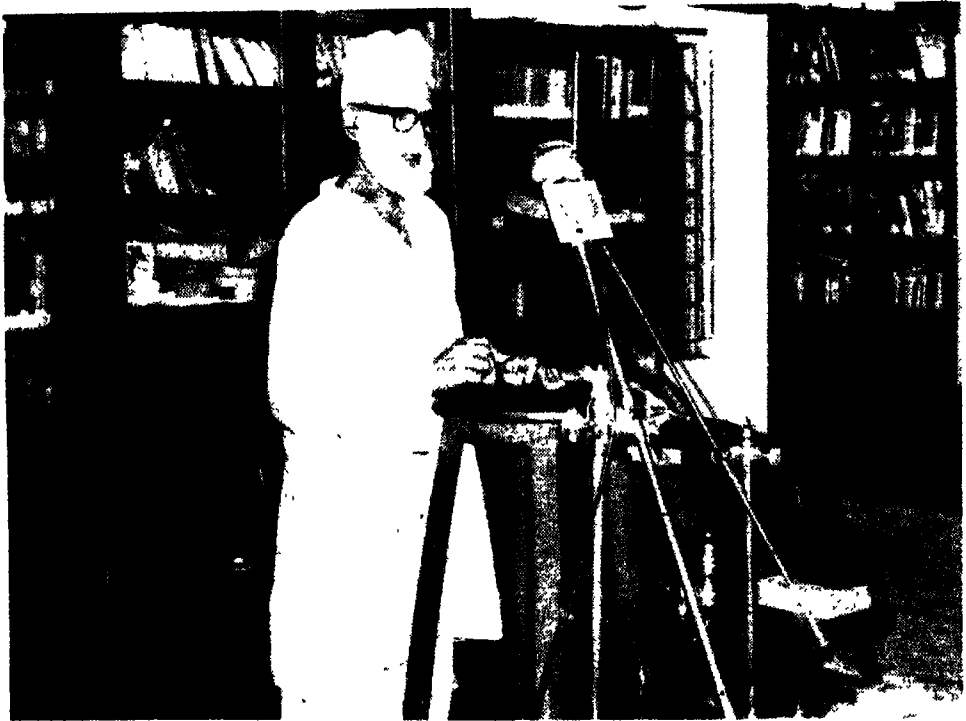
اجلاس شعبۂ "قومی تعلیم" میں مولانا ملک جمال الدین ناظم اعلیٰ انجمن فیض الاسلام راولپنڈی میں تقریر کر رہے ہیں۔

اخلاس شعبۂ "قومی تعلیم" سے پروفیسر ڈاکٹر منظور الدین احمد جامعہ کراچی خطاب فرما رہے ہیں۔

ت مولانا کوثر نیازی
صدر مشاعرہ۔
ڈاکٹر فرید الدین بقائی
صدر مجلس استقبالیہ کے
ہمراہ موصوف العلم
"سلور جوبلی نمبر
حصہ اول
ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

مشاعرہ:-
عالیجناب جسٹس
قدیر الدین
صدر کانفرنس
مولانا کوثر نیازی
کے اعزاز میں تقریر
خیر مقدم کر رہے ہیں

سید الطاف علی

اپنی تقریر سپاس

مشاعرہ کے صا

مولانا کوثر نیاز

نوازشا،

بیان کر رہے

مولانا کوثر نیازی صاحب

مسند صدارت پر

(داہنے) پروفیسر خواجہ

حمید الدین شاہد سکریٹری

مشاعرہ۔ ڈاکٹر بقائی۔

الحاج ایم۔ ایچ نجمی (علیگ)

سکریٹری استقبالیہ

۔ یوسف بخاری صاحب

جسٹس قدیر الدین صاحب

للسلور جوبلی

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

۲۷ تا ۳۰ اگست ۱۹۷۵ء

حرفِ آغاز

سرسید علیہ الرحمۃ نے ایم۔ اے۔ او کالج کے ۱۸۷۵ء میں قیام کے بعد آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے نام سے اس ادارہ کو قائم کیا تھا۔ کچھ عرصہ گزرنے پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے اُسے موسوم کیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہونے پر ہندوستان کی کانفرنس ہندوستان میں رہ گئی۔ اور جولائی ۱۹۵۱ء میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا کراچی میں احیاء کیا گیا۔

جب تک ملک تقسیم نہ ہوا تھا اس کے طول و عرض میں سالانہ اجلاس منعقد ہوتے رہے کبھی کبھی ناغہ بھی ہوا۔ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی ۱۹۵۲ء ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء میں اپنے سالانہ اجلاسوں کا شاندار طریقے پر اہتمام کیا۔ لیکن اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ کوئی اجلاس نہ ہو سکا۔ علمی و تعلیمی مذاکرے البتہ بڑی تعداد میں منعقد ہوئے جن میں ملک کے دانشوروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

سفرِ اسلام آباد

فی زمانہ جبکہ ہمارے پاکستان میں علمی و ثقافتی سرگرمیاں عروج پر ہیں اور قومی و بین الاقوامی سطح پر ان سے دلچسپی قومی مزاج بنتا جا رہا ہے۔ کارکنان آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کو یہ احساس ہوا کہ ادارہ کے سالانہ اجلاسوں کو از سرِ نو زندہ کیا جائے اور ان کی ابتدا سلور جوبلی کے انعقاد سے ہو۔ کیونکہ ۱۹۷۵ء میں ۲۵ سال کی مدت پوری ہو جاتی ہے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے راقم کو اواخر مارچ ۱۹۷۵ء میں راولپنڈی و اسلام آباد بھیجا گیا جہاں میں نے جناب مولانا کوثر نیازی صاحب وفاقی وزیر امورِ مذہبی سے شرف نیاز حاصل کیا اور عرض کیا کہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو آپ نے کانفرنس کے سہ ماہی رسالہ "العلم" کے بائیس سالہ جشنِ اشاعت کی صدارت کر کے ادارہ کو بہت افتخار بخشا تھا۔ اور اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ لہٰذا اب جشنِ سلور جوبلی کو بھی آپ اپنی تشریف آوری سے رونق بخشیں۔ مولانا صاحب نے بطیبِ خاطر اس درخواست کو منظور فرمایا اور باہمی مشورہ

سے قرار پایا کہ جناب عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب وفاقی وزیر تعلیم و صوبائی رابطہ سے جشن مذکور کی رسم افتتاح ادا کرائی جائے۔

اسلام آباد میں میں نے جناب ڈاکٹر محمد اجمل صاحب وفاقی سکریٹری تعلیم و دیگر افسرانِ محکمہ نیز انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بنک کے چیرمین جناب مختار مسعود صاحب سے بھی ملاقات کی۔ اور ان سے تقریباتِ جوبلی کو کامیاب بنانے کے لئے خصوصی تعاون کی درخواست کی۔

جلسۂ شوریٰ

دورۂ اسلام آباد کے بعد ۱۵ ارمئی ۷۵ء کو تقریبات کے پروگرام پر غور کرنے کے لئے ایک جلسۂ شوریٰ کانفرنس ورکنگ کمیٹی کے معزز رکن جناب افتخار حسین صاحب کے دولت کدۂ واقع ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں منعقد ہوا جس میں میزبانِ محترم کے علاوہ جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب، مرزا علی اظہر برلاس صاحب، سید حامد علی جعفری صاحب، سید اصغر علی شاہ صاحب اور خاکسار نے شرکت کی۔ اس جلسۂ شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق ۱۹ ارمئی ۱۹۷۵ء کو جناب مولانا کوثر نیازی صاحب اور جناب عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب کو خطوط لکھے گئے۔ ڈاکٹر محمد اجمل صاحب سے بھی درخواست کی گئی کہ ایک جلسہ کی صدارت فرمائیں۔

اسی دوران ناظم آباد کے مشہور قومی کارکن جناب مستفیض احمد صدیقی صاحب کے مشورہ سے طے ہوا کہ اس علاقہ کی ابھرتی ہوئی نوجوان شخصیت جناب ڈاکٹر فریدالدین بقائی مالک بقائی اسپتال کو تقریباتِ جوبلی کا صدر مجلس استقبالیہ بنایا جائے چنانچہ اس بارۂ خاص میں بہمراہی صدیقی صاحب میں نے ڈاکٹر صاحب سے ۷ ارجون ۷۵ء کو ملاقات کی اور موصوف نے مذکورہ پیش کش منظور فرمالی۔

کانفرنس ورکنگ کمیٹی سے منظوری

ضرورت تھی کہ اس منزل پر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی سے بھی طے شدہ اُمور کی توثیق کرائی جائے۔ لہٰذا ۲۰ رجون ۷۵ء کو ۶ بجے شام کمیٹی کا اجلاس کانفرنس لائبریری ہال میں ہوا۔ جس میں صدر کانفرنس جسٹس قدیرالدین احمد صاحب، عقیل احمد خاں صاحب ایڈوکیٹ، قاضی افتخار علی صاحب ایڈوکیٹ، نواب شمس الحسن صاحب، بیگم لفٹیننٹ کرنل شہاب الدین احمد صدیقی صاحبہ، پروفیسر خواجہ حمیدالدین شاہد اور راقم نے شرکت کی۔ جلسہ نے بہ اتفاق آرا ڈاکٹر بقائی صاحب کو صدر مجلس استقبالیہ بنانا منظور کیا۔

انتخاب صدر مجلس استقبالیہ

بعد ازاں ۲۲ رجون ۷۵ء کو کانفرنس لائبریری ہی میں ڈاکٹر بقائی صاحب کے اعزاز میں چائے کی دعوت ہوئی جس میں حسب ذیل ارکان و عہدہ دارانِ کانفرنس و دیگر ہمدردانِ ادارہ شریک ہوئے۔ جسٹس قدیرالدین احمد صاحب۔ ڈاکٹر منظورالدین احمد صاحب، ڈاکٹر احسان رشید صاحب، مستفیض صدیقی صاحب، سید آغا محسن جعفری صاحب، آفتاب عالم قزلباش صاحب، بیگم قزلباش صاحبہ، بیگم کرنل صدیقی صاحبہ، بیگم سید الطاف علی بریلوی، سید اصغر علی شاہ صاحب، قاضی افتخار علی صاحب، سید مصطفےٰ علی بریلوی صاحب اور جمشید یانی پتی صاحب۔

مجلس استقبالیہ کا جلسہ

مجلس استقبالیہ کا پہلا باضابطہ اجلاس اتوار ۲۹ جون ۷۵ء کو خود ڈاکٹر بقائی صاحب کے دولت کدہ واقع بلاک "پی" نارتھ ناظم آباد منعقد ہوا۔ جس کی روداد حسب ذیل ہے۔

جلسہ میں درج ذیل حضرات نے شرکت فرمائی:۔

۱۔ جناب ڈاکٹر فرید الدین صاحب بقائی و بیگم صاحبہ۔
۲۔ جناب ڈاکٹر جمیل جالبی
۳۔ جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب۔
۴۔ جناب افتخار حسین صاحب
۵۔ جناب محمد افتخار علی قاضی صاحب
۶۔ جناب سید حامد علی صاحب جعفری
۷۔ جناب الحاج غلام محمد صالح صاحب
۸۔ جناب الحاج پیرزادہ سید اصغر علی شاہ صاحب
۹۔ جناب اقبال احمد صدیقی صاحب۔
۱۰۔ جناب نور احمد میرٹھی صاحب
۱۱۔ جناب سید مصطفےٰ علی بریلوی
۱۲۔ جناب ڈاکٹر منظور الدین احمد صاحب
۱۳۔ جناب آغا محسن جعفری صاحب
۱۴۔ جناب این۔ ایچ نجمی صاحب
۱۵۔ جناب زین الحسن صاحب۔
۱۶۔ محترمہ بیگم شہاب الدین احمد صدیقی صاحبہ
۱۷۔ محترمہ ڈاکٹر صفیہ منظفر صاحبہ
۱۸۔ جناب تحسین سروری صاحب۔
۱۹۔ سید الطاف علی بریلوی
۲۰۔ جناب سید راشد علی صاحب ایم۔ اے
۲۱۔ جناب حبیب انصاری صاحب و بیگم صاحبہ۔
۲۲۔ جناب راجہ مظفر حسین صاحب
۲۳۔ جناب خواجہ حمید الدین شاہد صاحب

مطابق ایجنڈا نمبر ۱۔ قرار پایا کہ اجلاس کی تاریخیں ۲۵، ۲۶، ۲۷ جولائی ۱۹۷۵ء کے بجائے اگست کے چوتھے ہفتہ تک بڑھا دی جائیں۔

نمبر ۲۔ چار روزہ اجلاس کا مجوزہ اجمالی پروگرام پڑھ کر سنایا گیا جسے منظور کیا گیا۔

نمبر ۳۔ تقریبات جوبلی کے لئے کم از کم پچیس ۲۵ ہزار روپئے (۲۵۰۰۰) اخراجات کا تخمینہ کیا گیا۔

نمبر ۴۔ جناب ڈاکٹر فرید الدین بقائی صاحب کی صدارت میں باختیار اضافہ درج ذیل حضرات کی مجلس استقبالیہ کی ورکنگ کمیٹی منتخب کی گئی۔

۱۔ جناب ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب
۲۔ جناب این۔ ایچ نجمی صاحب
۳۔ جناب خواجہ حمید الدین شاہد صاحب۔
۴۔ جناب اقبال احمد صدیقی صاحب۔
۵۔ جناب نور احمد صاحب میرٹھی
۶۔ جناب سید مصطفےٰ علی صاحب بریلوی
۷۔ جناب آغا محسن جعفری صاحب
۸۔ محترمہ ڈاکٹر صفیہ منظفر صاحبہ۔
۹۔ جناب یامین زبیری صاحب ایڈوکیٹ
۱۰۔ جناب مستفیض احمد صدیقی صاحب

۱۱۔ جناب ڈاکٹر منظور الدین احمد صاحب۔
۱۲۔ جناب ڈاکٹر احسان رشید صاحب
۱۳۔ جناب افتخار حسین صاحب

اس قدر کارروائی کے بعد شرکائے جلسہ کی جناب ڈاکٹر بقائی صاحب کی جانب سے پُرتکلف دعوت چائے ہوئی اور ۷ ½ بجے شام جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

مہمانِ خصوصی جناب عبدالحفیظ پیرزادہ

مجلس استقبالیہ تشکیل پذیر ہونے کے بعد جناب عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب سے اجلاسِ جوبلی کی تاریخ و وقت متعین کرانے کی کوشش شروع کی گئی، اس سلسلہ میں جناب مولانا کوثر نیازی اور پیرزادہ صاحب کو جسٹس قدیر الدین احمد صاحب نے متعدد خطوط تحریر فرمائے اور تار بھیجے مس انیتا غلام علی صاحبہ صدر ویسٹ پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن اور پیپلز پارٹی کے پرجوش رکن مسٹر رضا ربانی نے بھی سعیِ بلیغ فرمائی تا آنکہ ۲۷ر اگست بروز چہارشنبہ ۷ بجے شام تقریباتِ سلور جوبلی کی رسم افتتاح کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اور جوش و انہماک کے ساتھ کام کا آغاز ہوا۔ اخباری اعلانات۔ پوسٹروں اور ہینڈ بلوں کے علاوہ درج ذیل دعوت نامہ بھی بشمول اجمالی پروگرام تین ہزار کی تعداد میں جاری کیا گیا۔

دعوت نامہ اور پروگرام
سلور جوبلی
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

بدھ ۲۷ر تا ہفتہ ۳۰ر اگست ۱۹۷۵ء
بمقام سرسید گورنمنٹ گرلس کالج متصل سبیل چورنگی ناظم آباد کراچی

۲۷ر اگست، ۷ بجے شام اجلاس اول کی رسمِ افتتاح
عالیجناب پیرزادہ عبدالحفیظ صاحب وفاقی وزیرِ تعلیم و رابطہ صوبائی

اور
مشاعرہ کی صدارت
عالیمرتبت مولانا کوثر نیازی صاحب وفاقی وزیرِ مذہبی امور
فرمائیں گے
ازراہِ معارف پروری شرکت کر کے شکر گذار فرمائیے

(جسٹس) قدیر الدین احمد صدر کانفرنس	(ڈاکٹر) فرید الدین بقائی صدر مجلسِ استقبالیہ
سید الطاف علی بریلوی (علیگ) سکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس	این۔ ایچ۔ نجمی (علیگ) سکریٹری مجلسِ استقبالیہ

قومی بچت کی اسکیموں
کے منافع کی شرح
■ ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ
۲۵ فیصد منافع اور ٹیکس میں چھوٹ
■ نیشنل ڈپازٹ سرٹیفکیٹ / بونس ڈپازٹ اکاؤنٹ
۲۰ فیصد منافع۔ ۱۰۰ روپے پر اضافے کی شرح:
تین سال میں۔ ۱۳۰ روپے
پانچ سال میں۔ ۱۹۰ روپے
سات سال میں۔ ۲۲۰ روپے
■ خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ / خاص ڈپازٹ اکاؤنٹ
۱۱٫۳ فیصد منافع کی ہر چھٹے مہینے ادائیگی
■ عام سیونگ اکاؤنٹ
۸٫۵ فیصد منافع
■ فکسڈ ڈپازٹ اکاؤنٹ
۹٫۵ فیصد سے ۱۱ فیصد تک منافع
منافع پر ٹیکس بالکل نہیں لگتا
وطن کے لئے
قومی بچت
گھرانے کے لئے
NATIONAL SAVINGS
قریبی قومی بچت کے مرکز، ڈاک خانے یا بینک سے رجوع فرمائیں
NATIONAL 434 H

بقیہ اجمالی پروگرام

بمقام کانفرنس لائبریری ہال (متصل سرسید گرلس کالج)

جمعرات ۲۸ راگست ۱۹۷۵ء

اجلاس دوم ۸½ بجے صبح تا ۱۲½ بجے دوپہر
موضوع "ابتدائی، ثانوی و اعلیٰ تعلیم کے مسائل"

صدر: جناب اسمٰعیل میمن صاحب ڈائرکٹر اسکول ایجوکیشن کراچی

اجلاس سوم ۷ بجے شام تا ۹ بجے شب
موضوع "تصنیف تالیف اور تحقیق علمی کے مسائل"

صدر: ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

جمعہ ۲۹ راگست ۱۹۷۵ء

اجلاس چہارم ۸½ بجے صبح تا ۱۲½ بجے دوپہر
موضوع "قومی زبان ذریعۂ تعلیم"

صدر: پروفیسر ڈاکٹر طاہر فاروقی صاحب (پشاور)

اجلاس پنجم ۷ بجے شام تا ۹ بجے شب
موضوع: "موجودہ نظام تعلیم اور ہمارا نصب العین"
صدر: جسٹس قدیر الدین احمد صاحب

مختلف اجلاسوں میں غور آنے والے مسائل و تجاویز
ہفتہ ۳۰ راگست ۱۹۷۵ء ۸½ بجے شب بمقام سرسید گرلس کالج

مشاعرہ زیرِ صدارت مولانا کوثر نیازی صاحب وفاقی وزیر مذہبی امور

دوسرا اجلاس مجلسِ استقبالیہ

انتظاماتِ جوبلی کو آخری شکل دینے کے لئے مجلسِ استقبالیہ کا ایک دوسرا جلسہ ڈاکٹر فرید الدین بقائی صاحب کے دولت کدہ پر ۱۰ راگست ۱۹۷۵ء بوقت ۶ بجے شام منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں جناب ایچ۔ ایچ نجمی صاحب مجلسِ استقبالیہ کے سکریٹری اور جناب خواجہ حمید الدین شاہد صاحب مشاعرہ کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ مثلِ سابق اس دفعہ بھی ڈاکٹر بقائی صاحب نے پُر تکلف دعوتِ چائے سے مہمانوں کو نوازا۔

کانفرنس ورکنگ کمیٹی کا ایک اور جلسہ

۱۹ راگست ۱۹۷۵ء کو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی (مجلس عاملہ) کا بھی ایک اور اجلاس زیرِ صدارت جسٹس قدیر الدین احمد صاحب منعقد ہوا جس میں تقریبات سلور جوبلی کانفرنس کے پروگرام و ضروری انتظامات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ نیز قرار پایا کہ مجلسِ استقبالیہ کی جانب سے سپاس نامہ کے علاوہ کانفرنس کے مستقل صدر جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب کی ایک مبسوط تقریر بھی جلسۂ افتتاحیہ میں ہو جو لکھ کر چھاپی جائے۔ اور جس میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی تاریخ، کارگزاری و خدمات اور آئندہ کے لائحہ عمل پر روشنی ڈالی جائے۔ اس تجویز کی بناء پر صدر محترم سے کافی دیر تک اُن امور پر تبادلۂ خیال کیا جن کو وہ ضبط تحریر میں لانے والے تھے۔ اس جلسہ میں اس وقت تک کے

وصول شدہ چندوں کی فہرست بھی پڑھ کر سنائی گئی
جس سے اندازہ ہوا کہ پچیس ۲۵ ہزار روپے کی متوقع رقم
فراہم نہ ہو سکے گی۔ لہٰذا اخراجات کو پندرہ ہزار روپے
تک محدود کیا جانا طے ہوا۔

سلور جوبلی کے متعلق ٹیلیویژن پر مذاکرہ

۲۶ اگست ۷۵ء بعد مغرب کراچی ٹیلیویژن پر انعقاد سلور جوبلی
کانفرنس کے سلسلہ میں ایک معلوماتی مذاکرہ بھی براڈکاسٹ
ہوا جس میں سید الطاف علی بریلوی سکریٹری کانفرنس
ڈاکٹر فرید الدین بقائی صدر مجلس استقبالیہ اور مسٹر
این۔ ایچ۔ نجمی (علیگ) سکریٹری مجلس استقبالیہ
نے حصہ لیا۔ جناب شاہد کمال پاشا نے موڈیٹر کے فرائض
انجام دیئے۔ ٹی۔ وی کے اس نشریہ اور ملک کے انگریزی
اردو اخبارات میں چھپنے والی اطلاعات سے ہونے والی
تقریبات سلور جوبلی کا بڑے پیمانے پر پروپگنڈا ہو گیا۔

جوبلی کا خیر مقدم

تاریخ جوبلی سے قبل اس کے خیر مقدم میں
کافی پیغامات تہنیت آئے جن میں سے چند منتخب
نمونہ از خروارے درج ذیل ہیں۔

جناب مولانا سید عبد القدوس ہاشمی ندوی — اسلام آباد

مکرم و محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج آپ کا تار ملا کہ ۲۷ اگست ۱۹۷۵ء کو آل پاکستان
ایجوکیشنل کانفرنس کی ۲۵ سالہ جوبلی میں حاضر ہو جاؤں۔
بہت خوب بادلی مبارکباد۔ آپ نے جس لگن اور مسلسل جدوجہد
سے کانفرنس کے کاموں کو بڑھایا اور اس مرتبہ تک پہنچایا
کہ اس کی سلور جوبلی منائی جائے۔ اس کے لئے آپ ہماری
طرف سے اور سب کی طرف سے شکر و سپاس کے مستحق ہیں
خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ یہ آپ کی مساعی جمیلہ کا ثمر
ہے۔ کہ آج تک یہ کانفرنس قائم ہے بلکہ قابل قدر علمی
تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہے۔ اتنا بڑا کتب خانہ
آپ نے جمع کیا اور مطالعہ کے لئے آسانیاں مہیا کیں۔
گراں قدر کتابیں شائع کیں اور علم کے پھیلانے کا سامان
پیدا کیا۔ میں پچھلے پچیس سالہ دور میں کانفرنس سے
بہت قریب تر رہا ہوں۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا
ہوں کہ یہ سب آپ کی محنت شاقہ اور دل کی لگن
سے ہوتا رہا۔ ورنہ شاید ہم سب مل کر بھی اتنا کچھ کر پاتے
میں اپنی بعض سخت مجبوریوں کی وجہ سے اس
وقت سفر نہیں کر سکتا ورنہ ضرور شریک ہوتا۔ اور یہ
دیکھ کر خوش ہوتا کہ قوم کے دردمند بزرگوں کی یہ
یادگار کانفرنس آج بھی پوری شان کے ساتھ کام
کر رہی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ میں شریک نہیں ہو سکتا
اب دعا کے سوا اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ دعا ہے کہ
اللہ تعالیٰ اس جشن جوبلی کو کامیابی عطا فرمائے۔ اور
آئندہ اس سے بھی زیادہ خدمت علم کا سامان
مہیا کرے۔ آمین، والسلام

جناب ناصر الدین ناصر۔ لاہور

کرم فرمائے من السلام علیکم

۲۴ مئی کا الطاف نامہ مجھے ۲۹ تاریخ کو کوئٹہ سے آکر مل گیا تھا۔ دو ایک روز تو مصروف رہا اور پھر اچانک موسمی بخار نے آلیا۔ کل قدرے افاقہ محسوس ہوا اور میں سارے کام چھوڑ کر حکم کی تعمیل میں بیٹھ گیا۔ اس حالت میں کچھ زیادہ عرق ریزی تو نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال اپنے تاثرات کو "جنت گم شدہ" کے عنوان کے تحت قلمبند کر دیا ہے۔ اسے محض تعمیل ارشاد سمجھ کر ہی قبول فرمائیں۔

ایک مدت سے کراچی کا قصد کر رہا ہوں۔ دیکھیں آب و دانہ کب کشش کرتا ہے اور کب آپ کی زیارت سے متمتع ہوتا ہوں۔

سہ چاند تاروں پر نظر پڑنے لگی آپ کو دیکھے زمانہ ہو گیا

جناب حاتم علوی صاحب کا تار از پشاور

سلور جوبلی کی دلی مبارکباد۔ آجکل پشاور میں ہوں۔ عدم شرکت کا افسوس ہے۔ آپ نے نہایت تندہی سے تعلیمی خدمات انجام دی ہیں۔

جناب الطاف احمد خیری صاحب سابق سکریٹری اسٹیٹ کونسل ریاست جے پور

مکرمی السلام علیکم

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی "سلور جوبلی" کا دعوت نامہ موصول ہوکر باعث مسرت ہوا۔ میری جانب سے اپنے جشن سیمیں کے انعقاد پر دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے جنوری ۱۹۵۱ء کے بعد سے پاکستان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ان سے میں تھوڑا بہت واقف ہوں اور مجھے اس کا بھی علم ہے کہ آپ اس انجمن کے روح رواں ہیں۔ اس موقع پر یقیناً آپ اور انجمن کے دیگر ارکان مستقبل کے لئے لائحہ عمل اور طریق کار کے متعلق غور کریں گے۔ اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قائداعظمؒ اور ان کے رفقائے کار نے جن اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے پاکستان بنوایا تھا آپ حضرات مجھ سے زیادہ اُن سے واقف ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حصول پاکستان کے بعد ہم ان اغراض و مقاصد کو بھول گئے اور اس مملکت خداداد میں ہم اسلام کا نام تو ہر موقع پر لیتے رہے مگر عملاً اسلام سے دور ہی ہوتے گئے۔ اور ہم میں سے تقریباً ہر شخص جائز اور ناجائز طریقے سے صرف دولت کمانے اور عیش کرنے میں لگ گیا؟

آپ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا جشن سیمیں ضرور منائیں مگر خدارا پاکستانی مسلمانوں اور بالخصوص پاکستان کے نوجوانوں کو حقیقی معنی میں عملاً مسلمان بنایئے اور سچے مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کرنا سکھانے کے لئے کچھ کیجئے۔

پاکستانی گھروں میں ماں باپ اپنی اولاد کو نہ قرآن مجید پڑھاتے ہیں (الا ماشاء اللہ) نہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور اصحاب رسولؐ کے اسوۂ حسنہ سے آگاہ کرتے ہیں۔ نہ ان پر نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کی تاکید کرتے ہیں اور نہ خود اُن کے سامنے اپنے عمل سے ایک اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اب رہے ہمارے اسکول اور کالج تو وہاں تعلیم ہے تو وہ لا مقصدیت کا شکار ہے۔ اور طلباء اور طالبات اسکول اور کالج علم حاصل کرنے کے لئے نہیں جاتے

ان کا تعلیمی معیار کیا ہے اور وہ کس طرح اور کن طریقوں
سے امتحان پاس کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع
نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لڑکے ہیں تو ان کی وضع قطع دیکھ کر
وحشت ہوتی ہے اور لڑکیاں ہیں تو ان کے لباس اور
چال ڈھال دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔

ہمارے بہت سے نوجوانوں کو نہ خدا اور آخرت
کا خوف ہے (ان میں سے بیشتر تو شاید خدا کے متعلق کچھ
جانتے ہی نہیں، اور نہ مرنے کے بعد جی اٹھنے اور جزا و سزا
پر ان کا ایمان ہے) نہ بڑوں کا ادب ہے۔ ہمارے
نوجوان نہ صرف مذہب سے بے بہرہ ہیں بلکہ ان کی
ایک تعداد مذہب سے بیزار ہے۔

ہم نے ۱۹۶۵ء کی جنگ سے اور ۱۹۷۱ء کے
سقوطِ مشرقی پاکستان سے من حیث القوم کوئی سبق نہیں
لیا۔ اگر ہم جلد سے جلد اپنی روش نہیں بدلتے اور سچے مسلمان
کی طرح زندگی گذارنے کی جدوجہد نہیں کرتے تو بس
خداوند تعالیٰ ہی رحم فرمائے۔

آپ "العلم" اور ایجوکیشنل کانفرنس کی آئندہ
تصانیف اور دیگر ذرائع سے اگر اس تکلیف دہ صورتِ
حال کے لئے کچھ کر سکتے ہیں۔ تو خدا را کیجئے۔ فقط والسلام

آپ کا مخلص الطاف احمد خیری۔

جناب صادق زاہد صاحب — ایبٹ آباد

مکرمی و محترمی السلام علیکم
امید ہے بفضل خداوند
تعالیٰ آپ بخیریت ہوں گے۔ اور آل پاکستان ایجوکیشنل
کانفرنس کی سلور جوبلی کی تمام تقاریب کو کامیاب بنانے
میں مصروف ہوں گے۔ بزرگوارم! مجھے الفاظ
نہیں مل رہے ہے کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں،
کہ اس موقع پر آپ نے انتہائی پرخلوص انداز سے
اس ہیچمدان کو ایبٹ آباد جیسے دور دراز مقام
پر یاد کیا ہے۔ خدا آپ کو اپنی تقاریب منعقد کرنے
کے لئے صحتِ کامل اور عمرِ خضر عطا فرمائے (آمین)
آپ لوگ اس ۱۹۷۵ء میں اس مخلص ترین انسان
کے مشن کو آگے بڑھانے میں شب و روز مصروف
ہیں۔ جو ہماری ملی تاریخ میں سرسید احمد خاں کے
نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور کیا تحریر کروں۔ آپ قلبی
طور پر مجھے اپنے قریب سمجھیں۔ میں بھی اس تحریک کا
اپنے آپ کو ایک ادنیٰ سا پیرو کار سمجھتا ہوں۔ میرے
لائق یہاں کی کوئی بھی خدمت ہو تو حاضر ہوں۔ والسلام

مخلص صادق زاہد

جناب پروفیسر محمد حامی الدین خاں — کراچی | ایجوکیشنل کانفرنس

ہندوستان میں ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں کی بیداری اور ترقی
تعلیم کی ولولہ انگیز کوشش کرتی تھی لیکن تقسیم ہند کے
بعد حالات بدلنے پر وہاں کام کرنا ممکن نہ رہا۔ خوش قسمتی
سے اس وقت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی باگ ڈور
سید الطاف علی صاحب بریلوی کے مضبوط ہاتھوں میں
تھی۔ انہوں نے حیرت انگیز بصیرت۔ دوراندیشی اور فہم سے
کام لیا۔ اور اپنی اور اپنے متعلقین کی زندگی اور املاک
کو خطرے میں ڈال کر صرف کانفرنس کے چند ضروری کاغذات
لے کر پاکستان چلے آئے۔ پاکستان کے قیام کو شروع ہوئے
ابھی بہت تھوڑا عرصہ ہوا تھا۔ اور حالات بہت نامساعد تھے

سید الطاف علی صاحب نے بغیر کسی مادی وسائل کے کام شروع کیا۔ اور بڑی جد و جہد سے چند مخلص رفقاء کا تعاون حاصل کر کے قلیل عرصہ میں کراچی میں سندھ مدرسہ کالج کی عمارت کے ایک چھوٹے کمرے میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا بورڈ لگانے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ پچھلے ۲۵ سال سے یہ کانفرنس ایک مضبوط مجلس انتظامیہ کی نگرانی میں روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ اس کی کامیابی کے ثبوت کے لئے گورنمنٹ سر سید گرلز کالج ایک عظیم دار الاشاعت، ایک اعلیٰ معیار کا کتب خانہ اور دار المطالعہ موجود ہیں۔ اور اس کی اپنی ایک وسیع خوبصورت عمارت ہے جس پر ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ رقم صرف ہو چکی ہے۔ اس کانفرنس کی سلور جوبلی، ۲۷ر اگست سے بڑی شان و شوکت سے ہو رہی ہے جو ایک منفرد حیثیت کا کارنامہ ہے

"العلم" کے سلور جوبلی نمبر حصہ اول میں مسز آمنہ کمال پرنسپل سر سید گرلس کالج نے بڑی صداقت اور خلوص سے سید صاحب کی ان تھک کوششوں اور ان کی "سادگی" وضعداری۔ استقلال، محنت اور انکسار"، کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اپنی اس دلی تمنا کا اظہار کیا ہے۔ کہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ..... سید الطاف علی صاحب کی موجودگی ہی میں اپنی گولڈن جوبلی بھی منائے اور ہم سب فخر کے ساتھ اس میں شریک ہوں" وہ حقیقتاً ایک دل کی نکلی ہوئی آواز ہے اور پاکستان کا ہر شخص اس پر آمین کہے گا۔ عرض اس دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

ڈاکٹر سید عبد اللہ
ایم اے ایم او ایل ڈی لٹ لاہور

مخترم و مکرم السلام علیکم مزاج شریف۔

آپ کی طرف سے کانفرنس میں شرکت کے لئے تار ملا۔ بے حد شکر گذار ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اسمیں شرکت سے معذور رہوں گا کیونکہ اس روز شعبۂ اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ کی مجلس انتظامیہ کی سالانہ جائزہ کمیٹی کی میٹنگ ہے۔ جس میں میری شرکت ناگزیر ہے۔ آپ کی اس دعوت کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔ والسلام۔

سید عبد اللہ

محترمہ سرتاج شاہ عالم صاحبہ
پشاور

مکرمی تسلیمات

آپ کا شفقت نامہ اور ایجوکیشنل کانفرنس کا دعوت نامہ چند دنوں کے فرق سے ملے جن کے لئے بہت بہت شکریہ۔

کانفرنس میں شرکت تو عین عزت افزائی تھی اس کے علاوہ ایک پرانی دلی خواہش بھی پوری ہوتی اس قسم کی کانفرنس کے لئے خان بہادر صاحب (مولوی شاہ عالم مرحوم) بہت دور دور تشریف لے جایا کرتے تھے۔ لیکن مجبوریاں اور مصروفیات پشاور سے نکلنے نہیں دیتیں۔ بلکہ ان کی وجہ سے آپ جیسے بہی خواہ بزرگوں کو وقت پر خط بھی نہیں لکھ سکتی۔ امید ہے میری یہ کوتاہی اور خطا آپ درگذر کر دیتے ہوں گے۔

دعا کرتی ہوں کہ کانفرنس حسب معمول کامیابی سے ہمکنار رہو۔ اور آپ کی کوششیں بار آور ہوں۔ بڑے بھائی (ڈاکٹر محمد جان خاں) بھی دعوت نامے کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

سرتاج شاہ عالم

مولانا فضل معبود صاحب
مجلس ترقیٔ اردو، پشاور

محترم السلام علیکم دعوت نامہ موصول ہوا ہے۔ یاد آوری کے لئے شکر گزار ہوں۔ لیکن یہاں کی ذمہ داریوں کی وجہ سے شریکِ مجلسِ علمی نہ ہو سکوں گا۔ امید ہے آپ معذرت قبول فرمائیں گے۔ خادمانِ اردو وتعلیم کو میری طرف سے پرُخلوص سلام کہیئے۔

والسلام فضل معبود

جناب مولوی حضور عالم صاحب (علیگ)
حیدر آباد (سندھ)

برادرِ عزیز و محترم السلام علیکم

"سلور جوبلی" کے دعوت نامہ کا شکریہ۔ میں ۲۸ر سے ۳۱ر اگست تک کراچی میں رہا۔ اور حیدر آباد واپس آنے پر آپ کا خط ملا۔ افسوس ہے کہ میں اس اجتماع میں شرکت سے محروم رہا۔ ورنہ اتنے عرصہ کے بعد آپ سے ملاقات ہونے کے علاوہ بعض دوسرے احباب کی زیارت بھی ہو جاتی۔

آپ جس طور پر ناکامیوں کا مقابلہ کر کے (بفضلہٖ تعالیٰ) قومی خدمات انجام دیتے ہیں۔ اور آخر کار کامیاب ہوتے ہیں وہ دوسروں کے لئے بھی سبق آموز اور ہمت افزا ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ اب آپ کی مالی فکریں بھی ختم ہو گئی ہوں اور آپ مطمئن ہوں۔

مولوی حمید اللہ خاں
ماڈل کالونی کراچی

محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مرسلہ نوازشنامہ آیا۔ آج دعوت نامہ بھی موصول ہوا۔ آپ کی یاد آوری اور عزت افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن نہایت حسرت و اندوہ کے ساتھ عرض پرداز ہوں کہ میں بدقسمتی سے شرکتِ کانفرنس سے محروم رہوں گا۔

ا۔ میری لڑکی جس کی شادی فروری میں کی تھی: ۵ ۲۵ر جون کو تبوک گئی تھی۔ وہاں کی آب و ہوا اس کو موافق نہ آئی اور سخت بیمار ہو کر واپس آگئی اب صاحبِ فراش ہے۔ آپ سے دعا کا متدعی ہوں۔

حمید اللہ خاں کراچی

پروفیسر معین الدین دردائی

مخدوم و محترم سلام و رحمت۔ آپ کا مرسلہ دعوت نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکر گزار ہوا۔ دل تو بہت چاہ رہا ہے کہ شریک ہوں لیکن اپنی معذوری کے تحت ہمت نہیں پڑتی۔ بہر حال کامیابی کے لئے دعا گو ہوں

والسلام محمد معین الدین دردائی

حضرت احسان دانش لاہور

مکرم بندہ السلام علیکم

نجانے کن کن خیالات کو سینے سے لگائے کراچی پہنچا مگر اسٹیشن ہی سے علالت شروع ہو گئی اور گھر جاتے جاتے بیماری اپنے شباب پر آگئی تکلیف اس قدر بڑھی کہ مجھے فوراً لاہور واپس ہونا پڑا اور ابھی تک سانسوں میں تسلسل نہیں ہے۔ احمد رشیدی نے بھی کہا تھا اور میرا خود بھی خیال تھا کہ آپ کے مشاعرہ میں جاؤں گا۔ بیماری تو اپنی جگہ، آپ کا حکم مجھ پر واجب کی حیثیت رکھتا ہے مگر ساتھ جانے والا کوئی نہیں تھا ورنہ گر پڑ کے حاضر ہو جاتا۔ علی الصبح لاہور کو روانگی ہو گئی اور سب کچھ دل کی دل میں رہ گئی۔ اب پھر ان شاء اللہ حاضر ہوں گا تو پہلے اطلاع دیدوں گا۔ خدا کرے آپ سب بعافیت ہوں۔ کانفرنس کی سلور جوبلی کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہوں۔ والسلام

احسان دانش

جناب مولانا اسمٰعیل ذبیح صاحب پشاور

برادرِ محترم السلام علیکم۔ میں ایبٹ آباد گیا ہوا تھا۔ وہاں آپ کے تار کا مضمون پہونچا۔ میں پشاور آیا تو فلو ہو گیا۔ اور ایک ہفتہ بخار میں رہا۔ آج ٹھیک ہوا ہوں تو عریضہ لکھ رہا ہوں۔ میں مجبور تھا اس لئے حاضر نہیں ہوسکا۔ ورنہ مجھے جو شوق بے حد تھا اور ہے وہ تو آپ خود جانتے ہیں۔ اگرچہ میں کانفرنس کی سلور جوبلی میں شریک نہ ہوسکوں گا۔ تاہم یقین ہے کہ یہ سلور جوبلی بے حد اور بے مثال کامیاب ہوگی۔ اور آپ جو سراپا کانفرنس ہیں آپ کا وجود ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ خداوند کریم آپ کو طویل عمر، کامل صحت اور مسرت عطا فرمائے۔ مخلص محمد اسمٰعیل ذبیح

مولانا نعیم صدیقی صاحب ایڈیٹر سیارہ لاہور

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اولاً تو آپ کے مرسلہ دعوت نامہ برائے شرکت سلور جوبلی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اتنے اہم موقع پر آپ نے مجھے یاد رکھا۔ بعدہٗ معذرت کے کلمات عرض کرتا ہوں کہ متعدد وجوہ بشمول مسئلہ صحت، اس میں حائل تھے کہ میں کراچی کا سفر کرسکوں۔ سو اس قصور کی یہ سزا تو پائی کہ شخصیتوں کی اس کہکشاں سے لمعات اندوز نہ ہوسکا جسے آپ نے سلور جوبلی کے آسمان پر مرتب کیا ہے۔ بایں ہمہ آپ سے طلبِ عفو بھی لازم ہے۔ امید ہے کہ کوتاہی سے درگذر فرمایئے گا۔ وعدہ رہا کہ انشاء اللہ اب کراچی میں اگر دو روز کے لئے بھی آنا ہوا تو آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کی سعی کروں گا۔ نیاز کیش۔ نعیم صدیقی

جناب رفیق احمد چودھری صاحب تار از میرپور خاص

سلور جوبلی کے لئے میری نیک خواہشات اور مبارکباد قبول فرمایئے۔ شرکت نہ کرسکنے کا افسوس ہے۔

نواب مشتاق احمد خان صاحب لاہور

برادرم السلام علیکم

کانفرنس کی سلور جوبلی کا دعوت نامہ ملا۔ میں ممنون ہوں۔ کہ آپ نے اس موقعہ پر مجھے یاد رکھا۔ کاش کہ میری حاضری ممکن ہوتی۔ اور مجھے شمولیت کی مسرت حاصل ہوسکتی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تقریب کامیاب ہوگی۔ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ کامیاب کیسے نہ ہوگی۔

خدا کرے آپ صحت و سلامتی کے ساتھ قومی خدمات انجام دیتے رہیں۔ مخلص مشتاق احمد

جناب اشفاق احمد ڈائرکٹر مرکزی اردو بورڈ لاہور

مکرمی محترمی السلام علیکم

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سے دعوت نامہ ڈائرکٹر جناب اشفاق احمد کے نام موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ اور مبارکباد قبول فرمایئے۔ جناب اشفاق احمد بعض دفتری مصروفیات کی وجہ سے کانفرنس کے اس اجلاس میں شرکت نہ کرسکیں گے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام

مخلص۔ (ناظم)

پروفیسر عبد السلام خورشید لاہور

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سلور جوبلی میں شرکت کے لئے دعوت نامہ ملا۔ کچھ اتفاقات بھی اس کے حق میں تھے۔ کہ ان دنوں قائد اعظم نیشنل کمیٹی کے سلسلے میں کراچی آرہا تھا۔ آپ سے ملاقات کی آرزو بھی تھی۔ والد مرحوم کے

ساتھ آپ کے مراسم کو ورثے میں پانے کے لئے تجدید تعلق بھی چاہتا تھا لیکن افسوس دعوت نامہ ملنے سے پہلے کراچی سے واپسی کی بکنگ کا عمل مکمل ہو گیا۔ بلکہ لاہور میں ۷۔ اگست کو یوم عنایت اللہ مشرقی سے خطاب کا وعدہ بھی کر چلا تھا۔ اس لئے معذرت خواہ ہوں۔

کانفرنس کا رسالہ باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کچھ لوگ اس ملک میں تسلسل اور تواتر سے ملی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ نے بہت کام کیا ہے۔ لیکن اس کی جزا خدا دے گا۔ یہاں کے بندے بڑے ظالم ہیں وہ کسی زندہ شخص کی قدر نہیں کرتے۔ مرجائے تو ایک آدھ جلسہ کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے سلور جوبلی کی تقریب کو کامیاب کرے۔ اور اللہ سے دعا ہے کہ آپ گولڈن جوبلی بھی منائیں۔

عبدالسلام خورشید

جناب حسن حبیب صاحب
پرنسپل پاکستان ایڈمنسٹریٹو اسٹاف کالج لاہور

محترمی۔ اسلام علیکم

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سلور جوبلی کا دعوت نامہ موصول ہو کر بہت خوشی ہوئی بشرکت ممکن نہ ہو سکی۔ لیکن اس موقع پر دلی احترام کے ساتھ اس امر کا اعتراف اور تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ نے ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اور پھر اس نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں فروغ تعلیم کے لئے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ آپ کو جیسا کہ علم ہے میرے والد صاحب کو بھی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے گہری وابستگی تھی سلور جوبلی کی مکمل رپورٹ کا مجھے اشتیاق کے ساتھ انتظار رہے گا۔ دلی احترام اور اخلاص کے ساتھ —

آپ کا حسن حبیب

عطیات برائے جوبلی

نام	رقم
۱۔ جناب علی رعنا صاحب	۱/-
۲۔ جناب راجہ علی صاحب	۱۰/-
۳۔ جنابہ بیگم شاہ گل صاحبہ	۲۵/-
۴۔ جناب نواب مظفر حسین صاحب لکھنوی	۵۰/-
۵۔ جناب مرزا علی اظہر برلاس صاحب	۱۰۰/-
۶۔ جنابہ لیڈی غلام حسین ہدایت اللہ صاحبہ	۱۰۰/-
۷۔ جناب سید حامد علی جعفری صاحب	۱۰۰/-
۸۔ جناب زین الحسن صاحب	۱۰۰/-
۹۔ جناب مجتبیٰ آفندی صاحب	۱۰۰/-
۱۰۔ جناب شیر محمد صاحب (علیگ)	۱۰۰/-
۱۱۔ جناب پروفیسر ڈاکٹر احسان رشید صاحب	۱۰۰/-
۱۲۔ جنابہ پرنسپل صاحبہ اپوا کالج	۱۲۵/-
۱۳۔ جنابہ حسن بانو قزلباش صاحبہ	۲۰۰/-
۱۴۔ جنابہ ارجمند بانو قزلباش صاحبہ	۲۰۰/-
۱۵۔ میسرز پاک پرنٹنگ انک	۲۰۰/-
۱۶۔ جناب پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب (علیگ)	۲۰۰/-
۱۷۔ جناب پیر الٰہی بخش صاحب	۲۰۰/-
۱۸۔ جنابہ بیگم شوکت علی خاں صاحبہ	۲۰۱/-
۱۹۔ میسرز سردار انڈسٹریز	۲۵۰/-
۲۰۔ جناب الحاج پیرزادہ سید اصغر علی شاہ صاحب	۲۵۰/-
۲۱۔ جنابہ شہر بانو اقبال صاحبہ معرفت بیگم کرنل صدیقی صاحبہ	۲۵۰/-
۲۲۔ جنابہ بیگم کرنل صدیقی	۵۰۰/-
۲۳۔ جناب آغا محسن جعفری صاحب	۵۰۰/-
۲۴۔ میسرز معمار ہاؤسنگ سروسز لمیٹڈ	۵۰۰/-
۲۵۔ جناب حبیب انصاری صاحب	۵۵۵/-
۲۶۔ جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب	۱۰۰۰/-
۲۷۔ جناب الحاج غلام محمد صالح صاحب	۱۰۰۰/-
۲۸۔ جناب شکیل عادل زادہ صاحب مدیر "سب رنگ"	۱۵۰۰/-
۲۹۔ جناب ڈاکٹر فرید الدین بقائی صاحب	۵۰۰۰/-
میزان	۱۳۲۱۷/-

جشنِ سلور جوبلی

افتتاحی اجلاس ۲۷ اگست ۱۹۷۵ء

کسی ادارہ کی زندگی میں ایک ربع صدی یا پچیس ۲۵ سال کی مدت معمولی نہیں ہوتی۔ اس مدت میں نوجوان کارکن ادھیڑ عمر کے اور متوسط العمر لوگ ضعیف العمر ہوجاتے ہیں۔ بڑے بڑے سیاسی و سماجی انقلاب ہو گذرتے ہیں۔ انداز فکر و نظر بدل جاتا ہے۔ اقدارِ حیات منقلب ہوجاتی ہیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ لاتعداد اچھے اچھے رفقائے کار جن کی زندگیاں خیر مجسم ہوتی ہیں۔ داغ مفارقت دے جاتی ہیں، جو کار آمد اصحاب بقیدِ حیات رہ جاتے ہیں، ان میں پہلی جیسی دماغی وجسمانی توانائی باقی نہیں رہتی۔ اور ان کے متعلق کھٹکا لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم کس وقت ان کی روشنی بھی ختم ہوجائے۔

گذرے ہوئے برسوں میں اگر خلوص و دیانتداری سے کام کیا گیا ہے تو ادارے برابر ترقی پذیر رہتے ہیں اور ان کے استحکام میں مزید پختگی آجاتی ہے ــــ ایسے میں یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ گذرے ہوئے زمانہ کی کارگذاریوں کا جائزہ لیا جائے اور حال و مستقبل کے مسائل پر غور کیا جائے۔ تمام بچے کھچے پرانے رفیقانِ سفر کو ایک جگہ جمع کرکے اُن کا اعترافِ خدمات کیا جائے۔ حکومت کو ادارہ کی کارگذاریوں اور خدمات سے آگاہ کیا جائے۔ نیز اُس نئی نسل کو بھی اکٹھا کیا جائے جس پر آئندہ کی ذمہ داری عائد ہونے والی ہے۔ قدیم وجدید کا یہ ملاپ ایک نئے دور کا آغاز اور ایک نئی صبحِ اُمید کا جشن مسرت ہوتا ہے۔ جس کا نام عرف عام میں سلور۔ گولڈن۔ ڈائمنڈ یا پلٹینم جوبلی رکھا گیا ہے۔

راقم السطور اور اس کے ہم عمر رفقائے کار کو چونکہ ادارہ کی گولڈن جوبلی تک فعال رہنے کی اُمید نہ تھی۔ اس لئے طے کیا کہ سلور جوبلی منائی جائے اور ایسی دھوم دھام سے یہ تقریب ہو کہ اُس کی یاد ہمارے جانشینوں میں ہمیشہ جوشِ عمل پیدا کرتی رہے۔ پروگرام کے مطابق تقریب سلور جوبلی کا پہلا افتتاحی اجلاس عین بعد مغرب سات بجے شام منعقد ہونا قرار پایا تھا۔ جلسہ گاہ یعنی کانفرنس کے قائم کردہ سرسید گرلس کالج کی پوری عمارت اور کمپاؤنڈ کو بجلی کی جھالروں اور سرچ لائٹوں سے بقعۂ نور بنا دیا گیا تھا۔ خوب ہی خوب سجے ہوئے ڈائس پر مہمانِ خصوصی کی نشست کے پیچھے سرسید علیہ الرحمۃ کا ایک بہت بڑا فوٹو بلندی پر آویزاں کیا گیا تھا۔ جس کے دائیں

اور بائیں حضرت قائد اعظم اور علامہ اقبال کی تصاویر تھیں اور پھر ان کے چپ و راست پاکستان کے پہلے وزیر اعظم شہید ملت لیاقت علی خاں اور زمانہ حال کے سربراہ مملکت عالیجناب ذوالفقار علی بھٹو کی تصاویر رونق دہ بزم تھیں۔ وقت مقررہ سے پہلے ہی مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ ۷½ بجے تک بہت بڑی تعداد میں نشستوں کا جو انتظام کیا گیا تھا۔ وہ قریب قریب سب بھر گئیں۔ ریڈیو۔ ٹیلیویژن اور نمائندگان اخبارات بھی اپنی اپنی مخصوص نشستوں پر متمکن ہو گئے۔ لیکن مہمان خصوصی جناب عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب کی تشریف آوری میں بوجوہ تاخیر ہوگئی ــــ اس وقفۂ انتظار میں مشہور قومی کارکن اور انجمن فیض الاسلام راولپنڈی کے جنرل سکریٹری جناب مولانا ملک جلال الدین صاحب کو دعوت دی گئی کہ وہ تقریر فرمائیں ـــ مولانا صاحب موصوف نے ڈیڑھ سو سالہ زمانہ غلامی کے نظام تعلیم اور اس کے خراب اثرات کو مؤثر طریقہ پر بیان کیا' بیچ بیچ میں ملت کے گرتے ہوئے اخلاق و اعمال پر کڑی نکتہ چینی کی اور فرمایا کہ ہمارے نظام و نصاب تعلیم کو قرآن و سنت کی روشنی میں از سر نو مرتب کرنا چاہیے۔

مہمان خصوصی کی آمد اور استقبال

قریب آٹھ بجے مہمان خصوصی جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کی آمد آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ کالج کے بیرونی گیٹ پر جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب صدر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ ڈاکٹر ایف ۔ یو بقائی صدر مجلس استقبالیہ اور دیگر معززین کی ایک بڑی جماعت نے موصوف کا پُر تپاک خیر مقدم کیا اور آپ کو ہاتھوں ہاتھ ڈائس پر لائے۔ جہاں آپ کرسی صدارت پر متمکن ہوئے۔ آپ کے داہنے اور بائیں جسٹس قدیر الدین صاحب۔ سید حسین امام صاحب۔ مسٹر حسن علی عبدالرحمٰن بیرسٹر۔ ڈاکٹر ایف ۔ یو بقائی۔ سید الطاف علی بریلوی اور مسٹر این ۔ ایچ نجمی (علیگ) تشریف فرما ہوئے۔

آغاز اجلاس از تلاوت کلام پاک

سید الطاف علی بریلوی نے اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دیتے ہوئے سب سے پہلے محترمہ بیگم سید عبدالحفیظ صاحبہ سکریٹری شعبۂ تعلیم نسواں کانفرنس کو تلاوت کلام پاک کی دعوت دی۔ چونکہ آں محترمہ ایک مذہبی خاتون اور کامیاب قاریہ ہیں۔ اس لئے انہوں نے جس خوش الحانی سے تلاوت کی اس سے محفل پر ایک خاص روحانی کیفیت طاری ہوگئی۔

رسم گل پوشی

تلاوت کے بعد مہمان خصوصی کو مخدومہ لیڈی غلام حسین ہدایت اللہ صاحبہ صدر شعبۂ نسواں ۔ اور محترمہ بیگم لفٹننٹ کرنل شہاب الدین صدیقی صاحبہ نائب صدر نے ہار پہنائے ۔ اس موقع پر یہ منظر دیدنی تھا کہ پیرزادہ صاحب نے ان بزرگ خواتین کو ڈائس پر چڑھنے کی زحمت نہ دی بلکہ خود نیچے اُتر کر آئے اور انتہائے سادگی و سعادت مندی کے ساتھ ہار پہننے کے لئے سر جھکا کر کھڑے ہوگئے ـــ اعلیٰ شرافت و انسانیت کے اس مظاہرہ سے حاضرین

بہت محظوظ ہوئے۔

نذرانہ مطبوعات کانفرنس

رسم گل پوشی سے فارغ ہوکر پیرزادہ صاحب جب پھر اپنی نشست پر واپس آئے تو از روئے پروگرام آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے سینیر رکن و چیرمین اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ جناب مرزا علی اظہر صاحب برلاس نے ادارہ کی ۷۵ مطبوعات کا سیٹ مہمانِ خصوصی کو نذر کیا۔ اس کام میں ڈاکٹر فریدالدین بقائی نے بھی مرزا صاحب کی معاونت کی جو کتابیں نذر کی گئیں اُن کی تفصیل یہ تھی:۔

۱	تعلیمات	۲۵
	نفسیات و فلسفہ	۶
	سائنس	۴
	اخلاقیات و عمرانیات	۷
	ادبیات، لسانیات، انتقادیات	۱۱
	سیرۃ۔ سوانح۔ تاریخ	۲۲
	میزان	۷۵

سپاس نامہ

نذرانہ مطبوعات کے بعد ڈاکٹر فریدالدین بقائی صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے درج ذیل سپاسنامہ پڑھا جسے کافی عریض و طویل اور انتہائی خوبصورت فریم میں نفیس خطاطی کے ساتھ مزین کیا گیا تھا۔

سپاسنامہ

بعالی خدمت عالیجناب پیرزادہ عبدالحفیظ صاحب
وفاقی وزیر تعلیم و صوبائی رابطہ
اسلامی جمہوریۂ پاکستان

جناب والا!

آج شام، جب کہ ہم سب آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی ۷۵ سالہ جوبلی کا جشن منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ آپ نے رونق دہ بزم ہوکر ہمارے ادارہ اور اس کے جملہ کارکنوں کو نہ صرف مفتخر فرمایا بلکہ اپنی تشریف آوری سے ہم پر اپنے اعتماد کا بھی عملاً اظہار فرمایا ہے۔ جس کے لئے ہم بدل شکر گزار ہیں۔

آپ ہمارے ملک کی نامور ہستی ہیں اور عوام کے ہر طبقہ کو آپ کی فضیلتِ علمی اور نیکوکاری کا اعتراف ہے۔ آپ ایک سچے اور مخلص رہنما ہیں اور بڑی لگن اور انہماک کے ساتھ اپنے دائرۂ کار میں پاکستان کی ترقی و بقاء کے لئے انتھک کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین واثق ہے کہ قائدِ عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ولولہ انگیز اور تاریخ ساز قیادت میں آپ اپنے مشن میں انشاء اللہ بدرجۂ اتم کامیاب ہوں گے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ اُسے سرسید علیہ الرحمۃ نے ۱۸۷۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج کھولنے کے گیارہ سال بعد، ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ء کو قائم کیا تھا۔

سرسید کے بعد کانفرنس کو نواب محسن الملک، نواب وقار الملک علامہ شبلی، سید امیر علی، سر خواجہ سلیم اللہ، مولانا حالی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، سر شاہ محمد سلیمان، سر راس مسعود، سر علی امام، سر اکبر حیدری، سر عبد اللہ ہارون، سر فضل حسین، صاحبزادہ عبد القیوم، حسن علی سے آفندی، نواب صدر یار جنگ، میجر شمس الدین محمد، ڈاکٹر ممتاز حسن، اور مثل ان کے دیگر مشاہیر نے پروان چڑھایا اور ہمہ گیر ترقی سے ہمکنار کیا۔

اپریل ۱۹۵۱ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کو عروس البلاد کراچی میں از سر نو قائم کیا گیا۔ اور گذشتہ ۲۵ سال کے عرصہ میں اس نے اپنی شائع کردہ اسّی معیاری مطبوعات، سہ ماہی رسالہ العلم، کثیر التعداد مجالس علمی، ذاتی عمارت میں فری پبلک لائبریری، ریڈنگ روم اور لیکچر گیلری نیز عظیم سر سید گرلس کالج کے ذریعہ جو کام کیا اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ ان سب کاموں کے ذریعہ ہم نے مملکتِ پاکستان میں توسیع و اصلاحِ تعلیم اور فروغِ تحقیقِ علمی کی طرحِ نو ڈالی ہے۔ اور آئندہ بھی اپنے پیش رو بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر ہم زیادہ سے زیادہ خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہمارا ملک جہالت کی تاریکی سے نکل کر تعلیم کی روشنی سے منوّر ہو جائے۔

ہم علی گڑھ تحریک کے مناد ہیں، جس نے قیامِ پاکستان کو ممکن بنایا۔ اسی تحریک کو جاری رکھ کر ہم اپنے ملک کو مضبوط و مستحکم بنانا چاہتے ہیں۔ صوبائی و لسانی تعصبات سے بالاتر ہو کر اور اپنے ملک کو اکائی قرار دے کر ہم اس کی بے لوث خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور علی گڑھ اسپرٹ سے سرشار لوگ پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد، آزاد کشمیر اور بلوچستان غرض ہر جگہ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ہم لوگوں میں عدیم المثال اتحاد و اتفاق اور یکجائی چارہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ حکومت بھی اس حقیقت کا مؤثر اعتراف کرے۔ اور علم و تجربہ کی ہماری جو صلاحیتیں ہیں۔ اُن سے بیش از بیش کام لے۔ بطورِ خود جو کچھ ہم کرسکتے تھے۔ وہ کر چکے۔ اور آئندہ بھی جہاں تک ممکن ہوگا کرتے رہیں گے، حکومتِ پاکستان نے توسیع و ترقی تعلیم کے جو شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں ان کے ہم پرجوش مداح ہیں۔ خود اپنے متعلق ہم نے حکومت کو جو پیش کش کی ہے۔ اس میں ذرائع و وسائل کی شدید کمی البتہ سدِّ راہ ہے لیکن امید واثق ہے کہ اللہ کے فضل، اہل پاکستان کی مدد اور آپ کی منصفانہ سرپرستی سے حلِ مشکلات میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا حلقۂ اثر اور اس کا دائرہ عمل بحمد اللہ یوماً فیوماً ترقی پذیر ہے۔ ملک کے اعلیٰ دماغ اس کے پلیٹ فارم پر مجتمع ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں کہ مستقبل قریب میں ہم اور آپ مل کر وہ سب کچھ کر دکھائیں جس کی آرزو ہمارا اور آپ کا حقیقی سرمایۂ حیات ہے

آیئے ہم اور آپ اور اس مجلس کے تمام معزز شرکا تصنع اور بناوٹ کی دنیا سے دور ہو کر صمیم قلب سے دعا مانگیں کہ آپ کی سربراہی میں کانفرنس کی تقریب سلور جوبلی کا انعقاد پاکستان کے علمی و تعلیمی اور تہذیبی و ثقافتی وقار کو بلند بنانے کا پیش خیمہ ثابت ہو، تعمیرِ ملّی کے مقدس فرائض کی بجا آوری میں ہماری ماضی کی غفلتیں اور کوتاہیاں قصّۂ

بن جائیں اور مستقبل ـــــ وہ مستقبل جس کی انمول ساعتیں ہمارے جوش عمل کا بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہی ہیں۔ ہمارے جیب و دامن کو کامیابی و کامرانی کی ایسی ایسی مثالی نعمتوں سے پُر کر دے کہ ـــــ وہ جو ترقی یافتہ دنیا کہلاتی ہے ـــــ اس کی آنکھیں بھی چکا چوند ہو کر رہ جائیں۔

اُٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر پیدا کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر پیدا کریں

ہم ہیں آپ کے مداح

ڈاکٹر فریدالدین بقائی (صدر)
واراکین مجلس استقبالیہ سلور جوبلی
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

سرسید گورنمنٹ کالج، کراچی
۲۷ اگست ۱۹۷۵ء

تقریر خیر مقدم
مسٹر حسن علی عبدالرحمٰن

خطبۂ استقبالیہ ختم ہونے اور مہمانِ خصوصی کی خدمت میں اس کے نذر گذرانے جانے کے بعد جناب حسن علی عبدالرحمٰن بار ایٹ لا آنریری جنرل سکریٹری کانفرنس نے انگریزی میں تقریر کی ـــــ آپ نے فرمایا۔

مسٹر پیرزادہ مسٹر جسٹس قدیرالدین خواتین و حضرات

آپ مجھے معاف فرمائیں کہ میں آپ سے انگریزی زبان میں مخاطب ہو رہا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ مجھے پاکستان کی قومی زبان اُردو سے محبت نہیں ہے۔ میں علی گڑھ میں زیر تعلیم رہا ہوں جہاں ہم سب طالب علم جو کشمیر سے راس کماری اور صوبہ سرحد و بلوچستان سے آسام اور برما تک سے آتے تھے۔ آپس میں اردو ہی میں بات چیت کرتے تھے ـــــ لیکن بات چیت اور اہل علم کے کسی عظیم اجتماع میں تقریر کرنا مختلف چیز ہے۔

حضرات! آج آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سلور جوبلی کا جشن ہے۔ اور ہم سب یہ جشن منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں ـــــ اس موقع پر آپ میری دلی شادمانی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ادارہ کے پچیس[۲۵] سالہ سفر میں میں بھی مسلسل اُس کا شریکِ سفر رہا ہوں۔ اس گہری وابستگی کی ایک چھوٹی سی کہانی بھی ہے۔

اس وقت اگلی صف میں میرے محترم دوست جناب پیر الٰہی بخش صاحب رونق افروز ہیں۔ پچیس سال گذرے میری ان سے ایک جگہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ کراچی میں علی گڑھ والی ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جا رہی ہے۔ اس کا ایک جلسۂ شوریٰ ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ میں غیر منقسم ہندوستان میں کانفرنس کی شاندار خدمات سے واقف تھا۔ فوراً چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ بہاولپور کے سابق وزیر تعلیم میجر شمس الدین محمدؒ صاحب مرحوم کی کوٹھی "دارالسلام" واقع دیارام گدومل روڈ، جمشید کوارٹرس میں جلسہ تھا۔ میجر صاحب میرے والد مرحوم کے دوست تھے اور میری بھی اُن سے کافی شناسائی تھی۔ لہٰذا اُن کے دولت خانہ میں میرے لئے کوئی اجنبیت نہ تھی۔

جلسہ میں ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے اور مقامی اصحاب کافی تعداد میں موجود تھے۔ سب نے قیام کانفرنس کی پرجوش تائید کی۔ اغراض و مقاصد طے ہوئے اور کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی جس کا مجھے بھی ممبر بنایا گیا۔ اور اس طرح پیر الٰہی بخش صاحب کی

مہربانی سے میں اس تحریک سے غیر ارادی طور پر وابستہ ہو گیا اور لطیفہ یہ ہے مجھے پھنسا کر خود پیر صاحب غائب ہو گئے۔ آج ایک مدت کے بعد میں کانفرنس کے جلسہ میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔

قصہ مختصر کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں سید الطاف علی بریلوی نے کچھ ایسی لگن کے ساتھ کام کیا کہ اس سے متاثر ہو کر میں ان کا پکا دوست ہو گا۔ اس دوستی نے آگے چل کر کچھ اور گل کھلائے ــــ ورکنگ کمیٹی اور اس کے عہدہ داروں کے انتخاب کا وقت آیا تو ایک روز اچانک بریلوی میرے دفتر میں آئے۔ اور کہا کہ آپ کو کانفرنس کا جنرل سکریٹری بنایا جا رہا ہے رضامندی دے دیجئے ــــ میں نے انکار کی حد کر دی لیکن وہ نہ مانے۔ اور مجھے سید کی فرمائش پوری کرنی پڑی۔

تو حضرات! یہ وہ بات کچھ ایسی نیک ساعت میں ظہور پذیر ہوئی کہ میں پچیس ۲۵ سال سے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا آنریری جنرل سکریٹری ہوں ــــ اس دوران متعدد بار انتخابات بھی ہوئے۔ ہر دفعہ نہ معلوم کس طرح میں ہی منتخب ہو جاتا ہوں۔ بہر حال

ہر آنچہ از دوست می رسد نیکوست

ابتدا میں پانچ سال تک کانفرنس کا دفتر سندرہ مدرسہ میں رہا۔ وہیں سے جولائی ۱۹۵۲ء میں قیام سرسید کالج کی اسکیم بروئے کار آئی جس کی شاندار عمارت میں اس وقت ہم سب جمع ہیں۔

حضرات! مجھے بڑا فخر ہے کہ میں آج کے تاریخی اجلاس جو بلی کے مہمان خصوصی مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ کی تشریف آوری کا پُرخلوص شکریہ ادا کر رہا ہوں۔ اور آپ سب معزز خواتین و حضرات کو بھی خوش آمدید کہتا ہوں۔ خدا حافظ

تقریر سید الطاف علی بریلوی

حسن علی صاحب کی تقریر ختم ہونے کے بعد سید الطاف علی بریلوی نے جلسہ سے خطاب کیا۔ اور کہا کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس سے میرا تعلق چالیس سال سے ہے۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۰ء تک علی گڑھ میں اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۶ء تک پاکستان میں۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی گولڈن جوبلی ہوئی تھی اور اب اگست ۱۹۷۶ء میں پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سلور جوبلی ہو رہی ہے۔ ان دونوں تقریبات میں میری شرکت و شمولیت میری زندگی کے اہم ترین واقعات ہیں۔ میں اس وقت آپ کے سامنے ایجوکیشنل کانفرنس کی تاریخ اور اس کے کارناموں کو نہیں دہراؤں گا۔ کیونکہ وہ قبل ازیں ضبط تحریر میں آکر اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مجلس استقبالیہ کے پیش کردہ سپاس نامہ اور میرے بعد جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب کی ہونے والی تقریر میں آپ یہ سب کچھ سن چکے ہیں اور سن لیں گے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ سرسید گرلس کالج جس کے احاطہ میں آپ تشریف فرما ہیں۔ اور جس کی ہمہ جہت ترقی و شہرت سے آپ کما حقہٗ واقف ہیں اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ جب اس کے قیام کا رزولیوشن کانفرنس ورکنگ کمیٹی نے پاس کیا تو ہمارے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ دفتر کے پرانے اخبارات کی ردّی فروخت

کر کے میں نے دن بھر گشت کر کے قریب ایک ہزار روپے
جمع کئے۔ اسی روز شام کو آرام باغ سے فرنیچر خریدا اور
سعیدہ منزل واقع رضویہ کالونی میں جو بغیر پگڑی یا
ایڈوانس کرایہ کے ہمیں مل گئی تھی۔ لے لگا دیا۔ دوسرے
روز بولٹن مارکیٹ کے ایک سنٹر سے سرسید گرلس کالج
کا بورڈ لکھوا کر اُسے آٹو رکشہ میں لایا اور میں اُسے آویزاں
کرا رہا تھا کہ اتفاقاً جناب مرزا ممتاز حسن قزلباش مرحوم
سابق وزیر اعلیٰ ریاست خیر پور کا اُدھر سے گذر ہوا مجھ سے
دریافت کیا کہ کیا کر رہے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ کالج
قائم کیا ہے آیئے اندر چل کر دیکھئے۔ فرمایا ابھی نہیں
جب تین سو لڑکیاں کالج میں ہو جائیں گی تو آؤں گا۔ یہ
جولائی ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ آج ۱۹۷۵ء میں ہمارے
کالج میں ۲۷۰۰ لڑکیاں زیر تعلیم ہیں۔ اسی مناسبت سے
کثیر التعداد اسٹاف ہے۔ بہترین ساز و سامان ہے۔
آجکل کے مارکیٹ کی قیمتوں کے لحاظ سے پچاس ساٹھ
لاکھ روپے کی عمارتیں اور چھ ایکڑ کا وسیع و کشادہ
کمپاؤنڈ ہے۔ کانفرنس کی اس خدمت کے علاوہ اسی
معیار کی مگر دوسری نوعیت کی تعلیمی و تصنیفی میدان میں
شاندار خدمات ہیں جن کو بیان کرکے میں آپ کا وقت
ضائع نہیں کروں گا لیکن اس ضمن میں میرے لئے یہ گذارش
کرنا ناگزیر ہے کہ ہم لوگ توکل بخدا اور خانقاہی طرز پر
کام کرتے ہیں۔ اور اس کے مستحق ہیں کہ اہل دل اور صاحب
بصیرت ارباب ملت ہماری مدد فرمائیں۔ کیونکہ یہ
دنیا بہر صورت مادی اسباب و وسائل کی محتاج ہے
اگر اسباب و وسائل حسب ضرورت مہیا ہو جائیں تو
تھوڑے وقت میں زیادہ کام ہوگا اور اگر ان چیزوں
کا فقدان ہوگا تو زیادہ وقت میں محدود حد تک تعمیری
کام ہو سکے گا۔ آج ہمارے وسائل کا یہ حال ہے کہ ۱۹۶۴-۶۵ء
تک مرکزی وزارت تعلیم ہمیں پچاس ہزار روپے سالانہ
گرانٹ دیتی تھی ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت دو
جنگوں کے نتیجہ میں یہ گرانٹ گھٹ کر -/۳۲٫۵۰۰ روپے
سالانہ رہ گئی جبکہ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں
ہر چیز کی گرانی کم از کم پانچ گنی ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر، لائبریری اور
آڈیٹوریم کی، جو عمارت اس کالج کے قریب ہی ہم نے بنائی
ہے۔ اس پر نیشنل بنک آف پاکستان کا چالیس ہزار
روپیہ قرض ہے جس کا کم و بیش پانچ ہزار روپے سالانہ
سود ہمیں ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان مالی مشکلات پر ہم مثل
سابق قابو پا لیتے اور حسب عادت ہم آپ سے ان کا
ذکر بھی نہ کرتے لیکن بے بسی یہ ہو گئی ہے کہ وہ مخیر حضرات
اور ہمارے بہترین ساتھی جو ہر طرح کی دستگیری کرتے
تھے۔ ان میں سے اکثر اس جہان سے رخصت ہو کر داغ
مفارقت دے گئے۔ اور جو موجود ہیں۔ ان کے حالات
کچھ اس طرح تبدیل ہو گئے کہ وہ اب ہماری امداد کرنے
کے قابل نہیں رہے ہیں۔ نئے عہد کے نئے سرمایہ داروں
تک ہماری رسائی نہیں اور ہم مجبور ہیں کہ آج کے
اس جلسہ کے مہمانِ خصوصی جناب عبد الحفیظ پیرزادہ
صاحب سے دست سوال دراز کریں۔ اور حلِ مشکلات
کی اپیل کریں۔ مجھے امید واثق ہے کہ میری یہ اپیل جب
کے حاضرین جلسہ بھی ہم نوا ہیں رائیگاں نہ جائے گی اور

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سلور جوبلی کی تقریب
ادارہ کی حیاتِ نو کا موجب بنے گی۔ اس سے زیادہ کیا
عرض کروں۔ خدا حافظ۔

تقریر جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب صدر کانفرنس

سید الطاف علی بریلوی

کی تقریر کے اختتام پذیر ہونے کے بعد جناب جسٹس
قدیر الدین احمد صاحب صدر آل پاکستان ایجوکیشنل
کانفرنس نے مجمع سے خطاب فرمایا ـــــ آپ کی تقریر
لکھی ہوئی تھی جو درج ذیل ہے۔

عزت مآب پیرزادہ عبدالحفیظ صاحب و
معزز حاضرین جلسہ!

آپ کا خیر مقدم ڈاکٹر فریدالدین بقائی صاحب
ریسپشن کمیٹی کی طرف سے گرم جوشی کے ساتھ کر چکے ہیں۔
انہوں نے جو کچھ فرمایا اس میں سے دو ایک خیالات کو
ان کی اہمیت کی وجہ سے دہرانا چاہتا ہوں اور پھر
کانفرنس کے منصوبوں اور خیالات کو پیش کرنے
کی جرأت کروں گا۔

آج میرے لئے اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
کے لئے بڑے فخر اور خوشی کا دن ہے۔ کیونکہ اس کانفرنس
نے پاکستان میں پچیس ۲۵ سال خدمت کرنے کے بعد یہ
جلسہ کیا ہے جس میں ایک ایسے وفاقی وزیر تشریف
لائے ہیں جن کی ہمارے کام اور مقصد کے لحاظ سے
بہت زیادہ اہمیت ہے۔

آپ کی تشریف آوری میرے لئے ذاتی طور پر
بھی خوشی کا باعث ہے۔ میں آپ کو اس وقت سے جانتا
ہوں جب سے آپ نے وکالت شروع کی تھی۔ آپ کی
قابلیت کا ذکر میں آپ سے اور آپ کے والد صاحب
مرحوم سے بھی کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر قسم کی
صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔ اور آپ کی ترقی سے مجھے
دلی مسرت ہے۔

آپ کا ہمارے اس جلسہ میں موجود ہونا ہمارے
لئے آپ کی ذاتی مہربانی اور حکومت پاکستان بلکہ
وزیر اعظم بھٹو صاحب کی تائید کی علامت ہے جس سے
ہماری امیدیں تازہ اور پائیدار ہوئی ہیں۔ جہاں
آپ کی موجودگی پر ہم کو فخر ہے وہاں یہ بھی عرض کردوں
کہ آپ جس کانفرنس میں تشریف لائے ہیں وہ آپ کے
شایانِ شان بھی ہے۔

جناب پیرزادہ صاحب۔ آپ جس کانفرنس کے
جلسہ کا افتتاح فرما رہے ہیں، یہ وہی کانفرنس ہے
جس کی بنیاد فخرِ ملت اور محسنِ قوم سر سید احمد خاں کے
ہاتھوں سے رکھی گئی تھی، اور پاکستان میں ۱۹۵۲ء
۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء میں اس کے سالانہ اجلاسوں کی
رسم افتتاح مرکزی وزرائے تعلیم کر چکے ہیں۔ اس
وقت آپ اسی سلسلہ سے وابستہ ہیں۔ مزید خصوصیت
آپ کی یہ ہے کہ آپ جواں سال اور جواں فکر ہیں۔
آپ جس کانفرنس کے ایک خاص الخاص جلسہ کے
آج مہمانِ خصوصی ہیں۔ اس کے سالانہ اجلاسوں کی
صدارت جو اکابر کر چکے ہیں۔ اُن کے اسماء گرامی آپ
خطبۂ استقبالیہ میں سُن چکے ہیں۔ چند مزید نام یہ ہیں

سرسید کے دست راست مولوی سمیع اللہ خاں نواب
عمادالملک سید حسین بلگرامی، سر مہاراجہ آف محمود آباد،
علامہ یوسف علی۔ سر محمد شفیع۔ سر عبدالرحیم سر شیخ
عبدالقادر۔ ان کے علاوہ اور بہت سے قوم کے چاہنے
والے اور ملت کا درد اپنے دل میں رکھنے والے اُن
کے صدر رہ چکے ہیں۔

قوم کے ان محسنوں کے ناموں کو گنوانے
سے میرا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ حاضرین جلسہ پر یہ
ظاہر کردوں کہ نہ صرف اس کانفرنس کی بنیاد قوم
کے ایک عظیم خیر خواہ نے رکھی تھی۔ بلکہ ہر زمانے میں
اس کو مسلم قوم کے بہترین دل و دماغ رکھنے والوں
نے اپنے علم اور تعاون سے مضبوط کیا ہے۔ یہ
کانفرنس سب دردمندانِ قوم کو خراجِ تحسین
بھی ادا کرتی ہے اور ان کے تعاون کی سدا
آرزومند رہتی ہے

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سرسید احمد خاں
نے اس کانفرنس کی داغ بیل علی گڑھ کالج قائم
کرنے کے بعد ڈالی تھی۔ کیونکہ اسکول، کالج اور
یونیورسٹیاں قوم کی جو خدمت کرتی ہیں وہ اور ہے
اور اس کانفرنس کا وجود جس غرض سے ہے وہ بالکل
علیحدہ ہے۔ اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں میں
تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر قوم کی دلچسپی تعلیم میں پیدا
کرنا، قوم کے مزاج اور اس کی ضرورت کو اسی
کے حال میں رہ کر معلوم کرنا اور تعلیم کو قوم کی ضرورت
کے مطابق کرنے کی راہیں سوچنا علیحدہ بات ہے۔ اس
لئے اس کانفرنس کی ضرورت اور اہمیت میں اس
بات سے کوئی فرق نہیں آیا کہ اب ہمارے ملک کی
تقریباً ساری تعلیم گاہیں قومیائی جا چکی ہیں بلکہ ایک
لحاظ سے اب اس کانفرنس کی ضرورت و اہمیت اور
بھی بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ پہلے قوم کی تعلیم گاہیں خانگی
ہاتھوں میں تھیں تو حکومت ان کی نگرانی کرتی تھی۔ اب
سرکاری محکموں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اس لئے ان محکموں
کو قوم کے تعاون کی ضرورت ہے۔

البتہ اب اس کانفرنس کا کام پہلے سے زیادہ
مخصوص ہو گیا ہے۔ پہلے یہ کانفرنس اسکولوں اور کالجوں
کے کھلوانے کی جستجو کرتی تھی۔ خود بھی اسکول اور کالج
کھولتی تھی۔ اور چلاتی تھی۔ پاکستان کے قیام کے بعد
بھی اس کانفرنس نے سرسید گرلس کالج قائم کیا
اور نمایاں نیک نامی کے ساتھ اس کو چلایا۔ یہ
عمارت جس میں یہ جلسہ ہو رہا ہے اسی کالج کی ہے۔ اس
سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ کتنا بڑا اور کیسا کامیاب
کالج تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس کی اساتذہ
اور طالبات قوم کا درد اپنے دلوں میں اور تعلیم کا شوق
اپنے عمل میں رکھتی تھیں۔ شاید کوئی کالج ملک میں
ایسا ہو کہ جب ایک دفعہ کئی مہینوں تک تنخواہیں دینے
کے لئے روپیہ نہیں تھا تو ساری اساتذہ نے مل کر یہ
فیصلہ کیا کہ جب تک ممکن ہوگا بغیر تنخواہ کے پڑھائیں گے۔
اسی کام کو کرنے کے لئے بہت سی ذہنی کوششوں
کے علاوہ لاکھوں روپیوں کا چندہ کرنا پڑتا تھا۔ اب
بحمداللہ اس محنت اور مشقت کی ضرورت نہیں رہی۔

اب یہ کانفرنس اپنی ساری توجہ اور سارا
وقت تعمیر ملی کی دوسری اہم خدمات میں صرف
کرسکتی ہے اور صرف کرنا چاہتی ہے۔ ان خدمات
کا مختصر ذکر ڈاکٹر فرید الدین بقائی صاحب نے کیا ہے
مگر میں بھی عرض کردوں کہ پچھلے پچیس ۲۵ سال میں اس
کانفرنس نے درجنوں کتابیں تصنیف اور تالیف کرائی
ہیں۔ جن کے مضامین تعلیم، اصولِ تعلیم، تاریخ تعلیم
مذہب، تاریخ، تمدن، معاشیات وغیرہ ہیں۔ ایک
اچھا کتب خانہ قائم کیا ہے۔ ایک ریڈنگ روم جاری
ہے۔ جس میں روزانہ اخبار بینوں اور کتب بینوں کا
ہجوم رہتا ہے۔ ایک اعلیٰ معیار کا "العلم" نامی سہ ماہی
رسالہ جاری ہے جس نے ملک کے اہل علم میں مقبولیت
حاصل کی ہے، اس کا جوبلی نمبر شائع ہوچکا ہے۔
آپ صاحبان اس کو ملاحظہ فرمائیں اور جانچیں کہ اس
میں تعلیم، تہذیب، تاریخ اور مذہبیات کا قابلِ قدر
ذخیرہ ہے یا نہیں۔

ایک اور سمت ہے جس میں اب اس کانفرنس
کی خدمت کی ضرورت نہیں رہی، اس کے ساتھ دوسری
سمت میں خدمت کرنے کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ
گئی۔ جس سمت میں ضرورت نہیں رہی وہ یہ ہے کہ
پاکستان کے قیام تک ساٹھ سال تک ہر سال اس
کانفرنس میں اعلیٰ درجے کے خطبات اور پُرمغز تقاریر
اس مضمون پر ہوتی رہیں کہ انگریزوں کی حکومت
اور برادرانِ ملک کی بے رخی اور رخنہ اندازی سے
بچاؤ کس طرح کیا جائے۔ اور تعلیمی اداروں کے قائم
کرنے اور چلانے والوں کو کیا ہدایت دی جائے۔ مگر
اب خدا کے فضل سے اپنی حکومت ہے۔ اور تعلیمی ادارے
اس کے ہاتھ میں ہیں۔ چنانچہ اب حکومت کی شکایت
کی ضرورت ہے اور نہ محکمۂ تعلیم کو ہدایت دینے کی۔ مگر
اس وقت بڑی اہم ضرورت یہ ہے کہ حکومت جو خدمت
انجام دے رہی اس میں اس طرح مدد کی جائے
کہ جس معلومات کی ضرورت ہے یا جس رُخ پر کمی ہے
اس کے لئے ذخیرہ علم مہیا کیا جائے۔ مثلاً اردو زبان
کو آسان سے آسان بنا کر سارے ملک میں لسانی ایکا
پیدا کرنا، تہذیب و تمدن میں مقامی اختلافات کے ساتھ
یک رنگی لانا، طالب علم اور استادوں میں علم کی محبت
پیدا کرنا اور ان کو جتانا کہ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں
کو زندہ علم کا سرچشمہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ یہ اینٹوں اور
پتھروں کے مقبرے نہ ہوں۔ اور وہاں طالب علم اور استاد
محض فاتحہ خوانی کرنے نہ جایا کریں۔

یہ بہت بڑا کام ہے اور اس کے لئے لاکھوں روپئے
کی ضرورت ہے۔ مگر اس ضرورت کے لئے بہت کم مخیر
حضرات روپیہ دینے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ چونکہ اس کام
میں کوئی چیز در اور دیوار کی طرح بن کر تیار نہیں ہوجاتی
جو ہر کس و ناکس کو آنکھوں سے دکھائی دینے لگے۔ اس
کام میں کانفرنس کے لئے بڑی مشکل کا سامنا ہے۔
ادھر حکومت نے اپنی گرانٹ کو بڑھانے کی بجائے
سنہ ۱۹۶۴-۶۵ء اور سنہ ۷۱-۷۲ء سے کم کردیا۔ اُدھر یہ کام
بہت مہنگا ہے۔ کیونکہ یہ کام کچی پکی باتوں سے نہیں بلکہ
مہارتِ خاص اور نظرِ عمیق چاہتا ہے۔ جو نہ سستی چیزیں

ہیں اور نہ ان کو سستا سمجھنا چاہیئے۔

یہ کانفرنس حکومت کی یہ خدمت بھی کرنے کے لئے آمادہ ہے کہ تعلیم، تدریس، تاریخ، المدن، مذہبیات کے سلسلہ میں جس قسم کی کتابوں کی ضرورت محسوس ہو، اس کی نشاندہی کی جائے تو اس قسم کا ذخیرۂ معلومات اور مواد جمع کرکے پیش کرے یا اس قسم کی کتابیں تصنیف اور تالیف کرائے جن کی ضرورت ہے۔ یہ کانفرنس اس کی قائل نہیں ہے کہ اپنی مرضی سے درسی کتابیں تیار کرے اور پھر دربدر پھرے کہ للہ ان کو نصاب میں داخل کر لیجیئے۔ اس سے زیادہ باوقار طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس قسم کی خدمت حکومت کو قوم کی تعلیمی فلاح کے لئے درکار ہو اس کو حسب نشاندہی سرانجام دیا جائے۔

اس مرحلہ پر پہنچ کر میں کانفرنس کی طرف سے چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اخبارات کی اطلاع کے مطابق حکومت پاکستان اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ تعلیم کو اور زیادہ عام کرنے اور بڑھانے کا جو منصوبہ بنایا گیا تھا اس میں کمی کی جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت کے سامنے انتظامی دشواریاں بھی بہت سی ہیں اور تعلیم پر حکومت کا خرچ بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ مگر حکومت کے خرچ بڑھ جانے کے یہ معنیٰ نہیں کہ تعلیم پر اس وقت جو کچھ خرچ ہو رہا ہے وہ پہلے سے بہت زیادہ ہے بلکہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ قوم کے دردمند لوگ جس بوجھ کو اٹھا رہے تھے وہ سارا بوجھ اسکولوں اور کالجوں کے قومیائے جانے سے حکومت پر پڑ گیا۔ اس کے علاوہ انتظام پر جو خرچ ہوتا ہے وہ اب بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ پہلے جو شکائتیں پرائیویٹ تعلیم گاہوں سے ہوتی تھیں اب ان کا رخ بھی حکومت کی طرف ہو گیا ہے۔ کیونکہ ہمیشہ حکومت سے امیدیں زیادہ ہی کی جاتی ہیں۔

شکائتوں کا تجزیہ تو بیکار ہے۔ مگر ایک انتظامی کمزوری ہے جس کے بہت برے نتیجے نکل رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل ادارہ کا سربراہ ہوتا ہے۔ اگر اس کو انتظام۔ ضروری خرچ باز پرس کرنے۔ تنبیہ کرنے۔ چھٹی دینے یا نہ دینے قائم مقام استاد مقرر کرنے یا نہ کرنے۔ طالب علموں کو داخل کرنے یا نہ کرنے کا کاغذی نہیں بلکہ عملی اور موثر اختیار نہ ہو تو وہ افسر نہیں بلکہ ایک مسکین اور معذور شخص ہو جاتا ہے اور پھر اس کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ

گر بیکارم و باکارم چوں مد حباب اندر

کا وظیفہ ورد زباں کرے۔ طالب علموں، استادوں، عمارتوں اور فرنیچر میں جو خرابیاں ظاہر ہو رہی ہیں وہ سب کو نظر آ رہی ہیں۔ اگر میں ان سے انکار کروں تو لوگوں کے ذاتی تجربے مٹ نہیں جائیں گے۔ البتہ نہ لوگوں کی آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ اس لئے عرض ہے کہ ان کا علاج کرنا ضروری ہے اور تعلیمی اداروں کے سربراہوں کو کاغذی نہیں بلکہ حقیقی اختیار دیا جانا چاہیئے۔ البتہ ان کو نتیجہ کا ذمہ دار ٹھہرانا چاہیئے

اس طرح تو حل نکلے گا ورنہ بات دفتروں کے کمروں
اور کاغذوں کے صفحوں میں چکر کھاتی رہے گی۔
طالب علم دبی اور کھلی سفارشات کے لئے دوڑتے
رہیں گے۔ عمارتیں اور فرنیچر خستہ ہوتا رہے گا۔ ابھی
وقت ہے کہ حالات پر قابو پا لیا جائے۔ پھر عرصہ بعد
سودا بہت مہنگا ہو جائے گا۔ اس لئے آپ کی اجازت
سے انگریزی کی وہ کہاوت دہرا دوں کہ

"A STITCH IN TIME SAVES NINE."

پیرزادہ صاحب۔ آپ خوب واقف ہیں کہ
اچھی تعلیم کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز اچھے
استاد ہیں۔ اور وہی لوگ بہترین استاد نہیں ہوتے
جن کے ناموں کے ساتھ بہت سی ڈگریاں لگی ہوئی
ہیں۔ بلکہ وہ ہوتے ہیں جو طالب علموں کو اپنی اور
قوم کی اولاد سمجھیں، ان کے لئے تکلیف برداشت
کریں۔ جن کے دلوں میں قوم کی محبت اور جن کے
کردار میں علم کا شوق ہو۔ یہ درست ہے کہ ایسے استاد
بہت کم میسر آتے ہیں۔ مگر یہ خوبیاں پیدا بھی کی جا سکتی
ہیں۔ اس منزل میں پہلا قدم یہ ہے کہ اگر ہو سکے
تو تقرر کے وقت ورنہ ترقی دیتے وقت اُن استادوں
کی قدر کی جائے جن کے دلوں میں قوم کی محبت
اور جن کی زندگیوں میں علم کے شوق کی گرمی ہو۔

دوسری عرض یہ ہے کہ نوجوانوں اور نئے
تعلیم یافتہ حضرات کے دلوں میں مذہب سے جو بدگمانیاں
ہیں ان کو دور کرنا چاہیئے۔ یہ کام بہت اہم ہے۔
ایک حد تک اس کا علاج عربی زبان سے واقفیت
پیدا کرنے سے ہو سکتا ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ
عرب نوجوان خود کھوئے ہوئے ہیں۔ ایک عرب نوجوان
شہزادہ نے شاہ فیصل بن سعود کو قتل کرنے کے بعد
اس کی جو وجہ بتلائی وہ عبرت انگیز ہے۔ جب کہ مکہ معظمہ
اور مدینہ منورہ کے رہنے والے نوجوان ایسے ہو سکتے
ہوں تو ظاہر ہے کہ نوجوانوں کے تردد کو دور کرنا کتنا
ضروری کام ہے۔

اس کیفیت کا اصل علاج یہ ہے کہ اسلام
کی معرفت کو نئے انداز، نئے الفاظ، نئے استعاروں، نئے
تشبیہوں اور مثالوں سے پھیلایا جائے۔ تاکہ صداقت
فرسودہ نہ نظر آئے۔ یہ ایسی بات ہے کہ جیسے ایک نگینہ
کو مخمل کے کیس میں رکھ کر پیش کیا جائے تاکہ وہ دلکش
بھی ہو۔ نہ اس کو ایک فرسودہ تھیلی میں سے نکال کر
چٹکی میں پکڑ کر دکھا دیا جائے۔ ایسے جوہر شناس
کم ہوتے ہیں جو نہ ہاتھ کو دیکھیں اور نہ تھیلی کو بلکہ نگ
کی اصلیت کو پہچان جائیں۔ ہاں جب رواج تھیلی ہی
کا تھا تو اس وقت یہ فرق بھی نہ تھا۔ اس کام میں
یہ کانفرنس دین کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ اگر اس
سلسلہ میں کسی خاص جہت کی نشاندہی کی جائے تو کام
میں سہولت پیدا ہو گی۔

تیسری عرض آپ سے یہ ہے کہ کانفرنس کا کام
خدمت کرنا ہے۔ قوم کا کام اچھی خدمت کی قدر
کرنا ہے۔ وزیروں اور حکومت سے مدد اور تعاون کی
امید ہوتی ہے۔

میری طرف سے فروگذاشت ہوگی۔ اگر میں سید الطاف علی بریلوی صاحب کی خدمت کو نہ سراہوں۔ وہ اس کانفرنس کے روح رواں ہیں۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اس کی خدمت کے لئے وقف کردی ہے۔ اور اس کے عشق کے سوا ان کو کوئی اور لگن نہیں ہے۔

میں یہ بھی اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ حسن علی عبدالرحمٰن صاحب نے ۱۹۵۱ء سے اب تک ہر اچھے اور برے وقت میں کانفرنس کا ساتھ دیا ہے۔

آخر میں میں دوبارہ جناب پیرزادہ صاحب کا خاص طور اور سب حاضرین کی شرکت کا دل سے ممنون ہوں۔

*

یہاں تک جناب قدیرالدین صاحب کی تقریر مطبوعہ تھی۔ اس کو پڑھنے کے بعد آپ نے انتہائی مؤثر انداز میں اہم مسائل تعلیمی پر مزید روشنی ڈالی اور ایسی ایسی کارآمد باتیں کہیں کہ ان سے ہر طبقہ و خیال کے سامعین حد درجہ متاثر ہوئے۔

تقریر مہمانِ خصوصی

کانفرنس کے صدر جسٹس قدیرالدین صاحب کی تقریر کے بعد مہمانِ خصوصی جناب عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب نے جلسہ سے خطاب فرمایا۔ آپ کی فاضلانہ اور فصیح و بلیغ درج ذیل تقریر کو جو برجستہ اور زبانی تھی مختلف اخبارات کی رپورٹوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

موصوف نے جسٹس قدیرالدین احمد صاحب اور شریک جلسہ خواتین و حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ سب سے پہلے میں آپ کا نہایت شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی اور سلور جوبلی کے موقع پر مجھے یاد فرمایا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ روایتی نہیں ہیں۔ آج آپ کے صدر جسٹس قدیرالدین نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے کھل کر بنیادی مسائل اور بنیادی باتیں کی ہیں جن کے لئے میں ان کا شکرگزار ہوں ـــ میں خود بھی ایسے موقع کا منتظر تھا کہ کھل کر بات ہوسکے۔

آپ نے ان باتوں کا ذکر کیا جن کی بابت شبہات پیدا نہیں ہوسکتے۔ اور نہ ہی کوئی تضاد۔ کچھ ایسے حلقے بھی تھے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ جب عوامی حکومت تعلیم کو قومیا چکی ہے تو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس میں کیوں شریک ہو رہے ہو۔ لیکن میرے عمل میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ عوام کے ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہر شعبے کی جو حکومت خدمت نہ کرے وہ حکومت نہیں ہے۔ آپ تو دانشور ہیں۔ آپ نے خدمات انجام دی ہیں۔

یہ کہنا کہ ہمیں تعلیمی مسائل میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو یہ زمانۂ سابق میں غیرملکی آقاؤں کی وجہ سے ہے اس وقت بھی مرد مجاہد اٹھے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ پاکستان بنا تو جو نظام تعلیم ورثہ میں ملا وہ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے نہ تھا۔ غیرملکی سامراج کے فائدہ کے لئے تھا۔ اس نظام نے ہمیں زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ تعلیم قومی نظریئے کے مطابق نہ تھی۔

آئین بنے لیکن قومی سطح پر کسی حکومت نے تعلیم کے معاملہ میں اپنی ذمہ داری پوری نہ کی۔ ہماری حکومت نے آگے بڑھ کر ان امنگوں کو پورا کیا۔ ہمیں کسی کی ذات سے اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ کچھ اصولوں پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ کیا عوامی حکومت کا یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ قوم کے بچوں کی تعلیم کا سب سے زیادہ خیال رکھے۔ اس وقت دو ہزار کروڑ روپیہ کا افراط زر ہے۔ سارے ہی پسماندہ ممالک اس مشکل سے گذر رہے ہیں۔ لیکن مالی مشکلات ہمیں راستے سے نہ ہٹا سکیں گی۔ ہاں کچھ وقت ضرور لگے گا۔ ہمیں اسکول کی تعلیم ہر گھر تک پہونچانا ہے۔

جناب پیرزادہ صاحب نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد کو بھی لائق تحسین و ستائش قرار دیا کہ اس نے ملک میں جہالت کا خاتمہ کرنے اور علم و تعلیم کی مشعل روشن رکھنے کے لئے تعمیری انداز فکر کے ساتھ جس نیک کام کا آغاز آج سے برسہا برس پیشتر شروع کیا تھا وہ اُسے بغیر توقف اور تامل کے آج بھی جاری رکھے ہوئے ہے اور اُسے ایسے تجربہ کار اساتذہ، اہل دانش اور ماہرین تعلیم کی خدمات حاصل ہیں جن سے ملک کے تعلیمی نظام کی تشکیل نو میں خاطر خواہ مدد لی جا سکتی ہے۔ اور وفاقی وزارت تعلیم اس مشکل مہم میں کانفرنس کا تعاون حاصل کرنے کی یقینی طور پر کوشش کرے گی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ۱۹۷۸ء تک تعلیم عام کرنے کی غرض سے اسّی ہزار پرائمری اور لوئر سکنڈری اسکول قائم کئے جائیں گے۔ ان نئے اسکولوں پر اس قدر خطیر رقم صرف ہوگی کہ تنہا صوبائی حکومت اس کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ ورنہ ان کے ترقیاتی کاموں کے پروگراموں پر نقصان دہ اثر پڑے گا۔ اسی لئے مرکز کی طرف سے اعلیٰ تعلیم کے لئے جو بھاری امدادی رقم دی جاتی ہے۔ وہ بھی لامحدود طور پر اور لامتناہی مدت تک جاری نہیں رکھی جا سکے گی۔

ٹرینڈ ٹیچروں کی کمی کو پورا کرنے کے بارے میں پیرزادہ صاحب نے انکشاف کیا کہ وفاقی حکومت نے نئے نصاب کے مطابق ٹیچروں کو ٹریننگ دینے کے لئے اسلام آباد میں ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ہے۔ اسی طرح درجہ اول سے درجہ سوئم تک نئے نصاب کو جاری کیا جا رہا ہے۔ بیورو آف کریکیلم کے تیار کردہ اس نصاب میں قومی نصب العین اور ٹیکنیکل فکر پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔

مسٹر پیرزادہ نے اعلیٰ تعلیم کو اہلیت کی بنیاد پر دئے جانے کی پُرزور وکالت کی اور کہا کہ ہمارا جیسا غریب ملک اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا' فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے والوں کے ملک سے باہر جانے کے رجحان پر بھی موصوف نے اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم بہت زیادہ روپیہ خرچ کرکے انہیں پڑھاتے ہیں۔ اور وہ ہمارا استحصال کرکے ترقی یافتہ ملکوں میں نوکری کرتے ہیں۔ یہ صورت حال ختم ہونی چاہئیے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سے پیرزادہ صاحب نے اپیل کی کہ ملک میں تعلیم عام کرنے کے منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے قدم آگے بڑھائیں۔

انہوں نے انجینرنگ اور میڈیکل کالجوں میں تمام فرسٹ ڈویژنوں کی طرف سے داخلہ بطور حق حاصل کرنے

کے مطالعہ پر بھی اظہار تاسف کیا۔ اور فرمایا کہ پھر جب وہ ڈاکٹر اور انجنیر بن جاتے ہیں تو دوسری قوموں کی ملازمت کرنے چلے جاتے ہیں، اگرچہ مسلم ملکوں کو اپنے جوہر قابل دینے میں ہم ضرور مدد کر سکتے ہیں۔

وزیر موصوف نے نہایت تفصیل سے قومی تعلیمی پالیسی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس امر سے آگاہ کیا کہ عنقریب ایک "نیشنل کونسل آف ایجوکیشن" قائم کی جائے گی جو عوامی حکومت کی تعلیمی اسکیم پر موثر عمل درآمد کے لئے رہنما پالیسیاں مرتب کرے گی، اس خصوص میں آپ نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی دعوت دی کہ وہ تعلیمی اسکیم کے مقاصد کے حصول میں اپنی قیمتی خدمات کو بروئے کار لائے۔ اس "ایجوکیشنل کونسل" میں کانفرنس کو نمائندگی دی جائے گی۔ نئے نصاب کے لئے مختلف تجاویز اور مشوروں میں بھی کانفرنس کو شریک کیا جائے گا۔ نیز نیشنل بک فونڈیشن کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ کانفرنس کا تعاون حاصل کرے۔

جناب پیرزادہ صاحب نے کانفرنس کی مالی مشکلات پر قابو پانے کے لئے اعلان فرمایا کہ سال رواں ۷۶-۱۹۷۵ء میں ایک ایڈ ہاک گرانٹ دی جائے گی اور اس کی ریکرنگ (متوالی) گرانٹ کو بھی از سر نو پرانی سطح پر بحال کر دیا جائے گا۔ ان اعلانات و مواعید پر حاضرین جلسہ نے پُر جوش تالیاں بجائیں۔

مسٹر پیرزادہ نے مزید فرمایا کہ اسکولوں میں فنی تعلیم عام کی جائے گی۔ اور ہر اسکول کے ساتھ ایک ورکشاپ یا زرعی فارم بھی ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ قومی تعلیمی پالیسی کی روشنی میں تین سال کی محنت کے بعد جو نصاب تیار کیا گیا ہے اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ فنی تعلیم کے ساتھ پاکستان کے بنیادی نظریہ کی تعلیم بھی دی جائے اور ان اداروں سے نکلنے والے طالب علم قومی تقاضوں کے سا[illegible]تھ قومی مقاصد سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ یہ نصاب بتدریج نافذ کیا جائے گا۔ جس کے دائرہ کو وسیع کیا جاتا رہے گا۔

مالی مشکلات کے ضمن میں پیرزادہ صاحب نے فرمایا کہ تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے دسویں حصہ کو بھی اس طرح تعلیم دینے کے لئے ۴۶ کروڑ روپیے کی ضرورت ہے۔ لیکن حکومت نے اپنے منشور کے مطابق اس ذمہ داری کو قبول کیا ہے او[ر] مالی مسائل حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہمارا نظریہ ہے کہ بے مقصد تعلیم ختم کر کے بامقصد تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ اور ملت کے ہر فرد کے دروازے تک تعلیم کو پہونچایا جائے۔ چنانچہ آج حکومت بطور پالیسی حسن ابدال اور کیڈٹ کالج پشاور جیسے کالجوں میں بھی بیس فیصد کسانوں کے بچوں کو مفت داخلے دینے کا انتظام کر رہی ہے۔

پاکستان کے وزیر تعلیم جناب عبد الحفیظ پیرزادہ نے اس موقع پر ملک کے تعلیمی مسائل کے بارے میں اتنی تفصیل کے ساتھ پچاس منٹ تک تقریر کی کہ اسے اس موضوع پر ایک سیر حاصل جائزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ موصوف نے ماہرین تعلیم کے اس صدق دلانہ جذبے کی بھی تعریف کی کہ انہوں نے نہایت صاف گوئی سے

تعلیمی مشکلات اور مسائل کی نشاندہی کی اور ماضی کی طرح وہ آج بھی فروغ تعلیم کے لئے قابل قدر احساسات رکھتے ہیں۔

تقریر سپاس جناب سید حسین امام صاحب

مہمان خصوصی کی فاضلانہ اور فکر انگیز تقریر ختم ہوئی تو پروگرام کی آخری کارروائی تقریر سپاس تھی، یہ خدمت عالیجناب سید حسین امام صاحب نے انجام دی۔ موصوف آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے نائب صدر ہیں۔ آپ نے جناب عبدالحفیظ پیرزادہ کی تشریف آوری پر اظہار شادمانی کرتے ہوئے اُن اعلانات کا خصوصی شکریہ ادا کیا جو موعودہ مالی امدادوں سے متعلق تھا۔ آپ نے فرمایا کہ ہماری کانفرنس جس نے تعلیمی اور ثقافتی میدان میں پچیس سال سے مسلسل نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اُس کو ضروری اخراجات پورے کرنے کی پریشانی نہ ہونی چاہئے۔ ہمارے ملک میں کئی ایک ایسے ثقافتی ادارے ہیں جن کو بافراط روپیہ مل رہا ہے۔ اتنی افراط سے کہ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کس طرح صرف کریں۔ ہمیں کسی سے رشک و حسد نہیں ہے۔ صرف انصاف و ہمدردی کے طالب ہیں۔ ہمارا ادارہ ہر قسم کے جماعتی ساز باز اور سیاست کاری سے ہمیشہ دور رہتا ہے۔ اس کے دروازے تمام طالبانِ علم کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ اور ہم کبھی یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے استفادہ کرنے کا خواہشمند کس نسل، خاندان، علاقہ یا عقیدہ کا ہے۔ ہماری نگاہ میں سب پاکستانی برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہمارا یہ نظریہ عوام و خواص میں بے حد مقبول ہے۔ ملک کے ہر حصہ کے لوگ ہمارے ممبر ہیں۔ آج کے اجتماع ہی پر نظر ڈالنے سے میرے اس بیان کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

—— فی زمانہ جبکہ ہر طرف افتراق و اختلاف کی ہوا چلی ہوئی ہے۔ آپ سب خواتین و حضرات کو ہمارے ادارہ کے پُرسکون وجود کو بسا غنیمت سمجھ کر اس کی زیادہ سے زیادہ امداد کرنی چاہئے۔ چونکہ وقت کافی ہو گیا ہے۔ اس لئے میں مہمانِ خصوصی جناب عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب اور آپ سب کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اختتام اجلاس اور چائے نوشی

مولوی سید حسین امام صاحب کی پُر اثر آخری تقریر کے بعد اختتام جلسہ کا اعلان کیا گیا۔ جلسہ گاہ سے رخصت ہونے سے قبل جناب پیرزادہ صاحب نے سرسید گرلس کالج لائبریری میں بھی قدم رنجہ فرمایا اور چائے نوش کی۔ یہاں بکثرت لوگوں نے اُن سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ جب تک موصوف موٹر پر بیٹھ کر روانہ نہ ہو گئے مداحوں کا ہجوم انہیں جوق در جوق گھیرے رہا۔ بہت سے گروپ فوٹو بھی لئے گئے۔ قریب دس بجے شب یہ رنگا رنگ صحبت تمام ہوئی۔ اور لوگ اس تمنا کے ساتھ رخصت ہوئے کہ کاش یہ محفل طویل تر ہوتی اور حشر

شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

کا عمل جاری و ساری رہتا ——

افتتاحی اجلاس پر تبصرہ

جشنِ جوبلی کیوں اور کیسے منایا گیا؟

از

جناب جمشید پانی پتی

اک ابر علی گڑھ پہ نمودار ہوا	صد شکر گہر ریز و گہر بار ہوا
یہ جلسۂ قوم پہلے اجلاس بنا	اجلاس کے بعد اب یہ دربار ہوا

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دہلی ۱۹۰۲ء
مولوی امجد علی اشہری مرحوم

انڈین نیشنل کانگریس کو مسلمانوں کے لئے ناموافق پاکر سرسید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ پلیٹ فارم "آل انڈیا اینگلو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" کے نام سے قائم کیا جس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس کا مقصد ہندوستان کے بدحال اور منتشر مسلمانوں کی یکجہتی و ہم آہنگی کا صور پھونکنا، "خوابِ غفلت سے بیدار کرنا" اور از بنگال تا سرحد اور از پنجاب و سندھ تا مدراس و دکن مسلمانوں میں اپنی قومی، اجتماعی تعلیم و ترقی کا احساس پیدا کرنا تھا اور اسی بیداری کے باعث آگے چل کر ملکی سیاست اور تحریک آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو اور ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ "مسلم لیگ" کا قیام اسی کانفرنس کے اجلاس میں عمل پذیر ہوا۔ ملک کے منتخب مشاہیر، اہل الرائے، قائدین اور ارباب علم و فضل نے کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے اجلاس یو۔پی۔ دہلی۔ پنجاب۔ بنگال۔ سندھ۔ بمبئی۔ سی پی۔ مدراس۔ بہار۔ سندھ۔ اجمیر غرضیکہ پورے ہندوستان بلکہ برما تک کے ہر بڑے شہر میں منعقد ہوتے تھے۔

خوش قسمتی سے سید الطاف علی بریلوی صاحب آج سے چالیس سال قبل علی گڑھ میں اس کانفرنس سے منسلک ہوگئے اور تہِ دل سے اس کی خدمت فرماتے رہے۔ پندرہ سالہ خدمات سے سبکدوش ہو کر جب علی گڑھ سے پاکستان تشریف لائے تو اس شجرِ پسندیدہ کی ایک شاخ بھی اپنے ہمراہ

لے آئے۔ اور اپریل ۱۹۵۱ء میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس عروس البلاد کراچی میں قائم کردی گئی۔ آج سید صاحب کی دعوت پر میں بھی اس کی پچیس سالہ سلور جوبلی میں شریک ہوں۔

سید صاحب انتظاماتِ جوبلی میں منہمک ہیں۔ اور میں سرسید کی بڑی سی تصویر کو دیکھ کر مسکرا رہا ہوں کہ حضرتِ سرسید نے اپنے چہیتے سید الطاف علی بریلوی سے ایک اور دلچسپ کام بھی لے لیا۔ یعنی الطاف صاحب تو ۱۹۷۵ء میں سلور جوبلی کے دولھا بنے پھر رہے ہیں اور سرسید نے اپنے اس مدرسے (ایم۔ اے۔ او کالج) کی ڈائمنڈ جوبلی (سو سالہ) منوا ڈالی۔ جو آج سے پورے سو سال پہلے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں قائم ہوا تھا۔ اور جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی صورت میں موجود ہے، وہی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو بقول مولانا کوثر نیازی "پاکستان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی توسیعی حدود کا نام ہے۔" اس مدرسے کے متعلق مولانا حالی فرماتے ہیں:-

"۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جو کہ ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا۔ مدرسے کے افتتاح کی تاریخ قرار پائی تاریخ مذکور پر سرسید بھی بنارس سے علی گڑھ آگئے اور ایک جلسے میں جس کے صدر انجمن مولوی محمد کریم مرحوم ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ تھے۔ رسم افتتاح عمل میں آئی اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہوکر تعلیم شروع ہوگئی۔ مولوی صفدر حسین نے ایک نظم پڑھی جس کے آخری تین شعر جو مادۂ تاریخ سے متعلق ہیں نقل کئے جاتے ہیں۔

تاریخ بھی لکھی ہے وہ ہم نے جس سے حضرت
ہر بات کو ہماری پڑتا لئے ملاکر

ظاہر میں عیسوی ہے باطن میں وہ ہے ہجری
اے سامعین سُنئے للّٰہ دل لگاکر

تھی فکر مجھ کو اک دن تاریخ مدرسہ کی
بولا یہ مُلہم غیب اٹھارہ سے پچھتر
۱۸۷۵   ۱۲۹۲ھ

سید الطاف علی بریلوی اور ان کے معزز رفقائے کار کو بیٹھے بٹھائے جانے کیا سوجھی کہ ایسی شاندار اور رنگا رنگ جوبلی منانے کی ٹھان لی۔ ہزاروں روپے کا خرچ۔ مہینوں پہلے سے انہماک۔ وفاقی وزیر تعلیم وصوبائی رابطہ عالیجناب پیرزادہ عبد الحفیظ اور وفاقی وزیر امورِ مذہبی جناب کوثر نیازی صاحب کو دعوت رونق افروزی اور انتظامات جشن چہار روزہ۔ آخر یہ سب کچھ نہ ہوتا تو نقصان ہی کیا ہوجاتا اور اگر کر رہے ہیں تو فائدہ کیا؟ اس کے متعلق رودادِ جلسہ بیان کرنے سے پہلے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔ کیونکہ صرف رودادِ سلور جوبلی لکھنے یا شائع کرنے سے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی اہمیت کچھ اچھی طرح واضح نہ ہوگی۔ بلکہ عام جلسوں کی سی ایک کارروائی ہوگی جو عام طور پر کافی عرصے غیر مانوس رہتی ہے اور جب منتظمین و شرکا ءاللہ کو پیارے ہوجاتے ہیں تو یہی روداد ایک تاریخی حیثیت بن کر ابھرتی ہے۔

اور قریب پچاس سال گزرنے کے بعد یہ بڑی ہی محبت سے پڑھی جاتی ہے۔

ہم انسان ہیں اور ہر انسان میں اللہ تعالیٰ نے یادداشت، مہر و مروت، وفاداری اور احسانمندی کے جذبات بھی ودیعت فرمائے ہیں۔ سر سید جیسے مربی و محسن دنیا سے چلے ضرور جاتے ہیں لیکن جو آبِ حیات وہ اپنی قوم کو دے جاتے ہیں اس کے ہر گھونٹ پر اگر ان کو یاد نہ رکھا جائے اور کسی نہ کسی بہانے ان کی نیکیوں اور اعمالِ صالحہ کا ذکر نہ کیا جائے تو آنے والی نسلیں گونگی، بہری اور احسان فراموش ہو جاتی ہیں۔ کوزۂ آبِ حیات ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ تشنہ لبی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

کوئی حقیقی اور پُر خلوص محسنِ قوم اپنے محاسن کا اعلان خود نہیں کرتا بلکہ آنے والی نسلیں اس کے احسانات و خدمات کا اعلان کرتی رہتی ہیں۔ اور دہراتی رہتی ہیں۔ تاکہ اس کی تحریر و تقریر جذباتِ ملی، ہمتِ مرداں اور ایثار ہر نسل کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوتے رہیں اور ان محسنین قوم کے ان تذکروں سے نسلاً بعد نسلٍ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور ایسا فائدہ پہونچتا رہے جیسے سورج کی تمازت سے پھولوں کو اور چاند کی پرکشش چاندنی سے سمندر کی لہروں کو۔ پس کسی احسان مند فرد، جماعت یا قوم کے اس پیارے عمل کو "جوبلی منانا" کہتے ہیں۔

سر سید کی شخصیت طوفان، بجلی اور ایک خوشبودار پھول کا حسین ترین امتزاج تھی۔ ان کے کارہائے نمایاں پر ایک طبقے نے خراج تحسین پیش کیا۔ ایک ٹولی نے ہدفِ تنقید بنایا اور کچھ نے دیو مسنے کی بڑ سمجھا۔ اور ایک طبقہ کو نظر ہی نہ آئے اور یہ بھی ایک مسلمہ اصول ہے کہ ہر شخص کو ہر عمل نظر آتا بھی نہیں۔ یہ اپنی اپنی فکرِ رسا اور بصیرت افروزی پر منحصر ہے کہ ہر بات اور عمل کی تہ تک پہونچ کر حتی الامکان کچھ نتیجے اخذ کئے جائیں اور یہ جب ہی ہوتا ہے جب اجتماعی طور پر قومی تفکر بیدار ہو ورنہ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔

چنبیلی کے چھوٹے سے پیڑ اور اس کے ہرے ہرے پتوں میں، بالکل سفید، نہ ورنہ نازک پنکھڑیاں لئے، ہواؤں میں بھینی بھینی دلآویز خوشبو اور مہک لٹانے والا ایک ننھا سا پھول چادرِ شبِ مہتاب پر کچھ اس انداز سے کھلکھلاتا ہے کہ نازک مزاج اور پری رو شہزادیاں بھی جبارت کھینچی کر بیٹھتی ہیں۔ یہ پھول توڑ تو لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ غور نہیں کیا جاتا کہ کھاد اور مٹی کی بدبو دار آمیزش سے غذا حاصل کرنے والے اس پودے کی چھال کے نیچے چھپے ہوئے ریشے اور نسیں کیا کام کر رہی ہیں اور ایک اوجھل اور پوشیدہ نظام کے تحت جڑیں، تنے، ٹہنیاں اور ان میں چھپے ہوئے لاکھوں تار فرائض آبکشی بھی ادا کر رہے ہیں۔ اور اپنے اس عمل کو خوشبوؤں اور رنگینیوں میں منتقل کر کے مرکزِ حسن

کی مانند ایک خوشبودار پھول کی صورت میں نمایاں
بھی کر رہے ہیں۔ ہم اس عمل پر جتنا بھی غور کریں گے۔
ہماری شخصیت اتنی ہی نکھرتی چلی جائے گی۔ اور اس
عطر و عنبر بحرِ زخار میں جتنے ڈوبیں گے ہماری انسانیت
اتنی ہی معطر ہوتی چلی جائے گی۔ سرسید کی شخصیت
ان کے عمل اور چنبیلی کے پیڑ میں کس قدر مماثلت ہے۔

ہم باغوں کے چاروں طرف جھاڑ جھنکاڑ بھی
تو دیکھتے ہیں۔ یہ ان ہی باعمل خوشبودار پودوں
کے لاشے ہیں۔ جن کے قریب سے اب ہم دامن سمیٹ کر
نکل جاتے ہیں۔ باسی پھولوں کے گجرے اور ہار بھی
تو دینے میں آتے ہیں جو بے اعتنائی اور بے مروتی
سے پھینک دیئے جاتے ہیں اور بعض بیگمات تو ان
کے چھونے کو بھی بدشگونی اور وجہ زوالِ حسن قرار
دیتی ہیں لیکن یہی مرجھائے پھول اور جھاڑ جھنکاڑ
ایک دن زیبائشِ چمن، جانِ گلستان، وجہ رنگ و بو
اور حسن و عشق کے درمیان وجہ کشش تھے۔

کاش! عطر لگا کر ذہن و دماغ کو معطر کرنے
والے، پھولوں اور گجروں کی مہک سے جوانیوں میں
سرمستیاں اور سرشاریاں پیدا کرنے والے سہرے
کی لڑیوں میں اپنی جوانیوں اور ماؤں کی آرزوؤں
کو تولنے والے۔ مزاروں پر پھولوں کی چادریں چڑھا کر
منتیں مانگنے والے ان مرجھائے ہوئے پھولوں
اور عمر رسیدہ یا خزاں آلود پودوں کو بھی تصور ہی
تصور میں یاد کر لیا کرتے جنھوں نے اپنی ایک ایک
نس کا نچوڑ ان کی خدمت میں پیش کیا اور رنگینیِ

قوس و قزح عطا کی تو تشکر و امتحسان اور اظہارِ خلوص
انسانیت کا فریضہ بہ احسن و خوبی ادا ہو جاتا
اس پیاری سی ادائیگی فرض کو بھی جو ہم
منانا بھولتے ہیں۔

ہماری نظریں آندھی کی بے ہنگم رفتار
اور وقتی توڑ پھوڑ کو بلائے جان سمجھتی ہیں لیکن
ہمیں کیا معلوم کہ طوفان خیز آندھیوں اور بے
تکے بگولوں کے پیچھے پیچھے دبے پاؤں اودی
اودی گھٹائیں اور ننھی ننھی بوندیاں بھی
تو ہوتی ہیں جن کی سرسراہٹ اور گنگناہٹ
میں شادابیِ حیات نو ہوتی ہے۔

برق تپاں کی سوزش، چمک دمک اور
گڑگڑاہٹ بھی تو وقتی طور پر بلائے ناگہانی
آفتِ ارض و سماں معلوم ہوتی ہے لیکن کسی کو کیا
معلوم کہ جب چکا چوند کڑکتی بجلی کی لہریں
سہمے ہوئے انسانوں، درندوں، پرندوں اور
درختوں کو چھوتی ہوئی زمین کی عمیق ترین گہرائیوں
میں اتر کر سیکڑوں میں واپس ہوتی ہیں تو
زمین کی تہوں میں جمادات و نباتات میں خمیر و حیات
میں اور پھول پتوں کی نس نس میں کتنی رنگینیاں
شادابیاں اور قوتِ نمو کی ولولہ انگیز اور حیرت
خیز سامانیاں چھوڑ جاتی ہیں کہ عقلِ انسانی بھی
حیران رہ جاتی ہے جس بدبخت خطہ زمین پر کبھی
بجلی نہیں کڑکتی چمکتی وہ بنجر ہو جاتا ہے، قحط پڑ جاتا

ہے اور انسان بھوکوں مر جاتا ہے۔

اگر آپ سر سید احمد خاں کی آخری پچاس سالہ زندگی کا مطالعہ کریں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ وہ کونسا میدانِ عمل ہے جس میں انہوں نے اسلامیانِ ہند کی رہبری نہیں کی، خوابِ غفلت سے بیدار نہیں کیا اور بیرونی قزاقوں اور اندرونی ترقی یافتہ دشمنوں کے دوش بدوش کھڑا نہیں کر دیا۔ اور وہ کونسی برائیاں، طنز، دشمنیاں اور فتوے باقی رہ جاتے ہیں جو اس محسنِ قوم کو اس کٹھن وقت میں ہمارے اپنوں نے نہ دیئے ہوں۔ لیکن جس طرح غذائی اور خوشبو دار پودے بدبودار کھاد سے غذا اور خوشبو پیدا کر لیتے ہیں۔ اسی طرح سر سید احمد خاں نے اِن تمام لعنتوں سے اچھائیاں پیدا کیں اور مسلمانوں کو قومی شعور اور اجتماعی فکر کا رجحان عطا کر دیا۔

جب امواجِ حیات تصوراتِ فنا سے ٹکرا رہی تھیں، تشنگیٔ سبزہ و گل قطرہ ہائے شبنم کے لئے ترس رہے تھے۔ بچہ بچہ دامنِ اجل سے کھیل رہا تھا۔ مسلمانوں کی ثقافت و تہذیب اور معاشرت کو موت کے پسینے آ رہے تھے۔ حویلیوں اور محلوں کو زمین بوس کیا جا رہا تھا۔ ہفت صد سالہ اعزازات، ذلت و خواری میں تبدیل کئے جا رہے تھے۔ فروغِ روزِ روشن پر شام کے اندھیرے مسلط ہو رہے تھے مسلمانوں کے لئے ہواؤں کی رفتار، سمندر کی موجیں اور دریاؤں کی لہریں ساکت ہو چکی تھیں۔ چمنِ زیست پر گل و بلبل کی جگہ شکرے اور بوم منڈلا رہے تھے۔ سات سو سالہ پرانے محکوم نئے آقاؤں سے ساز باز کر کے زندگی کے ہر شعبے کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے داؤ پیچ میں مصروف تھے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ من حیث القوم مسلمان احساسِ کمتری اور کیفیتِ نزع میں مبتلا تھے۔

سر سید احمد خاں چنبیلی کے پیڑ، طوفانِ باد و باراں اور برقِ تپاں کی مانند اپنا کام کرتے رہے اور اُس الم انگیز اور حسرت خیز دور میں سوختہ بخت مسلمانانِ ہند کو پیغام خوش نصیبی دیا۔ اُس کرم خوردہ ڈھانچے کو جس میں مزید شکست و ریخت کے آثار نمایاں ہوتے چلے جا رہے تھے۔ زندگی اور تازگی بخشی۔

سید الطاف علی بریلوی اور اُن کے ہم مشرب ساتھی تحریکِ سر سید کے عاشقِ جانباز ہیں۔ چمنِ سر سید کے رکھوالے ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں بھی اس شجرِ ثمردار کو "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس" کی صورت میں برقرار رکھا۔ اور پچیس سالہ آبیاری کے بعد جب اس کی ایک ایک شاخ پھل پھولوں سے لد گئی تو "سلور جوبلی" کے بہانے "پھولوں کی نمائش" کا اہتمام کر ڈالا

تاکہ آنے والے آئیں، دیکھیں، لطف اندوز اور مستفید ہوں کہ ۱۸۸۶ء سے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۵ء تک اس چمنستانِ دلپذیر نے کیسے کیسے گلہائے رنگا رنگ اگائے ہیں۔ ان باغوں میں کیسی کیسی بلبلوں نے ترانے گائے ہیں اور خزاں آلود فضاؤں کو بادِ بہاری نے کس انداز سے جشنِ بہاراں میں تبدیل کیا ہے۔

ہمارے یہ دوست آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی پچیس ۲۵ سالہ جوبلی ضرور منا رہے ہیں لیکن تاریخ اسلامیانِ ہند کے گذشتہ اڑسٹھ ورق الٹ کر دیکھیں ۱۹۰۷ء کی اس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سے بھی متعارف کرا رہے ہیں۔ جو آج سے اڑسٹھ سال پہلے ۱۹۰۷ء میں شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی کے زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا۔ اپنی کتاب "علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں"، صفحہ ۲۵۵ پر الطاف بریلوی صاحب فرماتے ہیں:-

"اب سے اڑسٹھ ۶۸ سال پہلے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہمارے صوبہ سندھ اور اسی شہر کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ جس کی صدارت شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی نے فرمائی تھی۔ اجلاس کی دعوت سردار محمد یعقوب صاحب وزیر ریاست خیرپور کی طرف سے دی گئی تھی۔ مگر سردار صاحب انعقادِ اجلاس سے قبل ہی وفات فرما گئے۔ مگر خوش قسمتی سے اس وقت ریاستِ خیرپور کی مسندِ وزارت آنریبل شیخ صادق علی کو تفویض ہوئی جو اجلاس کو کامیاب بنانے کے لئے پوری قوتِ عمل کے ساتھ آمادہ ہو گئے۔

اجلاس کے لئے ایم جیون جی کے پُرفضا باغ میں کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ یہ جگہ کراچی کی بہترین تفریح گاہ تھی۔ کیمپ میں ہر صوبے کے نمائندوں کے لئے علیحدہ علیحدہ قیام گاہوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہر کیمپ کے وسط میں ایک بڑا شامیانہ بطور ڈرائنگ روم آراستہ تھا جو باہمی ملاقات کے لئے مخصوص تھا۔ کیمپ میں تار گھر، ڈاک گھر وغیرہ کی سہولتیں بھی بہم پہونچائی گئی تھیں۔ کیمپ سے ملحقہ گورنمنٹ گیسٹ ہاؤس بھی مہمانوں کے لئے کھول دیا گیا۔ جب یہ انتظامات بھی مہمانوں کے لئے ناکافی ہوئے تو سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی میں مہمانوں کے قیام کا انتظام کیا گیا۔ (اتفاق دیکھئے ٹھیک پینتالیس سال بعد اسی مبارک مہمان خانے میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی) تیرہ سو ۱۳۰۰ کے قریب مہمان کراچی آئے جن میں علاوہ تمام صوبوں کے حیدرآباد دکن، میسور، رنگون اور برما تک کے نمائندے شامل تھے۔ تمام مہمانوں کی مہمانداری ریاست خیرپور کی جانب سے شبانہ روز نہایت سیرچشمی اور فیاضی کے ساتھ کی گئی۔ سندھ کے کمشنر اور ڈائرکٹر جنرل

اور ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم نے بھی شرکت کی اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

آنریبل شیخ صادق علی نے کانفرنس کے فنڈ میں پانچ ہزار روپیہ دینے کا اعلان فرمایا۔ تین ہزار ہز ہائینس میر خیرپور کی جانب سے اور دو ہزار روپیہ زمینداران سندھ کی جانب سے عطا کئے گئے۔ مولانا حالی نے صدارت فرمائی اور دو بڑی ہی ولولہ انگیز نظمیں پڑھیں مسٹر مرزا قلیچ بیگ صاحب نے بھی ایک استقبالیہ فارسی قصیدہ پڑھا۔

مرزا قلیچ بیگ سندھ کے نامور مصنف مورخ اور شاعر تھے۔ ڈپٹی کلکٹری سے ریٹائر ہوئے تاریخ و ادب کا بڑا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ سندھ کے تاریخی ادب پر بڑی گہری نظر تھی۔ دو جلدوں میں سندھ کی تاریخ لکھی جو نہایت مستند ماخذ پر مبنی ہے۔ قومی کاموں سے ان کو دلچسپی تھی۔ سندھی زبان میں بھی اُن کی متعدد تصانیف ہیں۔ فارسی اور سندھی زبان میں شعر کہتے تھے مرزا قلیچ بیگ کا ۱۹۲۹ء میں انتقال ہوا۔ اس اجلاس میں مرحوم نے کتنی دردانگیز نظم پڑھی اس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:-

مرحبا اے صاحبانِ ہند ذو الفر و وقار
مرحبا اے اہل علم و عقل و حکم و اختیار
شد ز تشریف شما ہم سندہ را حال شرف
شد ز تشریف شما ہم سندیاں را افتخار
می شنیدیم از زبانِ خلق تعریفِ شما
بہر تعظیم شما بس می کشیدیم انتظار
گرچہ با فتح عرب اسلام از ایں جا شد شروع
ہست در اقلیم ہند امروز حال سندہ زار
ماندہ در علم و ہنر پس تر ز دیگر ملکہا
آمدہ در سیم و زر مفلس ترین از ہر دیار
طاقت خدمت گزاری کاش اگر می داشتیم
بر شما بے شک ہمی کردیم گوہر ہا نثار
بیش ازیں لازم نہ باشد عرض احوال اے قلیچ
صاحباں ہم دیں و ہمدرد و غمگیں و غم گسار

علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں
صفحہ ۲۶۷

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور اُس کے شعبۂ نسواں کا عظیم الشان اور حسین ترین شاہکار سرسید گرلز کالج ہے جو ناظم آباد میں واقع ہے۔ اور کراچی میں لڑکیوں کا بہترین کالج ہے۔ اس سلور جوبلی کو منانے کا اہتمام اسی کالج میں ہوا۔ تین دن پہلے ہی سے اس کی عظیم الشان اور بلند و بالا عمارت کو سجایا گیا تھا۔ مغرب کے بعد برقی روشنیوں کے حسین ترین مناظر کسی بادشاہ زادی کی شادی کی دھوم دھام یا "تاج محل کی مون لائٹ" کا سماں پیش کر رہے تھے۔

ہم ۲۷ اگست کی شام کو جب سرسید کالج

کے قریب پہونچے تو کاروں کی لاتعداد قطاروں سے یہ اندازہ ہو گیا کہ سرسید گرلس کالج اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کتنے ہردلعزیز ادارے ہیں۔ اور تو اور پولس کی اتنی تعداد اتنا اچھا انتظام اور مہذب برتاؤ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس تاریخی اور محبت آمیز کانفرنس سے پولیس کو بھی اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا کہ عام دردمند شہری کو۔

آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ سید صاحب کے صاحبزادے اور کارکنانِ کانفرنس گیٹ پر موجود تھے۔ جو سلام اور مصافحوں کے ساتھ ساتھ شخصیتوں کو بھی چیک کر رہے تھے۔ اور حسب مراتب ہر ایک کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ جب گیٹ کے مرحلے سے گزر کر قدم آگے بڑھائیے تو سرسید گرلز کالج کے وسیع احاطے میں داخل ہوتے ہی سجا ہوا دربار دیکھ کر لطف آگیا۔ تاریخی رنگ کی ہزاروں کرسیاں ہلالی دائروں میں اس انداز سے لگائی گئی تھیں کہ منتظمین کی خوش سلیقگی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ کالج کی عمارت اور میدان بقعہ نور بنا ہوا تھا۔

مہمانِ خصوصی کی نشست کے پیچھے سرسید احمد خاں کی بڑی سی تصویر بلندی پہ رکھی تھی۔ سیدھی طرف علامہ اقبال اور وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کی اور الٹی طرف قائدِ اعظم محمد علی جناح اور قائد ملت لیاقت علی خاں کی تصویریں۔ ڈائس کی داہنی جانب فوٹوگرافر اور اخباری نمائندوں کی نشستیں تھیں۔ اور سمت میں خواتین کے لئے صوفے اور قریب دوسری کرسیاں ریزرو تھیں۔ جوق درجوق مہمان آتے چلے جا رہے ہیں۔ اور کانفرنس کی رونق دوبالا ہوتی چلی جا رہی ہے۔ سامنے گیٹ کے قریب کانفرنس کی مطبوعات کی نمائش لگی ہے وہاں بھی کافی لوگ جمع ہیں۔ کتابیں دیکھ اور خرید رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ علی گڑھ کی نمائش کا لطف آ رہا ہے۔ وہ چہل پہل کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ افتتاح کانفرنس کا صحیح وقت ۷ بجے شام ہے ساڑھے سات بج کر بیس منٹ ہو چکے ہیں۔ پیرزادہ صاحب کا بے چینی سے انتظار ہے کہ سید صاحب نے اپنے معزز مہمان ملک جمال اللہ صاحب سکریٹری انجمن فیض الاسلام راولپنڈی سے درخواست کی کہ وہ مسدس حالی کے بند پیش فرما کر حاضرین کو محظوظ فرمائیں یا دھیان بٹائیں۔ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ انہیں پوری مسدس حالی زبانی یاد ہے۔ ۷-۴۰ پر ہل چل سی مچی۔ پولیس بے تابانہ جنبش میں آئی سیٹیاں بجنے کی آوازیں آئیں۔ صدر مجلس استقبالیہ ڈاکٹر فریدالدین بقائی صاحب جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب صدر کانفرنس اور دیگر معزز عہدیداران کانفرنس معزز مہمان کے استقبال کے لئے گیٹ پر موجود ہیں۔ ایک نہایت ہی مہذب اور باوقار جلوس کی صورت میں پیرزادہ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی شگفتگی مسکراہٹ اور حسن و جمال سے پیارا کانفرنس دوبالا ہو گئی۔ حاضرین نے کھڑے ہو کر والہانہ انداز میں استقبال کیا اور پیرزادہ صاحب ڈائس پر تشریف فرما ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد جلسہ کی باضابطہ کارروائی

اجلاس شعبۂ ابتدائی، ثانوی و اعلیٰ تعلیم

افتتاحی اجلاس کے بعد جشن جوبلی کی تقاریب کو چار شعبہ جاتی اجلاسوں اور ایک شاندار محفلِ مشاعرہ پر تقسیم کیا گیا تھا۔ چنانچہ ۲۸ر اگست ۱۹۷۵ء کو صبح ۸½ تا ۱۲½ بجے دوپہر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے یوسف میموریل ہال میں "ابتدائی۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم" کے موضوع پر نشست ہوئی۔ جس کی صدارت کے فرائض جناب ایم۔ آئی میمن صاحب ڈائرکٹر آف اسکول ایجوکیشن کراچی ریجن نے انجام دیئے۔

اس جلسہ میں جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب صدر کانفرنس اور ڈاکٹر فریدالدین بقائی صاحب صدر مجلس استقبالیہ کے علاوہ بڑی تعداد میں ممتاز ماہرینِ تعلیم بالخصوص اسکول اور کالجوں کے سربراہوں اور اساتذۂ کرام نے شرکت کی۔

کارروائی جلسہ کا آغاز تلاوتِ کلام پاک از جناب امین افضل صاحب ہیڈ ماسٹر اشاعتِ اسلام اسکول سے ہوا۔ بعد ازاں سید الطاف علی بریلوی نے اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دیتے ہوئے صدر جلسہ اور مہمان مقررین کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُن کا فرداً فرداً تعارف کرایا۔ بعد ازاں درج ذیل تقاریر ہوئیں۔

تقریر محمد عزیز انصاری
ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ
ہیڈ ماسٹر نبی باغ سکنڈری اسکول کراچی

محترم مہمان خصوصی جناب محمد اسمٰعیل میمن صاحب ناظم تعلیمات اسکولز کراچی۔ جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب صدر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور معززہ حاضرین جلسہ۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے آج کے اجلاس کا موضوع "ابتدائی ثانوی و اعلیٰ تعلیم کے مسائل" ہے اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں صرف ابتدائی تعلیم کے مسائل پر روشنی ڈالوں۔ ابتدائی تعلیمی مسائل کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اولاً وہ مسائل جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ بچوں یعنی طلبہ سے ہے۔ دوئم وہ مسائل جن سے اساتذہ دوچار ہیں اور سوئم وہ مسائل جن کا تعلق حکومت سے ہے۔ ظاہر بات ہے اگر میں ان تینوں طرح کے مسائل کا تذکرہ کروں تو اس کے لئے طویل وقت درکار ہے۔ لہٰذا میں صرف ان مسائل کا ذکر کروں گا جن کا تعلق طلبہ یا اساتذہ سے ہے۔ اور کوشش کروں گا کہ ساتھ ہی ساتھ ان مسائل کا حل بھی تجاویز کی شکل میں دیتا چلوں۔

آجکل والدین اسکول میں داخلہ کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ اور میرے خیال میں یہ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ خود والدین کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اس طرح کہ تمام والدین اپنے بچوں کو کچھ مخصوص اسکولوں میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کراچی ایک بڑا شہر ہے اور تمام بچوں کو چند مخصوص اسکولوں میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ لہٰذا والدین کو زیادہ تر اپنی رہائش کے قریبی اسکولوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

اس ضمن میں ناظم تعلیمات کراچی جناب محمد اسمٰعیل میمن صاحب کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔ جن کی محنت سے یہ مسئلہ اس سال تقریباً حل ہو چکا ہے، لیکن بہرحال ہر سال یہ مسئلہ پیدا ہوتا رہے گا بلکہ اس میں شدت بڑھتی جائے گی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ہاں یہ بات کہنا تو میں بھول ہی گیا کہ ناظم تعلیمات کراچی نے داخلہ کا مسئلہ کس طرح حل کیا اور انہیں اس کے لئے کتنی محنت کرنی پڑی۔ میں مختصراً اس پر روشنی ڈالوں گا۔ جناب ناظم تعلیمات نے کئی بار ان اسکولوں کی فہرست کا اعلان اخبار کے ذریعے کیا جن اسکولوں کی تعداد کثیر ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق تقریباً ایک ہزار ہے اور ان اسکولوں میں داخلوں کی گنجائش معلوم کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ بہرکیف ناظم تعلیمات نے یہ کام کیا جس کے لئے ہم سب کو ان کا شکرگزار ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ موصوف نے دفتر ناظم تعلیمات کے علاوہ مختلف علاقوں کے اسکولوں میں داخلے کے لئے مراکز قائم کئے۔ اور ان کی نگرانی اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود خود کی۔ اور داخلہ کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا۔ لیکن جیسا کہ میں نے بتایا یہ مسئلہ ہر سال پیدا ہوتا رہے گا۔ اور آئندہ چند سالوں میں ابتدائی تعلیم لازمی بھی قرار

دے دی جائے گی۔ لہٰذا داخلہ کا کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے موجودہ اسکولز ناکافی ہوں گے اور حکومت کو نئے اسکول کھولنے پڑیں گے جن کی عمارات کے لئے کثیر رقم درکار ہوگی۔ لہٰذا ایک تجویز پیش خدمت ہے اور وہ یہ کہ کیوں نہ مساجد میں ابتدائی اسکول قائم کرائے جائیں۔ اس طرح نہ صرف اسکولوں کی کمی دور ہو جائے گی بلکہ بچوں کی روحانی تربیت بھی ہوگی۔ ہماری مساجد فجر کی نماز کے بعد سے ظہر تک بالکل خالی رہتی ہیں۔ لکڑی کے عارضی پارٹیشن جن پر بلیک بورڈ نصب ہوں ان کے ذریعہ کئی کلاس روم بن سکتے ہیں۔ اور نماز کے وقت ان پارٹیشنوں کو ایک کنارے کھڑا کر دیا جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ بچوں کا ذہن نازک اور نرم ربر کی طرح ہوتا ہے۔ اور اس وقت جس طرح چاہیں ہم ان کو تربیت دے سکتے ہیں۔ ظاہر بات ہے مسجد میں مدرسے قائم ہو جانے سے نہ صرف بچوں میں بلکہ اساتذہ میں بھی پاکیزگی پیدا ہوگی۔ مسجد میں جانے کی عادت پیدا ہوگی۔ بچوں میں عشقِ الٰہی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ نیز فرنیچر کا مسئلہ بھی پیدا نہیں ہوگا۔ پرانے زمانے میں انہیں مساجد میں مکتب قائم تھے۔ اور ابتدائی تعلیم انہیں میں ہوتی تھی۔ یہی نہیں تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے مدرسے مساجد میں قائم تھے۔ اور ہمارے اسلاف جن کی ہم پیروی کرتے ہیں انھوں نے انھیں مدرسوں میں تعلیم حاصل کی۔

دوسرا مسئلہ جس سے آجکل کے والدین دوچار ہیں وہ ان بچوں کی تعلیم ہے جن کی عمر ۳ تا ۵½ سال کے درمیان ہے۔ اب تک ابتدائی تعلیم سے مراد جماعت اول تا پنجم ہے۔ جس میں ۵ سال کی عمر کے بعد ہی بچے کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں والدین خصوصاً خواتین چاہتی ہیں کہ ان کے بچے تین سال کی عمر کے فوراً بعد ہی اسکول جانا شروع کر دیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی تو خواتین سے معذرت کے ساتھ کہ وہ کم از کم اتنے وقفہ تک تو سکون سے رہیں۔ علاوہ ازیں بچہ جب اسکول میں ہوگا تو کچھ نہ کچھ سیکھے گا۔ دوم یہ کہ والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے جلد از جلد وقت ضائع کئے بغیر زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر لیں۔ اس عمر کے بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت کی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ابتدائی تعلیم سے پہلے کی تعلیم ہے۔ یعنی اسے پری پرائمری تعلیم کہا جائے تو بہتر ہے۔ چونکہ پری پرائمری تعلیم کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ لہٰذا پری پرائمری اسکول لوگ نجی طور پر کھولتے جا رہے ہیں۔ اور تقریباً کراچی کے ہر اچھے علاقے میں اس طرح کے اسکول موجود ہیں۔ جن کو کسی نے کیر سنٹر کسی نے نرسری کسی نے بے بی سنٹر وغیرہ وغیرہ کے نام دئے ہیں۔ یہ سنٹر اسکول کی تعریف میں نہیں آتے۔ لہٰذا حکومت کا ان پر کنٹرول بھی نہیں ہے۔ ایسے اسکول بچوں کو مصروف تو رکھتے ہیں۔ لیکن میں ایک استاد کی حیثیت سے سمجھتا ہوں کہ ان میں بچوں کی خاطر خواہ تربیت نہ ہوتی ہوگی۔ کیونکہ ان پر حکومت کا کنٹرول

نہیں ہے اور وہ ہر بندش سے آزاد ہیں۔ اساتذہ بھی
زیادہ تر غیر تربیت یافتہ ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی
بھرمار تعلیمی مدارس کو قومیانے کے بعد ہوئی ہے اور
گذشتہ تین سالوں سے ٹریننگ اسکولوں میں صرف
باقاعدہ اسکولوں میں پڑھانے والے اساتذہ کو ہی
داخلہ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ تجویز ہے کہ حکومت کسی
آرڈیننس کے ذریعہ ان اسکولوں پر کنٹرول حاصل کرے۔

تیسرا مسئلہ بچوں کی جسمانی صحت سے متعلق ہے۔
ہمارے یہاں ابتدائی مدارس میں بچوں کی جسمانی نشوونما
کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ثانوی اسکولوں میں تو طلبا
کو بہر حال کچھ نہ کچھ طبی سہولتیں حاصل ہیں۔ اور
جسمانی نشوونما کا بھی معقول انتظام کیا جاتا ہے جو طلبا
فنڈ کے نام سے وصول کی جانے والی رقم کی مدد سے
کیا جاتا ہے۔ ابتدائی اسکولوں میں اس قسم کا کوئی
بھی فنڈ وصول کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی
حکومت کی جانب سے ایسا کوئی انتظام ہے کہ جس کے
ذریعہ بچوں کی طبی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ ہم
سب جانتے ہیں کہ توانا ذہن اسی وقت ہوسکتا ہے
جبکہ توانا جسم ہو۔ علاوہ ازیں ابتدائی مدارس میں جو
طلبا آتے ہیں چونکہ ان کے طبی معائنہ کا کوئی انتظام
نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان کی چھپی ہوئی بیماریاں پرورش
تو پاسکتی ہیں، ختم نہیں ہوسکتیں، اس طرح جسم کے
ساتھ ذہن کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ حکومت کو بالعموم
اور ناظم تعلیمات کو بالخصوص اس امر کی جانب توجہ
دینی چاہیئے۔ کراچی کے ایسے اسکول زیادہ تر رہائشی
مکانات میں واقع ہیں جن کے کمرے تنگ و تاریک ہیں۔
یا ایسی بلڈنگوں میں ہیں جہاں کوئی کھیل کا میدان
نہیں ہے۔ اسکول کے ساتھ کھیل کا میدان ہونا لازمی
ہے۔ جہاں بچے کھیل کود سکیں۔ حکومت کو چاہیئے کہ
وہ ہر اسکول یا کئی اسکولوں کا ایک مشترکہ کھیل کا
میدان مہیا کرے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا بعض اسکول
تو ایسے ہیں جہاں داخلوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔
لیکن یہاں ایسے اسکول بھی ہیں جو خالی پڑے رہتے ہیں۔
اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بعض علاقوں میں
اسکولوں کی کمی ہے اور بعض علاقوں میں اسکولوں کی
بہتات ہے۔ بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں اسکول نہیں
ہیں۔ لہٰذا میں ناظم تعلیمات کی توجہ اس جانب مبذول
کرانا چاہتا ہوں کہ وہ اسکول جو خالی پڑے ہوئے ہیں
یا جہاں طلبا کی تعداد بہت کم ہے ان کو ایسے علاقوں
میں منتقل کردینا چاہیئے جہاں اسکولوں کی کمی ہے یا
جہاں اسکول بالکل نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں شاید
حکومت کی کوئی اسکیم بھی زیر غور ہے۔ اور وہ نقصان
سے چلنے والے اسکولوں کی منتقلی اور مدغم کئے جانے کی
اسکیم کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ایک اچھی اسکیم ہے ہمیں
اس کی تائید کرنا چاہیئے۔ اس سے نہ صرف
داخلوں کا مسئلہ حل ہوگا۔ بلکہ چھوٹے اسکولوں پر حکومت
کی جو کثیر رقم خرچ ہورہی ہے اُس سے بڑے اور اچھے
اسکول چل سکیں گے۔ یہ ہی نہیں بلکہ اسکولوں کی کمی
کی عوامی شکایات بھی دور ہوجائیں گی۔ پسماندہ اور

نظر انداز کردہ محلّوں اور علاقوں کو بھی اسکول مل جائیں گے۔

جیسا کہ ناظم تعلیمات صاحب جانتے ہیں۔ کراچی میں ایسے بھی اسکول ہیں کہ جہاں اوسطاً فی طالب علم ایک سو روپے سے دو سو روپے ماہانہ خرچ ہو رہا ہے۔ اور جس کا ہمارا ملک متحمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ایسے مہنگے اسکولوں کو جلد از جلد متمول علاقوں میں منتقل کر دینا چاہئے۔

ایک اور مسئلہ جس کا ذکر والدین کرتے ہیں وہ تعلیمی معیار کی پستی ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری اساتذہ پر عائد کر دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں عرض کروں گا کہ طالب علم صرف چار یا پانچ گھنٹے اسکول میں رہتا ہے۔ جبکہ اٹھارہ سے بیس گھنٹے اپنے والدین کے پاس ہوتا ہے۔ اس بات سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تعلیمی معیار کی پستی کا ذمہ دار کون ہے بلکہ کراچی کی زندگی اتنی مصروف ہے کہ والدین اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کرا کے عہدہ برا ہو جاتے ہیں! انہیں چاہیئے کہ وہ اسکول سے رابطہ رکھیں اور اپنے بچوں کی تعلیم پر کچھ نہ کچھ توجہ ضرور دیں، اس طرح استاد بھی محتاط رہیگا۔ والدین بھی مطمئن رہیں گے۔ اور کسی حد تک تعلیمی معیار کی پستی کی شکایات ختم نہیں تو کم ضرور ہو جائیں گی۔

ایک اور مسئلہ جو غور طلب ہے وہ ذریعہ تعلیم سے متعلق ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ اسکول یا تو اردو میڈیم ہیں یا انگلش میڈیم ــــ تو پائے گئے انگلش میڈیم ذریعہ تعلیم کے اعتبار سے بھی دو قسم کے ہیں۔ (ایک وہ انگلش میڈیم اسکول جہاں تمام مضامین مثلاً حساب، سائنس سوشل اسٹڈیز وغیرہ انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جہاں یہ مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اس طرح تعلیمی معیار میں فرق لازمی امر ہے۔ لہٰذا میں ناظم تعلیمات سے درخواست کروں گا کہ وہ تمام انگلش میڈیم اسکولوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے اقدامات کریں۔

اب تک میں نے جن مسائل کا ذکر کیا ان کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ والدین سے ہے۔ اب ذرا ان مسائل کا ذکر ہو جائے جن کا تعلق اساتذہ سے ہے۔ ابتدائی مدارس کے اساتذہ کا مشاہرہ اتنا کم ہے کہ اچھی لیاقت کے لوگ اس پیشہ کی جانب توجہ نہیں دیتے ــــ کیونکہ قلیل مشاہرہ سے ایک شخص کا گذران ہونا مشکل ہے۔ پرائمری اسکول کے استاد کو تمام الاؤنس ملا کر تقریباً -/۳۰۰ روپے ماہانہ ملتے ہیں ــــ اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ اس ہوش ربا گرانی کے زمانہ میں کیونکر لائق اور اہل لوگ اس پیشہ کی جانب توجہ دیں گے۔ اور جس کا اثر تعلیمی پستی کی صورت میں ظاہر ہونا لازمی ہے۔

علاوہ ازیں اگر لائق لوگ خدمت کے جذبہ کے تحت اس پیشہ میں آ بھی جاتے ہیں تو دلچسپی سے کام کرنے کے باوجود ان کی ہمت افزائی کا کوئی ایسا طریقہ ہمارے یہاں رائج نہیں ہے، جس سے ایسے اساتذہ کے حوصلے بلند ہو سکیں۔ ــــ بلکہ ایسے حالات ہوتے ہیں کہ ان کی ہمت پست ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں موجودہ پرائمری اسکولوں کے اساتذہ جس پریشانی

کا شکار ہیں وہ بظاہر تو معمولی ہے لیکن توجہ طلب ضرور ہے۔ پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہیں انھیں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفس سے وصول کرنا پڑتی ہیں جس کی وجہ سے ایجوکیشن آفس کو بھی مشکلات ہیں اور پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کو بھی۔ ہر زون میں پرائمری اسکولوں کی کثیر تعداد ہے۔ لہٰذا ناظم تعلیمات ایسا انتظام کردیں کہ تنخواہیں ان کے اسکولوں ہی میں مل جائیں۔ اس سے اساتذہ کو نہ صرف وقت پر تنخواہ مل جائے گی بلکہ آمد و رفت اور عملہ ایجوکیشن آفس میں لائن لگانے سے بھی بچ جائیں گے۔ جو ابتدائی مدارس ثانوی اسکولوں سے ملحق ہیں۔ یا کسی ثانوی اسکول سے قریب واقع ہیں۔ اس .... کے صدر مدرس کو پرائمری اسکول یا اسکولوں کا روپیہ وصول کرنے اور ادا کرنے کا افسر مقرر کردیا جائے۔

ہمارے یہاں ابتدائی اسکولوں میں لائبریری کی کمی ہے۔ لائبریری اسکول کا اہم جزو ہے۔ جو اساتذہ اور طلباء میں علم حاصل کرنے کا ذوق پیدا کرنے کا کردار ادا کرتی ہے۔

معزز حاضرین میں یہ سمجھتا ہوں کہ بنیادی اور ابتدائی تعلیم کے مسائل پر کسی حد تک میں روشنی ڈال سکا ہوں۔ ویسے میری دانست میں وہ ایسے پیچیدہ اور گنجلک نہیں ہیں کہ ان کو حل نہ کیا جاسکے۔ ادائے مافی الضمیر میں تھوڑی سی طوالت ضرور ہوئی۔ لیکن یہ آج کی نشست کا تقاضہ بھی تھا کہ ذرا کھل کر بات کی جائے۔ ناظم تعلیمات کی ذات گرامی اور دیگر مہمانوں کی موجودگی میری ہمت افزائی کا موجب بنی رہی۔

محمد عزیز انصاری

تقریر منور الاسلام صدیقی

ایم۔اے۔بی ایڈ۔بی جی۔ایس بی ٹی
ہیڈ ماسٹر تعمیر نو سکنڈری اسکول کراچی

صاحب صدر۔ بزرگو! بہنو اور بھائیو! مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں ثانوی تعلیم کے مسائل پر آپ سے گفتگو کروں۔ میرے نزدیک پاکستان میں تعلیم بذات خود ہی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ جب تک اس ملک میں اس بات کا تعین نہیں ہو جاتا کہ اس قوم کی روایات، عقائد، مزاج، خواہشات اور ضروریات کے پیش نظر تعلیم کا نظام کس طرح وضع کیا جائے اور اس وضع کردہ نظام سے موجودہ نظام کو نہیں بدل دیا جاتا تعلیم کی ہر سطح پر مسائل برقرار رہیں گے۔

در اصل اس ملک میں تعلیم کا ایک نظام تو موجود ہے۔ لیکن کسی نظام تعلیم کا فقدان ہے۔ اس لئے اگر ثانوی سطح پر مسائل کی تشخیص اور ان کے تدارک کے لئے کوئی تجویز پیش بھی کی جائے تو در اصل یہ بات اصل مرض سے ہٹ کر اس کی علامتوں کے علاج کے مترادف ہوگی۔ پھر بھی اگر موضوع سخن پر بھی کچھ گفتگو کرلی جائے تو کچھ زیادہ نا مناسب نہ ہوگا۔

ثانوی مدارس میں، درپیش مسائل میں جگہ اور وقت کی قلت تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی، مربوط نصاب تعلیم کا فقدان اور

اساتذہ اور طلبا میں درس و تدریس کے سلسلے میں مناسب و لولہ نہ ہونا شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق ۱۹۷۲ء کے بعد صوبائی اور مرکزی حکومتوں سے ہے جو فیصلوں کی حد تک تو نہایت پرجوش ہیں لیکن اخراجات کے معاملوں میں کافی حد تک بے بس ہیں۔ اس لئے ان مسائل کی تفصیلات میں جانے سے سردست کچھ حاصل ہونا مشکل ہے۔ جب تک قومی آمدنی میں مناسب اضافہ نہیں ہوگا تعلیم پر مناسب رقم بھی صرف نہیں کی جا سکے گی۔ البتہ ایک مسئلہ معیار تعلیم کا ہے۔ جو میرے نزدیک متنازعہ ہے۔ میرے اکثر بزرگ جنہوں نے صنعتی ترقی سے پہلے روایتی تعلیم حاصل کی تھی جس کا اہم حصہ ادب اور تاریخ ہوا کرتا تھا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ثانوی مدارس میں تعلیم کا معیار گر گیا ہے۔ اور آج کا میٹریکولیٹ ان کے زمانے کے میٹریکولیٹ کے مقابلے میں نہایت پست معیار رکھتا ہے جس زاویہ نگاہ سے یہ بزرگ تعلیم کے معیار کا اندازہ کرتے ہیں یہ بات یقیناً درست ہے۔ لیکن دنیا میں دو عالمی جنگوں نے انسانی معاشرے کی قدریں اور احتیاجات کو یکسر بدل دیا ہے۔ سائنس کی ترقی نے وہ تہذیبی دوڑ پیدا کر دی ہے جس میں ادب اور تاریخ اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ آج کی دنیا میکانکی دنیا ہے۔ آج کا چاند کسی شاعر کے پرواز تخیل کی منزل نہیں بلکہ انسانی جسم کو طبعی اعتبار سے وہاں پہنچ جانے کی منزل ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے ثانوی مدارس کے نصاب میں سائنس اور ریاضی کے علوم کو برتری حاصل ہو گئی ہے۔ اس لئے مدارس سے فارغ شدہ نوجوانوں کے معیار تعلیم کی جانچ بھی ان ہی علوم کی روشنی میں کرنا ہوگی پاکستان کے جملہ تعلیمی بورڈوں کے نتائج سے یہ حقیقت اچھی طرح سامنے آجاتی ہے کہ آج طلبا کی ایک بڑی تعداد ریاضی اور سائنس کے مضامین میں امتیازی نمبر حاصل کر کے فرسٹ ڈویژن حاصل کر رہے ہیں جبکہ تیس چالیس سال پہلے مسلمان طالب علم کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ ریاضی اس کے لئے بنائی ہی نہیں گئی ہے اور اس کے پڑھنے کا حق صرف بنیوں کے لڑکوں کو ہے۔ پاکستان سے باہر افریقہ، شمالی افریقہ اور مشرق وسطی میں پاکستانی اساتذہ ڈاکٹروں اور انجینیروں کی بھرپور مانگ بھی اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ سائنس اور فنی تعلیم کے نقطۂ نظر سے ہمارا معیار تعلیم خاصا بہتر ہے۔ مگر اتفاقی رخصت کے لئے انگریزی میں لکھی ہوئی درخواست کو معیار تعلیم کے جانچنے کا معیار بنا لیا جائے تو یقیناً آج کے میٹریکولیٹ کمتر معیار تعلیم کے حامل ہیں۔ لیکن اگر سائنسی اور فنی اور تجارتی اعلیٰ تعلیم کے لئے اُن کی مہارت کو معیار بنایا جائے تو وہ اپنے بزرگوں سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ اور اس اعتبار سے معیار تعلیم گرا نہیں ہے بلکہ اُس میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

اس سرسری ریمارک کے بعد میں اپنے اصل مقصد کی جانب آتا ہوں جس کی طرف میں نے آغاز گفتگو میں اشارہ کیا تھا۔ اور وہ پاکستان کا نظام تعلیم ہے۔ بظاہر یہ اصل موضوع سے کچھ ہٹی ہوئی بات معلوم دیتی ہے لیکن یہ تعلیم کی تمام سطحوں پہ پیدا شدہ

مسائل کی بنیاد ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے
ہمارا نظام تعلیم کیا تھا۔ اس کے فوائد اور نقصانات
کیا تھے۔ میں اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ میں یہاں
صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انگریزوں نے اپنی
آمد کے بعد برصغیر کی رعایا کے لئے جس طرح کی تعلیم
مناسب سمجھی رائج کی اور وقت کے ساتھ اس میں
ضروری ترمیمات بھی کرتے رہے تاآنکہ اقتدار کی
منتقلی کے وقت وہ اسے بھی منتقل کر گئے۔ یہ تعلیم کا
ایک انتظام تھا۔ جو بیرونی آقاؤں نے اپنی ضرورت
کے پیش نظر مرتب کیا تھا۔ اسے نظام تعلیم کا نام نہیں
دیا جاسکتا جو کوئی قوم اپنے لئے مرتب کرتی ہے تعلیم
دراصل نئی نسل کی تربیت اور ان کے ذہنوں میں
بزرگوں کے تجربات کی منتقلی کا نام ہے۔ چاہے وہ
تجربات کسی بھی عہد میں کسی بھی قوم نے حاصل کئے
ہوں۔ اس اعتبار سے تعلیم کا دائرہ بین الاقوامی
حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک تربیت کا تعلق ہے
یہ خالص مقامی ہوا کرتی ہے۔ جس کا انحصار قومی
روایات قومی عقائد، قومی پسند و ناپسند قومی ضروریات
اور قومی مزاج پر ہوا کرتا ہے۔ حصول آزادی کے بعد
بدقسمتی سے ہم نے نظام تعلیم کے اس پہلو کا جائزہ
ہی نہیں لیا۔ اور ہماری تمام تر توجہ صرف اس بات
پر مرکوز رہی کہ ترقی یافتہ اقوام کے نصاب تعلیم میں
جو مضامین جس طرح شامل ہیں انہیں ہم بھی اپنے
نصاب تعلیم میں شامل کریں۔ اور یہی وجہ ہے کہ
گذشتہ اٹھائیس ۲۸ سال میں حالانکہ ہم نے نصاب تعلیم
میں بڑی انقلابی تبدیلیاں کی ہیں۔ اس کے باوجود
ہم نئی نسل میں وہ خوبیاں پیدا کرنے میں ناکام رہے
ہیں جن کی ہمیشہ سے ہمیں آرزو رہی ہے۔ مذہب
سے بیگانگی، حب الوطنی کا فقدان، دیانتداری اور
جدوجہد سے بے تعلقی ہمارے نوجوانوں کا مزاج
بن چکی ہے۔ جس کے بنیادی طور پر ہم خود ذمہ دار
ہیں۔ کیونکہ ہم نے ان کی مناسب تربیت کا سرے
سے کوئی انتظام ہی نہیں کیا۔ اور جو کچھ تعلیم دی
اس کا بھی عملی زندگی سے وہ کوئی تعلق نہ دیکھ
پائے۔ سوائے اس کے کہ ہم نے ان میں مایوسی
اور احساس محرومی پیدا کر دیا۔ ان کی کوئی خدمت
نہ کر سکے۔

انتہائی نامساعد حالات پیدا ہونے کے
باوجود ابھی ہم خرابی کی اس منزل تک نہیں پہنچے
ہیں۔ جہاں سے لوٹ آنا ناممکن ہو جائے۔ ہماری
فوری ضرورت ایک ایسا نظام تعلیم وضع کرنا ہے
جس کے مراحل سے گزار کر ہم ایک معصوم بچے کو
اپنے نقطۂ نظر سے ایک اچھا بالغ شہری بنا سکیں
یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نظام تعلیم کس
طرح وضع کیا جائے۔ اور کون لوگ اسے وضع کریں
تعلیم کے سرکاری ڈھانچے میں جو ادارے شامل
ہیں وہ بڑی حد تک محدود طریقۂ کار کے حامل
ہیں۔ اور محدود ذمہ داریاں رکھتے ہیں۔ اس کے
علاوہ ان اداروں سے وابستہ افراد اپنے
پیشوں میں تو خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن یا تو

ان میں وہ صلاحیتیں نہیں ہیں یا وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے آزاد نہیں ہیں۔ جو قومی مصلح میں ہونی چاہئیں۔ دوسری طرف سرکاری پیچ پر جو ادارے ملک کے مستقبل کو بنانے کے مجاز ہیں وہ ایسے سیاسی رہنماؤں کا مقدر بن چکے ہیں۔ جو پارلیمانی سیاست کے تو ماہر ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ قومی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہوں۔ اس طرح یہ ذمہ داری ان ماہرین تعلیم پر آپڑتی ہے جو فنی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اظہار خیال کی بھی مکمل آزادی رکھتے ہیں۔ اور ایسے غیر سرکاری اداروں سے وابستہ ہیں جو تعلیم کے لئے عرصہ دراز سے کام کر رہے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ہی ایک ایسا ادارہ ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ وہ واحد ادارہ ہے جو نظام تعلیم کے سلسلے میں قوم کی رہنمائی کرسکتا ہے۔ کیونکہ گذشتہ نوّے سال سے برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم کے لئے فکری اور عملی جدوجہد کرتا رہا ہے۔ اور اس کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔

تقریر ریحانہ مفتی صاحبہ
لکچرر سرسید گرلس کالج

جناب صدر کی اجازت سے سکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس جناب سید الطاف علی بریلوی صاحب کا میں شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے مجھے اظہار خیال کا موقع دیا۔ مجھ سے بیشتر معزز مقررین نے ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ لہٰذا میں ان تقاریر میں چند تجاویز کا اضافہ کرنے پر ہی اکتفا کروں گی۔

پرائمری تعلیم کو نظام تعلیم میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ضرورت ہے کہ اس درجہ پر خصوصی توجہ دی جائے۔ پرائمری استاد اس سلسلہ میں مرکزی کردار انجام دیتا ہے۔ لہٰذا میری ناقص رائے میں ضروری ہے کہ

(الف) پرائمری اساتذہ کی کم سے کم قابلیت بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ ہونا چاہیئے۔

(ب) اور کم سے کم اسکیل -/۵۰۰ مقرر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ معمولی تعلیم اور ناقص تربیت یافتہ اساتذہ ان عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جن کی توقع ان سے کی جاتی ہے۔

اس ضمن میں ان کے لئے عمدہ تربیتی اداروں کا بندوبست بھی کیا جانا چاہیئے۔ اور انھیں اپنی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کی پوری پوری سہولتیں حاصل ہونا چاہئیں۔

ابھی ایک مقرر نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اسکولوں کے لئے مساجد کو استعمال میں لایا جائے مجھے ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ نئی تعلیمی پالیسی میں اس امر کو تسلیم کیا جا چکا ہے کہ مساجد کو مدرسوں کی حیثیت سے استعمال کیا جائے گا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرلے کے بعد تجربہ کیا جائے کہ

کہاں تک اس منصوبہ پر عمل کرنا ممکن ہے۔

جہاں تک ثانوی تعلیم کا سوال ہے۔ نصاب تعلیم پر مکمل نظر ثانی ہونی چاہیئے۔ عمارات فرنیچر لائبریریوں اور کھیل کے میدانوں وغیرہ کا مناسب بندوبست کیا جانا چاہیئے۔ زیادہ تعداد میں تعلیمی ادارے کھولے جائیں، تاکہ استاد طالب علم کے تناسب کو بہتر بنایا جا سکے۔ اس کے علاوہ مروجہ نظام امتحانات کی اصلاح کی جائے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں جن تجاویز کا ذکر ملتا ہے۔ ان پر درست منصوبہ بندی کے ساتھ عمل کیا جائے۔ استاد اس درجہ میں بھی مرکزی کردار انجام دیتا ہے لہٰذا اس کی تعلیمی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے پورے پورے مواقع ملنے چاہئیں۔ اس کی کم از کم تعلیم بی۔ اے۔ بی ایڈ اور مزید تعلیم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔ ایسے تمام اساتذہ کو بغیر غیر ضروری پیچیدگیوں کے بہترین گریڈ ملنے چاہیئے۔ جو اپنی تعلیمی صلاحیتوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم سے متعلق اس محفل میں ایک دلچسپ موضوع زیر بحث ہے کہ پاکستان کے محدود وسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں خصوصیت سے انجینئرنگ اور میڈیکل کالجوں میں طلباء کے داخلہ کو محدود کر دینا چاہیئے یا تمام طالب علموں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ملنے چاہیئے؟

اس سلسلہ میں میرا موقف یہ ہے کہ ہمیں ایک سروے کرنا چاہیئے۔ اور یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ انجینئرنگ یا میڈیکل کالجوں میں طلباء اس قدر بڑی تعداد میں کیوں داخلے کے خواہش مند نظر آتے ہیں؟ اگر طلباء ان شعبوں میں اس لئے جانا چاہتے ہیں۔ کہ وہ ان شعبوں میں جانے کا مخصوص رجحان رکھتے ہیں۔ تو یقیناً ان تمام طلباء کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ملنے چاہئیں۔ لیکن اگر نوجوانوں کی اکثریت معاشرہ میں معزز مقام یا تنخواہوں کا عمدہ اسکیل حاصل ہونے کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے کوشاں ہیں۔ تو اس کے لئے میری ناقص رائے میں چند تجاویز مدنظر رکھنی ہوں گی۔

(۱) معاشرہ میں محنت کی عظمت کے تصور کو عام کیا جائے۔

(۲) معاشی ناہمواریاں ختم کی جائیں۔ یعنی ایک ٹیکنیشن، کلرک یا مزدور کو بھی باعزت زندگی گزارنے کی سہولتیں حاصل ہوں۔

(۳) نیز ثانوی/ اعلیٰ ثانوی درجات میں مختلف پیشہ ورانہ کورسوں کو متعارف کرایا جائے۔

(۴) رہنمائی اور مشاورت کے سائنسی طریقوں کی مدد سے نوجوانوں کی موزوں پیشوں کے انتخاب میں رہنمائی کی جائے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بلا سوچے سمجھے اور بے مقصد تعلیم حاصل کرنے کے بجائے نوجوان اپنے پسندیدہ شعبوں میں نہ جائیں۔ اس طرح انفرادی طور پر نوجوانوں اور اجتماعی طور پر قوم کو ٹھوس فوائد حاصل ہو

نیز اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلوں کی غیر ضروری دباؤ بھی ختم ہو جائے گی۔

تقریر مس حمیدہ زیدی
لیکچرر سرسید گرلس کالج

صدر محترم۔ تعلیمی ماحول میں میری نگاہ کے سامنے جو مسائل آئے ان میں سے دو زیادہ اہم ہیں۔

(الف) تعلیم ابھی تک بے مقصد ہے۔

(ب) طلبا اور طالبات میں اخلاقی تنزل کا رجحان ہے۔

نمبر (الف) کے متعلق عرض ہے کہ ہمارے ہاں کے ثانوی اسکولوں اور کالجوں میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور جس طریقے سے پڑھائے جاتے ہیں اُن سے طلباء اور طالبات کو امتحان پاس کرکے صرف کاغذی ڈگریاں حاصل ہوتی ہیں۔ اور اس طرح موجودہ نظام تعلیم ہماری نئی نسل کو معاشرے سے معاشی طور پر ہم آہنگ کرنے میں ...... بُری طرح ناکام رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بے روزگاری کا مسئلہ ہمارے ملک میں پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جا رہا ہے۔

موجودہ حکومت نے اس صورتِ حال کو تشویشناک خیال کرتے ہوئے ثانوی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں پیشہ ورانہ مضامین شامل کئے ہیں مگر اس نئے نصاب کا نفاذ ۱۹۷۸ء سے کیا جائے گا۔ اپنے ہاں کے طلباء اور طالبات کی اسکولوں اور کالجوں میں بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر یہ تین سال کی مدت بے روزگاری کے مسئلے کو خطرناک حد تک پیچیدہ کر دے گی۔

لہٰذا متعلقہ حکام سے التماس ہے کہ یا تو وہ نئے نصاب کا نفاذ آئندہ تعلیمی سال سے کر دیں۔ یا قلیل المیعاد اقدام کے طور پر سال رواں ہی سے کالجوں میں خصوصاً آرٹس کالجوں میں تین اختیاری مضامین میں سے ایک پیشہ ورانہ مضمون ضرور شامل کریں۔ اگر ایسا کیا گیا تو بے روزگاری کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جائے گا طلباء اور طالبات تعلیمی سرگرمیوں میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لیں گے۔ اور اس طرح انھیں غیر مفید کارروائیوں کی طرف متوجہ ہونے کا موقعہ نہیں ملے گا اور غیر ضروری طور پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند افراد کی تعداد بھی بغیر کوئی مصنوعی پابندی عائد کئے کم ہو جائے گی۔ اور اعلیٰ تعلیم کے حصول پر مصنوعی پابندی عائد کرنے کا جو مضر ردِ عمل معاشرے پر ہوگا۔ اس سے بھی نجات مل جائے گی۔

(ب) دوسرا اہم مسئلہ ہمارے طلباء اور طالبات میں اخلاقی تنزل کے رجحان کا ہے۔ آوارہ گشتا، سطحی قسم کی مشغولیات میں وقت ضائع کرنا والدین اور اساتذہ کا احترام نہ کرنا۔

ایسی صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے سب سے پہلے ہمیں ایک معیار قائم کرنا ہوگا کہ آخر پاکستانی قوم میں جو کہ ملت اسلامیہ کا ایک جزو ہے زندگی کی کون کونسی اعلیٰ اقدار پائی جانی چاہئیں جیسے ایک

ضابطۂ اخلاق اس طرح مرتب ہو جائے تب اپنے طلباء اور طالبات سے اُن کی عملاً پابندی کرانے کے لئے اقدامات کرنے چاہئیں، جن میں اساتذہ حکومت اور والدین سب کا تعاون شامل ہو۔ تنہا اساتذہ اس فرض کی ادائیگی کے ذمہ دار قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

تقریر الحاج محمد زبیر

سابق لائبریرین مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

معزز حضرات! تعلیم کے مختلف درجات میں ابتدائی تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ درحقیقت اس کی حیثیت وہی ہے جو ایک تناور درخت کے وجود میں آنے کے لئے بیج کی ہوتی ہے، اس اعتبار سے بنیادی تعلیم کے مسائل بھی بڑے نازک اور نہایت اہم ہوتے ہیں اور انہیں حل کرنے کے لئے گہری نظر اور وسیع تجربہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان مسائل میں سب سے اول مسئلہ مقام اور عمارت کا ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے شہر کے ہر حصہ میں ایسے مرکزی مقامات پہ مدرسے کھولے جائیں جہاں بچے بآسانی جا سکیں۔ اس مسئلہ کو اسلام کے اولین دور میں بڑی خوبی سے حل کر دیا گیا تھا اس زمانہ میں ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ اور ہر مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ ہوتا تھا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ تعلیم ایک پاکیزہ اور ستھرے ماحول میں دی جاتی تھی، اس طرح تعلیم کے ساتھ مذہب کی چھاپ بھی بچوں کے ذہن پر لگتی رہتی تھی اگر اس سسٹم کا احیاء ہو جائے تو ابتدائی تعلیم کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ابتدائی تعلیم کے لئے مخصوص عمارتیں نہ بنائی جائیں ضرور بنائی جائیں، مسجد میں تعلیم کا انتظام ہو اور مسجد کے باہر بھی۔

حضرات! وقت اتنا کم ہے کہ میں اپنی گفتگو کے دائرہ میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کو شامل نہیں کر سکتا تاہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہر قسم کی درس گاہ کے ساتھ ایک اچھی لائبریری بھی ہونی چاہیئے، تعلیم و تدریس میں کتب خانوں کی ضرورت و اہمیت صرف ان چند الفاظ میں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا کہ جن کے بغیر تعلیم کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا یعنی تعلیم دینے کا فرض پوری طرح ادا ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے کہ وہی تعلیم و تدریس کو حرارت اور قوت بخشتے ہیں۔

لیکن پاکستان میں ابتدائی تعلیم کے ساتھ کتب خانوں کے قیام پر توجہ نہیں دی گئی ملک بھر میں بچوں کی لائبریریاں اتنی کم ہیں کہ وہ لائق ذکر نہیں اور کالجوں سے جو لائبریریاں وابستہ ہیں ان میں اکثر کا نظم و نسق اتنا ناقص ہے کہ ان سے بھرپور استفادہ نہیں کیا جا سکتا، اس سلسلہ میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ محض کتب خانے قائم کر دینا کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے سدھار اور افادیت پر بھی نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

لہٰذا میری ناچیز رائے یہ ہے کہ اگر ہم اپنی درسگاہوں میں اعلیٰ اور معیاری کتب خانے قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مسائل میں سے ایک اہم اور بنیادی مسئلہ حل ہو جائے گا۔

تقریر ڈاکٹر فرید الدین بقائی

آپ نے فرمایا کہ اعلیٰ تعلیم کی جب بات کی جاتی ہے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اُس کا حق چھین نے سے پہلے اُس کو فریاد کا موقع دینا چاہیئے۔ بزرگانِ تعلیم اس نئی نسل کو بھی اُنہیں راہوں پر لے جانا چاہتے ہیں جن پر وہ خود چلے ہیں۔ حالانکہ نئے زمانے کے لحاظ سے راستے اور اقدار بدل گئے ہیں۔ اگر حکومتِ وقت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا بار نہیں اُٹھا سکتی تو یہ تمام بار نجی شعبے اٹھانے کے لئے طیار ہیں۔ میں نے کل رات اپنے خطبۂ استقبالیہ میں عرض کیا تھا۔ کہ ہم علی گڑھ تحریک کے منّاد ہیں۔ میں کھُل کر بات کرنا چاہتا ہوں کہ ہم علی گڑھ یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں آزمائیں تو سہی۔ ہم ناظم آباد ہی میں یونیورسٹی کھولیں گے۔ رات ذکر ہوا کہ ایک میڈیکل اسٹوڈنٹ پر دو لاکھ روپیہ خرچ ہوتا ہے اور وہ پھر ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ لیکن گذارش ہے کہ ڈاکٹر اور انجنیر ہی نہیں جاتے ہیں بلکہ ہر شعبہ کے قابل ترین لوگ بہت بڑی تعداد میں باہر جا چکے ہیں جن کی تفصیل میں بتا سکتا ہوں۔

آپ نے بیشک انجنیر، ڈاکٹر اور سائنٹسٹ پیدا کئے لیکن آپ یہ بھول گئے کہ اُن کو کیسے استعمال کیا اور اُن کے حقوق کیا ہیں۔ حکومت کے سامنے یہ بات ہونا چاہیئے کہ مستقل طور پر تعلیمی پالیسی کے مطابق معیارِ تعلیم قائم رکھا جا رہا ہے یا نہیں اُس کے بعد کھُلی اجازت ہونی چاہیئے کہ لوگ تعلیمی ادارے کھولیں اور اُن کو چلائیں۔

اعلیٰ تعلیم کی سہولتوں سے بڑے آدمیوں کے لڑکے اور لڑکیاں فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ حالانکہ بڑے آدمی زیادہ تر غریب لوگوں میں سے پیدا ہوتے ہیں۔ امیروں کے بچوں میں سے بڑے لوگ کم پیدا ہوئے ہیں۔

جن کے سر پر تعلیم کا جنون سوار ہوتا ہے اُن سے آپ اُن کا حق نہیں چھین سکتے۔ ہماری طرف سے کچھ رزولیوشن اور آرار گورنمنٹ کے پاس پہونچنے چاہئیں کہ تعلیمی معیار کیا ہونا چاہیئے اور جب گورنمنٹ اُس کو منظور کر لے تو پھر کسی کے لئے اُس میں رُکاوٹ نہ ہونی چاہیئے۔

تقریر جناب جمشید یالی نیتی صاحب

آپ نے تعلیم بنکنگ و اکاؤنٹینسی کی تاریخ اُس میں زمانۂ سابق میں مسلمانوں کی عدم دلچسپی اور پسماندگی پر نہایت دلچسپ انداز اور زبان میں روشنی ڈالی۔ بنکنگ کی بکثرت اصطلاحات پر اپنی رواں دواں نظمیں پڑھیں اور کچھ ایسا اچھوتا اسلوب بیان اختیار کیا کہ حاضرین میں سے ہر شخص بینکوں کی دُنیا میں پہونچ گیا۔ اور دل ہی دل میں یہ آرزو کرنے لگا کہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر صرف بینکاری کے کام میں لگ جائے۔ جمشید یالی نیتی صاحب نے اپنے موضوع کا دوسرے علمی موضوعات سے تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا اور

ثابت کیا کہ اگر ہمارے نوجوان اُس پر متوجہ ہو جائیں تو اُن کو ڈاکٹر اور انجنیر بننے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔

جمشید صاحب کی تقریر کے دوران بار بار تحسین و ستائش کی تالیاں بجتی رہیں۔

تقریر جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب

موصوف نے جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جیسی مزیدار تقریر آپ نے ابھی ابھی جمشید پانی پتی صاحب کی سُنی ہے ویسی تقریر میں نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ادبیت۔ شعریت اور جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس وقت جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے دلی جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ جہاں تک تعلیمی پالیسی کا تعلق ہے میری رائے میں درحقیقت اُس کا مقصد قومی لیگانگت ہے۔ اور یہ عمل بتدریج ہونا چاہیئے۔ یہ اس انداز سے ہونا چاہیئے کہ دُشواریاں پیدا نہ ہوں — جیسا کہ پانی پتی صاحب نے کہا کہ جب تک جذبہ نہ ہوگا اس وقت تک تعلیم و تعلم کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا — والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اصلاح پر روپیہ، وقت اور کوشش صرف کریں۔ اسی طرح اساتذہ کو چاہیئے کہ وہ اُن مسائل کو پہچانیں جن سے طالب علم دوچار ہیں۔ ایک رواج بچوں کو یہ کہنے کا ہو گیا ہے کہ مستقبل کی ذمہ داری تم پر ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ مستقبل تمہارے لئے ہے۔ ذمہ داریاں طالب علموں پر تھوپنا زیادتی ہے۔

جو چیزیں آپ تعلیم میں لانا چاہتے ہیں وہ ابتدائی تعلیم سے شروع ہوں گی۔ پوری توجہ سے زیادہ سے زیادہ وقت اور روپیہ ابتدائی تعلیم کی اصلاح پر صرف ہونا چاہیئے اس وقت ابتدائی تعلیم میں جو خامیاں ہیں اُن کو سب جانتے اور مانتے ہیں۔ رہی اعلیٰ تعلیم تو اُس کو حاصل کرنے کا حق سب کو ہے لیکن اعلیٰ تعلیم سو فی صد کسی ملک میں ہو ہی نہیں سکتی۔ البتہ اس سلسلہ میں ڈاکٹر بقائی صاحبہ کی اس تجویز سے میں متفق ہوں کہ اتنی راہ تو ضرور کھلنی چاہیئے کہ جس کا جی چاہے اعلیٰ تعلیم کا بار اُٹھائے۔ اور جس قدر حکومت اُٹھا سکتی ہے اُس کو وہ اُٹھائے۔ یہ معاملہ اقتصادیات کا ہے۔ بین الاقوامی مقابلہ کا ہے۔ — اساتذہ کے بارے میں جسٹس قدیرالدین نے فرمایا کہ ان کو اچھی تنخواہ ملنی چاہیئے۔ تاکہ وہ ذہنی سکون سے کام کر سکیں۔ اور محسوس کریں کہ اُن کو اُن کی محنت کا نعم البدل مل رہا ہے۔

قدیرالدین صاحب نے مزید فرمایا کہ اساتذہ کو اس قدر مطمئن کر دینا چاہیئے کہ وہ لیبر یونین کے طرز کی اپنی انجمنیں نہ بنائیں۔ آپ نے مساجد میں مدرسے قائم کرنے کی بھی پرزور حمایت کی۔ ساتھ کے ساتھ اُن مشکلات کی بھی

نشاندہی کی جو مولوی صاحبان کی طرف سے پیش آئیں گی۔

جناب جسٹس قدیرالدین صاحب کی تقریر حد درجہ دلچسپی اور توجہ سے سُنی گئی۔

—— اس جلسہ میں ایک مقالہ جناب ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب نے بھی جو مشہور ماہر تعلیم اور محققانہ کتابوں کے مصنف ہیں پڑھا افسوس ہے کہ مقالہ مذکور ہمیں طباعت کے لئے بہدست نہ ہو سکا۔ اس عرصہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف قریب قریب مسلسل بیمار رہے۔

تقریر صدارت

جناب محمد اسمٰعیل میمن صاحب ناظم تعلیمات اسکول ایجوکیشن

بعد دوپہر قریب ایک بجے تک جب سب تقریریں ختم ہوگئیں تو صدر اجلاس عالی جناب محمد اسمٰعیل میمن صاحب سے خطبۂ صدارت ارشاد فرمانے کی درخواست کی گئی۔ سید الطاف علی بریلوی نے آپ کے تعارف کے سلسلہ میں آپ کی علمی قابلیت، اعلیٰ انتظامی صلاحیت اور روشن خیالی کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ بہنے سے لوئر سکنڈری اسکولوں کو ہائر اسکولوں کے درجوں تک ترقی دینے اور کافی تعداد میں نئے اسکول کھولنے کی خصوصیت سے ستائش کی —— محکمۂ تعلیم میں سازشوں اور جتھا بندیوں کو توڑنے کی میمن صاحب نے جو سعی کی ہے اس کا بھی پُرزور الفاظ میں اعتراف کیا۔ جناب میمن صاحب کی فاضلانہ تقریر برجستہ اور زبانی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے:-

"محترم جسٹس صاحب، سید الطاف علی بریلوی صاحب معزز خواتین و حضرات!

سب سے پہلے میں اپنا یہ فرض سمجھتا ہوں کہ اس ادارے کے منتظمین کا شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے مجھے اس اہم جلسے کی صدارت کے لئے منتخب فرمایا۔

آج کی یہ نشست خاصی اہم، مفید اور معلومات سے بھرپور رہی۔ مختلف اراکین نے بعض اہم نکات پیش کئے جن کی وضاحت بحیثیت ناظم تعلیمات میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ابتدائی مدارس کے سلسلے میں فاضل مقرر نے بعض مسائل کی نشاندہی کی ہے جن میں جگہ کی تنگی، فرنیچر کی کمی اور اس سطح پر ذریعۂ تعلیم شامل ہیں۔ نجی اداروں کو قومی تحویل میں لئے جانے کے بعد حکومت پر اساتذہ کی تنخواہوں کی ادائیگی کا اتنا بڑا بوجھ پڑ گیا کہ فوری طور پر دوسرے مسائل کو سلجھانے کی خاصی کوشش کی گئی ہے۔ اور جس کے نتائج اچھے برآمد ہوئے ہیں۔ فرنیچر کی کمی دور کرنے کے لئے فوری طور پر پرائمری

اسکولوں کو دریاں فراہم کر دی گئی ہیں اور اس فراہمی کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے ہمارے محترم وزیر تعلیم جناب پیار علی الانہ کی خصوصی کوششوں سے سویڈش انسٹیٹیوٹ آف پاکستان میں فرنیچر تیار کرایا جا رہا ہے جس کا کافی حصہ اسکولوں کو پہنچا دیا گیا ہے۔ اور اس سال کے آخر تک بڑی حد تک اس مسئلے پر قابو پا لیا جائے گا۔ جگہ کی تنگی پر قابو پانے کے لئے موجودہ اسکولوں کی گنجائش کو پوری پوری طرح استعمال کیا جا رہا ہے متعدد نئے اسکول کھولے گئے ہیں اور سال رواں میں چند اور اسکول قائم کرنے کی توقع ہے۔ اس ضمن میں مساجد کے استعمال کے لئے فاضل مقررین نے جو تجویز پیش کی ہے وہ ایک اچھی تجویز ہے سابق میں بھی مساجد بچوں کی تعلیم کے لئے استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری انتظام کی ہے۔ فی الوقت مساجد کا انتظام علماء کے ہاتھ میں ہے جبکہ تعلیم کی ذمہ داری محکمۂ تعلیم کی ہے۔ جب تک ان دونوں میں کوئی صحیح رابطہ پیدا نہیں ہو جاتا اور مساجد کے منتظمین اس بات کے لئے تیار نہیں ہو جاتے۔ محکمۂ تعلیم کوئی ایسا منصوبہ تیار نہیں کر سکتا۔ ابتدائی مدارس کے سلسلے میں تیسرا اہم نکتہ ذریعۂ تعلیم کا ہے۔ اس ضمن میں یہ کہا گیا کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں میں کچھ مضامین انگریزی میں پڑھائے جا رہے ہیں باقی اردو میں اس سے بچوں کو بہت دشواری ہوتی ہے۔ یہ دور جمہوری دور ہے اور کراچی جیسے ترقی یافتہ شہر کے لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کے بچوں کو انگریزی میں تعلیم دی جائے اس جمہوری مطالبے کے پیش نظر نجی اداروں کو قومی تحویل میں لئے جانے کے بعد حکومت نے ذریعۂ تعلیم کے معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کی ہے۔ سابق میں جس اسکول میں جس طرح تعلیم دی جا رہی تھی آج بھی اسی طرح دی جا رہی ہے۔ میں ذاتی طور سے اس بات سے متفق ہوں کہ ایک اسکول میں تمام مضامین کے لئے ایک ہی ذریعۂ تعلیم ہونا چاہئے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں عنقریب اس مسئلے کا تفصیلی جائزہ لوں گا۔ اور اس ضمن میں مناسب احکامات جاری کر دیئے جائیں گے۔

ثانوی مدارس میں داخلوں کے مسائل پر مکمل طور پر قابو پا لیا گیا ہے۔ جن عمارتوں میں دوسری شفٹ خالی تھی وہاں اسکول قائم کر دیئے گئے ہیں اور متعدد نئی جگہوں پر بھی سیکنڈری اسکول کھولے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اسکولوں کی موجودہ گنجائش میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا ہے۔ ان تمام اقدامات کے نتیجے میں کوئی ایک بچہ بھی کراچی میں چھٹی جماعت میں داخلے سے محروم نہیں رہا ہے۔

متعدد مقررین نے اساتذہ کو معاشرے میں بہتر مقام دیئے جانے کا ذکر کیا ہے۔ میں خود بنیادی طور پر ایک استاد ہوں اور میرا ایمان ہے کہ جب تک اساتذہ کو معاشرے میں ان کا

جائز مقام نہیں مل جاتا نئی نسل کی صحیح طور پر تربیت نہیں کی جا سکتی۔ ہماری عوامی حکومت کو اس بات کا پورا پورا احساس ہے اور ہمارے محبوب وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے اساتذہ کی مالی حالت بہتر بنانے کے لئے متعدد ٹھوس اقدامات کئے ہیں۔ پرائمری سے یونیورسٹی تک تمام اساتذہ کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور ترقی کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔ قومی تحویل میں لئے جانے والے اساتذہ کو ان اقدامات سے خصوصی فائدہ پہنچا ہے اور بعض حالات میں وہ کئی گنا تنخواہ لے رہے ہیں، اور آئندہ بھی اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ عوامی حکومت اساتذہ کی بہتری کے لئے مسلسل اقدامات کرتی رہے گی۔

ایک اور فاضل مقرر نے قومی تعلیم اور قومی یکجہتی کا سوال اٹھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم ایسے مختلف عناصر پر مشتمل ہے۔ جن کی زبان اور ثقافت بڑی حد تک مختلف ہے۔ اس لئے ان مختلف اقدار میں سے مشترکہ قدروں کی نشان دہی کرنی ہوگی اور ان کے فروغ کے لئے بھی کوشش کرنا ہوگی۔ تاکہ حقیقی معنوں میں متحدہ قومیت کا جذبہ پیدا کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ مختلف ثقافتوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب آنا ہوگا تاکہ وہ دوسروں کے مسائل احساسات اور جذبات کو صحیح طور سے سمجھ سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام دوسروں کے مقابلے میں ہمارے اساتذہ زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکتے ہیں۔ اور میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اس قومی خدمت کو انجام دینے کے لئے پوری طرح مستعد ہو جائیں۔

آخر میں میں اپنے ان احساسات اور جذبات کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں جو میں نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق قائم کئے ہیں۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ گزشتہ زمانہ میں برصغیر کے نامور رہنما اس ادارے سے منسلک رہے ہیں اور اس ادارے نے برصغیر کے مسلمانوں کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ یہ جان کر بھی بے انتہا خوشی ہوئی ہے کہ آج بھی اس ادارے کو لائق اور مخلص رہنماؤں کی سرپرستی حاصل ہے اور یہ ادارہ اپنے محدود وسائل کے باوجود پاکستان کی علمی اور تعلیمی سرگرمیوں میں پیش پیش ہے میں اس ادارے کے منتظمین کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ اسکول ایجوکیشن کے متعلق ان کی جانب سے آئی ہوئی تجاویز کا خیر مقدم کروں گا۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر میں منتظمین ادارہ، فاضل مقررین اور معزز شرکائے جلسہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے چند گھنٹے خالص علمی ماحول میں گزارنے کا موقع دیا۔

جناب میمن صاحب کی کارآمد اور فکر انگیز تقریر صدارت کے بعد "شعبۂ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم" کا اجلاس ایک بجے بعد دوپہر اختتام پذیر ہوا۔

اجلاس
شعبۂ تصنیف و تالیف و تحقیقِ علمی کے مسائل

۲۰ اگست ۱۹۷۵ء کو سات بجے شام کانفرنس کے یوسف میموریل لائبریری ہال میں شعبۂ مذکورۂ بالا کا اجلاس زیرِ صدارت جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی منعقد ہوا۔ یہ نہایت پُر رونق جلسہ تھا۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ، نامور مصنفین اور اہلِ قلم حضرات نیز ذی علم خواتین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اسٹیج سکریٹری کے فرائض سید الطاف علی بریلوی نے انجام دیئے۔

جلسہ کا آغاز تلاوتِ کلام پاک از قاری محمدؐ رئیس سے ہوا۔ بعد ازاں کانفرنس کے مستقل صدر جناب جسٹس قدیر الدین احمدؐ صاحب نے جلسہ کے صدر منتخب جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپ کی علمی و تحقیقی خدمات کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا۔ کراچی یونیورسٹی میں ڈاکٹر صاحب بحیثیت وائس چانسلر جس حُسنِ تدبیر اور خلوص کے ساتھ کام کر رہے ہیں اُس پر بھی روشنی ڈالی۔

جنابِ صدر کی تعارفی تقریر کے بعد سب سے پہلے

جناب ڈاکٹر سید معین الحق صاحب کی تقریر ہوئی جس کی تلخیص یہ ہے:۔

صدرِ محترم، خواتین و حضرات!

جس موضوع پر تقریر کے لئے مجھ سے فرمائش کی گئی ہے وہ اس قدر وسیع ہے کہ اس وقت اس کے کسی پہلو پر بھی سیر حاصل بحث نہیں کی جا سکتی لیکن بفحوائے "مَالَا یُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا یُتْرَكُ كُلُّهٗ" اشارات کے طور پر چند مسائل کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

حضرات! گذشتہ پچیس چھبیس سال سے

میں تحقیق و تصنیف کے کام سے منسلک ہوں، اس عرصہ میں تصنیف و تالیف کے علاوہ دوسرے ارباب علم و فضل کے ساتھ کام کرنے اور متعدد علمی و تحقیقی اداروں کی کارکردگی کا اندازہ لگانے کا موقع بھی ملا۔ پاکستان نیز دیگر ممالک کے فضلاء اور تحقیقی اداروں کے کارناموں سے براہ راست واقفیت حاصل کرنے کی سہولتیں بھی حاصل رہیں اور رہیں، پاکستان ہسٹری کانفرنس کے جلسوں میں مختلف ممالک کے نامور فضلا شریک ہوتے رہے ہیں۔ اور ان حضرات سے تحقیق و تراجم سے متعلق مسائل اور مشکلات پر تبادلۂ خیال کے اکثر مواقع حاصل ہوئے، چنانچہ اس موضوع پر میرے ذہن میں متعدد مسائل ہیں، لیکن یہاں صرف دو تین امور کو ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق ہمارے ملک اور بالخصوص اس کے محققین سے ہے، شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میری تقریر میں تحقیق سے مراد تاریخی تحقیق ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تحقیق کے میدان میں ہم مغرب کے ترقی یافتہ ممالک سے بہت پیچھے ہیں۔ اور گزشتہ چند صدیوں میں مغربی مستشرقین نے ہماری یعنی اسلام اور مسلم اقوام کی تاریخ و تمدن پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس کا معیار ہمارے اکثر تحقیقی کارناموں سے فنی لحاظ سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اس کا سبب تو وہی ہے جس کے باعث اقتصادی و سیاسی زندگی میں انھوں نے برتری حاصل کی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے اختتام پر یعنی سولہویں صدی عیسوی کے بعد سے استعمار نے مشرق کے اکثر ممالک پر

بالادستی حاصل کرلی، اس سے ان کو ترقی کے کثیر مواقع حاصل رہے۔ اور ہم انحطاط و تنزل کی طرف بڑھنے لگے۔ سیاسی و اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ مغربی اقوام نے علمی تحقیقی اور سائنسی گوشہائے زندگی میں نمایاں طور پر ترقی کی، چنانچہ ان ممالک میں تحقیق کے لئے ادارے بھی قائم ہوئے اور ان میں کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔ اس زمانہ میں ہم پستی کی ان گہرائیوں میں پہنچ چکے تھے، جہاں سے بلند و بالا کارناموں کی اعلیٰ منزل تک نظر بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود ہماری تاریخ و تمدن پر بھی تحقیق کے میدان میں مدت تک ان ہی کا قبضہ رہا، خدا کا شکر ہے۔ کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔

گذشتہ صدی کے نصف آخر میں سید احمد خاں ان کے بعض رفقاء کار علامہ شبلی اور سید امیر علی وغیرہ کی کوششوں سے مسلمانوں میں تاریخی تحقیق کا ذوق پیدا ہوا، میری مراد جدید انداز سے تاریخی مسائل کو پیش کرنے سے ہے، اس لئے کہ قدیم طرز پر اسلامی فنون میں تحقیق کا کام تو متعدد علما و فضلا نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بھی جاری رکھا تھا، لیکن ان کا دائرہ کار محدود تھا اور افسوس ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ صرف یہی نہیں کہ وہ وسعت حاصل نہ کرسکا، بلکہ ایک لحاظ سے محدود تر ہوتا گیا۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ اور اس سے منسلک چند فضلاء جن میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم سرفہرست ہیں، تاریخی تحقیق کے

دائرے کو وسیع کرنے اور جدید انداز سے فائدہ اٹھانے میں انتھک کوشش کرتے رہے اور شکر ہے کہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں جدید طرز پر تحقیقی کام کے میدان میں ہندوؤں کے علمی اداروں اور ان کے کارکنوں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ سہولتیں حاصل تھیں۔ اس پر تعجب نہ کرنا چاہئیے کہ اکثر مسائل پر تحقیقی کوشش میں ان کو سبقت حاصل رہی، اس کا اندازہ تقسیم سے قبل، انڈین ہسٹری کانگریس اور انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کے اجلاسوں میں بخوبی ہوتا تھا، ان میں مسلم مورخین ومحققین کو انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا تھا، ان کی اپنی تاریخ کا ذکر چھوڑیئے خود مسلمانوں کے تاریخی ورثہ پر بھی ہندو مورخین ہی کی کتابیں ملتی تھیں۔ خال خال کہیں کسی مسلمان مورخ کی تصنیف نظر آجاتی۔ اس میں شک نہیں کہ ہم میں سے بھی بعض کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ یہ کمی پوری ہونی چاہیئے، لیکن نہرو رپورٹ اور گول میز کانفرنسوں کے نتیجہ میں جو حالات رونما ہوئے اور برصغیر کی سیاسی زندگی نے جو رخ اختیار کیا، اس نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو مجبور کر دیا کہ اسلامی اقدار اور مسلم قوم کی بقا کے لئے جو تحریک قائداعظم رح کی سرکردگی میں شروع ہوئی تھی اس کو پروان چڑھانے کے لئے ہر مسلمان اپنی بساط کے مطابق کوشش کرے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ مسلم طلبہ اور مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ نے اس تحریک میں کس قدر نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان حالات میں علمی اور تحقیقی کوشش کی رفتار جو ابھی ابتدائی منزل ہی میں تھی، یقیناً متاثر ہوئی، علی گڑھ کے اساتذہ اور طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے اسی زمانہ میں قائداعظم نے فرمایا تھا۔ ”یہ صحیح ہے کہ طلبہ کو عملی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیئے کیونکہ اس سے ان کی تعلیمی کوشش متاثر ہوتی ہے، لیکن یہ تحریک جو حصول پاکستان کے لئے چلائی جا رہی ہے۔ صرف سیاست سے متعلق ایک تحریک نہیں جس کے کامیاب نہ ہونے کا نتیجہ کسی سیاسی مقصد کے حصول میں ناکامی حد تک محدود رہے گا، بلکہ یہ مسلم قوم (NATION) کی بقا کا سوال ہے۔ یہ پہلا اور آخری موقع ہے جو مسلمانوں کو ملا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ لگا کر قوم کی بقائے دوام کے لئے کوشش کر لیں“

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ برطانوی اقتدار کے دور میں اس نظریہ پر بہت زور دیا جاتا تھا کہ طلبہ کو سیاست سے دور رہنا چاہیئے، لیکن جب آزادی کے جذبات ابھرنے لگے تو اس نظریہ کی اہمیت کم ہو گئی۔ نواب وقار الملک پہلے رہنما تھے جنہوں نے اس سے اختلاف کیا۔ جس کا اثر بہت اچھا ہوا، چنانچہ جنگ بلقان کے موقع پر اور پھر تحریک خلافت کے سلسلہ میں مسلم طلبہ نے اپنے خلوص اور جذبۂ حب الوطنی کا بڑے پیمانہ پر عملی مظاہرہ کیا اور تحریک پاکستان میں تو ان کا رول انتہائی اہم تھا، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانہ میں قائداعظم رح کے ارشادات کا

اکثر مسلمانوں پر بالعموم اور اساتذہ وطلبہ پر خاص طور پر جادو کی طرح ہوتا تھا، چنانچہ کم وبیش دس سال تک عوام وخواص سب کی توجہ اسی عظیم مقصد پر مرکوز رہی۔

تخلیق پاکستان کے بعد، آزادی کی فضا میں تحقیقی کوشش کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے کثیر تعداد میں ایسے حضرات بھی تحقیق وتصنیف کے کاموں میں مصروف تھے۔ قدرتی طور پر ان میں سے اکثر نے یا تو یہاں کے علمی اداروں سے خود کو وابستہ کرلیا یا نئے علمی وتحقیقی اداروں کی بنا ڈالی، ایجوکیشنل کانفرنس اور پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی مثال میں پیش کی جاسکتی ہیں، اول الذکر کے قیام میں سید الطاف علی بریلوی صاحب کی مخلصانہ کوششیں اور اس کے مفید وکامیاب نتائج کا کچھ اندازہ آپ حضرات کو ہے، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی قائم کرنے کے لئے میری تحریک پر کراچی کے چند ارباب علم وفضل اور با اثر حضرات نے ضروری اقدامات کئے۔ خدائے تعالیٰ کا شکر ہے کہ دونوں ادارے خاموشی سے علمی وتحقیقی خدمات انجام دے رہے ہیں اور اپنی ان خدمات کی بنا پر ملک میں ایک مقام حاصل کرچکے ہیں۔

تحقیقی اور تصنیفی کوششوں کے سلسلہ میں اس خلوص اور صلاحیتوں کے باوجود جو یہاں کے بعض فضلاء کی امتیازی خصوصیات ہیں، ہمارے محققین کو بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان مشکلات میں سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر ماخذ اور اچھے کتب خانوں کی کمی ہے۔ جو مخطوطات اور نادر کتب بعض افراد یا خاندانوں کے نجی ذخیرے میں ہیں، ان تک ہر شخص کی رسائی دشوار ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلامی ورثہ کو محفوظ کرنے کے لئے جو عمدہ کتب خانے صدیوں کی کوششوں کے نتیجہ میں وجود پذیر ہوئے ان میں سے تقسیم کے وقت بڑی تعداد ہندوستان کے حصہ میں آئی۔

اس کے علاوہ مقالوں اور کتابوں کی اشاعت کا بھی سوال ہے، تجارتی وکاروباری بنیاد پر قائم رہنے والے ادارے تحقیقی اور علمی کارناموں میں اس لئے زیادہ دلچسپی نہیں لیتے کہ علمی کتابوں کی فروخت سے زیادہ منافع حاصل نہیں کرسکتے۔ ان کے نزدیک پی ایچ ڈی کے گراں قدر مقالہ کے مقابلہ میں ایک معمولی جاسوسی ناول کہیں زیادہ قابل قدر ہے کیونکہ وہ آسانی سے فروخت کیا جاسکتا ہے، اسی قسم کی اور بھی بعض دشواریاں ہیں۔ لیکن ان کے باوجود یہ امر قابل اطمینان ہے کہ ہمارے ملک میں تحقیق سے دلچسپی زیادہ بڑھ رہی ہے۔

تاریخی تحقیق کے میدان میں ہمارے لئے اسلامی تاریخ وتمدن، برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ (جو ہمارا قیمتی وقومی سرمایہ ہے) اور خاص طور پر پاکستان کی تاریخ بہت اہم ہیں۔ اس سلسلہ میں چند گزارشات آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں نے ابتدائی دور سے ہی تاریخی تحقیق میں جو نمایاں اور قابل ذکر کارنامے انجام دیئے ہیں وہ عالمی تہذیب وتمدن کی تاریخ میں ایک بلند مقام

حاصل کر چکے ہیں اور مغربی مستشرقین بھی ان کی
اس کوشش پر ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔
مثلاً ڈاکٹر مارگولیتھ۔ ڈاکٹر اسپرنگر اور پروفیسر
ہملٹن گب وغیرہ نے ان کارناموں کو سراہا ہے اگرچہ
پہلے دو حضرات اپنی اسلام دشمنی کے لئے مشہور
ہیں۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں
مسلم فضلاء و علماء نے سب سے پہلے حدیث پر تحقیق
کا کام کیا اور یقیناً قابل قدر خدمات انجام دیں
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات
سے والہانہ عقیدت اور اسلام میں حدیث کی تشریحی
حیثیت اور اہمیت کی بنا پر محدثین نے اس میدان
میں جس خلوص اور جانفشانی سے خدمات انجام دیں،
اس کی نظیر نہیں ملتی، جس کا اعتراف مستشرقین
یورپ کو بھی ہے۔ رواۃ حدیث کے مستند حالات
جمع کرنے، ان کے اخلاق و صفات کے معلوم کرنے
نیز ان کے بعض نقائص اور کمزوریوں کا جائزہ
لینے کی غرض سے ہزاروں میل کے دور دراز سفروں
کی جو مشقتیں اس دور میں ان حضرات نے برداشت
کیں اس کا آج کی زندگی میں تصور بھی نہیں کیا
جا سکتا، انھیں کی مخلصانہ اور انتھک کوششوں
کے نتیجہ میں لاکھوں افراد کے سوانح محفوظ ہو گئے اور
ایک جدید علم کی بنیاد پڑ گئی جس کو اسماء الرجال
کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور جس پر متعدد
مستند کتابیں معرض وجود میں آئیں، اس طرح
ہزاروں افراد کے جغرافیائی اور اقتصادی حالات
جمع ہو گئے، چنانچہ سوانحی ادب کا جو شاندار ذخیرہ
قدیم ادوار پر مسلمانوں کے پاس موجود ہے وہ کہیں
اور موجود نہیں اس کی بنیاد پر اسلامی تاریخ و تمدن
پر کافی کتابیں قرون وسطیٰ میں لکھی گئیں، ان میں سے
متعدد تصانیف کلاسکس (CLASSICS) کی حیثیت
حاصل کر چکی ہیں۔ اور ہمارے شاندار علمی ورثہ کے
جواہر پاروں کو اپنے صفحات میں محفوظ کئے ہوئے ہیں
ان کثیر التعداد مآخذ کی بنیاد پر جدید نظریات اور
انداز تحقیق کے مطابق اسلام کی تاریخ کو اس کے
صحیح پس منظر میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ میں
سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارا فریضہ ہے کہ اس کام کو انجام
دیں اور اس سلسلہ میں اکثر مستشرقین کی تصانیف
سے جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کو دور کریں
ہماری تاریخ کو وسیع پیمانہ پر مسخ کیا گیا ہے، اب
ضرورت ہے کہ اس کی صحیح تصویر پیش کی جائے۔

برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ پر اگرچہ توجہ
دی جاتی رہی ہے۔ لیکن ہماری یہ کوشش ناکافی
ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ اب اس طرف اور
زیادہ توجہ دی جائے، یقیناً پاکستان ایک نظریہ
کے تحت وجود میں آیا ہے اور اسی کے پیش نظر
اس کے حصول کے لئے کوشش کی گئی۔ اور لاکھوں
انسانوں کی قیمتی جانیں اور ہزارہا خاندانوں کی
تباہی کی شکل میں قربانیاں دی گئی ہیں، اگر تحریک
پاکستان اور اس کے مطالبہ کی بنیاد اسلامی
نظریہ پر نہ رکھی گئی ہوتی اور خود ارادیت کا اصول

ہی اس کے لئے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہوتا تو
برصغیر کے اُن علاقوں کے مسلمان جو پاکستان میں
کسی بھی حیثیت سے شامل نہیں ہو سکتے تھے، اس
تحریک میں حصہ کیوں لیتے؟ تخلیق پاکستان کے بعد بھی
ہمارے لئے اس نظریہ کی اہمیت اسی قدر بلکہ اس سے
کہیں زیادہ ہے جو ۱۹۴۷ء سے قبل تھی۔ یہ حقیقت
اب آشکارا ہو چکی ہے کہ پاکستان کے استحکام اور
ترقی کے لئے اس نظریہ پر عقیدہ رکھنا ناگزیر ہے۔

بعض لوگوں کے ذہن میں پاکستانی قومیت
اور اس کے ساتھ پاکستانی کلچر کے بنیادی تصورات سے
متعلق کچھ انتشار اور الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں لیکن
ہماری نظر میں یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں، نظریۂ
پاکستان جس کی بنیاد اسلام پر ہے۔ ہمارے لئے
ابدی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس سلسلہ میں ہم تذبذب
کے شکار ہوئے تو علاقائی عصبیت کے وہ خطرناک
رجحانات زور پکڑنے لگیں گے جن کے نتیجے میں مشرقی
بازو ہم سے علیحدہ ہو گیا، میں سمجھتا ہوں کہ اس
میدان میں ہمارے مورخ اور محقق نمایاں اور مفید
خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اور ان کا یہ فرض
بھی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کوشش کریں۔

ہمیں اپنی تاریخ و تمدن کے ان ابواب پر
ریسرچ کرنا چاہیئے جن کا تعلق اس نظریہ کے بنیادی
تصورات سے ہے، مثلاً ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ
دو قومی نظریہ جس کو سامنے رکھ کر خود مختار پاکستان
کا مطالبہ کیا گیا تھا کوئی سیاسی چال نہ تھی، بلکہ
مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کا ایک بنیادی اور ختم
نہ ہونے والا عنصر تھا۔ اور یہ تصور کہ اس خطۂ ارض
میں رہنے والے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں، ہزار
سال سے زیادہ مدت تک قائم ہی نہیں رہا بلکہ
مستحکم ہوتا رہا اور جب سیاسی حالات کے تقاضوں
نے اس کو اجاگر ہونے کا موقع دیا تو وہ اپنی صحیح
شکل میں سامنے آگیا اور ہمارے مطالبۂ پاکستان
کی سب سے زیادہ نمایاں اور مستحکم دلیل ثابت ہوا۔
اس سلسلہ میں تاریخ کے ان تمام ابواب پر تحقیق
کی جانی چاہیئے جو علیحدہ قومیت کے تصور کے
لئے ضروری تھے؟ اس میں ایک اہم نکتہ یہ ہے
کہ ہم دنیا کو بتلائیں اور ثابت کر دیں کہ ہمارا
قومیت کا تصور بنیادی طور پر مغرب کے تصور
قومیت سے یکسر مختلف ہے، وہاں زبان اور
علاقائیت پر زور دیا جاتا ہے، ہم عقائد و تصورات
کو اہمیت دیتے ہیں، وہ مذہب کو انفرادی
اور ذاتی معاملہ سمجھتے ہیں اور بس، ہمارے نزدیک
دین کے بنیادی تصورات انسان کی انفرادی
زندگی کے علاوہ اس کی اجتماعی زندگی میں بھی
رہنمائی کرتے ہیں۔

میرے ان اشارات سے یہ نتیجہ نکالنا
غلط ہوگا کہ میں علاقائی تاریخ اور روایات
کی اہمیت کو کم کرنا چاہتا ہوں۔ ہرگز نہیں،
ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور علاقائی
تاریخ پر تحقیق کی افادیت کو کسی صورت میں

بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے مورخین کو دونوں میدانوں میں تحقیقی کام کرنا چاہیئے، تاریخ کا مطالعہ اور اس کی حدود بہت وسیع ہیں۔ اس کا ہر پہلو اور اس سے متعلق ہر موضوع، تحقیق کے نقطۂ نظر سے نہایت اہم اور ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ہم جس قدر ترقی کریں گے۔ ہمارے سامنے نئے نئے گوشے اور حقیقتیں منکشف ہوتی جائیں گی، اور ہر قدم پر تحقیق کی وسعت اور ضروریات محسوس ہوتی جائے گی۔

حضرات! یہ چند اشارات ہیں جو پاکستان میں تاریخ کے مطالعہ و تحقیق کے سلسلہ میں آپ کے سامنے اپنے تجربات کی بنا پر میں نے پیش کئے ہیں۔ یہ ایک وسیع اور اہم موضوع ہے۔ اس پر مزید بحث کی جا سکتی تھی لیکن وقت کی کمی کے پیش نظر آپ حضرات سے سمع خراشی کی معذرت کرتے ہوئے ان چند الفاظ پر تقریر ختم کر کے رخصت چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر سید معین الحق صاحب کی فاضلانہ تقریر ختم ہوئی تو جناب شان الحق حقی صاحب سکریٹری جنرل ترقی اردو بورڈ سے اظہار خیال کی درخواست کی گئی۔ موصوف نے درج ذیل معلومات افزا مقالہ پڑھا:۔

مقالہ جناب شان الحق حقی

بعنوان

"تدوین لغت کے مسائل"

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے جشن سیمین کے موقع پر "تصنیف و تالیف اور تحقیق علمی کے مسائل" پر گفتگو کے لئے بھی ایک نشست مخصوص کی ہے۔ یہ موضوع نہایت مناسب اور برمحل ہے اور ارباب کانفرنس اس پرداد اور شکریئے کے مستحق ہیں۔ میں ان کا خاص طور پر ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے بھی اس مذاکرے میں شرکت کا موقع دیا۔ تصنیف و تالیف کے مسائل ایک دو نہیں بے شمار ہیں۔ تحقیق علمی کا میدان زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا ہے، اسی لحاظ سے اس کے مسائل بھی بے حساب و بے حد ہونے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اس موضوع پر اپنے مخصوص دائرے اور محدود تجربے ہی کے حوالے سے گفتگو کر سکتا ہے۔ میں نے اس نشست کے لئے "تدوین لغت کے مسائل" کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن میں ضمناً چند عوامی مسائل کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو تالیف و تحقیق کے سلسلے میں توجہ کے لائق ہیں۔ یوں تو مسئلوں کا مسئلہ مادی وسائل کا مسئلہ ہے۔ افلاس و ادبار کی حالت میں علمی تحقیق کی داد جم ہی جم دی جا[سکتی] ہے۔ اور جو دے سکیں وہ واقعی کمال کرتے ہیں۔ لیکن میں اس وقت اس قسم کے کسی مسئلے کا ذکر نہیں کروں گا۔ جس کی چارہ جوئی اہل تحقیق کے اپنے بس میں نہ ہو، بلکہ بعض ایسی باتوں کا ذکر کروں گا جو ان کے اپنے کردار اور ضابطۂ اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہر کام اور ہر پیشے کے کچھ اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔ ہر گروہِ انسانی کی کچھ قدریں، کچھ اصول، کچھ وضع ہوتی ہیں۔ اہلِ تحقیق تو ایک برگزیدہ طبقے کا نام

ان کے لئے بھی ایک اخلاقی ضابطے کا ہونا شرط ہے محض امتیاز یا وضعداری کی خاطر نہیں، بلکہ ان مقاصد کی خاطر جو انہیں عزیز ہونے چاہئیں۔

یوں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ علمی تحقیق کا اخلاق سے کیا تعلق، لیکن تحقیق علمی کا اصل مقصد خواہ اس کا تعلق فلکیات سے ہو یا سمکیات سے، ہر صورت میں حقیقت کی تلاش ہوتا ہے۔ چنانچہ حق کی پاسداری اہل علم کا پہلا اصول ہونا چاہیئے۔ ذہنی خلوص و بے تعصبی کے بغیر سچائی کی تلاش کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ذہن کو تعصبات سے پاک، جذباتیت سے مبرا ہونا چاہیئے۔ اب یہ جس حد تک انسان کے مقدور میں ہو۔ چونکہ یہ آسان نہیں ہوتا اس لئے خاص طور پر احتیاط لازم آتی ہے۔ علامہ اقبال کی بیان کردہ یہ تعریف:

چہ باید مرد را طبع بلندے مشرب نابے
دل گرمے نگاہ پاک بینے جان بیتابے

سب سے زیادہ تحقیق علمی ہی کے مرد میدان پر صادق آتی ہے۔ میں نے اس کا ذکر خاص طور پر، اور سب سے پہلے اسی لئے ضروری سمجھا کہ بعض علمی کاوشوں میں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس قسم کی بے احتیاطی کا پتہ چلتا ہے۔ ہم اپنے فراہم کردہ مواد سے اپنے حسب منشا نتائج نکال کر اپنا دل تو خوش کر سکتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ علم کی دنیا میں اس کا اعتبار کیا ہوگا۔ معیار کو کسی بھی مصلحت یا مقصد پر قربان نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ ہماری آئندہ.. سائنسی ترقی کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔

دوسری بات جس کا ذکر میں کرنا چاہتا ہوں وہ باہمی اشتراک و تعاون کا مسئلہ ہے۔ میں فرد کی صلاحیتوں کا بہت معترف ہوں، لیکن اکثر بڑے تحقیقی کاموں میں ایک سے زیادہ افراد کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے، اور جتنی بڑی مہم ہوگی اتنی ہی جماعتی اشتراک کی محتاج ہوگی، جیسے کہ تدوین لغات کی مہم۔ یوں تو پہلے بھی افراد نے اپنے بل پر لغت کی کتابیں مرتب کی ہیں اور اپنی عمریں اس کام میں بتائی ہیں۔ لیکن جدید سائنسی دور میں لغت نگاری کا تصور بھی بدل گیا ہے۔ اگر اس کام کو جدید اصولوں کے مطابق کرنا ہو، وہ بھی کم سے کم وقت میں تو اس کا سرانجام بہت سے لوگوں کے پرخلوص تعاون کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی اور بھی بہتیرے کام ہیں۔ یہ ایک افسوسناک مشاہدہ ہے کہ ہمارے ہاں اس وقت جذبۂ تعاون کی بڑی کمی ہے۔ ہمارے باصلاحیت افراد ایسے کاموں میں تو خاطر خواہ طور پر جان لڑا سکتے ہیں، جن کا سہرا صرف انہی کے سر بندھے اور کوئی دوسرا ان کا شریک و سہیم نہ ہو، لیکن جہاں اشتراک و تعاون کا سوال آتا ہے تو اکثر پہلو بچا جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے اکثر علمی کارنامے بعض افراد ہی کی کاوشوں تک محدود نظر آتے ہیں۔ ایسی چیزیں کم ہی منظر عام پر آتی ہیں جس میں ایک سے زیادہ افراد کی کوششوں کو دخل ہو۔ ذاتی ناموری کا

شوق ہماری ایک ازلی کمزوری ہے۔ کوئی انسان
اس سے یکسر مبرّا تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن خلوصِ دل
سے علم کی خدمت مقصود ہو تو اس میں بھی اہلِ علم
کے لئے تسکینِ نفس کے بڑے سامان ہیں۔ علاوہ
ازیں علم کی لگن ہو تو خدمتِ علم کے لئے تھوڑا بہت
ایثار بھی لازم ہے۔ ایک ایثار تو یہی ہے کہ آپ
اپنے مقصد کی دھن میں اپنے اوپر خواب و خور حرام
کرلیں، بقول ملٹن

TO SCORN DELIGHT AND LIVE
LABORIOUS DAYS.

اور ایک ایثار یہ بھی ہے کہ انسان کام کے
پیچھے نام سے بے پرواہ ہو جائے۔ البتہ انسان واقعی
علمی لگن کے اس درجے پر ہو تو نام خود ہی اس کا
پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اور ذہنی آسودگی کے علاوہ
نام آوری کے لحاظ سے بھی شاید یہ سودا گراں نہ ہے۔
ذوقِ "فلک پیما" کے ساتھ "فکرِ بے پروا" بھی ہو
تو بڑی سعادت کی بات ہے، جس کی اجتماعی برکتوں
کا تو پوچھنا ہی کیا، انفرادی طور پر بھی کوئی صحیح المذاق
آدمی اپنے آپ کو خسارے میں محسوس نہ کرے گا۔

علمی معاملات میں خود غرضی بعض اوقات بڑی
قبیح صورتیں اختیار کرلیتی ہے۔ مثلاً قیمتی مواد کو
لوگوں کی نظر سے اوجھل کر دینا۔ ذی اثر لوگ
لائبریریوں سے نایاب کتابیں اور مخطوطات تک
نکلوا کر بیٹھ جاتے ہیں اور واپس نہیں کرتے بعض
گھروں میں پرانے نسخے یونہی پڑے پڑے کیڑوں کی
نذر ہو جاتے ہیں۔ نہ معلوم اس طرح ہمارا کتنا علمی سرمایہ
برباد ہوا ہے۔ آئندہ اس کی روک تھام ہونی چاہیئے۔
گھروں میں جو نوادر رکھے جائیں ان کا حشر اکثر برا ہی
ہوتا ہے۔ پوری طرح حفاظت نہیں ہو سکتی۔ میرے
والد مرحوم مولوی احتشام الدین حقی دہلی میں اپنا
بالاخانہ مقفل کرکے حیدر آباد دکن چلے گئے تھے۔
کئی برس بعد پتہ چلا کہ ایک ذات شریف غسل خانے
میں سے مستقل راستہ بنا کر ان کی ساری کتابیں اور
ٹوکریاں بھر بھر کے نکالتے اور چوک میں لے جا کر
بیچتے رہے۔ میرے ایک چچا (سلام الحق صاحب) نے
ان میں سے بچی کھچی کتابیں چوک سے دوبارہ خریدیں۔
اس کے بعد بعض کتابیں مولوی عبدالحق صاحب مرحوم
کے پاس بھی کبھی بکنے آتی رہیں اور وہ والد صاحب کو
دیکھنے کے لئے بھجواتے رہے، مگر والد صاحب نے اس
کے بعد یہ اصول بنا لیا تھا کہ کوئی نادر نسخہ گھر میں نہیں
رکھیں گے۔ کوئی کتاب کہیں سے بکنے آتی تو وہ انجمن یا
دلی کی ہارڈنگ لائبریری کو بھجوا دیتے تھے۔ مجھے بھی
ان کی نصیحت یہی تھی کہ کوئی قیمتی مخطوطہ گھر میں رکھنا
بڑا گناہ ہے کیونکہ اس کی حفاظت گھروں میں نہیں ہو سکتی۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا لغت کے سلسلے میں خلوص
عمل اور باہمی اشتراک و تعاون کی بڑی ضرورت تھی
کلاں آکسفورڈ ڈکشنری جس نے لغت نگاری کی مناہج
اور معیار ہی کو بدل ڈالا، گویا پوری انگریز قوم کے تعاون
سے تیار ہوئی ہو۔ حسب روایت اس کی تدوین میں
بہت سے لوگوں نے رضاکارانہ مدد کی تھی۔ گرجاؤں کے

پادری، ٹیچر، پروفیسر، پڑھے لکھے فارغ البال لوگ حتیٰ کہ بعض قیدی بھی الفاظ و اسناد کی فراہمی میں شریک رہے۔ اس صورت سے ان میں سے ایک DR. MINCY کا ذکر ڈاکٹر مرے نے کیا ہے۔ جنہوں نے جیل سے ان کو ہزاروں خطوط لکھے۔ اور بڑی قیمتی مدد بہم پہنچائی۔ ویسے موصوف قتل کے مجرم اور فاتر العقل شمار ہوتے تھے۔ یہ لسانی تحقیق کا بے مثل کارنامہ نصف صدی میں یعنی دو پشتوں میں جاکر مرتب ہوا۔ اور کوئی بیس برس چھپنے میں لگے۔

ترقی اردو بورڈ کراچی نے اپنی لغت کے لئے آکسفورڈ ڈکشنری ہی کو نمونہ بنایا تھا۔ یہ لغت تاریخی اصول پر مبنی ہے۔ یعنی ہر لفظ کا اشتقاق اور اس کے ساتھ اس کے استعمال کی دور بدور مثالیں مع سنین، حوالہ متون تاکہ لفظ کی پوری تاریخ آئینہ ہو جائے کہ یہ کس کس معنی میں کب کب کہاں کہاں ملتا ہے۔ کسی قدر مبالغے کے ساتھ کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر سارے انگریزی ادب پر پانی پھر جائے۔ تو اسے آکسفورڈ ڈکشنری کی مدد سے دوبارہ ترتیب دیا جا سکتا ہے، یعنی اقتباسات جو اس میں درج ہیں اتنے فراوان ہیں۔ مثلاً VULTURE جیسے معمولی لفظ کی جو ایک مردار خور پرندے (گدھ) کا نام ہے۔ ۱۲۰ مثالیں مع حوالۂ متون درج ہیں۔ کتاب، سن، صفحہ وغیرہ۔

اس اصول اور اس پیمانے پر لغت کی تدوین کا بیڑا اٹھانا کسی ایسی ہی زبان کو سجتا ہے۔ جس کا تحریری سرمایہ بہت وسیع اور وافر ہو کہ ہر لفظ کی سند مل جائے۔ اردو ایک پسماندہ قوم سے منسوب ہو کر پسماندہ رہ گئی ہے، ورنہ اس کی لغوی صلاحیتیں لا محدود ہیں اور ان سے کسی نہ کسی حد تک کام بھی لیا گیا ہے۔ یہ زبان ایک مجمع البحور ہے۔ ہمارے مصنفین نے ایک طرف عربی فارسی کے سارے لغوی سرمائے کو اپنا ہی مال سمجھا ہے، اور دوسری طرف بعض ہندو مصنفین نے ہندو مذہب، ہندو فلسفے وغیرہ پر اپنی تصانیف میں جو ویسے سراسر اردو رسم الخط اور اردو زبان میں ہیں سنسکرت کے الفاظ اور اصلاحات دل کھول کر صرف کی ہیں۔ اسی طرح یورپی خصوصاً انگریزی الفاظ اردو میں بتدریج دخل پاتے رہے ہیں، اور اب تو ان کا بھی بند کھل پڑا ہے۔ پہلے پہل ان میں کسی قدر توڑ پھوڑ کا عمل واقع ہوتا تھا۔ اور اب تو جوں کے توں لئے جا رہے ہیں، کیونکہ اردو کی صوتیات عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی تک کئی زبانوں کی اصوات پر حاوی ہیں۔ اور اب تو ہمارے پڑھے لکھے لوگ ان آوازوں کو بھی بے تکلف ادا کرنے لگے ہیں جو پہلے اجنبی تھیں، یہ ہماری عاداتِ لسانی میں ایک نئی تبدیلی ہے، مثلاً سکون اول (جیسے سکیل، سٹوڈنٹ، سٹائل) یا فتحہ مخففہ (جیسے جیٹ، سیٹ) وغیرہ۔ حرف "ژ" ہم نے فارسی سے لیا تھا، مگر اب یہ بہت سے انگریزی الفاظ کو ادا کرنے میں خوب کام آ رہا ہے، جیسے انکلوژر، ڈویژن، ٹیلی وژن۔ حالانکہ خود فارسی والے ٹیلی وژن کو تلویزیون ہی لکھتے اور بولتے ہیں۔

اب میں مختصراً اپنے خصوصی مسائل کا ذکر کرتا ہوں۔ تدوین لغت کے سلسلے میں ہمارا سب سے بڑا اور سب سے پہلا مسئلہ مآخذ کا جمع کرنا تھا۔ یعنی ایک جامع کتب خانے کی تشکیل۔ ہمارے مآخذ اکثر ہماری دسترس سے باہر ہندوستان یا لندن میں تھے۔ پاکستان میں کتابوں خصوصاً قدیم کتابوں کو حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل تھا۔ چٹانیں کاٹنی ہوں تو آپ کاٹ بھی ڈالیں، مگر چٹانیں کہیں سے میسر بھی تو آئیں! خیر۔ پندرہ برس اور جستجو کے نتیجے میں اپنے محدود وسائل سے کام لے کر ہم نے اچھا خاصا ذخیرۂ کتب فراہم کر لیا ہے، جو شاید دوبارہ نہ ہو سکے۔ کیونکہ کتابوں کے نسخے بس جہاں ہیں وہاں ہیں جو کتابیں کبھی ارزاں اور معمولی سمجھی جاتی تھیں، اب وہ بھی عنقا ہو گئی ہیں۔

اس کے علاوہ پاکستان میں اور پاکستان کے باہر مختلف شہروں میں مقامی کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ بہت سے مائکروفلم یا فوٹو اسٹیٹ بھی بنوا کر منگوائے گئے یا مقامی طور پر اگر کسی کو مطالعۂ کتب اور اخذ الفاظ و اسناد کے کام پر مامور کیا گیا۔

ہمارا دوسرا اہم مرحلہ الفاظ و اسناد یعنی لغت کا خام مواد فراہم کرنا تھا۔ یعنی کتابوں کی خواندگی اور ان میں سے اقتباسات لینا۔ ہمارا اپنا محدود عملہ اس کام کو کہاں تک کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس میں بہت سے بیرونی اصحاب کو رضاکارانہ یا نیم رضاکارانہ طور پر شریک کیا گیا۔ کوشش یہ کی گئی کہ اس کام کو پورے ملک میں پھیلا دیا جائے تاکہ یہ صحیح معنی میں ایک قومی مہم بن جائے۔ اس سلسلے میں ہر طرح کے تجربات ہوئے۔ جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بیرونی ناظرین کی فہرست میں کم و بیش ڈھائی سو نام شامل ہیں، اور الفاظ کی مثالیں جو جمع کی گئیں وہ ۱۲ لاکھ سے زائد کارڈوں پر مشتمل ہیں۔

اخذ اسناد کا مسئلہ یعنی مواد کی فراہمی یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس سلسلہ میں متن کی صحت کا معاملہ بھی خاصا بڑا دردِ سر رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں نسخوں کی کتابت اور طباعت بڑی غیر معیاری اور بہت ہی نامعتبر رہی ہے۔ ایسی کتابیں کم ہی ہیں جن کے معتبر ایڈیشن دستیاب ہوں، اور شاید یہ بھی ایک ریکارڈ ہے کہ الا ماشاء اللہ ہم نے آج تک کوئی کتاب ایسی نہیں چھاپی جو غلطی سے یکسر مبرا ہو۔ کاتب صاحبان اور خصوصاً مطبع کے مصححین کے ہاتھوں متن کا جو حشر ہوتا ہے اس سے سبھی لکھنے والے واقف ہیں۔ اکثر و بیشتر عبارت اس طرح مسخ ہوتی ہے کہ گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ دراصل کاتب ناحق بدنام ہے۔ وہ بے چارہ تو جو کچھ لکھتا ہے آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے اور اس میں جتنی درستیاں آپ کریں سب بنا دیتا ہے۔

میں دشمن جان ڈھونڈ اپنا جو نکالا
سو حضرت دل سلمہ اللہ تعالےٰ

ساری خرابی کا ذمہ دار لیتھو کا طریق طباعت ہے۔ اس سلسلے میں آپ چھاپہ خانوں، کو جتنی بھی

دعائیں دیں، کم ہے کہ اس بے چارے کا نامۂ اعمال کچھ ہلکا ہوگا۔

ایک اور ضمنی مسئلہ سنین کی تحقیق کا تھا جو اکثر صورتوں میں نادریافت یا محض قیاسی تھے۔ ہم نے بہت سے سنین کو ازسرِ نو تحقیق کیا۔ اصول یہ ہے کہ اقتباس کے ساتھ سنِ تصنیف یا پہلی اشاعت کا سنہ درج کیا جاتا ہے۔ اور اگر یہ معلوم نہ ہو سکے تو مصنف کا سنِ وفات۔ چنانچہ بورڈ نے سنین کی دو فہرستیں مرتب کی ہیں، ایک سنین کتب اور ایک سنین وفات مصنفین سابقہ۔

اردو زبان کے بعض اور بنیادی مسئلے ابھی تک تصفیہ طلب ہیں۔ ان میں ایک اہم مسئلہ املا کا ہے، دوسرا اوقاف و رموز کا مسئلہ۔ املا میں ابھی تک بے قاعدگیاں ہیں۔ بورڈ نے اس مسئلے کو اپنے سہ ماہی جریدے "اردو نامہ" کے ایک ابتدائی شمارے میں چھیڑا تھا۔ جو سنہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اب پچھلے ہی شمارے میں ایک اور تفصیلی مقالہ اس موضوع پر شائع کیا ہے جو جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ ہندوستان سے بھی ایک کتاب رشید حسن خاں صاحب کی اس موضوع پر شائع ہوئی ہے جس میں ان بحثوں کا خلاصہ کر دیا گیا ہے جو املا کے مسائل پر وقتاً فوقتاً گذشتہ نصف صدی میں ہوتی رہی ہیں۔ یہ بات بڑی اطمینان بخش ہے کہ اب ان مسائل پر کم و بیش اتفاقِ رائے پیدا ہو گیا ہے۔ یقین ہے کہ اردو بورڈ کی لغت جب منظرِ عام پر آئے گی تو املا کے معاملہ میں قابلِ سند قرار پائے گی۔

بہرحال تدوینِ لغت کے سلسلہ کا سب سے بڑا کام الفاظ کے معنیٰ کی تقسیم و تشریح ہے اور پھر اشتقاق نگاری۔ اردو کی متداول لغات عام اس سے کہ اس ضخیم لغت کے مقابلے میں محدود و مختصر بھی ہیں۔ تشریحات کے اعتبار سے بھی تشنہ اور غیر معیاری ہیں۔ "محیط اردو" میں الفاظ کی کل تعداد ہر دوسری لغت کے مقابلے میں ۱۰۰ فی صد سے بھی زیادہ ہوگی۔ اور غالباً ۲۵۰ فیصد تک پہنچے گی۔ اب تک بارہ میں سے گیارہ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔ مگر ذخیرۂ الفاظ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، چنانچہ طباعت کے مرحلے تک ہر جلد میں ابھی اور بہت سے الفاظ کھپانے ہوں گے پہلی جلد جو صرف الف مقصورہ پر مشتمل ہے۔ ۵۵۰۰ ٹائپ شدہ فل اسکیپ کاغذوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ چھپنے چھپتے ۲۳×۳۶×۴ سائز کے ۱۵۰۰ صفحات ہو جائیں گے۔ اور ایسی کل ۱۲ جلدیں ہوں گی۔ ایک تیرھویں جلد اور ہوگی جس میں مآخذ وغیرہ کی فہرستیں درج ہوں گی۔ تشریح نگاری کے سلسلے میں متداول لغات کے علاوہ بہت سے اشخاص سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اگر یہ کام چند برس اور شروع نہ ہوتا تو پھر یہ شخصی استفادہ اور بھی مشکل ہو جاتا کہ ایسے لوگ کم ہی رہ گئے ہیں جن سے اس بارے میں رجوع کیا جا سکے۔

بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

اشتقاق کا مسئلہ اس سے بھی ٹیڑھا ہے۔ چونکہ ہمارے ملک کو سنسکرت یا برصغیر کی دوسری

زبانوں کے مطالعے سے کوئی رغبت نہیں جو بہت سے دور دراز کے مستشرقین کو تھی۔ اور اس سے پہلے ہمارے اسلاف کو بھی رہی کہ بالآخر انہوں نے یہیں کی زبانوں کو اپنا لیا تھا۔ اشتقاق نگاری کا حق لسانیات اور السنۂ مختلفہ کی ماہرانہ واقفیت کے بغیر کیا ادا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی گنے چنے دو ایک اصحاب میسر رہے ہیں۔

میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ بہت سے مسائل کے سلسلے میں مادی وسائل کا ذکر نہیں کروں گا۔ حالانکہ کانٹے کا مسئلہ وہی ہے۔ لیکن طباعت کے مسئلے کا ذکر بہر حال ضروری ہے کہ ۱۲ جلدوں کا یہ دفتر چھپ کر سامنے نہ آیا تو کس کام کا ہوا!

بورڈ نے چاہا تھا کہ چھٹی جلد کی تکمیل کے بعد ہی طباعت کا آغاز ہو جائے۔ اگرچہ اب ہمیں احساس ہے کہ یہ اقدام قبل از وقت ہوتا۔ پچھلے پانچ برس میں ہم نے اگلی جلدوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ سابقہ جلدوں میں بھی معتد بہ اضافہ کیا ہے، کیونکہ الفاظ و اسناد کی تلاش برابر جاری رہی ہے۔

لغت کا مجوزہ سائز خاصا جہازی ہے۔ فی صفحہ دو کالم اور فی کالم ۵۵ سطریں ہیں۔ کئی طرح کا ٹائپ بھی لگے گا۔ اس طرح کے ۸ صفحے روزانہ کمپوز ہو کر پہلی دوسری تیسری خواندگی کے بعد پوری طرح درست اور اغلاط سے پاک ہو کر چھپ سکیں۔ تو سمجھئے کہ بڑی بات ہے جو پریس ۸ صفحے روز کا اوسط نبھا سکے واقعی کمال کرے گا۔ اس حساب سے لغت کی کل ۱۲ جلدیں کوئی سات برس میں چھپ سکیں گی۔ بالفرض یہ اوسط ۸ کی جگہ ۴ صفحے رہ جائے تو ۱۴ برس چاہیے ہوں گے۔ اور اگر دو ہی صفحے کا اوسط رہا تو ۲۸ برس ـــــ وعلیٰ ہذا القیاس۔

"کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک"

طباعت کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ کوئی ایسا پریس ہو جو ۸ صفحے روزانہ کا اوسط برقرار رکھ سکے۔ بالفرض یہ کام کئی پریسوں میں بانٹا جائے تب بھی ہماری اپنی بساط اتنی نہیں کہ ۸ صفحات روزانہ سے زیادہ کی خاطر خواہ تصحیح کر سکیں۔

چنانچہ طویل سوچ بچار کے بعد بالآخر اپنا ہی ایک چھوٹا سا پریس لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ لغت باقاعدگی اور صحت کے ساتھ کم سے کم وقت میں چھپ سکے۔ شکر ہے کہ یہ تجویز سرکار سے بھی منظور ہو گئی ہے اور اب اس کے لئے مالی امداد کا انتظار

جناب شان الحق صاحب کے دل آویز مقالہ کے بعد۔

جناب برزمی انصاری

رکن مجلس منتظمہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ

طبع یورپ سابق مدیر اعلیٰ "اسلامک اسٹڈیز" مجلۂ علمی و تحقیقی ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد۔ حکومت پاکستان نے مصنفین و محققین کو پاکستان میں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارا محققین و مصنفین و مؤلفین گوناگوں اور متعدد

مسائل سے دوچار ہیں تاہم ان میں سرفہرست ان کتب ومصادر ومنابع کی کمیابی بلکہ نایابی ہے جو تحقیقِ علمی کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ کراچی میں رہنے والے اُن حضرات کے لئے جو تحقیق وتصنیف کے صبر آزما شغل میں مصروف ہیں طویل مسافت اور دور دراز کے فاصلے نہایت تکلیف دہ اور مشکلات میں اضافہ کا باعث ہوئے ہیں۔

اس پر طرہ یہ کہ جن علم دوست اور معارف نواز اصحاب کی ملکیت میں ذخائر کتب (مخطوطات ومطبوعات) ہیں ان میں سے بیشتر صاحب ضرورت کے علمی وتحقیقی مرتبہ سے واقف ہونے کے باوجود کتاب کو مستعار دینا گناہِ عظیم سمجھتے ہیں بعض حضرات تو اس معاملہ میں اتنے غلو پسند اور سخت گیر واقع ہوئے ہیں کہ معمولی مطبوعہ کتابوں تک کو دکھانا گوارا نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ کسی خطی کتاب کا کوئی حصہ خود ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوکر نقل کیا جا سکے؛ .... ہمارے ہاں بدقسمتی سے نادروں کے مالک خوش بخت ومتمول لوگوں کی طرح جو سفید پوش شریف آدمی تک کو لفٹ دینا اپنی شان امارت وتمول کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ اصحاب علم جن کے نجی کتب خانوں میں ہندوستان کی مطبوعہ کوئی پرانی یا کمیاب کتاب ہوتی ہے۔ اسے اس خیال باطل کے سبب دکھانا تک پسند نہیں کرتے کہ انہوں نے کسی زمانہ میں وہ کتاب جو پاکستان کے کتب فروشوں کے ہاں دستیاب نہیں۔ چند آنے یا چند روپے دے کر (یا ہو سکتا ہے کہ) ہدیۃً حاصل کی تھی۔ کتابوں کے معاملہ میں جہاں اس بخل بے جا اور خستِ علمی کی مذمت کرنا ہر علم دوست اور معارف پرور شخص کا فرض ہے وہیں کتاب مستعار لینے والوں یا کسی کمیاب ونایاب کتاب یا خطی نسخہ کی فرمائش کرنے والوں سے بھی استدعا ہے کہ وہ بھی اس امر کا پورا پورا خیال رکھیں کہ جو کتاب عاریتاً لی جائے اسے صاف صحیح۔ درست حالت میں جلد از جلد اس کے مالک کو ہزاروں بار شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے وہ بے چارہ محض کتاب خواں ہو، صاحب کتاب نہ ہو۔ اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ تبادلۂ کتب کے ضمن میں اتنی ہی فراخدلی اور کشادہ قلبی کا اظہار کیا جائے جس کی توقع دوسروں سے کی جاتی ہے۔

مقرر نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہ پاکستان وہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ پر کام کرنے کا بڑا موقع ہے۔ بہت سے میدان ایسے ہیں جن میں کسی نے ابھی تک قدم ہی نہیں رکھا۔ خود ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بارے میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس سلسلہ میں پورا مواد ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ اور جو مواد آیا بھی ہے اس سے استفادہ نہیں کیا جا سکا۔ کیونکہ وہ ابھی تک انڈیا آفس یا برٹش میوزیم کی لائبریری کی زینت بنا ہوا ہے۔ انہوں نے اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ کراچی جیسے وسیع وعریض شہر میں جو میلوں کی وسعت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ایک مرکزی تحقیقی کتب خانہ قائم کیا جائے۔ جس میں عربی۔ فارسی۔ اردو۔ انگریزی وغیرہ زبانوں کی

حوالہ کی وہ کتابیں (مطبوعہ یا خطی) موجود ہوں۔ جن کی بالعموم اہلِ تحقیق و تصنیف کو ضرورت رہتی ہے۔ موجودہ لیاقت میموریل لائبریری اگرچہ کسی حد تک اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنا ہر کس وناکس کا کام نہیں۔ سوءِ اتفاق سے وہ لائبریری ایک ایسی شاہراہ پر واقع ہے جہاں بغیر کسی مہنگی سواری کے پہونچنا دشوار ہے۔ اور کسی ایسے شخص سے جو تحقیق علمی میں مصروف ہو یہ توقع کرنا کہ وہ روزانہ دس پندرہ روپے محض آمد ورفت پر خرچ کرے گا بے جا ہے۔ یہ علم کے متلاشیوں کی مثال اُس روایتی چیل کی سی ہے جس کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ غالب کے بقول روزہ رکھنے کے لئے خس خانہ و برفاب کہاں سے لائیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر حکومتِ سندھ اور مرکزی وزارتِ معارف و ثقافت اہلِ علم کی اس جائز دشواری کو محسوس کرتے ہوئے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے موجودہ کتب خانہ میں بیش قدر اضافہ کے لئے ایک خصوصی مالی گرانٹ منظور کرے۔ جسے کتابوں کی خریدِ انتخاب اور مخطوطات کا عکس (یا مائیکرو فلم) حاصل کرنے پر خرچ کیا جائے۔ اس طرح امید ہے کہ اگر صحیح خطوط پر بے لوث علمی خدمت کے جذبہ سے کام کیا گیا تو امید ہے کہ پانچ سال میں یہ کتب خانہ اپنے مرکزی محل وقوع کی وجہ سے اس قابل ہو جائے گا کہ اہلِ تحقیق و تلاش کی بیشتر ضرورتوں کا حصہ پوری کرسکے۔ اور انہیں ادھر اُدھر دھکے کھانے سے مستغنی کردے۔

آخر میں مقرر نے جناب صدر کا حاضرین مجلس اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے عہدیداروں کا شکریہ ادا کیا۔ کہ انہوں نے ان کی تقریر کو صبر وسکون کے ساتھ سُنا۔ اور امید ظاہر کی کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس پر علمی، تحقیقی اور سرکاری حلقوں میں پوری توجہ اور تندہی سے غور کیا جائے گا۔ تاکہ مؤلفین مصنفین اور محققین کو جو مسائل درپیش ہیں۔ ان کا تسلی بخش حل جلد از جلد تلاش کیا جا سکے۔

انصاری صاحب کی تقریر کے بعد:۔

جامعہ کراچی کے پروفیسر وقار احمد رضوی کی تقریر

ہوئی۔ موصوف نے فرمایا کہ سب سے پہلے تو اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تصنیف و تالیف کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ اگر غور سے دیکھا جائے تو بیشک انسانی معاشرے کے ارتقا اور اس کو صحت مند بنانے کے لئے تصنیف و تالیف کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی معاشرہ، قوم اور ملک کو اونچا اٹھانے میں مصنف مفکر اور دانشور کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ وہ اپنی بہترین تخلیق۔ تصنیف یا اعلیٰ کتاب کے ذریعہ قوم کے دل و دماغ کو فکر و دانش کی تابانی سے روشن کرتا ہے۔ اعلیٰ تصنیف قوم کا دل و دماغ ہوتی ہے۔ اس سے پورے معاشرے میں روشنی پھیلتی ہے اور قومی تہذیب و ثقافت کا تانا بانا بنتا ہے۔ اور یہ ہر زبان اور ہر ملک میں ہوتا ہے بمثال کے طور پر انگریزی ادب میں بیکن BACON اسٹیل STEEL ہیزلٹ HAZLITT جونسن JOHNSON

اور ایڈیسن ADDISON یہ وہ مصنفین ہیں۔ جن پر انگریزی ادب فخر کرتا ہے اور جنہوں نے اپنے افکار سے انگریزی ادب کو مالا مال کیا۔

برگساں BERGSON کی مشہور زمانہ کتاب CREATIVE EVOLUTION یعنی تخلیقی ارتقاء ہے جس میں اس نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے بحث کی ہے اور مسئلہ ہست و بود کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مارکس، ہیگل کا شاگرد تھا۔ اس نے اپنی کتاب داس کیپٹال THE CAPITAL میں مادی جدلیت کا تصور پیش کیا۔ ڈانٹے نے ابو العلا معری کے رسالۃ الغفران سے اپنی مشہور کتاب DIVINE COMEDY کا مواد حاصل کیا۔ نیوٹن نے مادہ اور قوت دونوں کو الگ الگ حیثیت دی۔ آئن سٹائن EINSTEIN کا مواد حاصل کیا۔ نیوٹن نے مادہ اور قوت دونوں کو الگ الگ حیثیت دی۔ آئن سٹائن EINSTEIN نے نیوٹن کے نظریہ کی تردید کی اور مادیین کے اس نظریہ کو باطل قرار دیا کہ معلول وعلت میں ربط وتعلق لازمی ہے اور دنیا کے سامنے اپنا مشہور نظریۂ اضافیت پیش کیا۔ وہ پہلا سائنسدان ہے جس نے خدا کے وجود کو تسلیم کیا۔ اور کہا کہ کوئی مدبر ہستی ہے جو اس کائنات کی خالق ہے۔

عربی میں ابن خلدون، فارابی، بوعلی سینا ابن رشد، امام رازی اور غزالی کی تصانیف عربی زبان کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ امام غزالی کی احیاء العلوم تہافۃ الفلاسفہ، رازی کی تفسیر کبیر، فارابی کی آراء مدینۃ الفاضلۃ، عطار کی منطق الطیر، حکیم مجدالدین عارف سنائی کی حدیقۃ الحقیقۃ، شیخ بوعلی سینا کی کتاب الشفاء، میر باقر داماد کی حبل المتین، ابن رشد ابن طفیل اور ابو الصفا کی تصانیف مشرق کی وہ مایۂ ناز کتابیں ہیں جن کا جواب مغرب کی دنیا آج تک نہیں دے سکی۔

اسی طرح اردو میں علمی تصانیف کی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ اقبال، سرسید، شبلی اور ابو الکلام کے افکار سے اردو کا دامن مالا مال ہے۔ اقبال نے اپنے افکار سے قوم کو حیات تازہ بخشی اور نئی راہ دکھائی اور معاشرے میں عقل و دانش کے چراغ روشن کئے۔ انہوں نے مشہور جرمنی مفکر گوئٹے کے جواب میں پیام مشرق لکھی۔ اور فرانسیسی ادیب برگسان کے نظریۂ زمان ومکان پر تنقید کی۔ سرسید نے اپنے افکار کی تابانی سے مسلم قوم میں حریت و آزادی کی لہر دوڑا دی۔ انھوں نے انگلستان میں رہ کر سر ولیم میور کی تصنیف لائف آف محمدؐ کا جواب لکھا اور یہ ثابت کیا کہ جدید فلسفہ اور سائنس سے اسلام کی حقانیت پر کوئی ضرب نہیں پڑتی۔ انھوں نے اکتیس سال کی عمر میں آثار الصنادید لکھی جس کا گارسن دتاسی نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ آئین اکبری کی تصحیح کی اور سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے قیام کے بعد علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق نکالا۔ شبلی نے جونسن کی کتاب LIVES OF POETS کی طرز پر شعر العجم لکھی اور اپنی دوسری تصانیف الغزالی الفاروق، المامون، سیرۃ النبی سے اردو زبان کو

گراں مایہ کیا۔

اس پوری بحث سے میرا مقصد یہ ہے کہ کسی قوم کو اونچا اٹھانے اور سر بلند کرنے میں تصنیف و تالیف کی کس قدر اہمیت ہے اور یہ کہ تہذیب و ثقافت کی تعمیر میں اعلیٰ تصنیف کا کردار بہت بلند ہوتا ہے۔ اب جب یہ بات طے ہو گئی کہ تہذیب و ثقافت اور قومی نشوونما کے لئے تصنیف و تالیف کی ضرورت ہے تو اب یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس کے تین درجات ہیں۔ یعنی تصنیف و تالیف اور تحقیق تینوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ تینوں میں فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ تصنیف اس کو کہتے ہیں کہ جس میں کوئی نیا نظریہ اور نئی فکر پیش کی گئی ہو۔ جیسے اقبال کی کتاب "اسلامی الہیات کی تشکیل جدید" اور مقدمہ ابن خلدون۔ تصنیف کا پایہ سب میں بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ شخصی یا قومی فکر کا نچوڑ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا رتبہ بھی بلند ہوتا ہے۔ تالیف میں یہ ہوتا ہے کہ مختلف واقعات کو ایک جگہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ اس کو انگریزی میں COMPILATION کہتے ہیں جیسے مولوی بشیر صاحب کی "واقعات دار السلطنت" کہ اس میں دار السلطنت دہلی کے بارے میں مختلف تاریخی واقعات کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ تحقیق کا درجہ تالیف کے بعد ہے۔ تحقیق اس سے آگے کی چیز ہے اور وہ یہ کہ کسی نئی بات یا کسی نئے علمی گوشہ کو دریافت کیا جائے۔ یا کسی موضوع پر ایسی تحقیقی معلومات فراہم کی جائیں جو عام نگاہوں سے پوشیدہ ہوں۔ مثال کے طور پر خالق باری کو عام طور سے امیر خسرو کی تصنیف مانا جاتا تھا۔ لیکن اب جدید تحقیق یہ ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔ اسی کا نام تحقیق ہے۔

تجویز

آخر میں ایک تجویز پیش کروں گا اور وہ یہ کہ کچھ عرصہ ہوا ملک میں ایس۔ ڈی۔ پی کا ایک سلسلہ نوجوانوں کی ہمت افزائی اور بیروزگاری الاؤنس کی شکل میں جاری ہوا تھا اسکیم ناکام رہی۔ نہ طلبہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور نہ کوئی ٹھوس کام ہی ہوا۔ اس کے بجائے اگر یہی رقم بطور اسکالرشپ طلبہ کو اس شرط پر دی جاتی کہ وہ تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے کر دکھائیں تب ان کو اسکالرشپ ملے گا۔ تو میں سمجھتا ہوں اب تک ملک میں پی ایچ ڈی کی کثیر تعداد پیدا ہو جاتی۔ جیسا کہ دوسرے ممالک میں ہوتا ہے کہ فرسٹ کلاس ایم۔ اے۔ ایم۔ ایس۔ سی طلبہ کو جونیئر یا سینئر ریسرچ اسکالرشپ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے ہاں بھی یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے فرسٹ کلاس ایم ایس سی طلبہ کو ڈاکٹریٹ کرنے کے لئے اسکالرشپ دیئے جائیں تو میں سمجھتا ہوں نئی نسل تحقیق کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے سکتی ہے۔ اس سے نوجوانوں کی ہمت افزائی بھی ہو گی اور ان میں تحقیقی رجحان بڑھے گا۔

جناب پروفیسر وقار احمد رضوی صاحب کے بعد اگلے مقرر:۔

پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب تھے۔ موضوع گفتگو "تحقیقی مسائل کی دشواریوں" پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمارے پاکستان اور کراچی میں کتابیں نہ ملنے کی وجہ سے بہت مشکل کا سامنا ہے۔ جناب بزمی انصاری صاحب نے عہد شاہجہانی کے سعد اللہ خاں کے حالات بڑی کاوش سے جمع کئے لیکن وہ تمام دشواریوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ دراصل تمام علمی اداروں میں ایک ربط ہونا چاہیئے۔ اور کتابوں کی فہرستوں کا تبادلہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون کونسی کتابیں کہاں کہاں موجود ہیں۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ کمیاب کتابیں دوبارہ شائع کی جا سکیں گی۔ تحقیقی اداروں سے ملک کا علمی وقار بلند کرنے کے لئے معیاری اور تحقیقی مقالے بھی شائع ہونے چاہئیں۔ جن کی طباعت معیاری ہو۔

ہماری یونیورسٹیوں کو بھی تحقیق کے میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔ اور وہ ایسے لوگ پیدا کریں جو تحقیق کر سکیں۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ ایس۔ سی کے خصوصی مقالے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے تھیسسوں کا بلا تاخیر اشاعت پذیر ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ اہل علم دیکھ سکیں کہ کیا کام کر دیا گیا اور کیا کام ہوا۔

مختلف کتب خانوں کی مخطوطات کی فہرستوں کی اشاعت کی سخت ضرورت ہے۔ اسی طرح شخصی کتب خانوں کی فہرستیں مخطوطات بھی مرتب کر کے شائع کی جائیں۔ سندھ اور پنجاب کے ذاتی کتب خانوں، مدرسوں اور خانقاہوں میں مخطوطات کی شکل میں خزانہ چھپا پڑا ہے۔ اس کا ایک مکمل سروے ہونا چاہیئے۔ محققین اور دانشوروں کی ان مخطوطات تک رسائی نہیں ہے۔ ان کو سہولتیں ملنی چاہئیں۔

پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کی تقریر کے خاتمہ پر جامعہ کراچی کے **پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام** کی تقریر ہوئی۔ آپ کے تعارف کے سلسلہ میں سید الطاف علی بریلوی نے ڈاکٹر صاحب کے علمی و تحقیقی کاموں اور بلند پایہ تصانیف کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا اور کہا کہ اپنے علم و فضل کے باعث آپ کراچی یونیورسٹی کی آبرو ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ بعض باتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ ہو جائیں تو بڑی آسانی ہو جائے۔ مثلاً ایران سے ہمارے گہرے دوستانہ تعلقات ہیں۔ وہاں بڑے معیاری رسالے نکلتے ہیں۔ اور اگر وہ مہیا ہو جایا کریں تو بڑی مدد مل سکتی ہے۔ ایران میں جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں۔ باہر کے ملکوں کی لائبریریوں میں سب سے کم کتابیں ہماری ہوتی ہیں اور وہاں کے عالم ہم سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان میں اتنی کم کتابیں کیوں شائع ہوتی ہیں۔

علمی اور تحقیقی کام میں آئندہ کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے تو جہاں تک علماء اور محققین کی ذمہ داری ہے

وہاں حکومت کی بھی ذمہ داری ہے۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ گذشتہ تین سال کے عرصہ میں حکومت کی طرف سے کافی ہمت افزائی ہوئی ہے۔ خود ہماری کراچی یونیورسٹی میں بہت کم رسالے اور کتابیں آتی ہیں۔ بہت سے باصلاحیت لوگ ہیں لیکن روپیہ کی ضرورت ہے۔ اچھی کتابیں لکھنے اور چھپوانے کے لئے گورنمنٹ گرانٹ ہونی چاہئے۔ یونیورسٹی کا اپنا ایک پریس بھی ہونا چاہئے۔ ترقی یافتہ ملکوں کو ہر طرح کی آسانیاں ہوتی ہیں۔ گھر بیٹھے کتابیں آجاتی ہیں۔ جہاں سے چاہیں منگوالیں نہ اسی طرح کتابوں کے چھپوانے میں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوتی۔ ہم پاکستانی دعویٰ کرتے ہیں کہ علمی اعتبار سے ہمارا اونچا مقام ہے۔ اس دعوے کو عملاً صحیح ثابت کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر ریاض الاسلام کی پُر اثر اور افادیت سے بھرپور تقریر کے بعد جامعہ کراچی کے ممتاز اساتذہ کرام

ڈاکٹر منظور احمد (شعبۂ فلاسفی)

ڈاکٹر منظور الدین احمد (شعبۂ پولیٹیکل سائنس)

اور ڈاکٹر سید بشارت علی (شعبۂ سوشیالوجی)

نے بھی بصیرت افروز اور پُر مغز تقاریر سے جلسہ کو نوازا۔ ان صاحبان نے نفسیاتی مسائل۔ مالی وسائل اور علمی مسائل پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ اور حاضرین سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

آخر میں

ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی
وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

سے تقریر صدارت کرنے کی درخواست کی گئی۔ جناب موصوف نے فرمایا کہ مجھے بڑی خوشی اور فخر ہے کہ اس مجلس کی صدارت کا اعزاز بخشا گیا۔ جہاں تک موضوعِ گفتگو کا تعلق ہے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تحقیقی کام کے تمام قصے میں زبان کا کتنا حصہ ہے۔ موسیقی میں سروں اور تالوں کی قدر ہے لیکن تحقیقی کام بغیر زبان کے پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچتے اور افسوس ہے کہ گذشتہ ساٹھ ستر سال میں زبان ہی کے مسائل دن بدن الجھتے چلے جارہے ہیں ـــ جو قوم یہ طے نہ کر سکے کہ اسے اپنے بچوں کو کس زبان میں تعلیم دے اور کس زبان کے ذریعہ وہ اپنے قومی وقار کو بلند کرنے کی سعی کرے اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ اسی طرح ثقافت کا سیدھا سادہ معاملہ بلا ضرورت جانے کیا سے کیا ہوا جارہا ہے۔ ؎

ذکر جب چھڑ گیا ثقافت کا
بات پہونچی مونجو ڈارو تک

ڈاکٹر صاحب نے قدیم نظام تعلیم کے بارے میں فرمایا کہ اپنے زمانہ میں ہمارا کلام مجید۔ آمد نامہ

خالق باری اور گلستان۔ وغیرہ سے واسطہ رہتا تھا۔ اس کے بعد ہم مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی کتابیں پڑھتے تھے جن سے اتنا آجاتا تھا کہ چار پانچ سال کے بعد ہائی اسکول میں داخلہ مل جاتا تھا۔۔۔ اُس زمانہ کا میٹرک بڑا قابل ہوتا تھا۔ لیکن آجکل بی۔ اے بھی عرضی نہیں لکھ سکتا۔ ہندوستان پاکستان کے کتنے لوگ ایسے ہیں جو علمی اعتبار سے اونچے معیار کے ہیں۔ کیونکہ جب تک اپنی زبان میں حصول علم نہ کیا جائے گا کوئی کارنامہ انجام نہیں پا سکتا۔ میں برابر یہ کوشش کرتا ہوں اور ظاہر کرتا رہتا ہوں کہ جب تک اپنی زبان نہ ہوگی ہم قابل لوگ پیدا نہیں کرسکتے۔ جرمنی میں ۱۹ انیس سال سے پہلے یونیورسٹی میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا۔ ہماری فرو گذاشتیں بے حد و حساب ہیں جن کا خمیازہ نئی نسل بھگت رہی ہے لشتم پشتم کام تو چلتا رہے گا لیکن جب تک اصلاح کی کوشش نہ ہوگی من حیث القوم ہم کوئی مقام حاصل نہیں کرسکتے۔

جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی صاحب نے نوجوانوں سے بھی اپیل کی کہ وہ اپنے کو سخت محنت کا عادی بنائیں۔ کوئی خود ستائی نہیں کاتی ضعیف ہوجانے کے باوجود میں پانچ پانچ گھنٹے لگاتار لیبارٹری میں کھڑے کھڑے کام کرتا ہوں۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر کے دوران بنیادی سائنس اور اخلاقی سائنس پر بھی روشنی ڈالی اور فرمایا کہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے)

صدر اجلاس جناب ڈاکٹر صاحب کی برجستہ تقریر رات کو نو بج کر چھپن منٹ تک جاری رہی اور مجمع نے اُسے کمالِ دلچسپی سے سنا۔

سید الطاف علی بریلوی
تقریر سپاس

سب سے آخر میں سید الطاف علی بریلوی سکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے صدر محترم۔۔۔ فاضل مقررین اور جملہ حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ ساتھ ہی موضوعِ بحث سے متعلق بھی چند خیالات کا اظہار کیا۔۔۔ الطاف علی نے کہا کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذۂ کرام (معزز مستثنیات سے قطع نظر) عام طور پر اُن کو فراغت و اطمینان کی زندگی میسر آجاتی ہے تو پھر لکھنے پڑھنے کے کاروبار سے غافل ہوجاتے ہیں۔ اُن کی زندگی امیرانہ بن جاتی ہے۔ اور شب و روز کی مصروفیات بھی کچھ اسی طرح کی ہوجاتی ہیں۔ بڑی بڑی پوزیشن کے اور نہایت نامور پروفیسر صاحبان کی پوری پوری عمر گذر جاتی ہے اور وہ اپنی یادگار میں اور اپنے سبجکٹ پر کوئی معیاری کتاب لکھ کر اپنے پیچھے نہیں چھوڑتے۔ نتیجہ میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے لئے بیرونی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ الہ آباد یا بعض دوسری یونیورسٹیوں کے لکچرار صاحبان کی لکھی ہوئی

کتابیں ہاتھ میں لے کر لوگ ایم۔ اے کے کلاسوں کو پڑھاتے ہیں۔ ایک اور چیز شاہدہ میں آتی ہے کہ مثلاً سائنس کے تو ٹیچر ہیں اور افسانہ نگاری اور ادبی تنقید میں سر کھپاتے رہتے ہیں۔

یوروپین اور امریکن اسکالروں سے بھی ہماری مرعوبیت روز افزوں ہے۔ اور ہم احساسِ کمتری کا شکار ہو کر ان کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ ہماری کوئی کانفرنس اور مذاکرہ علمی و تعلیمی اس وقت تک کامیاب نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک کہ غیر ملکی دانشور رونق دہ مجلس نہ ہوں۔ وہ کیا لکھ کر لاتے ہیں اور کیا تقریر کرتے ہیں، اس سے کچھ مطلب نہیں! بس اسی قدر کافی ہے کہ-

؏ مستند ہے ان کا فرمایا ہوا

ہمارے اپنے ملک سے جو ثقافتی وفود باہر جاتے ہیں ان کا معاملہ بھی کبھی انصاف پر مبنی نہیں ہوتا۔ چند مخصوص ہستیاں ہیں جن کی لوٹ پھیر رہتی ہے۔ ایسے عنقا صفت لوگ ہمارے چھ کروڑ آبادی کے ملک نے گویا کہ آج تک پیدا ہی نہیں کئے ـــــ اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو ان کے بعد بھی ان کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا نہ ملے گا۔

کاش کوئی اللہ کا نیک بندہ حق و صداقت کی ترازو ہاتھ میں لے کر اپنے ملک کے حقیقی باکمالوں پر بھی ریسرچ کرتا کہ کیسے کیسے انمول موتی اور کوہِ نور جیسے ہیرے ہماری بے توجہی اور ناقدری کے گرد و غبار میں اٹے پڑے ہیں۔ شاید ایسی ہی صورتِ حال کے لئے شاعر نے کہا تھا کہ

؏ اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالان

یا

؏ قوتِ داناں ہمہ از خونِ جگر می بینم

حضرات! میں اپنی اس ہرزہ سرائی کے لئے معذرت خواہ ہوں اور ادارہ کی جانب سے آپ سب کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اجلاس

"شعبۂ قومی زبان ذریعۂ تعلیم"

یہ اجلاس بھی ۲۹ اگست ۱۹۷۵ء کو صبح ۹ بجے کانفرنس لائبریری ہال میں منعقد ہوا۔ اس کے اسٹیج سکریٹری کے فرائض پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب (گورنمنٹ اردو کالج) نے انجام دیئے۔ ——— مقامی و بیرونی ادیبوں، شاعروں اور اردو کے اساتذہ نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

کارروائی جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے از مولانا ملک جمال الدین صاحب۔ جنرل سکریٹری انجمن فیض الاسلام راولپنڈی سے ہوا۔ بعد ازاں بہ اتفاق آراء نامور مصنف جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی پشاور یونیورسٹی کرسیٔ صدارت پر رونق افروز ہوئے۔

صدر محترم کے حسب ہدایت درج ذیل مقالات فرداً فرداً پڑھے گئے۔ ہر ایک مقالہ نگار کا اس کے شایان شان اسٹیج سکریٹری نے تعارف کرایا۔ بیچ بیچ میں حاضرین کی جانب سے بعض نکات پر لسانی و علمی پر سوالات کا سلسلہ بھی رہا جن کے مقالہ نگاروں نے شافی جوابات دیئے۔

قومی زبان ذریعۂ تعلیم

تاریخی پس منظر سے ایک دلیل

ڈاکٹر جان جوزف

آج ۲۹ اگست ۱۹۷۵ء کا دن ہے اور ہم پاک و ہند کے اس خطہ میں بیٹھے بات کر رہے ہیں جو اس برصغیر کا کوئی دور افتادہ کونہ کھدرا نہیں بلکہ سرزمین پاکستان ہے۔ اس لئے حیرت کا مقام ہے۔ کہ یہاں آج کے دن بھی یہ سوال کسی قطعی جواب کا منتظر ہے کہ آیا قومی زبان یعنی اردو ذریعۂ تعلیم ہونی چاہئے یا نہیں؟

میں آپ کو آج سے چار سو سال پہلے کے ایک لمحۂ فکریہ میں لے چلتا ہوں جہاں اساتذہ اور صاحبانِ اختیار اس مسئلہ پر غور و فکر کر رہے تھے کہ اپنے تعلیمی ادارہ کے لئے کون سے مضامین ضروری قرار دیں۔ چونکہ اس ادارہ کو سارے ہندوستان میں بھیجنے کے لئے طلبا تیار کرنے تھے۔ اس لئے آج سے چار سو سال پہلے نگاہِ دوررس رکھنے والے ایک مدبر نے رائے دی کہ اس اسکول میں فارسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان بھی سکھائی جائے۔

یہ ۲۷ ستمبر ۱۵۸۲ء کی بات ہے۔ اور یاد رہے کہ یہ اسکول یو۔ پی یا دہلی میں نہیں بلکہ گوا میں کھولا جا رہا تھا۔ اس وقت پرتگالیوں کو گوا میں آئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا پھر بھی اپنے ماحول کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی وجہ سے وہ معلوم کر چکے تھے کہ گوا سے تبت تک رابطہ کی اگر کوئی زبان ہے تو وہ ہندوستانی ہے۔ اور گوا کے اس اسکول میں چونکہ ایسے اشخاص تیار کئے جاتے تھے جو تجارتی، سیاسی، علمی اور دینی اغراض یا مترجم یا فوجی کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں جاتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے ہندوستانی زبان ضروری سمجھی گئی۔

اسی وقت کا ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمایئے جو اکبر کے وقت پیش آیا۔ اسے اکبر کے دربار سے منسلک ایک مسیحی راہب اپنے ایک خط میں یوں بیان کرتے ہیں۔ "منگل ۲۴ ستمبر (۱۵۸۲ء) بعد از دو پہر شہنشاہ (اکبر) ہمارے عبادت خانہ میں DOMINIC PIRES کی رسم نکاح کے موقع پر تشریف لایا .... نکاح کے وقت میں نے دولہا اور دلہن کو نصیحت کرنا چاہی۔ دلہن (مقامی عورت ہونے کی وجہ سے) میری بات نہیں سمجھتی تھی۔ اس لئے جو کچھ میں فارسی میں کہتا تھا شہنشاہ اکبر اس کا ترجمہ مقامی بولی میں کرتا جاتا تھا۔"

ایسے واقعات سے ان علما پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ فارسی دربار میں اور پڑھے لکھے حضرات کے لئے تو ذریعۂ ابلاغ ہو سکتی ہے لیکن عوام تک پہنچنے کے لئے تدریس و تعلیم کی زبان ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔

علما کے اس تیقن کا عملی نتیجہ بہت جلد تحریری صورت میں ظاہر ہو گیا۔ اس وقت دربار اکبری میں تین پرتگالی مسیحی علما آتے تھے اور چونکہ وہ ہندوستانی زبان کی اہمیت کے بہت جلد قائل ہو چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے ۱۵۹۰ء کے لگ بھگ ایک پرتگالی۔ ہندوستانی۔ فارسی لغت تیار کی جس کے تین کالم تھے۔ ایک میں پرتگالی لفظ، دوسرے میں ہندوستانی اور تیسرے میں فارسی لفظ درج تھا۔ اردو کی غالباً یہ پہلی لغت ہے۔ یاد رہے یہ ۱۵۹۰ء کی بات ہے۔

علاوہ ازیں ان علماء کے نزدیک ہندوستانی کی اہمیت اس رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ جو ۱۶۰۰ء میں ایک عالم CORSI سے متعلق لکھی

گئی کہ اس نے فارسی سیکھ لی ہے۔ اور اب ہندستانی سیکھ رہا ہے۔ جو اس ملک کی زبان ہے۔

۱۶۰۴ء ہی میں جیروم زیویر، اکبر کے دربار سے لکھے ہوئے اپنے ایک خط میں بتاتے ہیں کہ پرتگالی جنگی قیدیوں کی موجودگی کی وجہ سے ہر اتوار کو مذہبی تلقین و تدریس دو زبانوں میں ہوتی ہے۔ پرتگالی میں اور مقامی باشندوں کی اپنی بولی میں۔ دربار اکبری کے مسیحی علما نے اکبر کے کہنے پر بہت سی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مثلاً مرآۃ القدس یعنی داستان حضرت عیسیٰ، آداب سلطنت، اصحالف و مقدمات فلاسفہ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کتابوں سے عوام کی تربیت ناممکن تھی۔ اس لئے عوام کی تربیت کے لئے انہوں نے ۱۶۱۱ء میں ہندوستانی یعنی اردو کو ذریعۂ تدریس و تعلیم بنانے کے لئے ایک مختصر سی کتاب ہندوستانی میں لکھی۔ اس طرح ۱۶۱۱ء میں اردو کی پہلی "ٹیکسٹ بک" لکھی گئی۔

اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی بنیاد رکھی تو اکبر کے دربار میں گئی لیکن اس کام کو گوا کے سینٹ پالز کالج نے جاری رکھا۔ جہاں سے سترہویں صدی کے شروع ہی میں ایک کانکنی اور سمالی بولی کا گرامر چھپا۔ پھر ۱۶۵۰ء کے لگ بھگ وہاں سے IGNACIO ARCAMONE, S.J. نے ہندستانی میں اپنے نو وارد ساتھیوں کے لئے "راہ نما" INDICA JANUA کے عنوان سے کانکنی اور دکنی زبان کے لئے ایک MANUAL تیار کیا۔

اس سلسلہ میں میں سیرام پور کا ذکر نہیں کروں گا۔ وہاں ۱۸۰۰ء سے اردو تراجم کا کام شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا دائرہ صرف بائیبل مقدس تک محدود تھا۔ اور نہ ہی یہاں فورٹ ولیم کالج کا ذکر مناسب ہوگا کیونکہ وہاں بھی ترجمے کا کام ابھی جنوں، پریوں، طوطاؤں میناؤں اور درویشوں کی کہانیوں سے زیادہ آگے نہیں بڑھا تھا۔

اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سلسلہ میں سینٹ پالز کالج گوا کے بعد دہلی ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کا نام آتا ہے جس کے تحت ماسٹر رام چندر (جو مذہباً مسیحی تھے) نے ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ "الجبرا اور علم مثلث پر ایسی کتابیں لکھیں جو طلبا میں اتنی مقبول ہوئیں کہ کالج والوں نے شعبۂ مشرقی کے طلبا کی سہولت کے لئے انہیں نصاب میں داخل کر لیا۔ رام چندر نے ریاضی کے علاوہ علم ہیئت اور علم طبعی پر کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کر دیا۔ ان کی ایک کتاب کے ابواب ملاحظہ ہوں: "باب اول میں حرارت ..... دوم میں علم ہیئت ..... سوم میں علم آب و ہوا ..... چہارم میں علم ہوا ..... پنجم مناظر ..... ششم الکٹریسٹی یعنی بجلی ..... ہفتم میگنیٹزم یعنی مقناطیس ..... باب ہشتم میں حال حرارت کا مندرج ہے۔ اور مضامین مشکل کو ایسے طریقہ سہل پر بیان کیا گیا ہے کہ ہر خاص و عام کے فہم میں بآسانی آجاویں"

اگرچہ رام چندر کے زمانہ تک علمی مسائل اور فنون پر بہت کم کتابیں لکھی گئی تھیں اور مصنفین کی

ساری توجہ بقول محمد حسین آزاد "مضامین عاشقانہ
اور گلگشتِ مستانہ" تک محدود تھی لیکن جب انہوں
نے وقت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے اردو میں علمی
اور سنجیدہ مضامین ادا کرنے کی کوشش کی تو اردو
زبان و ادب میں نئے راستے نکل آئے جس پر بعد
میں ان کے شاگرد ذکاء اللہ، نذیر احمد اور خود
سر سید احمد خاں نے قدم اٹھائے اور اپنے ہمہ گیر
مضامین سے ثابت کر دیا کہ اردو ہر قسم کی حقیقت
نگاری کی متحمل ہو سکتی ہے۔

اردو زبان نے جب اس مفروضہ کو غلط
ثابت کر دیا کہ اس میں سنجیدہ مضامین نہیں سما
سکتے تو پھر یہ زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہو گئی۔
پچھلی صدی تک برصغیر پاک و ہند میں قبروں پر
کتبے عربی، فارسی یا انگریزی میں ہوا کرتے تھے۔
پھر ۱۸۵۷ء میں چند لوگوں کو اپنے عزیز مرحوموں
کی یادگار اردو میں تحریر کرنے کا خیال آیا۔ "دہلی
کی جنگی فوج کے انگریزی اور ہندوستانی افسر
اور سپاہی جو ۳۰ مئی اور ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کے
درمیان لڑائی میں مارے گئے اور زخمی یا بیمار
ہو کر مر گئے ان کی یادگار کے واسطے ان کے
ساتھیوں نے جن کو ان کی موت کا رنج ہے اور
سرکار نے جس کی خدمت میں وہ اس طرح کام
آئے یہ یادگار بنوایا۔ فقط" MUTINY
MEMORIAL IN DEHLI یہ کتبہ (ٹائیکل)
TAIKAL قبرستان پشاور میں ۱۴ جنوری ۱۸۶۳ء

کو لکھا گیا۔ RAGER EDMUND CLARK
"جب تک گیہوں کا دانہ زمین میں گر کر مر نہ جاوے
اکیلا رہتا ہے۔ پر اگر مرے تو بہت سا پھل ہے
یوحنا ۱۲: ۱۴ آیت (حوالہ یوحنا ۱۲: ۲۴ ہے)۔

اور دہلی کے اجمیری گیٹ قبرستان میں ۲۲
جولائی ۱۸۹۴ء میں ALENANDER
CHARLES MAITLAND کی قبر پر درج
ہے: "تو مرنے تک ایماندار رہ۔ تو میں زندگی کا
تاج تجھے دوں گا"

اور یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ شروع
میں مسیحیوں کی قبروں پر بھی فارسی کے کتبے ہی
ہوا کرتے تھے، اردو آہستہ آہستہ در آئی۔
مثال کے طور پر دہلی کے قبرستان کا ۱۰ جنوری
۱۸۶۲ء کا کتبہ ملاحظہ ہو:-

اللہ

یا مسیح　　اللہ

در یاد مسیح چوں مسیح بین بے یار
رحلت فرمود زین جہاں جانکاہ
یکشنبہ بتاریخ دھم ز جنوری نمود
در خلد برش اللہ

آخر میں ایک مثال اور ملاحظہ فرمایئے جس
سے مزید ثابت ہوتا ہے کہ اردو کو جہاں بھی
موقع دیا جائے وہ مکمل ذریعہ ابلاغ ثابت ہو سکتی
ہے۔ صدیوں سے کاتھولک مسیحیوں کے لئے عبادت
کی زبان صرف لاطینی تھی۔ چند سال ہوئے پاپائے روم

نے ملکی زبان میں عبادت کرنے کی اجازت دی تو راقم الحروف نے چند ساتھیوں کی مدد سے لاطینی عبادتی کتاب کا ۱۱۳۶ صفحات پر مشتمل اردو ترجمہ کیا جس سے واضح ہوا کہ اردو کے دامن میں کتنی وسعت ہے۔ یہ ۵ ردسمبر ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ اس وقت سے پاکستان بھر کے ہر شہر اور ہر گاؤں میں مسیحی عبادت اردو میں ادا ہوتی ہے۔ اور مسیحی مومنین اس میں نہ صرف دل بلکہ دماغ کے ساتھ بھی حصہ لیتے ہیں۔

میں نے اس مضمون میں صرف مسیحی مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ میری تحقیق کا دائرہ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں مسیحیوں کا حصہ ہے۔ اور دوسری وجہ شاید ابراہیم جلیس کا یہ مشاہدہ ہے۔

"کراچی والوں کو اپنی انجمنوں کے لئے اردو نام نہیں ملتے۔ وہ ان کے انگریزی نام رکھتے ہیں۔ لیکن جب کاتھولک مسیحی انجمن بنانا چاہیں تو انہیں نہایت آسانی کے ساتھ "کاتھولک تنظیم المصنفین" کا اردو نام مل جاتا ہے۔"[۱۵]

جناب پروفیسر شاکر عظیم

ایم۔اے۔بی ایڈ گورنمنٹ
لیاقت کالج ملیر کراچی

خواتین و حضرات! "قومی زبان ذریعہ تعلیم" کا ذکر جب چھڑتے ہیں تو یہ ذکر یار سے کچھ کم دلچسپ نہیں ہے۔ اسی طرح یہ حکایت دراز ذکر شب فراق اور زلف یار سے کم دراز نہیں ہے۔ اس بحث میں وادی عشق کی طرح بہت سے نشیب و فراز آتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں اس کا مفہوم صرف اور صرف ایک ہی متعین ہوتا ہے یعنی "اردو زبان ذریعۂ تعلیم" یہ وہ زبان ہے جو کبھی مغلوں کے دربار میں تخت نشین تھی، کبھی صوفیائے کرام کی مجلس میں مسند فگن رہی کبھی خواص کی مجلس کی زینت بنی رہی کبھی عوام کے دلوں پر حکمران و متمکن رہی۔

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے مذہب، تہذیب، ثقافت اور اقدار زندگی کی انفرادیت اور تشخص کی ہمیشہ اسلام نے حفاظت کی اور اسلام سے گہرا لگاؤ اور تعلق جب بذریعۂ ابلاغ ہمارے دلوں میں متعین ہوا تو وہ ہماری قومی زبان اردو ہی کے ذریعہ ہوا۔ اگر ہمارا ذریعۂ ابلاغ اردو نہ ہوتا تو ہمیں پاکستان کی منزل تک پہنچنے میں ابھی مزید وقت لگتا۔ یہ اردو اور صرف اردو تھی جس کی ہر بات ہمارے دلوں میں اتر گئی۔ جو خواص و عوام کی یکساں زبان تھی جو ہر مکتبۂ فکر میں بولی اور سمجھی جاتی تھی جس کے ذریعہ ہم دوسروں کی باتوں کو سمجھے اور دوسروں کو اپنی بات سمجھاتے تھے۔

قومی زبان اردو ہماری ثقافت، تہذیب اقدار زندگی کی رہین و محافظ ہے، اس زبان میں اسلام اور اسلامی علوم سے متعلق بہت بڑا سرمایہ محفوظ ہے بعض محقق یہاں تک کہتے ہیں کہ خود

عربی میں اسلامی علوم و فنون پر علم کا اتنا عظیم سرمایہ نہیں ہے۔ پچھلی ایک صدی میں جتنا اسلامی اور دینی و علمی کام اردو میں ہوا۔ اس کی نظیر دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔ صرف قرآن کی تفاسیر ہی کو لے لیں تو جتنا کام اس سلسلہ میں ہماری قومی زبان اردو میں ہوا ہے اس کا مقابلہ کوئی اور دوسری زبان قطعی نہیں کر سکتی۔

یہ اردو کا طفیل تھا جس نے ایک نسل ایسی پیدا کی جس نے برصغیر میں مسلمانوں کے قومی تشخص کی نشاندہی کے لئے عظیم ترین کام انجام دیئے۔ سرسید کے تہذیب الاخلاق سے لے کر آج تک کے اردو رسائل و اخبارات نے جو خدمات اس خطہ کے مسلمانوں کی انفرادیت اور قومی کردار کے متعین کرنے کے لئے انجام دی ہیں۔ کوئی دوسری زبان اس کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

پاکستان کے قیام میں جن محرکات نے کام کئے ہیں۔ ان میں ایک عظیم عنصر ہماری قومی زبان اردو کو حاصل ہے۔ اگر ہم اس عظیم گہرائی و گیرائی سے آراستہ و پیراستہ ذریعہ ابلاغ سے محروم ہوتے تو ہم اپنی منزل پر اتنی سرعت سے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اردو زبان نے ہمیں ایک خاص تہذیب، ثقافت، مزاج، رہن سہن کا انداز۔ زندگی گزارنے کے طور طریق عطا کئے ہیں۔ اردو کل بھی اور آج بھی شرافت، ثقافت، متانت، سنجیدگی۔ وسیع النظری کشادہ دلی اور حب الوطنی کی علامت ہے۔ جس طرح ایک فرد مختلف علاقوں میں رہنے کے باوجود کبھی مسجد میں داخل ہوتا ہے۔ تو مسجد کا احترام اس کی نظروں کو جھکائے رکھتا ہے۔ اس کی آواز دھیمی ہوتی اور وہ مسجد میں پہنچتے ہی باادب اور سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب ہم قومی زبان میں اپنے افکار و آراء کو اظہار کا جامہ عطا کرتے ہیں تو ہمیں بھی سنجیدہ اور متین ہو جانا لازمی ہو جاتا ہے۔

یہ قومی زبان ہی کا کرشمہ تھا جس نے ہم کو تحریک آزادی کے لئے جوشیلے اور کچھ کر گذرنے کے لئے نعرہ آزادی عطا کیا۔ "آزاد ہیں، آزاد ہیں آزاد رہیں گے۔ انقلاب زندہ باد۔ لڑ کے لیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان، نعرۂ تکبیر اللہ اکبر" یہ سارے نعرے ہماری قومی زبان اردو نے عطا کئے۔ بانیٔ پاکستان کے لئے قائد اعظم کا لقب خود اردو کا مرہون منت ہے۔ ہمارے عظیم مدبر نابغۂ روزگار سیاست داں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے نام کے ساتھ قائد عوام کا لقب خود اردو زبان کا دیا ہوا ہے

حضرات و خواتین اوپر جو کچھ میں نے عرض کیا اس کا مقصد قومی زبان کی افادیت انفرادیت اور اہمیت کی طرف آپ کی توجہ کو مبذول کرانا تھا۔ جب یہ بات صاف ہو چکی کہ اس مملکت کی تعمیر میں اردو ہی نے سب سے اہم اور متحرک کردار ادا کیا ہے تو پھر ہم اس زبان کو عملاً پورے طور پر اور للہیت و اخلاص نیت کے ساتھ اپنے معاشرے میں نافذ اور جاری و ساری نہ کریں تو اس کا کوئی

اخلاق جواز نہیں ہو سکتا۔ ع

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

جب تک ہم قومی زبان کو پورے طور پر قولاً اور فعلاً ذریعہ تعلیم کے لئے کام میں نہیں لائیں گے۔ ہم نئی پود اور آنے والی نسل کو پاکستان اور اس کے قیام کے عوامل و افکار سے پورے طور پر آگاہ نہیں کر سکیں گے۔ اور جب تک ہم اپنی اولاد در اولاد کو ان عوامل و حقائق سے روشناس نہیں کرائیں گے ہم پاکستان کی وہ مضبوط اور مربوط عمارت کھڑی نہیں کر سکیں گے جو اس مملکت خداداد کے قیام کا مقصد اولین تھا۔

ہمارے بچے اگر قومی زبان میں تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ تو اپنے مذہب، ثقافت، تہذیب، اسلاف اور اپنے آبا و اجداد سے انہیں گہرا لگاؤ پیدا نہیں ہو سکے گا۔ اور جب تک ہماری نسل کی جڑیں اپنے اسلاف کے ساتھ پیوستہ و مربوط نہیں ہو پائیں گی۔ ہم پاکستانی قومیت کا صحیح تشخص بھی قائم نہیں کر سکیں گے۔

ہم نے اس مضمون کے شروع میں ذکر کیا ہے کہ اسلام کے علاوہ دوسرا جو اہم عنصر قیام پاکستان کا باعث ہوا۔ وہ اردو تھا۔ اس کی افادیت و صداقت آج بھی واضح ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے برصغیر کے ۰ اکروڑ مسلمانوں کو جو غیر منقسم ہندوستان کے سارے صوبوں اور علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اسلام کے بعد اردو نے انہیں تسبیح کے دانوں کی طرح ایک قوم اور ایک ملت کے دھاگے میں پرو دئیے رکھا۔ ایک علاقہ کا مسلمان جب دوسرے علاقہ کے مسلمان سے ملتا تھا تو ان کے درمیان اظہار مدعا کے لئے اردو اور صرف اردو زبان ہی ترجمانی کا کام دیتی تھی۔ آج بھی قومی زبان یہ فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہی ہے۔ اب اگر ہم پورے طور پر تعلیم و تعلم میں اس کو نافذ اور جاری نہ کریں گے۔ تو ہم ایک قومیت کی بات نہ کر سکیں گے۔

جو لوگ چار قومیتوں کی باتیں کرتے ہیں ان کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ قومیتیں پاکستانی قومیت کے ساتھ وابستگی کی صورت میں ہی پھول پھل سکتی ہیں اور ایک منفرد پاکستانی قوم کی صورت میں ہی زندہ و پائندہ اور قائم و دائم رہ سکتی ہیں۔ یہ ایک گلدستے میں ایک قومی زبان کے مضبوط و مربوط ڈور کے ساتھ بندھی رہیں گی۔ پاکستانی گلدستہ میں یہ چار گل ہائے رنگا رنگ اس وقت تک اپنا اپنا رنگ اور اپنی اپنی خوشبو باقی رکھ سکیں گے۔ جب یہ اردو کی ڈور کے ساتھ پاکستان کے گلدستہ ہی میں ہم آہنگ ہو کر پروان چڑھے۔ جس دن یہ ڈور ڈھیلی ہوئی یا ٹوٹی سارا گلدستہ بکھر جائے گا۔ اور پھر کسی کا وجود قائم اور باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ ہم

اپنے بچوں کے ذریعہ تعلیم کے لئے اردو کو پورے طور پر نافذ کریں۔

آج کل ہمارے بچوں میں جو فکری انتشار اور افراتفری پائی جاتی ہے۔ میری ناقص رائے میں اس کی وجہ بھی قومی زبان میں ذریعہ تعلیم کو پورے طور پر نافذ نہ کرنے سے ہی پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ اپنے بچوں کو ایسے مدارس یا اسکولوں میں پڑھاتا ہے۔ جن کا تعلق پاکستانی مزاج سے قطعی دور ہوتا ہے ان کے سلیبس اور کورس میں جو کتابیں ہیں ان میں جو اصطلاحات، تشبیہات استعارے، کنائے اور محاورے استعمال ہوتے ہیں ان کا لگاؤ دور دراز کار باتوں سے ہے اور وہ قومی زبان کے ذریعہ حاصل کرنے والوں سے میل نہیں کھاتے۔

پاکستان میں آئینی طریقہ پر ایک ہی قومی زبان ہے۔ لیکن بعض جگہ ذریعۂ تعلیم میں اس کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی ہے۔ اپنے ہی گھر میں گھر والے کی یہ ثانوی حیثیت محل نظر ہے۔ تعلیم میں یکسانیت کے ساتھ ساتھ ذریعہ تعلیم میں بھی یکسانیت لازمی ہے۔ ماضی میں ہم دو زبانوں کو یکساں مقام اور حیثیت دے کر جو تلخ تجربہ حاصل کر چکے ہیں اگر ہم اس کا مزید اعادہ نہیں چاہتے تو ہمیں صدق دل سے سیزر کا حق سیزر کو اور قیصر کا حق قیصر کو دینا ہوگا۔ اگر دانستہ یا غیر ارادی طور پر ہم نے اس طرف سے غفلت برتی یا ظاہرہ اور خفیہ طریقہ پر ہم نے اس کے خلاف عمل کرنے کی کوشش کی تو جلد یا بدیر ہمیں اس سے پیدا ہونے والے حالات کی سنگینی سے کہیں دوچار نہ ہونا پڑے۔ خدا اس برے وقت سے محفوظ رکھے۔

خواتین و حضرات۔ یہ چند باتیں تھیں جو میں نے ایک پاکستانی کی حیثیت سے آپ کے گوش گذار کی ہیں۔ مجھ سے پہلے بھی اور میرے بعد بھی دوسرے حضرات اس مضمون پر اپنے گرانقدر افکار و آرا پیش فرمائیں گے۔ میں چلتے چلتے صرف اتنا اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نئی نسل نسلی خلا میں مبتلا نہیں ہے بلکہ نظام تعلیم اور زبان تعلیم کے فاصلہ سے دوچار ہے۔ آپ نظام تعلیم کو پاکستانی اور زبان تعلیم کو قومی زبان میں پورے طور پر نافذ کر کے دیکھیں یہ نسلی خلاء بالکل ختم ہو جائے گا۔ ؎

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

مولانا ماہر القادری

صاحب صدر محترمی سید الطاف علی بریلوی صاحب اور خواتین و حضرات: میری تقریر کا عنوان

"قومی زبان ذریعۂ تعلیم"

ہے۔ یہ موضوع خاصہ جامع اور بسیط ہے۔ جس کے تمام گوشوں پر تھوڑے سے وقت میں سیر حاصل تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں اختصار بلکہ اشارات سے کام لوں گا۔ یہ مجمع ذہین افراد اور دانشوروں کا ہے مجھے توقع ہے آپ کی ذہانت اجمال و اختصار سے تفصیل پیدا کرے گی۔

یہ بات تجربہ سے ثابت اور مسلّم ہو چکی ہے کہ غیر زبانوں کے مقابلہ میں اپنی قومی زبان سیکھنے سکھانے کا ذریعہ اور وسیلہ بننے سے علوم و فنون مکمل طور پر گرفت میں آتے ہیں۔ تمام ترقی کرنے والی خود دار قوموں نے یہی کیا ہے کہ اپنی قومی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا ہے۔ مثال کے طور پر جاپان کو لے لیجئے، اس ملک نے جاپانی زبان کو وسیلۂ ابلاغ بنایا ہے۔ حالانکہ جاپانی زبان خاصی مشکل زبان ہے اور اس کے حروف تہجی کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔ جاپانی زبان ہی کے ذریعہ جاپان نے صنعت، تجارت اور سائنس میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ عبرانی زبان مردہ ہو چکی تھی۔ اس کا کہیں چلن نہیں تھا۔ مگر اسرائیل نے اس مردہ زبان کو زندگی بخشی اور اپنی حکومت میں عبرانی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ بھارت نے آزادی کے بعد ہی "ہندی زبان" کی ترویج و ترقی کے لئے جدوجہد کا آغاز کر دیا اور ہندی کو بالآخر قومی زبان کی حیثیت دیدی گئی اور اس کا رشتہ سنسکرت سے جوڑ دیا۔

پاکستان میں اب تک یہ ہوتا رہا ہے کہ جو حکومت برسر اقتدار آئی ہے اس نے اعلان کیا ہے کہ اتنے برس میں پاکستان کا قانون اسلامی بنیادوں پر بنایا جائے گا۔ اور اردو زبان اس مدت میں ملک کی قومی زبان عملاً بنا دی جائے گی۔ مگر نہ تو عالمانہ اسلامی نظام قائم ہو سکا اور نہ اردو زبان تعلیمی اداروں اور دفتروں کی قومی زبان بننے پائی، موجودہ حکومت نے بھی دس برس کی مدت کا وعدہ کیا ہے۔ مگر اردو کی ترقی و ترویج کے لئے حکومت نے کیا کیا۔ اس کی کوئی خیر خبر اور سن گن نہیں ملی۔ مرکزی حکومت کا کوئی مراسلۂ گشتی اور اعلامیہ اردو زبان میں ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ہم ارباب اقتدار کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ اردو زبان کی ترویج و ترقی اور اسے مرکزی زبان بنانے کا جو وعدہ کیا گیا ہے، اسے پورا کیا جائے۔ یہ مطالبہ پوری پاکستانی قوم کا مطالبہ ہے۔

حضرات! اردو زبان دنیا کی سب سے زیادہ کمسن زبان ہے۔ مگر دنیا کی کسی زبان سے ہیٹی نہیں ہے۔ تمام علوم و فنون کی ترجمانی کے لئے اردو زبان میں پوری صلاحیت موجود ہے۔ حیدرآباد دکن کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ قلمرو آصفیہ میں حکومت کی زبان اردو تھی اور اردو ہی ذریعہ تعلیم تھی۔ نیچے کے دفتروں سے لیکر بابِ حکومت تک اردو زبان ہی کا چلن تھا۔ یہاں تک کہ عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے فیصلے اور شاہی فرامین کی زبان بھی اردو تھی۔ مشہور و معروف وکیل اور قانون کے عالم سر تیج بہادر سپرو نے اس کا اعتراف کیا تھا کہ حیدرآباد ہائی کورٹ کے اردو زبان میں لکھے ہوئے فیصلے الہ آباد ہائی کورٹ کے انگریزی زبان کے فیصلوں کی برابری کرتے ہیں۔

اردو زبان الفاظ کی ثروت اور ذخیرے کے اعتبار سے مالدار زبان ہے۔ نازک سے نازک خیال اردو زبان میں آسانی سے ادا کیا جا سکتا ہے، علم و فن کی اصطلاحات کے لئے جس طرح

انگریزی زبان، اطالوی زبان اور فرانسیسی زبان
سے مدد لیتی ہے۔ اسی طرح عربی اور فارسی زبانیں
اردو کی مدد کے لئے موجود ہیں جو شخص اس وہم میں مبتلا ہے
کہ اردو زبان ہر فکرو خیال اور خاص طور سے سائنسی
مصطلحات کے اظہار و ترجمانی کی پوری طرح صلاحیت
نہیں رکھتی وہ دراصل احساس کمتری کا شکار رہے۔
اور انگریز کی مرعوبیت اس کے دل و دماغ پر مسلط
ہے! آج کی تاریخ سے اردو زبان کو پاکستان کے
دفتروں اور تعلیم و تدریس کا ذریعہ بنا دیا جائے۔
تو کسی کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی! اب
رہیں تھوڑی بہت مشکلات تو آدمی کا عزم اور ولولہ
ہی مشکلات پر قابو حاصل کرتا ہے۔

حضرات! اردو زبان کا ایک خاص مزاج
ہے۔ مثلاً عورت کے لئے عام گفتگو میں یوں نہیں کہتے
کہ "وہ عورت حاملہ ہے" بلکہ یہ خیال "وہ عورت
امید سے ہے" کے لفظوں میں ادا کیا جاتا ہے "ڈاکٹر
مریض کو دیکھ کر چھوٹتے ہی کہے گا ——— "تم اپنا
پیشاب کل لے کر آؤ"، مشرقی طبیب "قارورہ"
کا لفظ استعمال کرے گا۔ یعنی ظرف بول کر مظروف
مراد لے گا 'قارورہ عربی میں شیشی کو کہتے ہیں۔
بادشاہوں کی محل سراؤں اور درگاہوں کے
دروازوں کے بند ہونے کو "معمور" بولتے ہیں۔
"دسترخوان اٹھانے" کو "دسترخوان بڑھانا"
بولا جاتا ہے۔ یہ اردو زبان کی شائستگی اور نکھری
ہوئی تہذیب کی دلیل ہے اور اردو زبان میں دوسری
زبانوں کی ہزاروں کتابیں منتقل ہو چکی ہیں۔
کوئی شخص کسی دوسری زبان کی مدد کے بغیر صرف
اردو زبان میں فلسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرے تو وہ
فلسفہ کا عالم بن سکتا ہے۔ قدیم و جدید فلسفیوں کے
بہت کچھ افکار اردو میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

اردو شاعری اپنی نزاکت، لطافت، محاکات
نگاری "تشبیہ و تمثیل اور تخیل کے اعتبار سے
دنیا کی ہر زبان کی شاعری کے مقابلے میں رکھی جا سکتی
ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ کا ایک شعر ہے۔

بہم بستہ قدرا بصد پیچ و تاب
گرہ داد شب رالپسِ آفتاب

کوئی شک نہیں اس شعر میں بڑا شکوہ اور
طمطراق پایا جاتا ہے۔ مگر اردو زبان کی مثنوی
"زہر عشق" کا یہ شعر

رُخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیئے اب دونوں وقت ملتے ہیں

فردوسی کے شعر سے زیادہ اثر انگیز اور
نفسیاتی ہے۔ ایرانی شاعر صائب تمثیل و تشبیہ
کا بادشاہ ہے اس کے اس قسم کے اشعار ؎

دوست دشمن می شود صائب بوقت بیکسی
شدتِ زخم آہواں رہ می دہد صیاد را

کوئی شک نہیں اس صنعت و صنعت کی معراج ہیں۔
مگر لکھنؤ کے شاعر امداد علی بحر کا ایک شعر سنئے ؎

آسائش بیجا سے مسرت نہیں ہوتی!
سو جائیں اگر پاؤں تو راحت نہیں ہوتی

اردو کی یہ چند جھلکیاں ہیں جو آپ کو دکھائی گئی ہیں۔ آخر میں مجھے یہی عرض کرنا ہے کہ پاکستان کی حکومت اور عوام سب کا یہ فرض ہے کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے سعی بلیغ کریں اور اردو کے حق کو پہچانیں! اردو زبان کے ساتھ اب تک جو بے پروائی کا برتاؤ رہا ہے اس کی تلافی کی ضرورت ہے۔ سہ

ہو پھول میں رنگت کیسی ہی خوشبو جو نہیں تو کچھ بھی نہیں
اس ملک میں چاہے کُن برسے اُردو جو نہیں تو کچھ بھی نہیں

جناب انیس الرحمٰن خاں

صدر آل ٹرینڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن کراچی

۱۔ ترقی یافتہ ملکوں میں شاید ایک ملک بھی ایسا نہ ہو جہاں ذریعہ تعلیم وہاں کی قومی زبان کو نہ بنایا جاتا ہو۔

۲۔ دراصل قومی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں میں تدریس کا عمل ترقی پذیر ممالک کی وہ بڑی لعنت ہے جس کی وجہ سے یہ ممالک معاشی اقتصادی اور سائنسی دوڑ میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

۳۔ ہمارے ملک میں یہ کہنے والوں کی کمی نہیں کہ علم کا حصول اپنی قومی زبان میں اس لئے ممکن نہیں کہ اس میں اعلیٰ معلومات کی کمی ہے اور علم دراصل یورپ کی زبانوں میں پایا جاتا ہے نیز اس علم سے فائدہ اٹھانے کے لئے بڑا ضروری ہے کہ غیر ملکی زبانوں سے واقفیت حاصل کی جائے اور جب تک پوری پوری واقفیت حاصل نہ کرلی جائے اس وقت تک خود اپنی قوم بھی ترقی یافتہ نہیں ہوسکتی۔

یہ درست ہے کہ آج کی دنیا میں زیادہ تر ایجادات اور سائنسی معلومات کا فروغ مغربی ممالک میں میں ہوا۔ اکثر تھیوریز پر تمام کتابیں وہاں لکھی گئیں، تمام لیبارٹیریز کا قیام وہاں پر عمل میں آیا۔ لیکن اس کے باوجود مشرق میں موجود جاپان نے ترقی کی رفتار کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ بے حد بڑھا دیا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جاپان نے ان تمام علوم کے ترجمے کئے اور خود اپنی قوم کو ان سے اپنی زبان میں واقف کرایا۔ دوسرے الفاظ میں علم کے حصول میں جاپان کے لاکھوں افراد کسی دوسری زبان کے محتاج بن کر نہیں رہ گئے۔

انسانی فکر اور سوچ کا وہ معیار اور وہ بلندی جو لوگ اپنی قومی زبان میں علوم اور فنون سیکھ کر حاصل کرسکتے ہیں وہ کسی غیر زبان میں علم حاصل کرکے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے دیکھا گیا ہے کہ وہ ممالک جہاں تعلیم ان کی قومی زبانوں کے علاوہ دی جاتی ہے۔ وہ صرف نقال بن کر رہ جاتے ہیں یعنی ان ممالک میں اصل اور بنیادی فکر کا فقدان رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایجادات سے واقفیت تو حاصل کرلیتے ہیں، زیادہ سے زیادہ ان کے استعمال سے آگاہ ہوجاتے ہیں۔ اور اس میں مہارت بھی حاصل کرلیتے ہیں۔ لیکن وہ ممالک یا وہاں کے طالب علم خود ایجادات بھی کرلیں۔ یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ پرائی زبان پر وہ پوری زندگی ایسا عبور حاصل

نہیں کر پاتے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے ذہن کو ان بلندیوں تک پرواز کے قابل بنا سکیں۔ جہاں پہنچ کر ایجادات اور اختراعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

آج کا مہذب یورپ بہت حد تک عربی زبان میں موجود علم سے فیض حاصل کرکے ترقی کی اس منزل تک پہنچا ہے لیکن آپ خود دیکھیں کہ انہوں نے عربی علوم کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا۔ ان کا ترجمہ کیا اور اس طرح اپنے طلباء کو انہوں نے ہر طرح کے علوم و فنون سے اپنی قومی زبان میں واقف کرایا۔ اس طرح انہوں نے اپنے طلباء کو ذہنی آزادی اور اس قدر ذہنی قوت بھی دیدی کہ ان کے بل پر پھر وہاں ایجادات اور اختراعات کا سلسلہ جاری ہوا۔ جو آج تک موجود ہے اور جس کے بل بوتے پر یورپ ترقی یافتہ ہونے کا دعویٰ دار ہے تو یہ بنیادی بات ہے کہ ذہن انسانی کی بلند پروازی کیلئے ضروری ہے کہ انسان اپنی زبان میں سوچے کیونکہ سوچ اور فکر اور فہم کا تعلق بڑی حد تک زبان سے ہوتا ہے۔

غیر ملکی زبان دراصل ہمارے اس دور کی یادگار ہے۔ جب ہم غلام تھے اور ہمارا علم ہماری سوچ اور ہمارے عمل کا ایک ہی مقصد سامنے رکھا گیا تھا کہ ہم اپنے باہر کے آقاؤں کے لئے کس طرح زیادہ سے زیادہ سودمند بن سکیں۔ ہمارے حکمرانوں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ ہمارا ذریعہ تعلیم اس طریقہ کا ہو کہ ہم آزادی سے ترقی کر سکیں اور ان کے محتاج نہ رہیں

لیکن آج جب ہم آزاد ہیں اور عوامی حکومت کے زیر سایہ ترقی کی طرف گامزن ہیں تو بڑا ضروری ہے کہ ہم اپنے طریقۂ تعلیم کو اس طرح تبدیل کریں کہ تعلیم قومی زبان میں دی جائے تاکہ ہم شعوری اور لاشعوری احساس کم مائیگی اور احساس محرومی سے بچ سکیں۔ صرف اس طرح ہم علم میں وہ خلا پیدا کر سکیں گے جو ہمارے مستقبل اور ایک ترقی یافتہ مستقبل کا ضامن بن سکے گا۔

وہ لوگ جو ملک کے ہمدرد تھے اور جن کی دوربین نگاہیں اس حقیقت کا ادراک کر چکی تھیں کہ تعلیمی ترقی کے لئے بڑا ضروری ہے کہ ذریعہ تعلیم قومی زبان کو بنایا جائے تو انہوں نے برصغیر میں بھی اسی سمت میں بہت بڑا کام کیا۔ مثال کے طور پر حیدرآباد دکن کی ریاست میں ہزاروں اعلیٰ کتابوں کے ترجمے کئے گئے اور اصطلاحات وضع کی گئیں۔ یہ سب علمی سرمایہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی پاکستان میں موجود ہے اور جسے زمانہ کے تقاضوں سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انجمن ترقی اردو نے بڑا کام کیا ہے۔ اس کے پاس بھی ایسی کتابوں کا ایک عظیم سرمایہ موجود ہے۔ اسی طرح خود ایجوکیشنل کانفرنس نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔

لہٰذا یہ سمجھنا کہ یہ کام ناممکنات میں سے
ہے یا کم از کم اس وقت ناممکن ہے۔ صحیح نہ ہوگا۔
ہمارے پاس اپنی قومی زبان میں سرمایہ اس قدر
ضرور موجود ہے کہ ہم ذریعۂ تعلیم اپنی قومی زبان
کو ضرور بنا سکتے ہیں۔

عوامی حکومت کی کوششیں قابل ستائش
ہیں اور اس نے ملک کے اکثر و بیشتر مسائل کا
حل بنیادوں میں تلاش کیا ہے۔ اور بنیادی طور
پر تبدیلی لاکر انقلاب اور ترقی کو ممکن بنانے کی
کوششیں کی ہیں۔

موجودہ حکومت کے پاس عوام کے اعتماد
کا سرمایہ بھی ہے۔ اور خداداد ذہانت اور تدبر رکھنے
والی قیادت بھی موجود ہے۔ سیاسی استحکام بھی
ہے اور قوم کی امنگیں بھی اس وقت عروج پر ہیں۔
بڑا ضروری ہے کہ آگے بڑھ کر ان اقدامات
کو عمل میں لایا جائے جن سے ہمارے روشن مستقبل
کا بہت بڑا تعلق ہے۔

سامعین کرام اگر پاکستان کو ایک
مضبوط اور ترقی یافتہ پاکستان بنانا ہے تو
اس کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ قومی تعلیم کو نہ صرف
ابتدائی درجوں میں بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ سطح تک
قومی زبان میں دیا جائے۔

اردو اصطلاحات اور سائنس کی تعلیم

پروفیسر حفیظ الرحمٰن صدیقی
گورنمنٹ اردو سائنس کالج کراچی

ذریعۂ تعلیم کے بارے میں علمی سطح پر کم سے کم
اتنی بات طے پا چکی ہے کہ ہمارے ملک میں ذریعۂ
تعلیم انگریزی کے بجائے اردو کو ہونا چاہیئے۔
وجہ اس کی یہ ہے کہ سینکڑوں سال تک یہاں
کی سرکاری و تعلیمی زبان بنی رہنے کے باوجود یہ
ہمارے بچوں کے لئے ایک اجنبی زبان ہے۔
حصول تعلیم میں یہ طالب علم اور مضمون فہمی کے
مابین ایک سنگ گراں کی طرح حائل ہے اور
ظاہر ہے کہ جب تک اسے راستے سے نہیں ہٹایا
جائے گا۔ نفس مضمون تک طالب علم کی رسائی
نہ ہو سکے گی۔

تجسس اور استفہام جتنا کچھ بھی ہے اس
مسئلے میں ہے کہ کیا سائنس کی تعلیم بھی اردو میں
دی جا سکتی ہے۔ یہ سوال ذہن میں دو باتوں
کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ سائنس ایک
فنی مضمون ہے اور عامۃ الناس کی نگاہ میں
اردو بنیادی طور پر شعر و شاعری کی زبان ہے۔
یہ محض ذوق لطیف اور محسوسات کو بیان کرنے
کی قدرت رکھتی ہے۔ سائنس کی ٹھوس اور فنی
اصطلاحات کی مطلب برآری کی متحمل نہیں ہو سکتی
دوسری یہ ہے کہ سائنس بین الاقوامیت کسی
ملکی زبان کے سانچے میں اسے ڈھالنے کی راہ
میں حائل ہے۔

اردو ذریعۂ تعلیم کے بارے میں ٹھوس تاریخی
معلومات اور خود اپنے طویل تدریسی تجربے کی
بنیاد پر میں متجسسین اور مستفسرین کی خدمت میں

نہایت اعتماد کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان کے
دونوں اندیشے اور وسوسے بے بنیاد ہیں۔ اول الذکر
استفہام کا جواب یہ ہے کہ اردو کے بارے میں
ہمارے اس تصور کے اندر کہ اس میں ذوق لطیف
اور محسوسات کو بیان کرنے کی صلاحیت پائی جاتی
ہے۔ خود یہ ادعا مضمر ہے کہ اس میں سائنس اور
فنی مضامین کی تفہیم کی صلاحیت اس سے بھی زیادہ
پائی جاتی ہے۔ ہمارے اس استدلال کی بنیاد یہ امر
ہے کہ مادی اجسام سے متعلق علوم کی تفہیم بمقابلہ غیر
مادی اور محسوساتی علوم کی تفہیم کے زیادہ آسانی
ہوتی ہے کیونکہ مادی اجسام اپنا ایک ٹھوس وجود
رکھتے ہیں۔ اعضائے مشاہدہ یعنی آنکھ، آنکھ، کان
ناک، زبان اور اعضائے لمس ان کے وجود کی گواہی
دیتے ہیں۔ اور تمام انسانوں کے اعضائے مشاہدہ تقریباً
ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کسی مادی وجود کا تمام
انسان یکساں طور پر مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس امر کی بنا
پر مادی اجسام کی تفہیم نہایت آسان ہوتی ہے۔

اس کے برعکس غیر مادی اشیاء یعنی ذوق لطیف
محسوسات، اقدارِ حیات، فکر و خیال، عقائد و نظریات
یعنی منجملہ سماجی علوم کے ادراک PERCEPTION
کا انحصار انسان کے اعضائے مشاہدہ پر نہیں بلکہ
مدرکہ ـــــ یعنی دماغ اور اس کی قوت ادراک
پر ہوتا ہے۔ اور انسانوں کی قوت ادراک جدا جدا
ہوتی ہے۔ اس لئے ہر شخص کے مدرکہ میں ادراک
اور تفہیم کی یکسانیت پیدا کرنے کے لئے زیادہ سے
زیادہ الفاظ اور مترادفات کی ضرورت ہوتی ہے۔

موخر الذکر سوال کے جواب میں عرض ہے کہ
سائنس کی تفہیم و تدریس کے بارے میں جو امر
بین الاقوامی ترویج کا حامل ہے۔ وہ اس کی
رسمیات (TERONINOLOGY) ہے۔ اصطلاحات
نہیں۔ رسمیات سے مراد مادی اشیاء کے نام ہیں۔
مثلاً کیمیائی عناصر کے نام جیسے۔ ہائڈروجن، آکسیجن
نائٹروجن وغیرہ یا ان کی علامات جیسے ہائیڈروجن
کے لئے H آکسیجن کے لئے O اور نائٹروجن کے لئے N یا
مرکبات جیسے ہائیڈروکلورک ایسڈ، سوڈیم کلورائیڈ
اور کوپر سلفیٹ وغیرہ یا ان کی علامات اور فارمولے
یا جانوروں اور پودوں کے نام مثلاً مینڈک کے
لئے رانا ٹگرینا یا آم کے لئے مینگوفیرا انڈیکا وغیرہ۔
یہ رسمیات بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اور مروج
ہیں۔ دنیا کے کسی ملک نے ان ناموں کو تبدیل کرنے کی
کوشش نہیں کی ہے۔ رسمیات کے بارے میں اس
اتفاق رائے کی مدد سے ہی سائنسی لٹریچر کی
بین الاقوامیت قائم ہے۔

اس کے برعکس اصطلاحات کی بین الاقوامیت
ایک بے حقیقت بات ہے۔ اور اسے بے حقیقت
بات ہونی بھی چاہیئے۔ کیونکہ اصطلاحات کی کوئی
بین الاقوامی زبان نہیں ہے۔ سائنس کی اصطلاحوں
میں انگریزیت کا جو غلبہ نظر آتا ہے وہ اس کی
بین الاقوامیت کی دلالت نہیں کرتا بلکہ محض اس
حقیقت کا مظہر ہے کہ موجودہ سائنس کا زیادہ تر

تحقیقی کام مغربی ممالک میں ہوا ہے۔ مغربی ممالک
کی علمی زبان زمانے تک لاطینی اور یونانی رہی ہے۔
لہٰذا وہاں کے تحقیق کاروں نے اپنی دریافتوں کے
لئے ظاہر ہے کہ اس زبان سے الفاظ لے کر اصطلاحات
وضع کئے۔ ہم اگر اپنی زبان میں سائنس کے مضامین
پڑھانا چاہتے ہیں تو اس امر میں کون سی معقولیت ہوگی
کہ اصطلاحوں کے معاملے میں لاطینی اور یونانی اصطلاحات
مثلاً PENAL اور HEPATIC GASTRIC
استعمال کرنے پر اصرار کریں اور ان کے اردو مترادفات
یعنی معدی، جگری اور گردوں کا استعمال کرنے
سے اجتناب کریں۔

یہی نقطۂ نظر دیگر اقوام کا بھی ہے۔ اور
اسی بنا پر جرمنی، جاپان، چین، فرانس اور روس
وغیرہ میں لاطینی اور یونانی ذخیرہ الفاظ سے وضع کردہ
سائنسی اصطلاحات کے لئے ان کی اپنی زبان کے
مترادفات وضع کئے گئے ہیں۔

ہاں اس موقع پر دو اعتراضات لائق توجہ
ہیں۔ ایک یہ کہ اردو میں وضع کی جانے والی اصطلاحات
کانوں کے لئے اجنبی اور ذہن و فہم کے لئے گراں بار
ہوتی ہیں۔ دوئم یہ کہ اردو میں اتنی صلاحیت کہاں
سے آئی کہ سائنس کی جملہ اصطلاحوں کے، جن کی تعداد
لاکھوں میں ہے۔ مترادفات پیش کر سکے۔

اردو کی اصطلاحیں کانوں کو اجنبی اس
وجہ سے معلوم ہوتی ہیں کہ ہم نے پہلے ان کے نام
کہیں نہیں سُنے۔ جبکہ انگریزی اصطلاحات کتابوں
میں بھری پڑی ہیں۔ ورنہ جہاں تک اصطلاحات کے
معنی کے فہم و ادراک کا سوال ہے۔ انگریزی کی
اصطلاحوں کے معنی سے بھی ہم اتنے ہی بلکہ اس سے
زیادہ نابلد ہیں جتنے اردو اصطلاحات کے معنی
سے۔ وجہ اس کی بہت واضح ہے۔ ایک عام تعلیم یافتہ
آدمی اپنی زبان کے صرف اتنے ہی الفاظ کے معنی
سے واقف ہوتا ہے۔ جتنے الفاظ اس کے روزمرّہ
کے بول چال اور تحریر و تقریر میں استعمال ہوتے
ہیں اور ان کی تعداد ظاہر ہے کہ چند سو یا ہزار
دو ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جبکہ اس کی زبان
مثلاً اردو میں ذخیرہ الفاظ کی تعداد پچاس ہزار
سے کم نہ ہوگی۔ اصطلاحوں کی تعداد اس کے مقابلے
ہزاروں میں کیا لاکھوں میں ہوتی ہے۔ لہٰذا سائنسی
اصطلاحوں کے ایسے الفاظ کو چھوڑ کر جو روزمرّہ کے
الفاظ سے لئے گئے ہوں باقی ماندہ الفاظ قدرتاً ہمارے
ذہن و فہم کے لئے گراں بار ہوں گے۔ یہ صورت حال
صرف اردو کی اصطلاحوں کے ساتھ نہیں۔ انگریزی
کی اصطلاحیں بھی معنی فہمی کے اعتبار سے خود انگلستان
اور امریکہ والوں کے لئے بھی اسی قدر اجنبی اور گراں بار ہیں۔

یہاں پر ایک سوال قدرتاً ذہن میں ابھرتا ہے۔
وہ یہ ہے کہ اگر اردو کی اصطلاحیں بھی اتنی ہی گراں
فہم ہیں جتنی انگریزی کی تو ہم انگریزی کی اصطلاحات
کے مترادفات وضع کرنے کی زحمت کیوں اٹھائیں۔
اس کی دو تین بڑی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اگر ہم کسی
اصطلاح کو بجنسہٖ اپنی زبان میں لے لیں تو پھر ان سے

مشتقات (DERIVATES) بنانے کا مسئلہ دشوار
گزار بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر ہم INSECT کو حشرہ کہیں بلکہ انسکٹ
کہیں تو پھر اس کے مشتقات کے ساتھ کیا کریں گے؟ اگر مشتقات
بھی انگریزی کے ہی مستعار لیں تو مثلاً انٹا مولوجی، انٹا
مولوجسٹ، انسکٹی سائڈ تو پھر ایسی اصلاحات کی حامل
زبان آئندہ سے اردو ہرگز نہیں کہلا سکے گی کیونکہ ایسی صورت میں
اردو زبان کے قواعد باقی نہ رہیں گے۔ قواعد ہر زبان کے لئے قالب
کا کام دیتے ہیں اگر یہ قالب باقی نہ رہے تو زبان کا تشخص باقی نہیں رہتا۔ یہ ہر زبان
کے لئے ایک تسلیم شدہ اصول ہے جس میں اختلاف اور بحث و تمحیث
کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا حل اس مسئلے کا صرف یہ ہے کہ
انگریزی اصطلاحوں کے اردو مترادفات وضع کئے جائیں
تاکہ مشتقات بنانے میں دشواری نہ ہو۔ ہاں ایسے الفاظ
جنہیں اردو زبان کی صوتیات (PHONETICS) اور
اس کا گرامر بہ آسانی قبول کر سکتا ہو اسے بلا تکلف
قبول کیا جا سکتا ہے۔ اور اردو زبان ہمیشہ ایسے الفاظ
اپنے دامن میں سمیٹتی چلی آئی ہے۔ مثلاً لفظ سائنس کو
لیجئے۔ یہ بھی ایک لاطینی لفظ ہے مگر اسے اردو زبان نے
بلا تکلف قبول کر لیا ہے اور اردو گرامر نے اس لفظ سے
وہ مشتقات بھی وضع کر کے دکھا دیئے جو اس زبان
سے انگریزی زبان میں بنائے گئے ہیں۔ مثلاً سائنٹسٹ
کے لئے سائنس داں سائنٹفک کے لئے سائنسی وغیرہ
یا فلاسفی، فلاسفر، فلاسفیکل کے لئے فلسفہ، فلسفی
اور فلسفیانہ وغیرہ اس طرح سے بے شمار الفاظ اردو
میں قبول کئے گئے ہیں جیسے اسکول، کالج، موٹر، مشین
رائفل، پولیس، ڈاکٹر، ایکسرے، امونیا، پنشن وغیرہ

اردو مترادفات وضع کرنے کی دوسری وجہ یہ
ہے کہ انگریزی اصطلاحات کا رسم الخط اور ہے اور
اردو کا اور۔ اگر ہم انگریزی اصطلاحات کو اپنی زبان
میں برقرار رکھیں تو ہر اصطلاح کو اردو رسم الخط میں
تحریر کرنے کے لئے ایک متفقہ املا (SPELLING)
متعین کرنے کا مسئلہ درپیش ہوگا۔ دو چار سو اصطلاحیں
ہوتیں تو کوئی بات نہ تھی۔ لاکھوں اصطلاحوں کے لئے
متفقہ املے متعین کرنا ان کے اردو مترادفات
وضع کرنے سے کم کٹھن کام نہیں مثلاً
اگر اپنی اپنی مرضی سے املے رقم کرنے کی چھوٹ
دے دی جائے تو اس سے اردو زبان میں املا کی یکسانیت
معرض خطر پڑ جائے گی اور کوئی زبان بھی املا میں عدم
یکسانیت کو گوارہ نہیں کر سکتی۔ ہاں رسمیات
(NOMENCLATURE) کے املا میں اگر اختلاف
ہو تو اسے گوارہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ رسمیات اسمائے
معرفہ کی تعریف میں آتے ہیں۔ اور ہر زبان اس
اختلاف کو گوارہ کرتی ہے۔ مثلاً ہائڈرو کلورک
ایسڈ رقم کرنے کے لئے ہم دو مختلف املے گوارہ کر سکتے ہیں۔
تیسری بات یہ ہے کہ اصطلاح اگر لاطینی یا
یونانی زبان کی ہو تو وہ کانوں کے لئے کتنی ہی
مانوس ہو معنی تک رسائی امر محال ہوتی ہے۔ آپ
چند حالیہ اصطلاحات کو مثال کے طور پر لے لیجئے۔
جیسے ASTRANANT SATELLITE وغیرہ
اور ان کا اردو کے مترادفات خلاباز، مصنوعی
سیارہ وغیرہ سے تقابل کیجئے اور بتایئے کہ ان

چیزوں کو آپ اردو اصطلاحات کی مدد سے جس حد
تک سمجھتے ہیں انگریزی اصطلاحوں سے اس کے متعلق
اس قدر سمجھ میں آتے ہیں؟ یہ ہیں وہ بڑی بڑی وجوہات
اصطلاحات کے اردو مترادفات وضع کر لینے کی۔

اب آئیے اس سوال کو لیں کہ کیا اردو میں
اتنی صلاحیت پائی جاتی ہے کہ لاکھوں سائنسی اصطلاحات
کے اردو مترادفات پیش کر سکے؟

اس سوال کا اجمالی جواب یہ ہے کہ سائنسی
اصطلاحات کی تعداد اگر سو گنا بھی ہوتی جب بھی اردو
میں ان کے مترادفات بلا دقت وضع کئے جا سکتے تھے۔

تفصیلی جواب یہ ہے کہ زبان کا بالخصوص
اردو زبان بنیادی طور پر دو چیزوں کے مجموعے کا نام
ہے۔ ایک اس کا گرامر ہے اور دوسرے اس کے حروف
اور صوتیات ہیں۔ کوئی لفظ خواہ کسی بھی زبان کا ہو
اگر ہمارے حروف تہجی اس کی صوتیات کو ادا کرنے
پر قادر ہیں اور اگر ہمارا گرامر انہیں اپنے قالب میں
ڈھلنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو اسے بلا تکلف
اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اور ماضی میں ہمیشہ اختیار
کیا جاتا رہا ہے۔ اردو کو زیادہ واسطہ عربی، فارسی
سنسکرت، ترکی اور انگریزی کے الفاظ سے رہا۔ لہٰذا
ان زبانوں کے جن الفاظ کی صوتیات اردو حروف
تہجی ادا کرنے پر قادر تھی، انہیں اس زبان نے قبول
کر لیا اور جنہیں ادا کرنے پر قادر نہ تھی انہیں مسترد کر دیا۔

اس طور پر اس وقت تک جتنے الفاظ اردو زبان
کے شمار میں آ چکے ہیں ان کی تعداد پچاس ہزار سے کم
نہیں دوسری طرف اس حقیقت کو ملحوظ رکھئے کہ انگریزی
کی زیادہ تر اصطلاحیں دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا
مرکب ہیں۔ ان پچاس ہزار الفاظ کی مدد سے اگر مرکب
اصطلاحات بنانے کی کوشش کی جائے تو لاکھوں کیا
کروڑوں اصطلاحات وضع کی جا سکتی ہیں۔ اگر آپ
کو اس دعوی میں شک ہو تو آپ ریاضی کے کسی
استاد سے حساب کرا کے دیکھ لیجئے۔ پس انگریزی اصطلاحات
کی فزوں تر تعداد سے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں

یہ سب باتیں محض خالی خولی اور فرضی نہیں ہیں۔
بلکہ عالم موجودات میں ان کا وجود موجود ہے۔ جامعہ
عثمانیہ حیدر آباد دکن، انجمن ترقی اردو پاکستان اور
شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی میں
اب تک جملہ علوم کے ڈیڑھ دو لاکھ مترادفات وضع
کئے جا چکے ہیں۔ اب تک نصف درجن سے زیادہ فرہنگ
ہائے اصطلاحات تنہا کراچی یونیورسٹی شائع کر چکی ہے۔
قاموس اصطلاحات نام کی نہایت مستند اور وقیع
فرہنگ اصطلاحات مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور
نے شائع کی ہے کہ ایسی فرہنگ شاید ہی کسی مشرقی
زبان میں چھپی ہو۔ سائنس کے درسی مضامین پر
درجنوں کتابیں مرکزی اردو بورڈ لاہور، شعبۂ تصنیف
و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی اور شعبۂ تصنیف و تالیف
اردو کالج شائع کر چکا ہے۔ ان میں سے بعض کتابیں
اعلیٰ علمی انعامات کی مستحق بھی قرار پا چکی ہیں۔ سائنس
کے ایک مضمون پر اردو میں ایک پی۔ ایچ۔ ڈی کا
مقالہ بھی طبع ہو کر اردو کی وسعت دامانی کا ثبوت پیش

کر چکا ہے۔ اردو کی صلاحیت ماننے کے لئے اور کتنے ثبوت چاہئیں۔

یہ تو تھا اردو میں سائنس کی تعلیم سے متعلق مسئلے کا علمی پہلو۔ اب آیئے ہم اس مسئلے کو لیں کہ اردو میں سائنس پڑھانے کا تجربہ کیسا رہا۔

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اردو میں سائنس پڑھانے کا تجربہ جہاں جہاں کیا گیا وہاں وہاں کامیاب ثابت ہوا۔

جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل بلند پایہ اسکالر سائنس داں ڈاکٹر، انجینئر، جو سینکڑوں کی تعداد میں کراچی میں بھی موجود ہیں اس حقیقت کا مظہر ہیں اور اردو کالج سے بھی اب تک ہزاروں طلبا فارغ التحصیل ہو کر نکل چکے ہیں۔ اردو ذریعۂ تعلیم کی کامیابی کا دعویٰ ہم ان معنوں میں ہرگز نہیں کر رہے ہیں کہ اس کالج کے طلبا ہر سال یونیورسٹی اور بورڈ کے امتحانوں میں اول آتے ہیں۔ جی نہیں یہ دعویٰ ہم نہیں کرتے اور اردو ذریعۂ تعلیم کی کامیابی و ناکامی کو جانچنے کے لئے یہ معیار مقرر کیا بھی نہیں جا سکتا کیونکہ یہ کسی ذریعۂ تعلیم کی کامیابی و ناکامی کو جانچنے کا کوئی حتمی پیمانہ نہیں ہے۔ ہم یہ دعویٰ جن معنوں میں کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کالج میں کوئی طالب علم جس قسم کا تعلیمی ریکارڈ لے کر آتا ہے۔ اسے ہم اس کالج میں بلند تر کر دیتے ہیں۔ ہماری دانست میں یہی سب سے زیادہ قابلِ عمل معیار ہے۔ اردو ذریعۂ تعلیم کی کامیابی کا دعویٰ کرنے کا۔

ہمارے طلبا بورڈ کے امتحانوں میں پوزیشنیں کیوں نہیں لاتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ رکھنے والے طلبا ہمارے کالج کا رُخ نہیں کرتے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس قسم کے طلبہ انجینیرنگ اور میڈیکل میں داخلے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور بدقسمتی سے انجینیرنگ اور میڈیکل کالجوں کا ذریعۂ تعلیم ابھی تک انگریزی ہے۔ لہٰذا تعلیمی کیریر میں صرف دو سال کے لئے ذریعۂ تعلیم کو تبدیل کرنا انہیں کسی طرح سودمند نظر نہیں آتا۔ تاہم یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ اگر میڈیکل اور انجینیرنگ کالجوں کا ذریعۂ تعلیم بھی اردو ہوتی تو وہاں کے نتائج بھی اس وقت کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہوتے۔ اس امر کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ رکھنے والے طلبا بالعموم اس کالج کا رُخ نہیں کرتے۔ اب تک یہاں کے درجنوں طلبا ڈاکٹر اور انجینیر بن کے نکل چکے ہیں۔

اس موقع پر ایک سوال کا جو اکثر کیا جاتا ہے، جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر اردو ذریعۂ تعلیم کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا ہے۔ تو دوسری درسگاہوں نے اسے اختیار کرنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ رزق اور معاشی وسائل کی کلید انگریزی زبان کے ہاتھ میں ہے۔ ۲۷۔۲۸ سال گزر جانے کے بعد بھی پاکستان کے دفاتر کی زبان انگریزی ہے۔ جب تک انگریزی رہے گی۔ طلبا من حیث المجموع

اردو میں تعلیم حاصل کرنے سے گریزاں رہیں گے۔
ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی کی سب سے کامیاب صورت یہ ہے کہ پہلے رزق اور معاش کی کلید اس کے ہاتھ میں دی جائے۔ یعنی پہلے دفاتر میں اسے رائج کیا جائے۔ تلقین اور پند و نصیحت کے بغیر طلبا، اردو ذریعۂ تعلیم کا رُخ کریں گے۔ انگریزوں نے انگریزی رائج کرنے کے لئے بھی یہی تدبیر اختیار کی تھی۔ یہ کام جب تک نہ ہوگا۔ ملک میں اردو کالج کی تعداد ایک سے نہ بڑھے گی۔
خدا کرے میری یہ رائے غلط ثابت ہو۔

ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ

مقالہ پروفیسر محمد خلیل اللہ
پرنسپل وفاقی گورنمنٹ اردو کالج کراچی

قوموں اور ملکوں کی ہمہ جہتی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں دو بڑی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ غربت۔ اور جہالت۔ ہر اچھی حکومت جو خلوصِ دل سے ملک و قوم کی ترقی چاہتی ہے ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی طرف سب سے پہلے توجہ دیتی ہے۔

نئے پاکستان کی عوامی حکومت نے جن عزائم کے ساتھ اقتدار سنبھالا تھا اس کے عملی مظاہر تین سال کی مختصر مدت میں نمایاں ہو چکے ہیں۔ زراعت، صنعت، صحت اور سماجی بہبود کے دوسرے شعبوں میں حکومت کے اصلاحی اقدامات مفید نتائج پیش کر رہے ہیں۔ ہر محب وطن پاکستانی کے دل میں اپنے ملک اور قوم کے بہتر اور درخشاں مستقبل کا یقین پختہ ہوتا جا رہا ہے۔ قومی زندگی کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے نئی حکومت کے اقدامات میرے معروضات کا موضوع نہیں ہیں۔ میں اس موقعے پر صرف ایک شعبے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ اور وہ ہے تعلیم کا شعبہ۔

عوامی حکومت نے سارے ملک میں میٹرک تک مفت تعلیم کا اہتمام کیا تاکہ ملک کے سارے باشندے امیر اور غریب کے فرق کے بغیر ایک خاص معیار تک تعلیم حاصل کر سکیں۔

تمام تعلیمی ادارے سرکاری تحویل میں لے لئے گئے۔
اس سے ایک طرف معیارِ تعلیم کو یکساں رکھنا ممکن ہو گیا تو دوسری طرف اساتذہ کو اپنے مستقبل کی طرف سے اطمینان حاصل ہوا۔ اور انہیں زیادہ توجہ سے تعمیر ملت کی اہم ذمہ داری کی تکمیل کا موقعہ ملا۔

ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ ملک میں اعلیٰ اور فنی تعلیم کے فروغ کی طرف بھی یکساں توجہ دی جا رہی ہے۔ نئی یونیورسٹیوں کا قیام طب، انجینئرنگ اور ٹیکنیکل تعلیم کا فروغ اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

عوامی حکومت اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ نئی نسل کو صحیح اندازِ فکر سے آشنا کئے بغیر قومی یکجہتی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ نویں اور دسویں جماعتوں کے لئے "تحریک پاکستان" کو لازمی مضمون قرار دینے کا اقدام اور ثانوی تعلیم کے وفاقی بورڈ کے قیام کی تجویز حکومت کے اس احساس

کے عملی ثبوت نہیں۔

پاکستانی قومیت کا صحیح شعور اور اس کا فروغ ہماری قومی اور ملی زندگی کے لئے روح کا درجہ رکھتا ہے۔ اس شعور کے فقدان نے ۱۹۷۱ء میں ہمیں قومی زندگی کے ایک عظیم المئے سے دوچار کیا۔ اور اسی المئے نے ہم کو بتلایا کہ اگر ہم پورے خلوص کے ساتھ اس شعور کو اپنی ملی زندگی کی روح نہ بنا سکے تو شاندار مادی ترقیوں کے باوجود ہم اقوامِ عالم میں اپنے لئے عزت کا مقام حاصل نہیں کر سکتے۔

پاکستانی قومیت کے شعور کا تقاضہ ہے کہ ملکی اور ملی مسائل پر سوچنے کا انداز سارے پاکستانیوں کا ایک ہو یہ فکر علاقائی اور لسانی تصورات اور امتیازات سے بالاتر ہو۔ وقت کے اس اہم تقاضے کی تکمیل کے لئے عوامی حکومت نے ایسے ادارے قائم کئے جن کے فرائض میں سب سے زیادہ اہمیت نظریۂ پاکستان کی تبلیغ اور تشہیر کو حاصل ہے۔

فکر و شعور کو فروغ دینے اور اس کو عمومیت بخشنے میں زبان جو اہم کردار ادا کرتی ہے وہ کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں۔ اِس حقیقت کو ذہن میں رکھئے۔ اور عوامی حکومت کے اِس اقدام پر غور کیجئے کہ جب نئے پاکستان کا متفقہ دستور مرتب کیا گیا تو اس میں یہ بات شامل کی گئی کہ اردو پاکستان کی واحد زبان ہوگی۔

اِسی کے ساتھ ساتھ پنجاب، سرحد اور بلوچستان کی صوبائی حکومتوں نے اردو کو سرکاری زبان قرار دیا۔ سندھ کی حکومت نے سندھی کے ساتھ اردو کو بھی سرکاری زبان قرار دیا۔

مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے یہ فیصلے کسی فوری جذبے یا وقتی مصلحت کے نہیں بلکہ تحریک پاکستان اور حصولِ پاکستان کی جدوجہد کی طویل تاریخ کے لازمی نتائج ہیں۔

مسلمان ہندوستان آئے تو مقامی باشندوں سے باہمی گفتگو اور تبادلۂ خیال کے لئے ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جو دونوں کی اجنبیت کو دور کر سکے اس ضرورت نے اردو کو جنم دیا۔ یہی ضرورت اس کے فروغ کا سبب بنی۔ اور اسی ضرورت کے سہارے یہ زبان پروان چڑھتی رہی۔ اس کی ترویج اور ترقی میں ہندوؤں نے بھی اتنا ہی حصہ لیا جتنا مسلمانوں نے مگر جب ہندوستان سے مسلم حکومت ختم ہوگئی اور ایک اجنبی قوم نے ملک کا اقتدار سنبھالا تو ابنائے وطن کو اپنی حکومت بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ مسلمانوں سے ان کے ایک ہزار سالہ اقتدار کا بدلہ لینے اور ان کو غلام بنانے کے منصوبے بننے لگے۔ ہر اس مظہر کو مٹانا ہندو قومیت کا تقاضہ بن گیا جو مسلم دورِ اقتدار کی نشانی بن سکتا تھا اردو زبان بھی اس وسیع تر منصوبے کی زد میں آگئی اور ایک خالص ثقافتی اور سماجی مظہر کو سیاسی مسئلہ بنا دیا گیا۔ یہ الفاظ ہندوستان کے بہت بڑے قوم پرست لیڈر گاندھی جی سے منسوب ہیں کہ "اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ جو قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان چاہیں تو اسے باقی رکھیں" ان الفاظ کے پیچھے جو ذہنیت کارفرما ہے وہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ غرض مسلمانانِ ہند نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ اور جب ان کی سیاسی جدوجہد ایک علیحدہ آزاد اور خود مختار مملکت

کے مطالبے کی منزل تک پہونچی تو پاکستان اور اردو دونوں ہی اس جدوجہد کے اہم اجزا، قرار پائے۔

بزرگانِ محترم! اس مختصر تاریخی جائزے کے بعد اگر میں یہ عرض کروں کہ نئی حکومت نے اردو کو قومی زبان قرار دے کر تحریک پاکستان کے ایک اہم تقاضے کی تکمیل کی ہے۔ یقیناً آپ بھی میری تائید فرمائیں گے۔

ان معروضات کے بعد میں ذریعۂ تعلیم کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

عوامی حکومت ملک میں جس نظامِ تعلیم کو رواج اور فروغ دینے کے لئے اپنے ذرائع اور وسائل سے کہیں زیادہ خرچ کر رہی ہے۔ اس نظام کے دو بنیادی مقاصد ہیں۔ قوم کی اعلیٰ علمی اور فنی صلاحیتوں کا عروج اور قومی یکجہتی، فکر و عمل کی یکسانیت کا فروغ۔ اگر ایک ایسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے جسے تاریخی اور منطقی شواہد کی بناء پر قومی زبان قرار دیا جا چکا ہو تو قومی یکجہتی اور فکر و عمل کی یکسانیت کو جو فروغ ہوگا اس سے انکار مشکل ہے۔

اب غور فرمائیں کہ ذریعۂ تعلیم بننے کے لئے کونسی زبان موزوں ہوسکتی ہے۔

پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ زبان طلباء کے لئے بالکل ہی اجنبی اور غریب نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اس میں تعلیمی اور علمی زبان بننے کی صلاحیت ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو پاکستان کے کسی صوبے کی مادری زبان نہیں ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ اس کا خمیر پاکستانی زبانوں کے مزاج سے بنا ہے۔ آپ اردو کی لغت اٹھائیں اور ان میں ایسے الفاظ تلاش کریں جو سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی زبانوں میں مشترک ہیں تو ان کی فہرست آپ کے اندازے سے کہیں زیادہ طویل ہوگی۔ اور یہی فہرست آپ کو بتلائے گی کہ اردو کسی صوبے یا علاقے کے لئے اجنبی اور غریب زبان نہیں ہے۔

یہ بات پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ زبان ایک ثقافتی اور سماجی مظہر ہوتی ہے اور اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ۔ سیاست سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ زبانیں ایک دوسرے کی رقیب نہیں ہوتیں۔ اور نہ باہمی رقابتوں یا منافرت کا ذریعہ۔ یہ ہمارے ہندو بھائیوں کا کرم تھا کہ انھوں نے اردو کو فرقہ وارانہ سیاست میں ملوث کر دیا۔ اور قیام پاکستان کے بعد سیاست کی نیرنگیوں نے اسے علاقہ واریت کا مظہر بنا دیا۔ اس کے جو مضر نتائج نکلے وہ ہماری قومی تاریخ کے المناک باب ہیں۔ مگر اللہ کا احسان ہے کہ ہماری عوامی حکومت نے ان باتوں پر پوری توجہ دی اور اردو کو قومی زبان قرار دے کر سارے شکوک و شبہات کا ازالہ کر دیا۔

حضرات! مجھے اجازت دیجئے کہ اس مختصر تمہید کے بعد میں اصل موضوع کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ یہ سوال کہ آیا اردو زبان علمی، ادبی، اور فنی مضامین کی تعلیم کا ذریعہ بننے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں، اب میرے ناقص خیال میں بعد از وقت ہے۔

ایک سو برس سے زیادہ عرصے کے عملی تجربات شاہد ہیں۔ کہ اس میں کسی شبہے یا بحث کی گنجائش نہیں ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا جہاں اردو ذریعہ تعلیم تھا۔ ۱۸۳۴ء میں ریاست حیدرآباد کے ایک رئیس نواب فخرالدین خاں نے "مدرسہ فخریہ" کی بنیاد رکھی۔ جہاں سارے مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ پھر ۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا جہاں ادبی اور فنی مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ طب، انجینرنگ، ٹیکنالوجی اور سائنس کے سارے مضامین کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی۔

جب جامعہ عثمانیہ میں طب اور انجینرنگ کے شعبے قائم ہوئے تو بہت سے بیدار مغز عالم اس شبہے کا برملا اظہار کرنے لگے کہ اردو زبان اِن مضامین کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ انڈین میڈیکل کونسل نے جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ طب کی ڈگری کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ جامعہ عثمانیہ نے برٹش میڈیکل کونسل سے درخواست کی۔ انگلستان سے سے ماہرین کا وفد آیا تین مہینے تک اس وفد نے عملی اور نظری تعلیم کے طریقوں کا غائر مطالعہ کیا۔ طلباء کا امتحان لیا۔ اور پوری چھان پھٹک کے بعد نہ صرف اس ڈگری کو تسلیم کیا بلکہ اپنی رپورٹ میں لکھا کہ "ہمیں حیرت ہے کہ ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں نے جامعہ عثمانیہ کے مفید تجربے سے اب تک فائدہ کیوں نہیں اٹھایا"۔ اور جب جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ڈاکٹر اور انجینیر زندگی میں داخل ہوئے تو تجربے نے معترضین کو قایل کر دیا۔ اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ اردو پڑھے ہوئے ڈاکٹر کی دوا سے مریض مرتا نہیں اور اردو پڑھے ہوئے انجنیر کا مکان گرتا نہیں۔

یہاں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دوں کہ جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پانے والے سارے ہی طلباء کی مادری زبان اردو نہیں تھی۔ ان میں تلنگو، مراٹھی کنڑی اور دوسری زبانیں بولنے والوں کی بھی خاصی تعداد شامل تھی۔ اور ظاہر ہے کہ ان زبانوں سے اردو کا اتنا گہرا واسطہ نہیں جتنا پاکستان کی زبانوں سے ہے۔

دہلی کالج اور جامعہ عثمانیہ اب بدقسمتی سے ماضی کا حصہ بن چکے ہیں مگر خود آپ کے شہر میں اِن عظیم اداروں کی جیتی جاگتی اور فعال یادگار آج پچیس برس سے اس تجربے کی کامیابی کی شہادت دے رہی ہے جس کی افادیت کو ہماری عوامی حکومت نے بھی تسلیم کیا اور اس کو راست وفاقی حکومت کی سرپرستی کا فخر بخشا۔

اردو کالج کی مثال ذریعۂ تعلیم کے سلسلے میں سارے شکوک و شبہات اور اعتراضات کا ازالہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ آپ یہ بات یقیناً دلچسپی سے سنیں گے کہ اس وقت اردو کالج میں ڈھائی ہزار سے زیادہ زیر تعلیم طلباء میں اکثریت ایسے طلباء کی ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اور اردو کالج کے شاندار امتحانی نتائج اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ اس ذریعۂ تعلیم نے طلباء کے لئے امتحان پاس کرنا کتنا آسان بنا دیا ہے۔

انگریزی زبان کی اہمیت اور ہمہ گیری سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ نئے نئے علوم سے آگاہی کے لئے طلباء کو انگریزی ضرور سیکھنا پڑے گی مگر صرف اس بنا پر اسکو ذریعہ تعلیم بنانے پر اصرار کچھ زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتا۔ یہ زبان سارے پاکستانیوں کے لئے یکساں طور پر اجنبی اور غریب ہے۔ ہمارے ذہن، مزاج، انداز فکر سے اسکو کوئی ربط نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کی زیادہ تر صلاحیتیں اس زبان کو سیکھنے میں صرف ہو جاتی ہیں اور سخت محنت کے باوجود وہ اس زبان میں اظہار خیال پر عبور حاصل نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب طالب علم کی توجہات اور صلاحیتوں کا مرکز بدل جائے گا، تو وہ اس مضمون میں کتنی مہارت حاصل کرلے گا، جس کی وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اور پھر ایک غیر قوم اور غیر کلچر کی زبان پر عبور حاصل بھی ہو جائے، تو اسے خود اپنی روایات اپنے قومی انداز فکر سے کتنا مس رہ جائے گا۔

تعلیم اور امتحانات کے شعبوں سے اپنی طویل وابستگی اور تجربات کی بناء پر میں آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ کراچی یونیورسٹی کے امتحانات اور خاص طور پر بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ بی کام اور ایل۔ ایل۔ بی کے امتحان دینے والے طلباء کی اکثریت امتحانی پرچوں کے جوابات اردو میں دیتی ہے اور ظاہر ہے کہ ان سب طلباء کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اور پھر اردو زبان میں علمی، ادبی اور سائنسی اصطلاحات کا ایک وافر ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے لئے بنیادی کام بہت پہلے جامعہ عثمانیہ انجام دے چکی ہے۔ علمی اور سائنسی کتابوں کا بھی ذخیرہ موجود ہے۔ گویا اس سلسلہ میں حکومت پر کسی فاضل خرچ کا بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔

حضرات! ان چند معروضات سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ اردو سارے پاکستان کے باشندوں کے ذہن، مزاج اور کلچر سے قریب ہے۔ کسی خطے کے لئے اس میں اجنبیت یا غرابت نہیں۔

ایک کامیاب ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے یہ زبان اپنی افادیت منوا چکی ہے۔

اس کو ذریعۂ تعلیم بنا کر ہم نہ صرف ملک کے معیار تعلیم کو بلند کر سکتے ہیں بلکہ قومی یکجہتی اور فکر و احساس کی ہم آہنگی کی وہ منزل حاصل کر سکتے ہیں۔ جو ہماری عوامی حکومت کا مقصود ہے۔

کیا اس کے بعد بھی یہ عرض کرنا ضروری ہوگا کہ اردو ذریعۂ تعلیم ہمارے ملی اور قومی مسائل کے حل میں ایک اہم عنصر ثابت ہو سکتا ہے۔

تقریر جناب میجر آفتاب حسن

جناب پروفیسر خلیل اللہ صاحب کے مؤثر فرمودات کے بعد اردو کالج کے سابق پرنسپل اور سکریٹری سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان سے تقریر کی درخواست کی گئی۔ موصوف

نے فرمایا :-

"پچھلے ۲۸ سالوں سے اردو کے بارے میں جتنا کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ وہ سب جمع کیا جائے تو ضخیم کتابوں کا ایک دفتر بن جائے۔ لیکن جس حد تک ان باتوں پر عمل ہوا ہے اس کو جمع کیا جائے تو وہ چند صفحات سے زیادہ نہیں ہوگا۔

بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ محرکات پاکستان میں سے جس چیز پر سب سے زیادہ حملہ اپنے ہی ملک میں ہوا ہے اور یہ حملہ پاکستانیوں نے ہی کیا ہے وہ یہی اردو زبان ہے۔ اس لئے کہ پاکستان کے موافقین چاہے اردو کی اہمیت کو نہ سمجھیں پاکستان کے مخالفین اچھی طرح جانتے ہیں کہ اردو زبان پاکستان کے بنیادی ستونوں میں سے ہے اور اس کو گرانا پاکستان کی بنیادوں کو کمزور کرنا ہے۔ جو چیز یک جہتی پیدا کرے پاکستان کی سالمیت کا اہم عنصر ہو اس کو مٹانا در اصل پاکستان کو مٹانے کی کوشش ہے۔ چنانچہ وہ اس میں لگے ہوئے ہیں۔ اخبار، رسالے، ریڈیو، ٹیلی ویژن۔ سارے ذرائع ابلاغ میں وہ اثر انداز ہیں۔ ہر طرف بے روک ٹوک اُن کی آواز سنائی دیتی ہے۔

در اصل اردو کے معاملے میں پاکستان کی ساری تاریخ داغدار ہے۔ اس سلسلے کی ساری کارروائی وہ تعلیمی ہو، عدالتی ہو، دفتری یا انتظامی سب کی سب بے یقینی کا شکار رہی ہے۔

قائداعظم کو جس شدت کے ساتھ اس مسئلے کی اہمیت کا احساس تھا اگر اس کا عشر عشیر بھی ان کے جانشینوں کو ہوتا تو آج یہ نوبت نہ آتی کہ اردو بے مقصد اور بے منزل بھٹکتی چلی جاتی ہے۔ سرکاری بے توجہی بلکہ بے رخی اور عوام کی بے حسی اس کی انتہائی کارآمد صلاحیتوں کو مفلوج اور اس کی پاکیزہ شکل کو مسخ کئے چلی جا رہی ہے۔ اور ہر ناکس و ناکس یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ـــــ اور ہماری منزل مقصود کب حاصل ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زبان کو اپنانے۔ پھیلانے اور آگے بڑھانے کا جذبہ اور ارادہ کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

ہر قدم جو بظاہر آگے جاتا ہے۔ در اصل پیچھے کی طرف ہوتا ہے۔ اور ہر نیا دور یہ خوش خبری ضرور لاتا ہے۔ کہ پرانی روش ترک کی جائے گی اور رجعت پسند دفتر شاہی کو نظر انداز کر کے قومی زبان کو بلا تاخیر سرکاری دفتری عدالتی اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے استعمال کر کے اُن نقصانات کی تلافی کی جائے گی جو زندگی کے ہر شعبہ میں ایک اجنبی اور غیر ملکی زبان کے مسلط رہنے سے پیدا ہو گئے ہیں۔

امید پیدا ہونے لگتی ہے کہ ہمارے ذہنوں کو آزادی نصیب ہوگی۔ ہم کورانہ تقلید سے نجات پائیں گے۔ اور ہمارے غور و فکر میں جلا پیدا ہوگی۔ علوم و فنون ہمارے قبضۂ قدرت میں ہوں گے اور ہم بھی دنیا کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور قوت پیدا کریں گے۔ ـــــ لیکن ہوتا کیا ہے؟ ہر حکومت

عملاً اس کے خلاف کرتی ہے۔ دفتر شاہی اس کو ایک
قدم آگے بڑھنے نہیں دیتی۔

انگریزوں کی دوسو سالہ غلامی کے گہرے
نقوش۔ احساس کمتری کی فضا کا ساختہ پرداختہ دماغ
اپنے طرز فکر کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتا ـــــ
بہانے پیش کئے جاتے ہیں۔ حیلے تلاش ہوتے ہیں۔

اور یہ بدنصیبی آج نہیں ابتدا ہی سے ہمارے
ساتھ رہی ہے۔ قائداعظم کی زندگی میں تو کوئی اُردو
کے خلاف بول نہیں سکتا تھا۔ لیکن ان کے بعد طرح
طرح کی باتیں سننے میں آنے لگیں۔

قائدملت نے سندھ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم
اسناد (۱۹۵۰ء) میں جو خطبہ پیش فرمایا اس کے کچھ
جملوں کا مطلب یہ نکالا گیا کہ اردو ابھی اس لائق نہیں
ہوئی ہے کہ سرکاری کام اس کے سپرد کئے جائیں۔

ظاہر ہے کہ قائدملت اردو کے مخالف یا پاکستان
کے بدخواہ نہیں تھے۔ پھر یہ خلاف واقعہ بات ان سے
کیسے منسوب کی گئی۔

لیکن داد دیجئے نوکرشاہی اور اس کے
کارندوں کو کہ اپنے حاکموں کو وہ کٹ پتلی کی طرح
نچاتے تھے اور جو جی چاہے ان سے کرواتے اور
کہلواتے تھے ـــــ اس تقریر کا مسودہ جن
صاحب نے تیار کیا تھا۔ وہ تعلیمات کے سرکاری ملازم
تھے۔ اردو کے ادیب کہلاتے ہیں اور مدتوں اسی
کی روٹی کھاتے رہے۔

یہ سلسلہ چلا اور چلتا رہا ـــــ ایک ملک
کے لئے دو قومی زبانوں کو تسلیم کر کے جدائی اور
دو پارٹی کی بنیاد رکھی۔

صدر ایوب کے زمانے میں قومی زبان کو اس کا
جائز مقام دلانے کا اعلان ہوا تو ہر طرف خوشی کی
لہر دوڑی اور محب وطن پاکستانیوں نے اطمینان
کا سانس لیا۔ ـــــ لیکن صدر ایوب نے خود جو بیان
ڈھاکے میں دیا یعنی

"دو قومی زبانوں کو ملک میں رائج کرنے کے لئے
جس بنیادی کام کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کافی
عرصہ لگے گا۔ ...." اس سے ساری امیدوں
پر پانی پھر گیا۔

پھر جنرل یحییٰ کی حکومت آئی اور اعلان ہوا کہ
نظام تعلیم پر از سر نو نگاہ ڈالی جائے گی اور
جو شکایات ایوب خاں کے زمانے میں پیدا ہوئی تھی
اس کا ازالہ کیا جائے گا۔ نور خاں ڈپٹی مارشل لاء
ایڈمنسٹریٹر نے یہ کام اپنے ذمہ لیا۔

نور خاں صاحب نے جو سفارشات پیش کیں۔
وہ بہت ہی غور و فکر اور سمجھ بوجھ کے ساتھ تیار
کی گئی تھیں۔ تعلیم کے ہر پہلو خصوصاً تعلیم میں قومی زبان
کی اہمیت پر بہت ہی واضح اور مدلل بحث اس رپورٹ
میں تھی۔ گندم رنگ انگریزوں نے برصغیر پاک
ہند میں جو آفت ڈھائی ہے اور ذہنوں کو مفلوج
کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر سیر حاصل بحث تھی اور
اصلاح کا ایک مکمل دستور العمل پیش کیا گیا تھا۔

اگر حکومت وقت میں اتنی صلاحیت ہوتی کہ

نوکرشاہی کے جال اور مغرب پرستوں کے پھندوں سے نکل سکتی اور ان تجاویز کو عملی جامہ پہناتی تو آج پاکستان کا رنگ دوسرا ہوتا۔

لیکن کیا ہوا، وہی پرانا رونا کہ ابھی زبان تیار نہیں ہے۔ اس بارگراں کو نہیں اٹھا سکتی۔ اس عدم تیاری کا بہانہ پچھلی حکومتیں بھی کرتی چلی آرہی تھیں۔

یہی بہانہ ہے جو مسلسل پیش کیا جا رہا ہے اور ہر دور جو آتا ہے اسی پر کاربند ہوتا ہے۔

کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ زبان اگر اس وقت تیار نہیں ہے تو پانچ سال بعد یا دس سال بعد کس طرح تیار ہو جائے گی۔ اگر اس وقت کام شروع کر دینے کے احکام جاری نہیں ہوتے تو اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ آنے والی حکومت بھی پرانا عذر نہ پیش کرے گی کہ زبان ابھی تیار نہیں ہے۔ بنیادی کام نہیں ہوا ہے۔

نہ کرنے کے سو بہانے ہوتے ہیں ورنہ دنیا جانتی ہے کہ اردو زبان آج نہیں آج سے ۸۰، ۹۰ سال پہلے ان تمام منزلوں سے گذر چکی ہے۔ اس پورے برصغیر میں یہی ایک زبان ہے جو سرکاری، دفتری، عدالتی کی صورت میں استعمال ہوئی ہے۔ اور کامیابی کے ساتھ ہوتی رہی ہے۔ اسے لکھانے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ یہی ملک کی ایک اہم ضرورت ہے۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ گو اردو کو قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ اور سندھ کے سوا سب صوبوں نے بھی اس کو اپنی واحد سرکاری زبان تسلیم کر لیا ہے۔ ابتداً صوبوں نے قومی زبان کو استعمال کرنا شروع بھی کر دیا تھا لیکن عام سرد مہری دیکھ کر، جوش اور ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ ذریعۂ تعلیم کو تبدیل کرنے اور قومی زبان کو استعمال کرنے کا کام جس جوش اور جذبہ کے ساتھ شروع ہوا تھا وہ سرد ہوتا نظر آرہا ہے۔ ایک گروہ اردو کے سارے پرانے کام اور اس کی سینکڑوں سالہ یادگاروں کو بھی مٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔

کچھ لوگ درسی کتابوں میں پرانی اردو اصطلاحوں کو چن چن کر الگ کر رہے ہیں اور ان کی عوض انگریزی ہی کی بھدی اصطلاحیں اردو رسم الخط میں ڈال رہے ہیں۔

اردو ہندسوں کو درسی کتابوں، سکول، ڈاک کے ٹکٹوں سے نکال کر ان کی جگہ صرف انگریزی کے ہندسے ڈالے جا رہے ہیں ـــــ اب اردو ٹائپ رائٹروں میں بھی انگریزی ہندسے ڈالے جا رہے ہیں۔

گویا ہر قدم پیچھے کی طرف اٹھ رہا ہے اور اگر اس صورت حال کی روک تھام نہ ہوئی تو پاکستان کا رسم الخط عرب اور ایران کی اسلامی برادری سے الگ ہو جائے گا۔

قومی زبان کو اس کا جائز مقام نہ ملنے کے سلسلہ میں صرف حکومت پر الزام دھرنے سے بات پوری نہیں ہوتی۔ عوام کی بے حسی اور زبان کے

معاملہ میں مجرمانہ غفلت بھی جس عروج کو پہنچ گئی ہے۔ اس کی مثال کسی دوسری مہذب قوم میں نہیں ملتی۔ اپنی زبان کو قابل اعتنا نہ سمجھنا اور اس کو ہر زبان سے حقیر سمجھنا اور بگاڑتے رہنا۔ اس قوم کی خصوصیت بن گئی ہے۔

حکومت نے منع نہیں کیا کہ تم اردو نہ پڑھو نہ بولو اور اپنے کاروبار میں استعمال نہ کرو۔ لیکن ہو کیا رہا ہے۔

دوکانوں کے نام، مکانوں کی تختیاں، شادی بیاہ کے رقعے اب تک انگریزی میں قابل فخر سمجھے جاتے ہیں۔ ابا اور ابو ڈیڈی سے اماں ممی سے بدل گئی ہیں۔ پھر بے چارے چچا، ماموں، خالو کا کیا پوچھنا ان کے لئے صرف انکل ہی کافی ہے۔

اور جو زبان بولی جاتی ہے اور ابلاغ کے اداروں میں بلا روک ٹوک استعمال ہوتی ہے۔ بلکہ قابل فخر سمجھی جاتی ہے۔ اس گھٹیا ذہنیت اور احساس کمتری کی نشان دہی کرتی ہے جس نے اس قوم میں مرض کہنہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن کیا کیا کہا جائے۔

ع۔ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

تقاریر
ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور ڈاکٹر ابو الخیر کشفی

جناب میجر آفتاب حسن صاحب کی قومی زبان اردو کے متعلق تقریر جو عبرت و موعظت کا مرقع تھی ختم ہوئی تو ان کے بعد جامعہ کراچی کے جناب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور ڈاکٹر ابو الخیر کشفی کی نہایت فاضلانہ اور مدلل تقاریر ہوئیں اور ان کی شیریں مقالی سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔

ان حضرات نے اردو کی اہمیت اور ضرورت پر زور ڈالتے ہوئے کہا کہ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ وہ کسی صوبہ کی مادری زبان نہیں ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اس کا خمیر پاکستانی زبانوں کے مزاج سے بنا ہے انہوں نے کہا کہ اردو کی لغت اٹھا کر دیکھیں تو اس میں بہت سے ایسے الفاظ ملیں گے جو سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی زبانوں میں مشترک ہیں۔ ایسے الفاظ کی فہرست پر نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کسی بھی صوبے یا علاقے کے لئے اجنبی یا غریب زبان نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ دہلی کالج اور جامعہ عثمانیہ اب بدقسمتی سے ماضی کا حصہ بن چکے ہیں مگر خود اس شہر میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ان عظیم اداروں کی جیتی جاگتی اور فعال یادگار ہے۔ جو ۲۵ سال سے اردو کی خدمت کر رہی ہے۔

مقررین نے مزید فرمایا کہ اردو سارے پاکستان کے باشندوں کے ذہن، مزاج اور ثقافت سے قریب ہے کسی خطے کے لئے اس میں اجنبیت نہیں اور اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر ہم نہ صرف ملک کے معیار کو بلند کر سکتے ہیں بلکہ قومی یکجہتی اور فکر و احساس کی ہم آہنگی کی وہ منزل حاصل کر سکتے ہیں جو قائد اعظم مرحوم کی طرح ہمارے قائد عوام مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا بھی مقصود ہے

مندرجہ بالا تقاریر کے بعد آخر میں صدر مذاکرہ ۴۴ عالی جناب پروفیسر محمد طاہر فاروقی کا خطبہ صدارت ہوا جو درج ذیل ہے۔

خطبۂ صدارت

شعبۂ قومی زبان ذریعۂ تعلیم

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی

اردو کو اعلیٰ جماعتوں تک ذریعۂ تعلیم بنانے اور ذریعۂ امتحان مقرر کرنے کا مسئلہ ایسا پیچیدہ نہیں ہے. جیسا کہ اسے لیت ولعل اور بحث وتمحیص میں ڈال کر بنا دیا گیا ہے. ہمارے ارباب حل وعقد میں سے اکثر حضرات جو یورپ اور امریکہ میں وقت گزار چکے ہیں۔ وہاں سے مسموم ذہنیت لے کر واپس آئے ہیں۔ اور قومی ملی مفادات کے متعلق "اندیشہ ہائے دور و دراز" میں مبتلا ہو کر، زبان کے بارے میں بھی غلط اور مضحکہ خیز اندازِ فکر اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ حضرات "اردو کو ذریعۂ تعلیم" بنانے کے بارے میں بھی مستقل رکاوٹ بنے ہوئے ہیں. اگر ہماری جامعات کوئی مفید اقدام کرتی ہیں. تو یہ اپنی ذہنی کج روی کو کام میں لا کر ٹال مٹول اور دیر اور دیر کے لایعنی شکوک اور اعتراضات اٹھا دیتے ہیں. اور نتیجہ یہ کہ اس صحیح اور ضروری اقدام کے آگے ایک نئی سدِ سکندری کھڑی کر دیتے ہیں۔

ہمارے ہاں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے بارے میں جتنے تجربات ہو چکے ہیں، ان کو آگے بڑھانے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں ہمارے اکابر غور وفکر کی مطلق زحمت گوارا نہیں کرتے. گزشتہ صدی میں دہلی کالج کی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے (اس وقت کے) تمام مروجہ انگریزی علوم کے تراجم اردو میں کئے۔ اور تدریس میں ان کو اس قدر مفید پایا کہ کالج کے پرنسپل کی رپورٹوں میں واضح الفاظ میں اعتراف ہے کہ مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبے کے حریفوں سے آگے نظر آتا ہے۔ اسی کام کو سرسید کی "سائنٹفک سوسائٹی" نے اور آگے بڑھایا تھا.

اس صدی میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۸ء تک اردو کو جملہ علوم و فنون کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ درجات تک ذریعۂ تعلیم بنا کر اس تجویز کی کامیابی پر مہر تصدیق ثبت کر دی. سب جانتے ہیں کہ وہاں اکتیس سال تک بی. اے. بی. ایس سی ہی میں نہیں، ایم اے. ایم ایس سی میں بھی. تمام مضامین مثلاً ہیئت، کیمیا، ارضیات، ریاضی، جغرافیہ، طبیعات، اقتصادیات، معاشیات، نفسیات، سیاسیات، فلسفہ، تاریخ وغیرہ میں. اور قانون، طب، اور انجینئرنگ میں بھی ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان اردو ہی رہا کی ہے. عثمانیہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے والے کتنے ہی طلبہ مزید اعلیٰ تعلیم وتحقیق کے لئے جرمنی، فرانس

انگلستان اور امریکہ گئے، اور وہاں جاکر اعلیٰ
امتیازات پائے۔ اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنا
بیرونی ممالک میں ان کے لئے رکاوٹ نہیں بنا۔
بلکہ زیادہ مفید اور زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔

حیدرآباد دکن ہی میں دارالترجمہ قائم کیا
گیا تھا جس نے بہت قلیل عرصے میں مذکورہ بالا تمام
علوم وفنون پر سینکڑوں علمی کتابیں تصنیف، تالیف
اور ترجمہ کرکے شائع کردی تھیں۔ جو طلبہ کو اعلیٰ مدارج
تک بخوبی کفایت کرتی تھیں۔ پاکستانی دور میں یہ کام
سست ہوگیا، جس کے اسباب کی طرف اوپر اشارہ
کیا گیا۔ مگر دارالترجمہ کی کتابوں کا سارا ذخیرہ آج
بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں حیدرآباد
دکن کی ان مطبوعات کے مکمل سٹ موجود ہیں۔
کراچی کی بعض دوسری لائبریریوں، لاہور کے کتبخانوں
اور بعض دوسرے شہروں میں بھی یہ کتابیں کتب خانوں
کی زینت ہیں۔ اور ان سے فائدہ اٹھانا باآسانی ممکن ہے۔

۱۹۴۹ء کے سال تعلیمی سے کراچی میں "اردو
کالج" کام کر رہا ہے۔ تمام مضامین یہاں اردو میں
پڑھائے جاتے ہیں۔ قانون کی تعلیم بھی اردو ہی
میں دی جاتی ہے۔ اس ضرورت کے تحت کراچی کے
ناشروں نے قانون اور سائنس کے مضامین پر بہت
کتابیں شائع کی ہیں۔ اور برابر شائع کرتے رہتے
ہیں۔ "اردو سائنس کالج" علیحدہ قائم ہوچکا ہے،
اور بخیر وخوبی سائنس کے جملہ مضامین کی تدریس
اردو زبان کے ذریعے کر رہا ہے۔ اگر حکومت یا کوئی
بڑا اشاعتی ادارہ ان کالجوں کے اساتذہ کے "کلاس
لکچر" ہی جمع کرکے شائع کردے تو عجب اور مفید
کتابیں جمع ہوجائیں۔ جو جدید ترین معلومات و نظریات
کی جامع اور خود مکتفی ہوں گی۔

پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۴۹ء میں بی۔ اے تک
تمام مضامین میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی اجازت
دیدی تھی۔ اور فیصلہ کیا تھا کہ امتحان میں طلبہ کو
اختیار ہوگا کہ جوابات اردو میں لکھیں یا انگریزی میں۔
چند سال ہی میں نظر آگیا کہ طلبہ کی اکثریت سی اکثریت
نے اردو زبان کو اختیار کیا۔ اور بہت کم تعداد ایسی تھی
جو انگریزی میں جواب لکھتے تھے۔ بعد میں پنجاب یونیورسٹی
نے ایم اے کی سطح پر بھی اس اختیار کو وسیع کردیا۔ اور بعد
میں ایم ایس سی کی باری آئی۔ مگر ہمارے یورپ زدہ
خودساختہ ماہرین تعلیم درمیان میں کود پڑے۔ اور
پنجاب یونیورسٹی نے تجربہ کی جو تدریجی مدت قرار دی
تھی، اس کو حکماً آگے بڑھا دیا گیا۔

یہی صورت کراچی یونیورسٹی میں ہوئی۔ البتہ
وہاں کے ارباب اختیار نے زیادہ ثابت قدمی کا ثبوت
دیا۔ چنانچہ وہاں اب تک قانون، سائنس وغیرہ
سب میں اعلیٰ درجات تک طلبہ کو اختیار ہوتا ہے کہ
امتحان میں اردو کو ذریعۂ اظہار بنائیں۔

اس بارے میں سب سے زوردار اعتراض یہ
کیا جاتا ہے کہ "انگریزی زبان سائنس، طب، انجینئرنگ
وغیرہ کی کتابوں کا جو ذخیرہ رکھتی ہے اس کا عشر عشیر
بھی اردو میں موجود نہیں ہے۔" اس قول سے اختلاف کی

نہ مجال نہ ضرورت ۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا
ساری دنیا انگریزی کے سہارے علمی اور تعلیمی ترقی
کر رہی ہے۔

جرمنی۔ روس۔ جاپان اور چین کی مثالیں ہمارے
سامنے ہیں۔ ان ملکوں کی زبانیں اور یہاں کے سائنس داں
انگریزی زبان والے ملکوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔
بلکہ کتنے سائنس اور خلائی علوم میں آگے ہی ہیں صنعتی
اور فنی میدانوں میں ان کی حیرت ناک ترقی عالم آشکارا
ہے۔ اور بدیہی طور پر معلوم ہے کہ یہ ممالک اپنی زبانوں
ہی کو ذریعۂ تعلیم و تحقیق۔ اور وسیلۂ اظہار و ابلاغ
بنائے ہوئے ہیں۔

ایک امریکی مصنف نے عرصہ ہوا لکھا تھا کہ
"نئے روس نے اپنی اس قوم کو جو ہزارہا سال
سے تاریکی اور جہالت میں پھنسی ہوئی تھی، صرف بیس
سال میں ایسا تعلیم یافتہ بنا دیا کہ اب وہاں تعلیم یافتہ
طبقہ کا اوسط پچانوے فی صد ہے" یہ کیونکر ممکن ہوا؟
صرف اس لئے کہ ابتدا سے انتہا تک روسی زبان ہی
ذریعۂ تعلیم بنی رہی۔

چین کی مثال اس سے کچھ زیادہ ہی روشن
ہے۔ چین ہمارے دو سال بعد قومی آزادی حاصل
کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ چینیوں کی عصبیت
ضرب المثل ہے۔ جدید علوم و فنون میں ان کی ترقی
یورپ اور امریکہ کے لئے بھی موجب حیرت بنی ہوئی
ہے۔ سائنس، انجینئرنگ اور خلائی میدانوں میں چین نے
جو ترقی کی ہے، وہ صرف اس لئے ممکن ہوئی کہ چینی
زبان ہی اول سے آخر تک ذریعۂ تعلیم بنی ہوئی ہے۔

بدیہی بات ہے کہ جب ہم کسی موضوع کی بابت
سوچتے ہیں تو "اپنی زبان" کو وسیلہ بناتے ہیں۔
خواہ بعد میں ہم کسی دوسری زبان میں اظہار خیال
کرنے لگیں۔ اگر اردو ذریعۂ تعلیم بنا دی جائے تو طلبہ
کے لئے افہام و تفہیم، غور و فکر اور اظہار و ابلاغ کا کام
از بس آسان ہو جائے۔ ایم۔ اے۔ ایم ایس سی کے
طلبہ، جنھیں نویں جماعت سے سولھویں جماعت
تک انگریزی زبان میں پڑھایا جاتا رہا، یعنی جن
کو آٹھ سال تک صرف انگریزی زبان سے واسطہ
رہا، ان تک میں اردو کے خطبات و مقالات مقبول
ہوئے۔ اور انھوں نے صاف صاف اعتراف کیا کہ
سائنس کے وہ مسائل جو اب تک ہم پر واضح نہ تھے،
اردو زبان میں لکچر سننے سے بآسانی اور بخوبی ذہن نشین
ہو گئے۔ ایسی تدریسی تجربات لاہور اور کراچی میں
بار بار کئے جا چکے ہیں۔ اور کامیاب رہے ہیں۔

مگر ہمارے مغرب زدہ بزرگ کسی طرح ان
بدیہی تجربات و نتائج کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔
ہمیں معلوم ہے کہ اب سے کچھ دن پہلے تک انڈونیشیا
اور مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک تعلیم و علوم میں
ہم سے بہت پیچھے تھے۔ مگر ان کا قومی و ملّی و علمی
شعور یقیناً ہم سے بہت بہتر تھا کہ انھوں نے اپنے
ملکوں میں تعلیم کو وسیع کیا تو اپنی قومی زبان کو ہی
ذریعہ تعلیم بنایا۔ ان تمام ممالک کا یہ تجربہ ہم سب کے
سامنے۔ اور آج کی بات ہے۔ چنانچہ ان کی علمی اور

تعلیمی ترقی کی رفتار اور اس کے نتائج ہم سے بہت بہتر ہیں۔ کاش کہ ہم بھی عقل و تجربہ کی راہ پر گام زن ہوں!!

مقام شکر ہے کہ انٹرمیڈیٹ تک ہمارے تمام بورڈ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا چکے ہیں۔ اگر حکومت حوصلہ افزائی کرے تو یونیورسٹیوں میں بھی بآسانی اس تجربے سے فائدہ اٹھا کر اُسے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ چالیس سال پرانی بات ہے کہ یو۔ پی میں جب اردو اور ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا تھا تو ابتداء میں کالج کے پروفیسر بہت پریشان تھے کہ کیسے پڑھائیں گے مگر چند ہفتے گزرنے پر خود انھوں نے شہادت دی کہ "اردو/ہندی کے ذریعے افہام و تفہیم میں بڑی آسانی ہوگئی۔ اب طلبہ کے چہروں سے نظر آتا ہے کہ وہ لکچر سن کر زیادہ طمانیت اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔"

یہی بات اردو کو سرکاری، درباری، عدالتی، کاروباری حیثیت دینے کے معاملے میں فی صد صحیح ہے۔ کوئی کرنے تو دے!! ہماری کچہریوں میں ضلعی سطح تک آج بھی سارا کاروبار اردو کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ پنجاب اسمبلی کی تمام کارروائیاں اور رودادیں بحمد اللہ بخیر و خوبی اردو میں تکمیل پاتی ہیں۔ اگر اسے وسعت دی جائے تو تمام دفاتر اور تمام صوبوں میں عدالت عالیہ تک ہر کام بآسانی اور بخوبی انجام پذیر ہونے لگے۔ لائق صد تحسین و ستائش ہے۔ پنجاب کی عدالت عالیہ کے چیف جسٹس جناب محترم جسٹس محمد اقبال صاحب کا یہ حکم کہ انہوں نے ہائی کورٹ کی تمام کارروائی کے لئے اردو زبان کو اختیار کرنے کی اجازت دیدی ہے۔ اور لاہور ہائی کورٹ کے محترم جسٹس جناب نسیم حسن صاحب نے اپنا فیصلہ اردو میں لکھ کر اور سنا کر قومی جذبہ کی بیش بہا مثال پیش فرمائی ہے۔

جناب اے۔ ڈی اظہر صاحب مرحوم کا یہ لطیفہ مشہور ہے (پہلے دوسروں سے سنا تھا۔ جب وہ پشاور یونیورسٹی میں ہمارے شعبے میں تشریف لائے تو انہوں نے بغیر نام لئے اور زیادہ تفصیل سے سنایا۔) فرماتے تھے۔ کہ عرصہ ہوا وہ لندن گئے ہوئے تھے۔ وہاں ان کے کوئی دوست مل گئے جو پاکستان میں کسی بڑے اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اظہر صاحب نے باتوں باتوں میں ان سے کہا کہ "اردو کو سرکاری اور دفتری زبان بنانے میں اعانت کرو۔ ایسا ہو جائے تو سب کو بڑی آسانی میسر آجائے۔" ان حضرت کا جواب واقعی یادگار رہے گا۔ بقول داغ کے کہ "یہ بات بھی ہے لکھنے کے قابل کتابوں میں"۔ فرمایا تھا کہ "آپ لوگ خدا کے لئے اس اقدام کو ترک کیجئے۔ ورنہ ہم جیسوں کو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ اب تو یہ ہوتا ہے کہ نیچے سے جو فائل آتا ہے، اس کی غلط یا گھٹیا انگریزی کے مقابلے میں میری انگریزی بہت بہتر ہوتی ہے۔ اور اس طرح میرا بھرم قایم رہتا ہے۔ جب اردو میں سارا کام ہونے لگے گا تو مجھے فائل پر حکم لکھنا

مشکل ہو جائے گا۔ میرا کلرک اور سپرنٹنڈنٹ جو نوٹ لکھیں گے۔ اس کی زبان میری زبان سے بہتر ہوگی۔ اور میری اردو تحریر دیکھ کر میرا ماتحت عملہ میری استعداد پر ہنسے گا۔ اس لئے عافیت اسی میں ہے کہ انگریزی ہی دفتری اور سرکاری زبان بنی رہے "

انگریزی دانی کی بابت یہ زعم ہمارے اکابر کو جس غلط فہمی میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔ وہ خود اس قابل ہے کہ اس پر ماتم کیا جائے۔ مولانا محمد علی جوہر۔ قائد اعظم علامہ عبد اللہ یوسف علی اور پطرس بخاری جیسے اہل علم جنہیں انگریزی پر اہل زبان جیسی ماہرانہ قدرت حاصل ہو، ہمارے ہاں "الشاذ کالمعدوم" کے ذیل میں ہیں۔ ورنہ دوسروں کا حال تو یہ ہے کہ ان کی انگریزی تحریر و تقریر پر انگلستان کے ماہرین زبان ہنستے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ "پاکستان ہندوستان میں جو زبان لکھی بولی جاتی ہے۔ اسے صحیح انگریزی کہنا ممکن نہیں"۔ مشہور مصنف سمرسٹ ماہم مشرق بعید کے سفر میں جب تھوڑی دیر کے لئے کراچی کے ہوائی اڈے پر رکا تھا۔ تو قدرتی طور پر ہمارے انگریزی زبان کے "ماہرین" اس سے ملنے کے لئے گئے تھے ان دنوں میں اس واقعہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی کہ اس نے ان "ماہرین زبان" کو رخصت کے وقت مشورہ دیا تھا کہ "آپ اپنی زبان کی خدمت میں مصروف رہئے۔ انگریزی آپ کے ہاتھوں میں اگر انگریزی نہیں رہے گی۔ اس لئے اس پر رحم کیجئے۔"

اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں سب سے بڑی رکاوٹ "مطبوعات اور اصطلاحات" کو قرار دیا جاتا ہے۔ کتابوں کا کچھ حال میں پہلے بیان کر چکا۔ اس پاکستانی دور میں اردو میں سائنس وغیرہ کی مطبوعات میں کمی کی بڑی وجہ صرف یہ ہے کہ نہ حکومت حوصلہ افزائی کرتی ہے نہ جامعات ہمت بندھاتی ہیں۔ اگر اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے تو دن دونی رات چوگنی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ اور بازار کتابوں سے بھر جائیں

ظلمتِ شام سے اندازۂ انجام نہ کر
رات کی رات میں انجام بدل سکتا ہے

لاہور اور کراچی کے بعض ادارے ان دشوار حالات میں بھی سائنسی مضامین پر اردو میں بہت سی کتابیں شائع کرتے رہے ہیں۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور۔ ادارۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی۔ ادارۂ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی اور بعض دوسرے اشاعتی اداروں کا کام اس سلسلے میں قابلِ قدر اور لائقِ ستائش ہے۔

اصطلاحات کا اعتراض سب سے زیادہ وزنی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہی سب سے بودا اور ناقابلِ التفات اعتراض ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی اور دار الترجمہ حیدرآباد دکن نے جملہ علوم و فنون کی اصطلاحات کے مناسب ترجمے کر دیئے تھے۔ جو کتابی شکل میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ اگر ہم ان اصطلاحات کو پسند نہ کرتے ہوں یا انھیں بہتر نہ سمجھتے ہوں تو کیا مشکل ہے۔ ان پر نظر ثانی کر کے ضروری ردّ و بدل کر لیجئے۔ ماہرین علم و فن

کی ایک یا زیادہ ذمہ دار کمیٹیاں بنا دیجئے۔ جو حیدر آباد دکن کی بے توجہی کے باوجود اس سلسلے میں بھی ہمارے ہاں خاصہ کام ہوا ہے۔ اوپر جن تین اداروں کے نام آئے، انھوں نے یہ کام بھی بہت کچھ انجام دے دیا ہے، کام کا آغاز کرنے کے لئے بہرحال کوئی رکاوٹ جائز طور پر سدّ راہ نہیں بن سکتی۔ اور اگر

؎ "دو بیزار ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں"

سائنس، طب، انجینئرنگ وغیرہ میں بین الاقوامی اصطلاحات استعمال کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ بھی کوئی بحث طلب بات نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ فیصلہ صرف ماہرین اور علما ہی کر سکتے ہیں۔ ان پر چھوڑ دیجئے وہ جانیں اور ان کا کام۔ دوسرے یہ کہ کچھ نام اور اصطلاحات کی حیثیت صرف علمی اور کتابی ہوتی ہے۔ ورنہ ان کے بجائے خود انگریزی میں بھی دوسرے آسان نام ہوتے ہیں۔ جو عام استعمال میں آتے ہیں۔ یہی صورت ہم بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ روس، جرمنی، جاپان اور چین کا عمل ہمارے سامنے ہے۔ ہم بھی انہی کی روش پر چل سکتے ہیں۔ غرض "اصطلاحات" کا "حیلہ بہانہ" مقصد برآری میں مطلق رکاوٹ نہیں بننا چاہئے۔

یہ بات بہرحال سمجھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس علمی اور قومی مسئلہ کے عناصر اربعہ یہ ہیں کہ

(۱) ہر ملک کی ایک اپنی زبان ہوتی ہے۔

(۲) ہر ملک اپنی زبان کو تعلیمی، علمی، سرکاری دفتری، کاروباری امور میں ذریعہ و وسیلہ بنایا کرتا ہے۔

(۳) طلبہ صرف اس وقت اچھی استعداد اور اعلیٰ معیار پیدا کر سکتے ہیں۔ جب ان کو انہی کی زبان میں تعلیم دی جائے۔

(۴) ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ صرف اس وقت صحیح غور و فکر، اعلیٰ تحقیق و تدقیق اور بہتر علمی اور سائنسی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ جب اُن کا ذریعۂ تعلیم اور وسیلۂ اظہار اردو اور صرف اُردو ہو۔

کلیم! شکوہ ز توفیق چند! شرمت باد!!
تو چوں بہ رہ نہ نہی پائے، رہنما چہ کند!!

اجلاس
شعبۂ قومی تعلیم اور اس کا نصب العین

جمعہ ۲۹ اگست ۱۹۷۵ء کو ۶ بجے شام کانفرنس لائبریری ہال میں متذکرۂ بالا شعبہ کا اجلاس زیرِ صدارت جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب منعقد ہوا۔ مقامی و بیرونی مندوبین کے علاوہ ماہرین تعلیم کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ جلسہ کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک از کنور اعظم علی خاں صاحب سے ہوا۔ بعد ازاں جناب ڈاکٹر منظور الدین احمد پروفیسر پولیٹیکل سائنس ڈپارٹمنٹ کراچی یونیورسٹی۔ پروفیسر مغنی صاحب اور پروفیسر قمر آستان صاحب (سرسید گرلز کالج)، نیز ملک جمال الدین صاحب جنرل سکریٹری انجمن فیض الاسلام راولپنڈی اور محترمہ بیگم ڈاکٹر منور علی صاحبہ نے تقریریں کیں۔ آخر میں صدر محترم جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب نے موضوع زیرِ بحث پر انتہائی فاضلانہ اور پرجوش تقریرِ صدارت فرمائی۔

تقریروں میں متعدد بنیادی اہمیت رکھنے والے علمی، تحقیقی اور تعلیمی مسائل سامنے آئے جن کے مختلف پہلوؤں پر ماہرینِ تعلیم و تدریس نے اپنے اپنے تجربات و شواہد کی روشنی میں اظہار خیال کیا۔ بہت سی ایسی تجاویز پیش کی گئیں جن کو عملی جامہ پہنانے کے اصول پر بلا تاخیر کام شروع کیا جا سکتا ہے اور وہ فروغِ علم کے لئے نہایت موثر اور کارآمد ذریعہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ باتفاق آرا قرار پایا کہ چار روزہ اجلاس ہائے کانفرنس و نیز اس جلسہ کے نتائج بحث و گفتگو کی روشنی میں رزولیوشن تیار کئے جائیں اور ان کے لئے جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب کی ایک رکنی کمیٹی مقرر کی گئی۔ سکریٹری کانفرنس کو بھی مجاز کیا گیا کہ جب مذکورہ رزولیوشن تیار ہو جائیں تو ان کو مرکزی حکومت پاکستان، مختلف صوبائی حکومتوں یونیورسٹیوں اور اخبارات کو روانہ کر دیں۔

اس قرارداد کی تعمیل میں درجِ ذیل بات رزولیوشن ترتیب دیئے گئے اور اربابِ اختیار کو روانہ کئے گئے۔

———— ※ ————

تجاویز

رزولیوشن ۱

طلبا اور قومی خدمت

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ

طلباء میٹرک کلاس میں پڑھتے ہیں یا کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہوتے ہیں وہ بدوران سال کئی کئی مہینے حصول تعلیم میں مصروف نہیں رہتے اور ملک کی خدمت کے لئے اس زمانہ میں وقت دے سکتے ہیں۔ جب کہ وہ سالانہ امتحانات کے نتائج کا انتظار کرتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ایک سال میں میٹرک کلاسوں کے طلباء کو دو تین ماہ کی مہلت حاصل ہوتی ہے۔ اور اونچی کلاسوں کے طلباء کو تین سے چھ ماہ تک کا وقت مل سکتا ہے۔

لہٰذا اس امر کے پیش نظر کہ ملک کو ایسے مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہے جو اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم دے سکتے ہیں نیز ٹیکنیکل اور سوشل کاموں میں امداد دے سکتے ہیں۔ یہ کانفرنس محسوس کرتی ہے کہ متعلقہ ارباب اختیار کو مرکزی حکومت کی تیار کردہ ایک اسکیم کے تحت ایسے انتظامات کرنے چاہئیں۔ جن پر طلباء متوجہ ہو سکیں اور اس قابل ہو سکیں کہ وہ اپنا خالی وقت ملک کی خدمت میں لگائیں۔

یہ کانفرنس فیصلہ کرتی ہے کہ مرکزی حکومت مندرجہ بالا تجویز پر غور کرے اور ضروری انتظامات اس امر کو ملحوظ رکھ کر کرے کہ مجوزہ اسکیم کی کامیابی کا دارومدار ان لوگوں کی لیاقت اور جذبۂ خدمت پر موقوف ہوگا جو اس کو انجام دیں گے۔

ریزولیوشن ۲

پبلک ذہن میں انتشار سے گریز

اس کانفرنس نے گہری تشویش کے ساتھ اس بات کو نوٹ کیا ہے کہ پاکستان میں اسلامی جمہوریہ کے نظریہ کو اپنانے میں اتحاد خیال مطلوبہ اونچے درجہ تک ترقی نہیں کر رہا ہے۔ اور اس مسئلہ پر کافی غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اس کا اصلی سبب وہ متضاد نعرے اور اپیلیں ہیں جو متخالف نقطہ ہائے نظر سے قوم کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً مارکسی سوشلزم اور یورپین طرز کی نیشنلزم اور علاقائیت وغیرہ۔ ان متخالف نقطہ ہائے نظر کا اظہار تعلیمی اداروں نیز ابلاغ عامہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

اس کانفرنس کی پُرزور رائے ہے کہ یہ اختلافات اتحاد قومی کے مفاد میں دور کئے جائیں۔ مزید فرمایا کہ قومی اتحاد کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچانے کے لئے تمام متخالف نقطہ ہائے نظر اور متذکرہ اپیلوں کی سرکاری پلیٹ فارموں، تعلیمی اداروں اور ابلاغ عامہ کی تنظیموں میں ہمت شکنی کی جائے اور ان کو ختم کیا جائے۔ صرف ایک ہی آواز بلند کی جائے جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کی خدمت کے حق میں ہو۔

ریزولیوشن ۳

اختیارات کے قومیائے جانے اور ان کی غیر ضروری مرکزیت کے درمیان فرق

یہ کانفرنس محسوس کرتی ہے کہ تعلیمی اداروں کے انتظام میں قومیائے جانے اور غیر ضروری اختیارات کی مرکزیت کے درمیان امتیاز معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ انتظامیہ کا رجحان اختیارات کی مرکزیت کی جانب ہے۔ کیونکہ نگرانی چوکنا رہنے کی متقاضی ہے۔ اس کے برعکس تمام انتظامی مسائل کا

چارج لے لینا اس پیدا شدہ ماحول میں سہل ہے کہ وہ پبلک کو جوابدہ نہیں ہے اور سنگین غلطیاں بھی جو سرزد ہوتی ہیں وہ محکمہ جاتی راز رہتی ہیں اور ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی جس کے نتیجہ میں محکموں کی کارکردگی میں الجھاؤ جاری وساری رہتا ہے جو ذمہ داریاں انہوں نے لے رکھی ہیں ان کی تعمیل کے لئے عارضی ہدایات جاری کی جاتی ہیں۔ یہ عمل تعلیمی اداروں کے داخلی انتظام پر بھی حاوی رہتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر/پرنسپل یونیورسٹیوں کے رجسٹرار اور وائس چانسلر کو بھی یقین نہیں ہوتا کہ جو اختیارات وہ استعمال کر سکتے ہیں ان میں مداخلت نہیں ہوگی۔ لہٰذا وہ اصلاح حال اور ذمہ داری کی ادائیگی میں دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ لال فیتہ شاہی اور مالیات پر کنٹرول کے باعث کروڑہا روپئے قیمت کی عمارات اور فرنیچر خراب ہو رہا ہے۔ اور طلبار سرکشی کا انداز اختیار کئے ہوئے ہیں۔ استادوں کو متبادل انتظام کئے بغیر رخصتیں دی جاتی ہیں اور طلبار کے داخلوں میں دخل اندازی عام دستور بن چکا ہے۔

لہٰذا یہ کانفرنس ارباب اختیار کو لامرکزیت کی ضرورت پر متوجہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ لامرکزیت عملی حقائق پر مبنی ہو۔ نہ کہ محض کاغذی انتظامی اختیارات اور پہلے سے طے شدہ معقول رقوم خرچ کرنے کی آزادی ہو نیز طلبار کے داخلے میں ہیڈ ماسٹر/پرنسپل اور یونیورسٹیاں بالکلیہ مجاز ہوں۔ عارضی احکامات کے ذریعہ ایڈمنسٹریشن کا کام چلانے کی رسم بھی ختم کی جاوے۔

ریزولیوشن ۸ لائق اساتذہ

طویل تجربے کی بنا پر بلاخوف تردید اس کانفرنس کی رائے ہے کہ قابل اطمینان تعلیم کے لئے اہم ترین اقدار کا حامل اچھا ٹیچر ہوتا ہے اور بہترین ٹیچر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے پاس اونچی ڈگریاں ہوں یا بہت سی ڈگریوں کی ایک لائن لگی ہوئی ہو۔ بلکہ اس کو علم کی سچی لگن ہو۔ ایسی لگن جس سے اس کے شاگرد بھی اثر پذیر ہو کر اپنے میں اس جیسی علم سے دلچسپی حاصل کریں۔ لہٰذا کسی لائق استاد کو جانچنے کا پیمانہ اس کی شخصیت ہے اور یہی چیز اس کے انتخاب کے وقت پیش نظر رہنا چاہیئے۔

اگر یہ صفت ابتدائی تقرر کے وقت دریافت نہ کی جاسکے تو اس بات پر نظر رکھنی چاہیئے۔ کہ اساتذہ کی کیا صورت گری ہوتی ہے تاکہ وہ لوگ جو مطلوبہ صفت رکھتے ہیں ان کو ہمت افزائی کے لئے منتخب کیا جاسکے اور پیشۂ تعلیم میں انہیں دوسروں کے لئے ممتاز اور نمونہ کا فرد بنایا جاسکے۔ لہٰذا یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ تمام تر اہمیت ایسے لوگوں کو دی جائے جو تعلیم وتربیت کے جذبہ سے سرشار ہوں اور اپنے شاگردوں کو تعلیم وتربیت کا اعلیٰ نصب العین دینے کے لائق ہوں تاکہ پیشہ ورانہ اور غیر ضروری تصنع کی حوصلہ شکنی ہو اور اُن اساتذہ کی جو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس معیار کو قائم رکھیں۔ ان کی عزت افزائی ہو تاکہ وہ بہتر طریقہ پر دوسروں کے لئے بطور نمونہ خدمت کرسکیں۔

رزولیوشن ۵
معیارِ تعلیم

یہ کانفرنس اس عام شکایت کو محسوس کرتی ہے کہ تعلیم کا معیار گر رہا ہے، اساتذہ پروفیسر صاحبان طلبا اور پبلک یہ شکایت کھلے عام اور پرائیویٹ گفتگو میں کرتے ہیں۔ اس کے برعکس آوازیں شاذ ہی سنائی دیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تعلیمی سال کے دوران کورس ختم نہیں ہوتے اور جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ ان کا علم سطحی ہوتا ہے حصول تعلیم میں دلچسپی کم ہو رہی ہے اور علمی نیز پیشہ ورانہ ڈگریاں اپنے ملک میں اور بیرونی ممالک میں اپنی اہمیت کھو رہی ہیں۔

یہ کانفرنس اس صورت حال پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ بظاہر یہ کسی کا بھی فرض اور ذمہ داری معلوم نہیں ہوتی کہ وہ تعلیم کی قدر و قیمت پر نظر رکھے۔ لہٰذا کانفرنس کی رائے میں ضروری ہے، کہ اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تدریسی نگرانی کے لئے ایسے راہ نما محکمے قائم کئے جائیں جو ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن سے آزاد ہوں اور ان کے فرائض یہ ہوں کہ وہ تعلیمی اداروں کا دورہ کریں طلبا اور اساتذہ سے انٹرویو لیں۔ مختلف امتحانات کے جوابی کاپیوں کی نمونتاً چیکنگ کریں۔ کلاس روم اور کلاس روم کے باہر تمام مدارج کے ٹیچر وغیرہ کی کارکردگی جانچیں تعلیمی و تدریسی معاملات سے متعلق شکایات سنیں اور عمل تدریس کے مسائل سے باخبر ہو کر یہ دیکھیں کہ آیا تعلیمی ماحول کس حد تک پیدا ہوا ہے اور آیا اسے قائم رکھا جا رہا ہے۔ یا نہیں ـــــ وقتاً فوقتاً ایسی رپورٹیں جاری کی جائیں جو قابل عمل سفارشات پر مبنی ہوں اور اچھے کام کے اعتراف کی حامل ہوں۔ ساتھ کے ساتھ غلط طریقوں کی ایسی تنقید کی جائے۔ کہ جس سے ٹیچروں، تعلیمی اداروں اور محکمہ ہائے تعلیم کی صحیح راہ نمائی ہو سکے۔

لہٰذا یہ کانفرنس مرکزی حکومت کو مندرجۂ بالا ضرورت پر متوجہ ہونے اور مناسب اقدامات کرنے کی سفارش کرتی ہے۔

رزولیوشن ۶
ابتدائی تعلیم کے لئے مساجد کا مناسب استعمال

کانفرنس کے مشاہدہ میں ہے کہ اسکولوں اور کالجوں کی عمارتوں میں متناسب گنجائشوں کے خلاف طلبا کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ساتھ ہی سیکڑوں مساجد ایسی ہیں جن سے توسیع تعلیم کا کام لیا جا سکتا ہے۔ متولی صاحبان کے اتحاد عمل سے ان کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ مساجد کے اماموں کو جز وقتی ٹیچر قرآن شریف، مادری زبانیں اور نماز پڑھانے کے لئے مقرر کیا جا سکتا ہے۔ دن کے بیشتر حصے میں بالخصوص نماز عصر سے پہلے تک مسجدیں کسی کام میں نہیں لائی جاتی ہیں۔ زیر تعلیم بچے ظہر کے وقت نماز باجماعت پڑھ کر مساجد کے متبرک ماحول سے بھی مستفیض ہو سکتے ہیں۔

اگر مسجدوں کو پرائمری اسکولوں کے کام میں لایا جائے گا۔ تو وہ عمارتیں جو آجکل ان کے استعمال میں ہیں۔ ان کو اونچے کلاسوں کی تعلیم کے کام میں لایا جا سکے گا۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ابتدائی

تعلیم کے کلاسوں کا نصاب اختلافی نہیں ہوتا ہے۔

لہٰذا اس کانفرنس کی رائے میں اگر ارباب اختیار مندرجہ بالا تجویز کے مطابق ابتدائی تعلیم کے لئے مساجد کے استعمال کو سہل العمل خیال کریں گے تو نئی عمارتوں کے بنائے جانے کا بہت کچھ صرفہ بچ جائے گا اور ساتھ کے ساتھ خود مساجد کی مقبولیت اور ان کے بہتر انتظام میں اضافہ ہو جائے گا۔

رزولیوشن ۔ علاقائی اور آل پاکستان ثقافت کے باہمی ربط کی اہمیت

اس کانفرنس کا پختہ یقین ہے کہ قومی کلچر کے معنی اس کی رنگا رنگی یا سپاٹ یکسانیت کے منافی نہیں ہے اور اس طرح ایک قومی کلچر کو ترقی دینے یا صوبائی و مقامی رسم و رواج عادات و خصائل ایسی تقریبات جو موسمی اور جغرافیائی حیثیت کی ہوں وہ ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔

مزید براں اس کانفرنس کو اس بات میں بالکل شبہ نہیں ہے کہ پاکستان کی بحیثیت مجموعی ایک منفرد اور قیمتی قومی کلچر ہے اور عادات و خصائل رسم و رواج کے تیوہار اور عقائد اور زندگی کا مشترک نظریہ پاکستان میں ہر جگہ یکساں پایا جاتا ہے۔

قومی صوبائی اور مقامی ثقافتوں کی ترقی اور ان کا اعتراف ساتھ ساتھ ہو سکتا ہے لہٰذا ذرائع ابلاغ عامہ اور تعلیمی ادارے درج ذیل امور کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

(۱) مقامی و صوبائی ثقافتوں کو اس طرح پیش کیا جائے اور ترقی دی جائے کہ وہ قومی ثقافت کے مدمقابل نہ سمجھی جائیں بلکہ وہ محض اس کی ذیلی شاخیں شمار کی جائیں۔

(۲) ہمیشہ اس پر زور دیا جائے کہ وہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اور

(۳) پبلک کو ہمیشہ یاد دہانی کی جاتی رہنی چاہئے کہ مقامی اور صوبائی رسوم، معمولات، تقاریب اور جذبات اور اجتماعیت کے بھی ہوتے ہیں جو بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اور جن کا وجود بعض اوقات الگ الگ کبھی ایک دوسرے سے ملا جلا اور کبھی کبھی صرف مقامی اور صوبائی شکل میں نظر آتا ہے۔

اس جلسہ کے خاتمہ پر ۲۸ اگست سے شروع ہونے والے شعبہ جاتی جلسے اختتام پذیر ہوئے۔ یہ سب جلسے کانفرنس ہال میں ہوئے اور ہر ایک نشست کے بعد ایک علیحدہ شامیانے میں مہمانوں کی پر تکلف چائے سے بھی تواضع کی جاتی تھی۔

بزمِ مشاعرہ

سلور جوبلی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی اختتامی تقریب مشاعرہ تھی جو ہفتہ ۳۰ راگست ۱۹۷۵ء کو رات کے ۹ بجے سرسید گرلس کالج کراچی میں منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کی صدارت عزت مآب مولانا کوثر نیازی وفاقی وزیر امور مذہبی نے فرمائی۔

صدر مشاعرہ اور شعراء کی نشستوں کے لئے ۲۷ راگست کے افتتاحی اجلاس کی طرح ترتیب دیا گیا تھا اور شہ نشین کو بڑی خوبصورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ سامعین کے لئے وسیع پنڈال میں صوفے اور کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ سارا پنڈال برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں تقریباً ڈھائی ہزار اصحاب و خواتین نے شرکت کی۔

مشاعرہ کا آغاز پروفیسر مسز سلطانہ علی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد جناب ڈاکٹر فریدالدین صاحب بقائی صدر مجلس استقبالیہ نے مولانا کوثر نیازی کی گلپوشی کی اور استقبالیہ تقریر فرمائی۔ اس کے بعد جناب این۔ ایچ۔ نجمی (علیگ) معتمد مجلس استقبالیہ نے خیر مقدمی تقریر کی۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری سید الطاف علی بریلوی اور صدر عالی جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب نے معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی تعلیمی، علمی اور ادبی خدمات پر مختصراً مگر جامع انداز میں اظہار خیال کیا۔ اس کے بعد صدر مشاعرہ مولانا کوثر نیازی بالقابہٗ نے اپنی تقریر میں سرسید احمد خاں کو زبردست خراج عقیدت پیش فرمایا۔ اور کہا کہ وہ دو قومی نظریے کے بانیوں میں سے تھے جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا۔ پاکستان نظریاتی طور پر علی گڑھ تحریک کی توسیع شدہ تحریک کے نتیجے میں قائم ہوا۔ سرسید احمد خاں کے مقاصد وہی تھے جو دوسرے ممتاز مسلم مفکرین مثلاً مولانا الطاف حسین حالیؔ، علامہ اقبالؔ اور قائد اعظم محمد علی جناح کے تھے۔ علی گڑھ کالج قائم کرکے سرسید نے مسلم نوجوانوں میں جدید تعلیم کی بنا ڈالی تھی۔ یہ کالج بعد میں مکمل یونیورسٹی بنا۔ اور اس نے مسلمانوں کی ایک ایسی نسل کی تربیت کی جس نے بعد میں جدوجہد کرکے برصغیر کے مسلمانوں کے لئے پاکستان حاصل کیا۔ مولانا کوثر نیازی نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمات

کو بھی خراج تحسین پیش کیا۔ اور فرمایا کہ اس ادارہ کو جب بھی کوئی مشکل پیش آئے میں خدمت سے گریز نہ کروں گا۔ آخر میں مشاعرہ کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ مشاعرے مسلم ثقافت کا ایک حصہ ہیں اور دانشوروں کے لئے تعلیم و تفریح کا ایک اچھا ذریعہ ہیں۔

صدر مشاعرہ کی اجازت سے پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد معتمد مشاعرہ نے اپنی غزل سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ چونکہ صدر محترم زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے اس لئے رات کے ۱۲ بجے موصوف سامعین کے اصرار پر اپنا کلام سنا کر تشریف لے گئے۔

اس وقفہ میں مہمانوں کی چائے سے تواضع کی گئی۔ اور مشاعرے کا دوسرا دور عالی جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب صدر کانفرنس کی صدارت میں شروع ہوا جو رات کے ۲ بجے اختتام کو پہنچا۔ آخر تک پنڈال شائقین سے کھچا کھچ بھرا رہا۔ شعراء صاحبان کی واپسی کے لئے جناب ڈاکٹر لقمانی اور معتمد مشاعرہ نے موٹروں کا انتظام کیا۔

کراچی میں بہت دنوں بعد اتنا کامیاب اور بارونق مشاعرہ ہوا۔

جن شعرائے کرام نے اپنا اپنا کلام سنایا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

۱۔ محترمہ مہر النساء مہر
۲۔ جناب پروفیسر جاذب قریشی
۳۔ جناب پروفیسر شور (علیگ)
۴۔ جناب تابش دہلوی
۵۔ جناب اقبال صفی پوری
۶۔ جناب صہبا اختر
۷۔ جناب رحمٰن کیانی
۸۔ جناب اعجاز رحمانی
۹۔ جناب احسان کاکوروی
۱۰۔ جناب مجیب خیر آبادی
۱۱۔ جناب اختر فیروز
۱۲۔ جناب عنبر چغتائی
۱۳۔ جناب عیش ٹونکی
۱۴۔ جناب کنور محمد اعظم علی خاں خسروی
۱۵۔ جناب ڈاکٹر یوسف جاوید
۱۶۔ جناب حکیم انجم فوقی بدایونی
۱۷۔ جناب دلاور فگار
۱۸۔ جناب یوسف بخاری
۱۹۔ جناب انوار عزمی
۲۰۔ جناب منظر کامل
۲۱۔ جناب منور بدایونی
۲۲۔ جناب امید فاضلی
۲۳۔ محترمہ بشریٰ شمس
۲۴۔ جناب عبرت صدیقی
۲۵۔ جناب نیر بن سوز
۲۶۔ جناب ڈاکٹر انعام حسن حریف۔

مشاعرہ کے بعد چار روزہ تقریب جوبلی اختتام پذیر ہوئی

مانا کہ جوبلی تھی فقط چار دن کا خواب
یہ چلد دن کا خواب بھی لیکن تھا لاجواب

تبصرے و تاثرات

جناب اخلاص حسین زبیری ایم اے

اس خاکسار کو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کے سہ ماہی مجلہ "العلم" سے ۱۹۵۱ء سے خاص دلچسپی رہی ہے اور اس دوران کئی موقعوں پر العلم کے مضامین پر تبصرہ یا اظہار تاثر کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ چنانچہ اس کے سلور جوبلی نمبر حصہ اول پر بھی کچھ تاثرات پیش کر رہا ہوں۔ یہ نمبر ایک خاص مقصد کے پیش نظر مرتب کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ سرسید علیہ الرحمہ کے ذاتی اوصاف اور ان کے تعلیمی اور اصلاحی کارناموں نیز علی گڑھ تحریک سے وابستہ دیگر نامور ہستیوں کے کارہائے نمایاں سے موجودہ عہد کے ناظرین کو بہتر طور پر آگاہ کیا جائے۔ میرے نزدیک اس مقصد میں کانفرنس کے ارباب حل و عقد جن میں مکرمی سید الطاف علی بریلوی کی شخصیت بہت نمایاں ہے کما حقہٗ کامیاب ہوئے ہیں۔ کانفرنس کے ایک مقتدر رکن جنہوں نے کانفرنس اکیڈیمی کی سرپرستی میں تصنیف و تالیف کا نہایت مفید اور شاندار کام انجام دیا ہے۔ عزیزی سید مصطفےٰ علی بریلوی ہیں۔ ان عزیز نے مجھ سے فرمائش کی کہ آپ جوبلی نمبر پر کوئی تبصرہ ضرور لکھیں۔ میں پیرانہ سالی کے حدود میں محض داخل ہی نہیں ہوا ہوں بلکہ اس میدان کی جہاں ختم نہ ہونے والے اور اضمحلال آور خزاں کی مستقل عملداری رہتی ہے۔ کافی مسافت طے کر چکا ہوں اور عزیز موصوف اس سے واقف ہیں مگر غالباً اسی صورت حال کے پیش نظر انہوں نے مجھے اس کام کے لئے موزوں سمجھا ہے۔ چنانچہ باوجود ان کمزوریوں کے جو اس صورت حال سے پیدا ہوتی ہیں۔ میں مجلہ مذکور کے تقریباً سبھی مضامین پر اپنا تاثر لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اداریہ "ہمارے گمنام محسن" کے عنوان سے تحریر فرمایا گیا ہے۔ وہ گویا جوبلی نمبر کا پیش لفظ ہے جس میں محترمی سید الطاف علی صاحب نے اپنے زبردست حافظے اور ذہن رسا کی مدد سے وہ سب کچھ لکھ دیا ہے جو لکھنا چاہئے تھا۔ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد یہ بات دلنشین انداز میں سمجھائی گئی ہے کہ پاکستان میں ایجوکیشنل کانفرنس کے

جلد از جلد قیام کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ بعد ازاں
کانفرنس سے وابستہ اور اس کے ہمدرد تمام حضرات
کا شکریہ بطریق احسن ادا کرنے کے ساتھ ان محسنین
کانفرنس کے لئے دعائے مغفرت کی گئی ہے جو اللہ کو
پیارے ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد مسز آمنہ کمال پرنسپل سرسید
گرلس کالج کا مختصر مگر دلچسپ مضمون ہے جس کا
عنوان "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی خصوصیت"
ہے جس چیز کو مصنفہ نے خصوصیت کہا ہے وہ یہ ہے
کہ اس ادارے نے کبھی سرمایہ داروں اور اہلِ زر کے
بل بوتے پر اپنے منصوبے نہیں بنائے۔ بلکہ ہمیشہ "علمی
سرمایہ داروں" کی تلاش کی یعنی اہلِ علم اور قلم دوست
حضرات و خواتین کے تعاون پر بھروسہ کیا۔ بعد ازاں
سید الطاف علی صاحب کی شخصیت اور کارکردگی
کو بجا طور پر خوب خوب سراہا ہے۔

تیسرا مضمون جناب جسٹس قدیر الدین صاحب
نے سپردِ قلم کیا ہے۔ عنوان ہے "اردو اور اردو میں
قانون کی تعلیم"۔ موصوف کی باریک بین اور نکتہ آفرین
طبیعت نے اس مضمون کو نہایت دلچسپ اور پر از معلومات
بنا دیا ہے۔ میں اس مضمون کا خلاصہ اس کی افادیت
کے پیش نظر مضمون نگار کے الفاظ میں یہاں نقل
کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ فرماتے ہیں "آپ انگریزی
کو اس وقت تک نظر انداز نہ کیجئے جب تک ہمارے
اصل قوانین انگریزی میں وضع کئے جاتے ہیں۔ مگر
اردو زبان سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھائیے اور خود
زبان اردو میں وہ قوت پیدا کیجئے جو ہمیشہ ٹھیک ٹھیک
الفاظ کے استعمال اور فقروں کی ایسی بندش سے
نمودار ہوتی ہے جس میں اصل مطلب بلا کم و کاست
ادا کیا ہو۔ اس کے علاوہ یہ موقع غنیمت جان کر اسلام
کی خدمت کیجئے۔ یہ اس طرح کہ اسلام کے بنیادی
اصول اور جوہری تصوّرات صحیح وضاحت کے ساتھ
ایک جگہ جمع کر دیجئے تاکہ ان کے استعمال کی راہیں
خود بخود نکل آئیں۔ آپ ملک و ملت پر احسان کر سکتے ہیں"

اگلا مضمون بعنوان "علی گڑھ سے جدائی! علی گڑھ
کی یادیں!!" تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں بریلوی صاحب
کی تعارفی تمہید کے بعد محترم پروفیسر عبدالمجید قریشی
صاحب کے دلچسپ خطوط درج ہیں جو موصوف نے
بریلوی صاحب کے نام نومبر ۱۹۴۷ء سے مئی ۱۹۴۸ء
تک کے زمانے میں لکھے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا
جس میں جناب بریلوی صاحب بھارت میں تھے لیکن
پروفیسر قریشی صاحب پاکستان تشریف لے آئے تھے۔
قریشی صاحب شگفتہ و دلچسپ خطوط لکھنے میں ید طولیٰ
رکھتے ہیں۔ میں نے ان کو پڑھ کر کافی لطف اٹھایا۔
بریلوی صاحب اپنے تعارف میں فرماتے ہیں کہ "ہماری
علی گڑھ برادری کے فی الوقت سب سے بڑے بزرگ
جناب پروفیسر عبدالمجید قریشی میرے استاد بھی ہیں،
اور روحانی پیشوا بھی۔ قریب ۴۵ سال سے مجھے ان کی
شفقتِ بے پایاں سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل ہے"
ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ "میری ناچیز
تحریک پر ۷۳ سال کی عمر میں قریشی صاحب نے)

تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا اور صرف چار سال کے عرصہ میں تین معرکۃ الآرا کتابیں (۱) مقدر انسانی (۲) چند عظیم علمائے جراثیم اور (۳) عظیم علمائے نفسیات (۲۸۰ صفحات پر مشتمل) تیار کردیں، جو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی جانب سے شائع بھی ہو گئیں۔"

اس کے بعد ایک معرکۃ الآرا مقالہ بعنوان "کانفرنس سے میری ۲۵ سالہ وابستگی" پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی جسے مرزا علی اظہر برلاس صاحب نے اپنے دلچسپ اور شگفتہ انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالہ سے ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام اور العلم کے اجرا کی پوری روداد ناظرین کے سامنے آجاتی ہے۔ میں ذیل میں ایک دلچسپ اقتباس اس کے سیاق و سباق کے ساتھ پیش کرتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس مقالہ کی تحریر کا اسلوب کیا ہے۔ "ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس کے موقع پر بریلوی صاحب نے جنوری ۱۹۵۱ء میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ جس میں ان کے دو ایسے شناساؤں سے ملاقات ہوئی جو بظاہر ان کے ہمدرد و معاون تھے، لیکن انہوں نے اس ذرا سی بات کو کہ کانفرنس کے نام میں لفظ 'مسلم' شریک کیا جائے یا نہ کیا جائے اتنا طول دیا کہ سخت نزاع کی صورت پیدا ہو گئی۔ ان میں سے ایک صاحب کہنے لگے "یہاں ایسے سرپھرے لوگ بھی موجود ہیں جو اس کے مقابلہ میں دوسری کانفرنس بنا کر دکھا دیں گے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ برلاس صاحب لکھتے ہیں کہ "میں ان بزرگ کی صورت دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں ثاقب لکھنوی کا یہ مصرع دہرا رہا تھا؛ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے' پھر مجھے پھریری آئی اور جی چاہا کہ ترکی بہ ترکی جواب دوں، مگر الطاف صاحب نے مجھے روکا اور خود نہایت بردباری کے ساتھ مسکرا کر جواب دیدیا۔ اس روز مجھے معلوم ہوا کہ قومی کام کرنے کے لئے نہ صرف لیاقت و قابلیت کی ضرورت ہے بلکہ "مرغانِ بے ہنگام" کی چیخ و پکار سے نپٹنے کے لئے انتہائی ضبط و صبر اور پتہ ماری سے کام لینا پڑتا ہے۔

اس کے بعد نہایت خلوص اور محبت سے لکھا ہوا ایک مضمون بعنوان "سرسید گرلز کالج - کچھ یادیں" باصرہ نواز ہوا۔ اس کی لکھنے والی ایک قابل قدر ہستی ہیں جن کا اسم گرامی مسز اُم سلمٰی زمن ہے۔ وہ سرسید گرلز کالج کی کافی عرصہ پرنسپل رہ چکی ہیں۔ موصوفہ نے اس کالج کے قیام اور ترقی کی سرگذشت نہایت مخلصانہ انداز میں بیان کی ہے۔ اس مقالہ سے بھی ایک دلچسپ مقام کا اقتباس اس کی افادیت کے پیش نظر پیش کرتا ہوں۔ "سنہ ۱۹۵۷ء میں تقریباً ½۷ ایکڑ زمین تقریباً اسّی ہزار روپیہ ادا کرکے کالج کی عمارت کے لئے حاصل کرلی گئی"۔ مسز زمن فرماتی ہیں کہ "جب یہ زمین حاصل ہو گئی تو پہلا جلسہ ہم نے اس پر عید میلاد النبیؐ کا کیا۔ اس کے بعد کالج کے سالانہ کھیل اسی کھلی ہوئی جگہ پر منعقد کئے گئے لیکن کھیل سے پہلے محترمہ راحیل بیگم شروانیہ کے ساتھ سارے اساتذہ

اور طلبا نے دو رکعت نفل بطور شکرانہ پڑھے اور خدا
کے حضور میں دعا کی کہ اس کالج کو ترقی دے! دل سے نکلی
ہوئی شاید ان ہی دعاؤں کا اثر اور برکت ہے کہ یہ کالج
باوجود بے شمار دشواریوں کے ترقی ہی کرتا جا رہا ہے،
اب ہماری سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ کالج کی اپنی
عمارت بن جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے کئی مرتبہ ورائٹی
شو، مینا بازار اور مشاعرے کئے جن پر ٹکٹ لگائے ...
...... "اس پیراگراف کو پڑھ کر جب میرے تصور میں
اپنی محترم خواتین کے قومی جوش و جذبے اور ان کی
جفاکشانہ کارکردگی کا نقشہ کھنچا تو میری آنکھیں فرطِ مسرت
سے پُرنم ہو گئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ دراصل اسی قسم کے
مستحسن جذبات اور کارکردگی کی بدولت اس کالج نے
ترقی کی ہے۔ اس صورت حال کا کریڈٹ بہت کچھ کالج کی
انتظامیہ کو جس کے روح رواں سید الطاف علی بریلوی
ہیں پہونچتا ہے۔ کیونکہ ان کی خوش تدبیری اور انصاف
پسندی کے نتیجہ کے طور پر ہی کالج کی اساتذہ میں مذکورہ
حسین جذبات پیدا ہوئے۔

اس کے بعد ۱۶ صفحات پر پھیلے ہوئے ایک
مضمون کو پڑھنے کی مسرت حاصل ہوئی جس کا عنوان
ہے "کانفرنس کی اکیڈیمی آف ریسرچ کی مطبوعات"
اسے ہمارے رفیق، مجسمۂ ایثار و مروت جناب ثناء الحق
صدیقی صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ اسے موصوف
کی حیرت انگیز کامیابی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کانفرنس کی تمام
کتابوں پر جن کی تعداد ۷۷ سے کم نہیں ہے اس مضمون
میں ناقدانہ تبصرے کئے گئے ہیں۔ ہر تبصرے کو تبصرہ نگار
کی ژرف نگاہی اور تبحر علمی نے دلچسپ بنا دیا ہے۔ موصوف
کی عام جسمانی صحت کو دیکھتے ہوئے یہ ظاہر ہے کہ انہوں
نے تبصروں کی تیاری میں جانفشانی کی ہے۔ اس امر
کا ثبوت ہے کہ صدیقی صاحب کانفرنس کے کام کو حقیقی
قومی کام سمجھتے ہیں اور اس سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں
خدائے تعالیٰ انہیں اس جفاکشی کا یہ اجر دے کہ وہ
تندرست و توانا ہو کر عرصہ دراز تک قومی خدمات انجام
دیتے رہیں، آمین! موصوف نے اس مضمون میں جہاں
کہیں میری کتابوں پر جن کی تعداد چار یا پانچ ہوگی۔
تبصرہ کیا ہے وہ حقیقت پسندانہ ہے اور میرے کام
کی داد دینے میں انہوں نے قطعی خست نہیں برتی بلکہ
فیاضی سے کام لیا ہے۔ اس کے بعد اسی قسم کا ایک
مضمون بعنوان "العلم کراچی پر ایک نظر" کو دیکھنے
اور اس سے محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ اسے مکرمی
جناب پروفیسر ایوب قادری نے تحریر فرمایا ہے،
موصوف علم تاریخ کے شیدائی ہیں اور اس میدان
میں کافی نام پیدا کر چکے ہیں۔ اس مضمون میں قادری
صاحب نے العلم کی تاریخ بیان کرنے کے علاوہ ان
رسالوں اور اخباروں کا ذکر بھی کیا ہے جو مدیر العلم
بریلوی صاحب نے اس سے قبل نکالے تھے۔ اور
جنہیں العلم کا مبدا یا اس کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔
اس مضمون کا ایک اقتباس اس کی افادیت کے
پیش نظر نذر ناظرین ہے "العلم کا پہلا شمارہ جولائی
۱۹۵۱ء کو جاری ہوا۔ یہ رسالہ آل پاکستان ایجوکیشنل
کانفرنس کا آرگن ہے۔ ایک علمی، تعلیمی اور ثقافتی

احیا اور انقلاب کا نقیب۔ اس رسالہ میں بلند پایہ اور فکر انگیز علمی، مذہبی ثقافتی مقالے شائع ہوتے ہیں۔ قومی یکجہتی اس کا مقصد وحید ہے۔ اس رسالہ میں ہمیں قدیم و جدید تمدن کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے جو علی گڑھ کی دین ہے۔ مذہب کی اعلیٰ قدروں کی حفاظت، مشرقی تہذیب کی نگہداشت، ماضی کے گراں قدر ورثے کا تحفظ اور اس کے ساتھ ساتھ موجودہ سائنسی دور کے تقاضے۔ جدید مسائل اور ان کا حل اور تعلیمی مسائل کی عقدہ کشائی بھی اس کے پیش نظر رہتی ہے۔ العلم نے پچیس سال کی مدت میں ان مسائل پر بہت کچھ پیش کیا ہے۔" اس مضمون میں العلم کے عمومی شماروں کی خصوصیات کے بیان کے علاوہ قادری صاحب نے اس کے خاص نمبروں خصوصاً غالب نمبر پر سیر حاصل تبصرے کئے ہیں۔ آخر میں ان حضرات کی ایک فہرست دی گئی ہے جن کا قلمی تعاون کانفرنس اور العلم کو ہمہ وقت حاصل رہا ہے۔ اور اس فہرست میں اس خاکسار کا نام بھی شامل ہے۔

اس کے بعد جناب محمد علی صدیقی صاحب کے مضمون بعنوان "سرسید احمد خاں ایک ترقی پسند مفکر" سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ مضمون حقیقت پسندانہ ہے اور جوش و جذبے کے لہجہ میں لکھا گیا ہے۔ اس کے کسی حصے کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے۔ سرسید علیہ الرحمۃ کی ترقی پسندی بطریق احسن ثابت کی گئی ہے۔ موصوف کہتے ہیں کہ "سرسیدؒ کے یہاں عقل، فکر اور علم کی تثلیث پر اس قدر زور ہے کہ صرف اسی بنیادوں پر وہ مدت مدید تک ہمارے سماج کے بہت سے حلقوں میں ترقی پسندی کے ماڈل رہیں گے۔ آخر میں وہ کہتے ہیں کہ سرسیدؒ نے جہاں ممکن ہوا اور مناسب سمجھا انگریزی نقطۂ نظر کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ لیکن ہندو فرقہ پرست جو اپنے آپ کو قوم پرست ظاہر کرتے تھے انہیں "مسلمان فرقہ پرست" کہنے لگے اگرچہ وہ ۱۸۸۶ء تک قوم پرست ہی تھے۔ اس کے بعد مسلم دشمن لٹریچر کے روز افزوں اضافے سے وہ ہندوؤں سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے اپنی رائے کی تبدیلی کا اپنے دوستوں سے اظہار کیا۔"

اس کے بعد ایک مہتم بالشان مضمون "تعلیم اور اسلامی معاشرت" سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ یہ جناب خواجہ غلام السیدین کا مضمون ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد پہلا تاثر یہ ہوا کہ موصوف اسلامی تعلیمات کے ایک عظیم المرتبت مبلغ ہیں۔ انہوں نے اس مقالے میں حالی اور اقبال کے منظوم جواہر پاروں سے کافی فائدہ اٹھایا ہے اور جابجا آیات قرآنی کی مینا کاری فرما کر مقالے کو کافی مؤثر بنا دیا ہے۔ اس مقالہ کا مطالعہ نوجوان ناظرین کے لئے بہت مفید ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں اسلامی اقدار کو ذہن نشین کرانے کی بہ طرز جدید کوشش کی گئی ہے۔" ایک جگہ موصوف فرماتے ہیں۔

"اسلامی تمدن میں سائنس کو اس طرح استعمال

کیا جائے کہ اس کی وساطت سے علم اور دولت، صحت اور فرحت اور تمام مادی و ذہنی آسائشوں کی تقسیم سوسائٹی کے افراد میں عدل و مساوات کے اصول پر ہو۔ سائنس کی مدد سے انسانی تاریخ میں اب پہلی بار اس بات کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ عوام کی زندگی کو بیماری، جہالت اور بے اطمینانی سے پاک کر دیا جائے۔" آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ "حضرات! زندگی کی گہرائیوں میں اس انقلاب (ذہنی انقلاب) کا پیدا کرنا اور انسانوں کے خمیر میں ایک نئی دنیا کا متشکل کرنا تعلیم کا اہم ترین اور مقدس ترین فرض ہے اور جب تک ہماری تعلیم اس طرف متوجہ نہ ہوگی اس میں اور قومی زندگی میں کوئی حیات پرور رشتہ قائم نہ ہوگا۔"

اس کے بعد "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی عظمت کا راز" کے عنوان سے ایک اہم مقالہ جناب پروفیسر ابو سلمان شاہجہان پوری نے سپرد قلم کیا ہے جس میں نہایت خلوص اور کشادہ دلی سے کانفرنس مذکور کے جملہ پُر عظمت پہلوؤں کو بطریق احسن اجاگر کیا ہے۔ اس مقالے میں پروفیسر موصوف نے سید الطاف علی صاحب کی باوقار زندگی اور ان کی اعلیٰ کارکردگی پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ نیز ان کے رفقائے کار کا تذکرہ بھی بہ انداز مستحسن کیا ہے۔ ان دونوں مساعی کے لئے موصوف مستحق ستائش ہیں۔

اس کے بعد کے مقالہ کا عنوان ہے "ایک ماہر تعلیم ڈاکٹر ضیاء الدین احمد" جسے الحاج محمد زبیر صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ مقالہ نہایت کارآمد معلومات سے پُر ہے اس میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے وقیع کارناموں پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے جس کے لئے مقالہ نگار ناظرین العلم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم علی گڑھ کی ایک مشہور ہستی ہیں۔ طلباء میں ان کی ہر دلعزیزی تھی۔ اس مقالے کے مطالعہ سے قارئین صیغۂ تعلیم بہت کچھ رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

اگلے مقالے کا عنوان ہے، "ایجوکیشنل کانفرنس حرفے چند" اس وقیع مقالہ کی تیاری جناب وفا راشدی ایم۔ اے کی فکر رسا کی رہین منت ہے۔ اس میں بھی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے بانی سید الطاف علی صاحب کی کارکردگی اور ان کے مرتبہ کی بلندی کی بطور خاص نشاندہی کی گئی ہے۔ نیز ان کے معزز رفقائے کار بالخصوص جناب ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم کے قابل قدر کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کانفرنس کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ و تحقیق کو خاص طور پر خراج تحسین ادا کیا گیا ہے۔ دیگر شعبہ جات کی افادیت کو بھی سراہا گیا ہے۔ کانفرنس کے ۲۲ سالہ جشن کے سلسلہ میں جو تقریب منعقد ہوئی اس کا خوش آئند نقشہ الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ اس کے مہمان خصوصی مولانا کوثر نیازی کی فاضلانہ تقریر کا نیز اس سپاس نامہ کا جو ان کی خدمت میں منجانب کانفرنس پیش کیا گیا اور جملہ... معززین کی تقاریر کا ذکر نہایت خوبی سے کیا گیا ہے۔

مقالہ بعنوان "سر سید رح کی تعلیمی خدمات" محترم جناب محمد حسین خاں زبیری کی نظر التفات کا رہین منت ہے۔ مقالہ نگار کا علی گڑھ سے خاص تعلق رہا ہے۔ اس

لئے موصوف کو اپنے موضوع سے کماحقہ واقفیت ہے۔ بنابریں یہ مقالہ مربوط و مسلسل اور شبہات و شکوک سے بالاتر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں سرسیدؒ کی تقریر کے بہت سے اقتباسات موقع بموقع دیئے ہیں۔ میں ان میں سے چند کا یہاں اعادہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ لندن میں تعلیم و تربیت کے نفاذ کو دیکھ کر سرسیدؒ کا دل بے چین ہوتا تھا..... ایک خط میں نہایت دلسوزی سے نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں۔ "افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جا رہے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جانو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت فاصلہ نہیں ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے تربیت کس طرح ہوتی ہے۔ اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیونکر آتا ہے اور کس طرح پر قوم عزت حاصل کرتی ہے۔" ۱۸۷۶ء میں مدرسۃ العلوم (کالج) کے طلبا کو مخاطب کرکے انہوں نے فرمایا: "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہے۔ اس پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہوگئے تو کیا۔ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں یعنی علم اور اسلام کے نمونے ہوگے اور جب ہی ہماری قوم کو عزت ہوگی۔" اسی طرح ایک جلسۂ عام میں مسلمانوں کو خطاب کیا: "اے دوستو ہماری پوری پوری تعلیم اس وقت ہوگی۔ جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ یونیورسٹیوں کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی۔ ہم اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے۔ اور بغیر (غیروں کی) یونیورسٹیوں کی غلامی کے ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا تاج سر پر۔"

اس کے مضمون کا عنوان ہے "ایجوکیشنل کانفرنس اور العلم سے میرے روابط" یہ مضمون اس خاکسار نے محترم سید الطاف علی صاحب کی فرمائش پر سپرد قلم کیا ہے۔ مضمون بہت مختصر ہے جس کے مطالعہ میں ناظرین کرام کے ۲ یا ۳ منٹ صرف ہوں گے۔

اس کے بعد ایک اہم مقالہ ہے جس کا عنوان "پاکستان میں تعلیم کا ماضی و حال" دیا گیا ہے۔ مقالہ نگار عزیزی سید مصطفےٰ علی بریلوی بی۔ کام۔ ایل ایل بی ہیں۔ موصوف ایک جواں سال اور جواں ہمت اہل قلم ہیں اور اپنی سابقہ تصانیف اور تحقیقی کاموں کے نتیجہ میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ قومی اور ملی کام کرنے کی لگن سے سرشار ہیں۔ مقالہ میں پاکستان کے ہر صوبے بشمول مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے تعلیمی حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں وہاں کے برادران وطن نے مسلمانوں کی راہ میں جو رکاوٹیں اور دشواریاں

پیدا کی تھیں۔ اُن کا صحیح نقشہ پرانی دستاویزات کے ذریعہ کھینچا ہے۔ اسے پڑھ کر انسان قدرتی طور پر اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ ہندوؤں کی شدید فرقہ پرستی اور تعصب نے مسلمانوں کو علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں کے مختلف صوبوں میں جو تعلیمی جد وجہد کی گئی اُسے بھی اس مقالہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس حصہ کا مطالعہ ناظرین کے لئے یقیناً مفید ہوگا۔ اس مضمون کے چند اقتباسات نذرِ ناظرین ہیں۔ (۱) "علی گڑھ سے سرسید احمد خاں کی قیادت میں جو تعلیمی تحریک اٹھی اس کا پنجاب کے مسلمانوں نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ سرسید انہیں زندہ دلانِ پنجاب کہتے تھے۔" (۲) "وزیر تعلیم پنجاب ڈاکٹر عبدالخالق کی تقریر: عوامی حکومت تعلیمی پس ماندگی ختم کرنے کا تہیہ کر چکی ہے انہوں نے کہا کہ انگریزی دور کے پرانے ناکارہ اور فرسودہ نظام تعلیم کو ختم کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسلامی ممالک کے نظام تعلیم کے نصاب کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔" (۳) ۱۹۴۲ء میں سندھ کے پورے نظام تعلیم پر کلکتہ یونیورسٹی کے بنگال پر قبضہ کی طرح برادرانِ وطن کا مستحکم قبضہ تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی بھی شکل میں استحصالی نظام شکست پائے۔ اس لئے انہوں نے مجوزہ سندھ یونیورسٹی کی مخالفت کرنا اپنا فرض قرار دے لیا تھا۔ (۴) خدا کا شکر ہے کہ سندھ یونیورسٹی اب اپنی وسعت، سازو سامان اور شان و شوکت کے لحاظ سے پاکستان کی دیگر یونیورسٹیوں کے ہم پلہ ہوتی جا رہی ہے۔ ان سب ترقیات سے ہم ایک بھرپور قومی جذبے کے تحت ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔" (۵) "بلوچستان میں برطانوی دورِ حکومت تک بلوچستان میں مسلمانوں کی تعلیم بمنزلہ صفر تھی۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت بلوچستان میں کوئی ایک بھی کالج موجود نہ تھا۔ ثانوی اسکول صرف ۱۷ اور ابتدائی اسکول ۱۰۰ تھے۔ اساتذہ کی تربیت کا صرف ایک ادارہ تھا۔ قیام پاکستان کی برکت دیکھیے ۱۹۶۶-۶۷ء میں طلبا کے ثانوی مدرسے ۹۸ اور طالبات کے ۲۵ ہو گئے تھے۔ ایک ڈگری کالج تو ۱۹۵۱ء میں قائم ہو چکا تھا۔ ۱۹۶۶-۶۷ء میں طلبا کے پانچ اور طالبات کا ایک کالج قائم ہو چکا تھا۔ ۱۹۷۲ء کی ترقیات مستزاد ہیں۔ بولان میڈیکل کالج اپریل ۱۹۷۲ء میں قائم ہوا" (۶) "بلوچستان یونیورسٹی میں ۱۹۷۴-۷۵ء میں طلبا کی تعداد ۴۰۰ تک پہونچ گئی ہے۔ طلبا میں وظائف تقسیم کئے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ریسرچ کی سہولتیں موجود ہیں...... خدا کی ذات سے امید ہے کہ بلوچستان یونیورسٹی اتحاد قومی کا وہی تاریخی کارنامہ انجام دے گی جو علی گڑھ یونیورسٹی نے مسلمانانِ ہند کی شیرازہ بندی کر کے کیا تھا۔" (۷) "صوبہ سرحد: قیام پاکستان سے قبل صوبہ سرحد اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ یہاں مسلمانوں کی ہندوستان بھر کے جملہ صوبوں سے زیادہ واضح اکثریت تھی۔ نیز یہاں کے مسلمان آزادی کے زبردست متوالے تھے۔" (۸) ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۰ء مسلمانانِ سرحد کے واسطے بڑی

مسرت کا دن تھا۔ کیونکہ اس روز قائد ملت لیاقت علی خاں نے پشاور یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ اس وقت صوبہ سرحد تعلیم کے اعتبار سے پاکستان کے دیگر صوبہ جات سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ میٹرک تک تعلیم عام ہو چکی ہے۔ قبائلی علاقے خصوصیت کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں" (۹) قبائلی علاقوں میں اس وقت ۲۸۰، پرائمری ۵۸ مڈل اور ۴۵ ہائی اسکول ہیں۔ اسی طرح کالجوں کی تعداد بھی بہ ہو چکی ہے اس کے علاوہ تعلیم بالغان کی طرف بھی کما حقہ توجہ ہے"

میں محسوس کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اقتباسات سے نہ مقالے کے اسلوب تحریر کی کافی نمائندگی ہوتی ہے نہ اس کے مقصد و مفہوم کی لیکن بخوف طوالت زیادہ اقتباسات درج بھی نہیں کئے جا سکتے۔ پورے استفادے کے لئے مقالے کا مطالعہ ضروری ہے۔

العلم سلور جوبلی نمبر کی ضخامت چار سو صفحات (۴۰۰) ہے۔ مندرجہ بالا تبصرہ میں صرف دو سو صفحات کے مضامین و مقالات پر روشنی ڈالی گئی۔

(باقی آئندہ)

جناب مولانا سید عبد القدوس ہاشمی ندوی۔ اسلام آباد

رسالہ العلم کا سلور جوبلی نمبر پر تبصرہ

نوازنامہ، پڑھا اور سارا رسالہ شوق و ذوق کے ساتھ پڑھ گیا۔ دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔ جوبلی کے کامیاب اجتماعوں کے لئے اور اتنے کم وقت میں اس قدر معلومات افزا اور خوبصورت خاص سلور جوبلی نمبر کے لئے یہ خاص نمبر معلومات کے اعتبار سے اور ظاہری صورت و شکل کے اعتبار سے ہر طرح قابل قدر اور وقیع ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ جلدی میں مطبعی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ لیکن میں اسے "لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید" کے اصول پر دیکھوں۔ اس میں مطبعی غلطیاں تو کچھ رہ گئی ہیں لیکن اتنی اور ایسی نہیں ہیں کہ پڑھنے والے کو سمجھنے میں دقت محسوس ہو۔ اس خاص نمبر کو اگر بچشم مجنون نہیں بچشم بدوی بھی کوئی دیکھے گا۔ تو یہی کہے گا کہ ؎

ہے اس کی ہر ادا میں اندازِ دلربائی

بڑے فاضل اور قادر القلم حضرات نے بڑے اچھے یادگار مضامین لکھے ہیں۔ اور آپ نے سات دریا کے ان آبدار موتیوں سے بڑی ہی تابناک لڑی تیار کی ہے۔

جناب مولانا اسمٰعیل ذبیح صاحب پشاور

جناب کا گرامی نامہ

مع خزانہ علوم "العلم" سلور جوبلی نمبر موصول ہوا۔ تین دن سے اس کے گرانمایہ مضامین کے مطالعے میں مصروف ہوں۔ چار سو صفحات کا اتنا خوبصورت نمبر جو معنوی لحاظ سے سطر بہ سطر ایک تاریخ "ایک فیضان" ایک یادگار، اور ایک رہنما ہے۔ اور ظاہری اعتبار سے بھی حسن اور پاکیزگی سے آراستہ ہے۔ دل سے لگانے کی چیز ہے۔ اتنی صحافت کی کوئی ناول یا کسی نوخیز شاعر کا مجموعہ کلام یا کوئی عام سی تصنیف یا کبھی پبلشی یا مفاد یا مقتدر پوزیشن کے زیر اثر طبع ہونے والی کتاب جس میں مغز تو برائے نام ہی ہوتا ہے آج مارکیٹ میں -/۲۰ سے -/۳۰ روپے کی

تک فروخت ہو رہی ہے۔ آپ نے اتنا ڈھیر سارا علم اس قدر سستا لٹا دیا ہے۔

الطاف صاحب عمر کے لحاظ سے تو آپ ستر کے پیٹے میں ہیں مگر سرگرمیٔ عمل، انتھک محنت اور مقصد کے لئے پیہم جدوجہد میں آپ موجودہ ژولیدہ فکر اور حیران و پریشان نئی نسل کے لئے ان بزرگوں کی ایک مثال بلکہ یادگار ہیں، جنہوں نے علی گڑھ تحریک یا دوسرے لفظوں میں مسلمانانِ عالم کے احیاءِ نو کی تحریک چلائی۔ جو کردار و عمل، خلوص و سادگی، ایثار و بے نفسی کا مینارِ نور تھے۔

"العلم" کے سلور جوبلی نمبر میں مولانا سید طفیل احمد منگلوری اور مولوی بشیر الدین صاحب کا تذکرہ آیا ہے ان دونوں بزرگوں کو میں نے ان کی آخری عمر میں دیکھا ہے۔ اس وقت بھی یہ عمل اور مسلسل قومی لگن کا نمونہ تھے۔ سر سید کی ذات ان کی تحریکات و تخلیقات اور ان کے ہمہ جہتی فیضان پر بہت سے تاریخی اور معلوماتی مضامین یکجا کرائے گئے ہیں۔ آپ کا اور نیاز فتحپوری کا سر سید کے سلسلہ میں مضمون مختصر ہے مگر جامع ہے اور گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ بھی اب آپ کی طرح ایک یادگار مینارِ نور بن گئے ہیں۔ ان کا مضمون "سر سید؟ اردو ادبیات پر تحقیق اور فکری کاوش کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

دراصل سر سید ہی گذشتہ ایک صدی میں مسلمانانِ عالم کے ان چند ایک مافوق شخصیات میں ہیں جو ایک ادارہ اور ایک کثیر المقاصد پراجکٹ تھے۔ اس برصغیر میں عظیم سیاسی رہنماؤں مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی اور قائد اعظم اور عظیم علماء شیخ الہند مولانا محمود حسین مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا اشرف علی تھانوی اور عظیم مصنفین جیسے شبلی اور سلیمان ندوی وغیرہ اور عظیم قومی شعراء حالی اور اقبال ان سب کی شخصیات بہت عظیم ہیں۔ لیکن ان سب میں عظیم تر سر سید تھے! اقبال نے پاکستان کا سیاسی تخیل کا خاکہ پیش کیا اور قائد اعظم نے عملاً پاکستان بنا کر دکھلا دیا۔ لیکن ان دونوں کے لئے زمین فراہم کرنے والا۔ ان کو کردار و عمل کی روشنی بخشنے والا سر سید اور ان کا مشن تھا۔ ہمارے محبوب قائد اعظم نے علی گڑھ تحریک کی روحِ عمل سے پاکستان بنایا اور یہی روح پاکستان کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ جس قدر پاکستان میں علی گڑھ تحریک کی روح زندہ باعمل اور تناور ہوگی اسی قدر پاکستان مضبوط ہوگا۔ دو قومی نظریہ مسلم قومیت کا استحکام اور جدید علوم و فنون میں اپنے اسلامی تشخص کی بقا کے ساتھ مکمل مہارت اور ایک سرگرم عمل، ایثار پیشہ اور سادگی سے اعلیٰ مقاصد حاصل کرنے والی مضبوط و متحد مسلم قوم ہی پاکستان کی تعمیر کر سکتی ہے۔ اور مسلمانانِ عالم کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ قائد اعظم کا پاکستان سر سید کی آرزوں کی تعبیر ہے۔ مگر اس کی تعمیر کی لازمی شرط بھی وہی جذبۂ اسلام ہوگا۔ جو متحرک اور ہمہ جہتی وسائل علم و عمل سے مالا مال ہوتا۔ صرف چند افراد کی مادی ترقی یا چند افراد کی سیاسی بلندی پاکستان کی بلندی نہیں بن سکتی۔ پوری پاکستانی قوم کو پھر اس جذبۂ اخوت و عمل اور اس حصولِ علم و کردار سے آراستہ کرنا ہوگا جو تحریک علی گڑھ کے ذریعے تحریک پاکستان بنی تھی۔

آپ قابلِ صد مبارک باد ہیں کہ ایک مجاہدانہ جوش اور ایک صوفیانہ انکسار و خلوص سے مسلسل "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس" کے ذریعے اور "العلم" کے پیغام کی

اشاعت سے اپنا مشن مشکل حالات میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

العلم کے تمام سابقہ پرچوں اور اس سلور جوبلی نمبر حصہ اول نے سرسید اور ان کے عظیم ساتھیوں کے مشن اور ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد کے ذریعہ پاکستانی قوم کی تربیت کا جو بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ ناموافق حالات کے باوجود جاری رکھنا ایک شمع نور ہے جو بہرحال روشنی پھیلا رہی ہے۔

العلم کے سلور جوبلی نمبر کے تمام مضامین ان شخصیات تحریکات اور مقاصد کا آئینہ ہیں جنہے تحریک علی گڑھ کو فروغ دیا۔ اور جو پاکستانیوں کو صراط مستقیم پر چلانا چاہتی ہے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سلور جوبلی کی کامیابی پر میں آپ کو اور آپ کے تمام ساتھیوں کو جو خلوص اور عمل کا پیکر ہیں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو صحت مند عمر طویل عطا فرمائے کہ آپ گولڈن جوبلی کا بھی اہتمام کر سکیں

الطاف صاحب! آپ بھی کیا سادہ سی شخصیت ہیں کہ انکسار مجسم اور تواضع کامل بنے ہوئے ہیں۔ اور قومی خدمت کے لئے سے

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

کبھی کبھی آپ کی علی گڑھ کی اسپرٹ اس قدر متواضع ہو جاتی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود آفتاب بڑی عاجزی سے ستاروں سے روشنی مانگ رہا ہے۔ نفس پر اتنا قابو اور دنیا پر اتنی قدرت اور اتنا خلوص اور اتنی بے پایاں سادگی اور کسر نفسی خود ایک ایسی مثال ہے جو نئی نسل کے لئے چراغ راہ ہے۔

جناب مولانا ملک جمال الدین صاحب
راولپنڈی

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے دن ہوں پچاس ہزار

ہر ستمبر کو آتے ہی آپ کے اطمینان کی خاطر بطور اطلاع کارڈ تحریر کر دیا تھا۔ اس وقت ہی یہ ارادہ تھا کہ مفصل خط ذرا آپ کے اور اپنے فارغ ہونے کے بعد تحریر کروں گا۔ آج کل سوچ ہی رہا تھا کہ خط لکھوں کہ کل آپ کا محبت نامہ شرف صدور لایا۔ بھائی اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب میاں صاحب۔ راجہ صاحب حکیم صاحب اور فاضل صاحب اگر میرے ہمراہ جوبلی کانفرنس میں شرکت کرتے تو بقول آپ کے جوبلی کی رونق دوبالا اور آپ کی خوشی چار گنا زیادہ ہو جاتی لیکن ان احباب کے جانے پر آپ یہاں خانے میں نہیں ٹھہراتے اور پر تکلف انتظامات فرماتے یہی ہونا تھا۔ مگر بھائی ان حضرات کے نہ جانے سے مجھے بہت بڑا فائدہ پہنچا۔ وہ یہ کہ مجھے آپ کو اور آپ کے خاندان کو اتفاقاً قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ جو میری خوشی اور خوش بختی کا باعث ہوا۔ آپ اور آپ کی بیگم صاحبہ محترمہ سے تو پہلے ہی چند مرتبہ شرف ملاقات سے مشرف ہو چکا تھا۔ لیکن اس مرتبہ آپ کے پورے خاندان اور دختران نیک اختر اور فرزندان رشید اور سید مصطفےٰ علی بریلوی صاحب کے خاندان

نے جس اپنائیت اور پیار کا مظاہرہ فرمایا وہ میرے لئے
انتہائی فرحت و انبساط کا باعث ہوا۔ آپ دونوں بیگم
صاحبہ اور آپ کی سادگی تکلفات اور بناوٹ سے مبرا
طرز زندگی کا تو مجھے پہلے بھی کچھ احساس تھا لیکن اس
مرتبہ آپ کے بچوں اور سید مصطفےٰ علی بریلوی کو دیکھ کر
اور ان کے درمیان چند دن گزار کر مجھے جو خوشی اور
مسرت حاصل ہوئی ہے۔ آپ اس کا اندازہ نہیں کرسکتے
سارا خاندان ہمہ آفتاب۔ تمام کے تمام سادگی شرافت
اور شائستگی کا پیکر آپ کا گھر کسی لیڈر کا کسی صوفی
کا کسی مولوی کا کسی امیر کا گھر نہیں بلکہ کاشانۂ درویش ہے۔

من فدائے آنکہ درویشانہ زیست
وائے آنکہ از خدا بیگانہ زیست (اقبال)

سید صاحب میں ہندوستان بھر میں سالہا
سال امیروں درویشوں اور علماء کو قریب سے دیکھتا
رہا ہوں جو بڑے بڑے وعظ کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی سادگی اور درویشانہ
زندگی کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے ہیں لیکن ان کے گھروں
میں شاہانہ ساز و سامان اور کروفر اور اگر کسی کو کچھ
میسر نہیں تو ان کے دلوں میں دنیا داروں کی طرح ٹھاٹ
باٹ اور کروفر سے زندگی بسر کرنے کے ارمان مچلتے
دیکھتا رہا ہوں۔ بقول حضرت اقبال

نالم از رسوائی این کاروان — در امیر او ندیدم نور جان
تن پرست و جاہ مست و کم نگاہ — اندرونش بے نصیب از لا الٰہ

آپ کے بچوں کو بھی آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے
سادگی کا خوگر پایا۔ بالخصوص عزیز طارق علی تو
بالکل پہلے زمانے کے مسلمانوں کا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔
بے تعصب اور روشن خیال دیندار ماں باپ کا فرماں بردار
اپنے ہاتھ سے گھر کے کام کرنا۔ اور دینی شعار بجا لانا یہ
دینی شعار بجا لانا یہ بہت عمدہ صفت ہے۔ ویسے آپ
کے سب بچے بڑے پیارے اور بہت اچھے ہیں۔ راشد
صاحب خالد صاحب اور آپ کی بچیاں بالخصوص
تنویر بیٹی بہت اچھی عادات و اطوار کی مالک ہیں۔
آپ کے بھتیجے سید مصطفےٰ علی بریلوی صاحب کو لائبریری
میں اجلاس کے موقعوں پر اپنے ہاتھ سے کرسیاں
لگاتے اور پنڈال کو آراستہ کرتے دیکھ کر دل
کو بہت خوشی ہوئی۔ آج کل کے پڑھے لکھے لوگ
خواہ وہ انگریزی داں ہوں یا مولوی ٹائپ
ہاتھ سے کام کرنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ کوئی مولوی
کوئی پیر کوئی لیڈر اپنے ہاتھ سے کام نہیں کرتا۔
سب کے خادم موجود ہیں۔ اور جس کے نہیں ہیں وہ
خادم بنانے کی کوشش میں مصروف ہے۔
آپ کے چھوٹے فرزند مجاہد صاحب کے ساتھ
اٹھنے بیٹھنے کا موقع بہت کم ملا۔ مگر وہ بھی سادہ ہی
معلوم ہوئے اور ان کی یہ بات سن کر بہت خوشی ہوئی
کہ وہ اپنا وظیفہ جو انہیں کالج وغیرہ سے ملتا ہے۔
پورا کا پورا اپنی امی جان کی خدمت میں پیش کر دیتے
ہیں اور خرچ کے لئے امی جان سے مانگتے ہیں یہ
ادا مجھے بہت اچھی لگی۔

میں حیران ہوں کہ آپ دونوں میاں بیوی
تو درویش تھے ہی ان بچوں کو کیسے اپنے رنگ میں

رنگ لیا۔ یہ انداز تربیت آپ نے کہاں سے سیکھا۔ اور بچوں کو کیسے اپنے ڈھب پہ لائے۔ کیونکہ ہماری پرانی اور نئی تعلیم گاہوں میں تو ایسی تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ
یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

(اقبال)

بھائی سید صاحب یہ جو میں لکھ رہا ہوں۔ کوئی مقالہ یا مضمون نہیں محض میرے احساسات اور تاثرات ہیں، کیونکہ میں مقالہ نویس نہیں ہوں۔ ایجوکیشنل کانفرنس کی کامیابی اور ترقی بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اسی درویشانہ زندگی کی مرہون منت ہے۔ آپ کے مخلصانہ انداز اور اطوار نے کانفرنس میں آپ کے معاونین اور سرپرستوں کی جو اہل علم پر مشتمل جماعت آپ کی رفیق کار ہے وہ بھی ان ہی اداؤں کا ثمرہ معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے اپنے خط میں میرے لئے اپنے گھر میں جس محبت اور پیار اور یادآوری کا ذکر کیا ہے۔ وہ بھی دراصل آپ کی اور میری بہن مخدومہ سیدہ انیس فاطمہ صاحب اور آپ کے بچوں اور افراد خاندان کے حسن اخلاق شرافت اور مہمان نوازی کا مظاہرہ ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے خاندان کو صحت و مسرت سے نوازے۔

حضرت نواب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب مدظلہ العالی کی خدمت میں بہت بہت سلام عرض کریں۔ افسوس ہے۔ آتے وقت ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا اور نہ ہی اُن کے فیضان صحبت سے استفادہ کرسکا موصوف کی مطبوعہ تقریر بہت پسند آئی اور سلور جوبلی کی مختلف تقریبات میں مختلف موقعوں پر خطبات صدارت اور ارشادات عالیہ نہایت معقول اونچے تلے اور اثر انگیز تھے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ موصوف کو تادیر کانفرنس کی قیادت اور ملک و ملت کی خدمت کے لئے صحت و توانائی اور مسرت سے نوازے۔

کانفرنس کے جملہ معاونین اور سرپرست اصحاب اور خواتین کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کریں۔ خداوندکریم ان سب کو اپنی عافیت اور حفظ و امان میں رکھے۔ اور رحمت کا نزول فرمائے۔ اپنے دفتر کے جملہ کارکنان کی خدمت میں میرا سلام عرض کریں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کسی کا بھی کوئی نام یاد نہ رکھ سکا۔ ورنہ سب کو نام بنام بسلام لکھتا۔ علمی ادارے کے کارکن انتہائی عزت و احترام کے مستحق ہوتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان سب پر اپنے فضل و کرام کی بارش برسائے۔

یہاں کے تمام دوست خصوصاً جناب میاں صاحب راجہ غلام قادرخاں صاحب راجہ فتح خاں صاحب حکیم اشرف الحق صاحب محمدؐ فاضل صاحب سلام عرض کرتے ہیں۔ فاضل صاحب اور حکیم صاحب کو سلور جوبلی میں شریک نہ ہونے کا بہت افسوس ہے ان کا خیال ہے کہ دعوت نامہ وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے شرکت سے محروم رہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تادیر ملک و قوم کی خدمت کا موقعہ عطا فرمائے والسلام

جناب نواب مشتاق احمد خاں صاحب لاہور

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ کانفرنس کا جوبلی نمبر ملا۔ ماشاء اللہ بہت کامیاب

کوشش ہے۔ ابھی تک میں نے دو مضامین پڑھے ہیں۔ جنھیں میں نے بہت مفید اور پُر از معلومات پایا۔ مجھے یقین ہے کہ بقیہ مضامین بھی اسی معیار پر ہوں گے، جس کی آپ کی ذات سے توقع کی جاسکتی ہے۔ پروفیسر قریشی صاحب کے خطوط بہت ہی دلچسپ ہیں۔

عالی جناب ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب
ناظم انجمن ترقی اردو، لاہور

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سلور جوبلی کی کامیابی پر مبارک باد قبول فرمایئے۔ بہت خوشی ہوئی۔

جناب حکیم شرف الحق صاحب راولپنڈی

سلام مسنون! امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ کی کانفرنس کی کامیابی کی خبریں سنیں خصوصاً، جمال الدین صاحب سے کانفرنس کی شان و شوکت کی داستانیں سن کر طبعیت میں بڑی فرحت پیدا ہوئی۔ کانفرنس کی اس عظیم الشان کامیابی پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ "العلم" (خاص نمبر) بھی مل گیا تھا۔ یہ ضخیم شمارہ یقیناً ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ میں کانفرنس میں شریک نہ ہوسکا۔ میں نے آپ کو ایک چھٹی لکھی تھی جس میں آپ کو لکھا تھا۔ کہ مجھے کانفرنس کے پروگرام سے پیشگی مطلع فرماکر بتائیں کہ میں اس میں کیا کردار ادا کرسکتا ہوں۔ لیکن آپ نے صرف جمال الدین صاحب کو پروگرام سے آگاہ کیا۔ اور جس وقت جمال الدین صاحب مجھے پروگرام بتانے آئے تو اس وقت میں دواخانہ کی نئی تعمیر کے کام میں شدید الجھا ہوا تھا۔ (دواخانہ کی تمام عمارت گرا کر نئی بنوا رہا ہوں)۔ اس وجہ سے اس کانفرنس میں شریک نہ ہوسکا جس کا مجھے خود بھی ملال ہے۔

بہر حال! مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے دوستوں کی فہرست میں رکھا ہوا ہے۔ اس کانفرنس کی کامیابی کا سہرہ آپ کے علاوہ آپ کے صدر محترم کے سر ہے۔ کیونکہ وہ بھی ایک باہمت بزرگ ہیں اور اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے یقیناً کام کیا ہوگا۔ اپنی خیریت اور تازہ ترین حالات سے آگاہ کریں۔

جناب پروفیسر وقار احمد رضوی
جامعہ کراچی

میں آپ کو اس امر پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی سلور جوبلی بہت کامیاب رہی اور علمی حلقوں میں اس کا بہت خیر مقدم کیا گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے آپ اس قدر بڑے کام سے بخیر و خوبی نمٹ گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس فیض کو تا دیر جاری رکھے۔ اور ہم نوجوانوں میں آپ جیسی جواں ہمتی پیدا کر دے (آمین)

الحاج محمد زبیر صاحب

مجھے امید ہے کہ اب تک سلور جوبلی کی تھکن اُتر گئی ہوگی اور آپ اس اجتماع کی کامیابی پر اطمینان و مسرت کی سانسیں لے رہے ہوں گے اپنی ان مسرتوں میں مجھے بھی شریک سمجھیں۔ اس کامیابی پر جملہ کارکنان میری دلی مبارکباد قبول کریں۔

جناب شبیر علی کاظمی صاحب جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو پاکستان

ایجوکیشنل کانفرنس کی سلور جوبلی کی قابل صد رشک کامیابی پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ آپ کی محنت اور محبت ٹھکانے لگی۔ تمام اجلاس نہایت کامیاب رہے۔

عالیجناب پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب

عزیز گرامی قدر سلمہ اللہ تعالےٰ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۲۵ رجون کا خط مل گیا تھا۔ جواب لکھنے کی ہمت آج ہوئی۔ خدا جانے ان خطوط میں کیا خوبی ہے کہ آپ انہیں پھر شائع کر رہے ہیں۔ بہرحال محبت کے تقاضے پورے کر رہے ہو۔ جوبلی نمبر کے شائع کرنے کے لئے خرچ میں میری طرف سے دو صد روپیہ کا چندہ حاضر کروں گا۔ جب چاہو کسی معقول آدمی کو بھیج کر منگوا لینا۔ اور کیا لکھوں زندہ ہوں۔ میری صحیح عمر یکم جولائی ۱۹۷۵ء تک ۸۸ برس ۵ ماہ ہے۔

ہاں میرے پاس ۱۹۲۶ء کی جوبلی کے موقع پر طلباء کی طرف سے شائع کردہ میگزین ہے۔ اس میں مجھے طلباء میں عالمگیر ہردلعزیزی کی سند دی گئی ہے (کیا ڈانٹنے والے (بقول تمہارے) ایسے ہوتے ہیں۔ وہ میگزین عزیزی مصطفےٰ علی سلمہ کو دکھانا ہے۔ جانے میرا لکھا پڑھا بھی جائے گا یا نہیں۔

والسلام

پروفیسر شیر محمد گریوال لاہور

دعوت نامہ مل گیا تھا۔ افسوس ہے کہ پہنچ نہیں سکا۔ امید ہے کانفرنس نہایت کامیاب رہی ہوگی۔ ٹیلی ویژن اور اخبارات سے کچھ کچھ پتہ چلتا رہا ہے۔ پورے حالات سے آگاہ کیجیے۔ اچھے مقالات سنبھال کر رکھئے۔

جناب محمد حنیف شاہد انچارج اورینٹل سیکشن پنجاب پبلک لائبریری۔ لاہور

امید ہے آپ بفضل خدا بخیریت ہوں گے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے سلور جوبلی کے سلسلے میں آپ کا "دعوت نامہ" موصول ہوگیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ اہلیہ کی علالت کی وجہ سے میں شریک نہ ہو سکا۔ معذرت خواہ ہوں لیکن آپ کی پُرخلوص دعوت کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پچھلے ہفتے میں رخصت پر تھا۔ اسی دوران میں "العلم" کا سلور جوبلی نمبر آیا۔ آج جب زیارت ہوئی تو دل باغ باغ ہوگیا۔ صوری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے لاجواب نمبر ہے۔ اس کی اشاعت میں آپ کے خلوص، لگن، جانفشانی اور جانسوزی کا خصوصی عمل دخل ہے۔ میں کانفرنس کی شاندار کامیابی پر اور "سلور جوبلی نمبر" کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور خداوند کریم کے حضور دعا گو ہوں کہ آپ کو ملک، ملت اور علم و ادب کی خدمت کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائے اور آپ کو صحت و تندرستی کی لازوال نعمت سے شاد کام رکھے۔

جناب مولوی حضور عالم صاحب علیگ حیدرآباد

۱۳ ر ستمبر کے کرم نامہ کے بعد العلم کا سلور جوبلی نمبر بھی پہونچا۔ ماشاء اللہ اس گرانی کے زمانہ میں بھی آپ شاندار کام انجام دے کر۔ اپنی روش کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اور مالی مشکلوں سے مغلوب نہیں ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ یقیناً مدد فرما کر آپ کو کامیاب فرماتے ہیں۔ دس روپے کا منی آرڈر (یعنی اس رسالہ کی قیمت) بھیج رہا ہوں۔ آپ کی صحت و عافیت کی دعا کرتا ہوں۔ عقیل احمد خاں صاحب محمد ایوب قادری صاحب عبدالمجید قریشی صاحب سید حسین امام صاحب اور دیگر ارکان ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت میں ہدیہ تبریک۔

ڈاکٹر محمد نذیر رانجھا۔ راولپنڈی

آپ کا نوازش نامہ ملنے کے چند روز بعد "العلم" کا "سلور جوبلی نمبر" موصول ہو کر موجب مسرت و شادمانی ہوا۔ آپ کی اس عنایت کا بے حد شکریہ!

یہ نمبر پڑھ کر میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ بالخصوص سرسید احمد خاں "مسلم لیگ ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق نہایت ہی معلوماتی لٹریچر تھا۔ اور سرورق میں خاصی کشش تھی۔

اللہ تعالیٰ ایجوکیشنل کانفرنس کو ہمیشہ ترقی کی طرف گامزن رکھے۔ اس سے منسلک حضرات کو ہمیشہ علم و ادب پروری کے جذبہ سے معمور رکھے ـــ وہ "العلم" کو آپ کی مدیریت کے تحت ہمیشہ ایک مجلہ کی حیثیت عطا فرمائے رکھے۔ آمین۔" فقط

جناب مولوی سلیم عبداللہ صاحب

العلم کا خا نمبر نظر نوا دل کُشا ہوا۔ ماشاء اللہ خوب ہے۔ آپ کی چہل سال علمی، اور تعلیمی خدمات کا آئینہ دار۔ اس سے قبل خاص نمبر جنگ آزادی اور مرزا غالب سے متعلق ہو کر ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں

زیر نظر ضخیم رسالہ اپنی ضخامت اور متنوع مقالات کی وجہ سے ایک مستقل تاریخی کتاب کی حامل ہے۔ کیونکہ اس میں ایجوکیشنل کانفرنس اکیڈمی کے دور ماضی کا جائزہ اور افاضل علم مصنفین کی گراں قدر علمی خدمات کا تذکرہ ہے

میرا خیال ہے کہ قیامت کے دن جب سـ علیہ الرحمۃ اپنے رفقاء اکابر ملت کو لئے ہوئے اللہ کے حضور باریاب ہوں گے اور ان کے ساتھ حالی، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ضیاء الدین، مولوی عبد مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جیسے نـ ارباب علم و فن صف بہ صف استادہ ہوں گے تـ میں آپ کو بھی شرف معیت حاصل ہوگا۔ اور یہ کے لئے بہترین جزا ہوگی۔

آپ کی یہ طویل علمی و ملی خدمات محض اللہ کی توفیق بخشی سے بروئے کار آئی ہیں۔

ذالِکَ فَضلُ اللہِ یُؤتیہِ مَن یَشَاء

پس آپ کو زیادہ سے زیادہ اس کے احسانِ عظیم کا شکرادا کرنا چاہیئے۔

منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

امید ہے آپ کی صحت بفضلہ تعالیٰ اچھی ہوگی۔

جناب علی اصغر شاہ صاحب
سفارت خانہ برما۔ اسلام آباد

آپ ماشاء اللہ العلم کے ذریعہ اُردو ادب کی علمی اور پاکستانیوں کی اسلامی خدمات بڑے احسن طریقہ سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اس کا اجر آپ یقیناً اللہ پاک سے پائیں گے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

پروفیسر رحمت فرخ آبادی

کانفرنس کی جوبلی کے موقع پر پاکستان میں سرسید احمد خاں کی دعوت کو عام کرنے میں کانفرنس کے پلیٹ فارم سے جو کوششیں ہوئیں وہ حد درجہ لائق ستائش ہیں

کانفرنس نے نئی خداداد مملکت کے نئے تقاضوں کے تحت ماضی کی روایات کے پیش نظر اس کام کو آگے بڑھایا۔ موجودہ حکومت نے تعلیمی پالیسی میں کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کہی گئی بعض اہم باتوں کو طلبا کی نصابی سرگرمیوں کا جزو بنایا ہے اور یہ بات بڑی خوش آئند بھی ہے اور ابنائے وطن کو کانفرنس کی سرگرمیوں کا احساس دلاتی ہے۔

آپ کا خط نہیں آتا ہے تو دل بجھا بجھا سا رہتا ہے اور اس کی کیفیت مفلس کے جھونپڑے کی سی ہوجاتی ہے کہ سرِ شام دیا بجھ جاتا ہے۔ جواب کا منتظر رہتا ہوں۔

میں کانفرنس میں شرکت کے لئے آتا لیکن دعوت نامہ اچانک ملا سوچ رہا تھا کہ کسی موضوع پر مقالہ پڑھوں گا۔ لیکن جب کچھ پتہ نہ چلا تو خاموش رہا تھا۔ خالی شرکت سے میں مطمئن نہ تھا۔

باقی خیریت ہے۔ خدا آپ کو تادیر سلامت رکھے۔ جوبلی نمبر حصہ اول کے بعد دیگر شماروں کا انتظار ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی
جامعہ کراچی

کانفرنس کی سلور جوبلی کے کتنے ہی عظیم پہلوؤں کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا سا پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے ایک بار پھر مجھے آپ سے ملا دیا —— ویسے غیر حاضری کی طویل مدت میں آپ کی یاد اور خیال دیرِ دل پر بار بار دستک دیتا رہا ہے۔

العلم کا جوبلی نمبر بہت اچھا ہے۔ اس میں "سلانہ" قسم کی ترتیب نہیں —— اور یہی فن کارانہ بے ترتیبی مجھے پسند آئی ہے۔ یہ جیسے ایک مجلسِ یاراں ہے جہاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد موضوعات ایک دائرہ کے اندر بدلتے رہتے ہیں۔ قبلہ پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب کے خطوط ایک دردمند روح کے اندر جھانکنے کے لئے دریچوں کا درجہ رکھتے ہیں۔

اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

جناب پروفیسر معین الدین دردائی صاحب

العلم کا جوبلی نمبر ملا۔ آپ کی محبت اور خلوص کا شکر گذار ہوں۔ بڑی

شاندار چیز نکالی ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ علی گڑھ تحریک، اور وہاں کے کارہائے نمایاں کو آپ نے بڑی خوبی سے سامنے لا دیا ہے۔ واقعی یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہے۔ آپ نے مادر درسگاہ کا حق ادا کر دیا۔ آپ کی عظمت، تعلیمی امور پر دسترس اور صحافت میں آپ کی مہارت اور لیاقت کا تو میں شروع ہی سے قائل ہوں اب اور زیادہ ہو گیا۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے۔

العلم سلور جوبلی کے تقریباً تمام مضامین علمی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر ایوب قادری صاحب اور مصطفٰے علی بریلوی صاحب کو ان کی کاوشوں کے لئے میری طرف سے مبارک باد دیجئے گا اور سلام کہیے گا۔

جناب پروفیسر صادق زاہد ایبٹ آباد

آپ کا ارسال کردہ نوازشنامہ معٔ "العلم" کے سلور جوبلی نمبر کے موصول ہوا۔ اس یادآوری اور علمی خزینے کے ارسال کرنے پر میری جانب سے دلی شکریہ قبول کیجئے۔ آپ نے یہ نمبر شائع کر کے علی گڑھ کے اس عہد کو ایک بار پھر زندہ کر دیا ہے۔ جس علی گڑھ نے برصغیر کے سب سے زیادہ مخلص انسان سرسید احمد خاںؒ کے عہد سے لے کر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد اس بد قسمت قوم کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کیا ہے۔ تاریخ کے ایک ادنٰی طالب علم کی حیثیت سے جب بھی اس عہد کی پر خلوص جدوجہد کا اندازہ کرتا ہوں اور زمانۂ حال کے لوگوں سے ان مخلصین کا موازنہ کرتا ہوں تو میں خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ بقول ایک شاعر کے یہ کہنا پڑتا ہے۔

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

آپ لوگوں کا دم غنیمت ہے جو اُس عہد کی یاد کو آج بھی لگا ہے گا ہے زندہ رکھنے کی کوشش میں شب و روز مصروف ہیں۔ خدا آپ لوگوں کو عمرِ خضر اور صحتِ کامل عطا فرمائے۔ آمین۔

رئیس القلم حضرت رئیس امروہوی از روزنامہ جنگ ۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء

مجھے کراچی میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کا واقعہ (کارنامہ) بخوبی یاد ہے۔ برادرِ بزرگ سید الطاف علی بریلوی ٹنڈو آدم سے کراچی تشریف لائے اور چہرے سے پسینہ اور پاؤں سے گردِ سفر پونچھتے ہی سرسید اعظمؒ کا نام لیکر علی گڑھ کی زرّیں و تابناک روایات کی شمع روشن کر دی۔ کانفرنس کے ترجمان "العلم" کا سلور جوبلی نمبر حصۂ اول پیشِ نظر ہے۔ چار سو صفحے کا عظیم الشان باتصویر اور نہایت خوبی سے مرتب کیا ہوا یہ نمبر سرسید کی کہانی ہے۔ سرسید کے رفقا کی سرگزشت ہے مسلم انڈیا کے نشاۃ ثانیہ کی داستان ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی روئداد ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کا تذکرہ ہے، سرسید گرلز کالج کا افسانہ ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ سید الطاف علی بریلوی انجمن آرا ہی نہیں بذاتِ خود انجمن ہیں۔ اگر پاکستان میں پانچ الطاف علی پیدا ہو جائیں تو اس مملکت کے ہر گوشہ میں عظیم الشان تعلیمی انقلاب برپا ہو جائے۔ بر کوچک کی مسلم تاریخ کے ہر طالب علم اور قدردان اور جامعہ علی گڑھ کے ہر فرزند کا فرض ہے کہ وہ سہ ماہی العلم کے اس تاریخی نمبر کو مسلسل اپنے مطالعے میں رکھے تاکہ ہمیشہ اپنا ذہنی پس منظر اس کے پیشِ نظر رہے۔

مجالس اور مذاکراتِ تعلیمی و علمی

منعقدہ کردۂ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

مُرتبہ
حکیم ریحان الزماں

تاریخ	موضوع	صدارت	مقررین	مہمان خصوصی	میزبان
۱۰ مئی ۱۹۵۱ء	"پاکستان کا مسئلۂ تعلیم"	پرنسپل جی۔ ایم شاہ بھاول نگر	سید الطاف علی بریلوی	......	ریلوے انسٹی ٹیوٹ بھاول نگر
۱۲ مئی ۱۹۵۱ء	"مسلمان اور تعلیم"		" " "		
۱۱ مارچ ۱۹۵۲ء	"ہمارے نظام تعلیم میں صحت، جسمانی اور فوجی تربیت کی ضرورت"	پرنسپل فضل الرحمن سندھ مدرسہ کراچی	جنرل محمد اکبر خاں	......	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۱۶ مارچ ۱۹۵۲ء[1]	"مسئلۂ فلسطین"	الحاج میجر شمس الدین محمد صدر کانفرنس	......	مفتی اعظم فلسطین	" " "
جولائی ۱۹۵۵ء تا دسمبر ۱۹۵۶ء	"سرسید کی علمی خدمات"	میجر شمس الدین محمد سابق وزیر تعلیم بھاول پور	قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی	......	" " "

[1] اس جلسہ میں ہر دو تقاریر کا اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمانی کا خوشگوار فرض پروفیسر حسن الاعظمی صاحب جنرل سکریٹری موتمر عالم اسلامی نے ادا کیا۔ معزز مہمانوں میں پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صدر موتمر، آنریبل غیاث الدین پٹھان، مولانا محمد اکرم خاں، خان بہادر حاجی وجیہ الدین، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی، جنرل محمد اکبر خاں، مولوی سید ظفر حسین واسطی اور بعض سفرائے ممالکِ اسلامیہ نے شرکت کی۔

جولائی ۱۹۵۵ء تا دسمبر ۱۹۵۶ء	"حسان بن ثابت"	ڈاکٹر زبید احمد سابق پروفیسر عربی الہ آباد یونیورسٹی	پروفیسر جلیل الرحمٰن اعظمی	......	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
" " "	"عہدِ غزنوی سے قبل عربی زبان میں ہندوستان کا حصہ"	علامہ میمن عبدالعزیز، ہیڈ آف دی عربک ڈپارٹمنٹ کراچی یونیورسٹی	ڈاکٹر زبید احمد سابق پروفیسر عربی الہ آباد یونیورسٹی	......	" " "
" " "	"برصغیر پاک و ہند کے مسلمان حکمرانوں کے سکوں پر ایک نظر"	مولوی سید ظفر حسین واسطی ایڈوکیٹ	خان بہادر مولوی سید ظفر حسین، سابق ڈپٹی ڈائرکٹر آرکیولاجیکل ڈپارٹمنٹ	......	" " "
" " "	"مصری تہذیب فراعنہ کے دور میں"	میجر قیصر حسین بختیاری پرنسپل ٹیچرس ٹریننگ کالج کراچی	امتیاز محمد خاں ڈائرکٹر تعلیمات کراچی	......	" " "
" " "	"اسلامی تاریخ دوبارہ لکھے جانے کی ضرورت"	بابائے اردو مولوی عبدالحق	ڈاکٹر سید معین الحق سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی	......	" " "
" " "	"اقتصادی ترقی، ترقی یافتہ ممالک میں"	ڈاکٹر نذیر احمد چیرمین اٹامک انرجی ریسرچ کمیشن	ایم۔ اے۔ ایچ قرنی جوائنٹ سکریٹری وزارت مال گورنمنٹ آف پاکستان	......	" " "
" " "	"ملازمتوں کے لئے منصوبہ بندی ترقی یافتہ ممالک میں"	صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالواجد خاں ڈائرکٹر ڈپارٹمنٹ آف کمرشیل انٹیلیجنس اینڈ ٹریڈ پروموشن	ڈاکٹر عزیز سعید	......	" " "
" " "	نظریۂ تعلیم	سید نصیر الحسن پرنسپل ایرانین ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ	سید الطاف علی بریلوی	......	" " "

دسمبر ۱۹۵۶ء	"طالب علم فرائض"	مسز سلمیٰ زمن پرنسپل سرسید گرلز کالج	مرزا علی اظہر برلاس	....	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
" " "	"صنفِ نازک اور حربی تعلیم"	" " "	جنرل محمد اکبر خاں	....	" " "
۲ جون ۱۹۵۷ء[1]	"جنرل بخت خاں"	ممتاز حسن سکریٹری فنانس	سیدہ انیس فاطمہ بریلوی	....	" " "
۲۸ ستمبر ۱۹۵۸ء[2]	اردو زبان کی ہر دلعزیزی اور شعرا و نثر نگاروں کی خدمات	خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی			" " "
	(الف) سپاس نامہ		سید الطاف علی بریلوی		" " "
	(ب) خیالات کی بیتا		محمد رحیم دہلوی		
	(ج) آئینہ کیوں نہ دوں		سید حسن مثنیٰ ندوی		
	(د) ملتِ پاکستان		سید اظہر حسین رضوی ایم اے		
	(ھ) میلاد النبیؐ اور ملتِ اسلامیہ		پروفیسر سید ابو الخیر کشفی		
	(و) چند قلمی خاکے		مرزا علی اظہر برلاس		
	(ز) اقبال کا فلسفۂ خودی		پروفیسر یونس حسن فروغ علوی		
	(ح) تعمیرِ انسانیت		محمد ایوب قادری ایم اے		
	(ط) شاعرانہ تاثرات		پروفیسر جلیل احمد قدوائی ایم اے		
	(ی) نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی شاعری۔		مولوی محمد ذکریا مائل		

[1] "جنرل بخت خاں" کی یادگار کے طور پر "جنرل بخت خاں میوزیم" کا قیام عمل میں آیا۔
[2] اس مناظرہ میں سیٹھ ایس۔ ایم یوسف صاحب نے اردو نثر کی تاریخ پر مشتمل خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔

۲۸ ستمبر ۵۸ء	(ک) ایک مقصد ایک نصب العین		ڈاکٹر سید ظہیر الدین احمد الجامعی، ڈی لٹ	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
	(ل) انٹرنیشنل فلاسفی کانگریس		جناب سید محمد تقی	″ ″ ″
	(م) احتساب افعال		جناب حاتم اے علوی	
۱۹ اکتوبر ۵۸ء	مذاکرہ "توسیع و اشاعتِ تعلیم"	خان بہادر مرزا ابو جعفر کشفی ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز کلکتہ		″ ″ ″
۳۰ نومبر ۵۸ء	توسیع و اشاعتِ تعلیم	ابو المکارم سلیم اللہ فہمی جوائنٹ سکریٹری وزارتِ زراعت و خوراک، حکومتِ پاکستان	سید الطاف علی بریلوی، خالد شوکت، شاہد احمد دہلوی، سیدہ انیس فاطمہ بریلوی، عارف حسین، مولوی عبد العلی خاں، سید اظہر حسین رضوی، ضیاء الدین احمد برنی، مولوی حسن مثنیٰ ندوی	حاتم اے علوی صاحب
۴ مئی ۵۹ء	"اقبال کا نظریۂ تعلیم"	جناب محمد شعیب صاحب فنانس منسٹر گورنمنٹ آف پاکستان	ڈاکٹر سید ظہیر الدین احمد الجامعی	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۱۶ مئی ۵۹ء	"اقبال کا نظریۂ تعلیم"	جناب حبیب الرحمٰن صاحب مرکزی وزیر تعلیم حکومت پاکستان	ڈاکٹر سید ظہیر الدین احمد الجامعی	″ ″ ″
۲۴ جولائی ۵۹ء	مطالعۂ مذہب	جناب ممتاز حسن صاحب ڈپٹی چیئرمین پلاننگ کمیشن	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	″ ″ ″

۲۲ر اگست ۱۹۵۹ء	تعلیم نسواں میں رفتار ترقی	محترمہ بیگم لفٹنٹ کرنل شہاب الدین احمد صدیقی چیرمین سرسید گرلس کالج گورننگ باڈی			
۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۹ء	پاکستان میں ثقافتی نشاۃ ثانیہ	جناب ڈاکٹر امداد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی ڈپٹی ایجوکیشنل ایڈوائزر گورنمنٹ آف پاکستان	پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۲۸ر نومبر ۱۹۵۹ء	تعلیم معاشیات	ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نائب صدر کانفرنس	جناب پروفیسر محمد شفیع صاحب پرنسپل جامعہ ملیہ کالج		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۷ر جنوری ۱۹۶۰ء	"پاکستان کا نیا دارالحکومت"	جناب الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب سابق وزیر تعلیم بہاولپور، صدر کانفرنس	جناب محمد فاضل صاحب ایڈیٹر روزنامہ "تعمیر" راولپنڈی		〃 〃 〃
۱۷ر فروری ۱۹۶۰ء	"اسلامی نظریۂ تعلیم"	جناب محمد افتخار علی قاضی صاحب ایڈوکیٹ سابق ایم ایل اے	جناب ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صاحب الجامعی	جناب ابوبکر احمد حلیم سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی	〃 〃 〃
یکم اپریل ۱۹۶۰ء	استقبالیہ			لاہور و پشاور کے پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کے وفود کو لنچ دیا گیا۔	〃 〃 〃
۱۴ تا ۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۰ء	ہفتۂ تعلیم نسواں				〃 〃 〃
۵ر ستمبر ۱۹۶۱ء	استقبالیہ وائٹ ہوم			باعزاز جناب جی اے مدنی کمشنر کراچی	〃 〃 〃
۸ر ستمبر ۱۹۶۱ء	لکچر و فلم شو		جناب ڈاکٹر یوسف زئی ٹی۔بی (T.B) کیوری اسپیشلسٹ		

۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۱ء	تقریب تنصیب سنگ بنیاد سر سید گرلس کالج	جناب اختر حسین صاحب مرکزی وزیر تعلیم حکومت پاکستان			سر سید گرلس کالج
۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۱ء	یوم سر سید	جناب مولوی عبد الحق صاحب	سید الطاف علی بریلوی و دیگر حضرات		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۱ء	استقبالیہ	باعزاز جناب جی۔ اے مدنی کمشنر کراچی			جناب ملک باغ علی صاحب وائس پریسیڈنٹ کانفرنس
۸ر نومبر ۱۹۶۱ء	استقبالیہ	باعزاز جناب آغا عبد الحمید صاحب ایڈمنسٹریٹر کراچی			آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۱۲ر نومبر ۱۹۶۱ء[1]	پبلک میٹنگ برائے دفاع ٹی بی	جناب زیڈ۔ ایچ لاری صاحب سابق جج ہائی کورٹ	سیدہ انیس فاطمہ بریلوی، ڈاکٹر یوسف زئی۔ ڈاکٹر کیانی، سید الطاف علی بریلوی		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۷ر دسمبر ۱۹۶۱ء	ایجوکیشنل فلم شو بمقام فردوس کالونی				
۱۳ر جنوری ۱۹۶۲ء	وقار الملک اسکول کی سالانہ تقسیم انعام کی تقریب	جناب الحاج محمد اقبال بلوچ ممبر کے۔ ایم۔ سی			
۴ر مئی ۱۹۶۲ء	استقبالیہ	باعزاز مسٹر غفار پاشا ایم پی اے			آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۹ر جولائی ۱۹۶۲ء	"تصوف اور ادب"		جناب پروفیسر کرار حسین صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج کوئٹہ		" " "
۲۷ر نومبر ۱۹۶۲ء	استقبالیہ	باعزاز مسٹر ہربرٹ کاجی ماہر تعلیم			" " "

[1] اس موقع پر فلم شو اور ایک نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔

تاریخ	موضوع	مقرر	نمائندگان رائیٹرز گلڈ کراچی		آل پاکستان کیپٹل کانفرنس
۲۴ر دسمبر ۱۹۶۲ء	استقبالیہ	بااعزاز مشہور روسی اہل قلم جناب الغ زادہ	نمائندگان رائیٹرز گلڈ کراچی		آل پاکستان کیپٹل کانفرنس
۳۱ر دسمبر ۱۹۶۲ء	استقبالیہ			بااعزاز جناب الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب سابق وزیر تعلیم بہاولپور وصدر کانفرنس	” ” ”
۲۲ر جنوری ۱۹۶۳ء	روح اسلام جنوب مشرقی ایشیا میں	جناب ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان	جناب پروفیسر قدرت اللہ فاطمی صاحب ملایا یونیورسٹی		” ” ”
۲۰ر مارچ ۱۹۶۳ء	"شعرائے لکھنؤ کے مقبرے"	جناب اختر حسین رائے پوری ڈائریکٹر یونسکو	جناب نادم سیتاپوری صاحب		” ” ”
۲۶ر اپریل ۱۹۶۳ء	"اردو بطور ذریعہ اعلیٰ تعلیم"	میجر جی ارشید ایڈیشنل کمشنر کراچی	جناب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب صدر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی		” ” ”
۱۰ر مئی ۱۹۶۳ء	"حیدرآباد دکن کے کتب خانے"	جناب حامد اللہ صاحب انصاری سکریٹری چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹریز	جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی حیدرآباد	جناب ڈاکٹر محمود حسین سابق وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی	” ” ”
۱۹ر جون ۱۹۶۳ء[ط]	حیدرآباد دکن کے قیمتی تاریخی ذخائر کتب سکیجات و تصاویر	جناب اشفاق نقوی صاحب مہتمم نیشنل میوزیم	سید محمد صاحب بیدری (حیدرآباد دکن)	ڈاکٹر سید معین الحق سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی	” ” ”
۱۳ر جولائی ۱۹۶۳ء	مبادیات اسلام	جناب ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان	جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب		” ” ”

ط۔ اس مذاکرہ میں قیمتی تاریخی ذخائر کتب و تصاویر کی نمائش بھی کی گئی تھی، علاوہ ازیں مولوی بشیر الدین پنڈت نے جو شاہجہان پور بھارت سے آئے ہوئے تھے۔ ایک مقالہ بعنوان "بشارات آنحضرت صلعم" پڑھا۔

۳۰ اگست ۱۹۶۳ء	اردو شاعری میں قومی حسّ کا ارتقاء	محترمہ بیگم لفٹننٹ کرنل شہاب الدین احمد صدیقی	ڈاکٹر مسز عالیہ امام ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مسز آمنہ کمال پرنسپل سرسید گرلس کالج۔ جناب مرزا اظہر برلاس چیف پبلک ریلیشن آفیسر کے۔ ڈی۔ اے۔		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۱۳ ستمبر ۱۹۶۳ء	استقبالیہ چینی وفد	باعزاز WEH — HIC YUIN YING		نمائندگان پرائیڈ گلڈس دیگر فرینڈ باڈیز	" " "
۲۹ فروری ۱۹۶۴ء	مثالی تعلیم۔	جناب پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی	ڈاکٹر سید ظہیر الدین احمد الجامعی۔ مرزا علی اظہر برلاس مولوی سید حسین امام صاحب محمد عظمت اللہ صاحب دہلوی ایڈووکیٹ		" " "
۳۰ اپریل ۱۹۶۴ء	جنوب مشرقی ایشیا میں تعلیم کی تشکیل نو	جناب منیر الاسلام صاحب چیرمین ایجوکیشن سب کمیٹی کراچی میونسپل کارپوریشن	جناب پروفیسر قدرت اللہ فاطمی سینٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ اسلام آباد		سرسید گرلس کالج
۱۲ مئی ۱۹۶۴ء	استقبالیہ	باعزاز جناب فرمان احمد و فیضان احمد صاحبان نمائندگان آل پاکستان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز کنونشن	....	جناب مبین الحق صاحب صدیقی سابق اسپیکر ویسٹ پاکستان اسمبلی	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

تاریخ	موضوع	صدر	مقرر		زیر اہتمام
۵ جون ۱۹۶۲ء[1]	اعلیٰ تعلیم اور فنی اصطلاحات اردو	جناب سید سردار احمد سی۔ ایس۔ پی چیرمین کراچی میونسپل کارپوریشن	جناب پروفیسر میجر آفتاب حسن ڈائریکٹر بیورو آف ٹرانسلیشن اینڈ کمپائلیشن کراچی یونیورسٹی		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۲۹ جون ۱۹۶۲ء	اعلیٰ تعلیم میں اردو بطور ذریعۂ تعلیم اور مسئلۂ اصطلاحات علمی	ڈاکٹر سید ظہیر الدین احمد صاحب الجامعی	جناب پروفیسر عبد اللہ المدرسی		″ ″ ″
۸ جولائی ۱۹۶۲ء[2]	استقبالیہ	باعزاز جناب عبد الوحید خان صاحب مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات			″ ″ ″
۲۸ اگست ۱۹۶۲ء	اپوا کی تاریخ اور تعلیمی خدمات	محترمہ بیگم لفٹننٹ کرنل شہاب الدین احمد صدیقی	مسز مسعودہ جواد پرنسپل اپوا سائنس اینڈ آرٹس کالج کراچی		″ ″ ″
۸ مارچ ۱۹۶۳ء[3]	عراق میں تعلیم	جناب پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی	ڈاکٹر سید اسد اللہ کاظمی ایم اے پی ایچ ڈی سابق ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کشمیر حال چیف آف یونسکو مشن اینڈ ایجوکیشنل ایڈوائزر ان عراق		″ ″ ″
۲۵ اپریل ۱۹۶۵ء	ترقیٔ ادب	″ ″ ″	سیدہ انیس فاطمہ بریلوی		″ ″ ″

[1] صاحب تقریر و صدر کی خدمات میں مطبوعات کا ایک ایک سیٹ بھی نذر کیا گیا۔

[2] مہمان خصوصی نے ایک نہایت دلچسپ و معلوماتی تقریر سے بھی نوازا۔ موصوف کی خدمت میں ۹۴ مطبوعات کانفرنس کا ایک سیٹ پیش کیا گیا۔

[3] مسز حکم صاحبہ سابق ایم۔ ایل۔ اے ڈھاکہ نے بھی اپنی تقریر میں اعداد و شمار موجودہ تعلیمی ترقی بالمقابل قبل تقسیم پر روشنی ڈالی۔

تاریخ	موضوع	صدر	مقررین		ادارہ
			مولانا ماہر القادری ایڈیٹر فاران شاہ حسن عطا۔ (ریڈیو پاکستان)		
۳ر جون ۱۹۶۵ء	افسرانِ مقننہ کا معیارِ کار اور پیشۂ قانون کے مقاصد	مسٹر ضیاء الدین خان سی ایس پی چیرمین کراچی میونسپل کارپوریشن	نواب سعید جنگ بہادر سابق چیف جسٹس حیدر آباد دکن پروفیسر شیخ حیدر، ایس ایم لا کالج، مرزا علی اظہر برلاس، عقیل احمد خاں ایڈوکیٹ		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۱۴ر جون ۱۹۶۵ء	لوہے کے جدید رجحانات	جناب ڈاکٹر نذیر احمد سابق چیرمین اٹامک انرجی کمیشن	جناب مولانا ماہر القادری، مس عارفہ عباسی ایم اے لکچرر کراچی کالج فار ویمن پروفیسر عبد اللہ المسعودی۔ پروفیسر عبد المجید قریشی، تابش دہلوی (ریڈیو پاکستان) مینا زبیری سکریٹری مینا آرٹس انسٹی ٹیوٹ، محمد زبیر لائبریرین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی		〃 〃 〃
	مشاعرہ	جناب اسمٰعیل احمد صاحب مینائی سابق چیف آفیسر کراچی میونسپل کارپوریشن	تابش دہلوی، ماہر القادری اقبال صفی پوری، مینا زبیری،		〃

مسلسل بعد

تاریخ	موضوع	صدر	مقرر	مہمان	ادارہ
۳ر فروری ۱۹۶۶ء	استقبالیہ	با اعزاز سید غلام مصطفٰے شاہ ڈائریکٹر تعلیمات کراچی	....	....	آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس
۲۲ر جون ۱۹۶۶ء	سوڈان میں طریقۂ تعلیم	ڈاکٹر محمد سلیم خاں غارانی پرنسپل گورنمنٹ ٹیچرس ٹریننگ کالج کراچی	ڈاکٹر قطب الدین ایم ایس سی (عثمانیہ) الف آر سی ایس آف جزیرہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سوڈان۔ مولوی عظمت اللہ دہلوی ایڈوکیٹ، مرزا علی اظہر برلاس چیرمین عبداللہ کالج گورنمنٹ باڈی، سید الطاف علی بریلوی۔	قونصل سوڈان مقیم پاکستان	" " "
۲۴ر جنوری ۱۹۶۶ء	اسلامی دنیا کے مسائل	جناب مولوی سید حسین امام صاحب وائس پریسیڈنٹ کانفرنس	انعام اللہ خاں جنرل سکریٹری موتمر عالم اسلامی		" " "
۲۶ر فروری ۱۹۶۶ء	جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی حالت	جناب ابن انشا صاحب ایگزیکیٹو سکریٹری نیشنل بک سنٹر آف پاکستان	جناب مولانا سید عبدالقدوس صاحب ہاشمی ندوی	.	" " "
۲۹ر مارچ ۱۹۶۶ء	اسلامی تاریخ ایک عام قاری کی نظر میں	جناب ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک آف پاکستان	جناب جمیل الدین عالی صاحب جنرل سکریٹری پاکستان رائٹرز گلڈ		" "

۱۔ مہمانِ خصوصی جناب سید غلام مصطفٰے شاہ صاحب اور سید الطاف علی بریلوی صاحب میں تعلیمی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا اور موصوف نے بریلوی صاحب کی تجاویز و آرا سے اتفاق کیا۔

تاریخ	موضوع	صدر	مقررین		منتظم
۳۱ر مئی ۱۹۶۷ء	اردو دنیا کی ایک ترقی یافتہ زبان	جناب مرزا علی اظہر برلاس چیرمین عبداللہ کالج	ڈاکٹر شوکت حسین سبزواری چیف ایڈیٹر اردو ڈکشنری، اردو ڈیولپمنٹ بورڈ		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۲۷ر جون ۱۹۶۷ء	اردو دنیا کی ترقی یافتہ زبان	جناب ایس۔ ایم اولیس ایڈیشنل کمشنر کراچی	ڈاکٹر شوکت حسین سبزواری چیف ایڈیٹر اردو ڈکشنری اردو ڈیولپمنٹ بورڈ		〃 〃 〃
۱۴ر اگست ۱۹۶۷ء[1]	آزادی اور اس کے فرائض	جناب مولوی سید حسین امام صاحب وائس پریسیڈنٹ کانفرنس	جناب مرزا علی اظہر صاحب برلاس، جناب پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی، جناب خان بہادر مرزا ابوجعفر کشفی، عقیل احمد رضا ایڈووکیٹ		〃 〃 〃
۲۶ر اکتوبر ۱۹۶۷ء[2]	ایران جدید	جناب الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب سابق وزیر تعلیم بہاولپور	جناب سید محمد جعفری ایم اے کلچرل سکریٹری سفارت خانہ پاکستان۔ ایران		〃 〃 〃
۱۶ر فروری ۱۹۶۸ء[3]	غالب کی شاعری	جناب ممتاز حسن صاحب	جناب مولانا ماہر القادری صاحب		〃 〃 〃

[1] بسلسلہ جشن یوم آزادی رسم پرچم کشائی بدست محترمہ بیگم لفٹننٹ کرنل شہاب الدین محمد صدیقی صاحب چیرمین سرسید گرلس کالج گورننگ باڈی ادا کی گئی۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کی مطبوعات ان کے مسودات اور کانفرنس کے مخطوطات نیز بریلوی صاحب کے ذاتی قلمی نوادر کی نمائش بھی کی گئی علاوہ ازیں درج ذیل شعرائے کرام نے نہایت پرسوز اور حسب موقع نظمیں پڑھیں۔
مولانا ماہر القادری۔ سوز شاہجہان پوری۔ تابش دہلوی۔ اور اقبال صفی پوری۔

[2] بموقعہ جشن تاجپوشی اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران و علیا حضرت ملکہ فرح دیبا۔

[3] بسلسلہ یوم غالب۔ غالب سے متعلق کتابوں کی نمائش بھی کی گئی۔

۲۸ر اپریل سنہ ۱۹۶۸ء	استقبالیہ	منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بینک آف پاکستان باعزاز نمائندگان پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس	ایڈیٹر فاران		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۲۹ر مئی سنہ ۱۹۶۸ء	"پروفیسر عبدالمجید قریشی کے ساتھ ایک شام"	جناب مرزا علی اظہر صاحب برلاس	مینا زبیری صاحبہ، سید الطاف علی بریلوی	جناب ڈاکٹر نذیر احمد	،، ،، ،،
۱۴ر اگست سنہ ۱۹۶۸ء[1]	برصغیر میں حصولِ آزادی کی جدوجہد	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب ستارۂ پاکستان	جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب		،، ،، ،،
۲۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۸ء[2]	تعلیم کا ماضی حال اور مستقبل	جناب لفٹننٹ کرنل آفتاب مختار پرنسپل دہلی کالج	محترمہ مسز سلمیٰ زمن، ایم اے ڈپ، ایڈ (لندن)، جناب سید حسین امام صاحب، راحیل بیگم صاحبہ شروانیہ۔ مسز حکم صاحبہ۔	مسز حکم صاحبہ	،، ،، ،،
۲۵ر دسمبر سنہ ۱۹۶۸ء[3]	قائدِ اعظم کی ولادت اور ان کے کارہائے نمایاں	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بینک آف پاکستان	جناب خواجہ سرور حسن صاحب بار ایٹ لا	ملک جمال الدین صاحب	،، ،، ،،

[1] بسلسلۂ یوم آزادی دفتر کانفرنس کو بڑی شان و شوکت سے سجایا گیا۔ شب کو چراغاں کیا گیا۔ تقریب پرچم کشائی بدست پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی ادا کی گئی۔ پروفیسر صاحب موصوف نے پرچم پاکستان سے متعلق ایک ولولہ انگیز تقریر کی۔ فضل احمد صاحب صدیقی نے موقع کی مناسبت سے ایک نظم پڑھی۔ سید محمد جعفری صاحب نے بھی اپنی نظم ۱۴ر اگست پڑھی۔

[2] بسلسلۂ جشن عشرۂ ترقیات حکومتِ وقت ہر طبقۂ خیال کے افراد نے پرجوش عملی حصہ لیا۔ عرفانہ عزیز ایم اے لکچرار سرسید گرلس کالج نے اپنی نظم "شاخِ یاقوت" پڑھی۔

[3] صدر دفتر کانفرنس پر چراغاں کیا گیا۔ مینا زبیری نے ولادت سے متعلق نظم پڑھی۔ ملک جمال الدین صاحب جنرل سکریٹری انجمن فیض الاسلام راولپنڈی نے مسدس حالیؔ کے چند بند پڑھے۔

یکم جون ۱۹۶۹ء	سیرت طیبہ کی روشنی میں اسلامی کردار	جناب الحاج پیرزادہ سید اصغر علی شاہ صاحب ریٹائرڈ جج	مولوی عبدالصمد صاحب انصاری ڈپٹی آڈیٹر جنرل پاکستان		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی
۲۸ جون ۱۹۶۹ء	ہماری دینی تعلیم کا حال اور مستقبل	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک آف پاکستان	جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی		〃 〃 〃
۱۴ جولائی ۱۹۶۹ء	جدید تعلیمی پالیسی	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک آف پاکستان و صدر کانفرنس	مولوی سید حسین امام صاحب، سیٹھ ایس ایم یوسف صاحب، الحاج مولوی عظمت اللہ صاحب دہلوی، پروفیسر محمد حافظ الدین خاں، نواب سید شمس الحسن صاحب، خواجہ حمید الدین شاہد ایم اے، ڈاکٹر سید معین الحق سکریٹری جنرل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی		〃 〃 〃

۵ؔ حافظ محمد صادق صاحب لاہور نے تلاوت کلام پاک کی۔ حضرت سوز شاہجہان پوری نے نعت بعنوان "نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد" اور جناب مقبول حسین صاحب نیر نے ایک نظم بعنوان "فریاد بخدمت رسول اکرم صلعم" پڑھی۔ دفتر کانفرنس پر چراغاں کیا گیا۔

۱۴ اگست ۱۹۶۹ء[1]	پاکستان کا شاندار مستقبل	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک آف پاکستان	جناب ضیاء الاسلام صاحب لفٹننٹ کرنل آفتاب مختار پرنسپل دہلی کالج، ڈاکٹر نذیر احمد، سید محمد تقی صاحب، مسز سلمیٰ زمن، مسز آمنہ کمال، پروفیسر سید اظہر حسین رضوی، مسٹر ضیاء الدین ایم اے، ضیاء الاسلام صاحب، جناب بشیر احمد صدیقی، خواجہ سرور حسن صدیقی بیرسٹر، پروفیسر مس انیتا غلام علی، بیگم لفٹننٹ کرنل شہاب الدین احمد صدیقی، مرزا عاشق حسین سابق پرنسپل شیعہ کالج لکھنؤ، سید الطاف علی بریلوی۔		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

لہ بسلسلہ تقریب یوم آزادی

تاریخ	موضوع	مقرر	صدر	مہمان خصوصی	مقام
۲۰ر جنوری ۱۹۷۰ء	ابتدائی تعلیم اور اس کے اساتذہ	جناب ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بینک آف پاکستان	جناب سید حامد علی جعفری سابق انسپکٹر آف اسکولز کراچی و پشاور		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۳ر فروری ۱۹۷۰ء[1]	مختلف قسم کی میڈیکل سائنسوں کا تقابلی مطالعہ	سید الطاف علی بریلوی صاحب	جناب شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب		سرسید گرلس کالج
۷ر مارچ ۱۹۷۰ء[2]	جلسۂ تنصیب سنگ بنیاد ایوان سائنس سرسید گرلس کالج		مسز آمنہ کمال پرنسپل سرسید گرلس کالج، سید الطاف علی بریلوی، بیگم لفٹننٹ کرنل شہاب الدین احمد صدیقی	جناب امیر علی ایچ فینسی صاحب و بیگم فینسی صاحبہ	" "
۲۶ر مئی ۱۹۷۰ء[3]	ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر تعلیم بہار (بھارت) کے ساتھ ایک شام	جناب مولوی سید حسین امام صاحب وائس پریسیڈنٹ کانفرنس	جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب، سید الطاف علی بریلوی		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۱۷ر جون ۱۹۷۰ء	اردو کی ترقی میں ٹائپ کی اہمیت	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بینک آف پاکستان	جناب حسن احمد مینائی صاحب ایم اے، جناب مرزا ظفر الحسن صاحب سکریٹری ادارۂ یادگار غالب		" "

[1] شفاء الملک حکیم عبداللطیف لکھنؤ (یو۔پی) بھارت سے تشریف لائے ہوئے تھے، سرسید گرلس کالج میں جلسہ ہوا۔

[2] بدست مشہور صنعت کار جناب امیر علی ایچ فینسی چیرمین پاکستان ریفائنری لمیٹڈ اس موقع پر آپ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ تقریب پرچم کشائی بدست محترمہ اصیل بیگم صاحبہ شروانیہ ادا کی گئی۔ بعد ازاں کالج کا ترانہ پڑھا گیا۔ محترمہ بیگم فینسی صاحبہ کی معیت میں جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب، افتخار حسین صاحب اسسٹنٹ جنرل منیجر ایسو، مرزا علی اظہر صاحب برلاس اور سید ایس ایم یوسف صاحب نمائش کا افتتاح کیا گیا۔

[3] مقرر خصوصی جناب سید محمود سابق وزیر تعلیم بہار و ممبر پارلیمنٹ پٹنہ (بھارت) سے تشریف لائے ہوئے تھے۔

تاریخ	تقریب	صدر	مقرر / شرکاء	مہمانانِ خصوصی	زیرِ اہتمام
۲۰ نومبر ۱۹۷۵ء	تقریب تنصیب سنگ بنیاد آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس و یوسف میموریل لائبریری	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بنک آف پاکستان	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس سید الطاف علی بریلوی، سید مظہر حسن رضوی ایم۔ اے	جناب محمد عالم صاحب[1] محترمہ بیگم صاحبہ	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء[2]	میری تصنیفی زندگی اور اس کے تجربات	جناب سید ہاشم رضا صاحب	جناب قاضی عبدالودود صاحب، جناب سید ہاشم رضا صاحب		″
۲۵ دسمبر ۱۹۷۵ء[3]	یوم قائدِ اعظم	جناب جی۔ اے مدنی صاحب ایم پی اے		جناب خواجہ سرور حسن صاحب بیرسٹر سکریٹری جنرل پاکستان انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرز، محترمہ بیگم عطیہ اویس صاحبہ، جناب سید حسین امام صاحب، جناب ڈاکٹر سید بشارت علی صاحب	″

[1] جناب محمد عالم صاحب فرزندِ اکبر جناب سیٹھ ایس۔ ایم یوسف صاحب۔

[2] مقررِ خصوصی جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر بھارت سے تشریف لائے ہوئے تھے۔

[3] دفتر کانفرنس کی عمارت کو سجایا گیا اور شب کو چراغاں کیا گیا۔ اور پرچم لہرایا گیا۔

۳۰ جون ۱۹۷۱ء[1]	قومی یکجہتی	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس	جناب افتخار حسین صاحب اسسٹنٹ جنرل منیجر ایسو و دیگر حضرات		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۳۱ جولائی ۱۹۷۱ء[1]	اردو اور رومن رسم الخط	مولوی سید حسین امام صاحب وائس پریذیڈنٹ کانفرنس	جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی صاحب سابق چیرمین شعبۂ اردو و فارسی پشاور یونیورسٹی۔ جناب شان الحق صاحب حقی۔ جناب پروفیسر حسن الاعظمی صاحب۔ جناب ماہر القادری صاحب		"
۱۴ اگست ۱۹۷۱ء[2]	یوم پاکستان	....			
۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء[3]	۲۵۰۰ سالہ جشن شہنشاہیت ایران	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس			
۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء[4]	جلسہ متعلق جنگ ۱۹۷۱ء	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس	جناب سید اصغر علی شاہ صاحب ریٹائرڈ جج۔ جناب ڈاکٹر سید ارشاد علی صاحب انس انبیا	جناب مولوی سید حسین امام صاحب	" " "

[1] جناب مولانا زاہر قاسمی صاحب نے تلاوت کلام پاک فرمائی۔
[2] صدر دفتر کانفرنس کی عمارت پر پرچم لہرایا گیا اور چراغاں کیا گیا۔
[3] دفتر کانفرنس کی عمارت کو نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا اور شب کو چراغاں کیا گیا۔
[4] جناب مولانا ماہر القادری صاحب نے تلاوت کلام پاک فرمائی اور حضرت رمزی الہ آبادی نے رزمیہ نظم پڑھی۔

تاریخ	موضوع	صدر	مقررین		
۲۶ اپریل ۱۹۷۲ء[۵۱]	جدید تعلیمی پالیسی	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس	[illegible] جناب پروفیسر سید اظہر حسین صاحب رضوی جناب سید محمد تقی جناب سید سبط نبی نقوی۔ بیگم خورشید جہاں ہیڈ مسٹریس اختر گرلز اسکول۔ جناب سید حامد علی صاحب جعفری جناب خواجہ آشکار حسین صاحب پرنسپل ڈاکٹر ضیاء الدین نبی باغ کالج جناب سید محمد تقی صاحب		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۲۹ جون ۱۹۷۲ء	علمی ترقی کے لئے لسانی اتحاد ضروری ہے	جناب مولوی سید حسین امام صاحب وائس پریسیڈنٹ کانفرنس	جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی سابق مرکزی وزیر تعلیم و سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی	جناب مولانا ظفر احمد صاحب انصاری۔ جناب ڈاکٹر محمد یٰسین صاحب زبیری	〃 〃 〃
۴ نومبر ۱۹۷۲ء[۵۲]	اخبار نویسوں کا کردار و اخلاق	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس	جناب ملک نصر اللہ خاں صاحب ایڈیٹر مدینہ بجنور جناب سید حسین امام صاحب جناب جی اے مدنی صاحب ایم اے	مرزا ظفر الحسن صاحب جناب سید محمد تقی صاحب جناب حاجی غلام محمد صالح صاحب جناب محسن بھوپالی جناب سحر انصاری جناب مولانا ماہر القادری صاحب	〃 〃 〃

[۵۱] کیپٹن سید آصف علی صاحب نے تلاوت کلام پاک فرمائی۔ سید الطاف علی صاحب بریلوی کے ایما پر عقیل احمد صاحب نے ٹیپ ریکارڈ کیسٹ سے صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء کی تقریر کا اردو ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ [۵۲] منجانب کانفرنس افطار کا انتظام کیا گیا۔

تاریخ	موضوع	صدر	مہمان خصوصی	با اعزاز	مقام
۲۵ نومبر ۱۹۷۲ء[۱]	استقبالیہ	جناب پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی		با اعزاز جناب دُرمحمد اُستو صاحب وزیر تعلیم سندھ	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۵ مئی ۱۹۷۳ء[۲]	اقبال کا بنیادی خیال	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس	جناب چیف جسٹس قدیر الدین احمد صاحب سندھ و بلوچستان		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۲۰ جون ۱۹۷۳ء[۳]	مرزا علی اظہر برلاس کے ساتھ ایک شام	״ ״ ״	سید الطاف علی صاحب بریلوی جناب اخلاص حسین صاحب زبیری جناب مرزا علی اظہر برلاس صاحب	جناب مرزا علی اظہر صاحب برلاس	״ ״ ״
۱۴ اگست ۱۹۷۳ء[۴]	تقریب نفاذ مستقل دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان و انتخاب جناب فضل الٰہی چودھری و جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب بحیثیت صدر و وزیر اعظم				״ ״ ״
۲۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء[۵]	العلم کا بائیس سالہ جشن اشاعت	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس	جناب ڈاکٹر محمود حسین صاحب		״ ״ ״

[۱] جناب ڈاکٹر محمد یٰسین صاحب زبیری نے تلاوت کلام پاک فرمائی ۹۶ مطبوعات کا ایک سیٹ مہمان خصوصی کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

[۲] جناب فضل احمد صاحب صدیقی نے اقبال پر ایک نظم پڑھی۔

[۳] جناب قاری عبدالرحمٰن صاحب نے تلاوت کلام پاک کی۔ [۴] دفتر کانفرنس کی عمارت پر پرچم لہرایا گیا۔

[۵] پروفیسر سید اظہر حسین صاحب رضوی نے اسٹیج سکریٹری کے فرائض ادا کئے حضرت سوز شاہجہان پوری نے نظم پڑھی، پروفیسر محمد ایوب صاحب قادری نے مقالہ پڑھا۔ بائیس ہمہ ۷۵ مطبوعات کانفرنس کا ایک سیٹ مہمان خصوصی کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

			وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی جناب پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی جناب پروفیسر عبدالمجید صاحب قریشی، جناب مولوی سید حسین امام صاحب ڈاکٹر فرمان فتح پوری	جناب الحاج مولانا کوثر نیازی صاحب وزیر اطلاعات، اوقاف و حج حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۷ مارچ ۱۹۷۶ء[ل]	اسلامی سربراہ کانفرنس	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب صدر کانفرنس	جناب انعام اللہ خاں صاحب سکریٹری جنرل موتمر عالم اسلامی و جناب ڈاکٹر منظور الدین احمد پروفیسر کراچی یونیورسٹی	"	"
۱۲ اپریل ۱۹۷۶ء[ل]	پاکستان انجمن ادبی رسائل کی چھٹی سالانہ کانفرنس	جناب حکیم محمد سعید صاحب چیرمین ہمدرد ٹرسٹ	خطبۂ استقبالیہ سید الطاف علی بریلوی مدیر العلم سالانہ رپورٹ سکریٹری صہبا لکھنوی مدیر افکار	جناب مولانا کوثر نیازی صاحب وفاقی وزیر امور مذہبی، حج و اوقاف	پاکستان انجمن ادبی رسائل

ل اسٹیج سکریٹری کے فرائض سید الطاف علی بریلوی صاحب نے ادا کیے۔
ل جناب سید الطاف علی صاحب بریلوی، چیرمین، مستقل کمیٹی نے جناب مولانا کوثر نیازی صاحب وزیر امور مذہبی، اوقاف و حج کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ مہمان خصوصی نے سپاس نامہ میں بیان کردہ بیشتر مطالبات سے اتفاق کیا۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس نے پاکستان انجمن ادبی رسائل کو پانچ سو روپے کا عطیہ دیا۔

۱۷ اپریل ۱۹۷۶ء	ادبی رسائل کی اہمیت	جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب سابق منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بنک آف پاکستان	جناب الف ایم ساقی صاحب ایڈیٹر ساغر، جناب محمد علی صاحب صدیقی، مسٹر اظہر جاوید لاہور۔ جناب مختار زمن صاحب (اے پی پی) جناب محمد احمد صاحب سبزواری، جناب مولانا راغب الحیری صاحب، جناب ڈاکٹر ممتاز حسن صاحب (تقریر صدارت)			آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
یکم نومبر ۱۹۷۶ء	تعزیتی جلسہ بسلسلہ سانحہ ارتحال جناب ڈاکٹر محمود حسین صاحب مرحوم	جناب چیف جسٹس قدیر الدین احمد صاحب	جناب مرزا علی اظہر صاحب برلاس۔ جناب پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی جناب سید محمد تقی صاحب، مسز آمنہ کمال پرنسپل سرسید گرلس کالج جناب مولانا سید جعفر شاہ صاحب پھلواری			

لہ اس مذاکرہ میں جناب پیارعلی الانہ صاحب وزیر تعلیم سندھ مہمان خصوصی تھے جو کسی اہم مصروفیت کے باعث تشریف نہ لاسکے اور اپنی تحریری تقریر ارسال فرمائی جسے مسٹر آفتاب عالم قزلباش ایڈوکیٹ نے پڑھ کر سنایا۔ اسی شب جناب شکیل عادل زادہ صاحب ایڈیٹر "سب رنگ" کراچی نے نمائندوں کو ہوٹل انٹر کانٹیننٹل میں ڈنر دیا۔

تاریخ	موضوع	صدر	مقررین		مقام
۲۸ نومبر ۱۹۷۶ء	تدوینِ حدیث	جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب صدر کانفرنس سابق چیف جسٹس سندھ و بلوچستان	جناب سید حسین امام صاحب جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب۔ سید الطاف علی بریلوی جناب مولانا سید عبدالقدوس صاحب ہاشمی ندوی۔ (اسلام آباد) پیر ہاشم جان صاحب، مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی، جناب انعام اللہ خاں صاحب۔ جناب حکیم محمود احمد صاحب برکاتی، جناب فضل احمد صاحب صدیقی جناب حکیم نصیر میاں ندوی		آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۹ دسمبر ۱۹۷۶ء[1]	قومی نظموں کا مشاعرہ	جناب قدیرالدین احمد صاحب صدر کانفرنس و سابق چیف جسٹس سندھ و بلوچستان۔ صدر کانفرنس			〃 〃 〃

[1] چھبیس ممتاز شعرائے کرام نے حُب الوطنی اسلام دوستی اور قومی یکجہتی کے موضوع پر نظمیں پڑھیں۔ جو اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۶ء کے "العلم" میں بھی شائع کی گئیں۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس			جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب صدر کانفرنس	چار مشاورتی جلسے بغرض انعقاد سلور جوبلی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس	۱۵ مئی تا ۹ جون ۱۹۷۵ء[1]
				سلور جوبلی آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس	۲۷ لغایت ۳۰ اگست ۱۹۷۵ء
" " "	جناب عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب وفاقی وزیر تعلیم و صوبائی رابطہ		جناب قدیر الدین احمد صاحب چیف جسٹس سندھ و بلوچستان و صدر کانفرنس	افتتاح سلور جوبلی کانفرنس	۲۷ اگست ۱۹۷۵ء[2]
			جناب اسمٰعیل میمن صاحب ڈائریکٹر آف اسکول ایجوکیشن کراچی	ابتدائی ثانوی تعلیم و اعلیٰ تعلیم کے مسائل	۲۸ اگست ۱۹۷۵ء
			جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب صدیقی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی	تصنیف و تالیف اور تحقیق علمی کے مسائل	" " "
			جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی صدر شعبۂ اردو و فارسی پشاور یونیورسٹی	قومی زبان ذریعۂ تعلیم	۲۹ اگست ۱۹۷۵ء

[1] عہدہ داران و ارکان کانفرنس ورکنگ کمیٹی پر مشتمل جلسہ میں جناب ڈاکٹر فرید الدین صاحب بقائی استقبالیہ کمیٹی کے صدر منتخب کئے گئے

[2] بمقام سرسید گرلس کالج کیا گیا

۲۹ر اگست ۱۹۷۵ء	قومی تعلیم اور اُس کا نصب العین	جناب قدیرالدین احمد صاحب سابق چیف جسٹس سندھ و بلوچستان وصدر کانفرنس			
۳۰ر اگست ۱۹۷۵ء [۱]	مشاعرہ	جناب مولانا کوثر نیازی صاحب وفاقی وزیر امور مذہبی و جسٹس قدیرالدین صاحب		جناب مولانا کوثر نیازی صاحب وفاقی وزیر امور مذہبی، حج، اوقاف	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
۲۸ر نومبر ۱۹۷۵ء [۲]	یوم خسرو	جناب مولوی سید حسین امام صاحب نائب صدر کانفرنس	جناب سید سبط حسن صاحب مقرر خصوصی و دیگر حضرات		〃 〃 〃
۶ر دسمبر ۱۹۷۵ء [۳]	استقبالیہ	جناب شبیر حسن قزلباش ایڈووکیٹ		جناب عبداللہ بلوچ صاحب وزیر محنت سماجی بہبود و اوقاف حکومت سندھ	〃 〃 〃
۲۹ر فروری ۱۹۷۶ء [۴]	یوم سلطان صلاح الدین ایوبی	جناب قدیرالدین احمد صاحب صدر کانفرنس	جناب پروفیسر وقار احمد صاحب رضوی جامعہ کراچی جناب ڈاکٹر فریدالدین صاحب بقائی۔ جناب جسٹس قدیرالدین احمد صاحب	جناب اے۔ کے سومار صاحب (مقرر خصوصی)	〃 〃 〃

نوٹ: نوٹ ۱ ۲ ۳ ۴ ۱۶۶ صفحہ پر ملاحظہ کیجیے۔

۱؎ بمقام سرسید گرلس کالج کمپاؤنڈ۔

۲؎ جناب الحاج پیرزادہ سید اصغر علی شاہ صاحب رٹائرڈ جج و ممبر کانفرنس ورکنگ کمیٹی نے تلاوت کلام پاک فرمائی۔ جناب کنور اعظم علی خاں صاحب خسروی رئیس بہاسو نے ایک نظم پڑھی اور جناب یوسف بخاری صاحب نے مقالہ پڑھا۔

۳؎ تقریب کا آغاز کنور اعظم علی خاں صاحب خسروی کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ محترمہ ارجمند قزلباش صاحبہ نے مہمانِ خصوصی کو ہار پہنائے۔ شبیر حسن قزلباش صاحب نے مطبوعات کا ایک سیٹ پیش کیا۔ سید الطاف علی بریلوی صاحب نے مہمانِ خصوصی کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ مہمانِ خصوصی نے جوابی تقریر کی۔ بعد ازاں نسیم حیدر صاحب ایڈوکیٹ نے بھی تقریر کی۔

۴؎ محترمہ پروفیسر قمر آستانہ صاحبہ، سرسید گرلس کالج نے تلاوتِ کلام پاک فرمائی۔ مہمانِ خصوصی کو مطبوعات کا نذرانہ پیش کیا گیا۔ جناب رحمان کیانی، جناب اعظم علی خاں صاحب خسروی اور جناب انصار حسین صاحب جعفری ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ تیلڈن سیکنڈری اسکول نے نظمیں پڑھیں۔ محترمہ بیگم راحت اللہ والا نے ضربِ کلیم سے چند بند پڑھے۔

تعلیم اسلامی اور سوشلزم

از جناب شبیر علی کاظمی مددگار ناظم انجمن ترقی اردو

انسانی تجربے میں وقت کی حیثیت اضافی ہوتی ہے۔ البتہ وہ ان واقعات سے رونما ہوا کرتی ہے جو اس مدت میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ پانچ ہزار سالہ قدیم ثقافت اور ڈیڑھ ہزار برس پرانی تاریخ کے بار افتخار کے پس منظر میں جب ہم قدیم پاکستان کے گزشتہ ربع صدی کا خیال کرتے ہیں تو یہ مدت ایک معمولی وقفہ نظر آتی ہے۔ مگر دینی اساس پر نظریاتی طور سے منصۂ وجود پر ابھری ہوئی جدید قوم کے لئے یہ مدت خاصی طویل اور اہم تھی۔ عالمی سیاست میں حقِ خودارادیت اور دین و ثقافت کے طفیل پاکستان جیسی مملکت کا قیام ایک تجربہ ہی نہ تھا بلکہ اقوام عالم کو ایک چیلنج تھا۔ اور سیاسی جدوجہد میں تاریخی معجزہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے یہ ہوسِ اقتدار کے سالوں میں پروان چڑھنے کا اہل نہ تھا۔ اس کی روز افزوں ترقی کے لئے اسی بیشمار نظریاتی عملیت کی ضرورت تھی، جن کے نام پر وہ عالم وجود میں آیا تھا۔

نظریاتی عملیت کے لئے وہ تعمیری اقدامات ضروری تھے جو اس مملکتِ خداداد کو اپنے سرچشمۂ حیات سے وابستہ رکھتے ہوئے اقتصادی تگ و دو میں ترقی یافتہ دنیا کے ہمدوش کر دیتے۔ ایسی قت ممکن تھا کہ جب ہمارا نظریۂ تعلیم اس نقطۂ نظر کی بالیدگی کے لئے مرتب اور ان تمام مقاصد کا حامل ہوتا جو حیات کے روز افزوں مطالبات کا ساتھ دیتے رہتے۔ نوجوانان قوم باوجود حب الوطنی ترقیات اور آسائش حیات کے جدید مطالبات کی تشفی کے بھی طلبگار تھے۔ جب تعلیم اور سیاست نے یہ راہ ہموار نہ کی اور نظریاتی عملیت کے بجائے فلک شگاف نعرے ہی گونجتے رہے۔ اور فلاحِ قوم کی تعبیر چند خاندانوں اور چند افراد کے تمول پر مشتمل ٹھہری اور اساسی نظریات بھی استحصال کے معاون نظر آنے لگے۔ چنانچہ قوم بیزار ہو کر میدانِ عمل میں اتر آئی۔ کاش مابعد کے اقدامات میں البتہ اشتعال ان اغیار کی ترغیبی استمداد سے بھی پیدا ہوا جو اس ملک کے نظریاتی وجود کو خطرناک تجربہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں مذہبی صدائیں استحصال کے نعرے متصور ہوئیں۔ اور وطنیت کے مادی نظریہ نے وہاں اسلام ہی کو ایک بدیسی نظام حیات ٹھہرا دیا۔ یہ اس سرخود غلط اور گمراہ طبقے کے خیالات تھے جو عموماً گزشتہ پچیس سالہ پاکستانی زندگی کا مایۂ ناز تھا۔ ورنہ قدیم دبستان کے لوگ اس رجحان کے مخالف تھے۔ البتہ اقتصادی فلاح کے وہ بھی دلدادہ تھے۔ اس نظریاتی اور معاشی آویزش سے یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ تعلیمی نظام نے اطمینان بخش صورت پیدا نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نظام تعلیم کو ملک کی مجموعی پیداوار، نظام اور تقسیمِ زر کے اصولوں کو بدلتے ہوئے معاشرے کی ضرورتوں سے مربوط نہیں کیا گیا۔ تدابیر زیر غور رہیں۔ مگر بے لوث عمل نہ ہو سکا۔ دورِ حاضر میں تبدیلیاں نہایت تیزی سے رونما ہو رہی ہیں، نئے خیالات کی افزونی اور قدیم روایات کی تحقیر عام ہے۔ یہ شکست و ریخت اور افراط و تفریط ابھی تک جاری ہے۔ اور زندہ معاشرہ کی علامتِ حیات ہے۔ مگر ہم نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ یک جہتی سے جو یکسوئی پیدا

ہوتی ہے وہ مفقود رہی۔ انتشار کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا۔ گزشتہ ربع صدی میں سائنسی تحقیقات نے محیر العقول طور پر اسرارِ خداوندی کا انکشاف کیا ہے۔ ایٹمی توانائی، سریع الحساب کمپیوٹر، چاند کی تسخیر، فضائی سفر، امراضِ مزمنہ کا انسداد اور علاج چند ایسے حقائق ہیں جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ہم دنیا کی سائنسی اور ثقافتی دوڑ میں کہاں کھڑے ہیں۔ یہ پچیس سال کی اس طویل اور مختصر مدت میں پدرم سلطان بود کی ڈگڈگی پر ہم اقوامِ عالم کو کب تک رجھاتے رہتے۔ ہم تو ان نظریات کے تحفظ سے بھی قاصر رہے جو ہم نے خود اپنے لئے وضع کئے تھے۔ احیائے دین کا جوش، اقتصادی فلاح کا ولولہ ٹھوس حقیقتوں میں تبدیل نہ ہو سکا۔ ڈھول کا پول کھل گیا۔ ہم بد عہد اور عہد شکن ٹھہرے۔ نظامِ حیات سے پہلو تہی برت کر حقوق اللہ و حقوق العباد کو فراموش کر دیا۔ ملک کے نظریاتی دفاع میں وہ رخنے پڑے جو توپ و تفنگ سے بند نہ ہو سکے۔ غلط اقدام کے اعتراف کے بجائے نظریاتی دفاع کی اشک شوئی کی خاطر خونِ ناحق بہنے دیا گیا۔ اور اس کو ہوسِ حکمرانی کے طفیل مصلحتاً پوشیدہ رکھا جو فضائے بسیط میں ہنوز فریاد کناں ہے۔ بالآخر ہم دو نیم ہو بیٹھے اور عالمی برادری میں اس شرفِ اولیت کو کھو بیٹھے جس سے سربلند تھے اور وہ نصب العین پارہ پارہ ہو گیا جس کے لئے سادہ لوح دین داروں نے دریائے خون پار کیا تھا۔ غرضکہ برصغیر میں دو سو برس کی کدوکاوش سے جو مذہبی اور سیاسی بیداری پیدا ہوئی تھی وہ غلط فیصلوں اور ایک مخصوص طبقے کی حبِ جاہ کی نذر ہو گئی۔ مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہوا۔ دو قومی نظریہ کی صداقت کا ابطال ہوا۔ اقتصادی ناہمواری میں اضافہ ہوا۔ مہنگائی کے بھوت نے سر اٹھایا۔ دینی ترغیبات کی تحقیر ہوئی اور ہماری تاریخ میں برادر کشی کے ایک سیاہ باب کا اضافہ ہو گیا۔ اس زوال، انتشار اور سقوط کے لئے ہمارا نظامِ تعلیم بھی موردِ الزام ہے۔ نوجوانانِ قوم ملک کے نظریاتی دفاع سے بے بہرہ رہے۔ جب وہ اس کے مفہوم اور پس منظر سے ناآشنا تھے تو تحفظ کیسے کرتے۔ پیش بینی کے فقدان اور حرص و آز کے طوفان نے ہماری بصارت اور بصیرت دونوں کو ختم کر دیا۔ اور قضا و قدر کا فرشتہ ہنوز دفترِ حساب کھولے بیٹھا ہے۔

سیاست ایک ترقی پذیر نظریہ ہے جس میں قومی مقامی اور بین الاقوامی ذمہ داریوں کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اور ایسی پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں۔ جن سے ملک پر اور بیرونِ ملک اپنا وقار قائم رہے۔ یہ سائنس اور صنعت کا دور ہے۔ جو براہِ راست علم کا نتیجہ ہے۔ اس لئے تعلیمی میدان میں تعلیمی اداروں کی مجموعی واقفیت سے جو قومی رہبری کی ضامن ہے ہمیں بصیرت حاصل کرنا تھی۔ اور زمانہ اور ضرورت کے لحاظ سے تبدیلیوں کو وسیع النظری اور پیش بینی سے دیکھنا تھا۔ مگر افسوس ایسا نہ ہوا اور ملک کی نظریاتی اساس محدود مادی تگ و دو کی شکار ہو گئی۔ ادھر مادی ترقی میں بھی ہم نے اس ایثار کا وافر ثبوت نہ دیا۔

جو استحکام معاشیات کا معاون ہوتا اور ہم اہم بنیادی صنعتوں کے قیام کے بعد ہمہ جہت فارغ البالی کی طرف اطمینان سے گامزن ہوتے۔ اس طرح ہمیں دونوں میدانوں میں ہزیمت ہوئی اور داخلی بغاوت کے شکار ہوگئے۔ اس پس منظر میں جدید پاکستان قدیم پاکستان کی شکست وریخت سے پیدا ہوا اور جدید قیادت نے اسلامک سوشلزم کا نظریہ پیش کیا جس کے تحت دوررس تبدیلیاں کی گئیں اور بہت کچھ ہنوز کرنا باقی ہے۔ اس لئے موجودہ حکومت کی ذمہ داریاں مختلف النوع حیثیتوں کی تھیں جن میں سب سے اہم منتشر الخیال، دست بریدہ اور زخم خوردہ قوم اور معاشرے کی تالیف قلوب کی بشارت دینا تھا۔ جو سیاسی دانشمندی کا کرشمہ ہی نہیں بلکہ معجزہ ثابت ہوا۔ دوم باقی ماندہ ملک کا تحفظ اور بیرونی ساکھ کو برقرار رکھنا ہے۔ جو مخصوص خارجہ پالیسی سے نصیب ہوسکتی ہے۔ خارجہ پالیسی کا تعین مدبرانِ قوم کا فریضہ ہے۔ اس کا تعلق براہِ راست تعلیم سے نہیں لیکن ہر ملک کی خارجہ پالیسی اس کے نظامِ تعلیم پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔ کیونکہ تعلیم دراصل معلومات کو فراہم کرنے اور اُن کو استعمال کرنے کے فن کو بھی کہتے ہیں۔ البتہ اس فن کی تفصیل دشوار ہے تعلیم کا یہ مقصد نہایت وسیع اور مروجہ تعریف سے بہت دور ہے۔ تاہم ماہرینِ تعلیم کو یہ نکتہ ہمیشہ اپنی توجہ میں رکھنا چاہیئے۔ خارجہ پالیسی سے زیادہ اہم اور ضروری اندرونِ ملک امن وامان برقرار رکھنا ہے۔ جس کے بغیر ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اور تعلیم کے لئے وہ ماحول پیدا نہیں ہوسکتا جس میں استاد وشاگرد ہمہ تن مقصد کی لگن میں کھوئے رہیں۔ ہمارے ملک میں ایک فکری انتشار کا عالم ہے۔ جو ذہنی پراگندگی کا عکس ہے۔ جس کے مختلف روپ میں مخالفت برائے مخالفت، مخالفت برائے اقتدار۔ مخالفت برائے حق گوئی اور حق شناسی۔ ان تمام اختلافات میں خدشات مضمر ہیں۔ اور انہیں خدشات کے طفیل تعلیمی ماحول پراگندہ ہوتا ہے۔ معاشرہ کی پراگندگی تعلیمی ماحول کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاون وسازگار ماحول معاشرے کی اصلاح سے پیدا ہوگا یا تعلیمی ماحول کی تطہیر اور نظم وضبط سے۔ موجودہ حکومت اپنی سی کوشش کر رہی ہے مگر ملک اور قوم کی خاطر سچے تعاون، سیاسی حقیقت پسندی اور احترامِ نظریات کی ضرورت ہے۔ معاشرے کی تطہیر ایک جدا موضوع ہے۔ مگر اس مضمون کا تعلق تعلیم سے ہے اس لئے ہم یہاں صرف تعلیم سے متعلق ان مسائل پر بحث کریں گے جو ہمارے نظریات کو تعلیمی نظام سے ہم کنار کرتے ہیں۔ اس کے بعد قوم کے نوجوانوں کے لئے ایسے لائحۂ عمل کی نشاندہی ضروری ہوجاتی ہے جو ہر لحاظ سے مقبول اور ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے ترقی پذیر ہو۔ گذشتہ ربع صدی کے تجربات ہمیں سبق دے رہے ہیں کہ تمام اصلاحی اقدام نہایت خلوص احتیاط اور سختی سے نافذ کرنے ہوں گے۔ دنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ممالک غیر مسلم ہیں۔ انھوں نے اپنی ضرورتوں کے تحت ترقی پسند اصول اپنا کر دنیا میں ترقی حاصل کی ہے

اور اسی لحاظ سے تعلیم کا نظام تیار کیا ہے۔ تو پھر یہ کیوں ممکن نہیں کہ ہم اسلام کے عہد اول ایسا معاشرہ اور نظام تعلیم پیدا نہ کر سکیں۔ جو ہمیں دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں کھڑا کر دے۔ پاکستان میں اسلامی سوشلزم کو سیاسی نظریئے کے طور پر پیش کیا گیا۔ لفظا اسلامی سوشلزم کی ترکیب میں ثنویت ہے۔ کیونکہ اسلام اور سوشلزم کو یکجا کر کے ذہنوں کو فکر مند اور متشکک کر دیا۔ البتہ اس نقطہ سے نظریاتی اور اقتصادی دونوں توقعات نمایاں ہیں۔ اسلام بذاتِ خود ایک نہایت ترقی پسند نظریۂ حیات ہے۔ سوشلزم میں انسان دوستی اور توقیرِ محنت کے عناصر صحیح اسلامی تعلیم کے مرہون منت ہیں۔ اسلام میں ایمان بالغیب یعنی وہ غیر مادی حقیقتِ کبریٰ کا معترف ہے۔ اسلامی عقیدہ میں تصورات اور موجودات دونوں کا میل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایمان بالغیب اقتصادی اصولوں اور سائنسی نظریات سے ہرگز بیر نہیں رکھتا۔ مقام افسوس یہ ہے کہ مغرب کا جدید فلسفۂ حیات اسلام کی کنہ کو نہیں پہنچا۔ اس نے اسلام کو محدود زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ مسلمان حقیقت کا متلاشی ہے اور جزو سے کل تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اسلامی فکر کی بنیاد فکر اور نظر دونوں پر ہے اور یہی مردِ مومن کا وصف ہے۔ اس فکر و نظر کے انسانوں سے جو معاشرہ پیدا ہوگا وہ مثالی ہوگا اور انسانیت کے دکھوں کا معالج ہوگا۔ ورنہ روایتی تعلیم خواہ مذہبی ہو یا دنیوی اور انگریزی اتباع کی تعلیم خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ اصل دین اور مروتِ اسلام کے منافی ہے بلکہ صحیح مذہب کے خلاف ایک سازش ہے۔ اس لئے ہمارا نظام تعلیم ایسا

ہونا چاہیئے جو دینی ضرورتوں کے ساتھ دنیوی مطالبات کو بھی پورا کرے۔ دین میں عزتِ نفس احترامِ انسانیت ہے۔ اس کی نگہداشت اور ترقی نظام تعلیم کا فریضہ ہے۔ اسلامی معاشرے میں سب انسان برابر ہیں حتیٰ کہ قوم اور ملک کی تخصیص بھی مذموم ہے۔ "سارا جہاں ہمارا" وسیع معنوں میں انسانی برادری کا تصور پیش کرتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہم مسلمان اس اعلیٰ اور ارفع نظریۂ حیات کو پسِ پشت ڈال کر وطنیت پر اتر آئے ہیں۔ حُبِّ وطن جزوِ ایمان ہے۔ مگر ایمان مکمل نہیں۔ اس تنزلِ فکر کے اسباب بھی ہیں جن کی اساس معاشی ہے۔ اس کی اصلاح نظام تعلیم سے ممکن ہے۔ کیونکہ یہ غلط تعلیم ہی کی پیداوار ہے۔ اسلام کا مدار اتحادِ توحید و رسالت ہے جس سے برادرانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اور ارکانِ اسلام کی پابندی سے باہمی اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیم کا یہ ایک رُخ ہے جو مسلمانوں سے متعلق ہے۔ اسلامی تعلیم کا دوسرا حصہ غیر مسلم سے متعلق ہے جس میں انسانیت نوازی اور رواداری کا سبق ہے۔ اگر ہمارا معاشرہ ان اقدار سے محروم ہے اور تعلیم ان فرائض کی انجام دہی سے قاصر ہے تو پھر مسلمانوں کے مقدر میں ذلت و رسوائی ہے۔ ان دونوں لازمی صورتوں میں عدل، مساوات ایثار اور تعاون جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو ان خوبیوں کو اپنا لے وہ اسلام پر عامل ہے۔ مسلم گھرانوں میں پیدا ہو کر ان اصولوں سے انحراف اور روگردانی کرنے ننگِ خلائق ہوتا ہے۔ مسلمانوں پر تعلیم فرض ہونے کے علاوہ دوسری اجتماعی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ اس لئے تعلیم

کے ذریعے ان اصولوں کی تربیت اور پیروی ضروری ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ "خدا نے جاہلوں سے تعلیم حاصل کرنے کا عہد عالموں سے تعلیم دینے کے بعد لیا ہے۔ (نہج البلاغت صفحہ ۹۰۸)

اس لئے عالم پر تعلیم دینا فرض ہے۔ مگر عالم محض علم کا پتلا نہیں۔ اس کی بشریت میں علم پوشیدہ ہے اور مطالباتِ بشریت کی تکمیل پر اس کے علم کے جوہر کھلتے ہیں لیکن صاحبِ علم کو بشریت کا ہمہ تن غلام بھی نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ وہ اس علم کا امین نہیں جو عطیۂ الٰہی ہے۔

نظامِ تعلیم کا اہم جزو نصاب ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ عمر و فہم کے لحاظ سے دینی اور دنیوی تعلیم کو ترتیبی اور تدریجی طریقوں سے مقاصدِ اعلیٰ کے حصول کے لئے مرتب کیا جاتا ہے۔ اگر ہم نے یہ ارتباط پیدا کر لیا تو ہماری فلاح ممکن ہے۔ اور ہم صاحبِ علم اور صاحبِ کردار نوجوان پیدا کر سکیں گے۔ ورنہ ڈگری یافتہ اور سارٹیفکٹ یافتہ جم غفیر سے انتشار اور زوال ہی مقدر ہوگا۔ ہمیں مذہب سے حاصل کردہ علم کو سائنس کی زبان میں سمجھنا چاہیئے۔ ہمارا معیارِ تعلیم یہ ہو کہ مذہب کو سائنس کے حقائق سے دیکھیں اور سائنس کو مذہب سے ماخوذ اور مربوط متصور کریں۔

موجودہ حکومت نے ابتدائی دور میں نئی تعلیمی پالیسی کے گیارہ مقاصد بیان کئے تھے جن میں معاشرتی اور ثقافتی استحکام کا تذکرہ ہے۔ ان کی تکمیل کے لئے مذہبی اقدار بطور اساس ضروری ہیں۔ تاکہ حقائق کی تلاش شخصیت کی تکمیل بطریقِ احسن ہو سکے۔ تعلیمی اساس میں دینی ترغیبات لازمی ہیں۔ اس سے ثقافت پروان چڑھتی ہے مگر ثقافت کے تحفظ کے لئے اقتصادی خوشحالی بھی لابدی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمان اگر اسلام کو صحیح معنوں میں ضابطۂ حیات بنا کر عمل کرتے تو کسی "ازم" کی ضرورت نہ ہوتی۔ کیونکہ یہ خود ترقی پذیر اقتصادی نظام کا منبع ہے۔ مگر مسلمانوں کے غلط رویے اور جدید مشینی عہد کی مادی ترقیات کے پیچیدہ نظام نے چند "ازم" کو جنم دیدیا۔ جدید سائنسی ترقی میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ غیر مسلم اقوام نے اسلام ہی نہیں بلکہ ہر منبع سے فراست لے کر صنعتی نظام اور اس سے متعلق مختلف نظریات مرتب کئے۔ دولت کی افراط اور مشینی طاقت نے اعلیٰ اقوام کو پیچھے ہی نہیں چھوڑا بلکہ ان کے مذاہب کو بھی چیلنج کر دیا۔ صنعت کے کرشمے اور مشین کا زور الہامی طاقت کی تجسیم ہو کر سامنے آ گئے۔ پسماندوں کی ذہنی اقتصادی محکومی نے اس غیر متجانس مگر درخشندہ نظامِ حیات کو قبول کر لیا اور ہمارے بہترین دماغوں کی ترتیب بھی اسی نظام کے تحت ہونے لگی۔ سائنس کے موجدوں نے جو معاشرہ بنایا۔ اس کی پشت پناہی کے لئے ایسا ادب اور فلسفہ پیدا کیا جو ان کے سائنسی نظریات کی تبلیغ اور تحفظ میں سازگار ہوا۔ غرض کہ ہم اسی غیر متجانس اور درخشندہ سائنس، فلسفہ اور ادب کی پیداوار ہیں۔ اس پس منظر میں ہماری ذہنی وفاداریاں منقسم ہیں۔ ان کی تسکین کے لئے ہمیں مذہب کے ساتھ ساتھ اقتصادی نظام کے مروجہ فلسفہ کو اپنا کر آگے

بڑھنے میں زیادہ لیبا دہیش نہ کرنا چاہئے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ فلسفۂ تعلیم کی پوری وضاحت کی جائے۔ توقع کی جاتی ہے کہ حکومت جلد ہی مفصل تعلیمی پالیسی قوم کے سامنے پیش کر دے گی۔

سوشلزم کی مختلف تعریفیں ہیں لیکن سائنسی سوشلزم کو عموماً کمیونزم یعنی اشتراکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ورنہ سوشلزم جو اشتمالیت کہلاتا ہے اپنے طریقۂ کار میں ہر ملک میں ایک جدا انداز لئے ہوئے ہے۔ فی زمانہ یہ لفظ عام ہے اور مختلف ملکوں میں اس کا مقامی ضرورتوں اور جغرافیائی حالات کے تحت مفہوم بھی بدل گیا ہے۔ البتہ یہ سائنسی سوشلزم کا خوشہ چیں ہے۔ اس لئے سوشلزم کو سمجھنے کے لئے ہمیں سائنسی سوشلزم کے فلسفہ یا تعلیم سے واقفیت ضروری ہے۔ جو مادی نظریات پر مبنی ہے۔ اور اس کا معاشرہ اپنے سیاسی نظام کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کی نمایاں باتیں یہ ہیں

(۱) دنیا مادی ہے۔ روح کوئی جدا شے نہیں۔ انسان بذات خود مادہ ہے جو روبہ تبدیلی رہتا ہے۔ اور قوانینِ قدرت انسان اور مادہ کی تبدیلی کے ذمہ دار ہیں۔

(۲) ریاست دراصل معاشرے کی نمائندہ ہے اور اس کی حیثیت فرد سے بلند اور اعلیٰ ہے۔ ریاست اور معاشرہ نیکیوں کے ذمہ دار ہیں۔ اخلاق کا دارومدار افادہ پر ہے۔ اس میں کوئی خارجی یا تجریدی اقدار کارفرما نہیں ہوتیں۔ یہ بھی تبدیلی کا پابند ہے۔ انسان سب برابر ہیں اس لئے معاشرہ کو غیر طبقاتی ہونا چاہئے۔ ریاست کے تمام اقدام مشترکہ بہبود کے لئے ہونے چاہئیں۔ اور امداد باہمی کے اصول کارفرما ہوں تاکہ مقابلہ کا دخل نہ ہو۔ معاشرہ دولت کی پیداوار کی بڑی مشین ہے۔ ذاتی ملکیت کا ہونا برا ہے۔ دولت معاشرہ کی ملکیت ہے۔ انفرادی پیداوار کو اجتماعی پیداوار سے بدل دینا چاہئے۔

اشتراکی معاشرے میں فرد کی کوئی حیثیت نہیں اس کو آزادیٔ رائے کا حق نہیں۔ ریاست کا فیصلہ سب کے لئے قابلِ قبول ہوتا ہے۔ ریاست کے اصولوں کے تحت عوام کو اپنی مشترکہ بہبود کے لئے کوشاں ہونا پڑتا ہے۔ انفرادی حقوق بے معنی ہیں۔ افراد کی ریاستی وفاداری غیر مشتبہ ہونی چاہئے۔ ریاست ہی تعلیمی مقاصد متعین کرتی ہے۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

(الف) تعلیم عام اور لازمی جس کے ذریعہ اشتراکی نظریات کی اشاعت ہوتی ہے اس کا نتیجہ مشترک ثقافت مقصود ہوتا ہو۔ تاکہ طبقاتی تقسیم ختم ہو جائے (یہ نظریاتی طور پر خوش آئند ہے لیکن عملی طور پر خلافِ فطرت ہے۔)

(ب) تعلیم سب کے لئے یکساں ہے۔ رنگ و نسل اور خاندان کا امتیاز نہیں ہوتا۔ دماغی اور جسمانی کام کرنے والوں میں کوئی فرق نہیں برتا جاتا۔

(ج) صرف تعلیم ہی مفت نہیں ہوتی بلکہ طلباء کو لباس، خوراک اور جیب خرچ کی آسانیاں بھی دی جاتی ہیں۔

(د) تعلیم سے نظریات کی اشاعت ہوتی ہے تاکہ بچے

کے ہو ملہم میں اشتراکیت مرتسم ہو جائے۔ اس مقصد کے
حصول کے لئے بچے کو اسکولی عمر سے قبل بھی والدین کے
ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔

(۴) پوری تعلیم ریاست کے زیر نگرانی ہوتی ہے۔
جس سے مشترکہ ثقافت اور باہمی ارتباط پیدا ہوتا ہو۔
ریاست کے خلاف تمام خیالات دبائے جاتے ہیں۔

(۵) اشتراکی نظام تعلیم میں مذہب کی کوئی
گنجائش نہیں۔ اخلاق کی تجریدی اقدار ایمان سے بے نیاز
ہوتی ہیں۔ تعلیم کی اساس افادی اور معاشی ہوتی ہے۔
ہر فعل کے عملی افادہ پر نظر رہتی ہے تعلیم کی اقتصادی
اساس مادی پیداوار اور معاشرہ کی کلیت سے وابستہ
ہوتی ہے۔ فرد در اصل معاشرہ کی زندگی میں ضم ہوتا ہے۔
اس لئے اسکولوں میں لکھنا پڑھنا اور محنت کرنا دونوں
سکھائے جاتے ہیں۔

(۶) کریکولم سخت گیر ہوتا ہے جو ریاست مرتب
کرتی ہے اور اس سے متعلق کتابیں بھی اسی نقطۂ نظر
سے لکھی جاتی ہیں۔
معلم اور متعلم دونوں کو آزادی نہیں ہوتی۔
تعلیم سے متعلق تمام احکامات اوپر سے جاری ہوتے ہیں۔
اشتراکی تعلیم سے اسکول اور معاشرے میں
سیاسی نظریات کی تعلیم و تربیت مقصود ہوتی ہے۔ جس
کے لئے نظم و ضبط ضروری ہے۔ اس لئے طاقت کے استعمال
سے بھی گریز نہیں کیا جاتا اور معاشرے کی تطہیر کا عمل سیاسی
اغراض کے لئے جاری و ساری رہتا ہے۔ ان تمام سختیوں
اور خامیوں کے باوجود اس نظام تعلیم کی کچھ خوبیاں بھی ہیں مثلاً

۱۔ غیر طبقاتی معاشرے کے تصور سے سماجی انصاف
پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ دولت کی مساویانہ تقسیم افراد کو خوش اور مطمئن
کر سکتی ہے۔

۳۔ مفت اور لازمی تعلیم سے معاشرتی ربط مبوط
ہو جاتا ہے۔ اور باہمی میل جول میں اضافہ ہوتا ہے۔

۴۔ تعلیمی، صنعتی، تجارتی اور دوسرے سماجی اداروں
میں امداد باہمی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ جس سے تعلیم اور زندگی
میں ربط پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح تعلیم حقیقی اور کارآمد بن جاتی ہے۔

۵۔ تعلیم محض دماغی کام سے عبارت نہیں ہوتی بلکہ وہ
دستکاری اور اس جیسے دوسرے شعبوں کو بھی حصر کر لیتی ہے۔
جن سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور دوران تعلیم مختلف
طلباء کے مختلف رجحانات اور باہمی میل سے ان کی ہمہ جہت
شخصیت تشکیل ہوتی ہے اور تعلیم کا عملی پہلو طلباء کی
آئندہ زندگی میں معاون ہوتا ہے۔ ان خوبیوں کے
باوجود اس باضابطہ اور ریاست کے منظور کردہ نظام تعلیم
میں چند خامیاں بھی ہیں۔ مثلاً

(۱) اخلاق اور مذہب سے بے نیازی فرد کی تعلیم کو نامکمل
رکھتی ہے۔ انسانی فطرت کے مادی اور روحانی دو پہلو
ہیں جن کی نگہداشت ضروری ہے۔ انسان دوسرے جانوروں
اور پودوں کے مقابلے میں یقیناً اعلیٰ درجہ رکھتا ہے؟

(۲) اشتراکی نظام تعلیم شخصیت کو کچل دیتا ہے۔
مساوات کے نام سے اس پر مخصوص سیاسی معیار مسلط
کر دیا جاتا ہے۔ اور ذہین طالب علم کے لئے ممکن نہیں کہ
وہ اپنی صلاحیت کے مطابق معاشرہ کی خدمت کر سکے۔

جبکہ اس دنیا میں حقیقی بزرگی اور اعلیٰ نفاست انفرادی
کوشش سے پیدا ہوتی ہے۔ اوسط صلاحیت کا انسان کوئی
تحقیق یا دریافت نہیں کرسکتا۔ اور نہ اس سے معاشرہ کی
سچی بھلائی کا کوئی نمایاں کام ہوسکتا ہے۔

(۳) بیرونی دباؤ سے داخلی تضاد پیدا ہوتا ہے۔
انسانی روح مردہ ہوجاتی ہے۔ اور سیاسی ترجیحات سے
شخصیت زخم خوردہ اور زخم پذیر ہوجاتی ہے جس کا مجموعی
نتیجہ دوسری قوموں سے بیزاری ہوتا ہے۔ اور اس طرح
دہشت گردی اور جارحیت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ اور
عالمی پیمانے پر جنگ اور اس سے متعلقہ مذموم نتائج
کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔

(۴) زندگی کا محض مادی نظریہ انسانی زندگی
کے توازن اور اس کی قدروں کو منتشر کردیتا ہے۔ انسان
بالکل خود غرض اور صاحب مقصد ہوجاتا ہے جبکہ درحقیقت
وہ صرف مادی آسودگی کے لئے نہیں جیتا۔ بلکہ وہ ہمدردی اور
محبت کا بھی خواہاں ہے جو اس گھٹے گھٹے ماحول میں ممکن
نہیں۔ انسان کا شرف اس کے صاحب عقل ہونے میں ہے۔
وہ اس کے استعمال سے اعلیٰ چیزیں حاصل کرنے کا
خواہشمند ہوتا ہے۔ جو ابدی ہوتی ہیں۔ یہ افادہ صرف
اسلام کی صحیح تعلیم اور اس پر اسوۂ حسنہ کی روشنی میں
عمل سے حاصل ہوسکتا ہے۔

اشتراکی تعلیمی نظریات کے فوائد اور نقصان
مختصراً طور پر تو یہ ہیں۔ لیکن ہم اشتراکیت کے بجائے
سوشلزم یا اشتمالیت کو اپنا موضوع بنائے ہوئے
ہیں۔ اس لئے ہمیں سوشلزم کی تعریف اور دائرۂ عمل
پر غور کرنا ہے۔ جنوبی مشرقی ایشیا میں حکومتوں کا سیاسی
عقیدہ سوشلزم ہے جو سائنسی اشتراکیت کی ایک مقامی
بے پالک صورت ہے۔ یہ عقیدہ ہندوستان، سیلون، برما،
اور انڈونیشیا میں خاصا قدیم ہے۔ لیکن اب جدید پاکستان
بھی اسی کے زمرہ میں آگیا ہے۔ حکومتوں کے علاوہ اکثر سیاسی
پارٹیوں، کاروباری جماعتوں میں بھی اس کا چرچا ہے۔ اور
وہ خود کو سوشلسٹ کہتے ہیں۔ وہ سوشلزم کے اقتصادی
نظام کے مدّاح ہیں۔ سوشلزم کا نعرہ عام ہے۔ مگر آج تک
اس کی تعریف کسی ملک میں متعین نہیں ہوسکی۔ اس کے معنی
ہر ملک میں سیاسی مطالبات کے تحت ہر زمانہ میں بدلتے
رہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ابتداً سوشلزم سے
مراد اشتراکیت تھی جس کے معنی و مفہوم غیر متعین تھے۔ اور
اس میں داخلی تضاد بھی موجود تھا۔ چنانچہ پسماندہ ملکوں
کے باشندوں نے سوشلزم کو مقامی عقائد کی آمیزش
کے بعد قبول کیا تاکہ مذہبی عقائد پر اس کا کچھ اثر نہ ہو
اور اقتصادی فوائد حاصل ہوجائیں۔ پاکستان نے بھی کم و
بیش اسی صورت حال سے مفاہمت کی ہے۔ اور اس کا نام
اسلامی سوشلزم رکھا ہے۔ یعنی وہ سوشلزم کو اقتصادی
حدود کے اندر ماننے کو تیار ہے۔ اور اس مفاہمت کے قومی
مفادات پر اطلاق کے لئے چند مفید اقدام بھی کئے ہیں۔ برما
میں بودھ سوشلزم ہے ہندوستان میں سرودھیا
سوشلزم ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ سوشلزم بذات خود
تمام ملکوں کے عقائد میں پوشیدہ ہے۔ اس لئے مفاہمت کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بھارت، سیلون اور برما میں
سوشلزم کو وہاں کے مروجہ مذہبی عقائد سے براہ راست

ماخوذ کر لیا سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ اسلام میں سوشلزم
سے بہتر اقتصادی پہلو نمایاں ہے بلکہ تقسیم دولت
کا طریقہ کار، ارتکاز زر کی مخالفت، عدل اور اخوت
انسانی کا پیغام وغیرہ سوشلزم میں اسلام ہی کی
آواز بازگشت ہیں۔

اسلامی سوشلزم کو مساوات محمدیؐ بھی
بتایا جاتا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر یہ اصطلاح
جدید مہذب ذہن کی تشفی کے لئے اختراع کی گئی ہے
روایتی اسلام اور اس کے نام نہاد علمبرداروں کے
غیر اسلامی کردار نے معاشرہ کو تشکیک کا شکار بنا
دیا ہے۔ سوشلزم کا اقتصادی نظام جو اپنی افادیت
کے لئے پسندیدہ ہے سب کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس
لئے اسلامی سوشلزم زیادہ قابل طعن و تشنیع نہیں
بشرطیکہ اس کے دونوں پہلوؤں کو جو اسلام ہی
سے ماخوذ ہیں بطریق احسن برتا جائے۔ نام اور
نعرہ بازی سے وقتی مفاد حاصل ہو سکتا ہے مگر ایک
مثالی معاشرے کی تیاری کے لئے نظریات اور اس
کے فلسفے کو اپنا کر دوسروں کو ترغیب دینا ضروری
ہے۔ یہ ترغیب نوجوانان قوم کو تعلیم کے ذریعہ دی
جا سکتی ہے اس لئے ہمیں مقاصد تعلیم اور تعلیمی فلسفہ
عام کرنا ہوگا۔ اور روحانی اور مادی قدروں کو اس
طور سے مربوط کرنا ہوگا کہ دونوں سطح پر فائدہ ہو بلکہ
دونوں جہان کی فلاح نصیب ہو سکے۔

پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں میں ترقی یافتہ
اور متمول ممالک کے طریقہ تعلیم کو اپنا لینا کافی سمجھا
جاتا ہے جس کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ افراد کی ترقی
کا ایک معین راستہ ہے جس پر تمام قوموں کو چلنا ہے۔
اور دوسرا خیال یہ ہے کہ تعلیمی ترقی کے مختلف مراحل
ہیں جو کم و بیش اقتصادی ترقی کے مراحل سے مماثل
ہیں۔ چنانچہ بعض ماہرین تعلیم اور اقتصادیات تعلیمی
مسائل اور نفری قوت پر نہایت نیک مشورے دیتے
ہیں۔ یہ ماہرین تعلیمی سرگرمیوں کو اقتصادی پیداوار
سے مربوط کرتے ہیں۔ مگر انسان کی روحانی بالیدگی کو
جو مادی فلاح سے وابستہ ہے بالکل نظر انداز کر دیتے
ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں مادی آسائشیں روحانی
اطمینان کی بھی موجب ہوتی ہیں۔

اسلامی سوشلزم فی الواقعی فلسفہ سیاست
اور نظریۂ حیات ہے تو اس کے لحاظ سے ہمیں اپنی تعلیم
کے مقاصد متعین کرنے ہوں گے۔ کیونکہ مقصد تعلیم اور
فلسفۂ تعلیم ایک جان دو قالب ہوتے ہیں۔ جن کے حصول
کے لئے نصاب تعلیم، اساتذہ کی تربیت اور متعلقہ دوسرے
امور زیر بحث آتے ہیں۔ مقصد سے مراد دراصل وہ علت
غائی ہے جو عمل کی رہنما ہو، ترغیب کی موجب ہو۔ اور
اس میں پیش بینی کا کرشمہ بھی شامل ہو۔ انسان کا ہر فعل
اور اس کی زندگی کا ہر موڑ کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رکھتا
ہے۔ زندگی کی دوڑ کو بغیر کسی مقصد کے نہیں ہونا چاہئے اس لئے
تعلیم کا مقصد ایک مقصد حیات ہے۔ اور حکومت کا فرض
ہے کہ ناتجربہ کار بچوں کی حقیقی فطرت اور معاشرے
کے مشقت طلب مطالبات میں ہم آہنگی پیدا کرے۔
ایک معلم جو مقصد تعلیم سے ناآشنا ہے۔ گم کردہ راہ ہے

فی زمانہ ہمارے معاشرے میں بھی ایک موضوع ایسا
ہے کہ ہر شخص اس پر بے تکان اپنے خیالات کا اظہار
کرتا ہے۔ اس کو بحیثیت فرد اور سرپرست یہ حق حاصل
ضرور ہے۔ لیکن وہ یہ فراموش کر جاتا ہے کہ کہنے اور
کرنے میں بڑا فرق ہے۔ قول اور عمل دو مختلف چیزیں
ہیں۔ اصلیت یہ ہے کہ تعلیم بذات خود اخلاقی قدروں
کی حامل ہوتی ہے۔ اور وہ دانستہ طور پر طلباء کے
اعمال کو بدلتی رہتی ہے۔ تاکہ اس کا متعینہ مقصد حاصل
ہو۔ حصولِ مقصد یا تعلیم کا نتیجہ وہ شے ہے جس سے تمام
تعلیمی اقدامات کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ایسی
تعلیم جو اپنے مقاصد سے نابلد ہو ہرگز تعلیم نہیں۔ طلباء
اور اساتذہ کو مقاصدِ تعلیم سے شعوری طور پر واقف
ہونا ضروری ہے اگر ہم تعلیم کے مسلمہ مقاصد سامنے رکھیں
تو ہماری منزل متعین ہو کر آسان ہو جاتی ہے۔ ورنہ
بے مقصد تعلیم کی دوڑ دھوپ سے ایک انتشارِ ذہنی
پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار روزانہ کی زندگی کا مشغلہ
بن جاتا ہے۔ قوم کے نوجوان گم کردہ منزل ہو کر
تضاد کا شکار اور ذاتی منفعت کے غلام بن جاتے ہیں۔
اگر ہم تعلیم کے روایتی مقاصد ہی اپنے سامنے رکھیں تو
ان کا واضح تصور ہونا ضروری ہے۔ مگر محض امتحان
پاس کرنا تعلیم تو نہیں۔ مقاصدِ تعلیم کی مختلف نوعیتیں
اور متعدد مراحل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا
جدا مقصد ہے جو بالآخر فرد کی فلاح پر منتج ہوتا ہے۔
اور اسی طرح تعلیم کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً عام تعلیم
سائنسی تعلیم، صنعتی تعلیم، پیشہ ورانہ تعلیم، تجارتی تعلیم
وغیرہ وغیرہ اور ان کے اپنے اپنے مقاصد ہیں۔ مقاصد
کی تفصیل سے قبل ان کی اہمیت اور افادیت جاننا
ضروری ہے۔

بامقصد عمل انسانیت کا مطالبہ ہے۔
اس مطالبہ کو منصوبہ بندی کے تحت پورا
کیا جائے تو نظم و ضبط قائم ہو جاتا ہے۔
منصوبے کے تمام پہلو معلم اور متعلم کو صاف
صاف معلوم ہونے چاہئیں۔ تاکہ وہ ان کے
حصول کے کوشاں ہوں۔ مقصد در اصل
عمل کی قوت کا نام ہے۔ ہم بے جان مشین
کی طرح مصروفِ کار نہیں رہ سکتے ہم مقاصد
کے تحت اقدام کرتے ہیں۔ کیونکہ ہماری
کارکردگی اس سے بامعنی ہوتی ہے اور
اس کی سمت کا صحیح تعین ہو جاتا ہے۔
صحیح مقاصد کی عدم موجودگی میں انتشار پیدا
ہوتا ہے۔

مقاصدِ تعلیم سے طریقۂ تعلیم کا تعین
ہوتا ہے۔ اور معلم حالات کا صحیح اندازہ لگانے
میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مقاصد کا غلط
تعین معاشرہ کے لئے ناسور ہے جس سے
پوری نسل جسمانی، ذہنی اور اخلاقی طور پر
کمزور ہو جاتی ہے کیونکہ مقصدِ تعلیم بالواسطہ
حیات کے مقاصد سے منسلک ہے اور مقصدِ
حیات فلسفۂ حیات کا ممنون ہے جو ابدی
قدروں کا بھی حامل ہوتا ہے۔ اور زمانے

کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔ اس لئے فلسفہ
حیات اور مقاصدِ تعلیم کی آئینہ داری تعلیم
کا کام ہے۔

ہم نے انگلستان پبلک اسکولوں کا
بڑا شہرہ سُنا۔ ان کے تعلیم یافتہ حضرات نے
ہم پر حکمرانی کی اور ہماری سیاسی رہنمائی
بھی کی۔ ہم نے ان اسکولوں کی نقل میں بہت
سے ادارے قائم کئے۔ یہ محض نقالی کی حد تک
مستحسن تھا مگر مقاصدِ تعلیم کے لحاظ سے ایک
غلط اقدام تھا۔ کیونکہ پبلک اسکولوں کی تعلیم
اور تربیت کے مقاصد میں نوآبادیاتی نظام کو
چلانے کے افراد کی تربیت مقصود تھی۔ حکمرانی
کے لئے سخت کام، برداشت، پابندیٔ وقت
حکمت عملی اور ظاہری رکھ رکھاؤ ایسے گر تھے
جن سے مرعوب ہوکر کمزور محکوم خود کو حاکم
کے حوالے کر دیتے اور مخالفت اور بغاوت
کا خیال بھی پیدا نہ ہوتا۔ ان اداروں کے
جانشین ادارے ابھی تک ہمارے ملک میں
موجود ہیں جن کا ماحول اور ان کی قدیم
روایات ہنوز کارگاہِ حیات میں ترقی اور
سر بلندی کی دعویدار ہیں۔ اس مخصوص ذہنیت
کو جو ان اداروں کی تربیت سے پیدا ہوتی ہے۔
ان کا نشانِ افتخار سمجھا جاتا ہے۔ ــــــ

اشتراکی ممالک میں بھی ریاست کا مفادِ اعلیٰ
قدر ہے جس میں فرد کی فلاح بھی پوشیدہ ہے
اس لئے اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت کا قیام مقصدِ
تعلیم ہے۔ اس طرح افراد پر ریاست کا پورا
تسلط ہے اور تعلیم اس مقصد کی معین ہے
ریاست اپنے شہریوں کو انتظامی اور صنعتی
ضرورتوں کے لئے تعلیم دیتی ہے جس سے
مجموعی مفاد متوقع ہوتا ہے۔ انفرادی فائدہ
پیشِ نظر نہیں۔

انگلینڈ کے گرامر اسکول، ڈنمارک کے
ہائی اسکول اور امریکن ہائی اسکولوں کا
مقصد جمہوریت پسند شہریوں کی تربیت ہوتا
ہے۔ ہمارے یہاں بھی کچھ مخصوص ادارے
مخصوص مقاصد کے لئے تھے۔ جن میں داخلہ
محض صلاحیت کی بنا پر کم ہوتا تھا۔ اب
صورتِ حال بدل رہی ہے۔ صلاحیت بغیر
داخلہ آسان نہ ہوگا۔ صلاحیت ذہنی اور
کسبی دونوں خوبیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اگر
سازگار مواقع فراہم ہوں تو بہت سے
باصلاحیت طلبا پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور اگر
ناسازگار ماحول ہے تو دانشمند اور صاحبِ
فراست بھی نہیں اُبھر پاتے۔ اس لئے فلسفۂ
حیات کے ساتھ مقاصدِ تعلیم عام ہوں اور
ان کے حصول کے مواقع یکساں طور پر سب کی
پہنچ میں ہوں، تب کہیں صلاحیت کا صحیح
معیار قائم ہو سکتا ہے۔ ورنہ امتحان کے نمبروں
سے تو صلاحیت کا ایک گونہ علم ہوتا ہے۔

امتحان امیدوار کی صلاحیت کی پوری جانچ
نہیں اور مروجہ طریقۂ امتحان اور امتحان
دونوں وہ ضروری لعنت ہو کر رہ گئے ہیں۔

مقاصدِ تعلیم کی تکمیل کے لئے مضامین کا انتخاب
بھی ضروری ہے جس سے نظریۂ تعلیم کی اشاعت ہو سکے۔
بعض ماہرینِ تعلیم کا خیال ہے کہ کریکولم کی تیاری کے لئے
فلسفیوں اور روشن خیال دانشمندوں اور ماہرینِ تعلیم
کی ضرورت ہے۔ فلسفہ کے مختلف دبستان کریکولم کے متعلق
مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ جو انسانی فطرت کے پرستار
ہیں وہ طفلانہ حرکتوں میں بزرگوں کی دخل اندازی پسند
نہیں کرتے اور وہ بچوں کی فطرت اور مذاق کے مطابق
نصاب کا تعین چاہتے ہیں۔

عینیت کے علمبردار مضامین کی افادیت کو پیشِ نظر
رکھتے ہیں۔ "حرکت میں ہوتی ہے برکت زیادہ" ان کے
دبستان کا مرکزی خیال ہے۔ تحصیلِ علم کا سب سے چھوٹا
راستہ عمل ہے۔ لہٰذا بچے کو مختلف طریقوں سے مختلف
کاموں میں لگا رہنا چاہیئے تاکہ وہ مختلف کام سیکھ سکے۔
اور ان کے ذریعے سے زبان، ریاضی اور سائنس کی
واقفیت ہو۔

تصوریت کے علمبردار کہتے ہیں کہ بچوں کو معاشرتی
علوم کی ضرورت ہے تاکہ تہذیب و ثقافت کا تسلسل
جاری ہے۔ لہٰذا درسی مضامین اس کے ترجمان ہوں۔
قوم کا تجرباتی سرمایہ مستقل ہونا ضروری ہے۔ اس لئے
فنون اور علوم دونوں کی ضرورت ہے۔

عینیت پسندوں کا خیال ہے کہ حقائق کی تعلیم
ضروری ہے۔ وہ کتابی اور مکلف مضامین کے خلاف
ہیں۔ معاشرتی عینیت پسند انسانوں کے انفرادی اور
اجتماعی مطالعے کے خواہش مند ہیں۔ عینیت پسند
نصاب میں ایسے مضامین چاہتے ہیں جو دستکاری
بھی سکھاتے ہوں تاکہ آئندہ چل کر پیشے کے انتخاب
میں آسانی ہو۔

نظریات کے ان اختلافات سے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ ہر دبستانِ خیال کے لئے مختلف مضامین کی ضرورت
ہے۔ ان نظریات کو پیشِ نظر رکھ کر ہمیں ایسا نصابِ
تعلیم مرتب کرنا ہے جس میں ہمارے نظریۂ تعلیم کی اساس
مذہبی، ثقافتی، سائنسی اور اقتصادی مضامین پر مبنی
ہو۔ اسلامی سوشلزم، دینی ترغیبات، ثقافتی مطالبات
سائنسی اور صنعتی ضروریات کی تکمیل کا داعی ہو۔ اور
اس مقصد کے حصول کے لئے انسانی سرمایہ کاری کے
لئے کوشاں ہو۔ ورنہ ملکی ضرورتیں تعلیم کے ذریعہ پوری
نہیں ہو سکتیں۔ اس سائنسی دور میں تعلیم پر مطالبات
بڑھ گئے ہیں۔ اور یہ نہیں کہ سائنس داں انسان کہاں
جا کر ٹھہرے گا۔ انسانی سرمایہ کاری میں سائنس اور
صنعت کی تعلیم پر زور دینا اور اس کا عام کرنا سب
پہلے آتا ہے۔

مقاصدِ تعلیم میں ثقافت کا تحفظ اور ارتقاء
اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مقاصد کا خود متعین ہو
کیونکہ ثقافت کا تعلق تفکر اور انسان دوستی
ہے جو تعلیم کا مقصد اور ماحصل دونوں ہیں۔ ایسی
جو عمل سے عاری ہوں ثقافت سے بے تعلق ہوتی

ثقافت اور اس سے متعلقہ عوامل فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لئے اس کا مقصد فکری ارتقا بھی ہے جو تیس سال کی عمر تک جاری رہتا ہے۔ تعلیمی معاملات میں جامد تصورات سے بچنا بہت ضروری ہے۔ جامد تصورات سے مراد وہ افکار ہیں جو ذہن میں پیدا ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ ایسے تصورات تعلیمی مراکز کو بے جان اور تعلیم کو بیکار کر دیتے ہیں۔ ابتدا میں بعض ادارے اپنی کارکردگی کے لئے خاصہ نام حاصل کر لیتے ہیں لیکن آگے چل کر وہ جامد تصورات سے بوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی قدامت پر ناز کرنے لگتے ہیں اور پھر بھی بعض صورتوں میں معاشرے کے لئے مضر ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسے ماحول کے تعلیم یافتہ اشخاص سے غیر تعلیم یافتہ تجربہ کار لوگ زیادہ کارآمد اور مہذب ہوتے ہیں۔ فکری انقلاب وہ انقلاب ہے جو ان جامد تصورات کے خلاف پُر جوش احتجاج کرتا ہے۔ مگر آگے چل کر یہی انقلاب خود اپنے نظامِ تعلیم کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جامد ہو جاتا ہے۔ اس کو روکنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔

(۱) زیادہ مضامین نہ پڑھائے جائیں۔ (۲) جو کچھ پڑھایا جائے نہایت جامع انداز میں پڑھایا جائے جب زیادہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ تو ہر مضمون کو تفصیل سے نہیں پڑھایا جا سکتا۔ اور سرسری دروس نامربوط تصورات کو انفعالی طور پر اخذ کر لیتا ہے اخذ کردہ نتیجے حرکت اور زندگی سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ لہٰذا طلبا کے دماغ میں کم تصورات کو داخل کیا جائے۔ البتہ وہ اہم ہوں جن کو وہ اپنی زندگی میں برت سکیں۔ اور ان پر عمل کر کے انھیں تحقیق اور دریافت کی خوشی نصیب ہو۔

تعلیم افادی ہونی چاہیئے کیونکہ فہم و ادراک بھی افادی ہیں۔ فہم سے مراد دراصل حال کا ادراک ہے۔ ماضی کی معلومات ہماری اتنی معاون ہوں کہ ہم ان کی مدد سے زندگی گزار سکیں۔ زندگی سے مراد ادراکات، احساسات، امید، ارمان اور دوسرے ذہنی اعمال ہیں جو ایک فکر کو دوسری فکر سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔

نظریاتی خیالات نصاب تعلیم پر منطبق ہوتے چاہئیں کیونکہ ان کو زندہ رکھنا بہت ضروری ہے لیکن ایسے علم کو زندہ رکھنے کے لئے چند عناصر بہت اہم ہیں مثلاً استاد کی ذہانت اور پیشے سے لگاؤ۔ طلبا کی اپنی ذہنی اُفتاد، تعلیمی مرکز کا ماحول وغیرہ ان عناصر سے باہر جو کچھ ہوگا۔ وہ غیر معیاری ہو سکتا ہے۔ اگر ان عناصر کی عدم موجودگی میں تعلیم برقرار رکھ کر طلبا کی معلومات کا امتحان ہوگا تو اس سے محض طلبا کی کاہلی کا علم ہو سکتا ہے۔ ثقافت کو غیر معیاری تعلیم اور بے علمی سے نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے تعلیم کا مرکزی فرض یہ ہے کہ وہ تغیر و تبدلہ عناصر کی ہم آہنگی کی تکمیل کرے۔ کیونکہ یہاں انسانی دماغوں سے نمٹنا ہے۔ نظریات کا استعمال بھی اس طرح ہو کہ اس سے دور اندیشی پیدا ہو۔ علم کے جدید ارتقا نے پیش بینی اور مہارت کی صلاحیت پیدا کرنے کے زیادہ امکانات پیدا کر دئے ہیں۔

مذہبی تعلیم سے فرض شناسی، احترام اور عقیدت پیدا ہوتی ہے فرض شناسی زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ نظم و ضبط اسی سے متعلق ہے۔ واقعات کی رفتار پر بالقوہ اقتدار اس کی تکمیل کر دیتا ہے۔ مقاصدِ تعلیم میں مذہبی*

* اساس ثقافتی اساس اور معاشیاتی اساس تینوں کو ملا کر ایک ترقی پذیر نظام کی ضرورت ہے جو ملّی اور ملکی ضرورتوں کی کفالت کا اپنے طور پر امین ہو۔ اور مساواتِ محمدی کا مثالی [illegible]

ایک شعلۂ مستعجل
ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

از جناب ثناء الحق صدیقی ایم اے

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس اور دوسری دیوانِ غالب"

بجنوری مرحوم کے اس فقرہ کو کلام غالب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے بار بار دہرایا۔ اور ہر بار ایک نئی لذت محسوس کی۔ تاہم مرحوم کے اس خیال سے بعض لوگوں نے اتفاق کیا اور بعض نے اختلاف جن لوگوں نے اتفاق کیا ان کا کہنا ہے کہ "اس فقرہ میں کافی وزن ہے اور اس سے مرحوم کی ژرف نگاہی کا ثبوت ملتا ہے"۔ جنھوں نے اختلاف کیا ان کا دعویٰ ہے کہ "یہ قطعاً ایک جذباتی سی بات ہے اور جو نقاد اس فقرہ سے اپنی تنقید کی ابتدا کرتا ہے وہ کبھی قارئین کے دل میں اعتماد پیدا نہیں کر سکتا"۔

غرض یہ دو متضاد آراء ہیں جو شروع سے بجنوری مرحوم کے اس فقرے کے بارے میں پیش کی جاتی رہیں۔ لیکن اس اختلاف رائے کے باوجود اس فقرہ کی تازگی اور ندرت آج بھی باقی ہے اور اس وقت بھی جب کبھی یہ فقرہ دہرایا جاتا ہے تو کہنے والے کے کام و دہن اس سے لذت یاب ہوتے ہیں اور سننے والے کی قوت سامعہ وجد میں آجاتی ہے۔ اس تاثیر کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس ہستی نے الفاظ کا یہ حسین مجموعہ شیدائیانِ اردو کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس کی رائے میں کس قدر خلوص تھا۔

نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ کرۂ ارض اپنے مدار پر تقریباً ساٹھ چکر پورے کر چکا ہے، سورج اور چاند نے اس خاکی سطح پر بے شمار مناظر بدلتے ہوئے دیکھے ہیں۔ انسان نے تمدن کی بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔ لیکن دیوانِ غالب کو ہندوستان کی الہامی کتاب بتانے والی ذات آج بھی ہمارے ذہنوں اور دلوں پر اپنی یاد اور محبت کے حسین نقوش قائم کئے ہوئے ہے۔ اب بھی جب ہم دیوانِ غالب کا مطالعہ کرتے ہیں تو باغِ خلد میں بسنے والی وہ ذات ہماری یادوں کی دنیا میں آکر ہمیں اس گلستانِ بے خزاں کے دلفریب نظاروں سے لطف اندوز ہونے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اور ہمارے ذہنوں کو مسحور اور قلوب کو سرشار کر دیتی ہے۔ بجنوری مرحوم ایک شعلۂ مستعجل اور ایک شہابِ ثاقب ہوئے۔ انھوں نے اس عالمِ رنگ و بو میں چند

لمحے کے لئے اپنی چمک دکھائی اور پھر پردۂ فنا میں مستور ہو گئے۔ اُن کو اس کرۂ خاکی سے تعلق منقطع کئے ہوئے ایک طویل عرصہ ہو چکا ہے۔ لیکن جن آنکھوں نے ان کی چمک دمک کا نظارہ کیا تھا۔ جن لگا ہوں نے ان کی رنگینی و شادابی کی محض ایک جھلک دیکھی تھی وہ ہنوز اُس کیف و سرور سے بیگانہ نہیں جو اُس عارضی منظر نے ان پر طاری کیا تھا۔ طبیعتیں جو کیفیت ابھی تک محسوس کر رہی ہیں اس کے پیشِ نظر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بجنوری مرحوم ہنوز زندہ ہیں اور مدت مدید تک زندہ رہیں گے۔

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

عبدالرحمٰن بجنوری بھارت کے صوبے اُتر پردیش کے ایک قصبہ سیوہارہ (ضلع بجنور) کے رہنے والے تھے۔ وہاں وہ ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ نسلاً شیخ صدیقی اور قصبہ کے ایک ذی وجاہت خاندان کے فرد تھے۔ اُن کے والد کا اسم گرامی نورالاسلام تھا۔ اور وہ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اکثر اوقات وطن سے باہر رہتے تھے۔ اسی لئے بجنوری مرحوم کا بچپن پردیس میں گزرا اور ان کی ابتدائی تعلیم پنجاب اور بلوچستان میں ہوئی۔ پرانے شریف گھرانوں کی طرح ان کی تعلیم کا آغاز بھی قرآن کریم سے ہوا۔ اس سے فراغت کے بعد انھوں نے اسکول میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۲ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول کوئٹہ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان کے والدین انتہائی دیندار اور پرانے طور طریقوں کے دلدادہ ہونے کے باوجود تعلیم کے بڑے حامی تھے۔ لہٰذا انہوں نے میٹرک کے بعد اپنے ہونہار فرزند کو اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں انھوں نے ایم اے او کالج میں داخل ہو کر اپنی تعلیم کی طرف پوری توجہ صرف کر کے ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے کا امتحان جو اُس وقت الٰہ آباد یونیورسٹی لیتی تھی پاس کر لیا۔ شروع ہی سے انھیں علوم مشرقی سے خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ بی۔ اے کی ڈگری لینے تک انھوں نے اردو، فارسی میں غیر معمولی قابلیت حاصل کر لی۔ وہ علی گڑھ کے قیام کے دوران مولانا خلیل احمد اسرائیلی سنبھلی۔ مولانا شبلی نعمانی۔ مولانا الطاف حسین حالی اور نواب محسن الملک سے بے حد متاثر تھے۔ ان ہی بزرگوں کے فیض سے اُنھیں اپنی علمی قابلیت کو بڑھانے اور ادبی ذوق کو ابھارنے کا کافی موقع ملا۔ نواب محسن الملک سے اُس وقت جو نیازمندی کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ انھوں نے آئندہ چل کر گہرا رنگ اختیار کر لیا۔

بی۔ اے پاس کرنے کے بعد بجنوری مرحوم نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ ساتھ ہی کالج یونین اور بمبوق کلب سے بھی خصوصی تعلق پیدا کیا۔ یونین میں تقریروں کے ذریعہ اظہارِ خیال کی مشق بڑھی اور بمبوق کلب میں ان کے ذوقِ شعری کو جلا ملی۔ اس مشق و مزاولت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے اپنی عمدہ تقریر پر کیمبرج اسپیکنگ پرائز حاصل کیا۔ اور اسی سال وہ یونین کلب کے نائب صدر مقرر ہوئے۔

لیکن ان مشاغل اور سرگرمیوں کی وجہ سے تعلیم کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایل ایل بی
کے سالِ اول میں پہلی بار ناکام رہے ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی سالِ اول اور ۱۹۰۹ء میں سالِ دوم کے امتحانات
پاس کئے۔

اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے۔ پہلے انگلستان میں قیام رہا۔ اور وہاں لنکن ان کورٹ سے
بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ بعدۂ جرمنی گئے اور فرائی برگ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے داخلہ لیا۔
ایک جرمن طالب علم کو اردو زبان سکھانے کے معاوضہ میں اس سے جرمن زبان سیکھی۔ اور اس میں اتنی مشق بہم پہنچائی
کہ اپنا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ "مسلم فقہ" پر اسی زبان میں تیار کر کے یونیورسٹی کو پیش کیا اور ۱۹۱۳ء میں ڈاکٹریٹ
کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال وہ علوم کے زیور سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ ہو کر یورپ سے اپنے
وطن واپس آگئے۔

شروع میں ایک، دو سال مراد آباد میں بیرسٹری کی مگر اس طرف طبیعت مائل نہیں ہوئی اس لئے جلد ہی
اس پیشہ کو خیر باد کہہ دیا اور ۱۹۱۶ء میں بھوپال چلے گئے۔ وہاں اس وقت سلطان جہاں بیگم والیۂ ریاست تھیں۔
انھیں مذہب اور تعلیم دونوں سے والہانہ عشق تھا۔ اور وہ علماء و فضلا کی بیحد قدر کرتی تھیں۔ انہوں نے بجنوری مرحوم
کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ریاست کا ناظم تعلیمات بنا دیا۔ وہ اس ذمہ داری کو محض دو ڈھائی سال پورا
کر سکے۔ تاہم اس قلیل مدت میں ہی بڑے بڑے پروگرام بنے۔ تعلیم میں اصلاح کی اسکیمیں تیار ہوئیں اسی
کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ ہند کی تعلیم کی طرف بھی توجہ رہی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کا منصوبہ، جامعہ عثمانیہ
کے قیام اور اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجاویز بھی اسی زمانہ میں ان کی مشغولیتوں اور توجہات کا مرکز و محور تھیں۔
جب ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کو مسلم یونیورسٹی کا درجہ دیئے جانے کی تجویز مسلمان زعماء کے سامنے آئی تو نواب
محسن الملک نے یونیورسٹی کے نظام کا خاکہ تیار کرنے کا کام بجنوری مرحوم کو سپرد کیا۔ جس کو انھوں نے نہایت
قابلیت سے انجام دیا۔ بعد میں نواب وقار الملک سے تبادلۂ خیالات ہوتا رہا اور جب کافی بحث و تمحیص کے
بعد ان میں اتفاق رائے ہو گیا تو بجنوری مرحوم کے تیار کردہ خاکہ کو ایک پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا گیا۔
اگرچہ حکومت نے بعض بنیادی تجاویز کو مسترد کر دیا۔ لیکن مسلم مدبرین اور سربراہوں نے اس کو کافی سراہا۔

۱۹۱۸ء/۱۳۳۷ھ کی پہلی عالمگیر جنگ اختتام کو پہنچی۔ اسی سال دنیا کے مختلف ملکوں میں انفلوئنزا کی وبا
پھوٹ پڑی۔ برصغیر میں اس نے کافی شدت اختیار کر لی۔ کوئی شہر، قصبہ یا گاؤں ایسا نہیں تھا جو اس کی زد
سے بچا ہو۔ حیدر آباد دکن میں بجنوری مرحوم کی ہمشیرہ وبا کی لپیٹ میں آگئیں۔ اطلاع ملتے ہی وہ حیدر آباد
چلے گئے۔ بہن جاں بر نہ ہو سکیں۔ ان کا غم دل پر لئے ہوئے بھوپال واپس آئے۔ چند روز نہیں گزرے تھے

کہ وہ خود اور اُن کی اہلیہ جمیلہ خاتون اس موذی مرض میں مبتلا ہوکر آگے پیچھے رخصت ہوگئے۔ پہلے بیوی نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ چار دن بعد شوہر بھی سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔ نہ نواب حمید اللہ خاں مرحوم کی کوششیں انھیں موت کے بے رحم ہاتھوں سے چھڑا سکیں اور نہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کا علاج معالجہ کچھ کام آسکا۔ اللہ کا کلام کیسا سچا ہے

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

بجنوری مرحوم کی موت قوم و ملک کا ایک عظیم نقصان سمجھی گئی۔ تمام علمی اور ادبی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی والیۂ بھوپال سلطان جہاں بیگم سے لگا کر ریاست کے ایک ادنیٰ فرد تک کو دلی صدمہ ہوا۔ جنازے میں بے شمار آدمیوں نے شرکت کی۔ اور اُن کے جسدِ خاکی کو بھوپال اور بیراگڈھ کے درمیان لال گھاٹی کے مقام پر آسودۂ خاک کر دیا گیا۔ بعد میں قبر کے گرد پختہ چبوترہ اور تقریباً ایک گز اونچی چہار دیواری تعمیر کی گئی اور بالینِ مزار پر کتبہ نصب کیا گیا جس پر دونوں جانب قطعات تاریخ وفات کندہ تھے۔ لیکن فروری ۱۹۴۲ء میں راقم الحروف نے وہاں پہنچ کر فاتحہ کے پھول چڑھائے تو یہ دیکھ کر بے حد ملال ہوا کہ چبوترہ اور چہار دیواری شکستہ حالت میں ہیں، اور لوحِ مزار بھی ایک طرف کو جھک گئی ہے۔

مرحوم کی تاریخ وفات کے معلوم کتنے مادے نکالے گئے ہوں گے۔ ان میں سے صرف دو کا پتہ چل سکا ہے جو مندرجۂ ذیل قطعات میں شامل اور لوحِ مزار پر کندہ ہیں۔

جنوبی رُخ

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

ہیہات جہاں میں کیا قیامت آئی　　　ماتم ہے بپا
رحمٰن کی پیاری صورت آنکھوں سے چھپی　　　اندھیر ہوا
یوں کہہ دو سہیل مصرعِ سالِ وفات　　　تم کھینچ کے آہ
عبد الرحمٰن ڈاکٹر بجنوری　　　اے آہ کہا

۱۳۳۷ھ

شمالی رُخ

ھو الغفور

اقوال جس کے زریں منقوش ہیں دلوں پر　　　دردِ زبانِ عالم ہے علم کا فسانہ
جس کی حرم تکلّم گوہر فشاں زباں تھی　　　کانوں میں گونجتی ہے تقریر عالمانہ

گم لعلِ بے بہا ہے بجنور کا یہاں پہ	آغوشِ قبر میں ہے اپنا دُرِ یگانہ
خوابِ گراں سے غافل سویا پڑا ہوا ہے	وہ کون؟ عبد رحمٰن علامۂ زمانہ
سالِ وفات لکھا یہ بیدلِ حزیں نے	اب علم کا ہے پنہاں اس گور میں خزانہ

۱۳۳۷ھ

غمگین تحسین سیوہاروی

مولانا سید ہاشمی نے رسالہ اُردو میں مرحوم کی وفات پر یہ اشعار شائع کرائے تھے۔

صبح کی آمد نہ تھی اے دیدۂ ظلمت نصیب — وہ کسی فوق النظر تارے کی تھی پہلی کرن

اس فضائے پُر کدورت میں نہ تھا اس کا وطن

اب کہاں وہ نورِ شیریں ہاں مگر اس کی جھلک — ہو اگر باقی تو ہو شبنم کی باقی روشنی

یا سرِ شب کھلنے والی موتیا کی چاندنی

بجنوری مرحوم نہایت سیدھے سادے اور کم گو انسان تھے۔ انہوں نے علوم مغربی کو تکمیل منزل تک پہنچا دیا تھا۔ وہ کئی سال قلبِ یورپ میں رہ کر اور تہذیبِ مغربی کے مراکز میں گزار کر آ تھے لیکن مشرقیت نے ان کا ساتھ آخری وقت تک نہ چھوڑا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں خاص طور پر اعلیٰ صلاحیتیں عطا کر کے اس عالم آب و گل میں بھیجتی ہے۔ وہ نہایت ذہین اور طباع تھے ساتھ ساتھ ان کی خداداد ذہانت کے جوہر کھلتے گئے۔ ساتھ ہی علم کا شوق بڑھتا گیا۔ یوں تو تمام سے ان کو کچھ نہ کچھ لگاؤ تھا۔ لیکن ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ اور ان زبا ادب اور شاعری کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تکمیل تو ہ کے دوران قیام ہی میں کر لی تھی۔ یورپ میں رہ کر جرمن زبان سیکھی اور اس میں اس حد تک مہار حاصل کی کہ مسلم فقہ جیسے ادق مضمون پر اسی زبان میں کتاب لکھ ڈالی۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے۔ متعدد زبانوں سے کما حقہٗ واقفیت ہونے کے باوجود وہ عروسِ اُردو کے شیدائی تھے۔ چنانچہ ا کے آخری لمحہ تک اُن کا پورا زور اسی بات پر صرف ہوا کہ اُردو زبان کو ترقی دی جائے۔ اور قومی تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے۔

۱۹۱۷ء میں "اُردو زبان کی ترقی کے متعلق چند خیالات" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو اُن کی وفات کے بعد ۱۹۲۱ء میں رسالہ اُردو میں چھپا اور بعد میں یادگارِ بجنوری میں شامل کر اس مضمون میں انھوں نے کھل کر اُردو کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

دو کیا یہ بات کچھ قرینِ قیاس ہے کہ مشرقی آب و ہوا میں مغربی زبان کا درخت بارآور ہو سکتا ہے۔ زبان فاتح کی تلوار کا نام نہیں۔ فاتح اپنا سکہ اور خطبہ جاری کر سکتا ہے۔ لیکن اپنی زبان جاری نہیں کر سکتا مفتوح فاتح کا مذہب اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس کی زبان اختیار نہیں کر سکتا۔ زبان ملک و ملت کی حرکت کی صدا ہے۔ اور غیر زبان کو رواج دینے کی کوشش خواہ وہ اہلِ حکومت کی جانب سے ہو ایک فعلِ عبث ہے

"انگریزی سراب کے تعاقب میں آنکھیں بند کر کے دوڑنا قوم کی دائمی تشنہ کامی اور شوربختی کا موجب ہوگا۔ اور جب تک سرگردگانِ ملک اس غلط راہ کو جلد از جلد خیرباد کہہ کر صرف اردو کی ضمانت، حفاظت اور اشاعت میں مصروف نہ ہوں گے اُن کی تمام رہنمائی غلط اور تمام کوشش ملک و ملت کے حق میں مفید ہونے کے بجائے مضر بلکہ مہلک ثابت ہوگی۔"

ایک اور جگہ اردو کی حقیقت و اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"علم الانسان کی رو سے اُردو دنیا بھر کی موجودہ زبانوں میں اہم اور دلچسپ حیثیت رکھتی ہے۔ اردو کو ملکی حیثیت سے بھاشا اور سنسکرت سے۔ تواریخی اور سیاسی حیثیت سے فارسی۔ ترکی اور انگریزی سے اور مذہبی حیثیت سے عربی سے رابطہ ہے۔ زبان اردو کی تواریخ ممالک ہندوستان۔ ایران۔ عرب۔ روم اور فرنگ کے ساتھ زمانۂ موجودہ اور گذشتہ کی تاریخ سے متعلق ہے۔"

آج کل معیارِ تعلیم کے پست ہونے کے اسباب کا کھوج لگایا جا رہا ہے۔ بجنوری مرحوم نے اب سے تقریباً ساٹھ سال پہلے نہایت قطعیت کے ساتھ اس کا سبب غیر زبان میں تعلیم کو قرار دیا تھا کہتے ہیں۔

"جدید تعلیم گاہوں کی حالت قدیم تعلیم گاہوں سے زیادہ خراب ہے۔ تمام مدارس، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم غیر زبان میں ہوتی ہے۔ اُردو کی تعلیم پانچ سات ابتدائی جماعتوں کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تمام علوم کی تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہے۔ ریاضی، تواریخ، جغرافیہ، منطق، سائنس، فلسفہ غرض ہر مضمون کی تعلیم انگریزی کے توسل سے ہوتی ہے۔ جو قوم اپنی مادری زبان سے یوں غافل ہو وہ دنیا میں کیا فروغ پا سکتی ہے۔ جس ملک کے لوگ اپنی مادری زبان کو یوں پسِ پشت ڈال دیں اس کی خاک سے بھلا کوئی فرزانہ اٹھ سکتا ہے۔

"جو ملت اپنی زبان کو باعثِ ننگ اور دوسروں کی زبان کو مایۂ ناز خیال کرتی ہے اس میں کیا خودداری آسکتی ہے۔ جب تک طلبہ کو مادری زبان میں تعلیم نہ دی جائے تعلیم کسی طرح جزوِ حیات نہیں ہو سکتی اور تاوقتیکہ اُردو کو ذریعۂ تدریس نہ بنایا جائے۔ اگر ہمارے طلبہ میں سے ہر ایک کے سر میں ہزار دماغ ہوں تب بھی بیکار ہیں۔"

اردو زبان کی اہمیت کا احساس اور اس سے دلی لگاؤ ہی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اُردو اَدب کا سب سے زیادہ مطالعہ کیا تھا اور اس کی ہر صنف سے مکمل طور پر واقفیت بہم پہنچائی تھی۔ نثر اور نظم دونوں کے تمام اچھے نمونے اُن کے زیرِ مطالعہ آئے اور اُن کے اثر سے انھوں نے خود بھی ایک لطیف ا منفرد طرز اختیار کیا۔ اول تو ان کی زندگی ہی نے وفا نہ کی پھر زمانۂ طالب علمی میں درسیات کی جانب رہی اور اس سے فراغت کے بعد فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے احساس نے اتنی فرصت نہ دی کہ وہ ا مشاغل اور تصنیف و تالیف کی جانب زیادہ توجہ دیتے اور کوئی بھاری بھرکم یادگار اپنے پیچھے چھوڑ جا چنانچہ ان کی نگارشات کمیت کے اعتبار سے زیادہ اہم نہیں۔ لیکن مغز و مواد کے لحاظ سے اتنی ہی وقیع ہیں۔

اس وقت تک ان کی جو تحریریں منظرِ عام پر آئی ہیں ان میں سب سے گرانقدر ان کا وہ مقا جو انہوں نے دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ کے لئے لکھا تھا اور جو "محاسنِ کلام غالب" کے نام سے کئی بار دیا غالب سے الگ بھی چھپ چکا ہے۔ یہ تحریر اپنے اختصار کے باوجود ادب کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کے بعد مقا کا وہ مجموعہ ہے جو مرحوم کے والد قاضی نورالاسلام نے ترتیب دیا تھا اور ان کی وفات کے بعد نومبر ۱۹۲۸ء میں بجنوری" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ تیسری چیز "یادگارِ بجنوری" ہے جو ان کے دس مضامین، دس مکاتیب ا نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ان کے صاحبزادے محمد فاتح فرخ (مرحوم) نے اپریل ۱۹۴۶ء میں مرتب کیا تھا۔ لیم اشاعت کی نوبت پاکستان بننے کے بعد آئی۔ چنانچہ یہ قابلِ قدر مجموعہ پہلی اور آخری بار بابائے اردو مولوی مرحوم کے تعارف کے ساتھ سول اینڈ ملٹری پریس میں طبع ہوا تھا اور اب بعض کتب خانوں کی زینت بنا ہوا۔

ان مضامین، مکاتیب اور "محاسنِ کلام غالب" کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بجنوری مرحوم کی لطافت و شگفتگی کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اس میں حسن و رعنائی نفاست و جاذبیت اور شستگی و دلکش اتم پائی جاتی ہے۔ اُن کی تحریر کی ان خوبیوں کو دیکھتے ہوئے اگر اُنھیں ایک حسن کار ادیب کہا جائے تو بے

بجنوری مرحوم "کلام غالب" پر بے طرح فریفتہ تھے۔ چنانچہ اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود قیام بھوپال کے دوران دیوان غالب کو از سرِ نو ترتیب دیا اور اس میں مرزا کی بہت سی وہ غزلیں شامل کر اس سے پہلے منظرِ عام پر نہیں آئی تھیں۔ دیوان غالب کو وہ نہایت اہتمام سے شائع کرنے کا ارادہ کر رہے اور اس کے شایانِ شان انھوں نے ایک مقدمہ بھی لکھا تھا۔ لیکن دستِ بیدادِ اجل نے انہیں مہلت اور اس عروس کو وہ اس سامانِ آرائش میں نہ دیکھ سکے جو انہوں نے اس کے لئے فراہم کیا تھا۔ ان کا دیوان غالب ان کے انتقال کے بعد نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ضرور ہوا لیکن اس میں وہ اہتمام نہ جس کے وہ خواہش مند تھے۔ تاہم یہی غنیمت ہے کہ وہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو گیا اور ان کی محنت ٹھکا

یہ بھی اللہ کی قدرت کا ایک عجیب نمونہ ہے کہ ایک جدید تعلیم یافتہ شخص جس نے ہندوستان میں رہ کر مغربی علوم کی تحصیل کی اور پھر قلبِ یورپ میں کئی سال قیام کر کے وہاں کے بڑے بڑے فضلا اور مشاہیر کے نظریات و خیالات سے براہِ راست واقفیت بہم پہنچائی وہ اگر کسی کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہوا تو وہ ایک شاعرِ ہندی (غالبؔ) تھا۔ کوئی مغربی محبوب اسے اپنے دامِ الفت میں نہ پھنسا سکا۔

بجنوری مرحوم کو کلامِ غالبؔ سے اتنی شیفتگی کیوں تھی؟ اس سوال کا جواب ان کے مقدمہ دیوانِ غالب یا محاسنِ کلامِ غالب کے صفحات میں مل جائے گا۔ دراصل انہوں نے کلامِ غالب کا جس نظر سے مطالعہ کیا تھا وہ نظر بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ وہ مرزا کے کلام کی جن خوبیوں کو نہایت نمایاں طور پر دیکھ لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کے لئے متعدد پردوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ دوسروں کی نظر ان نکات اور باریکیوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ اپنی ژرف نگاہی سے ان سب کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اور مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ بعض وہ خوبیاں بھی اُن کے تخیل کی گرفت میں آجاتی ہیں۔ جن پر مرزا کی بھی نظر نہیں گئی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعر جب کوئی شعر کہتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک یا چند مخصوص پہلو ہوتے ہیں۔ مگر ایک ناقد جب گہری نظر ڈال کر اس شعر کا تجزیہ کرتا ہے تو اسے ان کے علاوہ اور کئی پہلو بھی دکھائی دے جاتے ہیں۔ اور وہ شعر کے بعض ایسے محاسن و معائب بھی ڈھونڈ نکالتا ہے جو خود شاعر کو محسوس نہیں ہوتے۔ بجنوری مرحوم اور کلامِ غالب کا کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ دراصل ان کی بے پایاں علمیت نے ان کی نظر میں وہ وسعت پیدا کر دی تھی۔ جو اُن کے سامنے اس واقعہ اور کیفیت کی جو کسی شعر میں ہوتی تمام جزئیات و تفصیلات لے آتی تھی، اور جب غالبؔ کا تخیل ان کی علمیت کے آئینہ میں منعکس ہو کر اپنا حسن و جمال دکھاتا تو وہ سرشار و بیخود ہو کر "دیوانِ غالب کو ہندوستان کی ایک الہامی کتاب اور ویدِ مقدس کے ہم پلہ قرار دے دیتے۔" دوسرے لوگ جن کی نظر اس منظر کو دیکھنے سے قاصر رہتی وہ نہایت حقارت سے اس رائے کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیتے۔

"جس ناقد کی تنقید کی ابتدا اس جملہ سے ہو وہ اپنے قارئین کے دلوں میں کیا اعتماد پیدا کر سکتا ہے؟"

بجنوری مرحوم غالبؔ کی جامعیت اور ہمہ گیری اور ان کے کلام کی لطافت و دل آویزی سے متاثر ہو کر اُن کو ورڈس ورتھ، شیکسپیئر، ٹینی سن وغیرہ سے بلند مقام عطا کرتے ہیں اور ان لوگوں پر جو غالبؔ کا مقابلہ یورپ کے ان شعراء سے کرتے ہیں۔ ان الفاظ میں تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔

"تنازع للبقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال و آرا سے کرنے لگے ہیں۔ یہ وہ غلامی ہے جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی۔ پس کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانے میں طالب علم اور

انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شیکسپیر، ورڈس ورتھ اور ٹینی سن سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ افسوس یہ کوتاہ نظر نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا نادانستہ ظلم ہوتا ہے۔"

اس گمراہی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ تنقید کرتے وقت مشرق اور مغرب کے فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور یہ بات فراموش کر کے کہ ہر شاعر کے کلام پر اس کے ماحول کا بہت اثر پڑتا ہے وہ مغربی شاعری کے پیمانے مشرقی شاعروں کے کلام کو جانچنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے مشرق کا کوئی شاعر بھی ان کی نظر میں نہیں جچتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری مشرقی شاعری ہی ان کو بیکار معلوم ہونے لگتی ہے۔ بجنوری مرحوم ان نقادوں کے اسی غلط طریقۂ کار کی طرف اشارہ کر کے ان کو بتاتے ہیں۔ کہ کسی مشرقی شاعر کے کلام کا جائزہ لیتے وقت اور باتوں کے ساتھ ساتھ اس کے ماحول کو بھی ضرور پیش نظر رکھا جائے ورنہ وہ اس کے ساتھ قطعاً انصاف نہیں کر سکیں گے۔ کلام غالب کو بھی جانچنے کے لئے یہی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔

صلاح الدین خدا بخش نے غالب کا مقابلہ ہائن رش ہائنے کے ساتھ کیا تھا۔ لیکن بجنوری مرحوم نے ان کی بھی غلطی بتا کر اس رائے کو مسترد کر دیا۔ وہ کہتے ہیں۔

"کہاں ہائن رش؟ نے محض معنیٰ جو عشق والفت کے مضامین بصورت قطعات افسردگی کے ساتھ بیان کر کے خاموش ہو جاتا ہے۔ کہاں غالب جو دنیا کو اطلس کی مثال اپنے شانوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اور جس کا سرود سیارہ بہ سیارہ ہوتا ہوا فلک الافلاک تک پہنچتا ہے۔"

غالب کا مغربی شعراء سے موازنہ کرتے ہیں وہ صرف اقبال کے ہمنوا ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "مرزا غالب کا صحیح اندازہ قائم کرنا خود ایک بلند پایہ شاعر ہی کا کام تھا۔ اقبال نے بجا کہا ہے

آہ تو اجڑی ہوئی دل میں آرامیدہ ہے گلشن ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا مقابلہ ہو سکتا ہے تو وہ شعرائے المانیہ کا سرتاج یوحنا ولف گانگ فان گوئٹے المعروف بہ گوئٹے ہے۔

غالب اور گوئٹے دونوں کی ہستی انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے۔ شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہے۔"

اس مقابلہ اور موازنہ سے بالاتر ہو کر جب وہ مخصوص طور پر کلام غالب کا جائزہ لیتے ہیں تو وہی کیفیات اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو غالب پر ہوئی ہوں گی۔ اس کے ساتھ وہ اپنے حسن تخیل کو بھی ملا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "جب وہ چمنستان غالب کی گلگشت کو نکلتے ہیں تو تمام راستے خود بھی گل کاری

کرتے جاتے ہیں۔ اور مرزا کے اشعار کو ایسے حسین معنی پہناتے ہیں۔ کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔"

جہاں تک مرزا کے اشعار کا تعلق ہے ان کی لطافت، خیال آفرینی۔ نزاکتِ تخیل اور طرزِ ادا اپنی جگہ خوب بلکہ نہایت خوب ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ بجنوری مرحوم نے جس لطیف انداز سے ان کی تشریح کی ہے۔ اور جو نکات ان میں پیدا کئے ہیں۔ اس سے ان شعروں کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو بعض مقامات پر ان کی رنگینیِ بیانی اور لطفِ زبان نے اشعار کی تھوڑی بہت یبوست کو بھی چھپا دیا ہے۔ مثلاً غالب کا ایک شعر ہے ؎

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے   سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

اس شعر کی تشریح بجنوری مرحوم نے اس طرح کی ہے۔

"ہندوستان میں مغلوں کے زمانے کے بہت سے باغات غیر آباد اور ویران پڑے ہیں۔ سنگِ مرمر اور سنگِ رخام کی بارہ دریاں شکستہ افتادہ ہیں۔ جہاں شہزادے اور بیگمات رہتی تھیں۔ وہاں اب جنات اور پریوں کا مسکن ہے۔ جن روشوں پر کافوری شمعیں روشن رہتی تھیں۔ وہاں اب جگنو اڑتے ہیں۔ نباتات نے دستِ انسانی کی قطع و برید سے آزادی پاکر ایک عجیب آوارگی اختیار کر لی ہے۔ پانی کے پاس درختوں کے سائے میں جو پودے ہوتے ہیں وہ اکثر طویل اور نازک تن ہوتے ہیں۔ جن کی شاخیں پتلی ہونے کے باعث پھول کے وزن سے بھی جھک جاتی ہیں۔ اور ذرا سے ہوا کے جھونکے میں ادھر ادھر لہرانے لگتی ہیں۔ شام کے وقت ان شاخوں کا عکس سبزے پر بعینہٖ سانپ کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر طبیعت پر مانیا یا وحشت یا ہول کا اثر ہو تو اس افعی سے ڈرنا کوئی عجب نہیں۔"

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شعر جب تک شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے اس وقت تک وہ لطیف ہے۔ لیکن جہاں اس پر تشریح کا عمل کیا گیا اس کی لطافت اگر بالکل ختم نہیں ہوتی تو کم ضرور ہو جاتی ہے۔ لیکن بجنوری مرحوم کی تشریح سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ان کی حیثیت ایک حکاک کی سی ہے جو اپنے اوزاروں سے کاٹ چھانٹ کر الماس کو چمکدار بنا دیتا ہے۔

بجنوری مرحوم کی جو چند نظمیں اس وقت دستیاب ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف سخن فہم تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے سخن سنج بھی تھے۔ چنانچہ ان کی نظموں میں رعنائی تخیل بھی ہے اور حسنِ ادا بھی۔ یادگارِ بجنوری میں جو چار نظمیں دی گئی ہیں۔ ان میں گیتا نجلی کے چند بندوں کا ترجمہ شمع و پروانہ قانونِ فنا اور نٹ راجا شامل ہیں۔ آخر الذکر میں ہندو ضمیات میں سے ایک واقعہ کو نظم کیا گیا ہے۔ اس نظم میں دکھایا گیا ہے کہ

"چند رشیوں نے جو کائنات کے ابدی اور مادہ کے قدیم ہونے کے قائل تھے شیوجی کو جو ایک جوگی کا بھیس بدل کر ان کی اصلاح کے لئے آئے تھے نادانستگی میں طرح طرح سے زک پہنچانے کی کوشش کی۔ مگر وہ اپنی ہر کوشش میں ناکام رہے۔ آخر میں انہوں نے ایک ٹھگنے قد کا بھوت ان کے مقابلہ میں نکالا جس کے ہاتھ میں ایک بڑا لٹھ تھا۔ شیوجی بھلا اس سے کیا خائف ہوتے۔ انہوں نے اس بھوت کی پیٹھ پر پاؤں رکھ کر نہایت برق رفتاری اور سرعت سے ناچنا شروع کیا۔ جس سے رشی اپنی غلطی پر پشیمان ہو کر ان کے قدموں پر گر پڑے اور ان کے بھگت بن گئے۔

نرت راج سے مراد شیوجی کی توانائی وطاقت ہے۔ اب نظم کو پڑھئے اور شاعر کی زبان اور لطف بیان کی داد دیجئے۔

نٹ راجا

لغزش میں نشے کے بت طناز شرابی

سیماب مقابل

گرداب مماثل

تصویر برہمی میں ہے رقصاں تن شیوجی
یک دست میں گردش میں رواں شیشۂ عرفاں

زہرابۂ نوشیں

پرکالۂ نوریں

یک دست میں انوار فشاں شعلۂ یزداں
در آئے جہاں بت شکن مادہ باطل

منصورِ حقیقی

مغلوبِ مجازی

دنیائے دنی طفلکِ افتادۂ غافل
ہیں انگلیاں بے تاب کہ جنبش میں خدائی

سرشوخیٔ مدہوش

موسیقیٔ خاموش

اعجاز ہے ہر ضربۂ انگشتِ الٰہی
آغوش میں فوارۂ یخ بستہ کی برفاب

تحریکِ خموشاں

خاموشی جنباں

کب قید ہو تصویر میں رقصاں شو بیتاب

دُم دار ستارے

از

(جناب سید عابد علی)

گرمی کے زمانے میں جب لوگ رات کو کھلی جگہ پر سوتے ہیں تو ان کو آسمان میں انواع و اقسام کے ستارے نظر آتے ہیں جو آسمان میں بے حد خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ہلکی اور ٹھنڈی روشنی اور ان کا فضائے بسیط میں ٹمٹمانا اور جھلملانا بڑا اچھا لگتا ہے ـــــ مگر کبھی کبھی اس خوبصورت اور دلچسپ فضا میں ایسی شے بھی نظر آتی ہے جو دیکھنے میں ہیبت ناک ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ چونچ، جھاڑو یا دم نما ہوتی ہے۔ عرف عام میں اس کو دم دار ستارہ کہا جاتا ہے اور قدیم زمانہ سے لوگ اس کو نحوست، جنگ، قحط، افراتفری، آفت، امراض وغیرہ کی علامت تصور کرتے چلے آئے ہیں ـــــ جیسا کہ سترہویں (۱۷) صدی کے ایک یورپی شاعر کی نظم سے ظاہر ہوتا ہے۔ [نظم کا خلاصہ] "اچانک ظہور پذیر ہونے والا ستارہ دنیا کو مفلوک الحال بناتا ہے۔ اور جنگ و وبا سے خائف کرتا ہے۔ بادشاہوں کو موت سے، سلطنتوں کو بدامنی سے، ریاستوں کو بے شمار نقصانات سے، گڈریوں کو وبا سے۔ کسانوں کو ناموافق موسم سے، ملاحوں کو طوفان سے، شہروں کو زلزلہ کی ہلچل سے ـــــ اور اسی طرح شیکسپیئر کہتا ہے ـــــ "جب گداگر مرتے ہیں تو دم دار ستارے نظر نہیں آتے لیکن بادشاہوں کی موت پر آسمان میں خود بخود آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں" ـــــ اسی طرح ملٹن کے یہاں بھی اس کو نحوست کی علامت بتایا گیا ہے۔

یہ عقائد بلاوجہ نہ تھے بلکہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر دور میں مصائب کا شکار رہا ہے اور اس نے اکثر و بیشتر اپنے ان مصائب کا ذمہ دار اپنی کوتاہیوں اور معاشرے کے بجائے آسمانی مظاہر کو ٹھہرایا ہے اور اسی طرح وہ مسائل سے روگردانی کی راہ ہموار کر کے خود کو مطمئن کرتا رہا ہے بقول قاسمی ؎

کتنے معصوم ہیں انساں کہ بہل جاتے ہیں
اپنی ناکامی کو دے کر غم و آلام کا نام

اور یہ اتفاق ہے کہ بعض اقوام اور ممالک میں جب کبھی یہ ستارے نظر آتے ہیں تو کسی نہ کسی طرح کی بربادی، نقصان، جنگ، بادشاہ کا زوال یا موت، امراض یا قحط وغیرہ سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جیسے:-

(۱) ـــ یونان کی تاریخ میں مرقوم ہے کہ ۳۷۰ قبل مسیح میں آسمان پر ایک بڑا زبردست دم دار ستارہ نظر آیا تھا جس سے لوگ خوفزدہ ہو گئے تھے ـــ اور اس کے نظر آنے کے کچھ دن بعد یونان کے دو شہروں ہلیس (HELICE) اور بورا (BURA) زلزلے اور طوفان سے برباد ہو گئے تو خوفزدہ توہم پرست یونانیوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ تباہی اسی ہیبتناک ستارہ کی وجہ سے ہوئی تھی۔

(۲) اسی طرح ۴۴ ق۔م میں ایک ایسا ہی ستارہ نظر آیا اور اسی سال رومی سلطنت کے مشہور فرمانروا جولیس سیزر کا انتقال ہو گیا۔

(۳) ۱۱ ق۔م میں ایک دم دار ستارہ شہر روم کے اوپر سے گذرا اور کچھ دن بعد شہنشاہ کی وفات ہو گئی۔ اہلِ روم نے یہ تصور کیا کہ یہ سانحہ اسی ستارے کی نحوست سے پیش آیا۔

(۴) اسی طرح روم کو تباہ و برباد کرنے والا نیرو جب دنیا سے رخصت ہو رہا تھا (۶۸ء) تو اس وقت بھی کوئی دم دار ستارہ آسمان پر جلوہ گر تھا۔

(۵) مؤرخوں کے کہنے کے مطابق رومی شہنشاہ کلاڈیس اور قسطنطین ہن قوم کا سردار۔ اٹیلا فرانس کا ہنری اول پوپ الکزنڈر دوم رچرڈ شیر دل شہنشاہ فریڈرک۔ پوپ انوسینٹ چہارم اور رسولِ اکرمؐ کے انتقال کے وقت دم دار ستارے نظر آئے تھے۔

(۶) اسی طرح جب ۶۹ء میں رومیوں کی فوج نے بیت المقدس کا محاصرہ کر رکھا تھا تو ایک بہت بڑا دم دار ستارہ آسمان پر ظاہر ہوا تھا جس کو دیکھ کر لوگوں نے یہ خیال کیا کہ شاید اب وہ وقت آپہونچا ہے جس کی پیش گوئی کی گئی تھی کہ اس شہر کے سب سے بڑے معبد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔

(۷) خدا معلوم یورپ میں یہ بات کس طرح مشہور ہوئی کہ سن عیسوی کے چار اعداد کے پہنچنے تک قیامت آجائے گی۔ لہٰذا جب ۱۰۰۰ء میں ایک بے حد روشن دم دار ستارہ نظر آیا تو سب کو یقین ہو گیا کہ یہ دنیا کا آخری سال ہے اور انھوں نے سب دنیاوی کام چھوڑ دئے اور عبادت میں لگ گئے۔ قیامت تو نہ آئی مگر یہ ضرور ہوا کہ ان کے کام نہ کرنے یعنی کھیتی باڑی نہ کرنے سے یورپ میں کئی سال قحط

(۸) ۱۴۵۳ء میں ایک دم دار ستارہ تمام یورپ میں نظر آیا اور اسی سال ترکوں نے قسطنطنیہ موجودہ استنبول کو فتح کر لیا تو عیسائی دنیا نے اپنی اس بربادی کو اس ستارے کے منحوس اثرات پر محمول کیا۔

(۹) اٹلی کا آتش فشاں پہاڑ ولیسوویئس کئی مرتبہ پھٹ چکا ہے۔ مگر جب ۱۶۱۸ء میں بہت زد آتش فشانی ہوئی تو لوگوں نے خیال کیا کہ اس کی وجہ موجودہ روشن دم دار ستارہ ہے۔

(۱۰) انگلستان کی تاریخ میں لندن کے اندر طاعون پھیلنے کا واقعہ اور آگ لگنے کے واقعات بہت مشہور ہیں اس تباہی کو ۱۶۶۵ء کے دم دار ستارہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔

(۱۱) جنگ عظیم اول سے قبل بھی ایک دم دار ستارہ نظر آیا تھا۔

(۱۲) اور پاکستان میں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء دونوں جنگ میں دم دار ستارے نظر آئے تھے۔

اگر یہ تمام تباہی، بربادی اور نحوست ان ستاروں کے دم سے ہے تو پھر یہ خیال غلط ہے کہ موت اور زیست خدا کے اختیار میں ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نحوست صرف ایک خطہ یا شہر پر ہی کیوں موقوف ہوتی ہے — دنیا میں دوسری تباہیاں جیسے سمندری طوفان۔ زلزلے بغیر دم دار ستاروں کے بھی آتے رہتے ہیں۔ آخر پھر وہ کیوں آتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہوں کا زوال اور موت، وبا اور جنگیں ان کے بغیر بھی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جنگ میں ایک کی جیت اور دوسرے کی شکست ہوتی ہے۔ یہ دم دار ستارے صرف شکست خوردہ قوم اور ملک کے لئے ہی کیوں ہوتے ہیں۔ فاتح قوم اور ملک کے لئے یہ منحوس کیوں نہیں ثابت ہوتے۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں من جانب اللہ ہوتی ہیں نہ کہ ستاروں سے۔ فراق نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

یہ کیا ہم اہل زمیں کی بنائیں گے تقدیر — کہ خود نجوم فلک قسمتوں کے مارے ہیں

دم دار ستاروں سے لوگ قدیم زمانے سے واقف تھے چینی تہذیب میں دم دار ستارہ کے متعلق جو تحریریں اور تصاویر دستیاب ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس سے چار ہزار قبل مسیح سے واقف تھے۔ ان کے یہاں ایک دم دار ستارہ کو ۲۵۰۰ ق۔م میں دیکھنے کا ثبوت ملتا ہے اور اسی طرح ۴۶۶ ق۔م میں بھی ایک بے حد روشن دم دار ستارہ نظر آیا تھا جس کے بارے میں خیال ہے کہ شاید وہ ہیلے کا دم دار ستارہ تھا۔

اسی طرح اہل یونان کی تاریخ میں مرقوم ہے کہ ۳۷۳ ق۔م میں آسمان پر ایسی زبردست روشنی نمودار ہوئی کہ لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ مشہور یونانی فلاسفر ارسطو نے یہ روشنی اپنے لڑکپن میں دیکھی تھی۔ اگر وہ یہ بیان نہ کر دیتا کہ یہ روشنی (کوسٹ) دم دار ستارہ کی تھی تو شاید اب تک دنیا اس روشنی کی اصلیت سے بے بہرہ رہتی۔ اسی طرح ۴۶ ق۔م میں بھی دم دار ستارہ نظر آیا تھا جس کی روشنی آفتاب کی روشنی کی طرح کی تھی۔ ——— لیکن ۱۵۷۷ء میں سب سے پہلے ٹائیکو براہی نامی ماہر فلکیات نے سب سے پہلے ان دم دار ستاروں کا باقاعدہ سائنسی مطالعہ شروع کیا پھر اس کے بعد ۱۶۸۵ء میں نیوٹن نے اپنے کشش ثقل یا کشش تجاذب کی روشنی میں اس کو جانچنے کی کوشش کی۔ اور اس کے بعد ہیلے نے سب سے پہلے ۱۷۰۵ء میں اس کو حتمی طور پر ثابت کیا۔

عام طور پر ہر آٹھ دس سال کے بعد ایک ایسا دم دار ستارہ ضرور آتا ہے جس کو تمام حضرات بغیر دوربین کے آسمان پر دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دم دار ستارے آتے رہتے ہیں۔ مگر ان کی دُم میں چھوٹی ہوتی ہیں۔ اور ان کی روشنی بھی مدھم ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے عام آدمی انہیں نہیں دیکھ پاتے۔ مگر ماہر فلکیات اپنی اپنی دوربین سے اس کو ضرور دیکھتے ہیں۔ اور اس کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

دم دار ستاروں کی تاریخ میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ زیادہ تر ستاروں کو دریافت کرنے والے لوگ شوقیہ اجرام فلکی کا مشاہدہ کرنے والے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ جو شخص سب سے پہلے نیا دم دار ستارہ دریافت کرتا ہے۔ اس ستارہ کا نام اس شخص کے نام پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایسے لوگوں کو دو جگہ اطلاع دینی پڑتی ہے۔ اول امریکہ میں ہارورڈ کی رسدگاہ کو اور دوم یورپ کے کوپن ہیگن کی رسدگاہ کو اور اس میں ان کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ دم دار ستارہ کس وقت نظر آیا۔ آسمان پر اس کا محل وقوع اور ستاروں کے پس منظر میں اس کی حرکت کا رخ اور رفتار کیا ہے۔ اس کے بعد یہ رسدگاہیں اس دم دار ستارہ کا اعلان دنیا بھر میں کر دیتی ہیں۔ اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اب اگر یہ دم دار ستارہ بالکل نیا ہوا تو یہ اس شخص کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ پرانا ہوا تو پھر اسی شخص کے نام سے ہی موسوم رہے گا۔ جس نے اس کو سب سے پہلے دریافت کیا تھا۔ مگر اس مرتبہ جس شخص نے اس کو سب سے پہلے دیکھا اس کا نام آفس ریکارڈ میں تحریر کر لیا جاتا ہے کہ اس نے اس ستارہ کو فلاں مرتبہ فلاں تاریخ کو سب سے پہلے دیکھا تھا ـــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شوقیہ دم دار ستاروں کو تلاش کرنے والے کبھی دوربین استعمال کرتے ہیں۔ مگر ان کی دوربین ماہر فلکیات سے بہتر نہیں ہوتیں۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات عام آدمی بغیر کسی دوربین کے بھی دم دار ستارہ دیکھ لیتا ہے۔ جیسے سنہ ۱۹۱۰ء کے روشن دم دار ستارے کو سب سے پہلے افریقہ کے تین ریلوے کے مزدوروں نے ... دیکھا تھا۔ اور اس کی رپورٹ کی تھی۔ بہرحال اب تک تقریباً ۱۷۰۰ دم دار ستارے دریافت ہو چکے ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

نام رکھنے کا طریقہ دم دار ستاروں کا نام دریافت کرنے والے کے نام پر رکھنے کا طریقہ شاید سنہ ۱۷۵۳ء میں ہیلے نامی سائنسداں کے بعد سے رائج ہوا کیونکہ وہ دم دار ستارہ آج بھی اس کے ہی نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس سے قبل کسی ایسے دم دار ستارہ کا ذکر نہیں ملتا۔ جو اپنے دریافت کرنے والے کے نام پر ہو۔ اگرچہ ہیلے کا ستارہ اس کے دریافت کرنے سے پہلے بھی ۷۵ سال بعد آتا رہا تھا۔ مگر چونکہ ہیلے نے سب سے پہلے اس ستارہ کے بارے میں سائنسی معلومات دریافت کی تھیں۔ لہٰذا یہ اس کی دریافت سمجھ لیا گیا۔ اور اس کے ہی نام سے آج تک موسوم ہے۔ پاکستان میں سنہ ۱۹۶۵ء میں نظر آنے والا دم دار ستارہ

بھی نیا تھا اور اس کو دریافت کرنے کا سہرا دو جاپانی سائنسدانوں کوروا کیا اور کا ستو مربکی کے سر ہے۔ لہٰذا اس دم دار ستارہ کا نام ان دونوں حضرات کے ناموں کے جز کو ملا کر "آکیا سیکی" رکھا گیا۔ اسی طرح سنہ ۱۹۷۰ء میں نظر آنے والے دم دار ستارہ کو سب سے پہلے جنوبی افریقہ کے ماہر فلکیات جان سینٹ نے ۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۶۹ء کو دریافت کر لیا تھا۔ اب تک سب سے زیادہ دم دار ستاروں کو دریافت کرنے والا شخص پانس (PONS) ہے جس نے ۲۷ دم دار ستارے دریافت کئے۔ اسی طرح میسیئر (MESSIER) سیفٹ (SWIFT) برنارڈ (BARNARD) بروکس (BROOKS) پیرین (PERRINE) اور گیکوبائن (GIACOBINE) وغیرہ نے ۱۱ سے لے کر ۲۵ تک الگ الگ ستارے دریافت کئے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ بہت عرصہ قبل ایک کروڑ پتی امریکی نے یہ اعلان کیا کہ ہر اس شخص کو ایک ہزار روپیہ انعام دے گا جو نیا دم دار ستارہ دریافت کرے گا۔ ایک خوش نصیب ہئیت دان نے چند سال میں ۱۹ ستارے دریافت کر لئے تو اس کو اپنا یہ اعلان واپس لینا پڑا۔

دم دار ستاروں کا دوسرا نام رکھنے کا طریقہ اس کے دریافت کرنے والے سن پر رکھا جاتا ہے یعنی جس سن میں وہ نظر آتا ہے اسی سن سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ جیسے سنہ ۱۸۸۲ء کا دم دار ستارہ سنہ ۱۸۴۳ء کا دم دار ستارہ وغیرہ مگر اس طریقہ کار میں یہ دشواری تھی کہ اگر کسی سال کئی ستارے نظر آجائیں تو کیا کیا جائے کیونکہ وہ سب کے سب ایک ہی سنہ سے موسوم ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی سال میں دو طرح کے ستارے بھی نظر آسکتے ہیں۔ بالکل نیا اور پرانا۔ اس دشواری کو اس طرح دور کیا گیا کہ جب کسی سال ایک سے زیادہ نئے دم دار ستارے نظر آتے ہیں تو ان کے سنہ کے ساتھ انگریزی کے حروف تہجی کا اضافہ کرنے جاتے ہیں جو دو باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اول اس سال کتنے نئے ستارے نظر آئے دوم کس ترتیب سے سال میں نظر آئے جیسے سنہ ۱۹۵۵ء میں ڈوناتی (DONATI) نے جو ستارہ دریافت کیا تھا وہ اس کے نام سے پکارا جاتا ہے اور سنہ ۱۹۵۵ء سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یعنی وہ اس سال دریافت ہونے والے ستاروں میں چھٹے نمبر پر تھا۔

ان ستاروں کے نام رکھنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس سال دم دار ستارہ آفتاب سے قریب ترین راستے کی ترتیب سے بھی پکارا جاتا ہے جس کے لئے اس کی فہرست کا اظہار رومن گنتی کا اضافہ کر کے کرتے ہیں۔ جیسے ڈوناتی کے دم دار ستارہ کو VI سنہ ۱۹۵۵ء بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کوپ (KOP) کا دم دار ستارہ VII سنہ ۱۹۵۵ء سے بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔

دم دار ستارے کی وجہ تسمیہ

(۱) اس کو دم دار ستارہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ستارہ جیسے جیسے سورج کے قریب آتا ہے اس کی دم بڑی ہوتی چلی جاتی ہے جس کو عام

آدمی بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی بنا پر اس کو دم دار ستارہ کہا جاتا ہے۔

(۲) اہل یونان بھی اس ستارہ سے واقف تھے اور ان کو کومٹ کہتے تھے۔ جو لفظ کوما (COMA) سے نکلا ہے۔ اس کے معنی "بال والا" ہوتا ہے یعنی یہ بال والا ستارہ ہے۔ اس ستارہ کے اندر کم از کم ایک حلقہ یا ہالہ ہوتا ہے جو بال سا معلوم ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر اہل یونان نے اس کو بال والا ستارہ یا کومٹ کہنا شروع کر دیا تھا۔

(۳) اس ستارے کو اہل چین اور جاپان بھی قدیم زمانے سے جانتے تھے اور وہ حضرات اسی کو جھاڑو دار ستارہ (BESOMSFAR) کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ستارہ آسمان میں جس طرح حرکت کرتا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جھاڑو حرکت میں ہو، یا اس کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اس کی دم کا مقابلہ جھاڑو کی تیلیوں سے کیا ہو۔

(۴) دم دار ستارے اگرچہ ستارے نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ستارے کہلاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شروع شروع میں ان کے بارے میں یہ نظریہ تھا کہ یہ اجرام فلکی ہیں جس کا سب سے بڑا ہم نوا روم کا فلاسفر سنیکا (SENECA) تھا جس کا قول ہے کہ ـــ "کسی روز کوئی شخص پیدا ہوگا جو یہ بتائے گا کہ یہ کومٹ [دم دار ستارہ] آسمان میں کہاں سے آتے ہیں۔ ان کے سفر کرنے کی کیا وجہ ہے اور یہ اپنے سیاروں سے اس قدر دور کیوں نکل آتے ہیں۔ ان کی شکل وصورت اور ماہیت کیا ہے" ـــ شاید اسی وجہ سے اس کو ستارہ تصور کر لیا گیا اور آج تک ستارہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ ستارہ کی تعریف کے مطابق ستارے اور دم دار ستارے میں کوئی نسبت نہیں ہے۔

کہاں سے آتے ہیں

بہرحال ابھی تک سائنسدان یہ معلوم کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ یہ دم دار ستارے کہاں سے آتے ہیں اور ان کا تعلق کس سے ہے کیونکہ

(۱) ارسطو کا خیال تھا کہ ہماری زمین کے اندرونی بخارات کرۂ ہوائی میں اوپر جا کر بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور کومٹ [دم دار ستارہ] کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں بطلیموس بھی ارسطو کا ہم نوا تھا۔

(۲) سولہویں صدی میں جب براہے (BRABE) نے یہ بتایا کہ زمین سے دم دار ستاروں کا فاصلہ قمر کے فاصلے سے کم از کم چھ گنا ہے۔ لہٰذا دم دار ستارے بھی سیاروں اور ستاروں کی مانند اجرام فلکی ہیں۔

(۳) نیوٹن کا خیال تھا کہ ستاروں اور سیاروں کی طرح یہ بھی نظام شمسی کے افراد ہیں۔

(۴) لاپلاس نے ۱۸۱۳ء میں یہ نظریہ پیش کیا کہ دم دار ستارے دراصل ستاروں سے آتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا مدار سورج کی ایک جانب بہت مختصر اور دوسری جانب بہت طویل ہوتا ہے وہ اس کی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ جب کوئی دم دار ستارہ نظام شمسی کے قریب آ نکلتا ہے تو ہمارا آفتاب اسے اپنی طرف کھینچتا ہے جس کی وجہ سے

یہ دم دار ستارہ ہمارے سورج اور اپنے ستارے کے درمیان بیضوی راستے پر گردش کرنے لگتا ہے۔ آگے چل کر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جب یہ دم دار ستارے نظام شمسی کے سیاروں کے پاس سے گذرتے ہیں تو وہ بھی اس کو اپنی قوت کشش سے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں یہ گرفتار ان دو اجرام کے گرد ایک لمبے بیضوی مدار پر گردش کرنے لگتا ہے۔ اس طرح ستاروں کی دنیا سے الگ ہو کر یہ ہمیشہ کے لئے نظام شمسی میں شامل بھی ہو جاتا ہے۔ اس نظریہ کو نظریہ تسخیر (CAPTURE TFEORY) کہتے ہیں ——

پروفیسر پکرنگ (PICKERING) نے اس نظریہ کے مطابق یہ بتایا کہ مشتری سیارے نے (۱۸۵۸ء ۔ ۱۹۳۸ء) ۳۲ دم دار ستاروں کو اسی طرح تسخیر کیا۔ اور نیپچون نے ۶ کو۔ زحل اور یورنیس نے دو دو کو گرفتار کیا۔

(۵) ۱۸۳۲ء میں کوپرنے یہ خیال ظاہر کیا کہ دم دار ستارے گیس کے اسی مادے سے تیار ہوئے ہیں جن سے سورج اور سیاروں نے جنم لیا ہے۔ لیکن دم دار ستارے دیگر اجرام فلکی سے الگ تھلگ بنے اور سورج سیاروں اور ستاروں کی کشش کے باعث ان کے مدار میں موجودہ تبدیلیاں ہوئیں۔

(۶) پراکٹر (PROCTOR) کا خیال ہے کہ دم دار ستارے سیاروں کے ٹکڑے ہیں۔

(۷) ۱۹۴۵ء میں ہالینڈ کے ماہر فلکیات اورٹ نے ان دم دار ستاروں کے بارے میں ایک بڑا عجیب نظریہ پیش کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ نظام شمسی کے قریب کہیں پر ان دم دار ستاروں کا کوئی جزیرہ ہے جہاں یہ کھربوں کی تعداد میں موجود ہیں مگر اردگرد کے ستاروں کی زبردست کشش کی وجہ سے ان میں ہلچل رہتی ہے جن کے باعث یہ ادھر ادھر جھولتے رہتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان میں سے ایک دو جزیرے سے الگ ہو کر کسی قریبی ستارے کی کشش کی زد میں آجاتے ہیں۔ ہمارا سورج بھی ان ستاروں میں شامل ہے اس طرح یہ دم دار ستارے ہمارے سورج کے گرد چکر لگانے لگتے ہیں۔ اورٹ مختصر مدار کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ جب یہ دم دار ستارے سیاروں کے قریب سے گذرتے ہیں تو وہ ان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور نتیجہ میں دم دار ستارہ سیارہ اور سورج کے گرد گھومنے لگتا ہے —— مگر ابھی تک وہ خیالی جزیرہ دریافت نہیں ہو سکا ہے۔

(۸) یہ کہیں سے بھی آتے ہوں مگر اب تقریباً یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ سیاروں کی طرح نظام شمسی کے رکن ہیں۔ کیونکہ یہ ایک مخصوص مدار پر ایک مخصوص مدت میں سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود سیاروں اور ستاروں میں چند نمایاں فرق ہیں۔

سیاروں اور دم دار ستاروں میں فرق

(۱) دم دار ستاروں کے راستے عموماً بیضوی ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف سیاروں کے راستے عموماً گول ہوتے ہیں۔

(۲) دم دار ستارے کسی بھی زاویہ اور سمت سے آسکتے ہیں خواہ مغرب سے مشرق ہو یا مشرق سے مغرب ہو

لیکن اس کے برخلاف تمام سیارے ایک مقررہ سمت اور راستے پر حرکت کرتے ہیں۔

(۳) دم دار ستاروں کی شکل غیر منظم (IRREGULER) اور تبدیل ہونے والی ہوتی ہے وہ کبھی گول کبھی چونچ نما اور کبھی دم دار ہوتے ہیں اسی طرح ان کی دم اور ہالہ اور سر مختلف حالتوں میں مختلف جسامت اور لمبائی اختیار کرتے ہیں۔ جبکہ سیاروں کی جسامت اور شکل وصورت ایک جیسی رہتی ہے۔

(۴) دم دار ستاروں کی کمیت سیاروں کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے۔

(۵) دم دار ستاروں میں ہالے یا حلقے ہوتے ہیں۔ جبکہ سیاروں میں ہالے نہیں ہوتے ہیں۔

(۶) دم دار ستاروں میں کچھ تو ان کی اپنی ذاتی روشنی ہوتی ہے اور کچھ سورج کے انعکاس سے وجود میں آتی ہے۔ اس کے برخلاف سیاروں میں نام کی تمام روشنی انعکاس شدہ ہوتی ہے۔

مدار کیا دم دار ستاروں کا کوئی مخصوص راستہ یا مدار ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں قدیم زمانے کے علما کا خیال تھا کہ دم دار ستارہ ایسے اجرام فلکی ہیں جو فضائے بسیط میں بے قاعدہ طور پر گھومتے پھرتے ہیں لہٰذا جب زمین کے قریب آنکلتے ہیں تو ہم کو نظر آجاتے ہیں۔ اس لئے ان کا کوئی مخصوص راستہ متعین کرنا مشکل ہے۔

(۲) مگر سولہویں صدی میں جہاں اور بہت سے کام ہوئے وہیں کیپلر [۱۶۳۰ - ۱۵۷۱] نے یہ خیال ظاہر کیا کہ دم دار ستارہ خطوط مستقیم پر سفر کرتے ہیں۔ حالانکہ اس نے سیاروں کے مدار کے بارے میں بہت کچھ درست باتیں دریافت کی تھیں۔

(۳) کیپلر کے بعد نیوٹن نے یہ ثابت کیا کہ آفتاب کی کشش کا اثر بھی دم دار ستاروں پر ہوتا ہے —— اس نظریہ پر عمل پیرا ہوکر ۱۶۸۲ء میں ایڈمنڈ ہیلے (EDMOND HALLEY) نے دم دار ستارہ کے مدار کا بغور مطالعہ کر کے سب سے پہلے یہ بتایا کہ ان کے راستے مقرر ہیں۔ اور یہ بیضوی ہوتے ہیں۔

اب تک کے اعداد کی رو سے صرف دس فی صد ایسے دم دار ستارے ہوں گے جن کے راستوں میں بے تکا پن پایا جاتا ہو ورنہ زیادہ تر دم دار ستاروں کے راستے درست اور ٹھیک ہوتے ہیں۔ ان میں سے بھی ایک فی صد ستاروں کے بارے میں بعض ہیئت دانوں کا خیال ہے کہ ان کے راستے بیضوی نہیں بلکہ قطعہ مکافی ہیں یعنی وہ دوبارہ نہیں آئیں گے۔ مگر اس سلسلے میں اس بات کو مدنظر رکھنا چاہیئے کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے راستے اس قدر لمبوترے ہوں گے۔ یہ خیال اغلب ہونے لگتا ہو کہ یہ قطعہ مکافی ہیں کیونکہ دم دار ستاروں کا جتنا طویل یا لمبوترا ہوتا ہے وہ اتنی ہی زیادہ مدت کے بعد سورج کے قریب سے گذرے گا کیونکہ بیضوی مدار پر ستاروں کی حرکت کسی جگہ سست اور کسی جگہ تیز ہوتی ہے۔ عام طور پر طویل مدار والے دم دار ستارے اپنا زیادہ تر وقت مدار کے اس حصہ میں گذارتے ہیں جو آفتاب سے دور ہوتا ہے اور وہاں

وہ چیونٹی کی چال سے حرکت کرتے ہیں اور پھر جیسے جیسے وہ آفتاب کے قریب آتے جاتے ہیں۔ ان کی رفتار میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر II ۱۸۶۴ء دوم دم دار ستارہ کو لیجئے جس کا مدار اس قدر طویل ہے کہ وہ اس پر چل کر تقریباً بیس لاکھ ... ۲۰۰،۰۰۰ سال بعد آفتاب کے پاس سے گذرے گا۔ اس کے لئے صرف اتنا ہی کہنا کافی ہوگا سے کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہوتے تک۔

ہوسکتا ہے بعض ستارے اس سے بھی زیادہ لمبوترے مدار رکھتے ہوں اور ان پر یہ گمان ہوتا ہو کہ یہ قطعہ مکافی کے شکل کے نہیں۔ بعض دم دار ستاروں کے فاصلے قریب ترین ستارہ کے فاصلہ کے نصف کے برابر ہیں۔ اسی طرح بعض دم دار ستارے تو ایسے بھی ہیں جو ابتدائے آفرینش سے لے کر اب تک یعنی پانچ ارب سال میں صرف ایک ہی بار آفتاب کے پاس سے گذرے ہیں اور ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب تشریف لائیں گے۔ ہاں ان کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ صبح کا بھٹکا شام کو آجائے تو اس کو بھٹکا ہوا نہیں کہتے ہیں۔

وہ دم دار ستارے جن کے مدار قطعہ زائد ہیں ان کا فاصلہ ہمارے سیاروں کے مدار سے کافی بڑا ہوتا ہے جو عموماً ۲۰۰ سال بعد آفتاب کے پاس سے گذرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بھی قطعہ زائد میں حرکت کرتے ہیں کہ نہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر ان کے مرکز کا تعین کیا جا سکتا ہے لہٰذا وہ ۲۱ مدار جو کہ ——— (PERIHE LOON PERIOD) میں قطع زائد بناتے ہیں۔ ان میں سے ۲۵ قطع ناقص ہیں اور جب وہ نظام شمسی کے قریب آتے ہیں تو ان کے مدار سیاروں کے اثر سے تباہ ہو جاتے ہیں اور وہ اس دوران میں قطعہ زائد کے مدار کو ظاہر کرنے لگتے ہیں۔

اس کے برخلاف زیادہ تر دم دار ستاروں کے مدار سیاروں کے مدار کے برابر یا ان سے کم ہوتے ہیں۔ اور یہ عموماً ۲۰۰ سال کے اندر اندر آفتاب کے قریب سے گذرتے ہیں۔ ان پر بڑے ستارے اور خاص طور پر مشتری اور زحل کا کافی اثر ہوتا ہے۔ اور یہ دم دار ستارے ان سیاروں اور آفتاب کے درمیان اپنا راستہ یا مدار بیضوی شکل کا بنا لیتے ہیں جس طرح سیارے دم دار ستاروں کو اپنا مطیع بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح انھیں دفع بھی کر سکتے ہیں۔ اگر دم دار ستارہ پیچھے رہ جائے اور سیارہ مشتری آگے ہو جائے تو دم دار ستارہ کی رفتار بڑھ جائے گی اور وہ زیادہ لمبے قطعہ ناقص۔ قطعہ مکافی یا قطعہ زائد میں چلنے لگے گا۔ جیسے بروکس کے دم دار ستارہ (۱۸۸۹ء V) کی مداری گردش کی مدت ۱۸۹۶ء میں تجاذب مشتری کے باعث کم ہو کر ۲۷ سال سے صرف ۷ سال ہو گئی تھی۔ اور مدار بھی اسی حساب سے چھوٹا ہو گیا اور اس کے برخلاف ۱۸۰۸ء سے قبل لیک شیل (LEXCELL) کا دم دار ستارہ ½۵ سال کی مدت سے گردش کرتا تھا۔ لیکن اس سال تجاذب مشتری کے باعث اس کی رفتار اتنی زیادہ ہو گئی کہ یہ اپنے

مدار سے نکل بھاگا اور آج تک نظروں سے اوجھل یا غائب ہے۔ ان میں سب سے چھوٹا مدار انیکسے نامی دم دارستارہ کا ہے جو صرف ۳ سال ۴ ماہ میں آفتاب کے گرد چکر لگا لیتا ہے۔

دم دارستارے اور ان کی گردش کی تعداد

۲۵۰۰ قبل مسیح سے لے کر سنہ ۱۹۷۲ء تک تقریباً ۱۷۰۰ دم دار ستاروں کے چکروں کی تعداد ریکارڈ کی گئی ہے جن میں ان ستاروں کے چکر بھی شامل ہیں جو متعدد بار آفتاب کے سامنے سے گذرے ہیں ورنہ جدید ترین شماریات کی رو سے اس مدت میں ۷۰۰ مختلف دم دارستارے نظر آئے ہیں۔ متعدد چکر لگانے والوں میں سے اب تک سب سے زیادہ چکر یعنی ۵۰ گردش انیکے نامی دم دارستارے نے کئے ہیں۔ مگر یہ دوربین سے ہی نظر آتا ہے اس کے برخلاف پہلے کے دم دارستارے نے جو سب سے زیادہ روشن ہے یعنی کل ۲۹ چکر لگائے ہیں

نظر آنے کی مدت

دم دارستاروں کا نظر آنا دو تین باتوں پر منحصر ہوتا ہے۔ اول اس کی جسامت کیا ہے۔ دوم وہ آفتاب کے کتنے قریب سے ہو کر گذر رہا ہے۔ اور سوئم اس کی سمت کیا ہے۔

چھوٹے دم دارستارہ اپنی جسامت اور کمیت میں کم ہونے کے باعث اہل دنیا کو صاف طور پر نظر نہیں آتے مگر جب دوربین سے دیکھا جاتا ہے تو وہ دکھائی دے جاتے ہیں۔ دوم ایسے دم دارستارے جو آفتاب سے بہت زیادہ فاصلہ پر گذرتے ہیں وہ بھی اہل دنیا کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ کیونکہ آفتاب کی دوری کی وجہ سے ان کی دم زیادہ واضح نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ نظر تو آتے ہیں مگر دوربین سے۔ اور بہت سے دم دارستارے ایسے بھی ہیں جو اپنی دم کٹا چکے ہیں۔ لہٰذا ان کی گردش کی خبر بھی عام لوگوں کو نہیں ہو پاتی

دم دارستارے دو طرح سے نظر آتے ہیں ایک نظر آنا تو وہ ہے جب وہ تلاش کئے جاتے ہیں اور اس وقت وہ آفتاب سے کروڑوں میل دور ہوتے ہیں۔ اور ان کی صرف حرکت سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ دم دار ستارہ ہے اور کون سا ہے یعنی پرانا یا نیا۔ پھر جیسے جیسے وہ آفتاب کے قریب آتا جاتا ہے اس کی رفتار اور دُم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور سورج کے قریب آنے پر وہ اپنے چہرے اور دُم کی چند دن جھلک دکھا کر دوبارہ آفتاب سے دور ہونے لگتا ہے اور اس کی دُم اور رفتار بتدریج کم ہونے لگتی ہے۔ اب تک سب سے زیادہ مدت نظر آنے والا دُم دارستارہ سنہ ۱۸۱۱ء کا دم دارستارہ تھا جو ۵۱۰ دن نظر آیا اس کے بعد سنہ ۱۸۸۲ء کا روشن دم دارستارہ ۹ ماہ تک نظر آیا ورنہ عام طور پر ان کے نظر آنے کی مدت ۲ یا ۳ ماہ ہوتی ہے ——— لیکن بعض دم دارستارے اتنے روشن ہوتے ہیں کہ وہ دن میں بھی دیکھے جا سکے ہیں۔ سنہ ۱۸۸۲ء کا دم دارستارہ ایک مرتبہ اتنا روشن ہو گیا تھا کہ ہاتھ پھیلا کر آفتاب کو آڑھ میں لے لینے سے یہ دن میں ہی آفتاب سے تھوڑے فاصلے پر دکھائی دیتا تھا۔ اسی طرح پہلے کا ستارہ رات کو مثلِ مہتاب

چمکتا ہے اور بعض دم دار ستارے تو اس قدر روشن ہوتے ہیں کہ آفتاب و مہتاب کے بعد انھیں کا نمبر آتا ہے۔

باب دوم

دم دار ستارے کے حصے

دم دار ستارہ کے دو بڑے حصہ ہوتے ہیں اول "سر" اور دوم "دم"۔ دم دار ستارہ کا وہ حصہ جو ایک روشن نقطہ سا نظر آتا ہے وہ "سر" کہلاتا ہے۔ اور باقی وہ حصہ جو ایک طرف کو پھیلا ہوا ہوتا ہے اس ستارہ کی "دم" کہلاتی ہے۔ دم کے اندر سے وہ ستارے صاف نظر آتے ہیں جو پیچھے آسمان میں نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔ وان بیسبروک (VAN BIESBROEEK) نے پانس (PONS) کے دم دار ستارہ کی صرف ایک تصویر میں ۲، اور ۱۳ قدر یا مقدار (MAGNITUDE) کے درمیان ۳۷ ستارہ گنے تھے۔ مگر سر میں سے ستارے نظر نہیں آتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ دم جو روشن غبار یا دھوئیں کی مانند نظر آتی ہے وہ دراصل سر سے کہیں زیادہ لطیف مادے سے بنی ہوئی ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ سر میں دم کی بہ نسبت ۹۹ فی صد مادہ ہوتا ہے، اگرچہ دیکھنے میں دم سر سے کئی سو گنا لمبی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دم گیسوں اور ذرات سے وجود میں آتی ہے اور سر ٹھوس مادہ کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ عموماً سر کا قطر ۵۰۳ ہزار میل سے لے کر ڈیڑھ لاکھ میل تک ہوتا ہے مگر ۱۸۱۱ء II کا دم دار ستارہ کے سر کا قطر ۱۰۰۰۰۰۰ میل تھا۔

سر خود دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اول "مرکزہ" اور دوم "ہالہ یا حلقہ" سر کے بیچ میں جو کثیف ٹھوس مادہ گولے کی شکل میں ہوتا ہے اس کو مرکزہ کہتے ہیں۔ عام طور پر ایک دم دار ستارہ کے مرکزہ میں ایک ہی گولا ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ بھی نہیں ہوتا مگر اس کے برخلاف بعض میں ایک سے زیادہ بھی ہوتے ہیں۔ جیسے ۱۸۸۲ء کے دم دار ستارے کے مرکزے میں ۶ یا ۸ گولے موجود تھے۔ عام طور پر مرکزے کا قطر ۵۰۰۰ ہزار میل ہوتا تھا۔ اسی طرح ۱۸۱۱ء کے دم دار ستارہ کا سر سورج سے بھی بڑا تھا۔ ان کے سر کی جسامت بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ عام طور پر شروع میں دم دار ستارہ کا سر چھوٹا ہوتا ہے اور اس کے آفتاب کے قریب آنے پر یہ بڑھنے لگتا ہے لیکن بالکل قریب آجانے پر دوبارہ گھٹ جاتا ہے ——— اس کی ایک عمدہ مثال ہیلے کے دم دار ستارہ میں نظر آئی کیونکہ ستمبر ۱۹۰۹ء میں اس کا سر کا قطر زمین کے قطر سے دوگنے سے کچھ کم تھا لیکن تین ماہ میں یہ بڑھ کر تیس (۳۰) گنا ہو گیا۔ پھر سورج کے قریب ترین فاصلہ پر پہنچتے پہنچتے یہ دوبارہ گھٹ کر صرف زمین کا پندرہ گنا رہ گیا۔ اور پھر اس کے بعد ایک بار پھر اپریل ۱۹۱۰ء میں یہ پہلے سے بھی بڑا یعنی زمین سے چالیس (۴۰) گنا ہو گیا اور جون ۱۹۱۰ء تک یہ پھر زمین کا چار گنا ہو گیا۔ مرکزے

کے اندر چھوٹے چھوٹے پتھروں سنگریزوں اور دھاتوں کے ڈھیر ہوتے ہیں۔ دھاتوں میں شوما سوڈیم کیلشیم لوہا اور نکل پائے جاتے ہیں۔

مرکزے کے گرد منجمد گیسوں اور گرد کا ایک ہالہ یا حلقہ ہوتا ہے جس کا قطر کئی ہزار میل تک ہوتا ہے۔ شروع میں یہی ہالہ ہم کو دُم دار ستارے کا سر معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہالہ یا حلقہ روئی یا برف کے گالے کی مانند نظر آتا ہے۔ یہ بے حد لطیف ہوتا ہے۔ یہ ہالے بالوں کی طرح باریک ہوتے ہیں اسی لئے اہل یونان اس کو "کومیٹ" کہا کرتے تھے۔ جس کے معنیٰ بالوں والے کے ہوتے ہیں۔ دم دار ستاروں میں کئی کئی ہالے وقت کے ساتھ وجود میں آتے جاتے ہیں۔ جیسے ڈونائی کے دم دار ستارے نے چند دن میں سات ہالے حلقے بنائے تھے۔ اور ۱۸۶۱ء کے دم دار ستارے میں جس کو ٹبٹ (TEBBUTT) نے دریافت کیا تھا۔ اس نے ۱۷ دن کے اندر ۱۱ ہالے بنائے۔ ہالے کے طیف (SPECTRA) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر روشن اور غیر روشن دونوں طرح کے ذرات موجود ہوتے ہیں۔ اور کیمیائی طور پر اس میں مندرجہ ذیل معتدل اور باردار (IONISED) جز پائے جاتے ہیں۔

معتدل اجزاء:۔

۱۔ سینوجن CN (CYANOGEN)
۲۔ ہائیڈروکاربن CH , CH_2 (HYDROCORBON)
۳۔ نائٹروجن ہائیڈرائٹ NH , NH_2 , NH_3
۴۔ کاربن C_3
۵۔ سوڈیم NA (SODIUM MONOATOMIC)

باردار اجزاء:۔

۱۔ کاربن مونو آکسائڈ CO
۲۔ کاربن ڈائی آکسائڈ CO_2^+
۳۔ نائٹروجن N_2^+
۴۔ ہائیڈرو آکسائڈ OH^+
۵۔ ہائیڈروکاربن CH^+

دم دار ستارہ جب اپنے طویل سفر میں ہوتا ہے تو اس کی دم سمٹ کر اس کے سر کے ساتھ مل جاتی ہے اور پھر جوں جوں وہ آفتاب کے قریب آتا جاتا ہے۔ اس کی دم نکلتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح جب دم دار ستارہ تقریباً سورج سے ۲۵ کروڑ میل کے فاصلے پر آتا ہے۔ تو اس کی منجمد گیس گرمی کے

باعث پھیل کر دم کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور پھر یہ دم بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دم کے بڑھنے کا انحصار اس کی رفتار اور آفتاب کے فاصلے پر ہوتا ہے مگر بعض اوقات اس کے بڑھنے کی رفتار تیس (۳۰) میل فی سیکنڈ ہوتی ہے جس کی رو سے اس کی دم میں ایک لاکھ میل فی گھنٹہ سے زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے اور اس طرح ایک دن یعنی ۲۴ گھنٹے میں

. . . .

دم ۲۵ لاکھ میل لمبی ہوچکی ہوتی ہے سب سے بڑی دُم آفتاب کے بالکل مقابل پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد ستارہ جوں جوں آفتاب سے دور ہوتا جاتا ہے۔ دم میں کمی آتی جاتی ہے اور آخر کار دُم معدوم ہوجاتی دم کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ستارہ کہیں بھی ہو اس کی دم کی سمت ہمیشہ آفتاب کے مخالف ہوتی ہے۔ قدیم چینی اس کی اس خصوصیت سے واقف تھے لیکن علمائے یورپ میں پیری ایپین (PIERRE APPIAN) نے سب سے پہلے ۱۵۳۱ء میں اس چیز کو بیان کیا کہ بالہ کی طرح دم بھی آفتاب کے قریب پہونچ کر بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی اور واپسی میں بتدریج گھٹتی ہے۔ نیز یہ دم ہمیشہ آفتاب کے مخالف سمت میں ہوتی ہے۔ شروع میں یہ بات معمہ بنی رہی کہ آخر یہ دم ہمیشہ آفتاب کے مخالف کیوں ہے جبکہ عام مشاہدہ کی بات یہ ہے کہ جب کسی چیز کو دائرہ میں حرکت دیتے ہیں۔ تو وہ دائرہ کی سمت میں دُم بناتی ہے۔ اسی طرح دم دار ستارہ کو بھی دُم بنانا چاہیئے۔ مگر اس میں دونوں باتیں نہیں ہیں۔ اول دم آفتاب کے قریب بنتی ہے۔ اور دوم مدار کے راستے کے بجائے آفتاب کے مخالف بنتی ہے۔ اور سوئم آفتاب کے مقابل سب سے بڑی دم بنتی ہے۔ مگر اب اس راز سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ دراصل روشنی جو ہم کو بہت معمولی چیز معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی اپنے اندر ہوا اور پانی کی طرح دباؤ رکھتی ہے اور جب روشنی کی شعاعیں کسی مادی شے پر پڑتی ہیں تو وہ اس پر دباؤ ڈال کر اس کو معمولی سا دھکیلتی ہیں اور دم دار ستارہ کا مادہ اتنا لطیف ہوتا ہے کہ ان پر روشنی کا دباؤ نمایاں اثر ڈالتا ہے۔ اور اس طرح دُم دار ستاروں کی دم اس روشنی کے دباؤ کی وجہ سے وجود میں آتی ہے اور روشنی کی شعاعوں کی سمت جو آفتاب کے مخالف ہوتی ہے) کا رُخ اختیار کرتی ہے۔ مگر عموماً یہ دم بالکل سیدھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان پر آفتاب کی کشش ثقل اور مقناطیست بھی اثر انداز ہوتی ہے جس کی وجہ سے دُم اگرچہ آفتاب کی مخالف سمت نہیں ہوتی ہے۔ مگر سیدھی ہونے کے بجائے سرے پر سے خم دار ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے اکثر مسلمان اس کو حضرت علیؓ کی تلوار ذوالفقار سے تشبیہ دیتے ہیں۔

دم دار ستارہ کی دم مرکزہ کے مقابلے میں کم چمکدار ہوتی ہے۔ اس بات کا پتہ بھی قدیم چینیوں کو تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دُم میں مادہ کی مقدار سر کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی ہے۔ دُم میں دو طرح کے ذرات

ہوتے ہیں ایک تو خود چمک دار ہوتے ہیں اور دوسرے یعنی انعکاس کے باعث روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اس کو ایک مثال سے بڑی اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے چھت یا دروازے کی جھری سے جب اندھیرے کمرے میں روشنی داخل ہوتی ہے تو اس کے راستے میں جو خاکی ذرات آتے ہیں وہ انعکاس کے باعث روشن معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح دم میں موجود ذرات جب روشنی میں آتے ہیں تو خاکی ذرات کی طرح ان میں بھی انعکاس ہوتا ہے اور وہ روشن نظر آتے ہیں۔ دم کی روشنی سے جو طیف (SPECTRA) حاصل ہوتا ہے اس کی رو سے مندرجہ ذیل چیزیں اس میں موجود ہوتی ہیں۔

معتدل اجزاء:۔

۱۔ سینوجن CN

باردار اجزا:۔

۱۔ کاربن مانو آکسائیڈ CO^+ ۲۔ کاربن ڈائی آکسائڈ CO_2^+

۳۔ ہائیڈرو کاربن CH^+ ۴۔ نائٹروجن N_2^+

دموں کی تعداد دم دار ستارہ کی عام طور پر ایک ہی دم ہوتی ہے مگر بعض اوقات ان کے کئی کئی دمیں بھی ہوتی ہیں جس کی وجہ سے یہ اور بھی خوفناک اور ہیبتناک معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس لئے وہ لوگ جو دم دار ستاروں کو منحوس تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق زیادہ دموں والے ستارے بہت ہی زیادہ منحوس ہوتے ہیں۔ بوریلے (BORELLY) کا ۱۹۰۳ء کا دم دار ستارہ کے ۹ دمیں تھیں۔ جو اب تک نظر آنے والے تمام ستاروں کی دموں میں سب سے زیادہ ہیں مگر یہ دمیں عام نظروں سے نہیں دیکھی جاسکتی تھیں۔ ان کو فوٹو گرافی کی پلیٹ پر دیکھا گیا تھا انھیں کے برخلاف ۱۷۴۴ء کے دم دار ستارہ جس کو ———— (DECHESEAUX) نے دریافت کیا تھا۔ اس میں ۶ نمایاں دمیں تھیں اور ان کو خالی آنکھ سے دیکھا جاسکتا تھا۔ اسی طرح ۱۸۶۱ء کے دم دار ستارہ میں چار نمایاں دمیں تھیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں ۲۳ الگ الگ شعاعیں بھی موجود تھیں۔ اور ۱۸۴۳ء کے دم دار ستارہ میں دو دمیں تھیں جو ایک دوسرے سے ۱۶۰° کے زاویہ کے فاصلہ پر تھیں۔

دم کی لمبائی چھوٹے دم دار ستاروں کی دم پچاس لاکھ میل کے لگ بھگ لمبی ہوتی ہے۔ مگر بڑے ستاروں میں کافی لمبی لمبی دمیں ہوتی ہیں جو کروڑوں کے ہندسہ میں آتی ہیں جیسے ۱۸۶۱ء کے دم دار ستارہ کی دم ۲۴،۰۰۰،۰۰۰ میل لمبی تھی اور ۱۰۵° آسمان پر سے خم دار بھی تھی۔ ۱۸۸۲ء کے دم دار ستارہ کی دم بھی کافی لمبی تھی اور بعض کی دمیں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ افق (

سے لے کر نقطہ سمت الراس (ZENITH) تک پہونچ جاتی ہیں۔ مگر ۱۸۴۳ء کے دم دار ستارہ کی دم اب تک نظر آنے والے تمام ستاروں میں سب سے بڑی تھی یعنی وہ بیس کروڑ میل لمبی تھی جو تقریباً زمین کے مدار کا ۵/۶ ہے۔

اتنی لمبی لمبی دموں کے باعث بعض اوقات یہ ستارے کسی قریبی سیارے کو اپنی زد میں بھی لے لیتے ہیں ۱۸۸۲ء کا دم دار ستارہ براہِ راست زمین اور آفتاب میں سے گزرا۔ اسی طرح ۳۰ جون ۱۸۶۱ء کو ہماری زمین تبت کے دم دار ستارہ کی دم سے براہِ راست گذری اور اسی طرح ۱۹ مئی ۱۹۱۰ء کو بھی ہماری زمین ہیلے کے دم دار ستارہ کی دم سے گذری مگر ہماری زمین کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ کیونکہ دم گیسوں اور ذرات پر مبنی ہوتی ہے۔ اور ایک اندازہ کے مطابق بڑے دُم دار ستارہ کی مقدار بھی زمین کے $\frac{1}{1,000,000}$ سے بھی کم ہوتا ہے لہٰذا دم دار ستاروں کی کثافت تقریباً صفر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کثافت حجم اور مقدار مادہ کی نسبت کا نام ہے اور دم دار ستاروں کی دم میں کمیت کم ہوتی ہے اور ان کی وسعت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کو اس طرح سمجھئے تو اور زیادہ آسان ہو جائے گا کہ بجلی کے بلب میں سے حتی الوسع تمام ہوا پمپ کے ذریعہ نکال لی جاتی ہے۔ اور خلا پیدا کر دیا جاتا ہے لیکن حساب لگانے سے پتہ چلتا ہے کہ دم دار ستاروں کی دم اس سے کہیں زیادہ مکمل خلا کی حامل ہوگی۔ اسی طرح شواٹس شلڈ (SCHWAARTS CHILD) کے خیال کے مطابق ہیلے کے دم دار ستارہ کے ۲۰۰۰ معکب میل میں اتنا مادہ بھی نہ ہوگا۔ جتنا معمولی ہوا کے ایک مکعب انچ میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی دم سے گذرنے پر نہ تو زمین کو کوئی نقصان ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے مدار میں کوئی فرق آتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ان دنوں آسمان پر لاتعداد جگنو چمکتے ہوئے نظر آئے۔ اور ستارے ٹوٹتے دیکھے گئے۔ یہ باتیں اس وجہ سے تھیں کہ جب دم کے ذرات زمین کی کشش میں آکر کئی لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں تو ہوا کی رگڑ سے گرم ہو کر جل اٹھتے تھے جس کی چمک کبھی جگنو جیسی معلوم ہوتی تھی اور کبھی ستارہ ٹوٹتا معلوم ہوتا تھا۔

یہ ضرور ہے کہ اب تک ہماری زمین کسی دم دار ستارے کے سر سے نہیں گذری۔ مگر یہ ناممکن نہیں ہے لیکن اگر خدانخواستہ ایسا کبھی ہوا تو سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اس سے زمین کو کافی نقصان پہونچے گا۔ کیونکہ سر کا مرکزہ ٹھوس اجزا پر مشتمل ہوتا ہے جس کی کمیت لاکھوں ٹن ہوتی ہے۔ لہٰذا جب اس کا تصادم زمین سے ہوگا۔ تو ساری دنیا میں زلزلہ آسکتا ہے اور زمین میں کافی بڑا گڑھا ہو سکتا ہے۔ اگر یہ مرکزہ جنگلات یا ویران مقام پر ٹکرائے گا تو زلزلہ۔ آندھی اور طوفان وغیرہ

قسم کے نقصانات ہوں گے۔ مگر اس کے برخلاف اگر مرکزہ آبادی والے حصہ سے ٹکرایا تو یقیناً ساری آبادی کے انسانوں کی جان کو نقصان ہوگا اور اس کے علاوہ وہ تمام باتیں بھی ہوں گی جو غیر آبادی والے علاقہ میں رونما ہوں گی۔ اس سلسلے میں سائنسدانوں نے حساب لگایا ہے کہ زیادہ تر دم دار ستاروں کے مدار ایسے ہیں جو زمین سے کافی فاصلہ پر سے گذرتے ہیں۔ لیکن ۸ کروڑ سال میں اس کا امکان موجود ہے کہ کوئی نیا دم دار ستارہ ایسا آئے جو زمین کے درمیان سے اپنا مدار رکھتا ہو جس کا نتیجہ تصادم کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ مگر اب تک ایسا کوئی واقعہ نہیں رونما ہوا جس کی بنیاد پر کچھ کہا جا سکے۔ مگر ۳۰ جون ۱۹۰۸ء کو ایک ایسا واقعہ سائبیریا میں ضرور ہوا تھا جس کے بارے میں بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ دم دار ستارے کے سر کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ ابھی تک یہ بات حتمی طور پر تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ اب اگر اس واقعہ کو جیسا کہ بعض حضرات کہتے ہیں مان لیا جائے تو پھر اس رو سے اس وقت ایک زبردست دھماکا ہوا جس سے بے شمار لوگ بے ہوش ہو گئے اور یہ آواز ہزاروں میل دور تک ریکارڈ کی گئی تھی۔ ۳۰ میل کے دائرے میں درخت جڑوں سے اکھڑ کر ہوا میں اڑنے لگے تھے ایک سو میل کے فاصلہ پر واقع ریلوے اسٹیشن کے شیشے کی کھڑکیاں چکنا چور ہو چکی تھیں۔ اور چار سو میل دور چلتا ریلوے انجن رک گیا تھا۔ بحر الکاہل اور بحر ہند میں بڑا خوفناک طوفان آیا جس نے کافی تعداد میں جہازوں اور کشتیوں کو نقصان پہونچایا۔ اور سمندروں کی سطح پر لاکھوں مچھلیاں مردہ حالت میں تیرتی نظر آئیں ——— اس بات کو درست ماننے کے بعد اب ایک خوشخبری سنیئے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اب تقریباً ۸ کروڑ سال تک کوئی ایسا حادثہ نہیں ہوگا۔

دم دار ستارہ جب آفتاب کے سامنے سے گزرتا ہے تو آفتاب کی کشش اور گرمی کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ کیونکہ دم دار ستاروں کی دم گیسوں اور ذرات پر مشتمل ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کا کچھ حصہ اور بعض اوقات آدھا حصہ دم سے کٹ کر الگ ہو جاتا ہے اور جب یہ ستارہ آفتاب سے دور ہو جاتا ہے تو باقی ماندہ حصہ سمٹ کر اس کے سر میں آجاتا ہے۔ مگر چونکہ اس کے سر یا مرکزہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ لہٰذا دوبارہ یہ جب آتا ہے تو اس کے ہالے کی گیسوں سے دم پھر وجود میں آجاتی ہے مگر پہلی دم سے کم ہوتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس کی دم چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ دم دار ستارے کی دم تقریباً معدوم ہو جاتی ہے اور صرف مرکزہ یا سر ہی رہ جاتا ہے۔ اس طرح جو کبھی دم دار تھا۔ اب دم کٹا ہو جاتا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ کسی ستارہ کی یہ حالت ۔ ۱۰۰۰ مرتبہ آفتاب کے سامنے سے گذرنے پر رونما ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں بیلے کا دم دار ستارہ پیش کیا جا سکتا ہے جس کا مطالعہ اور مشاہدہ اس کے کئی چکروں سے کیا جا رہا ہے۔ اور اس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس کی دم میں بتدریج

کمی واقع ہو رہی ہے اور اس کی چمک میں بھی کمی ہو رہی ہے اور اس کی گیسوں کی تعداد میں بھی کمی ریکارڈ کی گئی ہے۔

دم دار ستارہ کی موت صرف اسی وجہ سے نہیں ہے کہ اس کی دم کا حصہ آفتاب کے پاس سے گذرنے سے کم ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں جیسے ستمبر ۱۸۸۲ء دوم کا دم دار ستارہ جب سورج سے ۴۶۰,۰۰۰ کلومیٹر کے فاصلے سے ۵۰۰ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے گذرا تو آفتاب کی اس قدر قربت کے باعث اس کی بے حد گرمی سے اس کا مرکزہ پانچ حصوں میں ٹوٹ گیا جس میں سے دو حصے بے حد چمکدار تھے۔ بعدازاں ان دونوں نے اپنا دم بھی بنالی یعنی وہ دونوں خود الگ الگ دم دار ستارہ بن گئے —— اس بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تمام دم دار ستارے شروع میں آپ ہی دم دار ستارہ ہوں گے اور آفتاب کے پاس سے گذرنے پر ان کے اسی طرح حصہ ہو گئے ہوں جیسا کہ ستمبر ۱۸۸۲ء دوم کے دم دار ستارہ کے ہوئے ہیں۔ اور یہی حصے بعد میں دوسرے دم دار ستاروں کی صورت میں رونما ہوتے رہے ہوں۔ اور یہ عمل جاری رہا ہو جیسا کہ اس ستارہ کے ساتھ ہوا۔ اس ستارے کے وہ حصے جو خود دم دار ستارہ بن گئے ہیں۔ وہ ۷۵۰ سال میں دوبارہ نمودار ہوں گے —— اسی طرح بائیلا نامی دم دار ستارہ جو تقریباً ہر سات سال بعد نظر آتا تھا اسی کو ۱۸۴۶ء میں اسی طرح کا ایک حادثہ پیش آیا یعنی وہ اچانک اپنی گردش میں دو ٹکڑے ہو گیا۔ کئی دن تک یہ دونوں ٹکڑے ایک دوسرے کے پاس رہے اور پھر رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے دور ہونے لگے اور یہ ٹکڑے بذات خود دم دار ستارہ نہ بن سکے کیونکہ یہ کشش ثقل کی وجہ سے اپنا توازن یا مرکزہ برقرار نہ رکھ سکے اور چند سالوں کے اندر ریزہ ریزہ ہو گئے۔

چند اہم ستارے

یوں تو دم دار ستارے کافی بڑی تعداد میں موجود ہیں مگر ان میں سے بعض خاص وجوہات کی بنا پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہاں پر ان میں سے چیدہ چیدہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۱) ہیلے کا دم دار ستارہ

سائنسداں ایڈمنڈ ہیلے نے سب سے پہلے نیوٹن کے دریافت کردہ قانون تجاذب کو بنیاد بنا کر ۱۶۸۲ء میں نظر آنے والے دم دار ستارہ کے بارے میں معلومات جمع کرنا شروع کیں کہ آیا اس کے اور سورج کے درمیان کسی قسم کا تعلق ہے کہ نہیں۔ اگر ہے تو یہ دونوں ایک دوسرے کو کتنی قوت سے کھینچ رہے ہیں اور اس کشش سے اس دم دار ستارہ کی حرکت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ بڑی جدوجہد اور کاوش کے بعد ہیلے یہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ یہ دم دار ستارے آفتاب کی کشش کے باعث بیضوی شکل کے مدار میں حرکت کرتے ہیں پھر اس نے حساب کے کلیہ کی مدد سے یہ دریافت کیا کہ موجودہ ستارہ کا بیضوی راستہ کیسا ہے اور اس پر یہ ستارہ کتنے عرصہ میں حرکت کر کے پھر آفتاب کے پاس آئے گا۔ اس کا نتیجہ یہ بتاتا تھا کہ یہ ستارہ ۷۵ یا ۷۶ سال میں ایک چکر پورا کرے گا۔ اس سے ہیلے کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر یہ نتیجہ درست ہے تو اس ستارہ کو اتنی مدت کے بعد پھر سورج کے پاس آنا چاہیئے۔ اور اسی طرح ماضی

میں بھی یہ اتنی ہی مدت سے چکر لگاتا رہا ہوگا۔ لہٰذا اس نے دم دار ستاروں کی پرانی تاریخ کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور اس میں اس بات کو مدِ نظر رکھا کہ اس خوبی والا ستارہ جو ابھی یعنی ۱۶۸۲ء میں نظر آیا ہے۔ ۷۵ یا ۷۶ سال پہلے بھی نظر آیا تھا کہ نہیں۔ اسی ستارہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے اور تھی کہ یہ بے حد روشن ستارہ ہے اور دن کے وقت بھی آسمان پر چمکتا ہے۔ رات کو مثل مہتاب روشنی دیتا ہے۔ لہٰذا اس نے دیکھا ۱۶۰۷ء میں واقعی ایک بڑا روشن دم دار ستارہ نظر آیا تھا اور صرف ۱۶۰۷ء میں ہی نہیں بلکہ ایسا ہی روشن دم دار ستارہ ۱۵۳۱ء میں بھی نظر آیا تھا۔ یہ باتیں اس کے نتیجہ کو تقویت پہونچانے کے لئے کافی تھیں لہٰذا اس نے پیشین گوئی کی کہ یہ دم دار ستارہ ۱۷۵۸ء کے آخر یا ۱۷۵۹ء کے اوائل میں دوبارہ پھر نظر آئے گا۔ اس کی اس پیشین گوئی پر زیادہ تر ہیئت دانوں کو یقین نہ آیا اور ان میں سے بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہیلے نے صرف شہرت حاصل کرنے کے لئے ایک فرضی تاریخ کی پیشین گوئی کی اور اس میں اس نے یہ چالاکی کی ہے کہ اس قدر زیادہ مدت رکھی ہے کہ اس وقت تک اس کا انتقال ہو چکا ہوگا ـــــ شاید اسی لئے ہیلے نے صرف اسی قدر تحریر کیا ـــــ "اگر یہ دم دار ستارہ ہمارے حساب لگانے کے مطابق ۱۷۵۸ء کے قریب واپس آجائے تو مستقبل کے غیر جانب دار لوگ اس بات کے ماننے میں تامل نہ کریں کہ اس کا انکشاف ایک انگریز نے کیا تھا۔"

وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ نیوٹن کا نظریۂ تجاذب روز بروز مقبول ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا ہیلے کی پیشین گوئی کے بارے میں بھی یقین مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ اس طرح جوں جوں ۱۷۵۸ء قریب آنے لگا اس ستارے کے مشاہدے کی تیاریاں زیادہ سے زیادہ کی جانے لگیں اور یہ انتظار کیا جانے لگا کہ یہ کب آفتاب کے قریب ترین فاصلے پر ہوگا اور اس پر مشتری اور زحل کے کیا اثرات ہوں گے۔ یہ حسابی عمل کافی دشوار امر تھا مگر فرانس کے ہیئت داں کلے رو (CLAIRAUT) نے اپنے دو معاونوں کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھایا اور چھ ماہ تک مسلسل کام کرکے اس کی آمد کی تاریخ سے قبل یہ بتایا کہ اسی ستارہ پر ۵۱۸ دن مشتری کے باعث اور ۱۰۰ دن زحل کے باعث کم ہو جائیں گے۔ گویا اب یہ ۱۳۔ اپریل ۱۷۵۹ء کو آفتاب کے قریب ترین فاصلہ پر ہوگا۔

اس اعلان کے بعد بہت سے ہیئت دانوں نے اس کو آسمان پر دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کو دیکھنے کا سہرا ایک کسان پالیٹش (PALITIZSCH) کے سر رہا جس نے اس کو ۱۲ مارچ ۱۷۵۹ء کو یعنی کلے رو کے بتائے ہوئے دن سے ایک ماہ قبل دیکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کلے کے حساب میں خامی رہ گئی تھی، کیونکہ اس وقت تک یورنیس اور نیپچون دریافت نہیں ہوئے تھے۔

اس کے بعد ہیلے کا دم دار ستارہ ۱۸۳۵ء میں اپنے وقت سے چار روز قبل دیکھا گیا اور اس مرتبہ

اس کو ٹلی کی رصدگاہ کے سپرنٹنڈنٹ نے دیکھا پھر اس کے بعد یہ ۱۹۱۶ء میں نظر آیا۔ اس مرتبہ اس کو جرمنی کے ہیئت داں وولف (WOLF) نے دیکھا۔ اب یہ ۱۹۸۵ء میں دوبارہ نظر آئے گا۔

یہودیوں کی مذہبی کتاب کا قصہ

یہ ایک عجیب وغریب بات ہے کہ تقریباً اتنی ہی مدت میں نظر آنے والے ستارہ کا ذکر یہودیوں کی مذہبی کتاب میں ایک قصے کی صورت میں بھی ملتا ہے جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید وہ حضرات اس بات سے واقف تھے کہ یہ [دُم دار ستارے] ایک مخصوص مدت کے بعد آسمان پر جلوہ گر ہوتے ہیں وہ قصہ یوں ہے۔

دو فلسطین کے دو عالم، گیمبل اور جوسو ساتھ ساتھ بحری سفر کر رہے تھے۔ اول الذکر صرف روٹی لایا تھا۔ آخر الذکر اپنے ہمراہ روٹی کے علاوہ کچھ آٹا بھی لایا تھا۔ جب گیمبل کی روٹیاں ختم ہوگئیں تو اس نے اپنے ہمراہی جوسو سے کچھ آٹا مانگا اور اس سے کہا کہ شاید تمہیں اس بات کا علم تھا کہ اس سفر میں تاخیر ہوگی اسی وجہ سے تم سامان خوردونوش بھی اپنے ساتھ لائے۔ جوسو نے جواب دیا کہ ایک بڑا منور ستارہ ہے جو ہر ستر (۷۰) سال میں آتا ہے اور جہاز رانوں کو دھوکا دیتا ہے۔ میں نے خیال کیا کہ ہمارے سفر میں یہ چمکتا نظر آکر اس میں تاخیر پیدا کر دے گا۔ یہی سبب ہے کہ میں خوراک کا سامان بھی اپنے ہمراہ لایا ہوں۔

[اگست ۱۹۱۰ء کے اب زرد لیٹری رسالہ سے] اس سلسلے میں ایک فرانسیسی ریاضی داں کا کہنا ہے کہ یہ ستارہ پہلے کا دم دار ستارہ تھا کیونکہ یہ دم دار ستارہ بے حد روشن ہوتا ہے اور اس کے دیکھے جانے کا ذکر چین میں چار ہزار سال قبل مسیح میں بھی ملتا ہے۔ اسی طرح اس کو ارسطو نے بھی اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ کاویل (COWELL) اور کرام لین (CROMMLIN) نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ یہ ستارہ ۸۰ ق.م سے کر ۱۹۱۰ء تک اکیس مرتبہ جلوہ افروز ہو چکا ہے۔

اینکے کا دُم دار ستارہ

اس ستارہ کو سب سے پہلے مس کیرولین ہرشل (CARO LINE HARSCHELL) نے ۱۷۹۵ء میں دیکھا تھا پھر اس کے بعد فرانس کے پانس (PONS) نے اس کو دوبارہ ۱۸۱۸ء میں دیکھا اور اس کا مدار معلوم کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں ناکامیاب رہا اور پھر اس کے بعد اس پر اینکے نے کام کیا اور اس نے اس کا مدار قطعہ ناقص دریافت کیا اور اس کی بتائی ہوئی تاریخ پر یہ ستارہ دوبارہ نظر آیا۔ اینکے کی محنت کو مدِ نظر رکھ کر ہیئت دانوں نے اس کا نام اس کے ہی نام پر رکھ دیا۔

یہ دم دار ستارہ ۳⅓ سال کی مدت میں ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ سب سے کم مدت کا دم دار ستارہ ہے جو دریافت ہو سکا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلے کے

دوسرا ستارہ تھا جو قطعہ مکافی کے بجائے قطعہ ناقص میں حرکت کرتا ہوا دریافت ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کی مدت برابر کم ہوتی جا رہی ہے پہلے اس کی مدت میں تقریباً ڈھائی گھنٹے کی ریکارڈ کی جا رہی تھی مگر اب یہ کمی اور کم ہو گئی ہے اس طرح اس کا مدار بھی دن بدن کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔

یہ ستارہ اس قدر چھوٹا ہے کہ بغیر دوربین کے نظر نہیں آتا۔ مگر بعض اوقات اس کو لوگوں نے بغیر دوربین کے بھی دیکھا ہے۔

بیلا کا دُم دار ستارہ سب سے پہلے ۱۸۲۶ء میں آسٹریا کے ایک شخص ولیم وان بیلا (WILLIAM VON BEILLA) نے اس کو دیکھا اور حساب لگانے سے معلوم ہوا کہ یہ ستارہ تقریباً چھ سات سال بعد چکر لگاتا ہے۔ اسی طرح اس کو ۱۷۷۲ء میں بھی ایک فرانسیسی نے خالی آنکھ سے دیکھا تھا۔ بہر حال اسی حساب سے یہ برابر نظر آتا رہا۔ ۱۸۴۵ء میں جب نظر آیا تو اول اول یہ اپنی صحیح جسامت اور شکل و صورت میں نظر آیا۔ مگر بیس (۲۰) دن کے بعد اس میں تغیر رونما ہوا اور یہ درمیان سے باریک اور سروں پر گول سا ہو گیا۔ اس حالت میں یہ دس دن تک رہا اور پھر ۵ / جنوری ۱۸۴۶ء کو کیمبرج کے پروفیسر چیلس نے اس کا مشاہدہ کیا۔ تو وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اب وہاں ایک ستارہ کے بجائے دو ستارے موجود ہیں۔ لہٰذا اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا "یہ کیا یہاں تو اب دو دُم والے ستارے نظر آ رہے ہیں!" ——— اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ بیلا دُم دار ستارہ ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔

یہ دونوں حصے خاموشی سے آفتاب کا طواف کرتے رہے۔ نہ تو انھوں نے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچا اور نہ ہی عمل دفع مؤثر نظر آیا۔ اس کے برخلاف ان کی اپنی دُمیں پیدا ہو گئیں اور ان کے سر میں مرکزہ بھی دیکھا گیا اور ان میں سے کبھی ایک زیادہ منور ہو جاتا اور کبھی دوسرا اور بعض اوقات تو دونوں کے درمیان روشنی کا پل سا نظر آتا۔

۱۸۵۲ء میں دونوں ستارے پھر نظر آئے مگر اس مرتبہ ان کے درمیان پہلے کی بہ نسبت تقریباً آٹھ (۸) گنا زیادہ فاصلہ ہو چکا تھا۔ چند دن تو وہ اپنی جھلک دکھاتے رہے اور پھر آسمان سے اس طرح غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اور اب تک نظروں سے اوجھل ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ہر چھ سات سال بعد جب بیلا کے ستارے کے نظر آنے کا وقت ہوتا ہے یا یوم وفات آتا ہے اس وقت شہاب ثاقب کی بےحد بوچھار نظر آتی ہے۔ ایک نظریے کے مطابق یہ شہاب ثاقب اسی ستارے کے ٹکڑے ہیں ——— بیلا کے

ستارہ کے دو حصے ہونے کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ جب یہ مشتری جیسے بڑے سیارے کے قریب سے گذرا تو اس کی کشش کی وجہ سے دو ٹکڑے ہوگیا اور بعد ازاں مزید ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اور اس طرح ریزہ ریزہ ہوکر فضا میں منتشر ہوگیا۔

ایک مدار کے مسافر ۱۶۶۸ء، ۱۸۴۳ء، ۱۸۸۰ء، ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۷ء کے دُم دار ستارے

ان تمام دُم دار ستاروں کا مدار ایک ہی ہے۔ یہ سب کے سب بے حد روشن بھی ہیں اور ان کی شکل و شباہت بھی ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے اور یہ سب کے سب مشرق کی سمت سے ہماری طرف آتے ہیں۔ ان تمام مماثلت کے باعث اول اول لوگ بڑے پریشان ہوئے کہ ۱۸۴۳ء کے ستارہ کو ۶۰۰ سال بعد آنا تھا پھر آخر یہ ۱۸۸۰ء میں کیسے نمودار ہوا۔ ابھی لوگ اس مسئلہ کو حل نہ کر پائے تھے کہ ۱۸۸۲ء میں پھر ایک دُم دار ستارہ اسی مدار میں گردش کرتا ہوا نظر آیا۔ یہ بے حد روشن تھا۔ اور اس کی دُم ۲۵ کروڑ میل لمبی تھی۔ لوگ ایک بار پھر پریشان ہوئے کیونکہ اگر یہ مان لیا جاتا کہ ۱۸۸۰ء کا دم دار ستارہ کوئی دوسرا تھا اور وہ اتفاق سے اسی مدار میں حرکت کر رہا تھا جس میں ۱۸۴۳ء کا دم دار ستارہ۔ تو بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا کیونکہ ۱۸۸۰ء کے دم دار ستارہ کو ۸۰۰ سال بعد آنا تھا ——— مگر یہ مسئلہ خود بخود حل ہوگیا۔ ہوا یہ کہ ۱۸۸۲ء کا دم دار ستارہ جب اپنی گردش کے دوران آفتاب سے صرف تین لاکھ میل کے فاصلہ پر آیا تو اس کو ایک حادثہ پیش آگیا جس سے یہ ستارہ چار حصوں میں منقسم ہوگیا اور اس کے ہر حصے کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ اس سے یہ خیال اخذ کیا گیا کہ یہ تمام دُم دار ستارے اول ایک بڑا دُم دار ستارہ تھا۔ مگر اس کو بھی کوئی ایسا ہی حادثہ پیش آیا ہوگا جس سے اس کے پانچ ٹکڑے ہوئے جن میں سے چار ۱۸۸۲ء تک نظر آئے اور پانچواں ٹکڑا ۱۸۸۷ء میں نظر آیا مگر اب اس مدار پر آٹھ (۸) دم دار ستارے گردش کر رہے ہیں۔

کرائے ٹیش (KREUTZ) نے ۱۸۸۲ء کے دم دار ستارہ کے ٹکڑوں کے مدار اور مدت نکالی ہے جس کی رو سے یہ ۶۶۴ - ۷۶۹ - ۸۷۵ اور ۹۵۹ سال میں اپنا چکر مکمل کریں گے۔

شواسمن واخمن کا دُم دار ستارہ

اس ستارہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دیگر دم دار ستاروں کے مقابلے میں دائرہ کی شکل میں حرکت کرتا ہے۔ اس کا مدار مشتری اور زحل کے مداروں کے درمیان واقع ہے۔ اس کے علاوہ اس کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی چمک بعض اوقات بڑھتی اور گھٹتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا

ہے۔ یہ مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوسکا ہے اس کو کافی طاقت ور دوربین سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ آفتاب سے کافی فاصلہ سے گذرتا ہے۔ اسی لئے اس کی دم بھی نہیں بنتی مگر یہ ایک مادے کے لحاظ سے دم دار ستارہ ہی ہے۔

تبت کا دم دار ستارہ یہ ستارہ ۱۸۶۱ء میں دریافت ہوا تھا۔ کافی بڑا ستارہ تھا۔ مگر اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی دم سے ہماری زمین گزری تھی اور اس زمین کو کوئی خاص نقصان نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ ان ستاروں کی دم میں کاربن مانو آکسائڈ اور کاربن ڈائی آکسائڈ پائی جاتی ہیں۔ اور یہ ان میں اول الذکر زہریلی ہے۔ خیال ہے کہ جب یہ گیس ہماری فضا میں آتی ہے تو آکسیجن سے مل کر کاربن ڈائی آکسائڈ بنا لیتی ہے۔ اور ہم لوگ اس کے زہریلے پن سے محفوظ رہتے ہیں۔

مسلمانان کراچی وسندھ کی تعلیم

اس کتاب کے مولف سید مصطفےٰ علی بریلوی ہیں۔ انھوں نے پاکستان کے مختلف حصوں کے قیام پاکستان کے قبل کی تعلیمی پالیسی اور تعلیمی حالت کا تفصیلی جائزہ لے کر الگ الگ کتابی شکل میں مرتب کیا ہے۔ زیرنظر کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ لیکن مؤلف کی پہلی کوشش ہونے کے باوجود اس کو بعد کی تالیف سے کم تر نہیں قرار دیا جاسکتا۔ انھوں نے عہد قدیم سے پاکستان تک کی کراچی اور سندھ کی تعلیم کے سلسلے میں مختلف ماخذوں کو کھنگالا ہے اور بہت سے لوگوں سے مل کر اور تحریری ریکارڈوں کو چھان پھٹک کر یہ مواد جمع کیا ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ انھوں نے قطرہ قطرہ جمع کرکے ایک دریا بنا دیا ہے۔ واقعات کو زیادہ واضح اور مستند بنانے کے لئے جو اعداد شمار فراہم کئے گئے ہیں وہ ایک ایسے فرد کی لگن اور تن دہی کا بیّن ثبوت ہے جس کو اپنے مضمون سے گہری دلچسپی ہو۔ کتاب ہٰذا میں جو اعداد پیش کئے گئے ہیں۔ انھیں دیکھ حیرت ہوتی ہے کہ مؤلف نے اس قدر مختلف النوع اشیاء کے اعداد کہاں سے اور کس طرح اکٹھا کئے۔ مختلف نوعیت کے اسکولوں اور کالجوں کی تعداد مسلمان اور ہندو طلبا کی مختلف امتحانات میں شرکت کرنے اور پاس ہونے والوں کی تعداد وظیفہ پانے والوں کی تعداد مسلمان اساتذہ کی تعداد۔ غرض تعلیم سے متعلق کوئی ایسی چیز نہیں بچی جس کی تعداد پوری تحقیق وتفتیش کرکے نہ دی گئی ہو۔ کتاب کے مقدمہ نگار مرزا علی اظفر برلاس نے صحیح کہا ہے کہ "سید مصطفےٰ علی صاحب بریلوی نے صوبۂ سندھ کے متعلق انگریزوں کی پالیسی کا بہت غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اور یہ گنتی کے ان چند نوجوانوں میں ہیں جن کو کراچی کی کاروباری فضا کے باوجود تاریخی تحقیق سے دلچسپی ہے۔ اور اپنے نتائج فکر کو ملک وملت کے سامنے اس لئے پیش کرتے ہیں کہ گذشتہ غلطیوں سے متنبہ ہو کر قومی تحفظ کے لئے صحیح لائحۂ عمل تیار ہوسکے۔

علامہ اقبال کی مثنوی "مسافر"

اور اس کا پیغام

بجناب مولانا اسمٰعیل ذبیح (پشاور)

اقبال کے کلام کے بے شمار رنگا رنگ پہلوؤں میں سے کسی کا انتخاب کرنا ایک امرِ دشوار ہے۔ کیونکہ

ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

لیکن جب میری نظر علامہ کی ایک "مثنوی مسافر" پر پڑی تو میں نے محسوس کیا کہ یہ وقت کی آواز ہے۔ اور اس کے پیغام کی وسعتیں اسلامی اتحاد، تبلیغِ دین اور اتحادِ عالم اسلام پر محیط ہیں تو میں نے آج کے مختصر مقالے کے لئے اسی کو موضوع بنا لیا ہے۔

یہ "مثنوی مسافر" اور "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" ایک ہی جلد میں شائع ہوئی ہیں۔ اور اپنی معنویت کے لحاظ سے دونوں کا موضوع ایک ہے۔ "مثنوی مسافر" علامہ اقبال کا سفرنامۂ افغانستان ہے۔ اس میں اہلِ افغانستان سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس میں غزنوی، سنائی اور ابدالی کی پاک روحوں سے بھی مکالمے کئے گئے ہیں۔ اور دوسری مثنوی میں ان کے حکیمانہ کلام کے مخاطب اقوام شرق اور امتِ عربیہ ہیں۔

علامہ اقبال کو ماضی کے ہزار سالہ جاں پرورانہ، روحانی، مذہبی، علمی اور ادبی رشتوں کی بنا پر سرزمینِ افغانستان سے والہانہ محبت رہی ہے اور جب علامہ کو اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے کابل آنے کی دعوت دی تو وہ ایک عاشقانہ ادا کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے۔

اپنی مثنوی کے آغاز میں وہ نادر شاہ مرحوم کی جس انداز میں تعریف کرتے ہیں اس کا نمونہ آپ بھی سماعت فرمائیے۔

نادرِ افغان، شہِ درویش خو	رحمتِ حق بر روانِ پاکِ او
کارِ ملت محکم از تدبیرِ او	حافظِ دینِ مبیں شمشیرِ او
چوں ابوذر خود گداز اندر نماز	سر بہتش ہنگامِ کیں خارا گداز
عہدِ صدیق از جمالش تازہ شد	عہدِ فاروق از جلالش تازہ شد
فقر و شاہی وارداتِ مصطفےٰ است	ایں تجلی ہائے ذاتِ مصطفےٰ است
اے صبا اے رہ نوردِ تیز گام	در طوافِ مرقدش نرمک خرام

از حضورِ او مرا فرماں رسید — آنکہ جانِ تازہ در خاکم دمید
سوختیم از گرمیٔ آوازِ تو — اے خوش آں قومے کہ داند رازِ تو
از غمِ تو ملتِ ما آشنا ست — می شناسیم ایں نواہا از کجا ست

اس کے بعد علامہ "خطاب بہ اقوامِ سرحد" کے تحت صوبۂ سرحد کے غیور پٹھانوں سے خطاب فرماتے ہیں۔

اے زخود پوشیدہ خود را باز یاب — در مسلمانی حرام است ایں حجاب
چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش — زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش
بندۂ حق وارثِ پیغمبراں — او نگنجد در جہانِ دیگراں
فطرتِ اُو را کشاد از ملت است — چشمِ او روشن سواد از ملت است
اندکے گم شو بقرآن و خبر — باز اے ناداں بخویش اندر نگر

اس کے بعد علامہ "مسافر وارد می شود بہ شہرِ کابل و حاضری می شود بحضورِ اعلیٰ حضرت شہید" کے عنوان سے اپنا وہ پُرسوز مکالمہ دہراتے ہیں جو نادر شاہ شہید کی زندگی میں اُن سے ہوا۔

شہرِ کابل! خطۂ جنت نظیر — آبِ حیواں از رگِ تاکش بگیر!
شاہ را دیدم دراں کاخِ بلند — پیشِ سلطانے فقیرے دردمند
قصرِ سلطانی کہ نامش دلکشاست — زائراں را گردِ راہش کیمیاست
من حضورِ آں شہِ والا گہر — بے نوا مردے بدربارِ عمر رضؓ
شہریارے چو حکیمانِ نکتہ داں — رازدارِ مدّ و جزرِ امتاں
گفت ازاں آتش کہ داری در بدن — من ترا دانم عزیزِ خویشتن
در حضورِ آں مسلمانِ کریم — ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم
نشۂ حرفم بخونِ او دوید — دانہ دانہ اشک از چشمش چکید
گفت "نادر در جہاں بے چارہ بود — از غمِ دین و وطن آوارہ بود
غیر قرآں غمگسارِ من نہ بود — قوتش ہر باب را برمن کشود

وقتِ عصر آمد صدائے الصلوات — آں کہ مومن را کند پاک از جہات

انتہائے عاشقاں سوز و گداز　　کردم اندر اقتدائے او نماز
رازہائے آں قیام و آں سجود　　جز بہ بزمِ محرماں نتواں کشود!

اس کے بعد علامہ بر "مزارِ شہنشاہ بابر خُلد آشیاں" حاضری دیتے ہیں۔ اور جس انداز میں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں وہ ان دو اشعار میں ملاحظہ ہو۔

زمانہ کہنہ بتاں را ہزار بار آراست　　من از حرم نہ گذشتم کہ پختہ بنیاد است
خوشا نصیب کہ خاکِ تو آرمید اینجا　　کہ ایں زمیں ز طلسمِ فرنگ آزاد است

اس کے بعد علامہ "سفرِ غزنی و زیارتِ مزارِ حکیم سنائی" اور پھر "روحِ حکیم سنائی از بہشتِ بریں جواب می دہد" کے دو عنوانوں کے تحت اس عظیم عاشقِ رسول کریمؐ سے جو راز و نیاز کرتے ہیں خدا آپ بھی دل کے پٹ کھول کر اُس کا سُرور حاصل کریں۔

آہ! غزنی آں حریمِ علم و فن　　مرغزارِ شیرِ مردانِ کہن
خفتہ در خاکش حکیمِ غزنوی　　از نوائے او دلِ مرداں قوی
من ز پیدا، او ز پنہاں در سرور　　ہر دو را سرمایہ از ذوقِ حضور
او نقاب از چہرۂ ایماں کشود　　فکرِ من تقدیرِ مومن وا نمود
ہر دو را از حکمتِ قرآں سبق　　او ز حق گوید، من از مردانِ حق
در فضائے مرقدِ او سوختم　　تا متاعِ نالۂ اندوختم
گفتم اے بینندۂ اسرارِ جاں　　بر تو روشن ایں جہان و آں جہاں
مومن از افرنگیاں دید آنچہ دید　　فتنہ ہا اندر حرم آمد پدید
آنچہ اندر پردۂ غیب است گوئے　　بو کہ آبِ رفتہ باز آید بجوئے

حکیم سنائی کی روح علامہ کو جواب دیتی ہے:-

رازدانِ خیر و شر گشتم ز فقر　　زندہ و صاحب نظر گشتم ز فقر
یعنی آں فقرے کہ داند راہ را　　بیند از نورِ خودی اللہ را
می ندانی عشق و مستی از کجاست؟　　ایں شعاعِ آفتابِ مصطفےٰ است
زندہ تا سوزِ او در جانِ تست　　ایں نگہ دارندۂ ایمانِ تست

اے مسلماں! جز براہِ حق مرو — نا امید از رحمتِ عامے مشو

اس کے بعد علامہ "برمزارِ سلطان محمود علیہ الرحمۃ" حاضری دیتے ہیں۔ اور تخمِ اشکے اندرون ویرانۂ غزنی" کاشت کرتے ہیں۔

خیزد از دل نالہ ہائے بے اختیار — آہ! آں شہرے کہ اینجا بود یار!
گنبدے! در طوفِ اُو چرخِ بریں — تربت سلطان محمود است ایں
برقِ سوزاں تیغ بے زنہارِ اُو — دشت و در لرزندہ از یلغارِ اُو
زیرِ گردوں آیت اللہ را نقش — قدسیاں قرآں سرا بر تربتش
مہرِ گردوں از جلالش در رکوع — از شعاعش دوش می گردد طلوع!
قصرہائے اُو قطار اندر قطار — آسماں با قبۂ ہایش ہم کنار
نکتہ سنج طوس را دیدم بہ بزم — لشکرِ محمود را دیدم برزم
تخمِ اشکے اندراں ویرانہ کاشت — گفتگو ہا با خدائے خویش داشت
تا نبودم بے خبر از رازِ اُو — سوختم از گرمیٔ آوازِ اُو

سلطان المجاہدین محمود غزنوی کے مزار کا حالِ زار دیکھ کر علامہ وارفتہ ہو جاتے ہیں۔ اور بڑے تاثر میں "مناجاتِ مردِ شوریدہ در ویرانۂ غزنی" کے عنوان سے پروردگار سے فریاد کرتے ہیں۔

اے خدا اے نقش بندِ جان و تن — با تو این شوریدہ دارد یک سخن
فتنہ ہا بینیم دریں دیرِ کہن! — فتنہ ہا در خلوت و در انجمن
ظاہرش صلح و صفا، باطن ستیز — اہلِ دل را شیشۂ دل ریز ریز!
از کہ گیرد ربط و ضبط ایں کائنات؟ — اے شہیدہ عشوۂ لات و منات!
مردِ حق آں بندۂ روشن نفس — نائب تو در جہاں اُو بود و بس
ایں مسلماں از پرستاراں کیست؟ — در گریبانش یکے ہنگامہ نیست!
در مصافِ زندگانی بے ثبات — دارند اندر آستیں لات و منات
با از جذب اندروں اُو را بدہ — آں جنونِ ذو فنوں او را بدہ
شرق را کن از وجودش استوار — صبحِ فردا از گریبانش برآر!

غزنی کے سابقہ جلال و جمال، انتہائے کمال اور پھر انتہائے زوال پر ماتم کناں ہوتے ہوئے علامہ قندھار پہونچے ہیں۔ جو بہت سے اولیاء اللہ کی آرام گاہ ہے۔ اور یہیں اُس عظیم مردِ مجاہد کا مزار ہے۔ جو تاریخ میں احمد شاہ ابدالی کے نام سے جاوداں رہے گا۔ وہ ابدالی جو موجودہ افغانستان کی حدودِ مملکت کا بانی ہے۔ اور اگر تاریخ کی گہرائیوں تک پہونچا جائے تو بدستِ ابدالی مرہٹوں کا خاتمہ اور بدستِ انگریز سکھوں کی شکست موجودہ پاکستان کی تشکیل کا ابتدائی خاکہ ہے۔

علامہ "بر مزارِ حضرت احمد شاہ بابا علیہ الرحمۃ موسّس ملتِ افغانیہ" حاضر ہوتے ہیں۔ اور اپنے ذوق و شوق کا اظہار جس انداز سے کرتے ہیں۔ آپ بھی اس کی روحانی کیفیت میں شریک ہو جائیے۔

تربتِ آں خسروِ روشن ضمیر　　از ضمیرش ملتے صورت پذیر

ملتے را داد ذوقِ جستجو　　قدسیاں تسبیح خواں بر خاکِ او

از دل و دستش گہر ریزے کہ داشت　　سلطنت ہا برد و بے پروا گذاشت

نکتہ سنج و عارف و شمشیر زن　　روحِ پاکش با من آمد در سخن

گفت می دانم مقامِ تو کجاست　　نغمۂ تو خاکیاں را کیمیاست

پیشِ ما اے آشنائے کوئے دوست　　یک نفس بنشیں کہ داری بوئے دوست

اے ترا حق داد جانِ ناشکیب　　تو ز سرِّ ملک و دیں داری نصیب

فاش گو با پورِ نادر فاش گو

باطنِ خود را بہ ظاہر فاش گو

اس مثنوی کا آخری حصہ "خطاب بہ پادشاہِ اسلام اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ ایدہ اللہ بنصرہٖ" کے عنوان سے ہے۔ اور یہ ایک پیغام ہے۔ جو روحِ ابدالی سے لے کر ظاہر شاہ تک پہونچانے کا فرض علامہ ادا کرتے ہیں۔ یہ ایک نصیحت نامہ ہے جو ایک نوجوان بادشاہِ اسلام کے نام اُس شخص کی طرف سے ہے جو دانائے راز ہے، جو حکیم الامت ہے۔ جو ترجمانِ حقیقت ہے۔ جو مسلمان اقوام کے عروج و زوال پر نہ صرف دیدہ بار ہوتا ہے۔ بلکہ ان کو توانا و بینا بننے کے سارے راز بھی بتلاتا ہے۔ جو صرف ملی قومیت کو مانتا ہے۔ اور جس کے نزدیک مسلمان ملکوں کے جغرافیائی حدود ایک ہی خاندان کے مختلف گھروں کی چار دیواری ہے اور جن کا نفع نقصان ایک ہے۔ اور جو تاریخ کی وہ عظیم ہستی ہے جنے مسلمانانِ ہند کو خودی سے آشنا کیا۔ اور ان میں وہ روحِ عمل پھونکی کہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں کے قبضۂ اقتدار سے آزاد ہو کر ایک عظیم سلطنت پاکستان بنا سکے۔ اور یہ تاریخِ عالم کا وہ پہلا شاعر ہے جو کسی مملکت کے تخلیقی تصور اور اس کے نظریات کے اساس کا بانی ہے۔

اور جسے مسلم اقوام عالم کو سربلند بناتے اور اسلام کی آفاق گیر تعلیمات پر ان کو متحد کرنے اور پھر کائنات کا وارث بننے کا الہامی پیغام سنایا۔

آیئے قریب آکر لوحِ دل پر ثبت ہو جانے والی یہ نصیحت آپ بھی سنیئے۔

اے قبائے پادشاہی بر تو راست — سایۂ تو خاکِ ما را کیمیاست
از تو اے سرمایۂ فتح و ظفر — تختِ احمد شاہ را شانِ دگر
حرفِ شوق آوردہ ام از من پذیر — از فقیرے رمزِ سلطانی بگیر
چوں پدر اہلِ ہنر را دوست دار — بندۂ صاحب نظر را دوست دار
می شناسی معنیٔ کرار چیست؟ — ایں مقامے از مقاماتِ علیؓ است
امتاں را در جہانِ بے ثبات — نیست ممکن جز بکراری حیات
صد جہاں باقی است در قرآں ہنوز — اندر آیاتش یکے خود را بسوز
برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است — ایں دو قوت اعتبارِ ملت است
چوں عرب اندر اروپا پر کشاد — علم و حکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند — حاصلش افرنگیاں برداشتند
ایں پری از شیشۂ اسلافِ ماست — باز صیدش کن کہ او از قافِ ماست
لیکن از تہذیبِ لادینے گریز — زاں کہ او با اہلِ حق دارد ستیز
فتنہ ہا ایں فتنہ پرداز آورد — لات و عزیٰ در حرم باز آورد
از تب و تابم نصیبِ خود بگیر — بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر!
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام — شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام
نکتہ ہائے خاطر افروزے کہ گفت؟ — با مسلماناں حرفِ پُرسوزے کہ گفت؟

پس بہ گیر از بادۂ من، یک دو جام
تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام

ذکر علامہ اقبالؒ کا ہے جن کے اشعار کے سمجھنے کا لطف بھی بقدرِ علم بقدرِ ظرف بقدرِ نظر اور بقدرِ وسعت اور اک عقل و شعور ہوتا ہے، سو حضرات! آپ بھی مثنوی کے حکیمانہ پیغام سے جس کے ۳۱۵ اشعار ہیں سے میں نے مختصر سا اقتباس پیش کیا ہے۔ خود ہی روح کا وجدان حاصل کریں۔ اور موجودہ حالات میں اس کی معنویت

سمجھیں۔ میں نے تو خوشبو پھیلادی ہے۔ اس کی مہک محسوس کیجئے۔ اس کی دھمک دل پر اس کی کسک جگر پر اور اس کی چمک دماغوں پر دستک دیتی ہے

اے خیبر کی گذرگاہو! تم اسلام کے پیغام کو صدیوں سے اِدھر سے اُدھر لے جاتے رہے ہو۔ ایک بار پھر اپنی ہواؤں کے دوش پر مثنوی مسافر کی خوشبو اُس پار پہونچا دو!

حضرات! اس مسافرت کے دوران علّامہ پر جو قلبی واردات طاری تھیں۔ اُس کے وجد میں ایک غزل گہربار بھی اس مثنوی میں شامل ہوگئی ہے۔ اس کے چند اشعار پیش کرکے میں اپنا مقالہ ختم کرتا ہوں۔

از دیرِ مغاں آیم بے گردش صہبا مست — در منزلِ لا بودم از بادۂ الّا مست

دانم کہ نگاہِ اُو ظرفِ ہمہ کس بیند — کردہ است مرا ساقی از عشوہ و ایما مست

وقت است کہ بکشائم مے خانۂ رومی باز — پیرانِ حرم دیدم در صحنِ کلیسا مست

ایں کارِ حکیمے نیست دامانِ کلیمے گیر — صد بندۂ ساحل مست یک بندۂ دریا مست

سینا است کہ فاران است؟ یا رب چہ مقام است ایں

ہر ذرۂ خاکِ من چشمے است تماشا مست

مولانا وصی علی ملیح آبادی

جناب اشتیاق اظہر

جس طرح ہر باپ استاد نہیں ہوتا اسی طرح ہر استاد باپ کی محبت اور احترام کا مستحق قرار نہیں پاتا لیکن جو استاد اس منصب جلیلہ کے مستحق گردانے جاتے ہیں۔ وہ حقیقی معنوں میں استاد ہوتے ہیں اور وہ اپنے کردار و عمل کے ذریعہ اپنے شاگردوں کے دلوں پر عزت و احترام کے وہ نقوش چھوڑ جاتے ہیں جو ان مٹ ہوتے ہیں۔ ایسے استادوں کی صف میں استاد الاساتذہ مولانا وصی علی ملیح آبادی ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایک نمایاں حیثیت کے حامل ہیں جنہوں نے مسلسل دس برس تک چمنستان علی گڑھ کے نوخیز اور تیز رو پودوں کی آبیاری کی اور ان میں ایک اچھا مسلمان ایک اعلیٰ انسان اور ایک نڈر محب وطن بننے کی تلقین فرمائی۔ اور یہ کہنا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے شاگردوں میں خدمت اسلام کی وہ لگن پیدا کی جس کے باعث وہ تحریک پاکستان کے مستعد اور فعال کارکن بن گئے لیکن وہ خود نام و نمود سے بے نیاز و بیگانہ اساتذہ کی صفوں سے باہر نکلنے اور قیادت کی خارزار راہ میں قدم رنجا فرمانے اور شہرت و شوکت کی پرخطر وادی میں قدم رکھنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے اور جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہوئے تو اپنے وطن ملیح آباد تشریف لے گئے اور خاموشی اور گمنامی کی زندگی کو جس میں اپنے اثر کی خدمت کے بے پناہ مواقع حاصل تھے۔ تمام خواہشات دنیاوی پر ترجیح دے کر زندگی کی آخری سانسوں تک اللہ اور اس کے رسولؐ کی اتباع میں مصروف و منہمک رہے۔ اور جب انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا تو بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہوا کہ تحریک پاکستان کا ایک سرگرم داعی ہزاروں شاگردوں کا واجب الاحترام استاد اور اپنے وقت کا یگانۂ روزگار عالم اور بے مثال انسان اس عالم فانی سے اس عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا جو ہر مرد مومن اور ہر مرد مجاہد کی آخری منزل ہے۔ ان کی زندگی بلاشبہ حقیقی معنوں میں اقبال کے مرد مومن کی زندگی تھی لیکن انہوں نے اس طرح یہ زندگی بسر کی کہ جب انہوں نے بساط ہستی الٹی تو ان کا دامن دنیاوی آلائشوں سے پاک تھا۔ ان کا رہن سہن۔ لباس۔ عادات و اطوار اور خوراک ایک سیدھے سادے مسلمان کی زندگی کی عکاسی کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد انھیں دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اور ان کے ایک شاگرد پیر صاحب پگاڑو جنہوں نے اوائل عمر میں ان سے دینیات کا درس لیا تھا۔ آج بھی ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔ لیکن اگر شاگرد کو استاد کا لحاظ تھا تو خود استاد کے دل میں بھی شاگرد کے لیے خصوصی جگہ موجود تھی۔ اس لئے کہ مولانا وصی علی کو پیر پگاڑو کے مجاہد والد محترم کی

خدماتِ جلیلہ کا اعتراف تھا اور اسی لئے جب انھیں عظیم مجاہد کے دو نوجوان صاحب زادوں کی مذہبی تربیت کی ذمہ داری سونپی گئی تو انہوں نے یہ خدمت بلا معاوضہ انجام دی۔ علامہ موصوف کے صاحبزادے مولوی اشرف علی کہتے ہیں کہ بس زمانہ میں وانسرائے نے موجودہ پیر پگارڈو اور ان کے چھوٹے بھائی نادرشاہ کو تعلیم و تربیت کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے سپرد کیا تو ڈاکٹر صاحب نے علامہ وصی علی سے کہا کہ آپ کچھ وقت ان بچوں کی دینی تعلیم کے لئے دیجئے، اور میری جائے قیام پر تشریف لاکر ان کی مذہبی تربیت فرمایئے۔ آپ نے یہ فریضہ بخوشی قبول فرمایا۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے معاوضہ کی بات کی تو علامہ وصی علی اس پر راضی نہیں ہوئے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ آپ کا مکان یہاں سے کافی فاصلہ پر ہے، آمد و رفت میں تکلیف و دشواری ہے۔ آپ سواری کا بندوبست فرمالیں اور یہ خرچ قبول فرمائیں۔ لیکن آپ نے اس سے بھی احتراز فرمایا۔ اور جواباً کہا کہ یہ مشہور روحانی بزرگ اور مجاہد کے بچے ہیں، کیا ہم ایسے مجاہد بچوں کے لئے اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ تھوڑی بہت مشقت برداشت کرکے ان کی مذہبی تعلیم و تربیت کے فرض کو بہ طریقِ احسن سرانجام دیں۔" لیکن افسوس ہے کہ ایسے شفیق اور فرض شناس استاد اور ایسے ہونہار اور مجاہد بچوں کا ربط و ضبط زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا۔ اس لئے کہ وزیر ہند کی ہدایت پر وائسرائے نے ان بچوں کو علی گڑھ سے لندن بھیج دیا۔ لیکن استادی شاگردی کا یہ مختصر عرصہ بھی اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا اور اس دوران خلوص و احترام کی جو روایت قائم ہوئی۔ وہ بُعدِ زمانی و مکانی کے باوجود اب بھی زندہ ہے۔ اور پیر پگارڈو آج بھی اپنے شفیق استاد کا ذکر عزت و احترام سے کرتے ہیں۔ پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل ملک غلام محمدؒ کے فرزند انعام محمدؒ کو بھی اپنے استاد سے بڑا تعلقِ خاطر تھا۔ چنانچہ جب انھیں یہ پتہ چلا کہ علامہ وصی علی مسلم یونیورسٹی سے اپنا تعلق ختم کرکے اپنے وطن ملیح آباد تشریف لے گئے ہیں تو انہوں نے بڑی کوشش کی کہ استادِ محترم ہجرت فرماکر پاکستان تشریف لے آئیں اور اس مقصد کے لئے انھیں ڈھاکہ میں ایک مذہبی منصب پیش کیا گیا۔ لیکن نام و نمود اور ہوسِ جاہ و جلال سے بے نیاز اور بے پروا یہ خالص علمی اور مذہبی شخصیت اپنے ہم وطنوں کو چھوڑنے پر تیار نہ ہوئی اور ڈھاکہ کا یہ اعلیٰ منصب شکریہ کے ساتھ واپس کردیا گیا۔ علامہ وصی علی، بڑی تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ کانپور سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لے گئے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ رواجی مذہبی مدارس اور انگریزی مدارس میں طلبہ کا میلانِ طبع مختلف ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان دو مختلف النوع اداروں کا سلیبس اور طریقِ تعلیم بھی مختلف ہے۔ لیکن وہ بے پناہ عزم و حوصلہ کے انسان تھے۔ اور انہوں نے علی گڑھ جاکر مسلم یونیورسٹی کے طلبہ پر یہ ثابت کردیا کہ خانقاہوں اور حجروں میں تعلیم و تعلم کی زندگی گزارنے والا ان تمام وہم و وساوس کا جواب جانتا ہے۔ جو مغرب کے لادینی نظریات، مغرب زدہ نوجوانوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ علامہ وصی علی نے کانپور کے مشہور قاضی خاندان کے رکنِ رکین قاضی محمد رفیع سے ایک دفعہ فرمایا کہ جب میں علی گڑھ گیا تو میں

درس دینے سے پہلے روزانہ پانچ گھنٹے مطالعہ کرتا تھا تاکہ یہ مغرب زدہ نوجوان طلبہ جب مجھ سے اسباق سے متعلق سوال
کریں تو میرے پاس ہر نکتہ اور ہر اعتراض کا جواب موجود ہو۔ اور جیسا کہ علامہ موصوف نے فرمایا۔ بالکل اسی طرح ہوا
مولانا جب درس دیتے تو طلبہ کی طرف سے سوالات کی بوچھار ہوتی اور مولانا انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ ہر سوال، ہر نکتہ
اور ہر اعتراض کا جواب دیتے تھے۔ یہاں تک کہ طالب علم کو شرح صدر ہو جاتا اور معاملہ آگے بڑھتا۔ لیکن یہ حالات
ان کے ابتدائی دورانِ قیام کے تھے اس کے بعد تو ان کے دفتر میں جو یونیورسٹی کی جامع مسجد میں واقع تھا، ہر وقت
طلبہ کی ریل پیل لگی رہتی تھی، اور ان کے خطبۂ جمعہ کو سننے کے لئے جامع مسجد میں تل رکھنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔
علامہ مرحوم کو اس بات کا ہمیشہ خیال رہتا کہ وہ جو کچھ پڑھائیں اس کے بارے میں طلبہ کے ذہنوں میں کسی قسم کا اشکال
نہ رہنے پائے اور اسی لئے وہ طلبہ کے سوالات سے خوش ہوتے تھے۔ درحقیقت جتنے سوال وجواب زیادہ ہوں گے
اتنا ہی استاد اور شاگرد کا ربط مستحکم ہوگا۔ اور علامہ مرحوم اس نکتہ سے واقف تھے۔ وہ ذہنی کدوکاوش کی اہمیت
سے بھی واقف تھے۔ اور جانتے تھے کہ یہ کاوش دماغ کی جلا کے لئے بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی
زندگی کے آخری دور میں بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ ذہنی کاوش اور نکتہ رسی اور نکتہ سنجی کے مشاغل کا سلسلہ
جاری رکھا اور آخر عمر تک اپنے شاگردوں کے ساتھ اپنی زندگی کے اس محبوب مشغلہ میں منہمک اور مصروف رہے۔
مولوی اشرف علی صاحب لکھتے ہیں کہ جب علامہ مرحوم علی گڑھ کی سکونت ترک کرکے ملیح آباد میں اقامت گزیں
ہو گئے تو وہاں بھی شاگردوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا جن سے علمی مباحثے اور مذاکرے ہوتے تھے۔ انہوں
نے اس ضمن میں میرے بچپن کے دوست مولوی محمد نصیر صدر مدرس مدرسہ جامع العلوم کانپور کا نام لیا جو علامہ مرحوم
کے شاگرد رشید تھے اور لکھا کہ مولوی نصیر صاحب اکثر ملیح آباد تشریف لاتے اور والد مرحوم سے گھنٹوں
علمی مسائل پر گفتگو رہتی۔ علامہ وصی علی شاید چند سال اور علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری
رکھتے لیکن تقسیم کے بعد جب یونیورسٹی میں دینیات کا موضوع لازمی کی بجائے اختیاری ہو گیا۔ تو علامہ کو اس بات
کا بے حد صدمہ ہوا۔ اور آپ نے فیصلہ کیا کہ اب آپ کا قیام علی گڑھ بے فائدہ اور بے سود ہے۔ لہٰذا خاموشی
کے ساتھ ترکِ تعلق کیا اور ملیح آباد واپس تشریف لے گئے۔ وہ اس معاملہ میں اپنے احتجاج کو اور بھی مؤثر
طریقہ سے پیش کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ملک کی بدلی ہوئی فضا میں اس قسم کے احتجاج کو یونیورسٹی کے لئے
ضرر رساں تصور کیا اور اس خاموشی سے علیحدگی کو ترجیح دی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جو علامہ مرحوم کا بے حد
احترام کرتے تھے اس زمانے میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے لیکن علامہ مرحوم کی علیحدگی کے وقت علی گڑھ
میں موجود نہیں تھے۔ بلکہ غیر ملکی دورے پر تھے۔ انہوں نے جب واپس آکر یہ معلوم کیا کہ علامہ وصی علی علی گڑھ سے
سبکدوش ہو کر ملیح آباد جا رہے ہیں تو انہوں نے علامہ کو راضی کرنے کے لئے بے حد کوشش کی اور انھیں علی گڑھ

میں رہنے کے لئے مجبور کرنا چاہا مگر علامہ وصی علی دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے یونیورسٹی سے اپنے قطع تعلق کے فیصلہ پر نظر ثانی نہیں فرمائی اور ملیح آباد تشریف لے گئے۔ مولانا کے صاحبزادے مولوی اشرف علی کا کہنا ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۵۰ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہزاروں کی تعداد میں گریجویشن کیا۔ اور یہ سب کے سب ان کے شاگرد تھے۔ اور پروفیسر محمد ایوب قادری نے اپنی تصنیف محمد احسن نانوتوی میں لکھا ہے کہ آپ کا قیام علی گڑھ کا سب سے بڑا کارنامہ بی۔اے کے طلباء کے لئے یونیورسٹی کے سنّی نصاب تعلیم کی ترتیب تھا۔ مولانا وصی علی ۲۲ ذی الحجہ سنہ ۱۳۰۵ھ مطابق سنہ ۱۸۸۸ء میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے اور آپ نے ۱۱ ربیع الاوّل سنہ ۱۳۹۲ھ مطابق ۲۶ اپریل سنہ ۱۹۷۲ء کو ملیح آباد ہی میں انتقال فرمایا۔ چاند کے حساب سے انتقال کے وقت آپ کی عمر ۸۷ سال تھی اور عیسوی حساب سے ۸۴ سال تھی۔ آپ کے والد حکیم محمد یوسف علی یوسف اپنے زمانہ کے مشہور طبیب اور شاعر تھے۔ آپ کے دو بھائی اور ایک بہن اور تھیں بھائیوں کے نام حافظ سلامت علی اور محمد ہدایت علی تھے۔ ابھی آپ کی عمر ۸ سال ہی کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد آپ کی والدہ محترمہ کا بھی وصال ہو گیا۔ آپ کی پھوپھی نے آپ کی پرورش کی۔ ملیح آباد میں پرائمری اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ تحصیل علم کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے مولانا تقی فتح محمد صاحب تائب سے پڑھا بعد میں شمالی ہندوستان کے مشہور مدرسہ جامع العلوم کانپور میں داخلہ لیا اور اسی مدرسہ سے سند فراغت حاصل کی اور مشہور شیخ الحدیث مولانا احمد علی میرٹھی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اسی مدرسہ میں مدرس ہو گئے اور آغاز ملازمت کے بعد اپنی چچا زاد بہن سے عقد فرمایا جن سے سات بچے ہوئے مگر مولوی اشرف علی کے علاوہ سب بچے زمانہ شیر خوارگی فوت ہو گئے۔ علامہ موصوف کافی عرصہ تک مدرسہ جامع العلوم کانپور سے وابستہ رہے لیکن اس کے بعد آپ کانپور کے ایک اور مدرسہ "مدرسہ الٰہیات" میں صدر مدرس ہو گئے لیکن جب اس مشہور تعلیمی درسگاہ کے حالات خراب ہو گئے تو آپ نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ آپ مدتوں مسجد صوبہ دار کانپور میں خطیب رہے۔ اور فرصت کے اوقات میں تبلیغ دین کا فریضہ سر انجام دیتے۔ آپ بلند آواز تھے اور خطابت کے اوقات میں لاؤڈ اسپیکر کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ علی گڑھ کی وسیع و عریض جامع مسجد کی آخری صفوں تک آپ کی تقریر صاف سنائی دیتی تھی۔ آپ کی خطابت پُر مغز اور پُر از معلومات ہوتی تھی۔ اس کی وجہ سے قرب و جوار کے شہروں میں بھی آپ کو وعظ کے لئے بلایا جاتا تھا۔ یہی وہ دور ہے جب آپ نے تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دیا۔ مولانا محمد احسن نانوتوی کی کتاب احسن المسائل پر آپ نے حاشیہ لکھا اور جلد سبق شریف کی تفسیر تحریر فرمائی۔ اس کے بعد آپ پھر دوبارہ مدرسہ جامع العلوم کانپور میں صدر مدرس کے عہدہ پر فائز ہو گئے اور سنہ ۱۹۳۶ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۰ء تک یہ ذمہ داری سر انجام دیتے رہے۔ آپ نے احاطہ کمال خاں میں مولانا شاہ غلام حسین

رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں مشکوٰۃ شریف کا درس دیا جس میں کانپور کے مشہور طبیب اور یو۔پی مجلس قانون ساز کے رکن ڈاکٹر عبدالصمد اور کراچی کے سابق میئر شیخ محمدؒ توفیق خاص طور پر شریک ہوتے تھے۔ جن علماء نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ان میں مولانا عبدالکریم گیاوی، مولانا نقی محمدؒ مظفر علی صاحب صدر مدرس مدرسہ اشرف العلوم کانپور اور مولانا نقی محمدؒ نصیر صاحب صدر مدرس مدرسہ جامع العلوم کانپور قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا کے برادرِ نسبتی مولانا کرم علی ملیح آبادی تحریکِ پاکستان کے سرگرم قائدین میں تھے۔ اور ان کی ملکی و ملی خدمات کا اعتراف چودھری خلیق الزماں نے اپنی تصنیف شاہراہِ پاکستان میں متعدد بار کیا ہے۔ مولانا کرم علی یو۔پی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر تھے۔ اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے رکن تھے۔ مولانا وصی اثر نے جب وہ مدرسہ جامع العلوم کانپور میں مدرس تھے حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب سے بیعت کی تھی اور جب وہ علی گڑھ سے اپنے وطن واپس تشریف لائے تو انھیں خواب میں اپنے پیر و مرشد کی بشارت ہوئی کہ تم ہمارے سلسلۂ بیعت کو جاری کرو۔ چنانچہ اپنے مرشد کے کہنے پر آپ نے بیعت کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا وصی علی بڑی دل آویز شخصیت کے مالک تھے۔ اور دیکھنے والے ان کی بھاری بھرکم شخصیت سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے۔ لیکن آپ نہایت سادہ زندگی بسر فرماتے۔

ان کے صاحبزادے نے لکھا ہے کہ آپ ہمیشہ شرعی پائے جامہ، کرتہ اور گھیردار اچکن زیبِ تن فرماتے ہاتھ میں ڈنڈا رکھتے تھے۔ نری کا جوتا پہنتے۔ بوٹ یا پمپ کبھی نہیں پہنا۔ اوائل عمر ہی سے سائیکل کی سواری کا شوق تھا۔ سائیکل اپنے ہاتھ سے کھول کر صفائی کرتے اور پھر اسے جوڑتے۔ گھڑی کی معمولی خرابی خود دور کر لیتے۔ جوتے کی معمولی مرمت بھی خود فرمالیتے۔ چارپائی خود بُن لیتے۔ حتیٰ کہ اپنے کپڑے کرتے پائے جامہ میں خود پیوند لگاتے اور انہیں خود سیتے۔ سنتِ رسولؐ کی پیروی میں کئی سال تک تعطیلات کلاں میں قیام ملیح آباد کے دوران بکری چراتے اور خود اس کا دودھ دوہتے۔ لیکن یہ سب اتباعِ سنت میں تھا ویسے وہ نہایت جری اور بہادر تھے۔ اور کانپور کے ہندو مسلم فسادات کے دوران آپ سے بہادری کے بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ آپ نے ۱۹۱۳ء کے سانحۂ مچھلی بازار میں بھی بڑی جرأت و ہمت کا مظاہرہ کیا اور گولیوں کی بوچھار میں مسجد مچھلی بازار کے صحن سے زخمیوں کو اٹھا کر محفوظ مقامات تک پہونچایا اور اپنے زمانے کے دستور کے مطابق لکڑی کے فن سے بھی انہیں مکمل طور پر واقفیت حاصل تھی۔ کانپور کے مسلمانوں کو بالعموم اور ٹکاپور کے مسلمانوں کو بالخصوص ان سے بے حد عقیدت اور محبت تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ گوشہ نشینی کے دور میں بھی رمضان المبارک کا مہینہ ٹکاپور کانپور میں گذارتے تھے اور جمعۃ الوداع اور عید کی نماز کی جامع مسجد میں امامت فرماتے تھے۔ علامہ وصی علی کو اکابرینِ دیوبند سے بڑی عقیدت تھی اور مدرسہ

جامع العلوم کے سالانہ امتحانات کے پرچے دیوبند یا سہارن پور کے علما سے تیار کرائے جاتے ہیں اور وہیں کے علما طلبا کی کاپیاں جانچتے۔ بعض اوقات تو اس مدرسہ میں دستاربندی کے جلسہ میں اکابر علمائے دیوبند کی شرکت ہوتی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار خود مولانا قاری محمد طیب نے آکر مدرسہ میں کامیاب طلبا کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے علامہ ملیح آبادی کو بے حد عقیدت تھی۔ اور خود حضرت تھانوی ان کا بڑا خیال فرماتے تھے۔ خود راقم الحروف نے اس تعلقِ خاطر کا مشاہدہ کیا ہے۔ آپ نے اپنی واحد اولاد کا نام اشرف علی رکھ کر حضرت تھانوی سے اپنے تعلقِ خاطر کا اعلانیہ اظہار فرمایا۔ علامہ وصی علی ملیح آبادی اگرچہ آج اس دنیا میں موجود نہیں لیکن انہوں نے اس صدی کی دوسری تیسری اور چوتھی دہائی میں اپنے رسول کی خدمت میں جس طرح دن رات ایک کر دیئے۔ اور اپنی زندگی کو قدرت کا ایک عطیہ سمجھتے ہوئے اسے راہِ خدا میں صرف کیا اور اپنے ایثار، اخلاق، ایمان اور اعمال سے اپنے ہزاروں شاگردوں کے لئے جو اعلیٰ مثال پیش کی وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ دنیا کبھی اہل اللہ سے خالی نہیں ہوتی اور اگر دل میں لگن ہو اور طبیعت میں اخلاص ہو تو حیاتِ مستعار کا ہر لمحہ وقفِ خوشنودیٔ خداوند اور نذرِ رسول کریمؐ کیا جا سکتا ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں اعلیٰ انسان۔ ایک اچھے مسلمان۔ ایک قابلِ قدر استاد اور ایک لائق و فائق عالم تھے۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ چین نصیب کرے اور ان کے شاگردوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

قدیم یونانی تہذیب

از
جناب پروفیسر رحمت فرخ آبادی ایم اے

یونان کی تاریخ بہت پرانی، اتنی پرانی جتنا غالباً علم انسانیت۔ یونان قدیم دراصل کسی خاص علاقہ کا نام نہ تھا بلکہ ہر وہ علاقہ جہاں یونانی نسل کے لوگ آباد ہوں، یونان کہلاتا تھا۔ اس کا قدیم نام ہیلاس (HELLAS) تھا قدیم زمانہ میں اس میں ایشیائے کوچک، اطالیہ، صقلیہ اور اسپین کے علاقے شامل تھے۔

وجہ تسمیہ

یونان کو انگریزی میں گریس (GREECE) اور یہاں کے قدیم باشندوں کو گریکس (GREEKS) کہتے ہیں۔ اس نام کی اصل وجہ یہ ہے کہ پہلا قبیلہ جس سے اہل روما کو واسطہ پڑا اس کا نام گرائیہ تھا۔ رومیوں نے انہیں گریکو ہی کہنا شروع کیا۔ تاریخ کو اس قدیم ترین دور میں اہل یونان خود کو ہیلانیز (HELLANEESE) اور اپنے ملک کو ہیلاس (HELLAS) کہتے تھے اور آہستہ آہستہ یہ نام پورے یورپ میں پھیل گیا۔

مختصر تاریخ

اہل یونان کی ابتدائی نسل کئی عناصر کا مجموعہ تھی۔ اس کا پہلا دور زمانہ شجاعت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دور میں یونانی علم الاصنام (MYTHOLOGY) کے مطابق تمام عالم انسانی پر دیوی دیوتاؤں اور غیر انسانی ہستیوں کی حکومت تھی۔ یہ دور مورخین کے اندازے کے مطابق بارھویں صدی قبل مسیح سے چودھویں صدی قبل مسیح تک ہے۔ اس دور میں نیم انسانی دیوتاؤں کا بھی ایک طبقہ تھا یہ دیوتا سورما کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ان میں ہرکولیس، تھیسیس اور پرسٹیس کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اسی دور سے متعلق ہمیں یونان کی سب سے بڑی رزمیہ داستانیں بھی ملتی ہیں جو ہومر (HOMER) نے لکھی ہیں۔

قدیم یونان کی تاریخ کا دوسرا دور ۱۱۰۰ء قبل مسیح سے ۵۰۰ء قبل مسیح تک ہے۔ اس دور میں ہمیں اہل اسپارٹا اور اہل ایتھنز کا تذکرہ ملتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ دور ان ہی دونوں شہروں کی تاریخ سے متعلق ہے ان دونوں شہروں نے بعد کے زمانہ میں دنیا کی تہذیب و تمدن کو کافی حد تک متاثر کیا۔ اس دور میں یونان قدیم میں اصلاحات، مذہبی اقدار اور طرز حکومت میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ ان اصلاحات کے ضمن میں سولن قابل ذکر ہے جس نے ایک نیا نظام نئے قوانین کے تحت جو عوامی جذبات اور احساسات سے

ہم آہنگ تھا۔ بنایا۔ یہ قوانین ڈریکو کے مرتب کردہ قدیم قوانین کے مقابلے میں اعتدال کے حامل تھے۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے آخر سے یونان کی تاریخ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں یونانی سلطنت نے وہ عظمت حاصل کرلی کہ رقبہ کے لحاظ سے یونان قدیم اس کے پچاسویں حصہ کے برابر بھی نہ تھا۔ اسی دور میں اہلِ یونان کی ایرانیوں سے آزادی کی خاطر جنگیں ہوئیں۔ چنانچہ ایران کے بادشاہ دارا نے انتظام سلطنت سے فارغ ہوکر ہوسِ ملک گیری کے سلسلہ میں ۴۹۳ء قبل مسیح میں یونان پر پہلا حملہ کیا لیکن کافی خونریزی اور ہزیمت کے بعد ایرانی افواج کو پسپا ہونا پڑا۔ اس جنگ میں ایرانی فوج کے بیس ہزار آدمی کام آئے۔ اپنی اس شکست کا بدلہ لینے کے لئے دارا ایک مرتبہ پھر یونان پر حملہ آور ہوا۔ اس حملہ میں شریک ایرانی افواج کی تعداد یونانی مؤرخین کے اندازے کے مطابق ایک لاکھ سے زائد تھی لیکن پھر بھی اہلِ یونان کو بڑی طرح شکست ہوئی۔ اہلِ ایران کے ان حملوں کا مقصد دراصل ایتھنز کی تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جو کافی حد تک پورا ہوا۔ لیکن اس کے بعد ایتھنز کو جو عروج حاصل ہوا وہ تاریخِ عالمِ انسانیت کا ایک اہم باب ہے۔

اہلِ یونان ان حملوں کے فوراً بعد دوبارہ قومی تعمیر میں لگ گئے۔ انہوں نے شہر کو دوبارہ تعمیر کیا اور اس کے دفاع کے لئے ایک مضبوط فصیل بنائی۔ لیکن ان دفاعی تیاریوں کے باوجود ہم اہلِ یونان کو بیرونی لڑائیوں میں مشغول پاتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے جزیرۂ قبرص اور پھر ساحل باسفورس پر قسطنطنیہ کے قلعہ پر حملہ کرنے میں اتحادیوں کی مدد کی۔ اسی عرصہ میں اہلِ ایتھنز کی اسپارٹہ سے جنگ ہوئی لیکن ۴۵۱ء ق م میں کائمن کی کوششوں سے دونوں ریاستوں کے درمیان تیس سال کے لئے باہمی صلح اور امن کا معاہدہ ہوا لیکن یہ معاہدہ پانچ سال کے بعد ۴۴۷ء ق۔م میں ٹوٹ گیا۔ اس معاہدہ کے خاتمہ کے بعد ہمیں ایتھنز کا عروج ملتا ہے۔ جس کا آغاز فارقلیس کے دور سے ہوتا ہے۔ یہ تقریباً پندرہ سال حکمراں رہا۔ تمام ملکی، سیاسی اور مذہبی معاملات میں اسے ہر طرح کی برتری حاصل تھی۔ اسی دور میں بت تراشی، موسیقی، فنِ کتابت، المیہ اور طربیہ قصوں اور داستانوں نے ترقی کی۔ فارقلیس کو جو رتبہ اہلِ ایتھنز نے اس کی خدمات کے صلے میں دیا۔ وہ نہ ہم اس سے پہلے کے کسی حکمراں کے ساتھ اور نہ ہی اس کے بعد کسی حکمراں کے سلسلے میں پاتے ہیں۔ اس کی وفات ۴۲۹ء قبل مسیح میں ہوئی۔

ایتھنز کے عروج کے بعد تاریخ یونان قدیم کا قابلِ ذکر واقعہ جنگ پلوپی سس ہے، جس کی وجہ سے سلطنت ایتھنز کو زوال آیا۔ اور اس کی جگہ یونان میں سیاسی طور پر اسپارٹہ کو عروج حاصل ہوا۔ اس لڑائی کے اسباب میں فریقین کا ایک دوسرے سے حصولِ اقتدار کے لئے حسد قابلِ ذکر ہے۔ یہ لڑائی ۴۳۱ء

قبل مسیح میں ہوئی۔ اس جنگ کے کئی مرحلے تھے۔ پہلے مرحلے میں ایتھنز کے استحکام کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ لیکن بعد کے مرحلوں میں اس کی طاقت ختم ہو گئی۔ یہ جنگ دراصل تیس سال جاری رہی مورخین کے خیالات کے مطابق خود اہل ایتھنز ہی اس کے زوال کا اصلی سبب تھے بلاوہ بریں اہل ایتھنز کی ہزیمت کا باعث دشمن کی قوت نہ تھی جتنا کہ خود اس کے سپہ سالاروں کی غفلت۔

اس طویل عرصہ کی جنگی کیفیت کے نتیجہ کے طور پر یونانی نسل بھی زوال کا شکار ہو گئی۔ کیونکہ ابتداً ایتھنز کی تباہی کے بعد اس کی جگہ اسپارٹا نے لے لی تھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد ایتھنز کی پرانی طاقت عود کر آئی اور اسپارٹا کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ بعد میں سلطنت مقدونیہ کو عروج حاصل ہوا۔ اور وہاں کے بادشاہ نے یونان کی تمام ریاستوں کے اقتدار کا خاتمہ کر کے ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی اور اس طرح یونان کی تاریخ کا قدیم دور ختم ہو گیا۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سلطنت مقدونیہ کے دور اقتدار میں بھی اہل یونان جدوجہد آزادی میں مصروف رہے۔ دوسری طرف اہل مقدونیہ کا تعلق بھی قدیم یونانی نسل سے تھا۔ اس لحاظ سے یہ دور بھی قدیم یونانی تاریخ کا جزو بن جاتا ہے۔ اور اس طرح تاریخ یونان قدیم دور مقدونیہ پر اہل روما کے اقتدار کی ابتدا کے ساتھ ختم ہوتا ہے جبکہ یونان کی رہی سہی آزادی بھی سلب ہو گئی تھی۔ تاریخ یونان کے اس قدیم دور کی تہذیب کا ہی ہمیں جائزہ لینا ہے۔

یونان کے اس زوال کا سب سے بڑا سبب نفاق تھا۔ اسی لئے عظیم یونانی مورخ تھیوڈلیسر نے لکھا ہے کہ

> "ان تمام خرابیوں کا سبب اقتدار کی خواہش تھی جو حرص و طمع سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خواہش جتھے بندی کی وہ روح تھی جو انسانوں میں اُس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب کبھی وہ علانیہ فساد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چونکہ دونوں طرف کے قائدول خوش کن وعدے کرتے ہیں۔ اس لئے ایک جماعت سب کے لئے دستوری مساوات کا اعتراف کرتی ہے بہر حال ان لوگوں نے مفاد عامہ کو جس کے وہ برائے نام حامی تھے اپنی جاگیر سمجھ لیا تھا۔ ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی جان توڑ کوشش میں انہوں نے خوفناک جرائم کا ارتکاب کیا اور شہری جو کسی بھی جماعت سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ دونوں کا شکار ہوئے۔"

ہومر ہومر (HOMER) ساحل ایشیائے کوچک کا ایک نابینا تھا۔ جو پہلے اپنے منظوم افسانے گا کر سنایا کرتا تھا۔ ان ہی دو منظوم مجموعوں کا نام الیڈ (ILIAD) اور اوڈلیسی (ODYSSEY) ہے۔ یہ دونوں مجموعے قدیم یونانی تہذیب کے زمانۂ شجاعت سے متعلق ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں رزمیہ داستانیں

کہا جاتا ہے۔ یہ داستانیں یونان میں فنِ کتابت کی ابتدا کے بعد ضبطِ تحریر میں لائی گئیں پہلی داستان میں شہر ٹرائے (TROY) کے طویل محاصرے اور فتح کا تذکرہ ہے اور ان بہادروں کے کارہائے نمایاں بیان کئے گئے ہیں جو اس جنگ کے ہیرو تھے۔ دوسری داستان میں اہلِ یونان کے سب سے بڑے سردار اوڈیسس (ODYSSEUS) کی صحرا نوردیوں کا حال بیان کیا گیا ہے جس سے ہمیں قدیم یونانی تہذیب کے جغرافیائی حالات اور عقائد کا پتہ چلتا ہے۔ اہلِ یورپ نے ابتدا میں ہومر کو ایک فرضی شخصیت سمجھا، اس سلسلہ میں تاریخ یونان کے مصنف جے بی بیوری (J.B. BURY) کا نام سرِفہرست ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے آخری دور میں جب مشہور ماہر آثارِ قدیمہ ڈاکٹر شارلیمان نے ترکی قلعہ حصار لک کے قریب ٹرائے کے آثارِ قدیمہ کا پتہ چلایا، تو ہومر کی بیان کردہ بہت سی باتیں ان کی روشنی میں صحیح ثابت ہوئیں۔

ہومر کی شاعرانہ اہمیت کے علامہ شبلی نعمانی بھی معترف ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون "ہومر کے الیڈ کا عربی ترجمہ" میں جو مقالاتِ شبلی کی جلد چہارم میں شامل ہے، لکھتے ہیں کہ

"اگر یہ سوال ہو کہ کُل دنیا کا سب سے بڑا شاعر کون ہے تو مختلف قوموں کی زبان سے مختلف جواب ہوں گے۔ اہلِ عجم فردوسی کا نام لیں گے، انگریز شیکسپیر (SHAKESPEARE) کو پیش کریں گے۔ رومی ورجل (VIRGIL) کے حق میں ووٹ دیں گے، عرب امراءالقیس کو مقابلے پر لائیں گے۔ غرض کسی شخص پر اتفاق نہ ہو سکے گا۔ تاہم وطن پرستی سے قطع نظر کرکے اگر کسی شخص پر اتفاق عام ہو سکتا ہے۔ تو وہ یونان کا شاعر ہومر ہے۔"

"ہومر وہ شخص ہے کہ ارسطو نے اس کے مشکل اشعار کی شرح میں ایک مستقل کتاب لکھی اور درحقیقت ارسطو نے فنِ شاعری اور بلاغت کے جو اصول اور آئین منضبط کئے وہ ہومر ہی کے کلام سے مستنبط تھے۔ سکندر ہومر کا کلام سفر و حضر میں ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ فرانس کے مشہور فاضل رینان کا قول ہے کہ ایک ہزار سال کے بعد دنیا کی تمام تصنیفات مٹ جائیں گی اور صرف ہومر ہی باقی رہ جائے گا۔"

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہومر کی رزمیہ داستانوں نے اسے شہرت عام اور بقائے دوام کا وہ مرصع لباس پہنایا۔ جو ہندوؤں کی رامائن اور مہابھارت اور فردوسی کے شاہنامے کو بھی حاصل نہیں ہے۔

معاشرہ قدیم یونانی معاشرے پر ہمیں وہاں کے جغرافیائی ماحول کے اثرات ملتے ہیں یعنی وہاں کے پہاڑی علاقہ اور سطح مرتفع نے اہلِ یونان کو تاریخ کے قدیم زمانہ میں کسی طور پر بھی ایک مرکزی حکومت کے تحت منظم نہ ہونے دیا۔

یونان کے کٹے پھٹے ساحل نے جو دنیا کے بہترین ساحلوں میں شمار ہوتا ہے، قدیم زمانہ میں بھی اہلِ یونان کو بہترین ملاح اور جفاکش بنایا، اس زمانہ میں ان کے دیگر متمدن قوموں سے تجارتی تعلقات بھی قائم تھے۔ اور اس طرح ان کی معاشرت پر دیگر قوموں کے بھی اثرات پڑے۔ چنانچہ یونان، ایشیا سے قریب تر ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے مشرقی روایات کے دائرے میں آیا۔ یہاں کی معاشرت پر ہمیں اب بھی کسی حد تک مشرقی روایات و معاشرت کی جھلک ملتی ہے۔

یونان کا موسم پروفیسر بیوری کے الفاظ میں قدرے سخت مگر پُرلطف ہے جو یونانیوں میں جفاکشی اور چُستی پیدا کرتا ہے۔ یونان کی زمین زیادہ زرخیز نہ تھی اس لئے اہلِ یونان کو اپنی تاریخ کے اس قدیم ترین دور میں بھی دیگر علاقوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کرنا پڑیں، اس طرح غیر ملکی معاشرت کے اثرات ان کے سماج پر پڑے۔

اہلِ یونان کے قدیم معاشرے کے بارے میں جاننے کے لئے ہومر کی رزمیہ داستانیں زبردست اہمیت کی حامل ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں :۔

(الف) اہلِ یونان کی اصل مال و دولت ان کے جانور اور چراگاہیں تھیں۔

(ب) اہلِ یونان گو کہ لوہے کے استعمال سے واقف تھے لیکن کانسی کے سستا اور با افراط ملنے کی وجہ سے وہ زیادہ تر اسی کا استعمال کرتے تھے۔

(ج) اہلِ یونان میں معاشرے کی بنیادی خصوصیت سادگی تھی اور ان کی زندگی عیش و عشرت سے پاک تھی۔

(د) اس زمانہ میں معاشرتی قوانین ضابطۂ تحریر و عمل میں نہ آئے تھے۔

لیکن بعد کے دور کا یونانی معاشرہ طرح طرح کی رنگینیوں سے پُر تھا، شادی و بیاہ کے موقع پر اعلیٰ درجہ کی ضیافت ہوتی۔ مذہبی تیوہار ان کی سماجی زندگی کا لازمہ بن گئے تھے۔ ان میں اولمپیا کا میلہ ایک زبردست تاریخی اہمیت کا حامل تھا اور ان کی طرزِ معاشرت کی واضح عکاسی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ قدیم یونان میں ڈراموں اور تھیٹروں نے بھی سماجی زندگی کی نشوونما میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایمفی تھیٹر (AMPHI THEATRE) قابلِ ذکر ہے۔ جو ان کے معاشرے کے نمایاں پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ تھیٹر اور ڈرامے نہ صرف عوام کے لئے تفریح کا ایک بہترین ذریعہ تھے بلکہ ایک طرح سے عوام کے حالات، واقعات اور رجحانات سے حکومتِ وقت کو بھی باخبر رکھتے تھے۔ ان کے مکالمے اور کردار زیادہ تر حکام کے خیالات و نظریات کو پیشِ نظر رکھ کر تیار کئے جاتے تھے۔ ان کا مقصد جہاں ایک طرف اہلِ یونان میں جذبۂ و نظریۂ قومیت کو فروغ دینا تھا تو دوسری طرف عوام کی اصلاح اور حکومت پر تعمیری تنقید بھی تھا۔

مذہب قدیم یونانی تہذیب میں مذہب کا سیاسیات یعنی ملکی معاملات سے بہت ہی گہرا تعلق تھا لیکن

مذہبی کاہن ایشیائی مذاہب کے مقابلے میں کچھ زیادہ با اثر نہ تھے۔ یہ صرف عوامی معاملات میں بادشاہِ وقت کے مُشیر تھے۔ ان کے مذہب نے کبھی ایک جامع شکل اختیار نہ کی بلکہ اس میں ہمیشہ نئے عقائد و نظریات داخل ہوتے رہے۔

اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں اہلِ یونان مناظر فطرت کی پوجا کرتے تھے اور انہیں وہ قادرِ مطلق اور لافانی تصور کرتے تھے، ان کے ساتھ طرح طرح کے کارنامے منسوب تھے۔ اہلِ یونان نے اپنی تاریخ کے قدیم دور میں بھی کبھی جانوروں کی پرستش نہ کی اور نہ ان کے بت ہندوؤں کے مہیب اور خوفناک بتوں سے مشابہت رکھتے تھے۔

دیوتاؤں کے بعد ان کے مذہب میں دوسرا درجہ سورماؤں کا تھا ان کا عقیدہ تھا کہ یہ سورما ایک ایسی نسل کے افراد تھے جو انسانوں سے پہلے اس دنیا میں آباد تھی اور ایسے کام کر سکتی تھی جو انسانی عقل و طاقت سے باہر ہیں۔ ان دیوتاؤں کی پرستش دعاؤں، نذر و نیاز، اور قربانی کے ذریعہ کی جاتی تھی۔

تاریخ کے اس قدیم دور میں بھی ہمیں اہلِ یونان میں ذات پات کی تفریق نظر نہیں آتی۔ ان کے سب سے بڑے خدا کا نام زیوس (ZEUS) تھا جس کی مدد کے لئے بارہ دیگر چھوٹے معبود تھے، اسی طرح ان کے مذہب میں ہمیں حیات بعد از موت کا بھی کوئی تصور نہیں ملتا، یہ معجزات پر یقین رکھتے تھے اور مادی ترقی کے عوامل ان کی جان تھے۔ اُن کے یہاں دیگر مذاہب کی طرح مذہبی اجارہ داری کا تصور بھی نہ تھا۔ وہ اپنی جہاں مذہبی خوش اخلاقی اور راست بازی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر انہوں نے ان اصولوں کو نہ اپنایا تو ان کا معبود زیوس اُن سے ناراض ہو جائے گا۔

اہلِ یونان اپنے مُردوں کو جلاتے نہ تھے بلکہ دفن کرتے تھے۔ اہلِ مصر کی طرح ان کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ انسان مرنے کے بعد پھر زندہ ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ مُردے کے ساتھ اس کی زندگی کے دیگر لوازمات کو بھی دفن کر دیا کرتے تھے۔

شہری نظام

ہومر کی نظموں سے ہمیں یونان قدیم کے شہری نظم و نسق کا بھی پتہ چلتا ہے چنانچہ پروفیسر بیوری لکھتا ہے کہ ہومر کی نظموں میں بادشاہ کا ذکر اس طرح آتا ہے کہ وہ لوگوں کا سردار ہے اور اس کی رہنمائی کے لئے بزرگوں کی ایک نسل موجود ہے۔ بادشاہ کی ذات میں تین ہستیاں یکجا تھیں، وہ بیک وقت پروہت، قاضی اور سردار ہوتا تھا۔ نسب کے اعتبار سے وہ دیوتاؤں کی نسل سے ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ بادشاہت باپ کے بعد وراثت میں بیٹے کو ملتی تھی یہ شخصی بادشاہت کی ابتدائی صورت تھی، آٹھویں صدی قبل مسیح کے آخر میں یونان میں جمہوریت کا آغاز ہوا تھا۔

اہلِ یونان زمانۂ قدیم میں مختلف شہری ریاستوں میں منقسم تھے۔ یہ شہری ریاستیں اگرچہ بہت

چھوٹی تھیں لیکن اپنے انتظامی، سیاسی اور خارجی معاملات میں مکمل طور پر آزاد تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہر ریاست میں دو ڈھائی لاکھ کی آبادی تھی۔ ایک ریاست کا شہری دوسری ریاست میں اجنبی تصور کیا جاتا تھا۔ اس دور میں ایتھنز تہذیب و تمدن کا اعلیٰ ترین مرکز تھا۔ ان تمام ریاستوں میں باہمی تعلقات تھے اور ان کے رسم و رواج اور سماجی ماحول میں یکسانیت تھی۔ شہری ریاستوں کی اس کثرت کی وجہ سے وہاں مرکزیت کا فقدان تھا۔

پیشے کام کاج کی نوعیت کے لحاظ سے اس زمانہ میں یونانی معاشرہ کئی حصوں میں منقسم تھا۔ البتہ ان میں تین بڑے طبقے تھے۔

(الف) امرائے حکومت، فوج کے سردار، جاگیردار اور اعلیٰ حکام وغیرہ۔

(ب) ملازم پیشہ افراد اور حکومت کے بنیادی کارکن۔

(ج) نچلے طبقے کے افراد اور گھریلو ملازمین، جن کی حیثیت غلاموں سے کم نہ تھی۔

ان تین طبقوں سے قطع نظر، لوگوں کا عام پیشہ زراعت، گلّہ بانی اور برائے نام صنعت و حرفت تھا۔ اہلِ یونان شکار اور ماہی گیری میں مشہور تھے۔ زراعت میں غلّے اور انگور کی پیداوار کے لئے مشہور تھے۔ باربرداری کے لئے بیل، خچر اور گدھے استعمال کرتے تھے۔ ادنیٰ درجہ کا تمام کام غلاموں سے لیتے تھے۔ اسلحہ اور دیگر جنگی ساز و سامان خود تیار کرتے۔ مختلف قسم کے زیورات اور ظروف کے علاوہ ہاتھی دانت، لکڑی اور مٹی سے بھی چیزیں بناتے جو بہت خوش نما اور پائیدار ہوتی تھیں۔

فلسفہ اہلِ یونان نے نہ صرف ہومر کی تصانیف پر اکتفا کیا بلکہ اس سے حاصل شدہ معلومات اور دیگر علوم و فنون کو بھی جِلا بخشی۔ ہومر کی تعلیمات کے اثر سے انہوں نے نہ صرف مناظرِ فطرت کی عقدہ کشائی کی بلکہ ہر شے کے اثبات کا پتہ لگایا۔ اس طرح یونانی فلسفہ کا مرکز و منبع ہومر کی رزمیہ داستانیں ہیں۔ یونان کے ابتدائی فلاسفروں میں سب سے پہلے سقراط کا نام آتا ہے۔

(الف) سقراط سقراط ۴۷۱ ق م میں پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں اہلِ یونان جنگ و جدل اور قتل و غارت گری میں مبتلا تھے۔ بے اعتباری، بدگمانی، بغض و حسد، اور نفرت اور کینہ بڑھ چکا تھا اور آئے دن کے ایسے واقعات نے عوام کے ذہن کو ماؤف کر دیا تھا۔ سقراط ایک حساس طبیعت کا مالک تھا۔ وہ ان حالات کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔

ابتدا میں سقراط اپنے باپ کی طرح بت تراشی کا کام کرتا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے اپنی زندگی اخلاقی اقدار کی بقا اور آزادیٔ انسان کے تحفظ کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ اخلاق اور سچائی کا مجسمہ تھا۔

سقراط کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے اپنے جذبات پر غیر معمولی قابو تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ

"احتیاج سے پرہیز کرنا اللہ کی ایک صفت ہے اور انسان جس قدر کم ضروریات رکھے اسی قدر وہ خدائے تعالیٰ کے قریب ہے۔"

سقراط کی بحث وگفتگو کا ایک خاص مقصد تھا اس کی پہلی تعلیم یہ تھی کہ علم انسانی محدود ہے۔ کیونکہ بہت سے مسائل زندگی کو حل کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کے نزدیک انسانیت کی فلاح وبہبود کی بنیادی شرط آدمیت ہے جس کو ہم اپنے عمل اور اپنے کردار میں اپناتے ہیں۔ اپنی اسی تعلیم کے پیش نظر سقراط نے امیر وغریب سب کا محاسبہ کیا اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ چنانچہ اس کی اسی حق گوئی اور بیباکی کی وجہ سے ایک خاص طبقہ اور جمہوریت کے علمبردار اس کے خلاف ہو گئے اور پھر ۳۹۹ ق م میں اس پر لامذہبیت کا الزام لگایا گیا۔ اور اسے سزائے موت دی گئی چنانچہ اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق اس نے زہر کا پیالہ پیا اور اس طرح وہ اخلاقی اقدار اور انسانیت کی بقا کی راہ کا پہلا شہید کہلایا۔ اس نے اپنی اس موت کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ

"برائی کرنا برائی ہے۔ دوسرے اگر موت ایک دائمی نیند ہو تو۔ اور اگر محض جسم سے روح کی جدائی بھی ہو تو ـــــــ ہر حال میں زندگی سے بہتر ہے اور جب اس کا وقت آئے تو دانائی کا تقاضا ہے کہ اس کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کیا جائے۔"

سقراط کے نزدیک بہترین عالم وہ ہے جو اپنے آپ کو پہچانے، اور ہر معاملہ میں اثبات اور راہیں پیدا کرے۔ اور ہر لحہ طلب علم اور تلاش حق میں سرگرداں رہے۔ سقراط نے جس انفرادیت اور جن اعلیٰ اقدار کی تعلیم دی ہے وہ مشہور مؤرخ بیوری کے الفاظ میں اب ہمارے مذہب ذہن (MENTAL RELIGION) کے اجزا بن چکے ہیں۔

(ب) افلاطون

سقراط کے مرنے کے بعد یونان کے جن فلاسفروں نے اس کی تعلیمات کو اپنایا اور انہیں انسانیت کے لئے نمونۂ عمل قرار دیا، ان میں اس کا لائق شاگرد افلاطون قابل ذکر ہے، جس نے سقراط کی تعلیمات کی اشاعت کی اور ان کی تشریحات سے عوام کے لئے فکر کی نئی راہیں پیدا کیں۔ افلاطون اپنے زمانہ کے تمام مروجہ علوم سے بخوبی واقف تھا، یونان کے ان چیدہ مصنفوں میں سے جن کی کوئی کتاب بھی ضائع نہ ہوئی۔ اس کی تمام تحریریں مکالمات کی شکل میں محفوظ ہیں۔ اس نے ریاست اسپارٹا کے آئین کو بہتر سمجھتے ہوئے اپنی کتاب ریاست (REPUBLIC) لکھی جس میں

اس نے ہمارے سامنے ایک مثالی معاشرہ کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس معاشرہ کی بنیاد اس نے عدل و انصاف اور اعتدال پر رکھی۔ افلاطون کی تعلیمات درحقیقت ہمارے فکر و عمل میں مطابقت چاہتی ہیں، وہ اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم خدا تعالیٰ کی صفات کو اپنائیں جن میں انسانیت کی نہ صرف فلاح کا راز ہے بلکہ جو حق و صداقت کا راستہ بھی ہیں۔

(ج) ارسطو افلاطون کی تعلیمات نے ایک نئے مدرسہ فکر کو جنم دیا جو اس کے نام کی مناسبت سے مشہور ہے۔ اس کے نامور شاگردوں میں افلاطون قابلِ ذکر ہے جو ۳۸۴ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ یہ سکندر اعظم کا استاد تھا۔ اس کا انتقال ۳۲۲ قبل مسیح میں ہوا۔

ارسطو نے اپنے زمانہ کی تقریباً ڈیڑھ سو ریاستوں کے مروجہ دساتیر کے مطالعہ کے بعد اپنی مشہور زمانہ کتاب سیاسیات (POLITICS) لکھی اس کی دوسری اہم تصنیف اخلاقیات (ETHICS) ہے جس میں اس نے انسانی کردار اور اخلاق پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح اس نے اپنے زمانہ کے یونانی ادب و شاعری کے مطالعہ کے بعد فنِ تنقید پر ایک کتاب فنِ شاعری بوطیقا (THE POETICS) لکھی جو اپنے فن پر اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی تصنیفات کے مطالعہ کے بعد محققین اسے فنِ منطق (LOGIC) کا بانی قرار دیتے ہیں۔ تقریباً بائیس سو سال گزرنے کے باوجود اب بھی اس کی تحریریں کسی نہ کسی طور پر دورِ جدید کے شاعروں ادیبوں اور فلاسفروں کے لئے رہنمائی کا کام دیتی ہیں۔

علومِ سائنس علمِ فلسفہ کی طرح اہلِ یونان نے اپنی تاریخ کے اس قدیم دور میں دیگر علومِ انسانی کی طرف توجہ دی جن میں علومِ سائنس قابلِ ذکر ہیں۔

علم الحساب اہلِ یونان کا پسندیدہ موضوع نہ تھا، البتہ اس کی ایک خاص جیومیٹری سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ اہلِ یونان کے سب سے بڑے ماہر اقلیدس (EUCLID) نے اس علم پر سب سے پہلی کتاب ELEMENTS لکھی اور ہمارے موجودہ علم جیومیٹری کی بنیاد اسی کتاب پر ہے جو ۳۰۰ قبل مسیح میں لکھی گئی تھی۔

اہلِ یونان میں دوسرا قابلِ ذکر سائنسدان ارشمیدس (ARCHIMIDES) ہے جس نے علومِ ریاضی اور سائنس کے کئی اہم مسائل حل کئے۔ اس نے علم طبیعات (PHYSICS) میں بھی کئی نئے اور اہم انکشافات کئے جن میں قانون کشش خصوصی (THE LAW OF SPECIFIC GRAVITY) اور THE LAW OF FLOATING BODIES) قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ اس کے اس نے کسی گول چیز کا محیط معلوم کرنے کا فارمولا بھی جسے "پائی" (π = PI) کہتے ہیں، ایجاد کیا۔ ارشمیدس کی ان تمام تحقیقات پر بعد کے دور میں اہلِ روم نے قابلِ قدر اضافے کئے۔

یونان قدیم میں اسکندریہ علوم سائنس کا ایک اہم مرکز تھا جہاں آپریشن کے ذریعہ مختلف قسم کے علاج کئے جاتے۔ علم الابدان کے سلسلہ میں اولیت HIPPOCRATES کو حاصل ہے جو اس علم کا بانی ہے۔ اس سلسلہ میں دوسرا اہم فرد ہیروفلیس (HIRRO PHLES) ہے جو نہ صرف انسانوں کا بے ہوش کرکے آپریشن کرتا تھا بلکہ اس نے انسان کے نظام اعصاب کے مرکز دماغ میں اس مرکز حس (CENTRE OF NERVE SYSTEM) کو بھی معلوم کیا جو حسِ انسانی پر اپنا کنٹرول رکھتا اور انسان میں احساس کا مادہ پیدا کرتا ہے۔

یونان کے قدیم جغرافیہ دانوں میں ارسٹو تھینز قابل ذکر ہے۔ اسے مؤرخین علم جغرافیہ کا بانی قرار دیتے ہیں۔ وہ پہلا فرد ہے جس نے نہ صرف زمین کے محیط کی پیمائش کی بلکہ کرۂ ارض کے حالات بھی جمع کئے۔ اہل یونان کا دوسرا عظیم جغرافیہ داں بطلیموس (PTOLEMY) ہے جو علم جغرافیہ کے علاوہ دیگر علوم وفنون پر بھی دسترس رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا ساکن ہے اور دیگر آسمانی سیارے اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ بطلیموس کے بعد یونان کا ایک جغرافیہ داں ارسٹارکس (ERSTARCHUS) قابل ذکر ہے جس نے اس دنیا کو پیش کیا کہ دنیا سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔

علم وادب

قدیم یونانی تہذیب میں تحصیل علم کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ بہترین دل ودماغ کا مالک ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف قسم کے کھیل اور فن یہاں تک کہ فن موسیقی بھی ان کے نصاب تعلیم کا جزو تھی۔ اس زمانہ میں طلبا کے لئے جگہ جگہ مدرسے قائم تھے۔ اور طالبات کے لئے امور خانہ داری کا علم حاصل کرنا لازمی تھا۔ فن موسیقی کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ اس سے دل ودماغ کو جلا ملتی ہے۔ یہ ہمارے اخلاق وکردار کو بہتر بناتی ہے۔ نفاست کی حامل اور انسانی روح کے لئے سکون بخش ہے۔

اہل یونان اپنے طلباء کو ہومر کی رزمیہ داستانیں خاص طور پر پڑھایا کرتے تھے۔ ان کے مطالعہ سے ان میں جہاں ایک طرف قومیت کا جذبہ پیدا ہوا تو دوسری طرف اس چیز نے ان کی عزت و وقار اور جاہ و حشمت کو بھی ابھارا اور ان میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوئی ان میں رزمیہ داستانوں کے زیر اثر ان میں گفتگو اور روزمرہ محاورہ، سوانح اور تاریخ نگاری، موسیقی، شاعری اور دیگر فنون لطیفہ پیدا ہوئے۔ ہومر کی ان رزمیہ داستانوں کے اثرات ہیں ورجل (VIRGIL) دانتے (DANTE) اور ملٹن (MILTON) کی شاعری میں بھی ملتے ہیں۔ وہ اپنی ان ہی رزمیہ داستانوں کی وجہ سے والمیک اور منو کا ہمعصر تسلیم کیا جاتا ہے۔ سطور ذیل میں ہم یونانی علم وادب کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

(الف) ڈرامہ

اہل یونان کے ڈراموں کا خاص مقصد جذبۂ قومیت کو فروغ دینا تھا، علاوہ یہ ڈرامے عوام الناس کے رجحانات سے بھی مطابقت رکھتے تھے۔ اور اس طرح حکومت کو عوام کے

خیالات سے باخبر رکھتے تھے۔ ان کا دوسرا مقصد حکومت پر تعمیری تنقید بھی تھا اور عوام کے اخلاق کی اصلاح بھی۔
ان ڈراموں کی دو قسمیں تھیں یعنی طربیہ اور المیہ۔

(i) طربیہ (COMEDY) ڈرامے۔ ان کے مصنفین میں ارسٹوفینس (ARISTOPHANCE) سب سے بہتر مانا جاتا ہے۔

(ii) المیہ (TRAGEDY) ڈرامے۔ ان کے مصنفین میں ایتھنز کے ایلکس (AESCHYLUS) سوفکلیس (SOPHOCLES) اور یور یپائیڈلیس (EURIPIDIS) قابلِ ذکر ہیں۔

(ب) تاریخ دیگر علوم کی طرح علم تاریخ کی ابتدا بھی یونان سے ہوئی۔ اس سلسلہ میں ہیروڈوٹس (HERODOTUS) اولیت رکھتا ہے جو پانچویں صدی قبل مسیح سے متعلق ہے۔ یہ ایتھنز کا باشندہ تھا۔ اس کی تاریخ درحقیقت، واقعات، قیاسات، خیالات اور حکایات کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد تھیوسی ڈیس (THUCYDIDES) کا نام آتا ہے جو نہ صرف فلسفہ تاریخ کا بانی ہے بلکہ اس نے پہلی دفعہ اپنی کتاب میں تاریخ کو اس کے صحیح رنگ و روپ میں پیش کیا۔

(ج) سوانح نگاری سوانح نگاری کے سلسلہ میں پلوٹارک کا نام اہلِ یونان میں سب سے پہلے آتا ہے۔ اس نے پہلی صدی قبل مسیح میں اس فن کی ابتدا کی اس نے ایک یونانی اور ایک رومی شخص کی سوانح لکھی۔ اور پھر ان کا تقابلی جائزہ لیا۔ اس کی اس کتاب کو (PARALLEL LIVES) یعنی متوازی زندگیاں بھی کہا جاتا ہے۔

فنِ تعمیر، نقاشی اور مصوری اہلِ یونان نے اس قدیم دور میں فن تعمیر میں بھی بے مثال ترقی کی تھی۔ وہ اپنی عمارتیں پتھر سے بناتے اور اس کی آرائش و زیبائش کے لئے سنگ مرمر استعمال کرتے تھے۔ مکانات کی زیب و زینت کی خاطر وہ مختلف رنگ استعمال کرتے، بڑے بڑے محلات اور مکانوں کی تعمیر وہ ستونوں کے ذریعہ کرتے تھے۔ ان کی عمارتوں کا تناسب قابلِ تعریف تھا۔ عبادت گاہیں، سادگی اور تناسب کا حسین امتزاج پیش کرتی تھیں۔ ان میں دروازے تو ہوتے لیکن یہ روشندان اور کھڑکیوں سے مبرا ہوتی تھیں۔ ان کے فن تعمیر کے اثرات ہمیں رومی فن تعمیر پر بھی ملتے ہیں۔

اہلِ یونان اس قدیم دور میں بھی اعلیٰ درجہ کے نقاش تھے، یہی حال ان کی سنگتراشی اور مجسمہ سازی کا تھا۔ اس زمانہ کی مٹی کے برتنوں پر نقاشی کے جو چند نمونے دستیاب ہوئے ہیں وہ ان کے اس ذوق کی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔

اہلِ یونان اعلیٰ درجہ کے مصور بھی تھے۔ ان کے شاہکار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ انہوں نے

اس فن میں بے مثال کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

اہل یونان کے تہذیب انسانی پر جو عظیم احسانات ہیں انہیں ہم کسی طور پر بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان ہی کے دور میں علم و ادب اور تہذیب و تمدن پروان چڑھا، انہوں نے اس کی اپنے خون سے آبیاری کی اور اسے ایک تن آور درخت بنایا اور اپنے بعد آنے والوں کے لئے ایک ایسا نمونۂ عمل چھوڑ گئے جو ہر دور اور ہر تہذیب میں اپنے اثرات رکھتا ہے۔ اس لئے فری مین (E. A. FREEMAN) کہتا ہے کہ:

"ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ اہل یونان نے دنیا کو سب سے پہلے روح آزادی اور حقیقت تمدن سے روشناس کرایا۔ صرف سیاست ہی نہیں بلکہ دیگر فنون لطیفہ، سائنس اور علم و ادب کو بغیر کسی قوم کے اثرات لئے ہوئے اسے بام عروج تک پہنچایا۔"

اہل یونان کی صحیح اور سچی لگن، حق گوئی، آزادی فکر اور تحقیق و جستجو نے اس درجہ عروج بخشا تھا۔ ان کی تہذیب نے دنیا کی تقریباً تمام تہذیبوں پر اپنے اثرات چھوڑے۔ پروفیسر ایس۔ آر شرما (S. R. SHARMA) کے الفاظ میں اہل یونان کی مناظر فطرت سے دلبستگی اور حق خود ارادی ہی دراصل انکا انسانیت کے لئے سب سے بڑا تحفہ ہیں۔ اسی لئے مشہور انگریز شاعر شیلے (SHELLEY) کہتا ہے کہ ہم عقیدے کے اعتبار سے یونانی ہیں کیونکہ ہمارے علم اور فضل، ہمارے قوانین اور ادب نے ہر طور پر اہل یونان کی تعلیمات سے جلا پائی ہے۔ اسی بات کو ایک اور انگریز مورخ بوچر (S. H. BUTCHER) اس طرح بیان کرتا ہے کہ سائنس، فنون لطیفہ اور آزادی کی قدردانی اور قدرشناسی سے والہانہ وابستگی میں ہم یونان ہی کے رہین منت ہیں۔ یورپ نے اہل یونان ہی کے حیات بخش تصادم سے بنا اور قوت بخش ذوق کمال حاصل کیا جسے ہم ترقی کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اس طرح یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے کہ یونانی تہذیب معلوم دنیا کی سب سے پرانی تہذیب ہے۔ ان کی اسی تہذیب میں علم و ادب کے سرچشمے پھوٹے جس نے بعد کے زمانے کو متاثر کیا۔ چنانچہ اس تہذیب سے رومی تہذیب نے جلا پائی۔ مختصر تاریخ تمدن کا مصنف جے۔ ایس ہالینڈ (J. S. HOYLAND) لکھتا ہے کہ

"اگرچہ یونانی اور بھی مختلف طریقوں سے دنیا کی تہذیب پر اثر انداز ہوئے، مگر خاص طور پر انہوں نے فکر و فلسفہ اور فنون لطیفہ کی دنیا پر گہرا اثر ڈالا۔ .... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونان نے مختلف فنون میں حسن و خوبی کے ایسے معیار بنائے ہیں جن کو دنیا نے اس سے

پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے اور شاید اب بھی کوئی ان پر سبقت نہ لے جاسکے۔ .... کہا جاتا ہے کہ عصرِ حاضر کی ہر وہ چیز جو راہِ ترقی کی طرف گامزن ہے دراصل یونانی ہے' اس میں شک نہیں ...... اسی نے دنیا کی جمہوریت، دستوری قانون' خود مختاری' آزادیٔ ضمیر کی مثالیں پیش کیں' اسی جدتِ طبع نے پہلی بار ہمیں یہ بتایا کہ انسان جس دنیا میں بستا ہے' اس پر سائنس کے ذریعہ کس طرح وہ کارفرمائی کر سکتا ہے' کس طرح عالمی ریاست وجود میں لائی جاسکتی ہے اور کس طرح ایسی ریاست میں تمام قومیں متحد رہ کر اپنی کامل آزادی کو برقرار رکھ سکتی ہیں' یونان کا عطیہ ان ہی علمی ذرائع کا عطیہ ہے۔ ان ہی چیزوں سے کسی دن روحانی تصورات کی بنیاد پر ایک دائمی اور قابلِ عمل نظامِ تہذیب ساری دنیا میں قائم ہو سکے گا۔"

الغرض' یونانی تہذیب نہ صرف ارتقائے انسانی کے ایک اہم انقلابی دور کی داستان ہے۔ بلکہ ارتقائے انسانی کا ایک اہم موڑ بھی ہے' یونانی تہذیب بقول رابرٹ بریفالٹ دنیا کی سب سے زیادہ عقلیت پسند تہذیب ہے اور یہی بات ان کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت تھی' اسی جذبہ کے تحت یونانی تہذیب نے یورپی تہذیب کی حفاظت ہی نہیں کی بلکہ اس کو پیدا کیا۔ یونان سے پہلے یورپ کا وجود نہ تھا۔ یونان نے اس طلسم کو توڑا' جس نے ارتقائے انسانی کو سحر زدہ کر رکھا تھا اور اس طرح اس نے یورپ کی تخلیق کی۔

قاضی اختر جوناگڑھی

جناب وقار اشدی ایم اے

حصولِ آزادی کے بعد جو چند گراں مایہ علمی و ادبی ہستیاں پاکستان کے حصے میں آئیں۔ اُن میں پروفیسر قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی امتیازی شان کے مالک تھے۔ ان کی ہمہ گیر و متنوع شخصیت ہمارے لئے سرمایۂ صد افتخار کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ جس پایہ کے عالم و ادیب تھے اسی پائے کے مورّخ و محقق بھی تھے۔

قاضی صاحب ریاست جوناگڑھ کے بارسوخ و اہلِ اقتدار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا شمار جوناگڑھ کے بااثر روساء میں ہوتا تھا بلکہ سید الطاف علی بریلوی مدیرِ اعلیٰ سہ ماہی "العلم کراچی کے الفاظ میں" کاٹھیاوار میں ہز ہائی نس نواب صاحب جوناگڑھ کے بعد قاضی صاحب ہی کی پوزیشن تھی۔" قاضی صاحب جوناگڑھ کے مسلمانوں کے ایک ممتاز رہنما تھے۔ بقول ڈاکٹر ممتاز حسن صدر ترقی اردو بورڈ کراچی۔ "جوناگڑھ کے داخلی معاملات میں کافی دخل رکھتے تھے۔ جب جوناگڑھ کے پاکستان سے الحاق کا سوال پیدا ہوا تھا تو قاضی صاحب اس تحریک میں پیش پیش تھے جس کی پاداش میں انہیں نوع بہ نوع مصیبتیں اُٹھانی پڑیں۔ سقوطِ جوناگڑھ کے بعد قاضی صاحب کی زندگی آلام و مصائب سے دوچار ہو گئی۔ حکومتِ ہند نے اُن کا جینا دشوار کر دیا۔ ولبھ بھائی پٹیل کے اکسانے پر مولانا ابوالکلام آزاد بھی قاضی صاحب کے خلاف ہو گئے لیکن قاضی صاحب اصول کی خاطر کسی سمجھوتے کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔ اور تمام سمجھوتوں کو بیک کیا۔ قاضی صاحب کسی طرح راتوں رات مع اہل و عیال ریاست جوناگڑھ سے نکلے اور "دیو" نامی پرتگیزی جزیرہ میں پناہ لی جہاں انہوں نے کوئی ڈیڑھ سال عسرت و کرب کی زندگی گزاری۔ لیکن کسی حال میں بھی صبر و سکون اور ہمت و استقلال کا دامن نہ چھوڑا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ قاضی صاحب کراچی پہنچنے میں کامیاب ہو گئے پہلے انجمن ترقی اُردو سے وابستہ ہوئے۔ انتہائی دلچسپی اور محنت و انہماک سے کام کیا۔ اور شعبہ ہائے متعلقہ پر حاوی رہے۔ انجمن کے معتمد، رسالہ اُردو کے مدیر اور شعبۂ تصنیف و تالیف کے نگراں کی حیثیت سے اپنی ساکھ قائم کی۔ ان کی علمی و انتظامی صلاحیتوں کے مطابق انجمن سے انہیں تنخواہ نہ مل سکتی تھی نہ ملی۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کو قاضی صاحب پر سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ اس اعتماد کو انہوں نے پوری ذمہ داری و رواداری کے ساتھ آخری وقت تک برقرار رکھا۔

۱۹۵۳ء میں بنگال میں اُردو زبان و ادب کے ارتقاء سے متعلق میرے کئی مضامین روزنامہ جنگ کراچی میں

شائع ہوئے۔ انہیں دنوں قاضی صاحب سے میری پہلی ملاقات کراچی میں ہوئی۔ انہوں نے ان مضامین کو بہت سراہا اور یہ بھی فرمایا کہ جب آپ کی کتاب مکمل ہو جائے تو اسے انجمن کو دے دیجئے۔ سات ماہ کی مسلسل کاوش و محنت کے بعد میری کتاب تیار ہو گئی۔ میں اس کا مسودہ لے کر قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ موصوف نے مجھے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب قبلہ سے ملایا اور سفارش کی کہ اس قسم کی کتاب انجمن ہی سے چھپنی چاہیئے۔ بابائے اُردو نے اس مسودے کو قاضی صاحب کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا

"آپ اس مسودے کو دیکھ لیجئے اور اپنی رائے لکھ دیجئے۔"

اسی سال کے ماہ دسمبر میں پیر حسام الدین راشدی جیسے اختر شناس دانشور کی تحریک سے سندھ یونیورسٹی میں بحیثیت صدر شعبۂ تاریخ اسلام تشریف لائے تو راقم الحروف کو ان سے اکثر ملنے، قریب سے دیکھنے اور ان کی ذات با صفات سے مستفیض و مستفید ہونے کا موقع ملا۔ انہیں دنوں ایک دن ان کے شعبۂ تاریخ میں ملاقات ہوئی تو میری کتاب کا مسودہ سامنے رکھ کر اس کے ایک باب "فورٹ ولیم کالج" کے بارے میں فرمانے لگے۔

"یہ جو کچھ آپ نے بارہ صفحات میں لکھا ہے یہ سب کچھ ایک صفحہ میں آ سکتا ہے۔"

میں نے مؤدبانہ عرض کیا۔

"آپ کا ارشاد درست ہے۔ لیکن عرض یہ ہے کہ جو کچھ بارہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے وہ اسی ایک صفحہ کی صراحت ہے۔ یہ مواد[1] پہلی بار اس کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اور موضوع کی افادیت کے اعتبار سے یہ تفصیلات ضروری ہیں۔"

قاضی صاحب نے میرے اس خیال سے اتفاق کیا۔

بعض وجوہ کی بنا پر میں نے وہ مسودہ انجمن سے واپس لے لیا۔ ۱۹۵۵ء میں یہ کتاب بنگال میں اُردو کے نام سے مکتبۂ اشاعت اُردو حیدر آباد (سندھ) کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ بابائے اُردو نے اس کتاب کو بہت پسند فرمایا اور انجمن ترقی اردو کے رسالہ سہ ماہی اُردو بابت جولائی ۱۹۵۵ء میں اپنے تفصیلی خیالات کا اظہار فرمایا۔ قاضی صاحب اس زمانہ میں سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس کے احاطے میں رہتے تھے۔ ان کی خدمت میں میں نے کتاب کا نسخہ پیش کیا تو وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے دعائیں دیں اور فرمایا۔

"قاضی صاحب! آپ نے اُردو ادب کا ایک اہم گوشہ پُر کر دیا ہے۔ یہ ایک ایسا بنیادی کام ہے کہ آئندہ اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا جائے گا وہ اسی کتاب سے ماخوذ ہوگا۔ اب آپ کیا لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

میں نے جواب میں عرض کیا۔

"کوئی تحقیقی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا بلکہ میرے خیال میں اس کام کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس لئے اس موضوع پر مزید کام کرنے کی کوشش کروں گا۔"

قاضی صاحب نے فرمایا۔

---

[1] حضرت مولانا ماہر القادری کا اصرار ہے کہ لفظ "مواد" کے بجائے "مواز" لکھا جائے لیکن اس ناچیز کی رائے میں یہاں لفظ "مواد" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ (ع۔ ر)

"میرا تو خیال یہ ہے کہ ایک کام پر جمے رہنے کے بجائے کوئی اور کام کرنا چاہیئے تاکہ ایک اور نیا کام وجود میں آسکے"۔

مجھے قاضی صاحب کا مشفقانہ ومخلصانہ مشورہ پسند آیا اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پایا۔

قاضی احمد میاں یادگارِ سلف بزرگ تھے مشرقی تہذیب وتمدن کا نمونہ، سراپا اخلاص، ومروت، پرشکوہ وقار شخصیت کی شادابی و شگفتگی بڑی پرکشش تھی۔ باتیں ایسی محبت اور رکھ رکھاؤ سے کرتے تھے کہ اُن کے پاس سے اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

قاضی صاحب کی ساری زندگی ٹھوس معیاری اور بامقصد کاموں کے لئے وقف تھی۔ ان کے گرانقدر تاریخی وتحقیقی مضامین ۱۹۱۸ء سے ۱۹۵۵ء تک برصغیر پاک وہند کے معیاری رسائل وجرائد مثلاً معارف، الناصر، زمانہ، نگار، اردوئے معلّی، مخزن، ہمایوں اور اُردو میں چھپ کر اربابِ فکر ونظر کی توجہ کا مرکز بنتے رہے۔

قاضی صاحب کی کتابوں میں طبقات الامم، یورپ پر اسلامی اثرات، اسلامی کتب خانہ اور سرسید کا علمی کارنامہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز حسن کی فرمائش پر ایک کتاب "اقبال کا تنقیدی جائزہ" تصنیف کی۔ یہ کتاب اقبالیات کے باب میں ایک بیش بہا اضافہ سمجھی

قاضی صاحب کی جملہ نگارشات اب قومی ورثہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جن کی حفاظت ہمارا قومی فریضہ ہے۔ ترقی اُردو بورڈ کراچی ایک اہم قومی لسانی ادارہ ہے۔ بورڈ کا یہ اقدام لائقِ تحسین ہے کہ اس نے ایرانی شہنشاہیت کے دو ہزار صد سالہ جشن کے موقع پر قاضی صاحب کے سولہ تاریخی، تحقیقی وتنقیدی مقالات کا ایک دلکش مجموعہ "مقالاتِ اختر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں ڈاکٹر ممتاز حسن صدر ترقی اُردو بورڈ نے قاضی صاحب سے دوستانہ تعلقات اور ان کی علمی بصیرت کا اظہار جس خلوص اور وسیع القلبی سے کیا ہے اس کی مثال ہم چشموں میں بہت کم ملتی ہے۔ بلکہ یہ اُن حضرات کے لئے ایک چیلنج ہے جو اپنے ہمعصروں کے علمی کارناموں کے اعتراف کے معاملے میں مصلحت کوشی کو مسلک بنا لیتے ہیں۔

قاضی صاحب اسلام، اسلام کی تاریخ اور اس کی روح سے ہم آہنگ تھے۔ عجم کا حسنِ طبیعت اور عرب کا سوزِ دروں رکھتے تھے۔ ان کا اسلوب سادہ اور فکر انگیز ہے۔

طرزِ تحریر مؤثر اور دلنشیں۔ ان کے مضامین شاہد ہیں کہ تاریخ وتحقیق ان کا مخصوص میدان ہونے کے باوجود فلسفہ، فقہ، حدیث اور تصوف جیسے علوم وفنون کے متعلق ان کی جو تحریریں منصۂ شہود پر آئی ہیں وہ ہر اعتبار سے بلند پایہ لائقِ مطالعہ وقابلِ استفادہ ہیں۔

قاضی صاحب کا نام احمد میاں تھا تخلص اختر تھا۔ ابتدائی دور میں شاعری سے خاصا شغف رہا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں برجستہ شعر کہتے تھے۔ ان کے افکارِ عالیہ حسنِ تغزل وحسنِ تخیل کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے "لمعاتِ اختر" و "سی پارۂ دل" اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ جب کبھی طبیعت اُمنگ میں ہوتی بزمِ دوستاں میں شعر وسخن کے شگوفوں سے خوش ہوتے اور احباب کا جی بہلاتے۔ چند اشعار قارئین کے تفننِ طبع کے لئے پیش کئے جاتے ہیں ؎

دور تھا جب تک تو مثلِ ماہیٔ بے آب تھا   بحرِ بے پایاں میں مل کر قطرۂ نایاب تھا

آشنایانِ محبت کا گلہ کچھ بھی نہ تھا　　جب کہ میں نا آشنائے عالم اسباب تھا
جلوۂ ہستی کہ جس نے محو رکھا اس قدر　　کھل گئیں آنکھیں تو دیکھا یہ بھی کوئی خواب تھا
چھیڑنا تھا سعیٔ لاحاصل سے جو تارِ نفس　　وہ ربابِ ہستیٔ خاموش کا مضراب تھا
طور کا سینہ تجلّی گاہِ الفت بن گیا　　یہ بھی اک تیرا فروغِ حسن عالمتاب تھا
دیکھتے ہی صورتِ آئینہ حیراں رہ گیا　　پر تو حسنِ ازل سے دل مرا بیتاب تھا
اختر اس کے اصل و ماخذ کا پتہ ملتا نہیں　　جس سے مشقِ لفظ عشق و عاشقی کا باب تھا

ہوتی رہی ہے روز مری اُن سے گفتگو　　لایا مگر نہ لب پہ کبھی حرفِ آرزو
بیتابیٔ جنوں کا نہ ہو جائے راز فاش　　رکھ لے خدا مرے دلِ مضطر کی آبرو
تصدیق ہو رہی ہے تصور کی اس طرح　　آنکھوں کو کھولتے ہی وہ صورت ہے روبرو
وہ شوقِ سجدہ ہے کہ ترے انتظار میں　　رہتی ہیں ہر گھڑی مری آنکھیں بھی باوضو
اختر مری ہوس کو نہیں ہے نشاطِ کار　　رنگِ مجاز میں ہے حقیقت کی گفتگو

قاضی صاحب اُردو ہی میں نہیں فارسی گوئی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی فارسی غزلیں بھی دو آتشہ ہیں۔ ان میں قند مکرر کا بھی لطف ہے۔ ایک فارسی غزل دیکھیئے ؎

چہ انتہائے دردِ ہجر یارب دادۂ مارا　　کہ نتواں کرد با ایں خستگیہا ترک دنیارا
زحظ بندگی تنہا دہ ام ہرگز قدم بیروں　　ولے سیلاب عصیاں سر بر آرد لغزش پارا
نہادند از ازل چوں برزبانم مہر خاموشی　　چگونہ بر زباں آرم دگر عرض تمنا را
پریشاں خاطرِ من رہ نداده اشتیاقم را　　کہ موج مضطرب زنجیر باشد سیل دریا را
تجلا ئیش چو آتش می زند درخرمن جانہا　　عجب برق جہانے کو بسوزد طور سینا را
چو رنگ حُسن با نور نظر ہمرنگ می باشد　　دوئی بردار و از رخ پردہ آں معشوق یکتا را
پرستش می کنم آرے بتے را بے ریا اختر　　خوش آں کفرے کہ وحشت می بود ایمان رسوا را

قاضی صاحب ہنستے ہنساتے ۳ / اگست ۱۹۵۵ء کو بزم دنیا سے ہمیشہ کے لئے اٹھ کر چل دیئے۔ ان کے ایک صاحب نظر دوست حضرت حفیظ ہوشیار پوری مرحوم نے جو اب خود بھی اس محفلِ رنگ و بو میں نہیں قطعاتِ تاریخ کی صورت میں عقیدت کے پھول پیش کئے۔ یہ تاریخہائے وفات پہلی بار سالنامہ نقوش لاہور جولائی ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی ہیں ؎

(۱)

قاضی احمد میاں زحکمِ قضا ناگہاں از جہاں برفت افسوس

بادلِ زار سال او گفتم قاضی احمد میاں برفت افسوس

ا = ۱ ۱۹۵۴ + ۱ = ۱۹۵۵ء

(۲)

احمد میاں اختر از جہاں رفت و بماند اندوہ و غم و ملال و حسرت و رنج

تاریخِ وفات عیسوی و ہجری اندوہ و ملال اختر حکمت سنج

۱۹۵۴ + ۱ = ۱۹۵۵ء

(۳)

نہاں ہے اب بزیرِ پردۂ خاک منور آفتابِ صبحِ معنی

پکار اٹھا ہے خود ہر ذرۂ خاک کہ "اختر آفتابِ صبحِ معنی"

۱۹۵۵ء

امیر خسرو اور فنِ موسیقی

(از جناب شیخ محمد علی)

علم شاعری و ادب اور فن موسیقی پر مسلمانوں کے کارہائے نمایاں اور ان کی خدمات کچھ کم محیر العقول نہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ مشہور فلسفی و ماہر سائنس ابو نصر الفارابی عجوبۂ روزگار و فقید المثال شاعر عمر خیام شہرۂ آفاق ماہر طب و جراحت ابن سینا اور یکتائے زمانہ و جامع المربوط ماہر فلکیات و ریاضیات البیرونی وغیرہ بھی اس صنفِ علم و فن پر نداخل کا مبسوط اختیار رکھتے تھے جو کوئی اچنبھے کی بات نہیں خاص طور پر الفارابی اور ابن سینا کے کارہائے نمایاں فنِ موسیقی میں بنی نوعِ انسان کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ خوبصورت ترتیب و تدوین اور "راگ" کے بہترین اصول و قواعد ہمیشہ اُن کے کر و فر کی بنیاد و اساس رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس امر سے انکار و گریز ممکن نہیں کہ آج صرف مشرقی ہی نہیں بلکہ مغربی موسیقی کو جو معراج اور بلندی حاصل ہوئی ہے اس میں ان محسنین کی خدماتِ گراں بہا اور سعی و کاوش کو کبھی کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن آج میرا موضوع یہ ماہرینِ علم و فن فکر و اجتہاد نہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے جہاں دیگر شعبہ ہائے سائنس کو ترقی و عروج کی منازل طے کرائیں اور اُن میں گراں قدر و بیش قیمت اضافے کئے وہاں اپنے روحانی سکون کی خاطر روحانی غذا کا اہتمام بھی کیا۔ اور اس اہتمام کار کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ ذہن جو ہمہ وقت قوانینِ فطرت کی پیچیدگیوں اور ان کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروفِ عمل رہتا ہے۔ اسے چند لمحوں کا سکون میسر آئے تاکہ یہ بہتر طریقہ پر آئندہ کام کے لئے تیار رہے اور اس غیر ارادی فعل نے ارادۃً اس میدان میں بھی اپنے شاندار عمل کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ آج میرا موضوع سر زمین ہند کی خاک سے عدم سے وجود میں آنے والا وہ عظیم شخصیت ہے جس کو بچپن ہی میں دیکھ کر ایک مجذوب نے بے اختیار یہ کہہ دیا تھا کہ

"چادر میں لپٹا ہوا یہ بچہ خاقانی
سے دو قدم آگے نکل جائے گا۔"

کتنی حق بات کہی گئی تھی۔ اس ذات کے بارے میں جو دو قدم کے بجائے اپنے معاصرین و متاخرین سے کئی قدم آگے نکل گئی۔ یہ بچہ مستقبل کا وہ امیر خسرو تھا جس کی فنی اسیری نے اسے اپنے وقت کا

عظیم جامع الکمالات، قادرالکلام شاعر اور ایک فقیدالمثال
یکتائے زمانہ موسیقار تسلیم کروایا۔ کیا برصغیر پاک و
ہند اور قشر الارض کے بسنے والوں میں کوئی ذات
ایسی بھی ہے جو اِن مروق حقائق کو جھٹلا سکے جو
صنفِ شاعری کے علاوہ موسیقی کے میدان میں خسرو
کی ذات سے وابستہ ہیں۔

خسرو جب پیدا ہوا، تو احساسِ ناواقفیت
سے بارانہ تھا لیکن شاید یہ اُس مجذوب کے ہی الفاظ
تھے جو حقیقت ثابت ہوئے۔ خسرو کی سوانح حیات
اس کی ذات سے وابستہ سینکڑوں واقعات اور
دہلی کی بادشاہت سے اُس کی وابستگی ان تمام
موضوعات پر اب تک کافی تفصیل سے بہت کچھ
لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس
موضوع پر دیگر کچھ لکھنا غیر مناسب ہے۔ آج وقت
ہے خسرو کی قادر الکلامی، اس کے عروج فن، اس
کے اندازِ بیان و اندازِ فکر اور فنِ موسیقی پر اس
کے جذبات و احساسات اور کارہائے گرانقدر
پر روشنی ڈالنے کا۔ مختلف مؤرخین مصنفین ماہرین
موسیقی اور سیاح نے امیر خسرو کے علم موسیقی اور
اس فن میں اس کے عروج و کمال پر کافی کچھ لکھا
ہے۔ اور سیر حاصل بحث و تحیص کا اہتمام کیا ہے۔
لیکن ان حضرات نے یہ ثابت کرنے کی قطعی کوشش
نہیں کی کہ وہ کون سے "راگ" ہیں جو اس کی اپنی
ایجاد اور فن موسیقی پر مُہر عروج و کمال کی سند رکھتے ہیں۔
نیز یہ کن کن "راگوں" کی آمیزش سے تیار کئے گئے ہیں
کس طرح گائے جاتے ہیں اور کیوں کر اور کس طرح
عالم وجود میں آئے۔ اور اگر ان راگوں کی تدوین
میں مختلف ممالک کی موسیقی کی آمیزش ہے تو
اُن کو ہم آہنگ و مسطح کرنے میں امیر کو کن دشواریوں
اور صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قابلِ افسوس امر
یہ ہے کہ علم موسیقی پر امیر کی کئی کتاب ضائع ہو چکی
ہیں۔ اس لئے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ عہدِ حاضر میں جو
طرزِ موسیقی رائج ہے اور روز افزوں بلندی و عروج
کے مراحل طے کر رہی ہے اس میں امیر کا کیا ہاتھ ہے۔
اور اس طرح ہمارے لئے یہ چیز ممکن ہی نہیں رہی
کہ ہم اس اہم ثبوت کو باہم پہنچائیں کہ عہدِ حاضر میں
موسیقی کا وہ حصہ جس کو جدید دنیا کا باسی اپنی ملکیت
قرار دیتا ہے وہ درحقیقت امیر کا سرمایۂ حیات ہے۔
اہلِ ہند اپنے آپ کو موسیقی کا جد امجد گردانتے ہیں
لیکن جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا کہ علم موسیقی
فنِ موسیقی پر صحیح معنوں میں کام کی ابتدا مسلمانوں سے شروع
ہوتی ہے جنہوں نے اس موضوع پر بھی بے تحاشا
کام کیا لیکن باوجود ان کی اس جہدِ پیہم کے مسلمان
محققین و صنادید نے اس ضمن میں کوئی قابلِ قدر
تحقیقی کام سرانجام نہ دیا اور سینکڑوں ایسے راگ
دھنیں جو امیر خسرو کی اپنی ایجاد ہیں غیروں سے
منسوب و وابستہ کیں۔ امیر کی سوانح کے مطالعہ سے
اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک طویل
عرصہ امیروں اور بادشاہوں کے دربار میں گذرا
اور اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی سرزمین پر

یہ دربار ہی فن موسیقی کی اولین درس گاہ اور اس کی شان و شکوہ کا اہم بنیادی اساس تصور کئے جاتے ہیں۔

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ امیر نے اُس دور میں جبکہ وہ خود ہندوؤں کے ساتھ دربار میں موسیقی کی مجالس میں شریک محفل ہوا کرتا تھا۔ اس دشواری کو بخوبی محسوس کیا ہوگا کہ ہندی موسیقی مسلمانوں کے مذاق اور ان کے احساسات پر پوری نہیں اترتی اگر جو گلنے یا راگ مسلمانوں کو مرعوب تھے اور وہ ان کو پسند کرتے تھے یعنی حمد، نعت خمسہ، رباعیات اور مثنوی وغیرہ۔ ان میں ہندی راگ و موسیقی کی کوئی گنجائش و ضرورت نہیں۔ میرے اپنے ذاتی خیال میں یہی وہ دور ہے جبکہ امیر نے راگ و موسیقی میں مکمل دلچسپی کا اظہار کیا اور اس امر کی ہر ممکن سعی کی کہ ہندی موسیقی سے ہٹ کر کوئی روش اپنائی جائے۔ جو مسلمانوں کے مذاق پر پوری اترتی ہو۔ اس ضمن میں اس نے ان غیر ملکی طائفوں سے جو ممالک غیر سے بادشاہوں اور امراء کے دربار میں اپنے فن کے مظاہرے کی خاطر آتے تھے۔ استفادہ کیا اور ان کی موسیقی کو سمجھا اور ساتھ ساتھ ہندی راگوں پر بھی کامل دسترس حاصل کی اور یہ طبیعت کا شوق ہی تھا کہ ایک قادر الکلام شاعر ہوتے ہوئے فنِ موسیقی میں وہ عظمت و کمال اور بلندی و عروج حاصل کیا۔ جو اس سے قبل کسی کے نصیب میں نہ تھا۔

امیر نے نہ صرف مختلف النوع "راگ" ایجاد کئے بلکہ آلاتِ موسیقی MUSICAL INSTRU-MENTS بھی ایجاد کئے اور ایسے جامع و مربوط اور مکمل قواعد مرتب کئے کہ باوجود ایک طویل عرصہ گذر جانے کے کوئی ماہرِ فن ان میں ترمیم و تنسیخ کی ذرہ بھر گنجائش نہ نکال سکا۔ فنِ موسیقی پر کامل دسترس کے حامل متاخرین و مشاہیرین متفقہ طور پر اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ امیر خسرو کی ہمہ گیر و ہم مربوط طبیعت کا اسے اس نازک و لطیف فن کی طرف راغب کرنے میں اور اس کو اس کے "فن" کے ساتھ درجۂ کمال تک پہنچانے میں بہت بڑا ہاتھ ہے کہ سات سو برس کی طویل مدت گذر جانے کے باوجود اس کا جواب پیدا نہیں ہوسکا۔

امیر کے معاصرین میں اُستاد نائک گوپال کا بڑا شہرہ سنائی دیتا تھا۔ گوپال کی فن موسیقی میں شہرت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ کہ اس شخص کے تقریباً پندرہ سو شاگرد اس کے اطراف ہمہ وقت موجود رہا کرتے تھے جو اس کے تخت کو فرداً فرداً اٹھا کر چلتے تھے۔ علاء الدین خلجی نے جب اس موسیقار کی شہرت سنی تو اسے اپنے دربار میں طلب کیا۔ اور خصوصی حیثیت عطا کی۔ امیر کو یہ بھی شرف حاصل تھا کہ وہ خلجی کے دربار میں خصوصی حیثیت کا حامل تھا۔ گوپال نے جب اس مسلمان موسیقار کو شہنشاہِ وقت کے لطف و کرم کا شکار دیکھا تو اسے باقاعدہ طور پر چیلنج کیا کہ اگر اس فن موسیقی سے اس کو ذرا بھی وابستگی ہے تو وہ اس کا مقابلہ سلطان علاء الدین

خلجی کے حضور کرے۔ گوپال نے بادشاہ سے درخواست
کی کہ وہ امیر کو حکم دیں کہ وہ پہلے اپنے فن کا مظاہرہ
کرکے مقابلہ شروع کرے۔ امیر نے پرسکون طریقہ پہ
گوپال کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے بادشاہ سے
فروگذاشت کیا کہ میں مغل ہوں اور ہندوستانی راگ
وموسیقی سے معمولی واقفیت رکھتا ہوں۔ بہتر یہ ہے گا
کہ پہلے استاد گوپال اپنے فن کا اظہار کریں پھر میں بعد
میں کچھ عرض کروں گا۔ گوپال نے کئی راگ سنائے لیکن
ہر راگ پر امیر نے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ یہ میری اپنی ایجاد
ہے جس کو استاد گوپال استعمال کر رہے ہیں۔ اور
پھر خود اس راگ کو بہتر طریقہ پر ادا کرکے یہ بتایا کہ
گوپال نے اس میں کیا کچھ خامیاں کیں ہیں۔ اور پھر
شہنشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے امیر نے گوپال سے
کہا کہ یہ چیزیں بازاری اور عام راگ ہیں اب میں اپنے
خاص راگ تم کو سناتا ہوں۔ امیر جب وقت اپنے
راگ سنا رہا تھا اس وقت بادشاہ، درباری اور
خود گوپال محوِ حیرت، منہ میں انگلیاں دیئے اس کے
راگ سن رہے تھے۔ امیر ہندی، فارسی اور عربی
راگوں سے بخوبی واقف تھا چنانچہ اس نے کئی ایسے
راگ تیار کئے تھے جو یقینی طور پر ان تمام راگوں کی
آمیزش کہے جا سکتے ہیں۔ اس نے اپنی اس آمیزش
سے موسیقی کو ایک نئے رنگ اور ایک نئے روپ
سے نوازا۔ امیر نے اپنے انھیں راگوں میں سے ایک
راگ دربار میں سنایا اور گوپال سے پوچھا کہ وہ
اس کا نام بتلا سکتا ہے۔ گوپال اس کا صحیح جواب
نہ دے سکا۔ امیر نے اس سے کہا کہ جس چیز کو تم "دھرپد"
کہتے ہو کبھی "چترنگ" اور کبھی "تروٹ" ہم نے اس کا
نام "ترانہ" رکھا ہے۔ دربار میں امیر کے رویئے اس کے
بلند کمالات اور فن پر کامل دسترس نے گوپال کو شدید
طور پر متاثر کیا اور اس نے امیر کی صحبت خاطر استفادہ
مستقل طور پر اختیار کر لی۔

امیر خسرو نے سینکڑوں راگ تیار کئے اور موسیقی
کی نئی جدت پسند طرز پر تدوین کی۔ ان میں وہ چند راگ
جو کافی شہرت ومقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے
چند مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مجیر۔ غارا اور عجمی راگ وموسیقی کی نئی جدت آمیز آمیزش
۲۔ عشاق۔ سارنگ، بسنت، نوا
۳۔ سازگری۔ پوربی۔ گورا، گن کلی اور فارسی کی حسین آمیزش۔
۴۔ غنم۔ پوربی کا خوبصورت تبدل۔
۵۔ زیلف۔ راگ کھٹ اور شہناز
۶۔ سرپردہ۔ سارنگ، بلاول اور راست
۷۔ باغرد۔ دیس کار اور فارسی کا ملاپ
۸۔ صنم۔ کلیاتی اور فارسی
۹۔ ایمن۔ ہنڈول اور منیریز
۱۰۔ فرودست۔ کانڑا، گوری، پوربی اور ایک عجمی راگ کی ہم کشش۔

مشہور ہندی موسیقار پنڈت دھرما جانو لکھتے ہیں کہ
"امیر خسرو کو ہندوستانی اور ایرانی راگوں پر کلی
دسترس حاصل تھی" دھرما نے اس ثبوت میں

کہ خسرو کو مذکورۂ بالا راگوں پر دسترس حاصل تھی
اور وہ ان کی ترتیب و تدوین پر مکمل اختیار رکھتا تھا۔
مختلف النوع ایسے راگوں کے حوالے دیئے ہیں
جو ہندوستانی اور ایرانی راگوں کی نئی طرز اور جدید
انداز پر مبنی ہیں۔

"ستار" آج یقیناً ہر شخص اس آلۂ موسیقی
سے واقف ہے لیکن شاید اس بات سے بہت کم واقف
ہوں کہ یہ بھی امیر خسرو کی ان ایجادوں میں سے ہے
جو امیر کے حسن و کمال کا زرخیز ثمر ہیں۔ امیر نے مردنگ
کو ڈھولک میں تبدیل کیا اور ایرانی باجے تنبور کو ایک
نئی شکل دی جسے "بینا" کا نام دیا۔ امیر کے مقبولِ
عام راگوں میں غزل، بخارہ، قول، ترانہ، نگار، شاہانہ
بسیط اور خیال وغیرہ کو کافی شہرت حاصل ہے۔ ماہرین
موسیقی اور محققینِ موسیقی کے خیال میں قوالی بھی امیر
کی ایجاد ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی کتاب
آبِ حیات میں اس امر کی تصدیق کی ہے کہ قوالی
خالصتہً امیر کی اپنی ایجاد ہے اور اسی سبب سلطان المشائخ
حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ علیہ نے اس کو
"مفتاح السماع" کے خطاب سے نوازا۔

"سنگیت" کی تاریخ ہندوستان کے طول و
عرض پر تین ہزار سال قبل سے ملتی ہے۔ اہلِ ہند اپنی
چار مقدس کتابوں کو گا کر پڑھتے ہیں۔ ہندی اور فارسی
راگوں میں تقابل و تفاوت کی وجہ صرف یہ ہے کہ فارسی
میں بارہ مقام، چوبیس شعبے، اڑتالیس گوشے، چھ آواز
بارہ نغمے اور تینتیس لحن شامل ہیں۔ اس کے علاوہ
دو شعبے اور چالیس لحن اضافی ہیں اور ہندی موسیقی
میں قدیم موسیقاروں کے مطابق چھ راگ، تیس راگنی
اڑتالیس پتر اور بارہ سُر ہونے ضروری ہیں۔ ان
میں راگوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

بھیرون۔ مالکوس۔ ہنڈول۔ دیپک۔ سری راگ
میگھ راگ

لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں کافی
ترامیم کی گئیں۔ اس لحاظ سے امیر کے ایجاد کردہ راگوں
میں بعض ہندی راگوں سے مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس
رائے کا اظہار امیر نے اپنی بعض تصانیف میں خود کیا ہے
لیکن سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر امیر کے راگوں میں
ہندی راگوں سے مناسبت پائی جاتی ہے تو اس میں حیرت
و اچنبھے کی کیا بات؟ موسیقی میں ملاپ و جدت یہ خسرو
ہی کا کارنامہ ہے جس نے رنگ برنگ حسین دلآویز پھولوں
کو یکجا کر کے اسے ایک حسین گلدستہ کی شکل دی جو رنگ و
بو میں اپنی مثال آپ ہے۔

ان تمام امور کو مدنظر رکھ کر اگر دیکھا جائے تو
امیر کی ایجادات کل اٹھائیس ہوتی ہیں۔ چار شعبہ جوز
نہاوند۔ اصفہانک اور مخالف کو شامل کرنے کے بعد)
بعض ماہرین کا خیال ہے کہ پانچ گوشے موافق، صنم،
آدان اور فرغنہ وغیرہ بھی امیر ہی کی ایجاد ہیں۔ فن موسیقی
اور تاریخ موسیقی پر لکھی گئی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ
چلتا ہے۔ کہ طرز موسیقی کی مختلف اقسام مثلاً الاپ،
جوڑ، دھرپد، سارده، ہوری، خیال، پٹہ، ترانہ، تروٹ
سرگم، چترنگ۔ قول اور ٹھمری وغیرہ بھی امیر کی مِنّت

کاوشں اور میدانِ موسیقی میں گراں قدر خدمات کا نتیجہ ہیں۔

امیر خسرو امرا و روسا کے دربار میں آنے والے غیر ملکی موسیقاروں سے اس فن پر دقیق و فنکارانہ گفتگو کیا کرتا تھا اور ان پر اس امر کا انکشاف کیا کہ ان کے ہاں چند مقبول راگوں کو اس نے دوسرے راگوں کی آمیزش سے ایک نئی خوبصورت ہئیت و تدوین سے نوازا ہے۔ اور اس طرح یہ اپنی سابقہ شکل سے نہایت خوبصورت و دلنشیں ہو کر سامنے آئے ہیں۔ اس نے بتلایا کہ ان راگوں کو جنھیں یہ رکھٹ کہتے ہیں۔ انھیں یہ کھٹ، جنھیں یہ بھاوٹ انھیں یہ دھناسری کہتا ہے اور حسینی، زوگاہ اور عجم کو اس نے سارنگ دکانی کا نام دیا ہے۔ سہ گاہ، چہار گاہ، مایہ بستہ، نگار، زنگولہ اور مغلوب کو ٹوری کا نام دیا ہے اور اسی طرح امیر نے کئی ایسے جدید اور خوبصورت راگوں کے نام بتلائے۔ جو اس آمیزش کے اثر سے تیار کئے گئے تھے۔ جن کو ان غیر ملکی موسیقاروں نے بھی بیحد پسند کیا اور امیر کی اس کاوش کو شاندار الفاظ میں سراہا۔

یہ یقیناً امیر خسرو کا اہلِ موسیقی پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اپنی ایجادات و اختراعات اور فنِ موسیقی پر حاصل کمالات کو سپرد قلم کیا اور اس طرح ہم تک وہ خزانۂ گلشن جس کی آبیاری امیر اپنے خون سے کرتے رہے۔ آپہنچا ورنہ شاید آج فنِ موسیقی کو ترویجی عمل میں کافی کچھ دشواریاں درپیش ہوتیں۔ یہ اصولِ فطرت ہے کہ ماضی میں کئے گئے کاموں کی بدولت اور ان کے سہارے جدید عہد کا انسان آگے بڑھتا ہے اور اپنے لئے بہتر راہیں تلاش کرتا ہے۔ لیکن اگر راہ ہی مفقود ہو تو آگے بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ فنِ موسیقی پر امیر کے احسانات اور ان کے کارنامے اگر دائرہ ذکر میں لائے جائیں تو یقیناً دفتر کشور کی ضرورت کا احساس فروغ پائے گا۔ لیکن یہاں اختصاراً و مجملاً ان کی خدمات کو نذرِ قارئین کرنا مقصود ہے۔

اگر ہندوستان میں موسیقی کی تاریخ کو اٹھا کر دیکھا جائے تو یہ احساس یقیناً فروغ پائے گا کہ ہندی موسیقی کی ترتیب و تدوین میں نفسانی حد شہوانی خواہشات کو ابھارنے اور مشتعل کرنے کا عنصر نمایاں اور واضح کردار کا حامل ہے اور اس حقیقت سے انکار ناگزیر ہے کہ اہلِ اسلام ہر ایسی شے کو ناپسند کرتے رہے ہیں جس میں اس قسم کے عنصر نمایاں ہوں چنانچہ مسلمانوں نے اپنے مذہبی عقائد کی روشنی میں موسیقی کو ناجائز و باطل قرار دیا جو یقیناً اپنے طور پر ایک صحیح عمل تھا۔ لیکن اس کے بعد اس ضرورت کو نہایت شدت سے محسوس کیا گیا کہ ایسی موسیقی اور راگ ترتیب دیئے جائیں۔ جو مسلمانوں کی روحانی ضروریات کی تکمیل کر سکیں۔ اس نکتہ پر امیر کی نظر پہلے ہی سے مرکوز تھی چنانچہ اس واقعہ کے بعد جب کہ موسیقی کو ناجائز و باطل قرار دیا گیا۔ امیر نے ہندی اور دوسرے ممالک کے راگوں کو اس طرح مرتب کیا اور ان کو خمسہ و غزل اور رباعیات سے ہم آہنگ کیا کہ مسلمان ہی کیا ہندو بھی اس کارنامہ

پر انگشت بدندان رہ گئے اور ان دھنوں کو کافی مقبولیت کا حصول ہوا۔ خاص طور سے ان میں قوالی کے رنگ نے ایک عجب عشق و سرمستی کی کیفیت پیدا کر دی اور یہ طرز ایسی مقبول ہوئی کہ آج بھی کل عالم میں یہ طرز کلام کے لئے اس کا شہرہ ہے خسرو کے بعد موسیقی کے بڑھتے ہوئے اثرات دیکھ کر بعض علماء و مشاہرین نے اسے ناجائز قرار دیا لیکن ہر دور اور ہر زمانہ میں صوفیا کا ایک گروہ ایسا موجود رہا۔ جو موسیقی کو روحانی لذت و سرور اور غذا کی خاطر استعمال کرتا رہا۔ چنانچہ شمس الدین التمش کے عہد میں قاضی سعد الدین صادق اور منہاج السراج نے موسیقی کے خلاف کافی زہر اگلا جس کو چشتیہ خاندان کے قاضی حمید الدین ناگوری نے چوس کر اہالیان دہلی میں امیر کے ان راگوں اور دھنوں کو جو قوالی سے ہم آہنگ تھیں دوبارہ رائج کر دیا۔ غیاث الدین بلبن کو ہندوستان کی تاریخ میں موسیقی کے شاندار دور سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کا سبب خود امیر کی ذات تھی۔

امیر کو یقیناً ایک فطری شاعر اور فطری موسیقار بھی کہا جا سکتا ہے جس کو خدائے واحد و برتر کی طرف سے یہ نعمت بے بہا مرحمت کی گئی۔ چنانچہ یہ امیر کی خصوصیت تھی کہ وہ شعر کہنے یا موسیقی ترتیب دینے میں کسی قسم کی قید و پابندی سے آشنا نہ تھے۔ اوزان شعر پر انھیں ملکہ حاصل تھا اور مشکل سے مشکل بحر میں شعر بلا تکلف کہہ جاتے تھے۔

ایک دفعہ کسی شاعر و موسیقار نے کسی موقع پر امیر کو طنز کا نشانہ بنایا اور ان پر اپنی علم موسیقی کی قابلیت کا رعب جمایا۔ امیر نے اسی وقت اشعار کہے اور ان کو موسیقی سے اس طرح ہم آہنگ کیا کہ طنز و مزاح کا نشانہ بنانے والا شاعر و موسیقار شرمندہ ہوگیا اور موقع پر موجود امراء اور رؤسا حیران رہ گئے اور انہوں نے یہ گواہی دی کہ بیشک۔ عہد حاضر میں خسرو کا ثانی کوئی نہیں۔

امیر خسرو نے سینکڑوں ، سم ، تال ، شر ، نغمے ، راگ ، دھنیں وغیرہ ایجاد کیں اور ان کے لئے نہایت بہتر و موزوں قواعد و ضوابط مرتب کئے۔ اس فن میں مستقل جدت آمیزی کو فروغ دیا۔ اور بے تحاشا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ان کے کارنامے فن موسیقی میں جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ایک عظیم مبسوط خزانہ کی شکل رکھتے ہیں جن کو اختصار سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا ایک مشکل ترین امر ہے۔ چنانچہ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ خزانۂ علم و فن جو امیر کی ذات سے وابستہ ہے اور آج غیروں سے منسوب ہے اس میں تحقیق و تدقیق کے عمل کا اہتمام کیا جائے تاکہ ہم خسرو کے اس سرمایۂ حیات کو جو اس کی محنت و جانفشانی اور عزم صمیم کا نتیجہ ہے مکمل طور پر حاصل کر کے محفوظ کر سکیں۔ اور یقیناً یہ ان ماہرین علم و فن کا جو اس تحقیق و تدقیق میں نمایاں کردار ادا کریں گے آنے والی نسل پر عظیم احسان ہوگا جو مستقبل میں امیر کے لامتناہی خزانہ سے بھرپور استفادہ کر سکے گی۔

مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی بنام مولوی ابوالحسن علی ندوی

مجھے مولانا کے مکتوب الیہ بننے کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب رسالہ "الندوہ" جس کی لوح بھی ان کے اور ان کے محبوب و محترم بزرگ دوست علامہ شبلی نعمانی کے نامِ گرامی نام ہوتے تھے۔ الندوہ ولانا سلیمان ندوی کے حکم سے سہ بارہ اجراء ہوا اور اس کی ادارت و ترتیب کا کام میرے اور صدیق محترم انا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کے سپرد ہوا۔ تو نواب صاحب نے اس سلسلہ میں مجھ نیاز مند کو ، بار شرف مخاطبت بخشا۔ میں نے ان کے اس سلسلہ کے مکاتیب کو حرزِ جان بنا کر رکھا۔ اب ناظرین کرام کو ملاحظہ فرمائیں۔ (ندوی)

محرم الحرام ۱۳۵۹ھ

گرامی قدر سلمہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عزیزی مولوی سید سلیمان صاحب نے "الندوہ" "ندوۃ العلماء کی تاریخ کے پہلے صفحہ" پر مضمون زاگلی صحبتوں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ وہ یاد جو ، اندر ایک عالم حسرت رکھتی ہے ؎

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

(خواجہ حالی مرحوم)

اسی مضمون میں جتاتا ہے کہ " اس سلسلہ کا رابطہ ایک اور روحانی مرکز سے بندھا تھا جس کا نام نامی حضرت مولانا فضلِ رحمٰن صاحب مجددی گنج مرادآبادی تھا..... مشرق و مغرب کے یہی دونوں مطلع تھے جن سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا۔

مغربی مطلع کا ذکر مولوی صاحب کے مضمون میں بہت کچھ آچکا۔ مشرقی مطلع کا ذکر میں اپنی ایک پرانی تحریر کے ذریعہ سناتا ہوں جو آج سے چون برس پہلے لکھی گئی تھی۔ میں اس زمانہ میں اگرہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ وہیں سے گنج مرادآباد حاضر ہوا تھا۔ بائیس رجب المرجب کو حاضرِ خدمت بابرکت ہوا۔ ۲۵ رجب کو آگرہ جا کر یہ یادداشت لکھی تھی۔

ایک اور بات کہنی تھی۔ جب میں نے اپنے یہاں کی قلمی کتابوں کی فہرست ختم کی تو اس کی خوشی میں ایک پرانا مضمون حاضری پانی پت پر نقل کر کے معارف میں شائع ہونے کے واسطے بھیجا تھا۔ جو شائع ہوا اور مؤثر ٹھہرا۔

اب "الندوہ" کے دوبارہ اجراء کی خوشی میں یہ ایک قدیم تحریر آپ کو بھیج رہا ہوں۔ پسند ہو تو الندوہ میں شائع کیجیے۔ رسید آئے تو اطمینان ہو جائے گا۔

حبیب الرحمٰن

---

۱۸ ستمبر ۱۹۴۰ء

گرامی قدر سلمہ

السلام علیکم

کام کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ ختم ہونے پر پہنچے گا۔ اکتوبر سے سلسلہ شروع کر دیتا۔ زود قلم نہیں ہوں۔ غور کرنا پڑتا ہے۔ حبیب الرحمٰن

گرامی قدر سلمہ

السلام علیکم

مقدس مقام میں صیام مبارک۔

خط آیا۔ مقالہ پہنچ کر پسند ہوا۔ اس سے اطمینان ہے۔ مقالہ میں ان الفاظ کے بعد "میرے دادا صاحب محمد خان زماں صاحب نے" یہ الفاظ بڑھا دیے جائیں "(جن کو شاہ عبد العزیز صاحب سے بیعت تھی)"۔ حبیب الرحمٰن

حبیب گنج ۵ رمضان المبارک

گرامی قدر سلمہ

السلام علیکم

الندوہ کا خیال دل و دماغ دونوں میں ہے۔ موقع کا انتظار ہے۔ اس زمانے میں دار المصنفین کی خدمت جاری رہی۔ خطوط نسخ کیے ہیں۔ کاتب سے اجازت کی ضرورت ہے۔ یہی میں نے مولوی سید سلیمان سے کہا ہے۔ الحمد للہ بخیریت ہوں۔ آپ سب کی خیریت کا آرزومند ہوں۔

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج ۲۰ شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ

---

۲ نومبر ۱۹۴۰ء

گرامی قدر سلمہ

السلام علیکم

الندوہ نومبر کا ابھی پڑھ کر رکھا ہے۔ اس کی صحت و صفائی کا معیار گر رہا ہے۔ اس جانب توجہ کیجیے۔

حبیب الرحمٰن

[illegible]

گرامی قدر سلمہ

السلام علیکم

ربیع الآخر کا "الندوہ" آیا، پڑھا۔ اغلاط طبع اب اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ طبیعت مطالعہ میں الجھتی ہے۔ تصحیح پر پوری توجہ کی ضرورت ہے۔ حیف ہے کہ کتابت آیات قرآنی میں بھی فاحش غلطیاں کی گئی ہیں۔ دوسرا امر قابل توجہ تمام تعریف و توصیف میں پروپیگنڈہ کی خصوصیات نمایاں ہو چلی ہیں۔ جن سے اشتہار و لٹریچر سے مشابہت پیدا

[illegible]

۱۸۔ مفکرینِ تعلیم

مصنفہ پروفیسر ضیاء الدین احمد ۱۴ روپے

۱۹۔ اصول و اساسِ تعلیم

مترجمہ انعام عظیم برنی ایم اے، اخلاص حسین زبیری ایم اے وغیرہ ۱۴ روپے

۲۰۔ تعلیمی نفسیات کا بنیادی خاکہ

مصنفہ پروفیسر وحید الحق صدیقی سابق پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۸ روپے

۲۱۔ عظیم علمائے نفسیات

مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی ۲۴ روپے

۲۲۔ مادری زبان کی تعلیم

مصنفہ پروفیسر یونس حسن فروغ علوی ۶ روپے

۲۳۔ جان ڈیوی کا فلسفۂ تعلیم

مصنفہ سید معین الدین علوی ایم اے ۵ روپے

۲۴۔ تعلیمی مسائل

مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۶ روپے

۲۵۔ مقاصدِ تعلیم

مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر "جنگ" ۱۲ روپے

۲۶۔ ارتقائے انسانی (بہ لحاظ سائنس کی روشنی میں)

مصنفہ مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) ۱۲ روپے

۲۷۔ چند عظیم علمائے تراجم

مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی ۲۰ روپے

۲۸۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم

مصنفہ پروفیسر سعید احمد رفیق ایم اے ۶ روپے

۲۹۔ خط و خطاطی

مصنفہ شیخ ممتاز حسین جونپوری ۳ روپیہ ۵۰ پیسے

۳۰۔ جمہوریت اور تعلیم جلد اول

مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر "جنگ" ۱۰ روپیے

۳۱۔ جمہوریت اور تعلیم جلد دوم

مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ "جنگ" ۱۵ روپیے

۳۲۔ انگریزوں کی لسانی پالیسی

مصنفہ سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۲۱ روپیے

۳۳۔ بچہ کا ذہنی و نفسیاتی ارتقا

مرتبہ اخلاص حسین زبیری ایم اے و پروفیسر وحید الحق صدیقی ۱۲ روپے

۳۴۔ تعلیم و تربیت

مصنفہ ضیاء الدین احمد برنی ۱۰ روپے

۳۵۔ سائنس کے کرشمے

مصنفہ مسرور احمد توقیر ایم اے ۵ روپے

۳۶۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں

مرتبہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) و پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے ۲۴ روپیے

۳۷۔ ان کہی کہانیاں

مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ۳ روپیے

حوالہ جات منظوری

+1. NO.D.I.G.S./A(1216 4)/87 DATED 28.5.1967.

+2. NO.D.E/F-PUB/(126)/7820-8170/69 DATED 20.5.1969.

+3. NO.D.E/F-PUB/(11-A)/(1306-1630)/72 DATED. 8.1.1972.

۳۸۔ مسلمانانِ کراچی و سندھ کی تعلیم

تالیف۔ سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی

مقدمہ۔ مرزا علی اظہر برلاس بی۔ اے بی ایل ۱۰ روپے

۳۹۔ تعلیم و تعلم

مرتبہ سید الطاف علی بریلوی

مقدمہ۔ سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی ۱۴ روپے

۴۰۔ تعلیم بالغان اور اس کی قومی اہمیت

تصنیف۔ مولوی مظہر الرحمان بچھرایونی

مقدمہ۔ پروفیسر ڈاکٹر محمود حسین پی ایچ ڈی ۴ روپے

۴۱۔ تعلیم کے ابتدائی اصول (حصہ اول و دوم)

تصنیف۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ

مترجمہ۔ مولوی سبطین احمد بدایونی ۲۰ روپے

۴۲۔ پاک و ہند میں تعلیمی ترقی

مترجمہ۔ سید احسن مارہروی ایم اے (علیگ) ۵ روپے

۴۳۔ اقبال کے تعلیمی نظریات

تصنیف۔ محمد احمد صدیقی بی۔ اے (آنرز) ایم اے

بی ٹی (علیگ) تعارف و مقدمہ۔ سید الطاف علی بریلوی

و اخلاص حسین زبیری ایم اے ۱۶ روپے

۴۴۔ ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن (بزبان انگریزی)

(جلد اول ۷۱۲ء تا ۱۷۵۰ء)

تصنیف۔ پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے ۲۴ روپے

۴۵۔ رفقائے عظیم (گریٹ کمپینینس)

تصنیف۔ میکس ایسٹ مین مترجمہ پروفیسر محمد حامی الدین

خاں ایم اے (علیگ) ۲۰ روپے

۴۶۔ مولانا محمد علی جوہر ــــ حیات اور تعلیمی نظریات

مصنفہ ثناء الحق صدیقی ایم اے ۸ روپے

۴۷۔ مسلمانانِ پنجاب کی تعلیم

مصنفہ۔ سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۲۰ روپے

۴۸۔ حیاتِ مابعد

تصنیف۔ سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی۔

مقدمہ ڈاکٹر ایم ایم احمد چیرمین شعبہ فلاسفی کراچی یونیورسٹی ۷ روپے

۴۹۔ تجددِ امثال۔ تصنیف سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی

مقدمہ۔ ڈاکٹر ایم ایم احمد ایم اے پی ایچ ڈی ۳۰ روپے

مقدرِ انسانی (ہیومن ڈسٹنی)

مترجمہ: پروفیسر عبدالمجید قریشی (علیگ) ۱۶ روپے

۵۰۔ یادیں اور خاکے

تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی

مقدمہ۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم اے۔ پی ایچ ڈی ۴ روپے

۵۱۔ تاثرات و مشاہدات

تصنیف۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی۔

مقدمہ۔ پروفیسر ڈاکٹر شوکت سبزواری ایم اے پی ایچ ڈی ۶ روپے

۵۲۔ پاکستان کا معاشی پس منظر

تصنیف۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی۔

پیش لفظ۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدین ایم اے ڈی لٹ ۷ روپے

۵۳۔ تجزیۂ کلامِ غالب

مصنف۔ سید رفیع الدین بلخی ایڈوکیٹ۔

مقدمہ۔ سید علی حسین زیبا ردولوی ایم اے ۱۲ روپے

۵۴۔ ادب منزل بمنزل

مصنفہ۔ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی

مقدمہ۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ۱۲ روپے

۵۵۔ مکاشفاتِ کشفی

مصنف میجر خان بہادر مرزا ابو جعفر کشفی

پیش لفظ۔ خان بہادر رضا علی وحشت

تعارف وتبصرہ۔ سید الطاف علی بریلوی و پروفیسر جمیل مظہری ایم اے ۳ روپے

۵۶۔ وادیٔ نیل

تصنیف۔ محمد قطب الدین ایم۔ ایس سی (عثمانیہ)

مقدمہ۔ پروفیسر شمیم اختر (کراچی یونیورسٹی) ۵ روپے

۵۷۔ تاریخی شہ پارے

از مرزا علی اظہر برلاس بی۔ اے۔ ایل ایل بی ۴ روپے

۵۸۔ مسلمانان بنگال کی تعلیم

از سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام۔ ایل ایل بی ۴ روپے

۵۹۔ فرحت الناظرین

مصنفہ۔ محمد اسلم خلف محمد حافظ پسروی

مترجمہ۔ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے ۱۶ روپے

۶۰۔ ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن جلد دوم (۱۷۵۱ء تا ۱۹۶۱ء)

از پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے ۴۲ روپے

۶۱۔ مقالات بریلوی

از سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۲۰ روپے

۶۲۔ چند محسن چند دوست

مقدمہ۔ ڈاکٹر ممتاز حسن ایم اے ایل ایل ڈی (ستارۂ پاکستان) تصنیف۔ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۰ روپے

۶۳۔ حکیم عمر خیام

تالیف۔ ابو المکارم سلیم اللہ فہمی

مقدمہ۔ سید الطاف علی بریلوی ۵ روپے

۶۴۔ صوفیائے بہار اور اردو

تصنیف۔ پروفیسر محمد معین الدین دردائی ایم اے (علیگ) ۱۶ روپے

۶۵۔ صوفیائے سندھ اور اردو

تصنیف۔ پروفیسر محمد معین الدین دردائی ایم اے (علیگ) ۲۵ روپے

۶۶۔ مسئلہ علم مسلم مفکرین کی نظر میں

از پروفیسر محمد یعقوب بخش راغب بدایونی ۴ روپے

سید الطاف علی بریلوی سکریٹری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے مسائل بیان کررہے ہیں

شرکاء اجلاس مستورات

سہ ماہی

کراچی

العلم

بتقریب صد سالہ جشنِ پیدائش قائداعظمؒ

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی

علامہ اقبال

نذر ذاکر حسین لائبریری
لشیر حسین زیدی

رجسٹرڈ نمبر - جی - ۳۳۶

ٹیلیفون نمبر
دفتر: ۶۱۱۱۹۶
مکان: ۶۱۱۳۶۹

العلم
کراچی

سالانہ قیمت ۱۲ روپے
فی پرچہ ۳ روپے

قیمت العلم قائداعظم نمبر
دس روپے

جلد ۲۴	جولائی تا دسمبر ۱۹۷۶ء	نمبر ۲، ۴

فہرست مضامین

حرفِ چند

صد سالہ جشن قائد اعظم

سنہ ۱۹۷۶ء قائد اعظم کا سال قرار دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس سال ۲۵ دسمبر کو ان کی پیدائش کو سو سال پورے ہو رہے ہیں، ہماری گورنمنٹ بالخصوص وزارتِ تعلیم نے اس صد سالہ جشن کو کامیاب بنانے کے لئے بہت کچھ کیا۔ قائد اعظم کی حیات اور کارناموں پر ملک کے طول و عرض میں لاتعداد مذاکرے اور تقریبات ہوئیں۔ درجنوں کتابیں لکھی گئیں اور بکثرت اخبارات و رسائل نے خصوصی نمبر شائع کئے۔ ٹی وی اور ریڈیو نے بھی ایک سے ایک اچھے پروگرام پیش کئے۔

ہماری ایجوکیشنل کانفرنس نے بھی جس کے قائد اعظم سنہ ۱۹۰۳ء سے لائف ممبر تھے اپنی بساط بھر اس جشن میں نمایاں حصہ لینے کا پروگرام بنایا۔

(۱) کانفرنس کے صدر جناب جسٹس قدیر الدین احمد کی قائد اعظم پر انگریزی زبان میں ایک بلند پایہ کتاب بصرفِ کثیر شائع کی جا رہی ہے،

(۲) دسمبر ۱۹۷۶ء میں ایک شاندار مذاکرہ منعقد ہو رہا ہے۔

(۳) "العلم" کا یہ "قائد اعظم نمبر" پیش کیا جا رہا ہے۔

اس شمارہ کی تیاری میں ہمیں گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ تمام اچھے لکھنے والے کسی نہ کسی ادارہ یا جریدہ سے منسلک ہیں اور وہ اپنے اپنے کام میں منہمک رہے۔ کافی اصحاب نے ہماری فرمائش کے جواب میں لکھا کہ "قائد اعظم کی معجز نما شخصیت کے متعلق کوئی نئی بات لکھنے کے لئے نہیں ہے، آپ کو کیا لکھ کر دیں" ان موانع کے باوصف ہم ان تمام بزرگوں اور احباب کے شکر گذار ہیں جنہوں نے اپنی بلند پایہ تحقیقات سے ہمیں نوازا۔ رسالہ میں شامل چند مضامین پرانے اخبارات سے بھی نقل کئے گئے ہیں۔ کیونکہ ایسے اچھے مضامین حاصل کرنا فی الوقت دشوار امر تھا۔ ویسے بھی ہماری ناچیز رائے میں حضرت قائد اعظم کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے متعلق جس قدر مواد اخبارات و رسائل میں موجود ہے وہ کہیں اور نہیں ہے جب سے قائد اعظم کی پبلک لائف کا آغاز ہوا اور اس کے بعد تاریخ انتقال تک روزمرہ کے واقعات و کوائف اخبارات ہی سے مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ کسی ایک فرد یا افراد کی معلومات اور مشاہدات زیادہ وسیع نہیں ہو سکتے۔ وہ کسی خاص عہد یا دائرہ خیال تک ہی محدود ہوں گے۔ لہٰذا حضرت قائد اعظم کی مبسوط و مکمل سوانح عمری اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتی جب تک کہ بمبئی کرانیکل، ٹائمس آف انڈیا، ہندو مدارس، اسٹیٹسمین، کلکتہ، پانیر الہ آباد، ہندوستان ٹائمس، دہلی سول اینڈ ملٹری گزٹ اور ڈان دہلی و کراچی کے فائلوں کو بالاستیعاب نہ کھنگالا جائے اور ان میں سے حالات و واقعات کو تفصیل سے نہ چھانٹا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری حکومت سنہ ۱۹۷۶ء کے کاموں کے تکملہ کے بعد اس پر خصوصی توجہ دے گی،

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس

جمعہ ۱۲ تا ۱۴ نومبر سنہ ۱۹۷۶ء آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا نوے سالہ اجلاس دھوم دھام اور شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوا، اجلاس اول کی رسمِ افتتاح عزت مآب الحاج محمد دلاور خانجی گورنر سندھ نے فرمائی۔ صدارت جناب جسٹس قدیر الدین احمد صاحب نے کی اور صدر مجلس استقبالیہ کے فرائض

جناب شکیل عادل زادہ صاحب نے انجام دیئے، بقیہ جلسوں کے مہمانان خصوصی ڈاکٹر احسان رشید، وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی، پروفیسر کرار حسین، وائس چانسلر بلوچستان یونیورسٹی اور جناب محمد ایوب کھوڑو، سابق وزیر اعلیٰ سندھ تھے۔ ۱۴ر نومبر کی آخری شب کو ایک شاندار آل پاکستان اردو مشاعرہ ہوا، جس کی صدارت سینیٹر کمال اظفر بار ایٹ لا نے کی۔ اس کے صدر استقبالیہ، جناب کرنل نظام الدین صاحب تھے۔ بلند پایہ خطبات صدارت کے علاوہ نہایت فکر انگیز اور معلومات افزا مقالات و تقاریر مقامی و بیرونی اصحاب علم و تحقیق نے کیں۔ پہلے اجلاس عام میں ایک فاضلانہ اور کارآمد تقریر جناب غلام مصطفےٰ جتوئی وزیر اعلیٰ سندھ کی جانب سے بھی گورنر صاحب کے سیکریٹری اکرام الدین سید صاحب نے پڑھ کر سنائی۔ یہ ایک خصوصی اعزاز تھا جو اس موقع پر کانفرنس کو بخشا گیا۔

افتتاحی اجلاس عام اور مشاعرہ کی تقریبات آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے قائم کردہ سرسید گورنمنٹ گرلس کالج کے وسیع و پرشوکت کمپاؤنڈ میں منعقد ہوئیں۔ اور علمی و تعلیمی مذاکروں کا انتظام کانفرنس لائبریری ہال میں کیا گیا تھا۔ دونوں عمارات میں چار روز تک بڑے پیلنے پر چراغاں کیا گیا۔ اور جلسہ گاہوں کو نفیس ساز و سامان سے مزین کیا گیا تھا۔ ہر ایک جلسہ عام ذی علم حاضرین کی تعداد کے لحاظ سے یکتا رہا۔

کانفرنس کے سہ روزہ اجلاسوں کی مفصل اور باتصویر روداد "العلم" کے اگلے شمارے میں جو خصوصی نمبر ہوگا پیش کیا جائے گی۔ اسی نمبر میں اُن احباب و مخلصین کا بھرپور شکریہ ادا کیا جائے گا، جن کی گراں قدر مالی اور اخلاقی امداد کے بغیر ہم ہرگز کامیاب نہیں ہوتے۔

کراچی۔ یکم دسمبر ۱۹۷۶ء

سید الطاف علی بریلوی

قائداعظم کی جہدِ مسلسل

(از عالیجناب جسٹس قدیرالدین احمد)

اہل پاکستان میں کچھ لوگ پاکستان کے تحفظ اور اس کے مستقبل کے بارے میں متفکر نظر آتے ہیں۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ ان کو اپنے وطن عزیز سے بیحد محبّت ہے۔ وہ پاکستان کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے درمیان بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کن اسباب کی بنیاد پر ہندوستان کے مسلمانوں میں پاکستان قائم کرنے کا جوش و جذبہ پیدا ہوا تھا اور وہ اس مقصد کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو گئے تھے اور اب پاکستان قائم ہو جانے کے بعد کس وجہ سے ان کا جوش و جذبہ اپنے ملک کی سربلندی کے لئے بظاہر گھٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے نیز یہ کہ پہلے جیسا جوش و خروش پیدا کرنے کے لئے انہیں کون سے طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ ان سوالوں کے پیش نظر میں ذیل میں مختصراً اپنے ملک کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں

دو اسباب تھے جن کی بناء پر ہندوستان کے مسلمانوں کے دل میں پاکستان قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور انہوں نے اس خیال کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے پُرجوش انداز میں جدوجہد شروع کی۔ پہلا سبب یہ تھا کہ انہیں بحیثیت مسلمان ایک علیحٰدہ ملّت ہونے کا پورا پورا احساس تھا اور اس حیثیت سے ابھرنے کی وہ دلی آرزو رکھتے تھے اور دوسرا سبب یہ تھا کہ انہیں اس غیر منصفانہ برتاؤ کا شدید احساس تھا جو سوچے سمجھے منصوبے کی شکل میں انکے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے اس فطری اور پیدائشی احساس نے اگرچہ وہ اس ملک میں جا بجا بکھرے ہوئے تھے وہ ایک خاندان (ملّت اسلامی) کے ارکان تھے اور ان کی اس آرزو نے کہ اس گڑھے سے جس میں حالات نے انہیں ڈالدیا تھا کس طرح نکلیں نیز اس تصور نے کہ انہیں ایک نیچے درجہ کا شہری بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ان کے جذبۂ وحدت ملّی کو زیادہ سے زیادہ تقویت بخشی اور ان کے اس ارادہ کو مضبوط سے مضبوط تر کیا وہ ان تمام دباؤ، الجھنوں اور بوجھوں سے جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے گلوخلاصی حاصل کریں۔

مصائب مسلمانوں کو اپنے ماضی پر جو فخر تھا اسیر ذلّت آمیز برتاؤ سے ابنائے وطن کی جانب سے مسلسل ضربیں لگائی جاتی تھیں۔ اور اپنے گرتے ہوئے وقار پر وہ بہت رنج و تاسف محسوس کرتے تھے۔ برطانوی حکام انہیں اپنا ایسا حریف سمجھتے تھے جو ان سے شکست کھا چکا تھا، چنانچہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد جس کا الزام صرف مسلمانوں پر عائد کیا گیا تھا وہ ان کے نام نہاد غرور کو مزید کچلنے اور انہیں دوسرے درجہ کا شہری بنا دینے کی تدبیریں سوچتے تھے۔ ایک تدبیر یہ تھی کہ انہیں سرکاری ملازمتوں سے محروم رکھا جائے۔ ان کے احساسات اور جذبات کا قطعی خیال نہ کرتے ہوئے اکثریت کی حامل جماعت کو ان پر ہر صورت میں ترجیح

دی جائے۔ ہندوؤں کی کیفیت یہ تھی کہ ایک طرف تو وہ مسلمانوں سے پرانے تاریخی واقعات کا حساب چکانا چاہتے تھے اور دوسری طرف موجودہ حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی خوشحالی کے مواقع حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کے حقوق پامال کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ مسلمان بیرونی طور پر دو مخالفوں کی غیر منصفانہ کارروائیوں سے پستے تھے اور اندرونی طور پر خود اپنے فخر اور سہل انگاری کا شکار تھے۔

ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر نے جو ۱۸۶۲ء سے ۱۸۸۷ء تک انڈین سول سروس کے رکن تھے اپنی کتاب "مسلمانانِ ہند" میں مسلمانوں کے ۱۸۸۱ء کے حالات کو حسب ذیل الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔

"ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ جس کی تعداد اسوقت کی، تقریباً تین کروڑ ہے برطانوی حکومت میں اپنے آپ کو انحطاط اور تباہی میں مبتلا پاتا ہے۔ وہ شاکی ہیں کہ ہم جو کل تک اس ملک کے فاتح اور حاکم تھے آج یہاں حصول روزی کے ذرائع سے بھی محروم ہیں۔ اس کا ہر وہ جواب جو خود ان کی تنزل پذیری کی بنیاد پر دیا جائے گا وہ اصولاً کمزور ہوگا کیونکہ انکی تنزل پذیری ہماری ہی سیاسی ناواقفیت اور غفلت کا ایک نتیجہ ہے اس سے پیشتر کہ یہ ملک ہماری حکومت میں آیا مسلمان وہی مذہب رکھتے تھے جو اب رکھتے ہیں۔ وہی کھاتے تھے جو اب کھاتے ہیں اور تمام ضروری امور میں ان کی زندگیاں ویسی ہی تھیں جیسی کہ اب ہیں آج بھی وہ وقتاً فوقتاً اپنے پرانے قومی احساسات، بہادرانہ مہم جوئی اور سپاہیانہ قابلیتوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں لیکن آج وہ برطانوی حکومت میں ہر دیگر لحاظ سے ایک تباہ شدہ قوم ہیں"۔

۱۸۸۱ء کا یہ بیان حکومت برطانیہ کے پورے دور پر صادق آتا ہے۔ مسلمانوں کو تمام ایسی راہوں سے محروم رکھا جاتا تھا جن پر چلکر وہ زندگی کی کوئی نفع بخش روشنی اختیار کر سکیں اور ان کی تعلیم کی طرف سے نہ صرف غفلت برتی جاتی تھی بلکہ اس کو ناقص بنا دیا جاتا تھا۔ انہیں سرکاری امداد سے علیحدہ رکھنے کی تدبیریں کی جاتی تھیں اور نجی طور پر قرضہ دینے والے ساہوکاروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جب یہ مصائب زیادہ عرصہ تک جاری رہے تو جیسا کہ مسٹر ہنٹر نے اپنے اقتباسات میں بتایا ہے مسلمانوں میں اپنی علیحدہ قومیت کا جذبہ تیز و تند ہو گیا۔ معاشی مجبوریاں موجود تھیں اور یہ مجبوریاں دیگر اقلیتوں خصوصاً اچھوتوں کے لئے بھی اذیت رساں تھیں۔ لیکن مذہب کے اختلاف نے انہیں آپس میں ملنے نہ دیا۔

اچھوت لوگ ایک طویل عرصہ سے سخت ذلتیں برداشت کرنے کے عادی ہو گئے تھے اور ذلت آمیز زندگی کو اپنا مقدر سمجھکر اس پر قانع تھے۔ لیکن مسلمانوں پر ذلت یا توہین آمیز برتاؤ کا اثر مختلف ہوتا تھا۔ ان میں احساس کی شدت اور قومی اتحاد کا جذبہ ان کے مذہب اسلام نے پیدا کیا تھا جس کے وہ سختی سے پیرو تھے۔

پروفیسر محمد مجیب دہلوی ایک بھارتی مسلمان ہیں انہوں نے ۱۹۶۷ء میں ایک کتاب جس کا نام "انڈین مسلمس" ہے لکھی۔ یہ کتاب غالباً مسٹر ہنٹر کے خیالات کے جواب میں لکھی گئی تھی اور اس میں پنڈت نہرو کے اس دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ انڈیا میں کسی ایسی چیز کا وجود نہیں ہے جسے ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافت کہا جائے۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے مسلم عوام سے براہ راست ملاقاتیں کرنے کی مہم چلائی تھی۔ اور مسلمانوں کو لالچ دلایا گیا تھا کہ اگر وہ اس تحریک میں شامل ہو گئے تو ان کی معاشی حالت بہت بہتر ہو جائے گی۔ پروفیسر مجیب کا عقیدہ یہ تھا کہ صرف مسلم رہنما مسلم عوام کو بہکا رہے تھے ورنہ وہ مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیتے۔ لیکن یہ خیال باطل تھا چنانچہ ان کی تحریک بالکل ناکامیاب

ہو گئی کیونکہ وہ ایک اہم جوابی اقدام کے سوا کچھ نہ تھی۔

اتحاد پروفیسر مجیب نے اپنی کتاب میں بڑی تفصیل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے مختلف مقامات اور مختلف فرقوں کے مسلمانوں میں باعتبار عقائد، سماجی طور و طریق اور سیاسی اور اقتصادی مفادات کوئی چیز مشترک نہیں ہے لیکن اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکے کہ اسلام سے جو انہیں وابستگی اور عقیدت ہے وہ عام ہے اور انہیں متحد رکھنے کا ایک قوی ذریعہ ہے۔ وہ کہتے ہیں "انکا (مسلمانوں کا) نصب العین یہ تھا کہ وہ ایک مکمل طور پر متحد اور غیر طبقاتی ملت بن جائیں۔ ان کا ایمان و یقین اسلام پر ہو اور وہ اپنے ایمان اور یقین کا دعویٰ اپنی روزمرہ کی زندگی میں کرتے رہیں۔"

مسلمانوں کے باہمی اختلافات کے متعلق وہ کہتے ہیں:۔

"اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمان بحیثیت ایک ملت اپنا کوئی متشکل وجود ہی نہیں رکھتے۔ اس کے برعکس ملت کے اندرونی اختلافات جو دنیا کے مسلمانوں کے طرز زندگی کے وسیع اختلافات کے موجب یا آئینہ دار ہیں صرف اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں اتحاد کا تصور بہت بلند اور قوی ہے۔"

جب مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ ہر وہ چیز جو ان کے مفاد میں ہوتی ہے یا وہ مطالبہ جو مسلمان اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ہندو رہنماؤں کی طرف سے مسترد کر دیا جاتا ہے اور ہر صورت میں انکا واحد جواب یہ ہوتا ہے کہ "یہ بات قومی مفاد کے خلاف ہے" تو تصور اتحاد ملت کی اہمیت ان کی نظر میں قدرتاً زیادہ ہو گئی۔ قومی مفاد کو وہ رنگ دیا گیا کہ وہ کمزور اقلیت کے مفادات کی نفی کے مترادف ہو گیا۔ مسلمانوں کے مفادات سے متشددانہ مخالفت کرنے کا پہلا مظاہرہ اس وقت منظر عام پر آیا جب ۱۹۰۵ء میں برطانوی حکومت نے بنگال کو تقسیم کیا۔ اس تقسیم کو ہندو نیتاؤں نے ہندوؤں کی توہین قرار دیا اور کہا کہ یہ تقسیم بنگال میں ہندو اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے۔ تمام ہندوستان بھر میں غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی اور ہندو نیتا حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انگلینڈ کے سامان کا بائیکاٹ (مقاطعہ) کیا گیا۔ ایک غیر قانونی انتشار (انارکی) کی تحریک چلائی گئی۔ قتل و غارتگری کے ہنگامے برپا کیے گئے۔ ہندوستان کے نائب سلطنت (وائسرائے) پر ایک بم بھی پھینکا گیا۔ غرض ہندوؤں کے اس شدید احتجاج کے نتیجہ میں ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کالعدم قرار دیدی گئی۔ اس کے بعد حکومت نے مشرقی بنگالیوں کی اشک شوئی کے طور پر ڈھاکہ میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ لیکن ہندو نیتاؤں نے اس کی بھی یہ کہکر مخالفت کی کہ اس سے بنگال کی ذہنی تقسیم ہو جائے گی۔ مسلمانوں نے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق طلب کیا تو اس کی بھی مخالفت کی گئی۔ انہوں نے سیاسی اور تعلیمی اداروں میں اپنی نشستیں مخصوص کرانے کا مطالبہ کیا تو اس کی بھی سخت مخالفت کی گئی۔ انہوں نے شمال مغربی سرحدی اور سندھ کے صوبے قائم کرنے کی درخواست کی تو اس کی بھی حسب معمول شدید مخالفت کی گئی۔

ایک چیلنج اکثریت کی طرف سے مسلمانوں کے لئے یہ ایک مستقل چیلنج تھا کہ میدان میں آیئے اور مقابلہ کیجئے۔ ہندو جانتے تھے کہ مسلمانوں میں خواندگی کی شرح افسوسناک حد تک پست تھی۔ ان میں نہ کوئی مستند اور تربیت یافتہ بینکر تھے۔ نہ منیجر نہ کاروباری منتظم، نہ مشیر نہ صنعتی انجینئر، ایسے لوگ ہندوستانی مسلمانوں میں اس لئے نہ مل سکتے تھے کہ تمام بڑی تجارت، صنعت اور معزز پیشوں پر اکثریت کی یعنی ہندوؤں کی اجارہ داری مسلط تھی۔ ایسے مسلمانوں کی تعداد بھی جو پیشوں کے اعتبار سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں بہت ہی کم تھی۔ صنعت کے ضمن میں اس حقیقت کو یاد کر کے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں کہ مشرقی بنگال میں ۱۹۴۷ء تک ایک بھی کارخانہ جوٹ (پٹسن) کا نہ تھا

کیونکہ تمام جوٹ کلکتہ بھیج دیا جاتا تھا تاکہ وہاں کے کارخانوں میں کام آئے یا وہاں سے باہر برآمد کردیا جائے۔ اسی طرح سندھ میں ۱۹۴۷ء تک ایک بھی کاتنے یا کپڑا بننے کا مل موجود نہ تھا کیونکہ تمام روئی بمبئی کے کارخانوں کے لئے یا وہاں سے برآمد کیے جانے کے لئے بمبئی بھیج دی جاتی تھی۔

اس ستمگری کے ساتھ سماجی علیحدگی یعنی سماج سے علیحدہ رکھنے کا حربہ بھی استعمال ہوتا تھا اور پریشان کن سیاسی آمرانہ انداز بھی۔ اس آمرانہ انداز کا فیصلہ کن مظاہرہ ۱۹۲۸ء کی نہرو رپورٹ میں ہوا۔ ان چیزوں نے ملک مسٹر ایم۔ اے جناح جیسے پختہ ترین نیشنلسٹ (قوم پرست) کو جن کی تعریف بحیثیت پیامبر اتحاد مسز نائیڈو نے ایک نظم میں کی تھی اور مولانا محمد علی کو جو ایک وقت میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر رہ چکے تھے اور محمد اقبال جیسے فلاسفر کو جنہوں نے ہندوستان کو بحیثیت اپنے وطن کے اپنی وجد آور نظموں میں سراہا تھا اپنے خیالات و نظریات تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور بالآخر انہوں نے مسلم عوام کے اس نظریہ کو قبول کر لیا کہ وہ علیحدہ قوم ہیں۔

۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۰ء تک اوسط درجہ کے مسلم رہنما ہندوستان کے مسلمانوں کو ملت ہی کہتے تھے اور صرف رعایتیں اور سہولتیں طلب کرتے تھے لیکن اب نظریات بدل جانے کے بعد مسلم لیگ میں آنے والے رہنماؤں نے مسلمانوں کو ایک قوم کہا۔ مسلم عوام نے اس تبدیلی کا اتنے جوش و خروش سے خیر مقدم کیا کہ وہ رہنما خود حیرت زدہ ہو گئے لیکن اب وہ بھی دل سے یہی چاہتے تھے۔ یہ اسباب تھے جن کے باعث پاکستان وجود میں آیا۔

قیام پاکستان کے بعد قوم کو ایسی رہنمائی کی ضرورت تھی جو اسکے مزاج اور تمناؤں سے ہم آہنگ ہو۔ نئے مقاصد کی نشاندہی منجانب رہنمایان قوم ضروری تھی اور بتدریج ترقی کرنے کے جذبہ کو زندہ رکھنا لازمی تھا۔ لیکن قومی رہنماؤں نے اپنے اور اپنی جماعتوں اور گروہوں کے مفادات کی جانب توجہ کرنا شروع کردی۔ بجائے اس کے کہ مستقبل کا خیال اور قومی ترقی کی فکر کرتے غالباً پوری قوم نے یہ افسوسناک غلطی کی کہ قیام پاکستان سے حاصل ہونے والے فائدوں کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔ لوگ یہ فکر کرنے لگے کہ ان فائدوں میں ہمارا حصہ کم نہ رہ جائے۔ چنانچہ یہ نظر آنے لگا کہ گویا پاکستان قائم ہونے کا تنہا مقصد ان فائدوں کا حاصل کرنا تھا۔ یہ وہ پہلی دیوار تھی جس سے قومی جوش و جذبہ کی لہریں ٹکرائیں اور پاش پاش ہونے لگیں۔

رُکاوٹیں دوسری دشواری جس کا سامنا ہوا یہ ہے کہ سول انتظامیہ کے نظریہ میں کوئی ضروری اصلاح نہ ہوئی۔ ہمارے سول ملازمین کو برطانوی حکومت نے نوآبادیاتی حکومت کی ضروریات کے مطابق تربیت دی تھی۔ ان کے یہاں سب سے زیادہ اہمیت انتظامیہ کا وقار قائم رکھنے کو دی جاتی تھی لہٰذا ملازمین کو ہدایت کی جاتی تھی کہ ان کے برتاؤ میں کمزوری کی ذرہ برابر جھلک یا لچک نظر نہ آنی چاہیے۔ ہمارے یہاں ایسی ہی تربیت پائے ہوئے نہایت قابل افسر موجود تھے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ خود کو عوام سے دور رکھا جائے۔ فیصلے آزادانہ صرف اپنی صوابدید کے مطابق کیے جائیں اور ان فیصلوں پر سختی سے بغیر لچک عملدرآمد کیا جائے۔ شیخ محمد شفیع نے اپنے ایک خطاب میں برطانوی انتظامیہ کی نوعیت پر تبصرہ کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اگر لوگ ان کے فیصلوں کے بارے میں کچھ لیس و پیش کرتے تو ان پر عدم تعاون کا الزام عائد کیا جاتا تھا۔ اگر وہ احتجاج کرتے تو انکے ساتھ وہ برتاؤ کیا جاتا تھا جو سرکشی کرنے والے لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اگر وہ جلوس نکالتے اور کھڑکیاں وغیرہ توڑتے تو بحیثیت بلوائیوں کے انہیں طاقت استعمال کرکے دبا دیا جاتا تھا۔

ہمارے منتظمین نے رفتہ رفتہ ملک کی پالیسیوں پر بھی

کنٹرول حاصل کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی منتظمین کی طرح ان کو بھی عوام کے دل اور ضمیر سے کبھی رابطہ یا قربت حاصل نہ ہو سکی۔

تیسری بات جس نے عوام کے جوش و جذبہ کو سرد کیا یہ تھی کہ عوام تو اسلام کی شان و شوکت کے لئے زندہ رہنا اور مرنا چاہتے تھے۔ لیکن انتظامیہ نیز سربراہان مملکت نے ان کے اس طبعی رجحان کی روک تھام کی جس سے ان کی ہمت شکنی ہوئی۔ دراصل مذہبی جوشش منتظمین کے لئے ایک ڈراؤنی شئے تھی۔ کیونکہ اس میدان میں وہ عوام کے رہنما بننے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ وہ ان پر سختی کر سکتے تھے لیکن ان کے جوش و جذبہ کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے کے اہل نہ تھے۔ سرکاری افسروں کے خیالات، ان کی زبان اور تمام اہم مسائل کے متعلق ان کے سوچنے کے پیرائے پاکستانیوں کی بڑھتی ہوئی توقعات کے مطابق نہ تھے۔

چوتھی رکاوٹ ہمارے قائدین کی یہ نااہلی تھی کہ وہ عوام کا پورا پورا اعتماد حاصل کرنے اور برقرار رکھنے میں ناکامیاب رہے۔ مسلم عوام نے آنکھیں بند کر کے قائداعظم کی پیروی کی تھی۔ انہوں نے صدر محمد ایوب پر بھی چھ سال تک اعتماد کیا۔ لیکن اس سے قطع نظر انہوں نے بار بار یہ محسوس کیا کہ اعتماد کرنے میں انہوں نے دھوکہ کھایا اور یہ کہ ان سے بیوفائی کی گئی۔

اب وہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی پیروی ایسے جوش و جذبہ اور عقیدت کے ساتھ کر رہے ہیں کہ اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ اور اسلامی سوشلزم (مساوات محمدیؐ) کی جانب بڑھنے کے ان کے اقدامات کو گہری دلچسپی اور آرزوؤں کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ اس سمت میں تبدیلیاں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں لیکن منزل پر پہنچنے کے لئے سفر نہایت محنت طلب اور طویل نظر آتا ہے۔ ہمارے سامنے امیدیں ہیں توقعات ہیں۔ لیکن دور لیے اور چوراہے بھی ہیں۔

پانچویں رکاوٹ ہماری بے صبری ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی وحدت پر بجا طور پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن ہم میں سے ہی بعض لوگوں نے اس کا مفہوم غلط لیا۔ اس کے معنی انہوں نے یہ لئے کہ ہمارے تمدن و تہذیب میں گویا کوئی تنوع ہے ہی نہیں۔ جو لوگ ہم میں سے بے صبری کا شکار ہیں وہ ہم پر منافقت کا الزام لگاتے ہیں اور اپنی مایوسیوں میں اضافہ کر لیتے ہیں۔ ہمارے ہمسایہ ممالک اس افتراق پسندانہ انداز فکر کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور اس کی اہمیت اس صورتحال کے باعث زیادہ ہو جاتی ہے کہ دنیا کی عظیم طاقتوں کی نیتیں اور ارادے غیر یقینی ہیں۔

فی الحال ہماری قوم اُس فوجی شکست کا خمیازہ بھگت رہی ہے جس سے وہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں دوچار ہوئی۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کوئی بھی ہمارے معیار کا ملک جس کے حالات ہمارے جیسے ہوں۔ ہم سے بھی زیادہ سنگین مصائب اور پژمردگی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ہم جو ایک دوسرے پر الزام عائد کرتے ہیں وہ محض بدانتظامی، بے پروائی، کم نگہی اور ان سے پیدا شدہ برے نتائج کے متعلق ہیں۔ اور ایک شکست فاش کے بعد جو ایک غیر مرئی بین الاقوامی سازش کا نتیجہ ہو ایسی صورت حال کا پیدا ہونا عین معمول کے مطابق ہے۔ بہر حال فی الوقت ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم مایوسی میں مبتلا رہیں۔ اور پرامید نہ ہوں کیونکہ ہر چیز ہماری اپنی کوششوں پر منحصر ہے۔ ہمارا وطن پاکستان ہر اعتبار سے صحیح و سالم ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے ہم زندہ رہنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ ہماری یہ حیثیت بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ہے۔ ہماری اناج پیدا کرنے کی استعداد سب پر عیاں ہے اور یہ ہمارا ایک عظیم سرمایہ ہے۔ ہمارے یہاں اشیا کی قیمتیں زیادہ ہیں۔ لیکن ہمارے معیار کے بہت سے دیگر ممالک سے کم ہیں۔

چار قومیتیں | کبھی کبھی چار قومیتوں کا نعرہ لگایا جاتا ہے جو ہم چاروں صوبوں کے بعض اشخاص کی زبان سے سنتے ہیں۔ بنگلہ دیش علیحدگی کی ایک مثال بن گیا ہے۔ لیکن وہ ایک دوسرا سبق بھی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ علیحدگی کے نتیجہ میں وہ کتنی بری طرح دوسرے ممالک کا دست نگر ہے اور وہاں کے لوگ کسقدر مایوسی اور پریشان حالی کا شکار ہیں

ہمسایہ ممالک کی طرف سے جنگ کی دھمکیاں ملتی رہتی ہیں لیکن یہ پریشانیاں تو آزادی اور خودمختاری کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ آزادی ہمیشہ ایک حقیقت ہوتی ہے جس کی حفاظت ضروری ہے یہ ایک خواب نہیں ہوتی۔ یہ ایک انگریزی نظم کا مفہوم ہے۔ نظم کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

"او آزادی! تو وہ نہیں ہے جس کی خوابیں شاعر دیکھتے ہیں اور اپنی نظموں میں اس کے گیت گاتے ہیں۔ تیرا حسن اگرچہ شان و شوکت کا حامل ہے لیکن تیرے چہرے پر پرانی جنگوں کے نشاناتِ زخم موجود ہیں۔ تیرے بلے چوڑے اعضا سخت جدوجہد کے نتیجہ میں مضبوط ہو گئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سوائے غلامی کی زندگی کے خواب آور تحفظ کہیں نہیں ہے۔ او! آزادی کی دیوی! یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم تیری بارگاہ کی حفاظت کے لئے مدتوں اپنا خون بہاتے رہیں بہ نسبت اسکے کہ غلامی کی زنجیروں کی حفاظت میں ایک لمحہ کے لئے بھی ہم سوئیں۔ (آرام کریں)"

ہمیں جس چیز کی واقعی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ایسا مقصد ہے جو ہماری دلی خواہش کے مطابق ہو۔ ہم جن چیزوں سے محبت کرتے ہیں وہ زیادہ تر ہماری تاریخ کی معین کردہ ہیں جو گذشتہ چودہ سو سال پر پھیلی ہوئی ہے نیز گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے اس تجربہ سے بھی ہم متاثر ہیں جو ہندوستان میں ہم نے حاصل کیا ہے۔ اس آخرالذکر طویل زمانے میں کوئی ایسی اہم سیاسی تحریک ہندوستان میں رونما نہیں ہوئی جس نے اسلامی جوش اور جذبہ کے امتیازی نشانات سے قوت حاصل نہ کی ہو۔ سید احمد شہید کی ۱۸۳۱ء کی تحریک، ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی، تحریک خلافت اور ۱۹۴۰ء کی تحریک پاکستان ان سب پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گذشتہ سو سال کے دوران مسلمانوں نے کسی ایسے سیاسی رہنما کو تسلیم نہیں کیا جو مسلمانوں کے مسلّمہ مقصد سے عقیدت نہ رکھتا ہو اور جس نے اسلام کے نام پر اُن سے تعاون طلب کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا واسطہ اختیار کیا ہو۔ ان قائدین پر نظر ڈالئے، سرسید احمد خان، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولانا محمد علی۔ ہز ہائی نس آغا خان، ڈاکٹر محمد اقبال، اور قائداعظم۔ ان سب نے اسلام کے نام پر مسلمانوں سے اپیل کی۔

اسلام کی شان و شوکت میں ترقی کے لئے ہمارے عوام کا جذبہ اتنا گہرا اور قوی ہے کہ اگر انہیں ایک مرتبہ یہ یقین ہو جائے کہ کسی خاص عمل سے اسلام کی شان و شوکت میں اضافہ ہوگا، تو بڑی سے بڑی تقدس مآب شخصیتیں بھی انہیں اس طریق کار سے برگشتہ نہیں کر سکتیں۔ یہ چیز اوّل سرسید احمد خان کی تحریک کے سلسلے میں پیش آئی اور یہی صورتحال ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک دوبارہ سامنے آئی۔ قائداعظم کی مخالفت جمعیت علماء ہند اور علمائے دیوبند دونوں نے کی۔ لیکن انگریزی وضع قطع کے اور ریش و بروت سے معرا محمد علی جناح ان کے تصور میں ان کے اسلامی عقائد کی رو سے منتخب شدہ ایک یادگار شخصیت کی حیثیت سے بسے ہوئے تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ قائداعظم کا مقصد اسلام کی شان و شوکت ہے لہذا بحرانی حالات میں بھی وہ ہر شخص کو چھوڑ سکتے تھے۔ لیکن اسلام کی عظمت کے تصور کو ہرگز نہیں۔

سب سے زیادہ افسوسناک چیز جو پاکستان کے قیام کے بعد رونما ہوئی۔ یہ واقعہ ہے کہ یہاں ایسی کوششیں شروع کر دی گئیں جن کا مقصد مسلمانوں کی اس گہری محبت اور وابستگی کو جو انہیں اسلام سے ہے

کم کرنا ہے اور ان کے سامنے لادینی حکومت کو اسلامی حکومت کے بدل کے طور پر پیش کرنا ہے۔ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہماری اسّی فیصد آبادی کو کسی ایسے بدل کے قبول کرنے کے لئے آمادہ کرنا محال ہے۔ پریزیڈنٹ ایوّب خان نے خالص لادینی آئین جاری کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی وہ اس سلسلہ کے تمام اقدامات منسوخ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

جسٹس محمد منیر نے اپنی ۱۹۵۳ء کی تحقیقاتی رپورٹ میں اسلامی مملکت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گویا اسلامی مملکت کا تصور کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی حالیہ کتاب "اسلام تاریخ میں" میں بھی اس چیز پر اظہار افسوس کیا ہے کہ موجودہ آئین پھر اسلامی کہا جاتا ہے۔ لیکن انہیں اپنی اس رپورٹ میں مندرجہ ذیل حقیقت ماننی پڑی۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"اگر کوئی چیز حتمی نتیجہ کے طور پر اس تحقیقات میں سامنے آئی ہے تو وہ یہ ہے کہ اگر آپ عوام کو یہ یقین کر لینے پر آمادہ کر لیں کہ کوئی کام جو آپ ان سے لینا چاہتے ہیں مذہباً صحیح ہے یا مذہب نے اس کے کرنے کی ہدایت کی ہے تو آپ انہیں اس کام کے راستہ پر بغیر یہ سوچے لگا سکتے ہیں کہ آیا ان میں تنظیم، وفاداری، سلیقہ مندی، حسن اخلاق یا شہری سمجھ بوجھ جیسی ضروری صفات موجود ہیں یا نہیں۔"

یہ قطعی لادینی نقطۂ نظر ہے اور اس میں اس امر پر غور کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ اس تصویر میں جو جسٹس منیر نے کھینچی ہے۔ قصور ان مسلم عوام کا ہوگا جن کو کسی کام کے لئے آمادہ کیا جائے گا یا ان حضرات کا جو انہیں اسلام کے نام پر (کسی غیر ضروری یا مضر) کام کے لئے آمادہ کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عوام کی آمادگی کو تعمیری مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے اور ان کے سامنے عمل کا ایک نمونہ بھی رکھا جائے تو عوام کی کارکردگی کی کیفیت اس سپاہی کی کارکردگی کے مانند ہوگی جو بلا حرکت کئے زخم پر زخم کھاتا ہے اور جان دے دیتا ہے لیکن اپنی متعین جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہٹتا۔

ہمارے عوام میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے پیروی کرنے اور قربانیاں دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ ایک مرتبہ ان کو یہ یقین دلایا جائے کہ حقیقتاً اور ایمانداری کے ساتھ اسلام، رسول اکرمؐ اور دین و ایمان کی خاطر ان کی ضرورت ہے۔ ان اعلیٰ مقاصد کے نام پر اگر ان سے کوشش اور جانفشانی کی اپیل کی جائے گی تو وجدانی کیفیت کے ساتھ وہ اس مطالبے کی تعمیل کریں گے۔ سخت سے سخت محنت سے وہ دریغ نہ کریں گے اور بڑی سے بڑی رکاوٹ ان کی مزاحمت نہ کر سکے گی۔

میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی فضا مکمل طور پر تبدیل کی جا سکتی ہے اگر ہمارے عوام اور ان کے ساتھ لاکھوں تعلیم یافتہ مرد اور عورتیں مکمل طور پر یہ یقین کر لیں کہ ہمارے قائدین قومی مقاصد کی تکمیل کے لئے سچی لگن، ذاتی عقیدت اور ولولہ رکھتے ہیں اور طرز حکومت سادہ، کفایت شعارانہ اور ہر طرح کی بیجا دکھاوٹوں اور نمائشوں سے پاک ہے اور یہ کہ ارباب حل و عقد کی نجی زندگیاں عوام کی نظر میں اسلام کی روح (اسلام کے حقیقی معنی) کے مطابق ہیں۔

میرے دل و دماغ میں یہ احساس بہت قوی ہے کہ ہماری موجودہ تکلیفیں وہ تکلیفیں ہو سکتی ہیں جو ایک نئی اور طاقتور قوم کو اپنی پیدائش سے قبل برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ پیدائش کا عمل تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن ان تکالیف کا مداوا ایک نئی زندگی کی امید سے ہو جاتا ہے۔ انشاء اللہ ہم جلد بلند تر اور عظیم تر مقاصد کی راہ پر گامزن ہوں گے۔

مترجمہ

(اخلاص حسین زبیری ایم۔اے)

مطالبۂ پاکستان کی وضاحت

(سرایولن رینچ کا قائداعظم سے انٹرویو)

(از جناب مطلوب الحسن سیّد)

نئی دہلی میں موسم سرما کا ایک دن تھا اور سال ۱۹۴۱ء تھا قائداعظم اپنے مکان واقع ونسٹن اورنگ زیب روڈ کے مطالعہ کے کمرے کے وسط میں بچھے ہوئے ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے وہ حسب معمول نہایت صاف ستھرا بے عیب لباس زیب تن کئے ہوئے تھے، اُن کا سوٹ اونی اور سرمئی رنگ کا تھا۔ اُن کی سفید قمیص کے کالر اور کفوں کو کلف لگا کر سخت کر دیا گیا تھا۔ اور استری اور صیقل کے ذریعہ انہیں چینی کے برتنوں کی طرح چمکا دیا گیا تھا۔ ایک ٹائی زیب گلو تھی جو سفید اور بھورے رنگ اور قدرے سبز رنگ کی آمیزش کا نمونہ تھی۔ اُن کے پاؤں میں آرام کرنے کے مواقع پر یا ڈرائنگ روم میں پہننے کے جوتے تھے۔ جن کی تیاری میں سفید لواڈ (بکری کے بچے کی کھال جو کمائی نہ گئی ہو) اور بھورے پٹنٹ لیدر کو استعمال کیا گیا تھا اُن کی داہنی ٹانگ بائیں ٹانگ کے گھٹنے پر رکھی تھی اور وہ کسی روزنامہ پر اپنے وقت کے چند منٹ گزارنے کے لئے نظر ڈال رہے تھے۔ وہ کسی مقررہ ملاقات کا انتظار کر رہے تھے۔ آج تاریخ یکم دسمبر ۱۹۴۱ء تھی۔

سرایولن رینچ نے جن کا تعلق لندن کے ایک ہفتہ وار اخبار اسپیکٹیٹر (Speclator) سے تھا ایک دن پہلے ٹیلیفون کیا تھا۔ یہ دونوں صاحب کافی عرصے سے ایک دوسرے سے واقف تھے اور سرایولن نے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ جنگ میں حصہ لینے کے متعلق مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو سمجھنا اور ہندوؤں کی اس جدوجہد کا اندازہ لگانا چاہتے تھے، جو وہ آئینی اصلاحات کے لئے خصوصاً آل انڈیا مسلم لیگ کی ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور کے منظور ہو جانے سے متاثر ہو کر کر رہے تھے۔ اس قرارداد میں جو تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس سے ہندو نیتاؤں میں مسلمانوں کے خلاف مزاحمت اور مقابلہ کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ اور برطانوی سیاسی حلقوں کے خیالات میں بے یقینی پیدا ہو گئی تھی۔

لہٰذا سرایولن کا مشن اس وقت یہ تھا کہ ہندوستان کی موجودہ صورت حال کا وہ صحیح اندازہ لگائیں اور اس سے اپنے وطن کے اخبار پڑھنے والوں کو مطلع کریں۔ اُنکے نزدیک یہ ایسا کام تھا جس کے لئے نہایت ہوشمندانہ تحقیق اور تشخیص کی ضرورت تھی۔ قائداعظم نے اس سلسلہ میں ایک قابل عمل اور آئینی فیصلہ کر کے پہلے ہی ایک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ وائسرائے ہند نے اس کی پیروی میں اُسی دن ایسا ہی اعلان کر دیا۔ ہندوؤں نے

وائسرائے کی اس کارروائی پر یہ اعتراض کیا کہ انہوں نے ہندوستان سے مشورہ کئے بغیر ایسا اعلان کیوں کر دیا لیکن قائداعظم نے یہ رائے ظاہر کی کہ وائسرائے ایک برطانوی نوآبادی کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس کارروائی کے سوا جو انہوں نے کی، کوئی دوسری کارروائی قانوناً نہیں کر سکتے تھے اور یہ کہ ہندوستانیوں کے لئے ایک نوآبادی کے شہری ہونے کی حیثیت سے سوائے اس کے کہ وہ جنگ جیتنے کی کوشش میں برطانیہ کی مدد کریں، کوئی دیگر چارۂ کار نہ تھا۔ کیونکہ ہندوستان جنگ کے منطقہ میں تھا اور اس لئے شکست کے خطرے میں بھی۔ سر ایوین اس صورت کی تحقیق و تصدیق کرنا چاہتے تھے۔

سامنے کے دروازے کی گھنٹی ٹھیک مقررہ وقت پر بجی۔ سکنڈوں کی شمار سے صحیح وقت پر۔ میں نے دروازہ کھولا اور ایک بلند قامت، چھریرے بدن کے شخص کو اپنے سامنے دیکھا جو ٹائی، شوز اور شرٹ کی تفصیلات کے اعتبار سے بھی ایسے ہی صاف ستھرے بے عیب لباس میں ملبوس تھے، جیسے کہ قائداعظم تھے میں اُن میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکا۔

انٹرویو فوراً بلا وقت ضائع کئے بغیر شروع کر دیا گیا۔ اس کے دوران قائداعظم نے سر ایوین کو قیام پاکستان کی ضرورت کے صحیح صحیح اسباب بتلائے، انہوں نے کہا کہ ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کی وجہ سے مسلمان کبھی غیر منقسم ہندوستان میں عزت و وقار کی زندگی بسر کرنے کی اُمید نہ کر سکتے تھے۔

دوسرے روز مسٹر ایوین رینچ نے اس انٹرویو کا خاکہ تحریر کیا اور ٹائپ شدہ ایک کاپی قائداعظم کے پاس منظوری کے لئے بھیجی جیسا کہ اعلیٰ درجہ کی صحافت کے اصول اخلاق کا تقاضہ تھا۔ سر ایوین نے تحریر کیا تھا کہ اس انٹرویو کی ایک کاپی اخبار اسپکٹیٹر کو برائے اشاعت بھیجی جائے گی۔

انٹرویو کے خاکے میں یہ لکھا تھا "میں نے کل ڈیڑھ گھنٹے مسٹر جناح سے بے تکلف اور صاف صاف بات چیت کی۔ انہوں نے نہایت پُرجوش انداز اور قطعیت کے ساتھ کہا کہ ہندوستان کی مسلم آبادی جس کی اکثریت کی وہ نمائندگی کرتے ہیں کسی ایسی اسکیم میں شرکت کیلئے راضی نہیں ہوگی۔ جس میں پورے ہندوستان پر ہندوؤں کے مستقل اقتدار کا انتظام کیا گیا ہو۔ اُن کا یقین ہے کہ ہندوستان کا تصفیہ صرف اس بنیاد پر ہو سکتا ہے کہ ملک کو پانچ بڑے منطقوں (zones) میں تقسیم کیا جائے۔ اُن میں سے ہر ایک منطقہ غیر ملکی پالیسی اور دفاع کو چھوڑ کر تمام دیگر امور میں خود مختار ہو۔ مثال کے طور پر ان کا درجہ کینیڈا کے اس وقت کے شمالی اور جنوبی صوبوں کی طرح ہو جب ۱۸۶۵ء کا برٹش نارتھ امریکن ایکٹ منظور نہ ہوا تھا، یا اس طرح کا جیسا اونٹیریو اور کیوبک کا اب ہے۔ انہوں نے کئی مرتبہ کینیڈا کی مثال دی اور کہا کہ وہاں سیاسی طاقت جس طرح رفتہ رفتہ بڑھی تھی ویسا ہی ہندوستان میں ہو سکتا ہے۔ دو زون (منطقے) یہ ہوں گے: پہلا شمالی مغربی زون بشمول سندھ، بلوچستان، پنجاب انبالہ تک، جس کی مسلم آبادی ۱۹۳۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۰، فیصد ہے۔ دوسرا زون شمالی مشرقی ہندوستان کا ہوگا جس میں بنگال اور آسام شامل ہوں گے، جن کی مسلم آبادی ۵ ۵ فیصد اور ۶ فیصد علی الترتیب ہے باقی ہندوستان تین بڑے منطقوں میں تقسیم ہوگا۔ جن میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی اور اُن کی مجموعی آبادی تقریباً تیئس ۲۳ کروڑ ہوگی۔ مسٹر جناح کی تجویز کے مطابق ہندوستان کی ریاستیں جیسی ہیں ویسی ہی رہیں گی اُن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوؤں کو اس وسیع ملک اور کثیر

کو جو ریاست ہائے متحدہ کی آبادی سے تقریباً دو گنی ہو گئی حاصل کرنے
کی صورت میں مطمئن ہونا چاہیئے۔ یہ ایک گفتگو کا ریکارڈ ہے اس
لئے اس میں لازماً ایک بات بار بار کہے جانے کا امکان ہے۔ مسٹر
جناح نے کہا کہ ایسے کسی نظام کا ایجاد کرنا ممکن نہیں ہے۔ جس میں
ہندوؤں کی مستقل اکثریت بھی تسلیم کی جائے اور اس میں ہندوستانی
مسلمان بھی شامل ہوں۔ سپرو جیسے لوگوں کا یہ کہنا مضحکہ انگیز ہے کہ
کل ہندوستان کی بنیاد پر بھی مسلمانوں میں حب الوطنی جیسا جذبہ پیدا
ہو سکتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے ہر اہم معاملہ میں صبح سے شام تک ہندو
اور مسلمان میں تضاد رہتا ہے۔ انہوں نے مسٹر گاندھی کا ایک قول دہرایا جو
یہ تھا، "بہت سے ہندو مسلمان کے ہاتھ سے ایک پیالہ پانی پینے کے مقابلہ
میں موت کو ترجیح دیں گے"۔ مسٹر جناح یقین رکھتے ہیں کہ تقسیم کے
بارے میں اُن کی رائے قطعی صائب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ درحقیقت
یہی تنہا طریقہ ہے جس کے اختیار کرنے سے کوئی قابل عمل سیاسی
نظام قائم ہو سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ تقسیم
کی تمام تفصیلات معاملہ طے ہونے سے پہلے ہی طے کرلی جائیں، انہوں
نے آئرلینڈ کی مثال دی اور برما اور سندھ کی بھی جن کے بارے
میں گول میز کانفرنس نے فیصلہ دیا تھا۔ دو مسلم منطقوں میں عام
اندازے کے مطابق آبادی ہندوستان کی کل آبادی کی ایک چوتھائی
ہوگی جس میں ساڑھے چھ کروڑ اور ساڑھے تین کروڑ غیر مسلم ہونگے
پانچ منطقے (zones) جو اُن کے ذہن میں ہیں اُن
کے بیان کے مطابق عملی طور پر ہندوستان کی پانچ بڑی بڑی ریاستوں
کی مانند ہوں گے۔ مسٹر جناح نے اس خیال کو مسترد کر دیا کہ افغانستان
کو شمالی مغربی منطقہ میں شامل کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ قدرتاً
افغانستان کو شمالی مصر، عرب اور مسلم انڈیا کے درمیان قریبی تعلقات
ہوں گے۔ اُن کا خیال یہ نہیں ہے کہ مذکورہ مسلم مملکتیں ترکی کی طرح
مادہ پرست ہو جائیں گی۔ کیونکہ ترکی میں مذہب کا زوال محض خلافت
کی وجہ سے ہوا تھا جو پسماندگی کے باعث وقت کا ساتھ قطعاً نہیں
دے رہی تھی، انہوں نے اپنے اس یقین کا پھر اعادہ کیا کہ قدرتی
نشو و نما رفتہ رفتہ ہوتی ہے، چنانچہ اس اصول کے تحت کینیڈا
اپنے موجودہ مرتبہ تک ایک سو سال میں پہنچا ہے۔

انہوں نے اس بات کو بار بار دہرایا کہ "پورے ہندوستان
کے لئے آپ کوئی قابل عمل وفاقی آئین وضع نہیں کر سکیں گے" اور یہ کہ
جو اسکیم انہوں نے پیش کی ہے اس کا کوئی بدل انہیں نظر نہیں آتا
آپکی یہ کوشش کہ پورے ہندوستان کو ایک مملکت رکھا جائے
ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی ہے ہم ہندوؤں سے کوئی عداوت نہیں
رکھتے۔ لیکن وہ ہم سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔

ہمارے رہنے سہنے کے بنیادی طریقے، ہمارے قوانین، ہمارا
فلسفۂ قانون سب مختلف ہیں، کسی وقت میں نے یہ کہا تھا کہ ابتداً
مسلمان ہندو تھے لیکن آپ ایکہزار سال پیچھے نہیں جا سکتے اب ہم
"محمڈن لا" کے تحت ہیں۔ ہمارا قانون وراثت مختلف ہے جس
کے مطابق ترکہ کی تقسیم ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کے کل معاشی
طریقے مختلف ہے۔ ہندو اور مسلمان کی ایک دوسرے سے جتنی
قربت ہے اُس کو دیکھتے ہوئے جرمنی آپ سے قریب تر ہے"۔
انہوں نے کہا جیسا کہ آپ جانتے ہیں اپنی نو عمری کے زمانہ
میں کانگریس کا رکن تھا لیکن رفتہ رفتہ میں نے ان ایمنٹ
رکاوٹوں کو محسوس کیا جو مسلمانوں کو ہندوؤں سے جُدا کرتی ہیں۔
انہوں نے ایک مثال اپنی زندگی کی دور دے کر بیان کی۔ اُن کے ایک
ہندو لیڈر پنڈت مالویہ سے بہت دوستانہ تعلقات تھے، ایک
شام مسٹر جناح اور انکی بیگم کھانا کھا رہے تھے کہ پنڈت مالویان
سے ملنے پہنچے، اس وقت مسٹر جناح نے پنڈت مالویہ سے کہا میں

جانتا ہوں کہ آپ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہو سکتے تو کیا آپ قریب ہی ایک کرسی پر تشریف رکھیں گے؟"

لیکن مالویہ نے پس و پیش کیا اور کہا کہ وہ اُس قالین پر نہیں بیٹھ سکتے تھے جس پر کھانے کی میز لگی ہوئی تھی اور اس پر کھانا کھایا جا رہا تھا، پس یہ مسئلہ آخر کار اس طرح طے ہوا کہ قالین کو رول کیا گیا (لپیٹا گیا) اور خالی کی ہوئی جگہ پر ایک کرسی بچھائی گئی۔ تاکہ پنڈت مالویہ اس پر بیٹھیں۔

مسٹر جناح نے کہا، ہمارے مذہب کا تصور مکمل طور پر مساوات اور اخوت پر مبنی ہے، ہم ہندوؤں کی ذات پات کے نظام کا مقصد سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مثال کے طور پر جب جمعہ کو میں مسجد جاتا ہوں تو میرا شوفر بھی میرے برابر آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور نماز میں شریک ہوتا ہے اور نماز ختم ہونے پر ہم بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔ آپ اپنے سپاہیوں کو ہندوستان لے جایئے۔ ہر ایک مسلمان اُن کے ساتھ کھائے گا، پیئے گا لیکن کوئی ہندو ایسا ہرگز نہ کرے گا۔

طاقت منتقل کرنا یعنی برطانوی پارلیمان کے اختیارات ہندوستان کی مرکزی مجلس وزراء کو سپرد کر دینا شہری جنگ و جدال (سول وار) شروع کرانے کا طریقہ طریقہ ہوگا۔ اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ ہندوستان کا مسئلہ اس طرح حل ہو جائے گا تو آپ یقیناً احمقوں کی جنت میں بستے ہیں۔ مسٹر جناح کا خیال ہے کہ برطانیہ عظمیٰ کے لوگوں کا مسلم نقطۂ نظر سے ناواقف ہونا ایک حقیقی خطرہ ہے اور انہیں خوف ہے کہ برطانوی رائے دہندگان غلط اطلاعات پا کر ایسے پراگندہ خیال بن سکتے ہیں کہ وہ جلدی میں کوئی فیصلہ کر کے کوئی تحریک شروع کر دیں وہ کہتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کسی سوراج قسم کی تحریک کا جنون نہیں رکھتے اور ۲؎ مسلم منطقوں میں جو حکومتیں ہوں گی وہ برطانیہ عظمیٰ سے اقتصادی مسائل کو دوستانہ انداز میں حل کرنے کے لئے بات چیت کرنے کو بالکل تیار ہوں گی۔

انہوں نے سوال کیا کہ آپ موجودہ کشمکش کو کس طرح ختم کرنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہ تمام گفتگو کہ ہندو ہمیں سادہ چیک دینے کو تیار ہیں محض عیارانہ ڈھکوسلا ہے ہندوؤں کی اس قسم کی باتوں کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے خیال میں ہم احمقانہ طور پر اُن کی چالوں میں آکر اپنی موت کے وارنٹ پر خود دستخط کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ جہاں تک ہمارے ۲؎ منطقوں میں ہندو سکھ اور دیگر اقلیتوں کا تعلق ہے، ہم اُن کے لئے پوری پوری ضمانت دینے کو تیار ہوں گے،

مسٹر جناح کا خیال ہے کہ پس ماندہ طبقوں میں سے بہت سے ان کے ساتھ ہیں اور وہ ان کی خدمت کو ہندو حکومت پر ترجیح دیں گے، انہوں نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ کوئی ہندو گھرانہ مسلمانوں کو اپنے یہاں گھر کے کام کے لئے ملازم نہیں رکھتا، اگر کوئی شوفر یا کوئی دیگر کام کرنیوالا مسلمان ہو تو اُسے مکان کے اندر جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس کے برخلاف ہم مسلمان ہندوؤں کو اپنے یہاں ملازم رکھتے ہیں۔ میرے بمبئی کے مکان میں پانچ ہندو ایک عیسائی اور تین مسلمان ملازم ہیں۔ بڑے کاروباری اداروں میں جو ہندوؤں کے قبضے میں ہیں مشکل سے کبھی کسی مسلمان کو ملازم رکھا جاتا ہے مسٹر جناح کا خیال ہے کہ جب تک حکومت مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو نہیں سمجھتی۔ ان کا جنگی مساعی میں شرکت کر کے حکومت کی مدد کرنا دراصل ان کی عزتِ نفس کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ اگر برطانوی پارلیمنٹ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کا احساس کر لے تو وہ جنگی کارروائیوں میں زیادہ سے زیادہ

حصہ لیں گے اور حکومت سے مکمل تعاون کریں گے۔ کیونکہ ہم اور حکومت ایک ہی چیز پر یقین رکھتے ہیں۔ موجودہ آئین کے ڈھانچہ کے اندر ہمیں مرکز میں جگہ دی جانا چاہیئے۔

قائداعظم نے انٹرویو کا یہ خاکہ پڑھا اور اسکے کئی حصوں سے انہوں نے اتفاق نہیں کیا سب سے پہلی قابل اعتراض بات یہ تھی کہ اُن کی رائے میں نجی زندگی کے ذاتی واقعات کو سیاسی مقاصد کے لئے بطور دلیل استعمال کرنا کوئی پسندیدہ اقدام نہیں ہے۔ انہوں نے پنڈت مالویہ سے ملاقات کا جو ذکر کیا اس کا محض یہ مطلب تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا ایک پس منظر پیش کر دیا جائے وہ اس بات پر زور دینا چاہتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو ثقافتی اور سیاسی اختلافات تھے انکا باہم تعلق تھا اور یہ کہ ہندو کا ذات پات کا نظام محض معمولی تعصب یا تعلیم کی کمی پر مبنی نہ تھا جیسا کہ ہندو لیڈر ثابت کرنیکی کوشش کرتے ہیں بلکہ یہ ہندو مذہب میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ہندو دھرم اور اُن کے ضابطۂ زندگی کا اصل جز ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس خاکہ میں بہت سی باتوں کو ضرورت سے زیادہ اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ان کا مطلب غلط نکالا جائے۔ چنانچہ قائداعظم نے اسکی ضروری تصحیح کرنے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ مسٹر ایولن کا خاکہ بہت کم فاصلہ چھوڑ کر ٹائپ کیا گیا تھا۔ اس لئے قائداعظم نے مجھ سے کہا کہ اسے دوبارہ ٹائپ کر دوں اور لائنوں کے درمیان میں فاصلہ زیادہ چھوڑوں، میں نے ایسا ہی کیا، لیکن اُنہیں جلد معلوم ہو گیا کہ اُس کی تصحیح لکھنے والے کا منشاء تبدیل کئے بغیر ممکن نہ تھی۔ لہٰذا ۱۷ دسمبر کو انہوں نے مسٹر ایولن کو مندرجہ ذیل خطوط لکھے۔

۱۔ مجھے آپ کا خط جس پر تاریخ نہ تھی موصول ہوا اور میں انکسار کے ساتھ آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ ہماری باہمی گفتگو کے متعلق آپ کے لکھے ہوئے نوٹ جو آپ نے مجھے بھیجے ہیں۔ میرے خیال میں اُن سے مُراد یہ نہیں ہے کہ وہ میری انٹرویو یا بیان ہیں میں نے آپ سے جو گفتگو کی اس سے مراد یہ تھی کہ پاکستان کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کا جو مطالبہ ہے وہ میں آپ کو سمجھا دوں اور اگر میں نے یہ صورتحال صاف صاف آپ کے سامنے بیان کر دی ہے تو آپ اس کو اپنے طور پر جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ کے نوٹ کئی اعتبار سے بالکل واضح اور صحیح نہیں ہیں بعض مقامات جس صورت میں کہ آپ نے انہیں بیان کیا ہے ایسے ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی جا سکتی ہے۔ اس لئے آپ کے نوٹ کی تصحیح کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک پاکستان کے مُطالبہ کا تعلق ہے جو ہماری گفتگو کا خاص موضوع تھا وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی قرار داد لاہور میں بہت واضح طور پر متعارف کیا گیا ہے اور میں اس کی ایک نقل اس خط کے ساتھ آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں۔

۲۔ میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس امر سے مطلع کر دیا کہ آپ نے مسلم لیگ کی پوزیشن کو پورے طور پر جان لیا ہے اور سمجھ لیا ہے۔ درحقیقت مجھے آپ سے یہ سُن کر بہت اطمینان ہوا ہے کہ آپ مسلم لیگ کے موقف اور نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھنے اور اُس کی قدر و قیمت پہچاننے کی پوزیشن میں ہیں۔

ترجمہ: اخلاص حسین زبیری
۱۹ اکتوبر سنہ ۱۹۷۶ء

قائد اعظم کے اقوال

از
جناب سرور علی قریشی صاحب

قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ سے تہ چلتا ہے کہ ہر قوم کی زندگی میں، ایک وقت یا آتا ہے کہ اسے قعرِ ذلت سے نکالنے کے ے ایک عظیم اور فعال ہستی منصۂ شہود پر آتی ہے اور اپنے کردار اور اپنی شخصیت سے اس م کا مقدر بن جاتی ہے۔

۱۹۳۰ء کے اواخر میں مولانا محمد علی جوہر رن کی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے بمبئی روانہ ہونے لگے تو انہیں ایک اسٹریچر پر لٹا کر از پر لے جایا گیا۔ لوگ یہ نظارہ دیکھ کر بے اختیار نے لگے۔ بعض مخلص عقیدت مندوں نے ان پوچھا ــــ "مسلمانوں کا مستقبل بڑا تاریک پر آشوب معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے بعد ان قیادت کون کرے گا؟"

انہوں نے بلا تامل جواب دیا: "صرف جناح! اللہ کرے ان کے دل میں یہ خیال جائے!"

علامہ اقبالؒ نے بھی اپنی وفات سے کچھ ے پہلے نیروبی کے مسلمانوں کی ایسوسی ایشن کو لکھا تھا "میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اپنا کام ختم کر چکا ہوں مجھے اب زندہ رہنے کی خواہش نہیں۔ اس وقت صرف ایک شخص ایسا ہے جس کی مسلمانانِ عالم کو بالعموم اور مسلمانان ہند کو بالخصوص اشد ضرورت ہے اور وہ ہیں مسٹر محمدؐ علی جناح، میری دلی خواہش ہے کہ آپ ان کی درازیٔ عمر کے لئے دعا کریں"۔ خدائے بزرگ و برتر نے دونوں مخلص مسلم زعما کی دلی تمنا پوری کی۔

مسٹر محمد علی جناح جو برصغیر کے سیاسی ماحول سے مایوس ہو کر انگلستان چلے گئے تھے قوم کی پکار پر واپس آگئے۔ اور پھر یہ دبلا پتلا انسان۔ ہمت و استقلال کا پیکر اپنے عزائم میں سرمست پورے جذبۂ انہماک کے ساتھ قافلہ ملت کو لئے رواں دواں منزل کی طرف جادہ پیما تھا۔ ملت اسلامیہ کی تقدیریں بدلنے والا مرد مومن اور اسلامیان ہند کو پاکستان جیسی عظیم الشان مملکت بخشنے والا۔ جس کو مغرب کے رہنے والوں نے ارضِ مشرق کا اہم ترین

انسان تسلیم کیا۔ تناسخ کے قائل ہندوؤں نے
ازرہِ بیزاری مغلِ اعظم کی روح کہا۔
اور ملت اسلامیہ نے اس مردِ مجاہد کو
قائداعظم کے محبوب نام سے پکارا اور بابائے ملت
تسلیم کیا۔

سیاست و تدبر کا مظہر و حامل۔ خطابت
کا شہنشاہ۔ میدانِ سیاست کا شہسوار، اپنے
عزم کا پکا اور ہٹ کا پورا۔
ایک ایسی شخصیت جس کے متعلق گاندھی جی
نے لکھا

"اسے نہ کوئی خرید سکتا اور نہ
وطن و ملت کے خلاف استعمال کر سکتا
ہے۔"

قائداعظم برصغیر کی مسلمان قوم کے عظیم ترین قائد
تھے۔

ان کے اقوال ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔
ہمیں چاہئیے کہ ان کی تعلیمات اور زریں اصولوں
کو اپنا کر ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔ ملک و قوم کی
ترقی بھی اسی میں مضمر ہے۔

ایک مسلمان طالب علم کی حیثیت سے میں
قائداعظم کے ان اقوال و ہدایت کو اولیت
دیتا ہوں جو انھوں نے اپنی تقاریر، بیانات
خطابات کے ذریعہ طلبہ کو دیئے۔

ان کے زریں اقوال کے چند درس آموز
اقتباسات اس مضمون میں پیش کر رہا ہوں۔

"آپ تعلیم پر پورا دھیان دیں اور اپنے
آپ کو عمل کے لئے تیار کریں۔ یہ آپ کا پہلا فریضہ
ہے۔ آپ کی تعلیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ آپ دورِ
حاضر کی سیاست کا مطالعہ کریں۔ یہ دیکھیں کہ
آپ کے گرد دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ہماری قوم
کے لئے تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دنیا
اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے
اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہ بنایا تو نہ صرف یہ کہ
آپ پیچھے رہ جائیں گے، بلکہ خدانخواستہ بالکل
ختم ہو جائیں گے۔ تعلیم کی اشاعت کے لئے بڑی
سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہئیے۔
اس مقصد کی خاطر جتنی بھی مصیبتیں جھیلی جائیں
کم ہیں۔" ۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء

اس اقتباس پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ قائداعظم نے طلبہ کے لئے سب سے پہلا فرض علم
عمل کو قرار دیا۔ یعنی علم بھی حاصل کرو اور عمل کے لئے
تیار رہو اور عمل کرتے بھی رہو۔ کیونکہ بغیر عمل کے
علم بیکار ہے۔ اس کے علاوہ قائداعظم نے طالب علموں
سے سیاست کے مطالعہ کے لئے کہا۔ قائداعظم نے
طلبہ کو اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کرنے کی دعوت
دیتے ہوئے فرمایا۔

"میں پاکستان کے ہر باشندے اور بالخصوص
اپنے نوجوانوں کو یہ بات اچھی طرح بتا دینا چاہتا
ہوں کہ وہ خدمت، ہمت اور برداشت کے سچے جذبے
کا مظاہرہ کریں، ایسی شریفانہ اور بلند مثالیں قائم

کریں کہ آپ کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں آپ کی
تقلید کریں۔" طلبہ سے خطاب لاہور۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

انھوں نے طالب علموں سے یہ بھی فرمایا کہ
کہ تم اپنی قوت ارادی، قوت عملی اور قوت کردار سے
خود کو بلند کرلو کیونکہ تم ہی وہ لوگ ہو جو آئندہ
ہماری قوم کی تمناؤں کا بوجھ اٹھاؤ گے اور آنے
والے تمہارے ہی نقش قدم پر چلیں گے۔

قائد اعظم نے اپنی اسی تقریر میں آگے چل کر
کہا۔

"اپنا اخلاق ہر صورت میں بلند رکھو، موت
سے نہ ڈرو۔ ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے۔ کہ ہمیں موت
کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ ....

....

.... اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے
کے لئے ہمیں موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیئے
مسلمانوں کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نجات
نہیں ہو سکتا کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت پائیں
۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

قائد اعظم نے فرمایا کہ ہمیں اسلام اور پاکستان
کے لئے اپنے اندر صرف مجاہدوں کا سا جذبہ بیدار کرنے
کی ضرورت ہے اور اگر ہم اس جنگ میں شہید ہو گئے
تو ایک مسلمان کے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا
ہو گی کہ وہ نیک راہ میں مارا گیا۔

قائد اعظم نے نوجوانوں پر فخر کرتے ہوئے کہا
کہ :-

"پاکستان کو اپنے نوجوانوں اور بالخصوص طلبہ
پر فخر ہے جو آزمائش اور ضرورت کے وقت ہمیشہ
صف اول میں رہے ہیں۔

آپ مستقبل کے معمار قوم ہیں۔ اس لئے جو مشکل کام
آپ کے سر پر کھڑا ہے اس سے نمٹنے کے لئے اپنی شخصیت
میں نظم و ضبط پیدا کیجیئے۔ مناسب تعلیم اور مناسب
تربیت حاصل کیجیئے۔ آپ کو پورا پورا احساس ہونا چاہیئے
کہ آپ کی ذمہ داریاں کتنی زیادہ اور کتنی شدید ہیں
اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر وقت تیار اور
مستعد رہنا چاہیئے۔" ۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

قائد اعظم کے ان الفاظ کے پڑھنے سے احساس
ہوتا ہے کہ قائد اعظم نوجوانوں کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔
انھوں نے پاکستان کے نوجوانوں کو مکمل اعتماد اور
استحکام کا پیغام دیا، انہیں ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ
کیا۔ اور انھیں تیار کیا کہ ان کا اصل کام اپنی ذات
سے وفا، اپنے والدین سے وفا، اپنی مملکت سے وفا،
صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب وہ متحد
ہو کر رہیں۔ اگر متحد رہو گے تو کھڑے رہو گے اور اگر
منتشر ہو گئے تو یقیناً گر پڑو گے۔

اسی طرح پاکستانی اسکاؤٹوں سے خطاب
کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔

"ہم جس دنیا میں اس وقت زندگی گذار رہے
ہیں وہ کسی بھی طرح مکمل نہیں کہلائی جا سکتی۔ تہذیب
و تمدن کی ترقیوں کے باوجود جنگل کا قانون جاری
ہے۔ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے مصداق طاقتور

کمزوروں سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے باز نہیں رہتے۔ اپنی ترقی کو مقدم رکھنا، لالچ اور طاقت حاصل کرنے کی ہوس نہ صرف افراد کو بلکہ اقوام عالم کے تمام افعال کی محرک ہے۔ اگر ہم دنیا کو زیادہ محفوظ، زیادہ پاکیزہ اور پُرمسرت بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی اصلاح کا کام افراد سے شروع کرنا پڑے گا۔ بچپن ہی سے فرد کی زندگی میں اسکاؤٹ کا ایثار، خدمت، قول و فعل اور خیال کی پاکیزگی کا مسلک پیدا کر دینا چاہیئے۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:۔

"اگر ہمارے نوجوان ہر ایک کو دوست رکھنے، ہر ایک کی ہمہ وقت خدمت کرنے اور ذاتی مفاد کو دوسروں کی بھلائی کے سامنے پس پشت ڈالنے، خیال الفاظ اور عمل میں تشدد سے بچنے کا طریقہ سیکھ لیں تو مجھے امید واثق ہے کہ عالمگیر اخوت ہمارے امکان اور دسترس میں ہوگی۔"

۲۲ ستمبر ۱۹۴۷ء

قائد اعظم نے دنیا کی سیاسی صورت حال بتاتے ہوئے فرمایا۔ دنیا میں صرف اس وقت طاقتور کا بول بالا ہے اور کمزور اس کے محکوم ہیں اور طاقتور بننے کی ہوس ہے، اس وقت پوری دنیا کوشش کر رہی ہے۔ اور اگر ہم دنیا کی اصلاح کریں تو پہلے اپنی اصلاح کرنی پڑے گی اور وہ اس طرح کہ ایمانداری اور خلوص دل سے کام کیجئے اور اپنے فرض کو وفاداری اور صمیم قلب سے انجام دیں۔ تاکہ آپ کے درمیان ایک دوسرے کے حق میں نیک نیتی پیدا ہو۔ کیونکہ جب آپ کے اندر یہ اوصاف پیدا ہو جائیں گے تو آپ خود بخود دنیا کی برادری کو اپنے حق میں کر سکتے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ اپنے دوسرے آباؤ اجداد کی طرح کامیاب نہ ہوں اور اپنے آپ کو دنیا کی عظیم ترین طاقتور اور ترقی یافتہ قوم کے روپ میں پیش کریں۔

قائد اعظم نے نوجوانوں کو نئے تعلیمی شعور سے روشناس کراتے ہوئے فرمایا:۔

"میرے نوجوان دوستو! اب تمہیں اس ضرورت اور بنیادی تبدیلی کا پورا پورا احساس ہونا چاہیئے جو اس خطے میں حال ہی میں ہوئی ہے۔ اب اپنی شخصیت کو محض سرکاری ملازم بننے کے خول میں محدود نہ کیجئے۔ جیسا کہ اب تک سب ہی اس کی تمنا کرتے رہے ہیں۔ اب نئے میدان، نئے راستے اور نئی منزلیں آپ کی نگاہ شوق کے منتظر ہیں۔ سائنس، تجارت، بینک، بیمہ، صنعت و حرفت اور فنی تعلیم کے شعبے آپ کی توجہ اور تجسس کے محتاج ہیں۔"

اسلامیہ کالج پشاور ۱۲ اپریل ۱۹۴۷ء

قائد اعظم نے نوجوانوں کو ترقی کی راہ بتاتے ہوئے فرمایا۔

"اب آپ لوگوں کو پرانے ڈھرے یعنی کلرکانہ اور سرکاری ملازمت کی تگ و دو سے نکل کر دوسرے مقاصد اور دوسرے راستوں اور میدانوں کی طرف جانا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے ملک کو کاریگروں اور ہنرمندوں کی اشد ضرورت

ہے۔ آپ بینک کاری، معاشیات، رموز کاری اور قانون کے میدانوں میں اپنے جوہر دکھائیے وہ نوجوانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ سرکاری ملازمت کی نسبت کہیں زیادہ فائدے میں رہیں گے۔ آپ خوشحال رہیں گے اور جب آپ کو فائدہ ہوگا تو پاکستان کو فائدہ ہوگا۔

ان اقوال و بیانات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قائد اعظم نے قوم کے نوجوانوں کے لئے جو راہیں متعین کی ہیں۔ اگر نوجوان عزم و تعاون سے اس راہ پر چل پڑیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ترقی حاصل نہ ہو۔ لہٰذا اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان توقعات کو پورا کریں اور اس نقش قدم پر چلیں جو قوم کے قائد نے ہمیں دکھایا ہے۔

خدا ئے رب العزت ہمیں اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے کی قوت عطا فرمائے۔ آمین۔

پاکستان زندہ باد ۔۔۔ قائد اعظم زندہ باد

نظریۂ پاکستان
ایک منطقی اور سائنسی تجزیہ

از جناب سید محمد تقی (سابق مدیر روزنامہ "جنگ")

پاکستان ایک قوم کا وطن ہے یا ایک سے زیادہ اقوام یا قومیتوں کا؟ یہ سوال ہر چند قیام پاکستان کے وقت ختم ہو جانا چاہئیے تھا اس لئے کہ پاکستان کا قیام ہی اس اصول کے تسلیم کرنے کے بعد عمل میں آیا تھا کہ برصغیر کے مسلمان ایک جداگانہ قومی تشخص رکھتے ہیں، تاہم ابھی تک ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو پاکستان کے ایک قومی ریاست ہونے کے تصور کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں پاکستان چار یا چار سے زیادہ قوموں کا مسکن ہے اور یہ ملک کثیر القومیتی علاقہ ہے، کسی ایک متحد التصور ملت کا وطن نہیں ہے۔

یوں تو اس سوال پر تقسیم سے کئی برس پہلے ہی سے بحث چھڑی ہوئی ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ اس سوال کو جذباتی اور عقیداتی پس منظر سے ہٹ کر موضوع بحث بنایا گیا ہو۔

بحث جذبات سے چلتی ہے اور جذباتی مراحل سے گذرتی ہوئی تسکین جذبات کے نقطے تک پہونچ کر ختم ہو جاتی ہے اور یوں مسئلہ سائنسی اور فکری اند[از] میں نہ تو اٹھایا جاتا ہے اور نہ ان حدود و ضروریات [کا] خیال رکھا جاتا ہے جو علمی و فکری تقاضوں سے [وابستہ] ہوتی ہیں۔

ایک گروہ مذہبی عقیدے سے شروع ہو کر مذہ[بی] عقیدے کی تسکین تک پہونچتا ہے اور دوسرا گرو[ہ] سیاسی عقیدے کی ضروریات کو سامنے رکھ کر سیا[سی] مقاصد کی تکمیل تک پہونچنا چاہتا ہے اور یوں علمی فکری، سائنسی اور منطقی ضروریات درمیان میں کہیں رہ جاتی ہیں۔

پاکستان یک قومی تصور کی ریاست ہے یا نہیں یہ سوال ایک قدرے بڑے سوال سے وابستہ ہے سوال یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمان ایک جداگانہ قو[می] تعین و تشخص رکھتے ہیں یا نہیں۔ اگر اس سوال [کا] جواب اثبات میں ہو تو غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ مسلم ہند کو ایک آزاد جداگانہ ریا[ست]

[بنا]یا جائے صحت پر مبنی تھا ورنہ نہیں۔ اور اس کا [م]نطقی نتیجہ یہ بھی برآمد ہوگا کہ پاکستان یک قومی تصور [ک]ی ریاست قرار پائے یا دوسری صورت میں خود [پ]اکستان کا قیام ہی اپنی اساس سے محروم ہو جائے گا۔

تقسیم سے پہلے بحث یہ چھڑی ہوئی تھی کہ برصغیر کے [مس]لمان ایک قوم ہیں یا نہیں۔ مسلم لیگ مسلم برصغیر کی [ج]داگانہ قومیت پر مصر تھی اس لئے کہ مسلمانوں کو [ج]داگانہ قوم ماننے کی صورت میں ایک آزاد مسلم ہندی ریاست کا قیام سیاسی فلسفے کا جواز حاصل کر لے گا [ج]بکہ پورے ہندوستان کو ایک قوم ماننے کی صورت [م]یں آزاد مسلم ریاست کا مطالبہ سیاسی فلسفے کے تحت [ج]ائز قرار نہ پائے گا۔

یہ بات پچھلی کوئی ایک صدی سے مانی جا چکی [ہ]ے کہ ہر قوم ایک آزاد مملکت میں رہنے کا حق رکھتی ہے۔ [ا]س لئے مسلم ہند اس بات پر مصر تھا کہ برصغیر کے [مس]لمان اقلیت نہیں ہیں، جو غیر منقسم ہندوستان کی [م]شترکہ حکومت میں ایک بڑی قوم کے جزو کی حیثیت [س]ے زندگی گذار سکیں۔ بلکہ ایک جداگانہ قوم ہیں جن کے [لئ]ے ایک جداگانہ وطن کا مطالبہ سیاسی فلسفے کے تقاضوں [ک]ے تحت صحیح ہے۔

واضح اس سے یہ ہوا کہ برصغیر کے مسلمانوں [ک]ا یہ دعویٰ کہ مسلم ہندوستان ایک جداگانہ قومیت [ہ]ے، پاکستان کے قیام کا جواز بنا تھا۔ لہٰذا اگر یہ دعویٰ [ص]حت پر مبنی قرار نہ دیا جائے تو پاکستان کے قیام کا سیاسی [م]نطق کی رو سے کوئی جواز پیدا نہ کیا جا سکے گا۔

بات اس سے یہ بھی نکل آئی کہ پاکستان کے یک قومی تصور کی ریاست ہونے نہ ہونے کا مسئلہ پاکستان کے سیاسی جواز کا مسئلہ ہے اور ایک سے زیادہ قوموں کا وطن ہونے کی صورت میں مختلف اقوام کے حق خود اختیاری کے مطالبے کا امکان ضرور پیدا ہو سکتا ہے، چاہے آج کل کئی ریاستیں کثیر القومیتی طرز کی بھی ہیں لیکن سیاسی فلسفے کے تحت انھیں جداگانہ و آزاد زندگی گذارنے کا ضرور حق حاصل ہے۔ غالباً اسی لئے سوویت یونین کی ریاستوں کو مرکز سے علیحدگی کا آئینی حق حاصل ہے۔ چاہے عملاً اس حق کا استعمال ممکن نہ ہو۔

تاریخ یا جغرافیہ

یہ امر کہ پاکستان ایک یک ثقافتی تصور کے تحت وجود میں آیا تھا، ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اور تاریخ ایک ایسی بے رحم حقیقت ہے جسے دیوتا بھی نہیں بدل سکتے۔ برصغیر دو جداگانہ اور بڑے ثقافتی نمونوں کا وطن ہے یا نہیں، اس پر یقیناً بحث کی جا سکتی ہے مگر اس واقعے پر کوئی بحث نہیں کی جا سکتی کہ پاکستان اس دعوی کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا کہ برصغیر دو یا اس سے زیادہ ثقافتی نمونوں کا وطن ہے جن میں سے صرف دو ہی ایسے ہیں جو آبادیوں کے تناسب کے اعتبار سے حق خود اختیاری کا مطالبہ کر سکتے اور اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر کی دو بڑی آبادیوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو جدا جدا ثقافتی نمونے قرار دینا صحت پر مبنی نہیں ہے جیسا کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے آل انڈیا کانگریس کا موقف تھا لیکن کوئی یہ کہنے کی

جرأت نہیں کر سکتا کہ پاکستان ایک ثقافتی تصور کے دعوے کی بنیاد پر بنا تھا۔ اس لئے اگر اس واقعے سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے تو پھر مثلاً برصغیر کے انگریزوں کے ماتحت آنے کے واقعے سے بھی انکار کرنا ممکن ہے۔

تاریخ کی طے شدہ حقیقتوں سے انکار کی ریت چلے تو کون سا واقعہ ہے جس سے انکار ممکن نہ ہوگا۔

بعض حضرات تقسیم کے مسئلے کو تاریخ کے بجائے جغرافیہ سے وابستہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وادی سندھ اور وادی گنگ وجمن کی دوئی برصغیر کے بٹنے کا سبب بنی ہے لیکن اس خیال کی تائید میں ٹھوس واقعات موجود نہیں ہیں، بالفاظ دیگر اس نقطۂ نظر کے حق میں تاریخ کو نہیں لایا جا سکتا۔ برصغیر میں صرف دو دریا نہیں ہیں کئی دریا ہیں اور سب کے کناروں پر تہذیبی آثار پائے جاتے ہیں اس لئے صرف دو دریاؤں کو تہذیبی دوئی کا مرکز قرار دینا واقعات کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

حقائق کو معروضی انداز میں دیکھنا چاہیئے اپنے جذبات کی روشنی میں نہیں۔ واقعات افراد کی خواہشوں کا احترام نہیں کیا کرتے نہ تاریخ کے بہاؤ سے افراد کے جذبات کا خیال رکھنے کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

ثقافتی مسئلہ

برصغیر کی تقسیم کے سلسلے میں ہمیں پہلے اس بنیاد کو متعین کرنا ہوگا جہاں سے اس تمام مسئلے میں سوچ کا آغاز ہونا چاہیئے۔

۱۹۴۰ء سے پہلے صورت مسئلہ یہ تھی کہ غیر منقسم ہندوستان انگریزی حکومت سے آزادی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ آزادی کے اس مطالبے کا جواز اس لئے پیدا نہیں ہو رہا تھا کہ پورا ہندوستان یا برصغیر ایک قوم ہے بلکہ تحریک آزادی کا واضح جواز ہندوستان کی محکومی تھا۔ محکوموں کو چاہیئے کہ وہ ایک قوم ہوں یا نہ ہوں انہیں آزاد ہونے کا حق حاصل ہے۔

تمام محکوم یورپ نے ہٹلر اور نازیوں سے آزادی کی تحریک چلائی جبکہ ظاہر ہے یہ جنگ آزادی لڑنے والے مختلف اقوام سے متعلق رکھتے تھے البتہ آزادی کے قریب آنے اور آزاد ہو جانے کی صورت میں سب اپنے اپنے خانوں میں بٹ گئے اور کئی اقوام محکومی کی خاک سے اٹھ کر جداگانہ قومی شعور کی منزل تک پہونچ گئیں۔

تو یوں آزادی کی تحریک چلانے کے لئے محکوموں کا کسی ایک قوم کا فرد ہونا کبھی ضروری نہیں سمجھا گیا، البتہ جوں جوں تحریک آزادی کے پھل پکنے کی منزل قریب آتی ہے مختلف گروہ یا آبادیاں اپنے حصے کے تعین میں لگ جاتی ہیں۔ اور ایسا ہونا بالکل جائز اور قدرتی بھی ہے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا۔ جوں جوں یہ واضح ہوتا چلا گیا کہ برصغیر آزادی کے قریب پہونچ رہا ہے، مختلف آبادیوں کو یہ تردد لاحق ہوا کہ آزاد ہندوستان میں ان کا مقام کیا ہوگا۔

برصغیر میں صورت یہ تھی کہ کئی ثقافتی نمونے اپنی اپنی جگہ موجود تھے مگر سب کے لئے جداگانہ حکومت کا

حصول یا حق خود اختیاری کا ملنا ممکن نہ تھا۔ البتہ دو بڑے گروہ یا آبادیاں ایسی تھیں جو اپنے ثقافتی وجود کو جداگانہ مملکت قائم کر کے بچا سکتی تھیں۔ یہ دونوں آبادیاں ہندو اور مسلمان تھے۔ جو الگ الگ ثقافتی تصورات کے حامل تھے۔ اس لئے مسلمانوں نے ایک آزاد مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا۔

مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمان۔ اور یہاں زور لفظ ہندوستانی پر ہے۔ ایک ممتاز ثقافتی ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے انہیں آزاد مملکت قائم کرنے کا حق دیا جائے۔ اس مطالبے کو مان لیا گیا اور پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ گویا پاکستان کا قیام اور مطالبے کے پورا کرنے کے لئے عمل نہیں آیا کہ برصغیر کے مسلمان ایک جداگانہ ثقافتی اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بہر حال یہ واقعہ ایک تاریخی حقیقت رکھتا ہے کہ پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں یا مسلم لیگ کے اس مطالبے کو پورا کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا کہ مسلمانوں کے ثقافتی تصور کو جو ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، حق خود اختیاری ملنا چاہیئے۔ اسی حق خود اختیاری کو تسلیم کرنے کے لئے پاکستان وجود میں آیا۔

بحث کی جاسکتی ہے کہ مسلم ہندوستان کا یہ مطالبہ کہ وہ ایک جداگانہ ثقافتی کردار یا تہذیبی تصور کا حامل ہے صحیح ہے یا نہیں۔ لیکن یہ بحث نہیں کی جاسکتی کہ مسلم ہندوستان نے ایک جداگانہ ثقافتی تصور کے حامل ہونے کا دعویٰ کیا ہی نہیں۔ اس لئے کہ یہ واقعہ تاریخ کی امانت بن چکا ہے کہ مسلم ہندوستان نے اپنے جداگانہ ثقافتی تشخص کا دعویٰ کیا تھا اور اسی جداگانہ ثقافتی تشخص کے نتیجے میں مسلم ہندوستان کو حق خود اختیاری یا پاکستان کا مستحق قرار دیا گیا تھا۔

مسلم ہندوستان اور پاکستان

بات اُلجھی رہے گی اگر اس مرحلے پر یہ پہلو سامنے نہ رہے کہ جداگانہ ثقافتی تعین و تشخص کا دعویٰ اور اس دعوے کے ساتھ قیام پاکستان کا مطالبہ تو پورے ہندوستانی مسلمانوں یا برصغیر کے مسلمانوں نے کیا تھا تاہم پاکستان کا اس انداز پر وجود میں آنا ممکن نہ تھا کہ سارے مسلمانان برصغیر اس کے دائرے میں آجاتے۔

برصغیر کے مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کی منطق قدرتی طور پر برصغیر کے ہندوؤں کے جداگانہ تشخص و تعین کو بھی ثابت کرتی تھی۔ اگر برصغیر کئی ثقافتی نمونوں پر مشتمل تھا جن میں سے دو ثقافتی نمونے جو ہندوؤں اور مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے بڑے تھے اور حق خود اختیاری کا مطالبہ کر کے اُسے حاصل بھی کر سکتے تھے۔ تو مسلمانوں کے حق خود اختیاری کے ساتھ ہندوؤں کے حق خود اختیاری کا مطالبہ بھی یکساں جواز کا حامل تھا۔

یوں ہند یونین کا قیام ہندوؤں کے جداگانہ ثقافتی ہونے کا اعتراف اور پاکستان کا قیام مسلمانان برصغیر کے مختلف ثقافتی نمونے کا عمل میں لانا تھا۔

نتیجہ اس بحث سے یہ نکلا کہ ہند یونین پر تمام ہندوؤں اور پاکستان پر برصغیر کے تمام مسلمانوں کا

یکساں حق ہے۔

لیکن اس تمام بحث کا سب سے اہم اور بنیادی نقطہ یہ ہے کہ مسلم برصغیر کے تصور کے تحت پاکستان کا مطالبہ یا قیام جائز تھا یا نہیں۔ بالفاظ دگر کیا ثقافتی اعتبار سے مسلم برصغیر ایک جداگانہ اکائی ہے یا نہیں جس کے دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ کیا برصغیر کی ہندو آبادی ایک جداگانہ ثقافتی اور تہذیبی تصور رکھتی ہے یا نہیں اس لئے کہ اگر ہندو اور مسلمان دو ممتاز ثقافتی تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں اور دونوں کی آبادیوں کی اکثریت اپنی ممتاز حیثیت کے تعین کے لئے ایک ممتاز و خود مختار حکومتی ڈھانچے کے عمل میں لانے کی متمنی تھی تو پھر ہند یونین اور پاکستان کا قیام جائز تھا، نہ کہ محکوم ہندوستان کے بطن سے ان دو آزاد حکومتوں کا وجود میں آنا غلط تھا۔

مگر اس مرحلے پر یہ سوال جائز طور پر پیدا ہوگا کہ آخر ہم اس تمام بحث کو چھیڑنے کی ضرورت محسوس ہی کیوں کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اگر مثلاً یہ ثابت کرنا ممکن نہ ہو سکے کہ ہندوستان یا بھارت اور پاکستان کا قیام ثقافتی پیمانے پر جائز نہ ہو تو کیا دونوں کو انگریز کا محکوم بنا دیا جائے گا۔ یا پاکستان کی آزادی کو ختم کر کے اسے ہند یونین میں شامل کر دیا جائے گا۔ ان دونوں مقاصد یا نتیجوں میں سے ہندوستان کے لئے تو پہلا ناقابلِ قبول اور دوسرا بیحد دل خوش کن ہوگا مگر پاکستان کے لئے دونوں صورتیں ناقابلِ قبول ثابت ہوں گی۔

یہاں، جو چیز پوری وضاحت کے ساتھ پیشِ نظر رہنی چاہیئے۔ وہ یہ ہے کہ اگر یہ تھیوری کہ برصغیر کے مسلمان ایک جداگانہ ثقافتی ہونے کی نمائندگی کرتے ہیں، صحیح نہ بھی ہو تو بھی یہ واقعہ تو بہرحال صحیح رہے گا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت نے ایک جداگانہ تشخص کے زور پر پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی اختلاف کی بنیاد پر ثقافتی اختلاف پیدا ہونے کا خیال صحیح نہیں ہے پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان ایک قوم نہیں کئی قومیتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اور یہ بھی دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان ایک قوم کا وطن نہیں، کئی قوموں اور قومیتوں کا وطن ہے اور مان لیا جائے کہ یہ سب کچھ صحیح بھی کہا جا رہا ہے۔ یعنی یہ غلط تھا کہ برصغیر کے مسلمان ایک قوم تھے، یا ان کا جداگانہ تشخص اور تعین تھا لیکن ان تمام دعاوی کو تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ بات تو بہرحال تاریخی طور پر ثابت ہے کہ ہندوستانی یا غیر منقسم ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت نے اپنے جداگانہ قوم اور ممتاز ثقافتی اکائی ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور صرف یہ حقیقت کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی جداگانہ ثقافتی اور قومی حیثیت کا دعویٰ کیا تھا، یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مسلم ہندوستان ایک جداگانہ اکائی تھا۔ کم سے کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ مسلم ہندوستان تاریخ کے اس مرحلے پر جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا، اپنی جداگانہ حیثیت منوانے پر

مصر تھا جس کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ سوشیالوجی جو قوموں اور قومیتوں کے مسئلے کو حل کرنے کے آخری حکم کی حیثیت رکھتی ہے۔ گروہوں، جماعتوں اور آبادیوں کے مزاج، کردار، امنگوں، ارمانوں، رہن سہن کے انداز اور سلیقہ، ماحول و حالات سے بحث کرتی ہے۔ قومیں آسمان سے نازل نہیں ہوا کرتیں، زمین سے اُگتی ہیں۔

اگر برصغیر کے مسلمان تاریخ کے کسی مرحلے پر اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم سمجھ رہے تھے۔ تو وہ اس مرحلے پر یقیناً ایک جداگانہ قوم تھے۔

یہ ایک سائنسی حقیقت SCIENTIFIC DATUM ہے کہ ۱۹۴۰ء میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے ایک جداگانہ اور متمیز اکائی ہونے کا دعویٰ کیا تھا، اس لئے اگر وہ اس سے پہلے ایک قوم نہ بھی ہوتے تو بھی اس احساس قومیت کے اُبھرنے کے ساتھ ہی کہ وہ ایک متمیز قوم ہیں اُن کی قومیت نے جنم لے لیا تھا۔

جدید عہد بڑی بڑی آبادیوں میں سے چھوٹی چھوٹی قوموں کے وجود میں آنے کا عہد ہے تو اگر ۱۹۴۰ء میں برصغیر میں ایک نئی قوم نے جنم لیا ہو تو اس سے قیام پاکستان کے جواز میں کون سا سقم پیدا ہو جائے گا۔ اس بات کو اگر فلسفیانہ انداز میں کہا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ بڑی آبادیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ خود دریافتی کے عمل سے گذرتے ہیں۔ خود دریافتی کا یہ عمل مخصوص سازگار حالات میں قوموں کو جنم دیتا ہے۔ لہٰذا سوشیالوجی کی اس سائنسی حقیقت سے ۱۹۴۰ء میں برصغیر کے مسلمانوں کے جداگانہ قوم ہونے کا متمیز ثقافتی ہونے کا مسلم لیگ کا دعویٰ سوشیالوجیائی جواز حاصل کر گیا۔ البتہ یہاں سوچنا یہ ہوگا کہ اس دعوے کے پس منظر میں کیا تاریخی، سیاسی، نظریاتی، تفکراتی اور جذباتی عناصر و محرکات تھے جن کے عمل و ردِّعمل کے نتیجے میں جداگانہ مسلم قومیت کا تصور اُبھرا۔ سوشیالوجی کے ماہرین، اس مرحلے پر جائز طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۴۰ء میں قوم کے جنم لینے کا واقعہ ان کے لئے اچنبھے کا سبب نہیں بنا اس لئے کہ وہ تو پہلے ہی برصغیر میں کئی ثقافتی قوموں کی موجودگی کو تسلیم کر چکے تھے اور ہندوستانی مسلمان، ان کے خیال میں ایک جداگانہ ثقافتی نمونے کی نمائندگی کرتے تھے۔

برصغیر کے مختلف ثقافتی نمونوں کے مرکز ہونے کا مسئلہ عقیدوں کے اختلاف کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہر چند کہ عقیدتی اختلاف ثقافتی تشکیل میں نہایت اہم کردار انجام دیتا ہے لیکن تنہا مذہبی، دینی اختلاف ثقافتی امتیاز کا سبب نہیں بن سکتا۔ ہندو کلچر جسے ہندوستانی یا انڈین کلچر کہا جاتا ہے، ایک عظیم تہذیبی نمونے کی حیثیت سے ماہرین سوشیالوجی کی خاص توجہ کا موضوع رہا ہے۔ اس موضوع پر بڑا جامع و نافع ادب پیدا ہو گیا ہے۔ اور اب شاید ہی کوئی ایسا پڑھا لکھا شخص ہو، خاص طور پر برصغیر میں جو عظیم ہندی کلچر یا ہندو کلچر سے آگہی نہ رکھتا ہو۔

ایسے میں ہندوستانی مسلمانوں کے جداگانہ کلچر کے وجود سے انکار اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ نسل انسانی واضح حقائق سے جو سامنے کی حقیقتوں پر مشتمل ہوں نتیجہ نکالنے میں بڑی سست رفتاری کا مظاہرہ کرتی ہے۔

ثقافت اور تہذیب

پچھلے دنوں پاکستان کے دانشور حلقوں میں ثقافت اور تہذیب کے مسئلے پر کافی بحثیں ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ بنیادی اصطلاحات پر اتفاق نہیں پایا جاتا۔ اور یہ صورت حال پاکستان کے دانشوروں تک محدود نہیں دوسرے ملکوں کا بھی بڑی حد تک یہی حال ہے۔ پھر خود موضوع کا تنوع، اور پھیلاؤ [illegible] کو اور ابھارنے کا باعث ہوا ہے۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ انسانی خیالات، تصورات، فکر و استدلال کے بارے میں جتنے علوم ہیں ان سب کی یہی حالت ہے کہ کسی ایک تصور کا کسی دوسرے تصور سے واضح امتیاز بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ان تصورات یا مفاہیم میں ثقافت و تہذیب بھی شامل ہیں جن کا جداگانہ تعین انتہائی مشکل ثابت ہوا ہے۔

ابلاغ و افہام کی سہولت کے لئے یہ بہتر ہے کہ ثقافت و تہذیب کو دو جدا جدا مفاہیم کے طور پر متعین کر لیا جائے۔ ثقافت سے فرد یا افراد کے روحانی تصورات اور ترجیحات مراد لی جائے۔ اور تہذیب ان روحانی تصورات کی مادی نمود کو قرار دیا جائے۔

فرد یا جماعت عہد سے لے کر لحد تک ان گنت اور گوناگوں حوادث و تجربات کی زد میں رہتی ہے ان حوادث اور تجربات میں سے فرد چند حوادث و تجربات کو اہم خیال کرتا اور اپنے لئے بامعنی سمجھتا ہے۔

یہ ہوا ثقافتی مسئلے کا ایک پہلو۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ فرد اور ماحول کے تصادم کے نتیجے میں فرد کا شعور ماحول و کائنات کے بارے میں ایک متعین تصور قائم کر لیتا ہے۔ وہ اس کائنات کے حقائق کو ایک بامعنی سلسلے کی لڑی میں پروتا ہے یہ ہوتا ہے فرد کا کائناتی تصور۔ یہ کائناتی تصور فرد کی زندگی کی نہج اور ماحول کائنات کے بارے میں اس کا جو ردعمل ہوتا ہے اس کا تعین کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر کائنات و ماحول کے بارے میں فرد جس شعور کو حاصل کرتا ہے ماحول سے یا اپنے شعور کے عمل سے اس سے فرد کی زندگی کی نہج اور کردار، اس کی شخصیت اور رہن سہن کا انداز متعین ہوتا ہے۔

یہ ہوا ثقافتی مسئلہ کا دوسرا پہلو۔

اب اس کا تیسرا پہلو خود ماحول کی اپنی نوعیت ہے۔ اس ماحول میں جغرافیائی، معاشی اور سیاسی حالات شامل ہوتے ہیں جو فرد پر خاص قسم کا عمل کرتے ہیں جن سے مخصوص قسم کا ردعمل پیدا ہوتا ہے۔ گویا معاشی طبقات، کامیابیوں اور محرومیوں، جغرافیائی حالات اور سیاسی مد و جزر بھی فرد کے

انداز زندگی، سوچ، امنگوں، تمناؤں اور خواہشوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، گہرا اور اہم اثر پیدا کرتے ہیں۔ جغرافیائی حالات و اثرات میں ہیں حیاتیاتی ساخت یعنی نسل و قبائل کے مخصوص مزاجوں کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے۔

تو بالاختصار یہ ہے صورتحال فرد کے ایسے روحانی و جسمانی حالات، ضروریات اور ماحول سے اس کے روابط کی۔

ویسے تو ہر فرد اپنے خول میں ایک جداگانہ دنیا ہوتا ہے لیکن بعض اعتبارات سے وہ جماعت کے ساتھ یکساں احساسات اور ردعمل کا حامل ہوتا ہے۔ ثقافت کا بنیادی یونٹ جماعت ہوتی ہے، چاہے بڑی ہو یا چھوٹی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی جماعت تک اَن گنت درجے آتے ہیں۔ تاہم کائناتی شعور کی حد تک یعنی کائناتی شعور کو ایک پیمانہ قرار دے کر گروہوں کی تقسیم کی جائے۔ تو انسانی نسل ایسے ٹکڑوں میں بانٹی جا سکتی ہے جو چند سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلم ہندوستان ایک ایسے گروہ سے عبارت تھا جو غیر منقسم ہندوستان کے دوسرے گروہوں سے ممتاز تھا۔

کیوں ممتاز تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں اور دوسرے گروہوں کے درمیان کائناتی شعور کا واضح اختلاف موجود تھا۔ غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان کائنات کے بارے میں جو تصور رکھتے تھے، وہ کئی باتوں میں ہندوستان کی ہندو اکثریت کے کائناتی تصور سے بالکل مختلف تھا۔ اور یہ مسئلہ ایسا لاینحل نہیں ہے جس پر تفصیل سے بحث کی ضرورت ہو اس لئے کہ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مسلم ہندوستان کی سوچ، امنگیں، تمنائیں، فلسفہ، فنون لطیفہ، ہیرو، روایات اور اختلاف کی قدریں، سماجی و معاشرتی آداب غرض دو جنوں دائرے تھے جو ایک دوسرے سے دور تھے۔ اس لئے واضح طور پر مسلم ہند اور ہندو ہند کی ثقافتی زندگی ذہنی، جذباتی، سماجی اور مجلسی فضا ایک دوسرے سے مختلف تھی اور اس لئے وہ دو جداگانہ ثقافتی دائروں کی نمائندگی کرتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان کے دائرے درجنوں خانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مگر حیات و کائنات کے شعور اور ردعمل کے بارے میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایک متعین ثقافتی نمونے کی حیثیت رکھتے تھے۔

ہندو اور مسلمان کا یہ ثقافتی اختلاف یا امتیاز ایک سوشیالوجیائی حقیقت ہے لیکن یاد رہے پاکستان کا قیام صرف ہندو اور مسلم کے اختلاف کی بنا پر ممکن نہیں ہوا۔ دو مختلف یا متضاد مذاہب کے ماننے والے کسی سیاسی ڈھانچے میں زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس کی ایک نہیں متعدد مثالیں موجود ہیں اس لئے یہ کہنا کہ ہندو اور

مسلمان کا اختلاف جو ایک مذہبی اختلاف تھا۔ قیام پاکستان کا سبب بنا ہے، صحت پر مبنی نہیں ہے۔

پاکستان کا قیام مسلم ہندوستان کے صرف کائناتی شعور کے اختلاف کی بنا پر ممکن نہیں ہوا۔ اس کا سبب وہ تاریخ، وہ سماجی حالات اور وہ مخصوص اسباب ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گذشتہ لگ بھگ ایک ہزار سال میں موجود رہے۔ گویا مطالبۂ پاکستان کا جواز صرف مذہبی و عقیدتی اختلاف میں ڈھونڈنا صحیح نہیں۔ یہ جواز اس تاریخ میں ملتا ہے جو پچھلے ایک ہزار سال کی مدت میں برصغیر میں گذری۔

سیاسی اصطلاح میں برصغیر کے مسلمان ایک قوم تھے۔ پورے مسلمانان عالم ایک قوم نہ تھے۔ قوم یعنی وہ گروہ جسے جداگانہ سیاسی ڈھانچے کی ضرورت تھی۔

لفظ قوم پر لمبی چوڑی بحثیں کی گئی ہیں۔ حالانکہ ان بحثوں کا بظاہر کوئی جواز موجود نہیں۔ ہندوستانی مسلمان ایک ممتاز گروہ کی حیثیت سے ایک آزاد سیاسی ڈھانچے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور یہ مطالبہ اس لئے جائز تھا کہ وہ ایک ممتاز سماجی گروہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی ممتاز سیاسی گروہ کا نام قوم رکھا گیا تھا۔ یعنی وہ ثقافتی و سماجی گروہ جو آزاد حکومت کا قیام چاہتا تھا۔ بحث لفظی نہیں ہے، مفاہیمی اور اصولی ہے۔ یعنی یہ کہ مسلم ہندوستان اپنی سماجی، روحانی، معاشی اور سیاسی ضروریات کے لئے آزاد مملکت کا قیام چاہتا تھا۔

مسلم ہند کو ایک قوم کہنے پر اصرار صرف اس لئے تھا کہ قوم تسلیم ہونے کی صورت میں حق خود اختیاری کے مطالبے کا جواز پیدا ہوتا تھا۔ اس لئے کہ یہ اصول عام طور پر مانا جاتا تھا کہ ہر قوم خود مختاری کا مطالبہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ ورنہ لفظ قوم میں کوئی تقدس پوشیدہ نہیں ہے۔

تاریخ کے ایک خاص وقفے میں برصغیر کے مسلمان یا ان کی اکثریت یکساں احساسات، یکساں نقطۂ نظر اور یکساں مقاصد رکھتی تھی۔ اس کا مقصود حق خود اختیاری کا حصول تھا۔ اس لئے یہ کہا گیا کہ مسلم ہندوستان ایک متمیز قوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے قیام کے لئے جو انتخابات اور ریفرنڈم ہوئے وہ دراصل مسلمانوں کے ایک قوم ہونے کے حق میں بھی تھے۔ مسلم ہندوستان کی اکثریت نے بالاتفاق یہ فیصلہ دیا کہ وہ ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس مرحلے پر یہ سوال کیا جاتا ہے مگر جائز طور پر نہیں کہ اگر برصغیر کے مسلمان ایک قوم تھے تو سارے مسلمانان ہند پاکستان میں کیوں نہیں ہیں؟ اس لئے کہ آزاد حکومت کا قیام صرف محض قوم ہونے سے ممکن نہیں ہو جاتا۔ آزاد حکومت کے قیام کے لئے کئی اور عملی شرائط بھی ضروری ہیں جن کے موجود نہ ہونے کی صورت میں مطالبۂ حق خود اختیاری عملی جامہ نہیں پہن سکتا۔

کسی چیز کے نظری جواز موجود ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا عملی جواز بھی موجود ہے۔ زمین اگر متحرک ہے تو اس کے ساکن کر دینے یا ساکن ہے تو متحرک کر دینے کا نظری جواز ہر وقت موجود ہے۔ مگر عملی جواز شاید کبھی بھی ممکن نہ ہو سکے۔ تو فطری طور پر ہندوستان غیر منقسم کے سارے مسلمانوں کے سیاسی حق خود اختیاری کا جواز ہر وقت موجود تھا۔ مگر عملی طور پر ممکن ہونا سیاسی قیادت وغیرہ کئی عناصر وعوامل پر محول تھا۔ لہٰذا سارے ہندوستانی مسلمانوں کا پاکستان میں موجود نہ ہونا صورتحال کی نظری حیثیت کو نہیں بدل سکتا۔

ایک یا چند قومیتیں

یہ موقف آج تک کسی نے اختیار نہیں کیا کہ برصغیر کے مسلمان یا موجودہ صورت میں پاکستان کے مسلمان ایک قوم ہونے کی بنا پر، ایک طرح رہتے، ایک جیسا لباس پہنتے، ایک جیسے کھانے کھاتے، ایک جیسے خیالات رکھتے اور باہمی مجلسی رشتوں میں ایک جیسا انداز اختیار کرتے ہیں۔ ایک قوم ہونے کا مطلب کبھی اور کہیں مکمل یکسانگی، مکمل ہم آہنگی اور ہر پہلو سے یگانگت کا ہونا کبھی نہیں لیا گیا۔ برصغیر کے ہر علاقے کے مسلمان مختلف نسلوں اور قبیلوں کے باشندے تھے اور اپنی بہت سی امتیازی خصوصیات رکھتے تھے۔ پاکستان میں بھی یہ صورت موجود ہے۔ پاکستانی قوم ایک نہیں متعدد گروہوں اور خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ رہن سہن کے اعتبار سے، بہت سی عادات اور رجحانات کے اعتبار سے۔ مگر ان ناگزیر قبائلی، نسلی، علاقائی اور گروہی اختلافات کے باوجود پاکستانی مسلمان اپنے کائناتی شعور، فنون لطیفہ کے پس منظر اور مقاصد، تاریخ اور ماضی کی یادوں، اخلاقی اور نظریاتی اقدار، محبوب شخصیتوں اور اساطیری روایات وغیرہ میں جوہری طور پر یکساں ہیں اور اس لئے ایک قوم ہیں۔ اس بنیادی وجوہری اشتراک کے بعد اور امتیازات کا درجہ آتا ہے جو اس قوم کو مختلف گروہوں میں بانٹتا ہے تاہم یہ امتیازات اپنے جوہر اور روح میں یکساں مآخذ سے فیضان حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح کے امتیازات ہر قوم میں پائے جاتے ہیں لیکن ان امتیازات کی بنا پر نہیں جدا جدا اقوام یا قومیتوں میں بانٹنا صحیح نہیں۔

ساری الجھن الفاظ کے مفہوم کے عدم تعین سے پیدا ہوتی ہے۔ لفظ قوم یا قومیت سے ہماری مراد کیا ہے اور خود قوم اور قومیت میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔ آیئے ذرا قوم کے لفظ کی تشریح سلبی انداز میں کر کے دیکھیں تاکہ مفہوم واضح ہو۔ دو قومیں دو ایسی انسانی آبادیوں کو کہتے ہیں جن کی غیر مشترک خصوصیات مشترک خصوصیات سے زیادہ ہوں جبکہ مثلاً دو گروہ جو کسی قوم کی دو ایسی انسانی آبادیاں ہوتے ہیں جن کی مشترک خصوصیات غیر مشترک خصوصیات سے زیادہ ہوتی ہیں۔

تو کہا جب یہ جاتا ہے کہ پاکستان کئی اقوام کا

وطن نہیں ہے بلکہ ایک ہی قوم کا مسکن ہے تو اس
سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ پاکستان میں بسنے والی
انسانی آبادی جن گروہوں پر مشتمل ہے ان میں
مشترک عناصر مختلف عناصر سے زائد ہیں۔ ان مشترک
عناصر کی وجہ سے پاکستانی ایک قوم کہلانے کے مستحق ہیں۔
مختلف اقوام قرار نہیں دیئے جا سکتے ورنہ ماننا نہ
پڑے گا کہ پاکستان میں جو مختلف گروہ پائے جاتے
ہیں ان میں مشترک عناصر کم اور غیر مشترک عناصر
زائد ہیں جو واضح طور پر ایک غلط تاثر ہے، اس لئے
کہ کوئی ذی ہوش یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ پاکستانی
عوام کے مختلف حصوں میں اشتراک پیدا کرنے والے
عناصر کم اور امتیاز پیدا کرنے والے عناصر زائد ہیں۔

قومیتوں کے لفظ کو یہاں اقوام کے ہم معنیٰ
قرار دیا گیا ہے، ورنہ اگر اس کے معنی ایسے گروہوں
کے ہوں جو ایک قوم کے اندر پائے جاتے ہوں تو
پھر یہ اصطلاح متنازعہ نہ رہے گی۔ تاہم ان ایسی
تجربات اور خطرات کے پیش نظر جن سے پاکستانی قوم
دوچار رہی ہے اور جن سے پچھلے ہی دنوں گذر چکی
ہے، لفظ قومیتیں ذرا مشکوک بلکہ مخدوش بن چکا
ہے۔ یہ اصطلاح زیادہ تر روس کے زیر اثر حلقوں
نے استعمال کی ہے جبکہ بدقسمتی سے روسی عالم و
محقق پروفیسر گینکووسکی نے اپنی کتاب کا نام
"اقوام پاکستان" رکھا ہے جس سے یہ شبہ پیدا
ہوتا ہے کہ قومیتوں کی اصطلاح فی الواقع اقوام
کے ہم معنی ہے اور اقوام کے لفظ میں ہر اکائی
کی آزادی کا مفہوم پنہاں ہے۔ چنانچہ پاکستانی
بنگلہ دیش کی آزادی کا مشاہدہ بھی کر چکے ہیں۔
اس لئے قدرتاً پاکستانی اقوام اور قومیتوں کی
اصطلاح سے الرجک ہیں۔ پھر مزید بدقسمتی یہ کہ
پروفیسر گنیکووسکی یا کسی اور روسی محقق نے
اقوام ہندوستان نامی کوئی کتاب نہیں لکھی۔
(کم سے کم میرے علم میں ایسی کوئی کتاب نہیں آئی)
اس لئے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اقوام اور قومیتوں
کی اصطلاح کے استعمال پر یہ زور سیاسی مقاصد
کا حامل ہے اور مدعا اسی صورتحال کا اعادہ
ہے جو بنگلہ دیش میں دیکھنے میں آئی۔ لہٰذا ان
اصطلاحوں کے زیر سایہ جو بحثیں کی جاتی ہیں۔
وہ علمی و تحقیقی نہیں، محض سیاسی ہیں۔ اور
سیاسی مقاصد سے کی جا سکتی ہیں۔ ان
سیاسی مقاصد سے جنھیں پاکستان کا وجود
باقی رکھنے والے پسندیدگی کی نظر سے
نہیں دیکھ سکتے۔

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں
اقبال

قائد اعظم کے تعلیمی نظریات

از جناب پروفیسر رحمت فرخ آبادی ایم۔ اے (سکھر)

کسی ریاست کے وقتی مسائل کا جائزہ اور ان کا حل ملکی سیاست کا اہم جزو ہے۔ اسی لئے عام طور پر سیاست داں صرف اپنے دور کے وقتی مسائل اور ان کے عارضی حل ہی سے دلچسپی رکھتے ہیں، بلا لحاظ اس کے کہ مستقبل میں کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ لیکن ان سیاستدانوں کی صف میں وہ استثنائی شخصیات بھی ہیں، جنہوں نے مختلف اقوام کے لئے فکر و عمل کی بنیادیں رکھیں۔ یہ سیاستداں ہنگامی اور وقتی سیاست سے زیادہ مستقبل کو اہمیت دیتے ہیں اور قومی تعمیر مستحکم بنیادوں پر کرنا چاہتے ہیں تاکہ وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ جو رفیع الشان عمارت تعمیر ہو۔ اس کی بنیادیں مضبوط ہوں۔

اس نقطۂ نظر سے اگر مسلمانان ہند کے قائدین کا جائزہ لیا جائے تو دو نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔ ایک سرسید احمد خاں جنہوں نے مسلم قومیت کے شعور کے آغاز میں ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ قوم کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی آئندہ نسل ہے جس کو مسلم قومیت کی تعمیر کرنا ہے۔ انہوں نے مسلم قومیت کی تشکیل کے لئے جدید علوم و فنون، عقل و استدلال، دور اندیشی، رواداری اور عزم و نظم کی اہمیت کو محسوس کیا۔ جب سرسید احمد خاں کی نظریاتی بنیادوں پر عملاً مسلم قوم ایسے مرحلے پر پہنچ گئی جہاں اس کی آواز میں قوت اور فیصلوں میں اثر تھا تو اس مرحلے پر جس شخص کے ہاتھوں میں قوم نے اپنی قیادت سونپی وہ قائد اعظم تھے۔

قائد اعظم کا دور برصغیر میں مسلم قومیت کا ایک طوفانی دور ہے جہاں ہر طرف دشواریاں، مزاحمتیں، سازشیں، مباحثے اور مجادلے نظر آتے ہیں۔ قائد اعظم ایک مصروف سیاستداں تھے لیکن ان کی یہ مصروفیت صرف وقتی ہنگاموں کے لئے نہ تھی بلکہ وہ مسلم قومیت کے مستقبل کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ مستقبل کا تعلق نئی نسل سے ہوتا ہے۔ اس لئے قائد اعظم نے اس کو بہت اہمیت دی۔ وہ جب بھی موقع ملتا نئی نسل کو اپنے مشوروں اور پیغامات سے نوازتے۔ ان مشوروں، پیغامات اور خطبات میں ان کے تعلیمی نظریات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔

قائد اعظم کو تحریک پاکستان کے لئے جوان کارکنوں کی ضرورت تھی جو کانگریس کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر سکیں لیکن انہوں نے طلبا کو کبھی بھی یہ مشورہ نہیں دیا کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں سے نکل کر گلیوں اور بازاروں میں آجائیں۔ وہ جانتے تھے کہ ہر کام اپنے وقت پر صحیح ہوتا

طالب علم بنیادی طور پر طالب علم ہے جس کا مقصد حصولِ
علم ہے نہ کہ عملی سیاست میں حصہ لینا چنانچہ ۳ جولائی ۱۹۴۳ء
کو انہوں نے بلوچستان مسلم لیگ کوئٹہ کے اجلاس میں طلباء
کو مشورہ دیا کہ:

"فی الحال جو سب سے زیادہ ضروری امر
ہے وہ تعلیم ہے علم تلوار سے بھی زیادہ
طاقتور ہوتا ہے. جائیے اور علم حاصل کیجئے۔
ہم جانتے ہیں کہ اگر وقت آجائے تو ہم اپنی
جان اور سب کچھ قربان کر دیں گے لیکن
پہلے اس کی تیاری تو کر لو. ہم بے کار اور
بے مقصد قربانی نہیں چاہتے۔"

یہ خطبہ اس دور کا ہے جب تحریکِ پاکستان شروع
ہو چکی تھی. اور قائد اعظم کو جوان کارکنوں کی اشد
ضرورت تھی، لیکن آپ نے وقتی سیاسی فائدوں کی
خاطر طلباء کے مستقبل سے کھیلنے کی غلطی نہ کی. کیونکہ وہ
جانتے تھے کہ نئی نسل اگر آج تعلیم سے محروم رہی تو پاکستان
کی تشکیل و تعمیر اور مسلم قومیت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا.
نئی نسل کی یہ اہمیت انہوں نے اپنے ایک اور خطبے میں
۸ فروری ۱۹۴۳ء کو کراچی مسلم لیگ شعبۂ خواتین سے
خطاب کرتے ہوئے کہی. انہوں نے فرمایا کہ

"آپ کے پاس اس سے بھی بڑی کامیابی
کی کنجی ہے. وہ کنجی ہے آپ کی آئندہ نسل.
اپنے بچوں کو اس طرح تربیت دیجئے کہ وہ
پاکستان کے قابل فخر شہری اور موزوں
سپاہی بن سکیں. آپ نے پاکستان کے
لئے بہت سی قربانیاں دی ہیں. اس پاکستان
کے لئے جسے اب ساری دنیا ایک مسلمہ حقیقت
تسلیم کر چکی ہے. بس ایک قدم اور آگے
بڑھانا ہے، وہ وقت دور نہیں جب ساری
دنیا کی قومیں پاکستان کی تعریف و توصیف
کریں گی. انشاء اللہ"

تعلیم انسان میں روشن ضمیری اور رواداری کو جنم
دیتی ہے اور معاملہ فہمی کا ادراک پیدا کرتی ہے. اسی وجہ
سے مصلحین نے اس کی ترویج و اشاعت پر زور دیا ہے.
برصغیر جیسے علاقے میں جہاں مختلف قومیں، مختلف نظریات
مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبیں شانہ بشانہ کام کر رہی
ہوں، معاملہ فہمی اور رواداری کی اشد ضرورت ہے کیونکہ
اس کے بغیر کوئی قوم صحیح قیادت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتی.
قائد اعظم ان تمام امور سے بخوبی واقف تھے. اور اسی لئے
وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ نئی نسل تعلیم یافتہ ہو، چنانچہ ۱۵ نومبر
۱۹۴۲ء کو اپنے ایک تاریخی خطبے میں جو انہوں نے آل انڈیا
مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر میں دیا، اس امر پر
اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ

"جب تک آپ طالب علم ہیں، آپ اپنی تمام
کوششوں کو محض تیاری تک محدود رکھیں.
اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیں. آپ کو
لازم ہے کہ طلبائے ہند کی تنظیم کریں اور ان
کی ایک مستحکم اور مضبوط جماعت بنائیں تاکہ
مسلمانانِ ہند کے حقوق کی کامل حفاظت
ہو. آپ کو لازم ہے کہ مسلمانانِ ہند کے

سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی نشوونما
اور ترقی کے لئے ایک لائحہ عمل بنائیں
اور عملی جامہ پہنائیں۔ آپ کا یہ فرض بھی ہے
کہ اسلامی تہذیب کو ہر دلعزیز بنانے میں
کوشاں ہوں اور اس امر کی حوصلہ
افزائی کریں کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں
میں باہمی خیر طلبی اور ایک دوسرے کے حق
میں نیک نیتی پیدا ہو اور وہ ایک دوسرے کے
حال سے اچھی طرح واقف ہوں اور سمجھ لیں کہ
ہمارے بھائیوں کی ضرورتیں اور خواہشیں
کیا ہیں۔ آپ کا ایک اور اہم فرض یہ ہے کہ
ہندوستان اور اسلامی ممالک اور دنیا بھر کے
مسلمان طلباء کے مابین تعاون کی تخلیق کریں۔
میں نے ابھی کہا ہے کہ آپ عملی سیاست میں حصہ
نہ لیں میں اس کی وضاحت کرتا ہوں تاکہ
غلط فہمی کا اندیشہ نہ رہے اور میں چاہتا ہوں
کہ آپ اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کریں جن کے
وسیلہ سے آپ طالب علمی کی زندگی ختم کرنے کے
بعد عملی سیاست کی جدوجہد میں کامیاب ہوں۔
آپ اس وقت اپنے آپ کو تیار اور ضروری
ساز و سامان یعنی علم و آگہی اور توفیق عمل سے
آراستہ کریں۔ آپ کی اولین اور اہم ترین ضرورت
ہے مطالعہ، مطالعہ، مطالعہ۔ اس میں شبہ نہیں
کہ مسلمان طلباء اور عام طور پر مسلمانوں میں عظیم الشان بیداری
پیدا ہوگئی ہے۔ ترقی کی ضرورت کا احساس موجود ہے جوش
خروش ہے طبیعتوں میں ولولے ہیں۔ جذبات
ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ مزاجوں کو محض برانگیختہ
کرنے والے بے مصرف اور بے وزن مقولے بھی
زبانوں پر جاری ہیں جن سے مسحور ہونا ہرگز مفید
نہیں کیونکہ ہندوستان کا مسئلہ انتہائی پیچیدہ
اور مشکل ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں
ملتی۔ چنانچہ آپ اسی صورت میں دوسروں کے
عقیدے بدل سکتے ہیں اور ان کو اپنی راہ پر
لا سکتے ہیں کہ پہلے آپ خود روشن ضمیر بن جائیں
اور معاملے سے کامل طور پر آگاہی حاصل کریں۔
آج کل دانائے راز ہونے کی خاص ضرورت ہے
کیونکہ ہر فرقے اور فریق نے اپنے مقاصد کے
لئے ایک منظم پروپگنڈہ اختیار کر رکھا ہے۔ اکثر
اوقات سچائی بالائے طاق رکھ دی جاتی ہے
اور مدمقابل کے خیالات و خواہشات کی ترجمانی
دیدہ و دانستہ کی جاتی ہے۔"

نئی نسل اور تعلیم کی اہمیت کے علاوہ قائد اعظم نے
مقاصد تعلیم پر بھی اپنے مختلف خطبات میں روشنی ڈالی ہے
اور یہ بتایا ہے کہ آزاد معاشرے میں مقاصد تعلیم کا تعین کیوں
ضروری ہے۔ قائد اعظم نہ تو مفکر تعلیم تھے اور نہ ہی اس علم
کے پروفیسر یا استاد لیکن ایک بالغ نظر مدبر ہونے کی حیثیت
سے وہ جانتے تھے کہ تعلیم کے مقاصد کیا ہونے چاہئیں، وہ
جانتے تھے کہ مقاصد تعلیم کا تعین اس اصول کار کے تحت ہو
کہ تعلیم یافتہ طبقہ معاشرے میں اچھی مثالیں قائم کرے
جو آئندہ نسلوں کے لئے رہنمائی کا کام دے سکیں۔ چنانچہ

۳۰ر نومبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے مقاصد تعلیم کے بارے میں فرمایا کہ

"میں پاکستان کے ہر باشندے اور خاص طور پر اپنے نوجوانوں کو یہ بات اچھی طرح بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ خدمت، ہمت اور برداشت کے سچے جذبے کا مظاہرہ کریں۔ اور ایسی شریفانہ اور بلند مثالیں قائم کریں کہ آپ کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں آپ کی تقلید کریں۔ .... اپنا اخلاق ہر صورت میں بلند رکھو۔ موت سے نہ ڈرو۔ ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے۔ کہ ہمیں موت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لئے ہمیں موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیئے۔ مسلمان کے لئے اس سے بہتر اور کوئی ذریعۂ نجات نہیں ہو سکتا کہ وہ صداقت کی خاطر شہید کی موت مر جائے۔ ...... تعمیر پاکستان کی راہ میں مصیبتوں اور دشواریوں کو دیکھ کر گھبرایئے نہیں، تازہ جوان اور نئی اقوام کی تاریخ میں کئی باب ایسی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں کہ انہوں نے محض قوت ارادی، قوت عمل اور قوت کردار سے خود کو بلند کر لیا۔ آپ خود بھی فولادی قوت کے مالک ہیں اور عزم و ارادے کی دولت میں آپ کی نظیر نہیں ملتی۔ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آپ دوسروں کی طرح، اپنے آباؤ اجداد کی طرح کامیاب نہ ہوں۔ آپ کو صرف مجاہدوں کا سا جذبہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ ایک ایسی قوم ہیں جس کی تاریخ شجاعت کردار اور آہنی ارادے کے لوگوں اور کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی شاندار روایات کے مطابق زندہ رہیئے بلکہ ان میں عظمت و شوکت کے ایک اور باب کا اضافہ کیجئے۔"

اسی طرح قائد اعظم نے ۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے وفد سے ملاقات کرتے وقت انہیں نظم و ضبط پیدا کرنے کی تلقین کی اور مناسب تعلیم اور مناسب تربیت حاصل کرنے پر زور دیا۔ یہ دونوں باتیں مقاصد تعلیم کے ذیل میں آتی ہیں۔ قائد اعظم نے اس موقع پر فرمایا کہ

"پاکستان کو اپنے جوانوں اور بالخصوص طلباء پر فخر ہے جو آزمائش اور ضرورت کے وقت ہمیشہ صفِ اول میں رہے ہیں۔ آپ مستقبل کے معمار ہیں۔ اس لئے جو مشکل کام آپ کے سر پر کھڑا ہے اس سے نبٹنے کے لئے اپنی شخصیت میں نظم و ضبط پیدا کیجئے۔ مناسب تعلیم اور مناسب تربیت حاصل کیجئے۔ آپ کو پورا پورا احساس ہونا چاہیئے کہ آپ کی ذمہ داریاں کتنی زیادہ اور کتنی شدید ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیئے۔"

اسی طرح ۱۲ر اپریل ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم نے اسلامیہ کالج پشاور میں طلباء کو خطاب کرتے ہوئے انہیں ان کے

...ائض بتائے۔ آیئے ہم ان کی اس تقریر کے ایک اقتباس کا جائزہ لیں۔ اور یہ دیکھیں بابائے قوم کیا چاہتے تھے۔ ...پ نے فرمایا کہ

"اب آپ کے فرائض یہ ہونا چاہئیں نظم و ضبط کا گہرا احساس، عمدہ کردار، حقیقی اور عمل پر اکسانے والی تعلیم۔ آپ کو چاہیئے کہ خود کو پورے دل و دماغ کے ساتھ مطالعہ کے لئے وقف کر دیں۔ کیونکہ یہ آپ کی پہلی ذمہ داری ہے۔ اپنی ذات کی طرف، اپنے والدین کی طرف، اپنی مملکت کی طرف۔ آپ کو حکم ماننا چاہیئے۔ کیونکہ صرف اسی طریقہ سے آپ حکم دینا سیکھ سکتے ہیں۔"

دورِ غلامی میں تعلیم درحقیقت سامراج کے ...قاصد کو پورا کرنے کے لئے دی جاتی تھی۔ اس وقت ...فرنگی بازی گروں کا مقصد صرف کالے انگریز پیدا کرنا تھا اور پھر انہیں دفتر میں بابو بنانا اور محنت اور ...سمانی کاموں سے نفرت سکھانا تھا۔ قیام پاکستان کے ...عد قائداعظم کو اس بات کا احساس تھا کہ اب مقاصدِ ...تعلیم ایک انقلابی اور خوش آئند تبدیلی چاہتے ہیں۔ ...دیہ کوئی آزاد مملکت فرسودہ اور غیر قومی نظامِ تعلیم ...کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو قائداعظم ...ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں تقریر کرتے ...ہوئے طلباء کو ہدایت کی کہ وہ یہ سمجھیں کہ وہ صرف دفتر ...کا بابو بننے کے بجائے آزاد شہری بننے کو ترجیح دیں۔ ...قائداعظم نے فرمایا کہ

"پرانے طرزِ تعلیم اور طرزِ حکومت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اچھے پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ کلرک پیدا کئے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کلرک ذرا اونچے اٹھ گئے اور ایک بلند مقام پر فائز ہو گئے یہ حقیقت ہے کہ مقصد اچھے کلرک پیدا کرنا ہی تھا۔ سول سروس میں زیادہ تر خود انگریز رہتے تھے ہندوستانیوں کو سول سروس میں داخل کرنے پر بہت بعد میں عمل کیا گیا بہرحال پورا اصول اور پورا خیال یہ تھا کہ ایک خاص قسم کی ذہنیت، ایک نفسیات، ایک مخصوص ذہنی کیفیت پیدا کی جائے۔ یہ کہ ایک عام آدمی جب بی اے یا ایم اے پاس کرلے تو بس سرکاری ملازمت ڈھونڈتا پھرے اگر ملازمت مل گئی تو بس سمجھ لیا کہ منزل پالی اس سے زیادہ بلندیوں کا تصور بھی نہیں کیا گیا۔ میں جانتا ہوں اور آپ سب جانتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ ایم اے پاس کی آمدنی ٹیکسی ڈرائیور سے کم ہوتی ہے اور سرکاری ملازمین میں سے بیشتر ایسی پست زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ان سے کہیں اچھی ایسے لوگ بسر کر رہے ہیں جو پرائیویٹ اداروں میں ادنیٰ ملازمتوں پر کام کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اب اس پرانے ڈھرے سے نکلیں اس ذہنیت کو دور کریں۔ اب آپ آزاد پاکستان میں ہیں۔ حکومت ہزارہا لوگوں کو نہیں لے سکتی۔ یہ ناممکن ہے۔ سرکاری ملازمت حاصل کرنے کی تنگ حدود میں ایک طرح کی مقابلہ بازی شروع

ہو جاتی ہے جس سے احساس کمتری میں
مبتلا ہونا ناگزیر ہے۔ حکومت میں صرف
کچھ لوگوں کی کھپت ہو سکتی ہے اور جن باقی
لوگوں کو کوئی سرکاری ملازمت نہیں ملتی
وہ ہمیشہ اپنی مایوسی اور ناکامی کی وجہ سے
ایسے لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں جو حکومت
کے خلاف نعرہ بازی کرکے اپنا الو سیدھا
کرنا چاہتے ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ اب آپ کی توجہ،
آپ کا ذہن، آپ کے مقاصد، آپ کی
تمناؤں کا رخ 'دوسرے راستوں'
دوسرے میدانوں اور دوسری منزلوں
کی طرف ہونا چاہیئے جو آپ کے لئے کھلی
پڑی ہیں اور رفتہ رفتہ کھلتی جائیں گی۔
دستی کام اور محنت کرنے میں کوئی عار نہیں
ہونا چاہیئے۔ ہمارے یہاں ٹیکنیکل تعلیم کی
زبردست گنجائش ہے۔ کیونکہ ہمیں کاریگروں
اور ہنرمندوں کی اشد ضرورت ہے۔ آپ
معاشیات، بنک کاری، تجارت، بیمہ کاری
اور قانون وغیرہ کی تعلیم حاصل کرسکتے ہیں
جن سے کئی امکانات ترقی پیدا ہو گئے
ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ نئی صنعتیں قائم
ہو رہی ہیں۔ کارخانے لگ رہے ہیں نئے
بنک، بیمہ کمپنیاں اور نئے تجارتی ادارے
کھل رہے ہیں۔ یہ آپ کے سامنے کھلے
ہوئے نئے میدان ہیں۔ اور نئے راستے
نئی منزلوں کی طرف لے جانے والے۔
ان کے متعلق غور کیجئے، توجہ کیجئے۔ میں
آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سرکاری
ملازمت کی نسبت کہیں زیادہ فائدے میں
رہیں گے۔ سرکاری ملازمت میں کیا رکھا ہے؟
صبح سے شام تک کلرکانہ ذہنیت میں گھرے
رہنا اور انتہائی تکلیف دہ اور سوہان روح
حالات میں زندگی بسر کرنا۔ اگر آپ تجارت،
کاروبار اور صنعت و حرفت کی راہ پر
چلیں گے تو آپ زیادہ خوش رہیں گے۔ نہ
صرف خوش بلکہ خوشحال بھی اور خوشی اور
خوشحالی کے مزید مواقع ہر وقت آپ کے
منتظر رہیں گے۔ اس سے نہ صرف آپ ہی
کو فائدہ پہنچے گا بلکہ پاکستان کو بھی
فائدہ ہوگا۔"

قیام پاکستان سے پہلے جب کہ ہم انگریزوں کے
غلام تھے، مسلمان عام طور پر نظری تعلیم کو اہمیت دیتے
تھے۔ سائنس، کامرس، ٹیکنالوجی، طب اور بنک کاری
وغیرہ مضامین مسلمان طلبا بہت کم اختیار کرتے تھے
اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سو سال کے قلیل عرصہ میں مسلمان
سائنسی علوم میں دیگر اقوام یہاں تک کہ ہندوؤں سے
بھی پیچھے رہ گئے۔ لیکن آزادی کے بعد مملکت خداداد
پاکستان کو سائنسدانوں، انجینیروں، بنک کاری
بیمہ کے منتظمین اور تجربہ کار تاجروں کی اشد ضر

بڑی۔ قائداعظم ملک کے حالات کے پیش نظر نہ صرف یہ جانتے بلکہ سمجھتے تھے کہ اب ہمارے ملک میں طلبا ر کا رجحان نظری تعلیم کے بجائے فنی علوم کی تعلیم کی طرف ہونا چاہیئے تاکہ نئی نسل، نئی خداداد مملکت کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے قائداعظم نے ۱۲ اپریل ۱۹۴۸ء کو اسلامیہ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"میرے نوجوان دوستو۔ اب تمہیں اس ضروری اور بنیادی تبدیلی کا پورا پورا احساس ہونا چاہیئے جو اس خطہ میں حال ہی میں ہوئی ہے۔ اب اپنی شخصیت کو محض سرکاری ملازم بننے کے خول میں محدود نہ کیجئے۔ جیسا کہ اب تک سب ہی اس کی تمنا کرتے رہے ہیں۔ اب نئے میدان، نئے راستے اور نئی منزلیں آپ کی نگاہ شوق کی منتظر ہیں۔ سائنس، تجارت، بنک، بیمہ، صنعت و حرفت اور فنی تعلیم کے شعبے آپ کی توجہ اور تجسس کے محتاج ہیں۔"

نئی نسل کی سائنس سے دلچسپی قائداعظم کے لئے کوئی معمولی بات نہ تھی، اسی لئے وہ قیام پاکستان کے بعد نوجوانوں کی توجہ اس طرف مبذول کراتے رہے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے بغیر جدید دور میں دوسری اقوام کے ساتھ چلنا اور ترقی کرنا محال ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا ہے جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہو بلکہ ہمارے مزاج کے مطابق ہو کیونکہ اسی طرح ہم زمانے کی رفتار کا ساتھ دے سکیں گے۔ چنانچہ ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کراچی کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے کہا کہ

"تعلیم اور صحیح قسم کی تعلیم کی اہمیت ہم سب پر واضح ہے۔ ایک صدی سے زائد عرصہ تک غیر ملکی تسلط کا قدرتی نتیجہ ہے کہ ہم لوگوں کی تعلیم پر مناسب توجہ نہیں دی گئی۔ اگر ہمیں حقیقی، تیز رفتار اور نتیجہ خیز ترقی کرنی ہے تو ہمیں تعلیم کے مسئلہ پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔ اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا چاہیئے جو ہم لوگوں کے مزاج کے مطابق ہوں، جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہوں، جو دنیا بھر میں ہونے والی وسیع ترقیوں اور جدید تقاضوں کے مطابق ہوں۔ پاکستان کی ترقی کا انحصار زیادہ تر طرز تعلیم پر ہے۔ یعنی ہم کیونکر اپنے بچوں کو پاکستان کے سچے خدمت گزار بناتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد محض کتبی نہیں ہوتا اور ہمارے یہاں کتبی تعلیم بھی بہت کمزور اور ناقص ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کی توانائیوں کو ایک راہ پر لگائیں۔ اور آنے والی نسلوں کے کردار کی

تعمیر اچھی سے کریں۔ اس امر کی فوری اعلیٰ
اشد ضرورت ہے کہ ہمارے جوانوں کو
سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعلیم
دی جائے کیونکہ اسی سے ہماری مستقبل
کی معاشی زندگی کا معیار بلند ہونے کی
امید ہے۔ حصول تعلیم کے بعد لوگوں کو
تجارت، کاروبار اور صنعت و حرفت میں
داخل ہونا چاہیئے۔ یاد رکھئے ہیں دنیا
کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے جو
انتہائی تیزی سے خود کو بدلتی چلی رہی ہے"

کسی قوم کی ترقی کے لئے اس کی خواتین کا تعلیم یافتہ
ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ خواتین نہ صرف قوم کا نصف
حصہ ہوتی ہیں بلکہ قومی کردار اور قومی کردار کی تعمیر
اور اس کے تشخص میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔
ان کو ساتھ لئے بغیر دور جدید میں کسی طرح بھی ترقی
نہیں کی جا سکتی۔ قائد اعظم ان کی اس حیثیت اور
کردار سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ تحریک پاکستان کی
جدوجہد کے دورِ شباب میں بھی قائد اعظم نے خواتین
کی معاشرے میں نشاندہی کی اور ان میں انقلابی تبدیلیوں
کو نیک فال قرار دیا۔ انہوں نے اسی مقصد کے پیش نظر
۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو مسلم کنونشن دہلی میں خطاب کرتے
ہوئے فرمایا کہ

" خوشی کی بات ہے کہ مسلمان خواتین میں
بھی انقلابی تبدیلی ہو رہی ہے۔ یہ تبدیلی
بہت اہمیت رکھتی ہے۔ دنیا میں کوئی قوم
اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک
اس قوم کے مردوں کے ساتھ ہی ساتھ عورتیں
بھی آگے نہ بڑھیں۔"

اس طرح قیام پاکستان کے بعد بھی قائد اعظم خو
کو نظر انداز نہ کر سکے۔ وہ جانتے تھے کہ جدید آزاد ا
خداداد مملکت میں عورتوں کا کیا مقام ہے۔ چنانچ
ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے ۲۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو
تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ:۔

" قوم کی تعمیر اور اس کے استحکام کے
عظیم اور کٹھن کام کے سلسلہ میں خواتین کو
انتہائی اہم کام کرنا ہے۔ خواتین قوم کے
نوجوانوں کے کردار کی معمار ہوتی ہیں جو مملکت
کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔
میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ حصول پاکستان کی
طویل جدوجہد میں مسلمان خواتین اپنے مردوں
کے پیچھے مضبوطی سے ڈٹی رہی ہیں۔ تعمیر پاکستان
کی اس سے کہیں سخت اور بڑی جدوجہد میں جس
کا ہمیں اب سامنا ہے، یہ نہ کہا جائے کہ پاکستانی
خواتین پیچھے رہ گئیں۔ یا اپنا فرض ادا کرنے سے
قاصر رہیں۔"

تعلیم، مقاصد تعلیم اور طرز تعلیم کے علاوہ طالب
کی زندگی کا انتہائی نازک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہم جو
ہے، جوانی کے جذبات اعلیٰ مصروفیات چاہتے ہیں جو
ہوش سے محروم ہو جاتا ہے۔ عام سیاستداں جوانوں
اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور ان کے شعور کو

پختہ ہونے سے قبل ہی انہیں جذباتی سیاست کی آگ
میں جھونک دیتے ہیں۔ اس عمل سے نہ صرف طلبا کا مستقبل
تباہ ہوتا ہے۔ بلکہ قوم و ملک کو بھی شدید نقصانات
اٹھانے پڑتے ہیں۔ بیسویں صدی کی اس آخری دہائی
میں سیاست میں طلباء کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔
لیکن قائداعظم جانتے تھے کہ جوش کے لئے ہوش ضروری
ہے اور عملی سیاست کے لئے سیاست کا علم اور تربیت
ضروری ہے ورنہ قوم جذباتی سیاست کے نتیجہ میں انتشار
کا شکار ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر
ہے کہ طالب علم اور سیاست کے موضوع پر قائداعظم
نے قیام پاکستان کے بعد جب بھی خطاب کیا اس کے
لئے ڈھاکہ یا ڈھاکہ یونیورسٹی کا انتخاب کیا۔ غالباً
ان کی مدبرانہ نظر نے یہ پہچان لیا تھا کہ اگر نئی نسل
نے جذباتی سیاست میں حصہ لیا تو سب سے زیادہ نقصان
مشرقی بنگال ہی کو ہوگا۔ چنانچہ ۲۱ر مارچ ۱۹۴۸ء کو
ڈھاکہ میں جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے
طلبا کو مشورہ دیا کہ

"میرے نوجوان دوستو۔ میں آپ کو خبردار
کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کسی سیاسی جماعت
کے آلۂ کار بن گئے تو یہ آپ کی سب سے بڑی
غلطی ہوگی۔ یاد رکھئے اب ایک انقلابی
تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ اب ہماری اپنی
اپنی حکومت ہے۔ اب ہم ایک آزاد اور
خود مختار مملکت کے مالک ہیں۔ اب ہمیں
آزاد لوگوں کی طرح عمل اور اپنے معاملات
کا انتظام کرنا چاہیئے۔ اب ہم کسی بیرونی طاقت
کے تسلط میں نہیں ہیں۔ ہم نے وہ زنجیریں توڑ
دی ہیں۔ ہم نے غلامی کی بیڑیاں کاٹ ڈالی
ہیں۔ میرے نوجوان دوستو۔ اب میں آپ
ہی کو پاکستان کا حقیقی معمار سمجھتا ہوں۔ اور
دیکھ رہا ہوں کہ آپ اپنی باری پر کیا کچھ کر کے
دکھاتے ہیں۔ اس طرح رہیئے کہ کوئی آپ کو
گمراہ نہ کر سکے۔ کوئی آپ کو غلط طور پر استعمال
نہ کر سکے۔ اپنی صفوں میں مکمل اتحاد اور استحکام
پیدا کیجیئے۔ ایک مثال قائم کر دیجئے کہ نوجوان
کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ کا اصل کام کیا ہونا
چاہیئے۔ اپنی ذات سے وفا، اپنی مملکت سے
وفا، اور اپنے مطالعہ پر کامل توجہ۔"

اسی طرح تین دن کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی
کے جلسۂ تقسیم اسناد منعقدہ ۲۴ر مارچ ۱۹۴۸ء کو
خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ۔

"آپ کی بھلائی، آپ کے والدین کی بھلائی
بلکہ ساری مملکت کی بھلائی اس میں ہے کہ
آپ کی توجہ صرف تحصیل علم کے لئے وقف رہے۔
صرف اس طرح آپ خود کو زندگی کی جنگ کے
لئے مسلح کر سکتے ہیں اس زندگی کی جنگ کے لئے جو عنقریب
آپ کو پیش آنے والی ہے صرف
اس طریقے سے آپ اپنی مملکت کے
لئے طاقت اور فخر کا سرچشمہ بن سکتے ہیں۔
اور ان مسائل کے حل کرنے میں مدد دے
سکتے ہیں جو اس مملکت کو معاشرتی اور معاشی

میدان میں در پیش ہیں۔ صرف اس صورت
سے آپ اسے دنیا کی ایک عظیم ترین اور ترقی
یافتہ قوم بنا کر منزل مقصود تک پہنچا سکتے ہیں۔"

طلباء اور سیاست کے موضوع پر قیام پاکستان
کے بعد کی تقریروں سے شبہ ہو سکتا ہے کہ قائداعظم
نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنے اقتدار کے تحفظ
کے لئے اس طرح کا مشورہ دیا ہوگا۔ لیکن جو لوگ قائد
اعظم کی سیرت سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ
قائداعظم وقتی مصلحتوں کی خاطر اپنے نظریات نہیں
بدلتے تھے لیکن رفع شک کے لئے یہ وضاحت ضروری
ہے کہ قائداعظم نے یہ مشورہ متواتر قیام پاکستان سے
قبل بھی طلباء کو دیا۔ یہاں ہم اسی لئے ان کی ایک تقریر
سے جو مارچ ۱۹۴۱ء کی ہے، ایک اقتباس نقل کرتے
ہیں۔ اس میں آپ نے پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن لاہور
میں خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہوئے کہا کہ

"میرے نوجوان دوستو۔ سب سے پہلے
آپ کو تعمیر قوم کے ادارات میں محنت کی
داد دینا ہوگی۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ ادارات
کون سے ہیں اور کیا ہیں۔ مجھے میں آپ کو
بتاتا ہوں۔ دنیا میں کم از کم تین رکن ایسے
ہیں جو کسی قوم کو صاحب مملکت اور لائق
حکومت بننے کا حقدار ٹھیراتے ہیں۔ ان
میں سے ایک تعلیم ہے۔ تعلیم کے بغیر آپ ایسی
حالت میں ہوں گے جیسا کہ کوئی رات پنڈال
کے اندر اندھیرے میں تھے اور اگر تعلیم ہوگی
تو آپ کی کیفیت اس وقت کی سی ہوگی
کہ روز روشن میں بیٹھے ہیں۔"

قائداعظم کو یہ شدید احساس تھا کہ ہمارا معاشرہ
فرسودہ ہو چکا ہے اور یہ کہ عام انسان کا معیار
زندگی بلند کئے بغیر اصلاحات کے تمام خواب بے معنی
ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عام آدمی کے تمام مسائل
کا حل علم اور فن کے مطالعہ اور ترقی سے وابستہ ہے۔
چنانچہ ۸ را پریل ۱۹۴۸ء کو ایڈورڈ کالج پشاور میں
خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ

"ہمارے کالجوں کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ
زراعت، حیوانیات، انجینیری، طب اور دوسرے
فنی اور خصوصی مضامین میں اول درجے کے
ماہرین پیدا کریں۔ صرف اسی طریقے سے
ہم ان مسائل کا کوئی ٹھوس حل نکال سکیں گے
جو عام آدمی کا معیار بلند کرنے میں پیش
آرہے ہیں۔"

قائداعظم نے ایک قائد کی حیثیت سے مختلف
تعلیمی اداروں کا دورہ بھی کیا اور ان اداروں کے
طلباء و طالبات سے خطاب بھی کیا۔ اور ان کے طریقۂ
تعلیم اور طرز تعلیم پر رائے بھی دی، یہاں تک کہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا جس کو چھوٹا پاکستان کہا جاتا تھا
ہر سال دورہ کرتے اور وہاں کے طلباء اور اساتذہ سے
تبادلۂ خیالات کرتے۔ تحریک پاکستان میں علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی نے جو کردار ادا کیا اسی کے پیش نظر قائداعظم
نے اسے پاکستان کا اسلحہ خانہ کہا تھا۔ قائداعظم جہاں

ایک طرف سرسید تحریک اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے
متاثر تھے۔ تو دوسری طرف جیسا کہ ان کے خطبات کے
مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی کے
طریقۂ تعلیم اور نظام تعلیم سے بھی بہت متاثر ہوئے۔
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی
کہ اس نے مسلم قومیت کی امتیازی حیثیت کو طریقۂ تعلیم
اور نظام تعلیم میں نمایاں کیا تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۴۶ء
میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے جشن سیمیں کے
موقع پر جو اوکھلا (جامعہ نگر) میں منعقد ہوا تھا، قائد
اعظم نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

"جامعہ ایک ایسا ادارہ ہے جو ترقی
کی منازل طے کرتا جا رہا ہے۔ اب یہ بلاشبہ
مسلمانوں کی قومی یونیورسٹی بن چکا ہے۔ یہ
مسلمانوں کی قومی تحریک کا موید ہے اور
ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی جامعہ
کی مثال قابل تقلید ہوگی۔ آپ نے ایک
ایسا ادارہ قائم کیا ہے جو ایک صحیح طرز
تعلیم کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔"

قائداعظم نے نئی نسل کی تعلیمی ترقی کے لئے
جو راہیں متعین کیں اور جن کا جستہ جستہ مواد، اقتباسات
کی صورت میں گذشتہ اوراق میں دیا ہے، ان کے مطالعہ
سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

۱۔ قائداعظم اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ
جدید نظام تعلیم اس طرح مرتب کیا جائے کہ اس کی اساس
مذہب، اخلاق، تہذیب اور شائستگی پر ہو۔ وہ چاہتے
تھے کہ تعلیم یافتہ نوجوان ایک بہتر انسان بنیں اور ان کی
سیرت و کردار اور انداز فکر میں مذہب اور اسلامی
اقدار رچی بسی ہوں۔

۲۔ طریقۂ تعلیم اس طرح ہو کہ نئی نسل اپنے دور
اور اپنے مسائل سے باخبر ہو اور ان کو حل کرنے کی صلاحیت،
استعداد اور حوصلہ رکھتی ہو۔

۳۔ طریقۂ تعلیم ایسا پرکشش اور ہمہ وقت ہو کہ
طلبا صرف تعلیم کی لگن رکھیں۔ ان میں یہ شعور ہو کہ
دوران تعلیم وہ خود کو طالب علم سمجھیں۔ وہ طالب علمی
کی عمر کی قدر پہچانیں اور جلد سے جلد اعلیٰ اور کارآمد تعلیم
حاصل کر کے ملک و قوم کی خدمت کر سکیں۔

۴۔ وہ انگریزوں کے جاری کردہ نصاب تعلیم کو یکسر
ناکارہ سمجھتے تھے۔ اور ایسا نصاب تعلیم جاری کرنا چاہتے
تھے کہ فوری ضرورتوں کے حساب سے توازن اور اعتدال
کے ساتھ کارآمد نوجوان دستیاب ہو سکیں۔

۵۔ وہ نصاب تعلیم کو تمام شعبہ ہائے حیات سے
مربوط رکھ کر ایسے تعلیم یافتہ افراد حاصل کرنا چاہتے تھے
جو ملک کی فنی اور غیر فنی ضروریات پوری کر سکیں۔

پاکستان اس وقت تعمیر نو کے دور سے گزر رہا ہے۔
مملکت کے مختلف اداروں کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں۔
اسی طرح تعلیم بھی اس دور کا ایک اہم موضوع بن گئی ہے
تعلیم کا تعلق مستقبل سے ہے اور اس کے اثرات صدیوں
تک چلتے ہیں۔ اس لئے ایک باشعور قوم ہونے کی حیثیت
سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنے ذہنوں کو تعلیم، مقاصد
تعلیم، طریقۂ تعلیم اور ذریعۂ تعلیم کے بارے میں صاف

رکھیں۔ ان تمام موضوعات پر قائدِاعظم نے اپنے مختلف خطبات میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ ہم کو نشان راہ بتا دیئے ہیں۔ اور تعلیمی فکر اور فلسفے کی بنیادیں استوار کر دی ہیں۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم جدید مملکت کی تعمیرِ نو کرتے وقت قائداعظم کے نظریات سے فائدہ اٹھائیں اور ان کو مشعلِ راہ بنائیں تاکہ نقصانات سے محفوظ کریں۔ درحقیقت یہ ایک لمحۂ فکر ہے ہم سب کے لئے جن کے سپرد مستقبل کی تعمیر ہے۔

قائداعظم کی خاص صفات

از جناب وارث سرہندی ایم اے

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

علامہ اقبال مرحوم نے مندرجہ بالا شعر میں ایک قائد یا رہنما کی تین خاص اور اہم صفات بیان کی ہیں یعنی بصیرت، خوش بیانی اور ہمدردی۔ یہ واقعی نہایت ضروری اور ناگزیر صفات ہیں جن کے بغیر کوئی راہ نما منصب راہ نمائی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

صاحب بصیرت ایک راہ نما کے لئے صاحب بصیرت ہونا ضروری ہے تاکہ وہ قوم کے ماضی، حال اور مستقبل پر گہری نظر رکھ سکے۔ ماضی سے کما حقہ، واقفیت کے بغیر حال کو سدھارنا ناممکن نہیں ہے، کیونکہ ماضی کے مطالعہ سے ہی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قوم نے کن اصولوں پر عمل کر کے ترقی کی اور کن غلطیوں کا ارتکاب کر کے نقصان اٹھایا۔ ان تمام مضر اور مفید عوامل سے پوری طرح باخبر ہونے کے بعد ہی حال کے لئے کوئی ایسا لائحہ عمل مرتب کیا جا سکتا ہے۔ جو مضرت سے پاک اور افادیت کا حامل ہو۔ قرآن حکیم میں جا بجا امم سابقہ کے احوال و واقعات بیان کئے گئے ہیں تاکہ ہم ان سے سبق حاصل کریں، اور ان غلطیوں کا اعادہ نہ کریں جو ملل سابقہ کو تباہی کی طرف لے گئیں بلکہ وہ راہ عمل اختیار کریں جو کامیابی اور فوز و فلاح کی راہ ہے۔ بالفاظ دیگر ماضی سے رشتہ منقطع کر کے حال کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اگر حال اچھا ہو تو مستقبل خود بخود سنور جاتا ہے، کیونکہ عموماً مستقبل حال کے افعال و اعمال کا منطقی نتیجہ ہوتا ہے۔ تاہم حال پر نظر ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کا صحت مند اور دور اندیشانہ تصور ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مستقبل میں بعض ایسے موڑ آ سکتے ہیں۔ جن کا اندازہ عام اور کوتاہ بیں شخص نہیں لگا سکتا اور ان کی وجہ سے بعض ایسے اعمال و افعال جو بادی النظر میں مفید معلوم ہوتے ہیں نتائج کے اعتبار سے نقصان دہ اور ترقی کی راہ میں حائل ہو سکتے ہیں۔ ایک صاحب بصیرت

انسان ان امکانات کو نظر انداز نہیں کرتا اور ایسا لائحۂ عمل مرتب کرتا ہے جن میں ایسے امکانات کو ملحوظ رکھ کر صحیح راہِ عمل متعین کی جاتی ہے۔ ورنہ کوتاہ نظری کے باعث بظاہر جیتی ہوئی اور طاقت ور بازی بھی انجام کار مات ہوسکتی ہے۔ شاطروں کے متعلق سنا ہے کہ وہ کوئی چال چلنے سے پہلے آئندہ دس چالوں پر نظر رکھتے ہیں۔ جو شاطر صرف ایک ہی چال پر نظر رکھتا ہے۔ وہ انجام کار مات کھا جاتا ہے۔ اسی بصیرت کا ذکر علامہ اقبال نے اپنے ایک اور شعر میں بہت دلنشیں انداز میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو الہام ہوتا تھا یا وہ عالم الغیب تھے، بات یہ ہے کہ کوئی حادثہ یا اچانک واقعہ حقیقت میں اچانک اور اسباب سے معریٰ نہیں ہوتا ..... یہ الگ بات ہے کہ عام لوگوں کی نظر ان اسباب پر نہیں ہوتی اور وہ اس کو اچانک اور خلاف فطرت و عادت سمجھ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو نظام قائم کیا ہے اور جو فطرت تشکیل دی ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی فطرت کو اللہ تعالیٰ نے سنت اللہ قرار دیا ہے۔ اور یہ واضح کردیا ہے کہ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ حالات و واقعات خواہ کیسے ہی محیر العقول اور تعجب خیز ہوں وہ اصول فطرت کے عین مطابق اور نظام اسباب و نتائج کے تابع ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ دنیا دارالاسباب ہے۔

فی الحقیقت اہل بصیرت وہی لوگ ہوتے ہیں جو اصو[ل] فطرت سے آگاہ ہوتے ہیں اور مخفی اسباب پر نظ[ر] رکھتے ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے بظاہر غی[ر] معمولی نتائج کو قبل از وقت بھانپ لیتے ہیں۔ اس[ے] وجدان کہہ لیجئے یا الہام کا نام دے لیجئے مگر حقیقتاً بصیرت اسی کا نام ہے اور یہ بصیرت کسبی نہیں و[ہبی] ہے، یہ اللہ کی دین ہے۔ جسے چاہے وہ نواز د[ے]۔ بہر حال اگر کسی قائد یا زعیم قوم میں یہ خوبی موج[ود] نہیں تو وہ کسی طرح بھی قوم کی قیادت و سیادت ک[ا] اہل نہیں ہوتا۔ اگر ایسے شخص کو قیادت و سیاد[ت] تفویض کردی جائے تو وہ اس قوم کی بدبختی ہو[گی] اور اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں نک[لتا]۔

سخن دلنواز کو علامہ مرحوم نے راہنما کی دوس[ری] صفت قرار دیا ہے۔ یہ بھی اپنی[جگہ] اہم ہے۔ اگر کسی قائد کو بات کہنے کا سلیقہ نہیں آ[تا] تو وہ کیسا ہی صاحب نظر اور پیش بیں ہو۔ قوم[کو] متاثر نہیں کرسکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی متعین کی ہوئی راہِ عمل کو اختیار نہیں کرتی۔ ا[ور] اس کی بصیرت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ بع[ض] لائق اور اہل نظر زعما محض اس بنا پر ناکام[رہے] کہ وہ سخن دلنواز کی نعمت سے محروم تھے۔ اس کم[ی] کی وجہ سے وہ قوم کو اپنے خیالات و نظریات قب[ول] کرنے پر آمادہ نہ کرسکے۔ حالانکہ ان کے نظریا[ت] بہت وقیع اور عمدہ تھے اور ان کو قبول کرلینے [کی] صورت میں قوم بہت ترقی کرسکتی تھی۔ بات وہ[ی]

ا اپنے خیالات کو دلنشیں انداز میں پیش نہ کرسکے۔
غالبؔ نے اپنے مندرجہ ذیل شعر میں تقریر کی
خوبی یوں بیان کی ہے۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یہ خوبی اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے، جب ادراک
حقیقت اور بصیرت کے ساتھ ساتھ پیرایۂ اظہار حسین
دلنشیں ہو۔ اس کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا
ہے کہ بڑے بڑے حکماء و فلاسفہ کے پر مغز و حکیمانہ
اقوال و افکار سے لوگ اتنے متاثر نہیں ہوتے،
جتنے ایک خوش بیان شاعر کے کلام سے متاثر ہوتے
ہیں۔ شعر و ادب کو ہر ملک اور ہر قوم میں اس لئے
مقبولیت حاصل ہو رہی ہے کہ یہ خیالات کو دلپذیر
دلنواز پیرایۂ اظہار مہیا کرسکتا ہے۔

دُور کیوں جائیے۔ علامہ اقبال کی مثال
ہمارے سامنے ہے۔ علامہ مرحوم عوام میں اس لئے
مقبول نہیں ہوئے کہ وہ بہت بڑے مفکر اور دانشور
تھے بلکہ ان کی مقبولیت کا اہم اور نمایاں سبب یہ
تھا کہ وہ خوش فکر ہونے کے ساتھ ساتھ خوشگو
شاعر بھی تھے۔ ان کی خوش فکری اور خوش گوئی نے
ان کے کلام میں ایسی ندرت اور دل آویزی پیدا
کی جس نے ان کو عوام و خواص میں یکساں طور پر
مقبول و محبوب بنا دیا۔ اگر علامہ مرحوم محض خوش
فکر اور بلند خیال مفکر ہوتے اور خوش بیانی کی
صفت سے محروم ہوتے تو وہ خواص میں تو ضرور
عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے مگر عوام
کے دلوں میں گھر نہ کرسکتے۔ خواص کی بات چھوڑیئے،
کہ ان کی تعداد ہمیشہ گنی چنی ہوتی ہے۔ اس لئے محض
ان کے بل پر کسی قوم کی ترقی و تعمیر نہیں ہوسکتی۔
تاوقتیکہ عوام ساتھ نہ دیں۔ عوام کو ساتھ ملانے کے
لئے ضروری ہے کہ انداز بیان دلکش اور سادہ ہو،
اس میں اغلاق اور پیچیدگی نہ ہو۔ جو کلام محض دماغ
کو متاثر کرے وہ عوام میں مقبول نہیں ہوسکتا، کیونکہ
عوام دماغ کے بجائے زیادہ دل سے کام لیتے ہیں اور افکار سے
زیادہ جذبات کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔

علامہ اقبال کے خطبات کی پُر مغزی اور
فکر انگیزی سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ بلاشبہ یہ
خطبات افکار و علوم کا گنجینہ ہیں، لیکن یہ عوام کی
ذہنی سطح سے بلند ہیں۔ ان سے ارباب دانش و بینش
ہی لطف و فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر علامہ مرحوم شاعری
کو ذریعہ اظہار نہ بناتے اور اسی طرح کے خطبات ہی کو
ذریعہ ابلاغ سمجھتے تو وہ کبھی بھی عوام میں مقبول نہ ہوسکتے۔
سازِ سخن کو بہانہ بنا کر ہی علامہ عوام میں مقبولیت
حاصل کرسکے اور اس طرح قوم میں شعورِ ذات اور
احساس زیاں پیدا کرسکے۔ جو تعمیر و ترقی کے لئے
ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ محض لفاظی
اور خوش بیانی کافی ہے۔ بلکہ یہ کہنا مقصود ہے کہ عمدہ
و اعلیٰ افکار و نظریات کا پیرایۂ بیان بھی اگر حسین و
دلنشیں ہو تو سونے پہ سہاگہ ہو جاتا ہے اور عوام
و خواص اس خوش نما لباس میں پیش کردہ افکار عالیہ

کو جلد قبول کر لیتے ہیں اور ان سے مستفید و مستفیض ہو سکتے ہیں۔ بے مغز لفاظی کسی کام کی نہیں ہوتی۔ اگرچہ وقتی طور پر یہ بھی متاثر کرتی ہے۔ جس طرح کہ جوش ملیح آبادی کی شاعری ہے کہ الفاظ بہت حسین مگر معنویت ندارد۔ چونکہ شاعر فکری طور پر ہی ذہین ہے۔ اس لئے تکرار خیال اور لفظی بازی گری پر اپنی شاعری کی عمارت استوار کی ہے جو بظاہر بڑی شاندار اور پرشکوہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر بنیاد میں کھوکھلی ہے۔ چنانچہ ایسی شاعری پر شعر پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود کی مثال صادق آتی ہے۔ جس خوبصورت پیرایۂ بیان کی پشت پر بلند افکار بھی ہوں اس کی مقبولیت دیرپا اور اس کی عمر طویل ہوتی ہے۔ کسی شاعر، ادیب اور مفکر کے فن پاروں کی عمر ان میں پیش کردہ افکار و خیالات کی گیرائی اور گہرائی کے مطابق ہوتی ہے۔ جب تک ان افکار کی گرفت حالات پر مضبوط رہتی ہے وہ فن پارہ زندہ رہتا ہے۔ اور جب یہ گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے تو فن پارہ گلدستۂ طاق نسیاں بن جاتا ہے، خواہ وہ فن پارہ اپنے زمانہ میں شاہکار ہی کیوں نہ سمجھا جاتا ہو۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ذوق اور غالب کے کلام پر نظر ڈال لیجئے۔ ذوق اپنے زمانہ کا خوش گو شاعر تھا۔ وقت کے محاورہ اور روزمرہ پر کامل عبور رکھتا تھا۔ زبان کی نزاکتوں اور بیان کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر تھا اس لئے اپنے عہد کا مقبول ترین شاعر تھا۔ ہندوستان میں ہر طرف ذوق کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا۔ سرکار دربار میں بھی اسے ممتاز اور قابل رشک مقام حاصل تھا۔ مگر کم و بیش نصف صدی کی مدت میں اس کی کمان اتر گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ ذوق کے کلام میں افکار کی بلندی اور گہرائی کا فقدان تھا۔ اس کے خیالا سطحی اور موضوعات وقتی دلچسپی کے حامل تھے۔ اس لئے جب وہ وقت گزر گیا تو اس کے کلام کی کشش بھی ختم ہو گئی۔ بالفاظ دیگر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ذوق خوش گو ضرور تھا مگر خوش فکر نہ تھا یا اس کی خوش فکری بہت محدود تھی۔ زیادہ صحیح لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے۔ کہ ذوق زبان کا شاعر تھا۔ فکر و خیال کا شاعر نہ تھا اس کی شاعری کی بنیاد روزمرہ اور محاورہ کے چٹخارے پر تھی۔ جو شاعری محض زبان و بیان تک محدود ہوتی ہے اس کی گرفت سطحی اور اوپری ہوتی ہے اس لئے اس کی عمر بھی کوتاہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایسا شاعر مروجہ زبان اور محاورہ کے تابع ہوتا ہے۔ اور خلاق معنی نہیں ہوتا۔ زبان ارتقا کے عمل سے گزرتی ہے۔ بیان کے نئے سانچے بنتے ہیں اور پرانے اسالیب متروک ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جس شاعری کی بنیاد محض پرانے اسالیب بیان اور زبان کے متروک سانچوں پر ہوتی ہے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی متروک ہو جاتی ہے۔ ذوق کے مقابل غالب تھا جو اپنے زمانہ میں اتنا مقبول نہ تھا۔ مگر آج چار دانگ عالم میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کا کلام افکار عالیہ اور خیالات نادرہ کا حامل ہے۔ غالب نے جو یہ کہا تھا ؎

کو کیم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

تو یہ اس کی بصیرت اور پیش بینی کی دلیل ہے۔ غالب نے اپنی بصیرت کی بدولت آئندہ نسلوں کی ذہنی سطح اور رجحان طبع کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس لئے پورے یقین کے ساتھ یہ پیش گوئی کر سکا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غالب نے زبان و بیان کی طرف توجہ نہیں دی۔ غالب کی زبان آج بھی سند کا درجہ رکھتی ہے اور معیار سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ اس وقت غالب کی زبان کسی قدر اجنبی اور نامانوس محسوس ہوتی تھی کیونکہ وہ محض زبان کا شاعر نہیں تھا کہ زبان کے مروجہ سانچوں میں سمٹ کر رہ جاتا بلکہ وہ خلاق معنی تھا۔ جو بلند اور گہرے خیالات وہ پیش کر رہا تھا، زبان کے مروجہ سانچے ان کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے اس کو اپنے خیالات و افکار کے ابلاغ کے لئے نئی تراکیب وضع کرنے اور نئے الفاظ تراشنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لئے اس نے اپنی شاعری کے لئے زبان بھی ایجاد کی۔ وہ محض ماہر زبان نہ تھا بلکہ زبان کا موجد اور خالق بھی تھا۔ اس لئے جو تراکیب وضع کیں، وہ بہت خوبصورت اور جو الفاظ تراشے وہ بہت خوش آہنگ اور پُرمعنی ہیں۔ اس لئے اس کے اسلوب میں جدّت و ندرت کے ساتھ ساتھ دلکشی و دلآویزی بھی پیدا ہو گئی۔ اس کی رعنائی خیال نے حسن بیان کا لباس پہن کر غالب کی شاعری کو چار چاند لگا دیئے۔ یہی حال علامہ اقبال کا تھا۔ علامہ مرحوم کو بھی اپنی فکر بلند کے ابلاغ و اظہار کے لئے زبان کے مروجہ قالب ناکافی نظر آئے اور علامہ نے اس کے لئے نئے قالب وضع کئے اور الفاظ کو نئے معنی کا سرمایہ دار بنایا۔ اس سے ان کی شاعری کو نیا آہنگ اور پیرایۂ بیان ملا، جو اتنا دلآویز تھا کہ علامہ کے افکار قوم کے دل میں گھر کر گئے۔

اس طویل بحث سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ کسی قائد اور راہ نما کے لئے علو فکر اور بلند نظری کے ساتھ ساتھ خوش بیانی اور بات کرنے کا سلیقہ بھی نہایت ضروری ہے۔

جان پُرسوز

رہنمائے قوم کی تیسری خصوصیت علامہ نے یہ بتائی ہے کہ وہ جان پُرسوز کا حامل ہو۔ یعنی احساس و ہمدردی کی دولت سے مالامال ہو۔ میرے خیال میں یہ کسی راہ نما کی بنیادی صفت ہے۔ کیونکہ اگر کسی راہ نما کے دل میں اپنی قوم کا درد نہیں ہوگا تو وہ اپنی قوم کی اصلاح و تعمیر کے لئے کچھ بھی نہ کر سکے گا، خواہ وہ کیسا ہی صاحب بصیرت اور خوش بیان و خوش کلام ہو۔ احساس درد اور جذبہ ہمدردی ہی اسے قوم کے دکھ درد میں شریک ہونے اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے اور اس راہ میں پیش آنے والے مصائب برداشت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

عزیمت و استقلال

ان تین اہم خصوصیات کے علاوہ میری رائے میں کسی قائد میں ایک اور صفت ہونی لازمی ہے۔ وہ ہے عزیمت۔ عزیمت ہی سے استقلال مزاج اور ثبات قدم کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو کامیابی کی ضمانت دیتے ہیں۔ جو قائد صاحب عزیمت نہیں ہوتا وہ مشکلات اور مصائب کے وقت رخصت تلاش کرنے لگتا ہے اور اس طرح اپنے

موقف سے ہٹ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوجاتا ہے۔ تاریخ عالم اٹھا کر دیکھ لیجئے ان ہی ہادیان ملت اور راہ بران قوم نے کارزار حیات میں اپنی قوم وملت کو فتح وکامرانی سے ہمکنار کیا ہے جن میں دوسرے اوصاف کے علاوہ عزیمت بھی پائی جاتی تھی۔

شاید میری اس طویل تمہید کو بعض حضرات بیجا طوالت اور موضوع سے گریز قرار دیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظم کے کردار اور ان کی حیرت انگیز کامیابی کے راز کو سمجھنے کے لئے یہ تشریح ضروری تھی۔

سطور بالا میں جو چار خصوصیات بیان کی گئی ہیں اگر وہ کسی راہبر قوم میں مجتمع ہوجائیں تو وہ قائد انقلاب آفریں ثابت ہوتا ہے، اور بہت کم مدت میں قوم کی کایا پلٹ دیتا ہے۔

اب ان خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے قائد اعظم کے کردار پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ قائداعظم کے کردار کی ان خصوصیات پر محض اردو زبان کے حوالہ سے گفتگو کروں گا اور یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اُردو زبان کے متعلق قائداعظم نے جو موقف اختیار کیا اس میں ان کی مندرجہ بالا قائدانہ خصوصیات کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

قائداعظم کے مطالبہ مطالبۂ پاکستان کیوں؟

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی تہ میں ان کی بصیرت کی کارفرمائی صاف نظر آتی ہے۔ اگر مسلمان قوم کے ماضی، حال اور مستقبل پر اُن کی گہری نظر نہ ہوتی تو وہ تقسیم ہند پر کبھی مصر نہ ہوتے، بلکہ کانگریس کے ساتھ مل کر متحدہ ہندوستانیوں میں شریک اقتدار ہونے کو کافی سمجھتے۔ مگر وہ اس کے مضمرات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اور جانتے تھے کہ محض شرکت اقتدار ایک سراب ہے اور اس کے نتائج مسلمانان ہند کے حق میں کسی طرح بھی سازگار ثابت نہیں ہوں گے۔ کیونکہ ہندوؤں کی حیثیت بہر صورت شریک غالب کی ہوتی اور مسلمان شرکت اقتدار کے باوجود ان کے تابع مہمل بن کر رہ جاتے۔ خود مسلمانوں میں جو لوگ مطالبۂ پاکستان کے مخالف تھے وہ اس کے مضمرات اور آئندہ رونما ہونے والے واقعات کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر تھے۔ ان کی نظر میں محض اقتصادی اور معاشی مفادات تھے جو متحدہ ہندوستان میں شریک اقتدار ہونے سے حاصل ہوسکتے تھے۔ ہمارے یہاں آج بھی ان لوگوں کی کمی نہیں جو تقسیم ہند یا قیام پاکستان کے مطالبہ کی علت العلل معاشی واقتصادی عوامل کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سراسر غلط فہمی اور کوتاہ اندیشی کی دلیل ہے، اگر محض اقتصادی ومعاشی ہی نصب العین ہوتا تو اس شدید جدوجہد اور خون خرابے کی کیا ضرورت تھی، لاکھوں جانوں اور عصمتوں کی قربانی کا ماحصل اگر محض معاشی بہبود تھی تو یہ مقصد متحدہ ہندوستان میں کانگریس کے ساتھ مل کر بھی حاصل ہوسکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ ہنود اہل اسلام کو شدھ کرلیتے تاہم شدھ ہونے کی صورت میں اقتصادی مفاد تو حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اور اس نصب العین پہ مذہب کو قربان کیا جاسکتا تھا۔

قومی تشخص کا تحفظ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد اقتصادی اور معاشی عوامل نہ تھے بلکہ قومی تشخص کا تحفظ اور بقا اس مطالبہ کا اصل الاصول اور محرک اعلیٰ تھا۔ اگر یہ نصب العین نہ ہوتا تو مسلمان کبھی بھی قیام پاکستان کے لئے جان، مال اور عزت کی قربانی نہ دیتے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقتصادی اور معاشی مفادات کو ذیلی اور ضمنی حیثیت حاصل تھی، اور یوں بھی اقتصادی خوش حالی آزادی کا منطقی نتیجہ اور بدیہی ثمرہ ہوتا ہے۔ اگر آج ہماری اکثریت اس خوش حالی سے محروم ہے تو اس ملت کا صاحب اثر طبقہ صحیح قومی نصب العین سے ہٹ گیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مطالبہ پاکستان کی اصل اور بنیاد نظام اسلام اور اُردو زبان کی ترویج تھی۔ کیونکہ اسلامیان ہند کے قومی تشخص میں اسلام اور اُردو زبان کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اہل اسلام میں سب سے بڑا مضبوط قومی رشتہ تو بلاشبہ اسلام ہی ہے۔ مگر زبان کی اہمیت کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس رشتہ کو زبان کے واسطہ ہی سے مضبوط یا کمزور کیا جاسکتا ہے۔ اثر و تاثر اور افکار و خیالات کے ابلاغ کے لئے زبان ہی واحد ذریعہ ہے جسے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ اس لئے اسلام کے بعد اردو زبان ہی قومی اتحاد و اتفاق کا سب سے مضبوط رشتہ ہے۔ اردو کو اختیار کرنے کے بعد فارسی اور عربی زبانیں بھی ہمارے لئے اجنبی نہیں رہتیں اور ان کا سیکھنا ہمارے لئے بہت سہل ہو جاتا ہے۔ کوئی زبان سیکھنے کے لئے دو باتیں اہم ہوتی ہیں۔ اول اس کے رسم الخط سے شناسائی، دوم اس کے الفاظ اور مزاج سے آشنائی۔ اُردو، فارسی اور عربی کا رسم الخط یکساں ہونے کی وجہ سے یہ زبانیں ہمارے لئے نامانوس نہیں۔ اس کے علاوہ اردو میں عربی اور فارسی کے کم و بیش پچاس فی صد الفاظ مروج ہیں۔ اس لئے ہم ان زبانوں کے الفاظ و معانی اور مزاج و خمیر سے آشنا ہیں۔ ان حالات میں ان زبانوں کا سیکھنا ایک اُردو داں کے لئے زیادہ دشوار نہیں ہے۔ میں دوسروں کی مثال نہیں دیتا، اپنی مثال پیش کرتا ہوں۔ میں نے اردو کے طفیل ہی سے فارسی اور عربی زبانوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ اگر میں اردو سے واقف نہ ہوتا تو فارسی اور عربی تک بھی میری رسائی نہ ہوتی۔

اساس پاکستان

زبان کے اثرات اتنے ہمہ گیر اور دور رس ہوتے ہیں کہ کوئی بھی صحیح الدماغ اور سلیم العقل انسان ان سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ اس کی بدیہی اور تاریخی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ جن ممالک میں اسلامی اقتدار کے ساتھ عربی زبان رائج ہوئی، وہ ہمیشہ کے لئے اسلامی حلقۂ اثر میں داخل ہو گئے۔ ان ممالک میں جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا وہ بھی اسلامی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کی وجہ محض عربی زبان ہے۔ ہندوستان کی مثال ہی لے لیجئے۔ ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے حکومت کی، لیکن مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی طرح مسلمانوں کا اقتدار ہمیشہ کے لئے یہاں قائم نہ رہ سکا اور نہ اس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں اپنی

زبان رائج کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے مسلمان حکمرانوں کی حد سے بڑھتی ہوئی روا داری کہیے یا کم نظری، اگر مسلمان حکمران ہندوستان میں عربی یا فارسی زبان رائج کر دیتے تو آج ہندوستان ایک اسلامی ملک ہوتا۔ تاہم اسے مسلمانوں کی خوش بختی سمجھئے کہ ان کی شعوری کوششوں کے بغیر ہی عربی اور فارسی کے اثرات سے ایک نئی زبان یعنی اردو وجود میں آگئی جو ہندوستان میں ہمارے قومی تشخص اور بحیثیت قوم ہماری بقا کی ضامن بن گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جس طرح ہنود دوسری اقوام کو اگرچہ "در کان نمک رفت نمک شد" کے مصداق اپنے میں مدغم کر چکے تھے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی ہڑپ کر چکے ہوتے۔ یہ اُردو زبان اور اس کے اسلامی مزاج ہی کا کرشمہ تھا کہ ہنود کی انتہائی کوشش کے باوجود مسلمان اپنا قومی اور اسلامی تشخص برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ اگرچہ اردو کی تعمیر و تشکیل میں ہندوستان کی دیسی زبانوں کا بھی اہم حصہ ہے۔ مگر اردو کی بنیاد چونکہ اسلامی زبانوں پر استوار ہوئی تھی اور اس پہ اسلامی علوم و افکار کی گرفت مضبوط تھی اس لئے اُردو زبان نے ہندوانہ اثرات کو بہت کم قبول کیا اور اگر قبول کیا بھی تو ضمنی اور سطحی انداز میں، بلکہ اس کے برعکس ہندو تہذیب و تمدن کو اتنا متاثر کیا کہ بعض کٹر ہندو چیخ اٹھے۔ ایک اہم ہندو شخصیت نے کہا تھا کہ اُردو زبان کو ہم کیسے برداشت کریں یہ ہمارے گھروں میں داخل ہو کر ہمارا دھرم بھرشٹ کر رہی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے بچے پرماتما اور ایشور کا نام لینے کے بجائے خدا کا نام لیتے ہیں۔ گاندھی جی کو اُردو محض اسی وجہ سے قبول نہ تھی کہ یہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اور اس کو بجنسہ قبول کرنے میں ہندو قومیت پر زد پڑتی تھی۔ یہ کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ جن ہنود نے اُردو زبان کو اپنایا وہ غیر شعوری طور پر اسلامی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زبان کا رسم الخط کتنے دور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے گاندھی جی اُردو کو قرآنی حروف میں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ اگر اردو کو اس کے اسلامی رسم الخط سے محروم کر دیا جائے تو یہ اپنے تمام اسلامی ورثے سے محروم ہو جائے گی۔ اور آئندہ نسلیں کم از کم اُردو کے واسطہ سے اسلامی علوم و افکار تک رسائی حاصل نہ کر سکیں گی۔ بد قسمتی سے ہمارے یہاں ایسے کوتاہ اندیش دانشور بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ جو اُردو میں رومن رسم الخط مسلط کرنے کی تجویزیں پیش پیش رہے ہیں۔ حالانکہ ترکی کا تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ ترکی زبان کا رسم الخط تبدیل کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ترکی زبان میں اسلامی علوم کا جو سرمایہ تھا وہ موجودہ نسل کی دسترس سے باہر ہو گیا۔ جس کی وجہ سے مغربی انداز فکر اور تہذیبی اثرات کا ترکوں پر غلبہ ہو گیا۔ مقام شکر ہے کہ اب ترکیہ میں اصلاح احوال کی کوشش ہو رہی ہے۔ اور اسلامی علوم کو پھر رواج دیا جا رہا ہے۔

زبان کی اسی اہمیت کے پیش نظر سر سید نے جو ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے داعی اور حامی تھے۔ اردو ہندی نزاع پیدا ہونے پر اس وقت کے بنارس کے کمشنر سے صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا تھا کہ اب ہندو اور مسلمان اس ملک میں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ سر سید ایک صاحب نظر انسان

تھے اور زبان کے اثرات و مضمرات سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ ان کی پیش گوئی پوری ہو کر رہی۔

اسی طرح قائد اعظم بھی علی وجہ البصیرت اسلامیانِ ہند کے قومی تشخص کے تحفظ اور قومی اتحاد کے لئے اُردو زبان کی اہمیت سے واقف تھے۔ اس لئے جب بھی وہ مطالبۂ پاکستان کی توجیہ کرتے تو اسلام اور اُردو زبان کو اس کی بنیاد قرار دیتے۔ اگر قائد اعظم سطحی نظر کے حامل ہوتے تو اردو کو کبھی اہمیت نہ دیتے۔ قائد اعظم نے بارہا واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ پاکستان میں اسلامی نظام حیات اور اردو زبان کی ترویج کی جائے گی۔

قائد اعظم نے اردو زبان کو پاکستان کی واحد قومی اور سرکاری زبان قرار دیا تھا تو اس کی ایک وجہ جہاں یہ تھی کہ یہ زبان برعظیم کے مسلمانوں کے قومی تشخص کے تحفظ میں ممد و معاون رہی تھی، وہاں دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اردو کو اختیار کرنے کے بعد قوم کو لسانی اور صوبائی تعصبات سے نجات مل سکتی تھی۔

برعظیم پاک و ہند میں اُردو زبان ہی وہ واحد زبان ہے جس کی رسائی اس برعظیم کے گوشہ گوشہ تک ہے اور پھر سب سے بڑی خوبی اس میں یہ ہے کہ یہ سب علاقوں کی زبان ہوتے ہوئے بھی کسی علاقہ کی زبان نہیں ہے۔ اس لئے اس کو اختیار کرنے کی صورت میں نہ کسی علاقہ کی حق تلفی ہوتی ہے اور نہ کسی علاقہ کی بے جا طرف داری۔ اردو زبان کی ہمہ گیری کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ ہر علاقہ اس کے مولد و منشا ہونے کا مدعی ہے۔ پنجاب والے کہتے ہیں کہ اُردو پنجاب میں پیدا ہوئی۔ سندھ میں بھی اردو کے اثرات نمایاں ہیں۔ سندھ کے قدیم شعراء کا اُردو کلام اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو نے آغاز ہی سے سندھ میں قدم جمالئے تھے۔ بلوچستان میں مدت دراز سے اردو دفتروں میں رائج ہے اور بے تکلف تمام کام اسی میں انجام پا رہے ہیں۔ سرحد میں بھی اردو کا بول بالا ہے۔ پٹھان اپنے مخصوص لہجہ میں بے تکلف اردو بولتے ہیں۔ اہل دکن کا دعویٰ ہے کہ اردو نے یہاں جنم لیا۔ برج بھاشا کا علاقہ اور دوآبۂ گنگ وجمن بھی اس کا وطن قرار دیا جاتا رہا ہے۔ بمبئی اور سورت کے علاقہ میں بھی اردو کے اثرات کم نہیں۔ یو۔پی اور بہار تو اردو کا گھر کہلاتے ہی ہیں۔ بنگال اور مدراس میں اُردو شعراء کی تعداد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ کے علاقوں میں بھی اُردو بلا تکلف بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ غرض وہ کونسا گوشہ اور حصہ ہے جہاں اردو کی رسائی نہیں۔ اُردو کے مولد و منشاء کے متعلق مختلف نظریات پر بحث کرنا میرا منصب نہیں اس لئے یہ ثابت کرنے کی بھی یہاں ضرورت نہیں کہ اُردو کا آغاز کس علاقے میں ہوا۔ ان مختلف نظریات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ ہر علاقہ اُردو کو اپنی زبان سمجھتا ہے۔ اور تمام علاقائی زبانوں سے اُردو کا قریبی رشتہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے اردو کو پاکستان کی واحد سرکاری اور قومی زبان بنانے سے ایک مشترکہ ذریعۂ اظہار و اتحاد کو فروغ ملتا ہے۔ وہاں علاقائی تعصبات کی بیخ کنی بھی ہوتی ہے۔

واحد قومی زبان اُردو

قائداعظم کی بصیرت نے ان تمام مضمرات کا صحیح اندازہ لگانے کے بعد ہی اُردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دیا تھا۔ اس فیصلہ سے قائداعظم کی بصیرت کے علاوہ ان کی قوم سے ہمدردی اور شدید محبت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ کیونکہ وہ محض قوم کے اتفاق و اتحاد اور ملی تشخص کے قیام اور بقا کے لئے اردو زبان پر زور دیتے تھے۔ حالانکہ وہ خود اُردو زبان کے ماہر نہ تھے۔ اُن کا تعلق ایک گجراتی خاندان سے تھا۔ اور وہ اردو کی بہ نسبت انگریزی میں زیادہ آسانی کے ساتھ اظہارِ خیال کر سکتے تھے۔ اگر ذاتی سہولت اور گروہی مفاد اُن کے پیشِ نظر ہوتا تو وہ اردو کی جگہ گجراتی یا انگریزی کی ترویج پر زور دیتے۔ لیکن وہ ایک مخلص اور بے لوث قومی راہنما تھے جو ذاتی اور انفرادی مفادات کو قومی اور اجتماعی مفادات پر قربان کر دیتا ہے۔ اس لئے اردو کو واحد قومی زبان قرار دینا ان کی قوم سے ہمدردی اور بصیرت کا ثبوت ہے۔

قائداعظم کے سحرِ دلنواز کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ پوری قوم نے ان کی صدا پر لبیک کہا اور ان کے ایک اشارہ پر تن من اور دھن کی بازی لگا دی۔ اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی قائد کے حکم کی تعمیل کی اور وہ کارِ نمایاں کر دکھایا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

قائد کی آخری اور چوتھی صفت عزیمت ہے۔ قائداعظم کی عزیمت کا ثبوت ان کے اس موقف سے بھی ملتا ہے جو انہوں نے اُردو کے بارے میں اختیار کیا۔ پہلے عزیمت حالات کا مقابلہ مردانہ وار کرتے ہیں اور کسی صورت میں بھی اصولوں میں لچک پیدا نہیں کرتے۔ کیونکہ ایک بار کسی اصول میں لچک پیدا ہو جائے تو وہ صحیح معنوں میں اصول ہی نہیں رہتا۔ بلکہ بازیچۂ اطفال بن جاتا ہے۔

مشرقی پاکستان میں جب ہندو کی شہ پر بنگالی کو دوسری قومی زبان بنانے کے لئے ہنگامہ ہوا تو قائداعظم اپنی جسمانی صحت کے تقاضوں کو نظرانداز کر کے فوراً مشرقی پاکستان تشریف لے گئے اور وہاں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے جو اس ہنگامہ میں پیش پیش تھے، واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان اُردو اور صرف اُردو ہو گی۔ اس سلسلہ میں کسی قسم کا دباؤ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور جو لوگ اس فیصلہ کے خلاف ہنگامہ آرائی کر رہے ہیں، وہ شرپسند ہیں۔ شرپسندوں کے آگے سر جھکایا نہیں جا سکتا۔ قائداعظم کے واضح اعلان سے لسانی ہنگامے دب گئے کیونکہ ہر شخص قائداعظم کی شخصیت سے متاثر تھا اور جانتا تھا کہ قائداعظم کسی صورت میں بھی اصولوں میں لچک پیدا کرنے کے قائل نہیں۔

دو قومی زبانیں
المیۂ مشرقی پاکستان

یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ قائداعظم جلد ہی ہم سے جدا ہو گئے اور شرپسند عناصر کو پھر سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔ قائداعظم اور قائدِ ملت کے بعد کوئی ایسا با اثر رہنما موجود نہ تھا۔ جو قوم کو

اپنی بات منوا سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شرپسندوں کے بے جا مطالبہ کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیا گیا اور اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی پاکستان کی دوسری قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا جس روز بنگالی کو دوسری قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ درحقیقت اسی روز مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد پڑ گئی۔ کیونکہ بنگالی لوگ اردو کے روادار نہ رہے اور ہم بنگالی زبان سے ناآشنا تھے۔ گویا زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم کے مصداق ملک کے دونوں بازوؤں میں ذہنی بعد پیدا ہو گیا۔ کیونکہ بنگالی زبان کا مرکز تقل مغربی بنگال بالخصوص کلکتہ تھا۔ اور بنگالی شعر و ادب اور ذرائع ابلاغ پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے بنگالی زبان کے ذریعہ پاکستان دشمن عناصر کے زہریلے اثرات مشرقی پاکستان کی نئی نسل میں سرائیت کرتے گئے تا آنکہ اختلاف اتنا بڑھا کہ شیخ مجیب جیسے غدار اور وطن فروش منصب قیادت سے سرفراز ہوئے جو مشرقی پاکستان کو پاکستان سے کاٹ کر ہندوستان کی جھولی میں ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ مختصر لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے قائدِ اعظم کی بصیرت و عزیمت سے انحراف کر کے اردو سے پاکستان کی واحد قومی زبان ہونے کا حق چھین لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اپنے ملک کے بیشتر ایک بڑے حصہ سے محروم ہو گئے۔ اور ہمیں ایسی شکست نصیب ہوئی جس کی مثال تاریخ اسلام میں شاید ہی ملے گی۔ بلکہ بنگال میں جو کچھ ہوا وہ اربابِ اقتدار کی کوتاہ اندیشی اور غلط روش کے باعث ہوا۔ اردو کو مشرقی بنگال میں ہر دلعزیز بنانے کے لئے سنجیدگی سے کوئی کوشش نہ کی گئی۔ اگر کم از کم پاکستان کے دورِ اولین میں بنگالی زبان کے لئے عربی رسم الخط رائج کر دیا جاتا تو اس کی کوئی مخالفت بھی نہ ہوتی، کیونکہ عربی رسم الخط بنگالی زبان کے لئے اجنبی نہ تھا۔ اول تو ہر مسلمان قرآن کے رسم الخط سے آشنا ہے۔ دوم مدت مدید تک بنگالی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہے۔ بنگالی ہندوؤں اور انگریزوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر بنگالی کو جبراً دیو ناگری رسم الخط میں مقید کیا تھا۔ تاکہ بنگالی زبان کو اسلامی افکار سے محروم کیا جا سکے۔ اگر ہم دور اندیشی سے کام لے کر بنگالی کے لئے عربی رسم الخط بحال کر دیتے اور نئی نسل کی تعلیم عربی رسم الخط میں ہوتی تو دیوناگری رسم الخط کے ذریعہ بنگالی ہندوستان کے زہریلے خیالات کی جو یلغار ہوئی وہ نہ ہو پاتی۔ عربی رسم الخط کی بدولت بنگالی اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانوں سے زیادہ قریب ہو جاتی۔ اور اس اشتراک کی بنا پر مشرقی پاکستان کے باشندوں کے لئے اردو زبان کو واحد سرکاری زبان کی حیثیت سے قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا۔ نیز آزادانہ اور بے تعلقانہ مبادلۂ افکار سے دونوں میں زیادہ سے زیادہ مفاہمت پیدا ہوتی اور اس سے ہمارا رشتہ مضبوط ہوتا۔ مگر افسوس اقتدار کی جنگ نے کسی کو اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دینے کی مہلت نہیں دی۔

قائدِ اعظم کا عظیم موقف

کم از کم اب تو اپنے ملک کا معتد بہ حصہ کھو دینے کے بعد ہم میں احساس پیدا ہو جانا چاہیئے۔ اگر ہم نے اب بھی قائد اعظم کے عظیم موقف کے مطابق اردو زبان کو اس کا حق نہ دیا تو ہمیں سخت ابتلا کا شکار ہونا پڑے گا۔ قائد اعظم کے اصول و نظریات کے مطابق عمل کرنے ہی میں ہماری فلاح ہے۔ اگر ہم نے اب بھی ہوش نہ سنبھالا تو پھر ہماری داستان تک بھی نہ ہوگی۔

قائداعظم پر رسائل میں مضامین کی ببلیوگرافی

جناب نعیم مرزا
ایم۔ اے (فائنل) شعبہ لائبریری سائنس جامعہ کراچی

احمد، جمیل الدین "قائداعظم کی قیادت"
نیا راہی ماہنامہ ۲، (جنوری ۱۹۵۸) ص ۲۔

—— النبال، ارشد "قائداعظم" ماہ نو ماہنامہ ۹، (دسمبر ۱۹۵۶) ص ۱۱

—— اسد (ملتانی) "محسن ملت (نظم)
ماہ نو ماہنامہ ۔ ۹ (دسمبر ۱۹۵۶) ص ۷۔

—— اقبال، ایوب، جناح "پاکستان کی کہانی"
طلوع اسلام ماہنامہ ۴، (جنوری ۱۹۶۱) ص ۳۱ تا ۴۲۔

—— الظفر، ملک نسیم "خواب اور تعبیر"
لیل و نہار ہفت روزہ ۱۲ (ستمبر ۱۹۶۲) ص ۱۔

—— الولی، انعام "قائداعظم کے حضور (نظم)
نقاد ماہنامہ ۲، (نومبر ۱۹۵۳) ص ۳۔

—— العقیس، مذاق (فیروزپوری) "نذرانہ عقیدت" (نظم) لیل و نہار ہفت روزہ ۱۲،
(دسمبر ۱۹۶۲) ص ۱۳

—— العقیس، مذاق (فیروزپوری) "توانائے قائد" (نظم) لیل و نہار ہفت روزہ ۱۲،
(دسمبر ۱۹۶۲) ص ۱۳

—— العقیس، مذاق (فیروزپوری) "ارتعاش (نظم) لیل و نہار ہفت روزہ ۱۲ (دسمبر ۱۹۶۲) ص ۱۴

—— پرویز، "قائداعظم اور اسلامک آئیڈیولوجی"
طلوع اسلام ماہنامہ ۱۳ (جنوری ۱۹۶۰) ص ۶۵ تا ۷۵

—— تابٔ، حفیظ "اے قافلہ سالار (نظم)
لیل و نہار ہفت روزہ ۷، ۳۰ (ستمبر ۱۹۶۲) ص ۱۷

—— "تاریخ پاکستان کا پہلا ورق" (اداریہ)

. . . .

. . . ./

لیل و نہار ہفت روزہ ۱۳ (مارچ ۱۹۶۳) ص ۱۲

—— "خطبہ قائداعظم" (اداریہ) لیل و نہار
لیل و نہار ہفت روزہ ۔ ۱ (جون ۱۹۶۰) ص ۵۔

—— رزاقی، شاہد "قائداعظم کا سفر حیدرآباد (دکن) لیل و نہار ہفت روزہ ۱۶ (اپریل ۱۹۵۹) ص ۱۰

ریاض، میر حسن " یوم پاکستان" الشجاع ماہنامہ ۷ (اپریل ۱۹۵۹) ص ۴

—— ریاض، میر حسن "قائداعظم" الشجاع ماہنامہ ۷، (جنوری ۱۹۵۹) ص ۴

—— زبیری، یامین "قائداعظم اور طلبا" چٹان ہفت روزہ ۱۶ (ستمبر ۱۹۶۳) ص ۱۷

—— سلیمی، صفدر "قائداعظم" طلوع اسلام ماہنامہ ۱۴ (جنوری ۱۹۶۱) ص ۹ (نظم)

—— سیمابی، منظار صدیقی "بابائے ملت قائداعظم" چٹان ہفت روزہ ۱۶ (ستمبر ۱۹۶۳) ص ۷

—— شاعر لکھنوی "تیرے بغیر اے قائداعظم" (نظم) نیا راہی ماہنامہ ۲ (جنوری ۱۹۵۸) ص ۱۰

—— شورش کاشمیری "قائداعظم" (اداریہ) چٹان ہفت روزہ ۱۵ (دسمبر ۱۹۶۲) ص ۳ تا ۴

شورش کاشمیری "فرمودات قائداعظم" چٹان ہفت روزہ ۱۶ (مارچ ۱۹۶۳) ص ۲۰ تا ۲۴

—— شورش کاشمیری "قرارداد پاکستان" چٹان ہفت روزہ ۱۶ (مارچ ۱۹۶۳) ص ۱۱ تا ۱۲

—— شورش کاشمیری "پاکستان کی جنگ آزادی سید احمد بریلوی سے قائداعظم تک" چٹان ہفت روزہ ۱۶ (مارچ ۱۹۶۳) ص ۱۵ تا ۱۶۔

—— شہباز عبدالحق "بیاد قائداعظم" ماہ نو ماہنامہ ۱۱ (دسمبر ۱۹۵۸) ص ۷

—— شیدا گجراتی "قائداعظم" (نظم) لیل و نہار ہفت روزہ ۱۰ (دسمبر ۱۹۶۰) ص ۱۶

—— عروج، عبدالرؤف "مرد راہ داں" (نظم) ماہ نو ماہنامہ ۱۰ (دسمبر ۱۹۵۷) ص ۷

—— عظیم راہنما (اداریہ) لیل و نہار ہفت روزہ ۱۰ (دسمبر ۱۹۶۰) ص ۳۶

—— عنایت اللہ، ملک محمد (پروفیسر) "بانی پاکستان کی ولادت" چٹان ہفت روزہ ۱۶ (دسمبر ۱۹۶۳) ص ۲۳ تا ۲۴

—— علی میاں کفایت "ایک شخصیت ایک یاد" ماہ نو ماہنامہ ۱۲ (ستمبر ۱۹۵۹) ص ۶

—— فنا، پروین سید "نذرانۂ عقیدت" (نظم) لیل و نہار ہفت روزہ ۷ (ستمبر ۱۹۶۲) ص ۱۷

—— "قائداعظم کا یوم ولادت" (اداریہ) لیل و نہار ہفت روزہ ۱۲ (دسمبر ۱۹۶۲) ص ۳

—— "قائداعظم کے ارشادات" (اداریہ) لیل و نہار ہفت روزہ ۱۳ (دسمبر ۱۹۶۳) ص ۲

—— "قائداعظم کے ارشادات" (اداریہ) لیل و نہار ہفت روزہ ۱۴ (مارچ ۱۹۶۴) ص ۱۱

—— "قائداعظم کا آخری سفر" (اداریہ) لیل و نہار ہفت روزہ ۷ (ستمبر ۱۹۶۲) ص ۱۴

—— "قائداعظم کی یادیں۔ (اداریہ) نقاد ماہنامہ ۷ (فروری ۱۹۵۴) ص ۲۵

—— محمود، شوکت (پروفیسر) "قائداعظم کی ایک نئی تصویر" لیل و نہار ہفت روزہ ۱۴ (مارچ ۱۹۶۴) ص ۱۱

—— ندوی، اکمال "قائداعظم اور عظمت کردار" لیل و نہار ۱۲ (دسمبر ۱۹۶۲) ص ۱۱

—— ندیم، غلام رسول "قائداعظم محمد علی جناح" چٹان ہفت روزہ ۱۴ (اگست ۱۹۶۱) ص ۲۳

— نظامی، عبدالحمید جیوی "قائد اعظم شمیر میں" لیل نہار ہفت روزہ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۱) ص ۱۳

— نیر، مشتاق احمد "قائد اعظم کی آخری قیام گاہ" ماہ نو ماہنامہ ۱۲ (ستمبر ۱۹۵۶) ص د

— نیازی، کوثر "قائد اعظم کی سوانح عمری اور فاطمہ جناح"، شہاب ہفت روزہ ۹۰ (مارچ ۱۹۶۴) ص ۳ تا ۴

قائد اعظم پر کتابوں کی ببلیوگرافی (کتابیات)

احمد، سید نور، مارشل لا سے مارشل لا تک لاہور، دین محمدی پریس ۱۹۶۵) ص ۲۰۱ تا ۲۲۵

— احمد، وصی۔ اسباب تقسیم ہند (کراچی، ادبی پریس ۱۹۵) ص ۲۱۴ تا ۲۲۲

— احمد، سید طفیل، مسلمانوں کا روشن مستقبل دہلی، مطبع علمی، ۱۹۴۵) ص ۵۵۹ تا ۵۰۰

— احمد، شبیر، محمد علی جناح " (نظم) قائد اعظم اور ان کا عہد (لاہور، مقبول اکیڈمی ۱۹۶۲) ص ۵

— الزماں، خلیق (چودھری) شاہراہ پاکستان کراچی، انجمن اسلامیہ پاکستان ۱۹۶۷) ص ۱۱۱۳

— اختر، خالد (افغانی) حیات قائد اعظم محمد علی جناح (بمبئی، قادری پریس ۱۹۴۶) ص ۸۴۰

— جعفری، رئیس احمد قائد اعظم اور ان کا عہد (لاہور، مقبول اکیڈمی ۱۹۶۲ء) ص ۸۰۵

— جعفری، رئیس احمد "تاریخ مسلم لیگ یا حیات محمد علی جناح" (کراچی، مکتب خانہ تاریخ آفس ۱۹۴۷) ص ۸۸۵

— جناح۔ ایم۔ اے، پاکستان اور مسلم ہندوستان (بمبئی، ہوم اسٹیڈن سرکل، ۱۹۴۶)

— جناح۔ ایم۔ اے، آل انڈیا مسلم لیگ کا کراچی سیشن (دہلی، آل انڈیا مسلم لیگ پرنٹنگ پریس ۱۹۴۳ء)

— حسین، عاشق بٹالوی (ڈاکٹر) ہماری قومی جدوجہد (لاہور، البیان ۱۹۶۷) ص ۵۵۱ تا ۵۹۵

— خان، محمد احمد، اقبال کا سیاسی کارنامہ (کراچی، حکیم پریس ۱۹۵۲) ص ۱۹۴ تا ۱۹۷

— خان، لیاقت علی، جناح گاندھی گفت و شنید (دہلی، آل انڈیا مسلم لیگ پرنٹنگ پریس ۱۹۴۶) ص ۱۰۱ تا ۱۱۴

— سرور، محمد، تحریک پاکستان کا ایک جانباز۔ لاہور، سندھ ساگر اکیڈمی ۱۹۷۵) ص ۲۲۴

— محمود، صفدر، مطالعہ پاکستان (لاہور، مکتب اردو ڈائجسٹ ۱۹۷۳) ص ۲۷۹

— یوسفی، اللہ بخش، سرحد اور جدوجہد آزادی (لاہور، مرکزی اردو بورڈ ۱۹۶۸) ص ۵۵۷ تا ۵۸۳

قائداعظم کی دو باتیں

از مولوی حسن مثنیٰ ندوی صاحب

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے دو باتیں بڑی وضاحت سے قوم کے گوش گذار کی تھیں۔

ا۔ "خدا کے فضل سے پاکستان اب ایک حقیقت مسلمہ جس کے لئے ہم دس سال سے جدوجہد کر رہے تھے۔ اور اسے بھی یاد رکھئے کہ پاکستان خود مقصود نہیں بلکہ وسیلہ ہے ہماری منزل مقصود کا۔"

۲۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کا پورا احساس ہوگا کہ پاکستان جیسی نئی مملکت کی ترقی کے لئے جو دو منفصل حصوں پر مشتمل ہے" اس کے تمام باشندوں میں چاہے وہ جس حصے کے رہنے والے ہوں ہم آہنگی فکر و خیال" اتحاد و ائتلاف اور سالمیت و استحکام لازمی ہے۔ صرف ترقی ہی نہیں بقا کے لئے لازمی ہے۔ پاکستان ایک مجموعہ ہے مسلم قوم کی وحدت کا" اور اسے وحدت ہی کا مجموعہ بن کر رہنا ہوگا۔ اس وحدت کی نگرانی اور حفاظت ہمیں سچے مسلمانوں کی طرح کرنا ہوگی۔ اگر ہم نے کبھی یوں سوچا کہ ہم پہلے بنگالی" پنجابی" اور سندھی وغیرہ ہیں۔ اور مسلمان اور پاکستانی اتفاقاً ہیں۔ تو یقین کیجئے پاکستان بکھر کے رہ جائے گا۔ اس فریب میں ہرگز نہ رہیئے گا کہ یہ ایک دقیق نکتہ سنجی ہے۔ ہمارے دشمن ان تمام امکانات سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ اور میں آپ کو خبردار کئے دیتا ہوں کہ وہ ان کو استعمال کرنے میں مشغول بھی ہو چکے ہیں۔

پاکستان ہندوؤں اور انگریزوں کی تمناؤں کے علی الرغم قائم ہوا ہے۔ نہ یہ دونوں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی مملکت وجود میں آجائے۔ نہ عالمی پالیسی کو یہ گوارا تھا۔ وہ تو گردوپیش کے تغیرات نے اور اندرونی حالات اور مسلمانوں کے عزم و ثبات نے بساط سیاست پر انہیں زچ کر دیا۔

لیکن سیاست میں" زچ ہو جانے والے" اپنی کارروائیوں سے کبھی باز نہیں آتے۔ اس لئے پاکستان قائم ہو جانے کے بعد بھی وہ خاموش نہیں ہوئے۔ پاکستان کے خلاف انہوں نے کئی مورچے قائم کئے۔

انتشار سیاسی کا مورچہ

انتشارِ معاشی کا مورچہ

انتشارِ سماجی کا مورچہ

اور ان سب میں بڑا اور خاموش مگر اتنا ہی خوفناک "انتشارِ فکری کا مورچہ" ہے۔ اگر سنجیدگی سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ سیاسی انتشار پھیلانے کے لئے کیسی ہولناک کارروائیاں کی گئیں۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں کے قتل سے لے کر اب تک ایک سلسلہ جاری ہے۔

سیاسی انتشار، معاشی انتشار اور سماجی انتشار کی ہر کوشش صرف اس لئے کی گئی کہ قوم کا ذہن و فکر پراگندہ ہو۔ اس کے اندر پریشانی بے اطمینانی اور بے اعتمادی پیدا ہو یہاں تک کہ وہ اپنے آپ سے بیزار ہو جائے۔

جس قوم میں یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ وہی دن دشمن کی آخری یلغار کا ہوتا ہے۔ قائدِ اعظم صرف سیاستداں ہی نہیں تھے، مدبر بھی تھے اور مدبر وہ ہے جس کی نظر مستقبل بعید پر ہوتی ہے۔ قائدِ اعظم کی یہ دو ہدایتیں دلوں میں جاگزیں رہیں تو دنیا کی کوئی قوت پاکستان کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اور نہ اس کی ترقی اور سربلندی کا راستہ روک سکتی ہے۔

دسمبر کا مہینہ قائد اعظم کی پیدائش کا تھا لیکن امسال ۱۹۷۶ء میں یہ مہینہ قائد اعظم کی سیاست، فراست اور استقامت کی تجدید اور تصور پاکستان کی پوری قوت کے ساتھ احیاء و تکمیل کا مہینہ ہو گیا۔ کسے گمان تھا کہ ایسا وقت آئے گا لیکن آ گیا۔ قدرت کے ان اشارات کو سمجھنے اور ان کو پورا کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کا تصور کیا ہے۔ اور اس کا مکمل نقشہ کیا ہے۔ اسے نہ بھولئے کہ اس کے بغیر اطمینان و سکون کی زندگی ممکن نہیں۔

خدا کی بے شمار نعمتیں قائدِ اعظم کی روح پر جنہوں نے پاکستان حاصل کیا۔ اور خدا کی بے شمار رحمتیں ان مجاہدوں پر جنہوں نے پاکستان کے تحفظ و ترقی اور سربلندی کے لئے جان کی بازی لگا رکھی ہے۔

اب سے تیس سال پہلے مسلمانوں کو مقابلہ برطانیہ اور ہندو کانگریس سے کرنا پڑا تھا۔ آج مقابلہ روس اور بھارت سے کرنا ہے۔ آج اس سے بھی زیادہ ذہانت، فطانت، خود اعتمادی، مقصد کی لگن اور قوت ایمانی درکار ہے۔ پہلے بھی ہم نے موت و حیات کی جنگ لڑی تھی۔ اب بھی موت و حیات کی جنگ ہے۔ یہ حیرت انگیز نہیں ہے کہ روس نے برطانیہ کی جانشینی کیوں اختیار کی۔ اسلام کے مقابلہ میں روس نے ایک مدت سے "بیزنطینی جدید" کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ لیکن ع

دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر است

قائد اعظم کی ایک ولولہ انگیز تقریر

۲۱ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو آرام باغ کراچی میں مسلم لیگ کا شاندار اجلاس

(رپورٹ روزنامہ عصر جدید کلکتہ

۱۴ر جنوری ۱۹۴۱ء

کراچی ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۰ء کل شام حسب اعلان بعد نماز مغرب رام باغ (حال آرام باغ) میدان کراچی میں فرزندان توحید کا ایک پرشکوہ اور عدیم النظیر جلسہ زیر اہتمام سندھ پراونشل مسلم لیگ منعقد ہوا۔ اس میدان کی تاریخ میں اس سے بڑا اجتماع آج تک نظر نہیں آیا۔ نماز مغرب سے قبل ہی لوگ ہزاروں کی تعداد میں آ گئے تھے۔ بہت سے مسلمانوں نے جلسہ گاہ ہی میں جماعت کے ساتھ نماز مغرب ادا کی۔ سات بجے تک میدان میں جدھر نگاہ جاتی تھی فرزندان توحید کا ایک بحر مواج نظر آتا تھا۔ ٹھیک سات بجے قائد اعظم تشریف لائے۔ آپ کا استقبال اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے کیا گیا۔ اسٹیج پر سرکردہ مسلم زعماء کے لئے نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا جن میں آنریبل سید میراں محمد شاہ، آنریبل خان بہادر محمد ایوب کھوڑو، شیخ عبدالمجید سندھی، سید علی محمد راشدی، قاضی نذیرالدین صاحب مدیر و مالک روزنامہ حیات، مسٹر جی۔ ایم سید، قائد اعظم کے پرائیویٹ سکریٹری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جلسہ میں ہندو حضرات بھی بہ تعداد کثیر موجود تھے۔ جن میں راؤ بہادر ہوت چند چانڈومل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خاکسار سپاہی اور مسلم نیشنل گارڈ کے رضاکار انتظام و انصرام میں مصروف تھے۔

مسلمانان کراچی کے اس بے نظیر اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک زبردست تقریر فرمائی (جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

"میں پاکستان کا نام لیتے ہوئے کوئی باک اور جھجک محسوس نہیں کرتا۔ اس لئے کہ جب ہم مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کا نام لیتے ہیں تو پاکستان کا نام بھی لے سکتے ہیں۔ (یہ آپ نے خاص طور پر اس لئے فرمایا کہ ایک دو مقررین نے اس بات پر زور دیا تھا کہ مسلم لیگ کی قرارداد لاہور میں پاکستان کا نام نہیں آیا جسے ہندو پریس غلط طور پر اچھال رہا ہے۔) آپ نے مزید فرمایا کہ اسے آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کہہ لو یا پاکستان کہہ دو یا اسلام آباد

ان سب کا مطلب ایک ہی ہے جو اچھی طرح عوام کے
ذہن نشین کرا دیا گیا ہے۔ پاکستان آج کی پیداوار نہیں
ہے بلکہ پہلے ہی سے موجود ہے۔ سندھ، بلوچستان، پنجاب
اور صوبہ سرحد کو ہم پاکستان کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ
پاکستان ہم نے نہیں قدرت نے بنایا ہے۔ پاکستان
کے قیام یا قرارداد لاہور کی منظوری کا مطلب بالکل
صاف ہے۔ یعنی وہ سرزمین جس میں ہماری اکثریت ہے
اس پر صرف ہماری حکومت ہونی چاہیئے۔ دوسری کسی قوم
یا طاقت کی نہیں۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنے اس
مقصد میں کامیاب کس طرح ہوں؟ تو اس کا نہایت سادہ
جواب یہ ہے کہ اگر آپ پاکستان کا قیام چاہتے ہیں یعنی
اس وسیع و عریض سرزمین میں جسے ہندوستان کے نام سے
پکارا جاتا ہے ہم کو بھی کوئی حصہ کوئی جگہ ملنی چاہیئے جہاں
ہم آزادی اور عزت سے رہ سکیں اور اپنی تہذیب و تمدن
کو زندہ رکھ سکیں، تو آپ سب کو اور اسلامیان ہند
کے بچہ بچہ کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو کر متحد اور
منظم ہو جانا چاہیئے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس طرح ہندوؤں
کو کیا نقصان پہنچا ہے۔ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ سارے
ہندوستان پر اُن کی حکومت ہو اور ہم غلام بنا لئے
جائیں۔ ہم پچیس برس سے ہندو مسلم سمجھوتے اور اتحاد
کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں جو ابھی تک مشکور ثابت
نہیں ہوئیں۔ یہ امر بے حد تعجب انگیز ہے لیکن اس کا
سبب یہ ہے کہ ہندو ہندوستان میں خالص رام راج
قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں لیکن ان کا خواب
شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔ اسی لئے کہ ہماری قوم
آج سے قریباً ۲۰ سال پہلے ایک مردہ قوم تھی لیکن اب
خدا کے فضل و کرم سے سارے ہندوستان کے مسلمانوں
میں جان آگئی ہے۔

اس میں شک و شبہ کی ذرہ بھر بھی گنجائش
نہیں کہ کانگریس ایک خالص ہندو جماعت ہے جس کا
مقصد کوئی ایسا جال بچھانا اور کوئی ایسی چال چلنا
ہے جس سے ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت اور
قومی حکومت قائم ہو جائے۔ نیز مخلوط طریقۂ انتخاب نافذ
ہو جائے۔ اگر سمجھوتہ کی بنیاد ان چیزوں پر رکھی جائے تو
اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان بھر کی حکومت کی
باگ ڈور ہندوؤں کے ہاتھ میں دے کر ان کی غلامی کا
طوق مسلمانوں کی گردن میں ڈال دیا جائے۔

لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ جو اور جس قسم کی حکومت
بھی قائم ہو اس میں مسلمانوں کو پورا پورا حصہ ملنا چاہیئے
اور انہیں اپنی جداگانہ تہذیب، ثقافت اور تمدن کے
ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا حق ملنا چاہیئے۔
جب یہ سوال پیدا ہوا تو ہمارے ہندو دوستوں نے
نشستوں کا جھگڑا شروع کر دیا۔ اور جب مسلمانوں نے
اپنے مطالبات پیش کئے اور بتایا کہ وہ ہندوستان میں
کیا چاہتے ہیں تو کانگریس نے اپنے پٹھوؤں اور حاشیہ
نشین نام نہاد مسلمانوں کو ان مطالبات کی مخالفت
کے لئے کھڑا کر دیا جنھوں نے وہی کچھ کہنا شروع کر دیا
جو ہندو کانگرس ان سے کہلوانا چاہتی تھی۔ ہندوؤں
اور مسلمانوں کے درمیان صلح و صفائی نہ ہونے کی
سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمان تو چاہتے ہیں

آزادی، اور ہندو اُن کو اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ آج بھی مسٹر گاندھی، ساورکر اور مونجے وغیرہ ہماسبھائی لیڈر اور ان کے لگے بندھے ایسی ہی جمہوریت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

ہم آج بھی وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو ایک مدت سے کہتے چلے آتے ہیں کہ ہم ایک جداگانہ اور آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ کانگریس آج تک نشہ میں ہے لیکن اب یہ نشہ اُتر رہا ہے۔ اس لئے کہ اب مسلم لیگ کے سایۂ علم میں ہندوستان کے مسلمان متحد و منظم ہو چکے ہیں۔ جب مسلم لیگ منظم نہ تھی تو کانگریسی ہماشوں نے ایک خواب دیکھا تھا جو انشاء اللہ اب پریشان ہو کر رہے گا۔ بلکہ پریشان ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود ہندو کانگریس کی چال اب بھی وہی ہے۔ جس کا جواب اسلامیان ہند کے ہاتھ میں ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ مسلم لیگ کی قوت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ جس کا ایک زندہ ثبوت آج کا یہ ایک فقید المثال اجتماع ہے۔ آج سے تین چار سال قبل تک کراچی میں اتنا زبردست اجتماع کبھی نہ دیکھا گیا۔ اس روح پرور جذبۂ بیداری کو دیکھ کر جو مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہو چکا ہے۔ اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ حکومت برطانیہ اور کانگریس دونوں مل کر بھی ہم کو شکست نہیں دے سکیں گے۔ ہم نے کافی سے زیادہ قوت اور تنظیم پیدا کر لی ہے لیکن اس کے باوجود ہم کو زیادہ سرگرمیوں سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ مسلمانو! اگر سچے دل سے چاہتے ہو کہ تم غیروں کی غلامی سے چھوٹ جاؤ اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہو یعنی پاکستان قائم ہو جائے تو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں اس جھنڈے تلے آجاؤ۔ اس پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاؤ۔ اتفاق و اتحاد کا رشتہ بڑھاؤ۔ باہمی تنازعات اور شکر رنجیوں کو چھوڑ دو۔ ایک آواز پیدا کرو۔ ایک زبان و ہم آواز ہو کر کہو کہ ہم قیام پاکستان کے لئے جانیں تک لڑا دیں گے۔ اگر ہم نے اپنا یہ مطالبہ ایک منظم اور متحد جماعت کی طرف سے پیش کیا تو اپنے مقصد میں انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گے۔"

قائد اعظم کی مسلمہ قیادت

جناب خواجہ سرور حسن بار ایٹ لا مرحوم

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ مجھ کو قائد اعظم سے وہ قرب حاصل رہا ہے۔ جو نواب زادہ لیاقت علی خاں نواب محمد اسمٰعیل خاں اور راجہ صاحب محمود آباد کو تھا۔ میں جو کچھ عرض کروں گا اس میں وہ بات نہ ہوگی جو ان لوگوں کے مشاہدہ میں آئی ہوگی۔

آپ خیال کیجئے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی سیاست میں کیسے کیسے اعلیٰ پائے کے سیاست داں حصہ لے رہے تھے۔ مسٹر گوکھلے۔ تلک۔ بپن چندر پال لالہ لاجپت رائے، سی۔ آر۔ داس اور گاندھی جی وغیرہ مگر قائد اعظم کی سیاست اور تدبر نے سب کی سیاست کو پسِ پشت ڈال دیا۔

۱۹۰۶ء میں قائد اعظم نے سیاست میں حصہ لینے کی ابتدا کی۔ کانگریس ہی زور شور سے حصہ لیا۔ اور متحدہ قومیت کے نظریہ کے داعی رہے لیکن کانگریس کی بے اصولی اور عیاری کے باعث آپ اس سے علیحدہ ہوگئے اور مسلم لیگ کی تنظیم جدید کر کے اس کو ہندوستان کے مسلمانوں کا متحدہ پلیٹ فارم بنا دیا۔ اگر وہ اصولی اختلاف کے باعث کانگریس سے علیحدہ نہ ہوتے وہ صدر کانگریس ہوتے۔ گاندھی جی نے ان کو متحدہ ہندوستان کی آزاد حکومت کی پہلی وزارت عظمیٰ کا لالچ دیا۔ مگر دنیا جانتی تھی کہ یہ شخص خریدا نہیں جا سکتا تھا۔

قائد اعظم ۱۹۴۸ء تک سیاسی لیڈر رہے ان کی سیاست کو انگریز، ہما بھائی اور کانگریس بھی تسلیم کرتی تھی۔ قائد اعظم کی سیاست و دیانت دارانہ اور بے غرض تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رہنما ابتدا کانگریس میں شریک رہے۔

سر سید احمد خاں بھی شروع میں ہندوستان کی متحدہ قومیت کے خواہاں تھے۔ مگر جب انہوں نے برادران وطن کی ذہنیت کو دیکھا تو ان کا نظریہ بدل گیا۔ یہی حال قائد اعظم کا تھا کہ وہ خلوص دل سے متحدہ قومیت کے لئے کوشش کرتے رہے۔ جب تک کسی ملک میں کسی قوم کو سیاسی اقتدار حاصل نہ ہو۔ وہ قوم اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔ پانچ سو سال تک مسلمانوں نے اسپین پر حکومت کی۔ بڑے بڑے سائنسداں موجد اور علامہ پیدا ہوئے۔ لیکن جب ان کی سیاسی قوت ختم ہوگئی تو مسلمانوں کو وہاں سے جلاوطن ہونا پڑا اور وہاں نام کو بھی مسلمان نہ رہا۔

روس میں بھی مسلمان کا یہی حشر ہوا۔ وسطی ایشیا
جو اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔ جب وہاں
روسیوں کا اقتدار ہوا تو زار روس نے مسلم ریاضی دانوں
کو حکم دیا کہ عیسائیت کے نظریۂ تثلیث کو وہ اپنے ریاضی
کے اصولوں سے ثابت کریں۔ مگر سیاسی قوت و اقتدار
بغیر کوئی مذہب اور تہذیب قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ قائد اعظم
ہی کی ذات تھی جس کے طفیل برصغیر پاک اور ہند میں
اندلس اور روس کی تاریخ نہیں دہرائی گئی۔ قائد اعظم
کے ذاتی کیرکٹر کے لئے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

۱۹۲۴ء میں بمبئی میں اسمبلی کے الیکشن میں
قائد اعظم امیدوار تھے۔ رائے دہندگان کے ایک جلسہ میں
قائد اعظم نہایت شاندار سوٹ اور ہیٹ پہن کر شریک
ہوئے۔ تقریر کے بعد آپ نے حاضرین جلسہ سے کہا کہ
آپ مجھ سے جو سوالات کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ ایک
شخص نے کھڑے ہو کر کہا آپ سراپا یورپین لباس
میں ہیں۔ بالکل انگریز معلوم ہوتے ہیں عیش و آرام کی
زندگی بسر کرتے ہیں۔ مسلمان کس طرح آپ کو اپنا
لیڈر بنائیں گے کیونکہ اس زمانہ میں کھدر پوشی کی
تحریک عروج پر تھی اور تمام کانگریسی لیڈر کھدر پوش
تھے۔ اس لئے ایسے اعتراض کا موقع تھا۔

قائد اعظم نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ میں خود
کماتا ہوں اور اپنی کمائی کو اپنے اوپر صرف کرتا ہوں۔
اگر آپ کسی کھدر پوش کو ووٹ دینا چاہیں تو بخوشی
اسے دے سکتے ہیں۔ صدیوں میں جناح جیسا آدمی
پیدا ہوتا ہے۔ مصطفےٰ کمال پاشا اور جناح کی شخصیتیں
ملتی جلتی ہیں۔ مطمح نظر دونوں کا ایک تھا۔ جیسے یہاں
والے جناح کو سوٹڈ بوٹڈ کہتے تھے۔ اسی طرح مصطفےٰ
کمال کو وہاں والے مغرب زدہ کہتے تھے۔

جس طرح اتاترک نے اپنی قوم کی آزادی کے
لئے جنگ لڑی اور ایک طاقتور ترکی وجود میں آیا۔
اسی طرح قائد اعظم نے برصغیر کے مسلمانوں کو متحد کر کے
سیاسی جنگ لڑی۔ اور دہری غلامی سے آزاد کرایا۔
ہمیں فخر ہے کہ قدرت نے ہمیں ایک ایسا لیڈر
عطا کیا تھا جس نے ہمارے لئے یہ ملک بطور گوشۂ
عافیت مہیا کیا۔ مسلم لیگ کے اجلاس لاہور پر
تقریباً ایک لاکھ افراد کا جم غفیر تھا۔ اجلاس
شروع ہے کہ ایک ۶۴ سالہ بوڑھا شخص پنڈال پر
داخل ہوتا ہے۔ تمام مجمع سروقد کھڑا ہو جاتا ہے
بالکل خاموش ہے یہ باوقار شخصیت کون تھی۔ یہ
قائد اعظم محمد علی جناح تھے۔ میاں بشیر احمد نے اس
موقع پر اپنی خود نوشت نظم کسی دوسرے شخص سے
پڑھوائی چند شعر سنئے:۔

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح — پیری میں بھی جواں ہے محمد علی جناح
لگتا ہے جا کے ٹھیک نشانے پہ جس کا تیر — کیسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح
غیروں کے دل بھی سینے کے اندر دہل گئے — مظلوم کی فغاں ہے محمد علی جناح
اسلام کا نشاں ہے محمد علی جناح

قائد اعظم کی شخصیت۔ ذاتی اوصاف و خصوصیات نہ نظم
میں بیان ہو سکتے ہیں اور نہ نثر میں ان کا احاطہ کیا جا سکتا
ہے مجھے بارہا قائد اعظم کی خدمت میں شرف باریابی حاصل ہوا
چند مرتبہ آپ کے ساتھ کھانا کھانے کی بھی عزت حاصل ہوئی

قائداعظم ایک تاریخ ساز ہستی

(از سید مصطفیٰ علی بریلوی (علیگ (بی۔کام۔ایل ایل۔بی)

برصغیر پاک و ہند میں مغل حکومت کے زوال ۱۷۰۶ء تا ۱۸۵۷ء اور پھر ۱۹۴۷ء تک کا طویل دور مسلمانانِ ہند کے لئے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ وہ مسلمان جن کی عسکری قوت سے ایک دنیا تھراتی تھی۔ ان کا وجود برابر ہو گیا۔ بڑے بڑے مخلص مردانِ کار مثل نواب علی وردی خاں (بنگالہ) سراج الدولہ شہید، سلطان حیدر علی، سلطان ٹیپو شہید (میسور) حافظ رحمت خاں شہید (والیٔ روہیلکھنڈ) وغیرہم فرنگی استبداد کا خاتمہ کرنے میں ناکام ہو گئے۔ نتیجتاً پورا ملک یونین جیک کے زیرِ سایہ آگیا۔ انگریز کے تحکم کا یہ عالم ہو گیا کہ زمین و آسمان لرزنے لگے۔ معمولی انگریز اہلکار شرفائے ہند کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دینے میں عار محسوس کرتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کی وجہ سے انگریزوں کا مزاج مسلمانانِ ہند کی جانب سے اور بھی برہم ہو گیا۔ بقول سر سید علیہ الرحمۃ آسمان سے جو بھی بلا آتی تھی، مسلمان کا گھر ڈھونڈتی تھی۔ جدوجہد آزادی کے صرف چودہ برس بعد ۱۸۷۱ء میں حکومت برطانیہ کی مسلم کشی اس منزل پر پہنچ گئی کہ خود سرکار و الا تبار کو اپنے مفاد میں محسوس ہونے لگا کہ مسلمانانِ ہند کے تن بے جان میں انجکشن دینے کی ضرورت ہے۔ ان تفصیلات سے قطع نظر عرض یہ کرنا ہے کہ ایسے نازک ماحول میں قدرت نے سر سید رحمۃ اللہ علیہ سے کام لیا۔

جنگ آزادی سے قبل سر سید ایک سرکاری ملازم تھے۔ اپنی ذاتی لیاقت، ذہانت اور مشرقیت کے علاوہ سراپا سرکاری ملازم اور صرف ملازم تھے چنانچہ تاریخ سرکشی بجنور اُن کی اسی کیفیت کا نتیجہ ہے، لیکن جدوجہد آزادی کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں پر جو تباہی و بربادی نازل ہوئی اس نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ چنانچہ سر سید نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر مسلمانوں کی حمایت میں دلیرانہ قدم اٹھایا۔ یہ وہ بنیادی پتھر تھا جس پہ آہستہ آہستہ عمارت تعمیر ہوتی گئی اور تعلیمی سیاست کے ذریعہ مسلمان اس لائق ہوئے کہ قائداعظم کی قیادت میں ایک علیحدہ مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

قائداعظم کی شخصیت

قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کی بلند و بالا شخصیت اور ان کے کارناموں کا اندازہ ملک کے سیاسی پس منظر کی روشنی میں ہی متعین کیا جا سکتا ہے۔ سر سید کی طرح قائداعظم محمد علی جناح سے بھی اللہ تعالیٰ نے اس وقت کام لیا جب مسلمانانِ ہند میں سیاسی قیادت کا فقدان تھا وہ گروہ در گروہ

بٹے ہوئے تھے۔ موتی لال نہرو نے اپنی تاریخی رپورٹ میں مسلمانوں کے تشخص قومی سے انکار کر کے مولانا محمد علی جوہر جیسے محب وطن کو دل برداشتہ کر دیا۔ دوسری طرف قائد اعظم ہندوستانی سیاست کے غیر صحت مندانہ رجحانات سے اس قدر متنفر ہوگئے کہ انہوں نے لندن میں جبریہ گوشہ نشینی اختیار کرلی، لیکن جب انہوں نے محسوس کیا کہ برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کو ان کی ضرورت ہے تو وہ ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر وارد ہند ہوگئے۔ قائداعظم کسی مذہبی گھرانے کے فرد نہیں تھے، ان کا مسلمانوں کے اس طبقہ سے تعلق تھا جس کو تجارت کے علاوہ دنیا کی کسی اور بات سے خصوصی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس خاندان کے ایک فرد قائداعظم نے اپنی پختہ کار سیاست کے طفیل پاکستان قائم کر کے ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا، جس پر ایک دنیا محو حیرت ہے۔

دو قومی نظریہ اور قائداعظم

پاکستان کا قیام دو قومی نظریہ کے تحت وجود میں آیا۔ برادران وطن ہندو کہتے تھے کہ ہندوستان میں ایک قوم آباد ہے، مسلمانوں کو انگریز کے خلاف ان سے اتحاد کرلینا چاہیے۔ اور کہ جہاں تک مسلمانوں کے مطالبات کا تعلق ہے اس کی بات آزادی کے بعد کی جائے گی۔ جس وقت پاکستان کی جدوجہد جاری تھی یہی بات کلکتہ کے مشہور اخبار "عصر جدید" نے اپنے اداریہ میں اس طرح بیان کی تھی۔

"ہندوؤں کو مسلمانوں سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ ایک ہندوستانی کی طرح آزادی کی جنگ میں ہندوؤں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر شریک نہیں ہوتا لیکن مسلمانوں کو اس کے جواب میں شکایت یہ ہے کہ ہندو ہندوستان میں مسلمانوں کو بھی انگریز کی طرح بدیشی سمجھتا ہے اور جس طرح وہ انگریز کے تمام اثرات مٹا دینا چاہتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے لائے ہوئے اثرات کو بھی برداشت کرنا نہیں چاہتا ــــ اردو کے مقابلہ میں ہندی کا پرچار، ہندو کے اس ارادے کی کھلی نشانی ہے۔"

(اداریہ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۴۶ء)

ہندوؤں کی مندرجہ بالا ذہنیت کے پیش نظر مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ مسلمانوں کی حیثیت کے بارے میں پہلے فیصلے کر لئے جائیں اس کے بعد آزادی کی جدوجہد میں شرکت کی جائے گی۔ مسلمانوں کو بجا طور پر ہندوؤں کی نیت پر شبہ تھا۔ قائداعظم جو خود میثاق لکھنو اور ہندو مسلم اتحاد کے ہیرو تھے خاصے طویل عرصہ تک برادران وطن ہندوؤں کی کھلی ہوئی دھاندلیوں اور ناانصافیوں سے اس حد تک دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ انھیں صاف نظر آرہا تھا کہ مشترکہ جدوجہد کے معنی مسلمانوں کی غلامی ہوں گے۔ کیونکہ ایک مرتبہ مشترک ہندوستان میں ہندو کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آجاتی تو وہ فوج اور پولس کے ذریعہ مسلمانوں کو کچل دیتا اور آزاد پاکستانی خطوں کے مسلمانوں کی بھی وہی حالت ہوتی جو آج ہندوستانی مسلمانوں کی گذشتہ

۲۸ سال میں ہوگئی ہے۔

قائدِاعظم کے ناقد

ایک اچھے سیاست داں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے قدم بڑھاتا چلے سیاست میں وضع داری نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جب مولانا محمد علی، مولانا حسرت، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، وغیرہم نے محسوس کیا کہ ہندوؤں کے ارادے خوفناک ہیں تو انہوں نے اپنا اندازِ فکر بدل دیا۔ اسی طرح علامہ اقبال اور قائدِاعظم نے بھی ملت کے مفادِ اعلیٰ کے تحت اپنی رائیں تبدیل کردیں۔ کچھ بزرگوں کا خیال ہے کہ آج تحریکِ پاکستان کے ڈانڈے سرسید رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمدؒ علی سے ملانا غلط ہے، کیونکہ سرسید ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ مولانا محمدؒ علی کے نظریات کی ترجمان جامعہ ملیہ دہلی ہے جو دو قومی نظریہ کے خلاف رہی ہے وغیرہ۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ سرسیدؒ، قائدِاعظمؒ، مولانا محمدؒ علی غرض سب ہی مخلص کارکن ایک قومی نظریہ کے کسی نہ کسی شکل میں موید تھے، لیکن جوں ہی ان اکابرینِ ملت نے محسوس کیا کہ اس نظریہ کی حمایت جاری رکھنے کے نتیجہ میں مسلمانوں کا تشخص قومی ختم ہوجائے گا۔ انہوں نے فوری طور پر مسلمانوں کو ایک علیٰحدہ تنظیم کے تحت منظم ہونے کا مشورہ دیا۔ کچھ اصحاب قائدِاعظم پر الزام عائد کرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے "ایک قوم" کو وطن مل گیا اور دوسری بے وطن ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد قائدِاعظم نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ ہندوستانی مسلمانوں سے ان کا کوئی واسطہ مطلب نہیں رہا۔ ان کے بین الاقوامی جائز حقوق کے لئے انہوں نے ہمیشہ فرمایا کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی عظیم قربانی کی بدولت پاکستان بنا ہے اور کہ مضبوط پاکستان ہندوستان کے مسلمانوں کے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت ہے، چنانچہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جب پاکستان کسی حد تک کامیاب رہا تو مسلمانانِ بھارت کو کچھ عرصہ تک اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا۔

مسلم عوام اور قائدِاعظم

قائدِاعظم کو عامۃ المسلمین کا بے مثل تعاون حاصل تھا۔ اگرچہ جدوجہد پاکستان کے زمانہ میں بھی مسلمان بے شمار ذاتوں برادریوں اور چھوٹے چھوٹے گروہی تعصبات کا شکار رہتے لیکن قائدِاعظم کی مخلصانہ آواز پر وہ اس طرح متحد ہوگئے کہ دشمنوں کو بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا۔ قائدِاعظم کی ایک خوبی یہ تھی کہ انھوں نے متوسط الحال اور اعلیٰ مسلم طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کو بھی خلوصِ دل کے ساتھ جدوجہد پاکستان میں شریک کرلیا، ہندوؤں کو مسلم اہلِ ثروت کے جذبہ اور خلوص کا اندازہ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ کو زمینداروں اور کھاتے پیتے افراد کی جماعت قرار دیا۔ زمیندار اور سرمایہ دار طبقہ عام طور پر خود غرض اور مطلب پرست ہوتا ہے لیکن یہ قائدِاعظم کا کمال تھا کہ ملک کے ہزاروں لاکھوں صاحبِ حیثیت مسلمان اپنے گھربار، ماحول، وطن، خاندان، بزرگوں کی ہڈیوں اور روایات کو چھوڑ چھاڑ کر ایک ایسی سمت روانہ ہوئے جہاں وہ

ایک نظریاتی اسلامی حکومت بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ انہیں کچھ خبر نہیں تھی کہ ان کا انجام کیا ہوگا لیکن ایک جذبۂ صادق تھا کہ جو ان کے اور غریب مسلم عوام کے دل میں بے پناہ جوشِ عمل بیدار کئے ہوئے تھا۔ اس جذبہ نے دشمنوں کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا اور افقِ عالم پر ایک عظیم اسلامی سلطنت معرضِ وجود میں آگئی جس کا نام پاکستان ہے اور جس کا بجا طور پر کریڈٹ قائد اعظم کو جاتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے زمانہ اور اس کے بعد مسلمان عوام اور خواص قائد اعظم کا نام بڑے احترام، عزت اور وقعت کے ساتھ لیتے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج بھی جب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں اسی محبت اور تشکر کے ساتھ یاد کئے جاتے ہیں۔ قائد اعظم پاکستان کے دستورِ حکومت کو کس شکل میں دیکھنا پسند کرتے تھے اس کا اندازہ درج ذیل چند اقتباسات سے بخوبی ہو سکے گا۔

"میں تو یہ نہیں سمجھ سکا کہ لوگوں کو اس استفسار کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین ہوگا یا نہیں — اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کی نظیر دنیا میں کوئی بھی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ اصول آج بھی تیرہ سو سال پیشتر تھے — میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام کے اسوۂ حسنہ کے اتباع میں ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی جمہوریت کی بنیادیں صحیح اسلامی تصورات اور اصولوں پر استوار کریں۔"

"اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے لامحالہ ایک علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

قائد اعظم — ہمعصروں کی نظر میں

راما سوامی آئر "میں مسٹر جناح سے کئی سال سے واقف ہوں اور ہمیشہ ان کی صائب رائے اور بے لوث خدمات کا معترف رہا ہوں۔ انہوں نے عوام پر اپنے اقتدار کو ذاتی فائدے اور حصول منصب کا ذریعہ بنانے سے ہمیشہ احتراز کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جرأت، یقین کی ایک بے نظیر مثال اور اپنے صریح نقطہ کے سچے علمبردار ہیں۔ ایک ایسے دور میں جبکہ بڑے بڑے مشاہیر بھی اپنی حکمت عملی کو وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے ہیں ایک ایسے جری مبارز کا نقطۂ نظر یقینی فیض آفریں ہے۔"

ستیہ مورتی میں اس موقع پر ان کا ذکر ایک سیاست داں کی حیثیت سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف ایک انسان کی حیثیت سے، اور میں یہ کہوں گا کہ وہ چند بہترین خوش پوش لوگوں میں

سے ہیں جن کو میں نے ہندوستان میں بیرونِ ہند دیکھا ہے، وہ نہایت شستہ اخلاق کے مالک ہیں۔ ان کی گفتگو اور تقریر ہمیشہ موثر ہو سکتی ہے، خصوصاً ایسے بیشتر مواقع پر جبکہ مرکزی مقننہ میں توازن ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ سیاست دانی ان کے رگ و ریشہ میں ہے اور ان میں بہت سی ایسی خوبیاں ہیں جن کی نوجوانوں کو تقلید کرنا چاہیئے۔"

الف۔ اے جینز مرکزی اسمبلی کے فرنگی ممبر

"چھ سال سے مرکزی مقننہ میں ان کا شریک کار ہونے کی حیثیت سے میں ان کی لاثانی پارلیمانی صلاحیتوں کا انتہائی معترف ہوں اور ایک ماہر سیاسیات کی حیثیت سے موجودہ ہندوستان میں ان کا ثانی تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ ان کی نمایاں ترین صفت جس کا میں بہت قایل ہوں وہ ان کی دائمی دیانتداری ہے۔ اس سے میرا یہ مفہوم ہے کہ مسٹر جناح کو خریدا نہیں جا سکتا۔ وہ کوئی خیال یا طرزِ کار اس وقت تک ہرگز قبول نہیں کریں گے جب تک کہ وہ خود اس کی صداقت کے قایل نہ ہو جائیں اور ہندوستان میں ان کے زبردست اثرات کا غالباً یہی راز ہے۔ اس لئے کہ ایک سچا اور دیانتدار انسان ہمیشہ مخلص ہوتا ہے۔ اور ایک کلیتاً بے لوث اور مخلص قائد ہر ملک کو نصیب نہیں ہوتا۔"

السٹریٹیڈ ویکلی کا تبصرہ

"یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص قائدِاعظم جناح سے ہر بات میں متفق نہ ہو، لیکن اسے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ملتِ اسلامیہ ہند کی درحقیقت یہ خوش قسمتی ہے کہ اس کے مسلم قائدین کو مسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے ایک رُوح اور قوت کی ضرورت تھی اور یہ رُوح قائدِاعظم نے نہایت کامیابی سے ان میں پیدا کر دی ہے۔ اُن کی باا‌ثر شخصیت تمام خوبیوں اور الزامات سے بالاتر کردار اور لاثانی ذہانت و بصیرت نے مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، فضل الحق، سرسکندر، نواب اسمٰعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں جیسے بیباک لوگوں کے دلوں میں بھی ان کی وفاداری کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور جب تک اسلامیانِ ہند کی قیادت کے لئے قائدِاعظم جناح سلامت ہیں اس وقت تک انھیں کوئی خطرہ نہیں۔"

(بحوالہ مقالہ شاہد حسین "عصرِ جدید"
مورخہ ۱۳ر جنوری ۱۹۴۱ء)

قائدِ اعظمؒ اور علی گڑھ تحریک

(از مولوی محمد امین زبیری مرحوم)

اس صدی کے اوائل میں جب کہ قائدِ اعظم ایک نوجوان بیرسٹر تھے بمبئی میں علی گڑھ تحریک بہت ہی زور کے ساتھ رونما ہوئی تھی۔ ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر کانگریس کے مشہور پریذیڈنٹ اور سرسید کے سیاسی نظریہ کے انتہائی مخالف جسٹس بدرالدین طیب جی تھے۔ اب تک یہ تحریک صرف تعلیم تک محدود تھی لیکن ۱۹۰۶ء میں سیاست کو شامل کیا گیا۔ اور اکتوبر میں محسن الملک آنریری سکریٹری علی گڑھ کالج اور ہز ہائنس آغا خاں کی قیادت میں ایک وفد نے حکومت کے سامنے پہلی مرتبہ مسلم مطالبات پیش کئے جن میں آئندہ اصلاحات میں جداگانہ انتخاب سے کونسلوں میں نمائندگی کا بھی مطالبہ تھا پھر اسی سال دسمبر میں مسلم لیگ قائم ہوئی جس کے پہلے صدر کالج کے ہی سکریٹری وقارالملک تھے اور پھر وہی لیگ کے سکریٹری بھی منتخب کئے گئے۔ مسلمانوں کے یہ مطالبات تین سال تک پریس میں زیر بحث رہے۔ کانگریس نے زبردست مخالفت کی۔ مگر حکومت نے ان کو تقریباً تسلیم منظور کرلیا۔ یقیناً یہ تمام مباحث قائدِ اعظم کی نظر سے گذرے اور یہ عجب اتفاق ہے کہ جب ۱۹۱۰ء میں جدید اصلاحات کی رو سے کونسلوں کے انتخابات ہوئے تو قائدِ اعظم اسی حق کی بنا پر بمبئی کے مسلم حلقہ انتخاب سے منتخب ہوئے۔

اسی سال انھوں نے مسلم لیگ کی تحریک پر مجلس مقننہ میں وقف علی الاولاد کا بل پیش کیا۔ اور لیگ کانگریس کی مصالحتی کمیٹی میں ان کو مسلم لیگ کا نمائندہ مقرر کیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں مسلم یونیورسٹی کا غلغلہ بلند ہوا اور چندہ جمع کرنے کے لئے اپیلیں کی گئیں اور وفود نے دورے کئے۔ تو قائدِ اعظم نے بھی اس فنڈ میں ایک عطیہ دیا۔ اس وقت تک مسلم لیگ عملاً علی گڑھ تحریک کے قائدین کے ہاتھ میں تھی۔ اس سال کے آخر میں جب کنگ امپیریر کی زبان سے تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کرائی گئی تو مسلمانوں میں ایک جوش پیدا ہوا۔ اور سرسید کے جانشین مولوی مشتاق حسین، وقارالملک کے ان الفاظ نے کہ "آفتاب نصف النہار کی طرح اب روشن ہے۔ کہ ان واقعات کو دیکھنے کے بعد جو اس وقت مشاہدہ میں آئے، مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہیئے لاحاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ اس قسم کے بھروسہ کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر بھروسہ کرنا چاہیئے وہ ہماری اپنی قوت بازو ہے۔"
ایک انقلاب پیدا کردیا اور مسلم لیگ کے نظریات

میں بھی مائل بہ ترقی تبدیلی پیدا ہوئی، چنانچہ ۱۹۱۳ء
میں مسلم تعلیمی کانفرنس کے ساتھ ہی ساتھ مسلم لیگ کا اجلاس آگرہ میں
منعقد ہوا جس کے صدر بمبئی کے سر ابراہیم رحمت اللہ تھے۔
جو کانگریس میں بھی حصہ لیتے تھے اجلاس بہت ہی شاندار
تھا۔ تقریباً پانچ ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ قائداعظم نے
لیگ کونسل کے ممبر کی حیثیت سے اس میں شرکت کی، رزولیوشن
بھی پیش کئے اور بحث میں بھی حصہ لیا۔ گویا اس طرح
علی گڑھ تحریک کے ایک اہم جزو سیاسیات سے ان
کا بہت قریبی تعلق پیدا ہو گیا۔ اور چونکہ وہ انجمن القرض
کے وفود کو بھی ہمیشہ عطیات دیتے تھے۔ اور علی گڑھ کے
متعلق دلچسپی کا اظہار کرتے تھے، اس لئے ۱۹۱۵ء میں
وہ ایم اے او کالج کے ٹرسٹی منتخب کئے گئے اور علی گڑھ
کی تعلیمی تحریک سے بھی قریبی رابطہ ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں
جب نان کوآپریشن کی تحریک شروع ہوئی جس میں تعلیمی
مقاطعہ بھی تھا۔ اور اس مقاطعہ میں سب سے پہلے علی گڑھ
کی تباہی اور بربادی مضمر تھی، تو قائداعظم نے اس حقیقت
کو سمجھ کر عین وقت پر اس تحریک و مقاطعہ کے خلاف
ایک اہم اور مدلل بیان پریس میں شائع کرایا جس سے
علی گڑھ والوں کے بھی ہاتھ مضبوط ہو گئے اور انہوں
نے اس حملے کا کامیاب مقابلہ کیا۔

اس مدافعت کے چند مہینے بعد ہی مسلم یونیورسٹی
وجود پذیر ہو گئی۔ اور قائداعظم نہ صرف کورٹ کے ممبر
بلکہ کورٹ کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بھی منتخب کئے گئے
مگر چونکہ دیگر اہم مصروفیتوں کی وجہ سے بمبئی سے علی گڑھ
پہنچ کر کونسل کی میٹنگوں میں شریک نہ ہو سکتے تھے اس لئے
دوسری میقات میں انتخاب منظور نہیں کیا۔ مگر یونیورسٹی
کے ساتھ ان کی دلچسپی برابر قائم رہی۔ ۱۹۲۴ء میں جب
حکومت ہند میں سنڈہرسٹ کالج کے نمونہ پر دہرہ دون میں
ایک فوجی کالج قائم کرنے کے امکانات پر غور کرنے کے لئے جنرل سر اینڈ
ریو اسکین کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی تو اس میں
قائداعظم اور یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر ڈاکٹر
ضیاء الدین احمد کو بھی ممبر مقرر کیا گیا اور اس کمیٹی نے علی گڑھ
وزٹ بھی کی۔ پھر ۱۹۲۵ء میں جب یونیورسٹی جوبلی کے موقع پر
مسلم لیگ کا بھی سالانہ جلسہ تھا تو قائداعظم اس میں شریک
ہوئے اور یونین کلب کے مباحثہ میں حصہ لیا جس کا موضوع
تھا کہ "اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان میں فوری طور
پر ذمہ دار حکومت قائم کی جائے"۔ اس کے بعد بھی وہ ایک
دفعہ علی گڑھ آئے اور یونین میں تقریریں کیں۔ اور مباحثوں
میں شریک ہوئے۔ ایک مباحثہ میں سر علی امام، سر
عبدالرحیم، سر شفیع اور علامہ عبداللہ یوسف علی بھی
شریک تھے۔ لیکن ۱۹۳۸ء میں ان کی وزٹ نہایت پرجوش
اور شاندار تھی۔ یونیورسٹی اور شہری مسلم لیگ نے مدعو
کیا تھا۔ ۵ فروری کو ۹ بجے صبح کی ٹرین سے تشریف لائے
اسٹیشن پر تمام طلبا اپنے یونیفارم میں صف بستہ تھے
اور گیٹ کے باہر یونیورسٹی رائڈنگ اسکول کے سواروں
کا دستہ اپنی خوشنما وردیوں میں بطور باڈی گارڈ موجود
تھا۔ شہر کے عوام و خواص اور عمائدین، وائس چانسلر
اور دیگر ممبران اسٹاف سب ہی حاضر تھے۔ سلامی
اور استقبال کے بعد جلوس شہر میں نکالا گیا۔ جلوس
کے جلو میں طلبا کا دستہ سواراں تھا۔ شہر سے حدود

یونیورسٹی میں داخلہ ہوا اور اس راستے سے [..]س چانسلر
ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کی کوٹھی پر تشریف لے، جاکر لنچ
تناول کیا۔ یونیورسٹی اسٹاف کے ارکان اور عمائد شہر
شریک طعام تھے۔ ازاں بعد کوٹھی حبیب منزل میں آرام
کیا۔ اور ۳ بجے یونیورسٹی کی جانب سے وکٹوریہ گیٹ پر
استقبال ہوا۔ اور اسٹریچی ہال میں اللہ اکبر اور زندہ
باد کے نعروں کے ساتھ رونق افروز ہوئے۔

اس موقع پر اسٹریچی ہال کی خاص طور پر
زیبائش اور آرائش کی گئی تھی۔ اور اس کی چھت
پر مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔ یونین کے
وائس پریسیڈنٹ نے اپنی تقریر میں نہایت گہرے
جذبات کے ساتھ ویل کم کیا اور قائد اعظم نے پرجوش
چیرز کی گونج میں کھڑے ہوکر ایک تقریر کی جس کی ابتدا
میں فرمایا کہ:

"صاحب صدر آپ نے اپنی تقریر میں مجھ پر
مدح اور ثنا کی بارش کی ہے۔ میرا شکریہ قبول فرمائیے
مگر جس چیز نے مجھے ابھارا اور میرا دل بڑھایا وہ پیغام
امید ہے جو آپ نے اپنے نوجوان اراکین کی طرف سے
مجھے دیا۔ پھر وہ روح شباب ہے جو آپ نے میری جان
ودل میں پھونکی۔ اگر آپ لوگ اپنے اظہار کردہ ارادوں
اور فیصلوں کی آدھی مقدار کے برابر بھی قربانی و ایثار
کرنے کے لئے تیار ہوگئے تو اسلامیان ہند میں وہ
زور و قوت و اختیار پیدا ہو جائے گا جس کی ضرورت ہے"

"اس وزٹ میں تقریباً تین دن حبیب منزل
میں مقیم رہے اور ہر روز طلبا سے ملاقاتوں میں مشغول
سیاست پر تبادلۂ خیال کیا۔ اور ان کو حقیقتیں سمجھائیں
اس وزٹ کے بعد بھی متعدد مرتبہ اور مسلسل علی گڑھ تشریف
لے گئے اور اپنے خطبات سے ان کو ایک طرف درس
سیاسیات دیا اور دوسری طرف ان میں اتحاد، یقین محکم
اور تنظیم کا صحیح جذبہ پیدا کیا۔ وہ ان طالب علموں سے
نہایت بے تکلفی کے ساتھ ملتے تھے جن میں بیدار مستقبل
کا پرتو ہوتا تھا۔ وہ یونیورسٹی کے طلباء میں پوری قوم
کی قیادت کے آثار پاتے تھے۔ اور علی گڑھ کو اسلامی
کا اسلحہ خانہ اور طلبا کو بہترین سپاہی تصور کرتے تھے
چنانچہ ۱۹۴۲ء کی وزٹ میں جو تقریر کی اس کے آخر
میں کہا کہ:-

"میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ شانہ بشانہ
کھڑے ہو جائیں اور مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کریں
ایک مستحکم اور مضبوط پیکر فولاد کی طرح اپنی جگہ پر قائم
رہیے۔ اپنی قوم کی تنظیم و تربیت کیجئے اور ان کو
و تادیب کا خوگر اور عادی بنا لیجئے، ہماری قوم ہمارے
ساتھ ہے۔ آپ رکاوٹوں سے پراگندہ خاطر نہ ہوں
مسلمانوں کو منظم اور یکجا کریں اور فوجی قواعد کی طرح
ہم جلد تر آزادی کی منزل مقصود پر پہونچ جائیں گے

اور ۱۹۴۱ء میں کہا کہ:-

"پس میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ تیاری
اور ہر آنے والی ضرورت سے عہدہ برآ ہونے کے
بن جائیے۔ علی گڑھ اسلامی ہند کا اسلحہ خانہ ہے
آپ لوگ بہترین سپاہی، دیہات میں نکل جائیے
عامہ خلائق کو تعلیم دیجئے۔ اور ہر طرح سے ترقی کر

مدد ہم پہونچائیے۔ اپنی قوم کے ہر فرد کو بتلائیے کہ ہماری منزل مقصود کیا ہے۔ بہت سے لوگ ان لاعلم لوگوں کو گمراہ کرنے میں کوشاں ہیں، ہاں ان غریبوں کو اچھی طرح سمجھا دیجئے پھر وہ اپنی منزل کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔"

قائداعظم اگر کسی سال نہ جا سکتے تو علی گڑھ کے مایۂ ناز فرزند قائد ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں کو پیغامات لے کر بھیجتے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں جو بڑے معرکہ کا انتخابی سال تھا، نواب زادہ موصوف نے علی گڑھ جا کر طلباء کو ایڈریس کیا۔ اور اس معرکہ کے میدان میں اترنے کی اپیل کی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان طلباء نے تمام غیر منقسم ہند میں منتشر ہو کر ان امیدوں کو پورا کر دکھایا جو ان سے وابستہ تھیں اور اس معرکہ کو سر کرنے میں انہوں نے وہ جوہر دکھائے جو مسلم سیاست کی تاریخ میں درخشاں رہیں گے۔

علی گڑھ کے طلباء نے پاکستان پر ایک وسیع لٹریچر مہیا کیا جس کو قائداعظم نے بہت سراہا اور انہیں کی حوصلہ افزائی پر مسلم انڈیا لکھی گئی۔

قائداعظم کو یونیورسٹی کے ساتھ جو والہانہ شیفتگی تھی اس کا ایک ثبوت وہ وصیت ہے جس میں انہوں نے اپنے ترکہ کی تقسیم میں یونیورسٹی کے لئے چھ لاکھ روپے کی خطیر رقم وقف کی ہے۔ اتنی بڑی رقم کا عطیہ بجز نظام دکن کے کسی معطی نے یونیورسٹی کو نہیں دیا۔

قائداعظم کا اس ادارہ سے جو قریبی تعلق ۱۹۱۵ء سے شروع ہوا۔ وہ علی التسلسل نفس واپسیں تک قائم رہا یعنی ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بھی وہ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممتاز ممبر تھے۔

عجب اتفاق ہے کہ قائداعظم کو جس قدر معاون و مددگار ملے وہ تقریباً سب کے سب کسی نہ کسی طرح علی گڑھ سے تعلق رکھتے تھے۔ لیگ کے جس قدر صدر ہوئے ان میں سات تو علی گڑھ کے ہی چشم و چراغ تھے۔ باقی سب کے سب ایم اے او کالج کے ٹرسٹی اور کورٹ کے ممبر تھے۔

مزید اتفاق یہ ہے کہ ان دونوں کے جانشین بھی علی گڑھ کے ہی فرزند ہیں۔ دوسرے سرکاری عہدہ داروں صوبائی اور مرکزی وزراء کی بیشتر تعداد بھی علی گڑھ کی تربیت یافتہ ہے۔

"ان کہی کہانیاں"

سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کی تصنیف ہے جو چار چھوٹے بڑے دل دوز اور موثر تاثرات پر مشتمل ہے۔ جن کے مطالعہ سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مصنفہ کے نزدیک زمین پر اللہ کی حکومت قائم کرنے کے لئے معاشرے کی اصلاح ضروری ہے۔ انسان دوستی خدا دوستی کی دلیل ہے واقعات بھی دلچسپ ہیں اور ترتیب و تنظیم میں بھی فنکارانہ مہارت سے کام لیا گیا ہے جس سے ان کہی کہانیوں کی دلچسپی بڑھ گئی ہے قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ :۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس
5/10 - ڈی - جے - ۱ ناظم آباد بی روڈ۔ کراچی

قائدِ اعظم اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تحریر:- نواب زادہ محمود علی خاں

اسلامیانِ ہند کی تاریخ آزادی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے جو شاندار اور یادگار کردار ادا کیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ایسی شخصیتوں کو جنم دیا جنہوں نے تحریک آزادی کے ہراول دستے کے قائدین کی حیثیت سے برصغیر کی آزادی مسلمانوں کی تعلیمی معاشی معاشرتی بہبود کے لئے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دیں اور مسلمانان برصغیر کی تعلیمی ترقی معاشرتی اصلاح ثقافتی فروغ اور سیاسی تگ و تاز کی ابتدا کا سہرا جن کے سر بندھا وہ سر سید احمد خاں، حالی، شبلی نعمانی، محسن الملک، وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وغیرہ تھے جن کے دم قدم سے مسلمانوں میں جداگانہ سیاسی حیثیت کا تشخص اجاگر ہوا۔ انہیں بزرگوں نے جداگانہ انتخاب کی داغ بیل ڈالی انہی کے طفیل جداگانہ سیاسی حقوق کے حصول کی تحریک چلی جو بالآخر تحریک پاکستان اور نتیجتاً حصول پاکستان پر ختم ہوئی۔ ان کے بعد اس مشعل کو آگے لے چلنے والے مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، نواب زادہ لیاقت علی خاں، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر، نواب اسماعیل خاں تھے۔ صف اوّل کے کتنے ہی مسلمان رہنما ہیں جنہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آغوش علمی میں تربیت پائی اور اس درس گاہ سے نکل کر ہندو سامراج اور برطانوی استعمار دونوں کے لئے زبردست چیلنج ثابت ہوئے۔ تحریک خلافت ہو یا تحریک پاکستان ان میں سے کوئی بھی تحریک ایسی نہیں جس میں فرزندان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قربانیاں شامل نہ ہوں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یہی وہ اہمیت ہے جس نے اس صدی کے سب سے عظیم مسلمان راہنما حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کو اس عظیم درس گاہ کی طرف متوجہ کیا۔ برصغیر کی یہ واحد درسگاہ تھی جہاں درۂ خیبر سے لے کر آسام کے آخری گوشہ تک اور کوہ ہمالہ کے دامن سے راس کماری تک کے ہر علاقہ اور حصے سے مسلم طلباء تعلیم حاصل کرنے آتے تھے اور اسلامی ثقافت فکر و عمل کے سانچے میں ڈھل جاتے تھے۔ اس لئے جو تحریک یہاں سے اٹھتی ان طلباء کے ذریعہ قدرتاً ملک کے طول و عرض میں پھیل جاتی۔ اس لئے تحریک پاکستان میں بھی قائد اعظم

کی تعلیم سے مسلم یونیورسٹی کا ہر طالب علم اس کا پرجوش
سپاہی بن گیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں ہوتا یا شہر کے
بازاروں میں یا رخصت گزارنے اپنے وطن جاتا قائدِ
اعظم کے پیغام اور نظریۂ پاکستان کی تشہیر و تصبیر ہر
جگہ اور ہر حال میں اس کے پیش نظر ہوتی۔ طلبائے علی گڑھ
کی تحریک کو ایک ہمہ گیر حیثیت حاصل تھی جبکہ دیگر طلباء
کی انجمنیں اور جماعتیں مقامی یا صوبائی بنیاد پر کوشاں
تھیں۔ طلبائے علی گڑھ ملک کے کونے کونے میں مصروف
عمل تھے۔ انفرادی کوششوں کے علاوہ اجتماعی طور
پر یونیورسٹی کے طلبا کی تین تنظیمیں تھیں ـــــ

(۱) مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین
جس کا ہر طالب علم ممبر تھا اور جو طلبا کی
سب سے بڑی فعال نمائندہ آرگنائزیشن تھی۔

(۲) یونیورسٹی مسلم لیگ، علی گڑھ ہندوستان
میں وہ واحد تعلیمی ادارہ تھا۔ جہاں مسلم لیگ
کی شاخ ۱۹۳۷ء کے آخر میں قائم کی گئی۔
جبکہ بہت سے شہروں میں مسلم لیگ کا وجود تک
نہ تھا۔ اور یہ فرزندان علی گڑھ نواب
وقار الملک، نواب محسن الملک، صاحبزادہ
آفتاب احمد خاں وغیرہ تھے جنہوں نے ۱۹۰۶ء
میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی اور آل
انڈیا مسلم لیگ کا دفتر علی گڑھ میں قائم کیا جو
وہاں ۱۹۱۰ء تک رہا۔

(۳) مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جس کی آل انڈیا
آرگنائزیشن ۱۹۳۶ء میں قائم کرنے میں
علی گڑھ کے ممتاز اور پرجوش طلباء
نعمان زبیری اور واحد بخش قادری وغیرہ
کا بڑا ہاتھ رہا۔ اور پھر جس کے صدر راجہ
صاحب محمود آباد اور جنرل سکریٹری نعمان[۱]
زبیری ہوئے اور ان کی کوششوں سے
ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بھی
مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی برانچیں قائم
ہوئیں۔

ان تینوں تنظیموں نے قائد اعظم اور مسلم لیگ کی
خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ ان
جماعتوں کی طرف سے اساتذہ کی نگرانی میں تحریک
پاکستان پر کافی لٹریچر شائع کیا گیا جس سے تحریک
پاکستان کو مقبول ہونے میں بڑی مدد ملی۔ میرے یونین
کے سکریٹری شپ کے زمانہ میں یونین کی طرف سے ۱۹۴۲ء
میں محترم استاد ڈاکٹر عزیز احمد صاحب کا لکھا ہوا ایک
پمفلٹ "نیچر آف اسلامک پولیٹیکل تھیوری" شائع ہوا۔
"تاریخ نظریۂ پاکستان" کے مصنف پیام شاہجہاں پوری
صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ "مسلم یونیورسٹی
کے پروفیسر ڈاکٹر سید افضال حسین قادری اور ان کے
رفقائے کار کی کوششوں سے انسائکلوپیڈیا آف
برٹانیکا کے ۱۹۳۵ء کے ایڈیشن میں تحریک پاکستان
پر ایک جامع نوٹ شائع ہوا اس طرح قیام پاکستان سے
قبل ہی پاکستان کا نام دنیا کی اس مشہور کتاب میں آ گیا"

قائد اعظم متعدد بار علی گڑھ تشریف لائے لیکن
۳۳ء سے ۱۹۴۳ء تک وہ باقاعدگی سے ہر سال علی گڑھ

آئے مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا سے خطاب کیا انہیں مسلم لیگ کا ہراول دستہ قرار دیا۔ مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک حقیر طالب علم کی حیثیت سے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے بھی قائداعظم کے ایک ادنیٰ سپاہی کی طرح تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ مجھے علی گڑھ میں ان کی تقریریں سننے، ان سے ملاقات کرنے اور گفتگو سے شرفیاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں اپنی ذاتی مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ قائداعظم کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے والہانہ لگاؤ تھا اور وہ برصغیر پاک و ہند کی اس سب سے بڑی مرکزی مسلم درسگاہ کو قوم کی متاعِ حیات سمجھتے تھے جہاں ہندوستان کے تمام کونوں سے طلبا تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ اپنے ذاتی تاثرات اور چشم دید واقعات بیان کرنے سے قبل میں ایک امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان میں جب کوئی اہم اور نازک سیاسی موڑ آیا تو قائداعظم نے ہمیشہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طرف رجوع کیا اور اس پلیٹ فارم کو اظہار خیال کے لئے منتخب کیا۔ مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لکھنؤ منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۷ء جہاں سے مسلم لیگ کا عوامی دور شروع ہوتا ہے کے بعد قائداعظم ۵ر فروری ۱۹۳۸ء کو علی گڑھ تشریف لائے تاکہ مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لئے طلبا کا تعاون حاصل کرسکیں۔ قائداعظم نے مسلم یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں آپ سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ
آپ مسلم لیگ کے نظام میں شریک ہوجائیں
اگر مسلمانوں نے اتحاد و اتفاق کرلیا تو آپ کی
توقع اور اندازے سے کہیں پہلے سمجھوتہ ہو
جائے گا لیکن حصول آزادی سے پہلے
اپنے استحقاق کو منوانا ہوگا۔"

اسلامیان ہند کی تاریخ کا دوسرا نازک اور اہم ترین موڑ وہ تھا جب برصغیر کے نمائندہ اجتماع عظیم نے لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کی۔ اس قرارداد کی منظوری سے سترہ روز قبل مارچ ۱۹۴۰ء کو قائداعظم پھر علی گڑھ تشریف لائے تاکہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کو اس اجتماع کی اہمیت سے آگاہ کرسکیں جو ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں منعقد ہونے والا تھا۔ مسلم یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹس یونین نے ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا جس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"مسلمان ایک وحدت ہیں۔ ان کا ایک سیاسی
وجود ہے جسے ہر قیمت پر محفوظ رکھنا ہے۔ جب موجودہ
دستور کی تدوین ہو رہی تھی تو مسلمانوں نے
سندھ کی علیحدگی اور شمال مغربی سرحدی صوبے
میں مساوی اصلاحات کے نفاذ پر زور دیا لیکن
ہندوؤں اور نیشنل کانگریس اس کی مخالفت میں ایڑی
چوٹی کا زور لگایا۔ ہمارا مطمع نظریہ تھا کہ
کم از کم ان خاص علاقوں میں جہاں ہم
اکثریت میں ہیں ہمیں حقیقی اقتدار ملنا چاہیئے۔"

تقریر کے اختتام پر قائدِاعظم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کو نزاکت وقت کا احساس دلاتے ہوئے ان سے اپیل کی کہ

"کسی پر تکیہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں
ہوتا۔ ہم کو اپنے آپ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

میں ہر شخص کا دوست بننے پر رضامند ہوں
لیکن بھروسہ اپنی طاقت پر کروں گا۔ مسلم لیگ
نے تاحال بہت معقول کام کئے ہیں۔ لیکن ابھی
اس کا آغاز ہی ہے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے
کہ ہندوستان میں بھی درحقیقت جنگ ہو رہی
ہے۔ میں تم سے اپیل کرتا ہوں کہ شانہ سے شانہ
ملا کر لیگ کی صفوں میں کھڑے ہو جاؤ۔"

قائداعظم کی تقریر کے سترہ دن بعد لاہور کے تاریخی اجتماع میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔ اس تاریخی اجتماع میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک نمائندہ وفد بھی شریک ہوا۔ اس وفد کے ایک رکن اور مسلم یونیورسٹی کے فاضل استاد پروفیسر ڈاکٹر افضال حسین قادری نے قائداعظم کو ایک بار پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تشریف لانے کی دعوت دی۔ اس دعوت کے جواب میں قائداعظم نے جو الفاظ کہے وہ مسلمانوں کی اس عظیم درس گاہ کی عظمت کے آئینہ دار ہیں اور ان الفاظ سے اس محبت کا بھی اظہار ہوتا ہے جو قائداعظم کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ۔

"مجھے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی زیارت
کو ضرور جانا ہے۔"

چنانچہ مسلم لیگ کے اس تاریخی اجتماع کے اختتام پر جب قائداعظم بمبئی واپس جانے لگے تو انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لے جا کر ایک بار پھر برصغیر کی اس تاریخ ساز درسگاہ کو اپنے خطاب سے نوازا۔ اس موقع پر ان کے اعزاز میں مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین نے دعوت استقبالیہ منعقد کی۔ اس موقع پر قائداعظم نے بڑی ولولہ انگیز تقریر کی۔ آپ نے فرمایا۔

"آج میں آپ کی استقبالیہ دعوت
میں شریک ہو کر اپنی عمر دس برس کم محسوس
کر رہا ہوں۔"

قائداعظم نے مزید فرمایا کہ۔

"اب ہم نے اسلام کی خدمت کے
لئے جس طرح کمر باندھی ہے مجھے یقین ہے
کہ اس میں آپ کی پُرخلوص تائید ہمیں حاصل
ہوگی اور پاکستان قائم ہو کر رہے گا۔"

۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو قائد پھر علی گڑھ تشریف لائے اور طلبا کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ــــ

"میں ملت اسلامیہ کے ولولوں اور
تمناؤں کا ترجمان ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے
وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانان ہند کے دل میں
جو خیال موجزن تھا اس کا بے باکی سے اظہار
کر دیا ہے۔ اس پر سارے ہندو پریس،
ہندو اخبارات چراغ پا ہیں۔ انہوں نے مخالفت
کا ایک طوفان اٹھایا مگر ہمارے پائے ثبات
میں کوئی تزلزل پیدا نہ کر سکا۔"

یہ تو وہ واقعات تھے جن کا تعلق ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیانی عرصے سے ہے۔ اب میں ان واقعات کی طرف آتا ہوں جن کا میں نے بچشم خود مشاہدہ کیا۔ ۲ر نومبر ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے جب قائداعظم علی گڑھ تشریف لائے۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کا جوش شان

سے استقبال کیا گیا وہ کسی حکمران کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سارا شہر ریلوے اسٹیشن پر امنڈ آیا ہے۔ کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ریلوے اسٹیشن کی فضا نعرۂ تکبیر اور قائد اعظم زندہ باد کے الفاظ سے یوں گونج رہی تھی۔ شاعرانہ اصطلاح کے مطابق فلک میں شگاف پڑے جا رہے تھے۔ ہر طرف سبز پرچم لہرا رہے تھے۔ اور ان کے سائے میں قائد اعظم خراماں خراماں اسٹیشن سے باہر نکل رہے تھے۔ جب وہ اس بگھی میں سوار ہوئے جو خاص ان کی سواری کے لئے لائی گئی تھی تو طلبا کے جوش عقیدت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے بگھی کے گھوڑے کھول دیئے اور اسے خود کھینچتے ہوئے قائد اعظم کی قیامگاہ تک لے گئے۔ یونیورسٹی رائیڈنگ اسکول کا ایک ایک چاق و چوبند دستہ ان کے جلو میں تھا۔ شام کو اسٹریچی ہال میں جلسہ منعقد ہوا۔ ہال میں انسانی سروں کا ایک سمندر تھا کہ موجیں مار رہا تھا۔ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اے بی اے حلیم نے اس تاریخی جلسے کی صدارت کی۔ یہاں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ پروفیسر حلیم صاحب پرو وائس چانسلر ہونے کے علاوہ شعبۂ تاریخ کے صدر بھی تھے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں پروفیسر حلیم صاحب نے اپنی دوسری حیثیت کی نسبت سے چند ایسے الفاظ کہے جو واقعاتی ہونے کے ساتھ ساتھ قائد اعظم کے متعلق پیشین گوئی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر حلیم صاحب نے قائد اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ـــــ

"قائد اعظم! مجھے آپ سے ایک نسبت سے آجکل تاریخ پڑھا رہا ہوں اور آپ ان دنوں تاریخ بنا رہے ہیں۔"

اور اس میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔ واقعی ان دنوں قائد اعظم تاریخ بنا رہے تھے۔ وہ ایک تاریخ ساز شخصیت تھے۔ انہوں نے نہ صرف تاریخ بنائی بلکہ ایک بہت بڑا تاریخی ملک بنا دیا اور علی گڑھ کے متعلق مسلم دانشوروں میں جو جملہ مشہور تھا کہ :

"جو کچھ علی گڑھ آج سوچتا ہے وہ ہندوستان کل سوچے گا۔"

اس مقولے کی صداقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ قائد اعظم نے خطبۂ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ـــــ

"حضرات۔ آپ نے جس جوش اور خلوص سے میرا خیر مقدم کیا ہے میں اس کے لئے مشکور ہوں ایسا اعزاز اس ملک یا کسی ملک میں کسی کے لئے باعث صد افتخار ہوگا۔ آپ جیسے ارباب علم و دانش کے وہ جذبات جو اخبار ڈان کی امداد اور اعانت میں مضمر ہیں قابل صد ستائش ہیں اور مسلم لیگ کے سرمایہ میں آپ کی امداد کا بھی شکر گزار ہوں۔ آپ کی امداد میرے لئے ایک پیام امید ہے۔"

۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو قائد اعظم پھر علی گڑھ تشریف لائے۔ میں ان دنوں مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کا

کیبنٹ ممبر تھا۔ یہ وہ دور تھا جب قائدِ اعظم کی مقبولیت اور شہرت اپنے عروج پر تھی۔ اور وہ جہاں جاتے تھے مسلمان اپنی آنکھیں فرشِ راہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس بار علی گڑھ میں قائد اعظم کا ایسا پرجوش استقبال کیا گیا کہ اس قطعۂ زمین پر پھر یہ فقید المثال استقبال کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ اس بار قائدِ اعظم کے اعزاز میں مسلم یونیورسٹی میں جو جلسہ منعقد ہوا اس میں انہوں نے پاکستان کی تشریح کرتے ہوئے وہ تاریخی الفاظ ارشاد فرمائے جو آج بھی لاہور میں مینار پاکستان پر کندہ ہیں۔

"پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے وطن نہیں۔ اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی۔"

قائدِ اعظم کی اس بصیرت افروز تقریر نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء میں قیام پاکستان کے لئے ایسی روح پھونک دی۔ اور ان کے دلوں میں قربانی اور ایثار کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ مجھے یاد آیا ہے کہ قائد اعظم نے ۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ اور پاکستان کی تحریک کو ملک کے طول و عرض میں پھیلانے کے لئے مالی امداد کی اپیل کی تھی۔ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کی کابینہ نے قائدِ اعظم کی اس اپیل کے جواب میں فیصلہ کیا کہ یونین کے فنڈ سے ایک ہزار روپیہ مسلم یونیورسٹی کے طلباء کی طرف سے مسلم لیگ کے فنڈ میں دیا جائے۔ ۳۲ سال قبل کے زمانے کو دیکھتے ہوئے ایک ہزار روپے کی یہ معمولی رقم نہ تھی۔ یونین کی کابینہ کے اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ اس رقم کا ڈرافٹ لے کر ایک وفد دہلی جائے اور یہ حقیر نذرانہ قائد اعظم کی خدمت میں پیش کرے۔ میں اس وقت مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کا سکریٹری تھا۔ چنانچہ ایک وفد تشکیل دیا گیا جو پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ اس وفد میں میرے علاوہ سید مسعود زاہدی مسعود الحسن قریشی، قاضی فضل اللہ عباسی اور محمود الحسن شامل تھے۔ ہم لوگ ۲۹ نومبر ۱۹۴۴ء کو ۱۰۔ اورنگ زیب روڈ نئی دہلی پہنچے جہاں ان دنوں قائد اعظم مقیم تھے۔ جب ہم نے ایک ہزار روپے کا یہ ڈرافٹ قائد اعظم کی خدمت میں پیش کیا تو انہوں نے بڑی محبت و شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے اس حقیر رقم کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ اور چائے سے ہماری تواضع فرمائی۔ اس موقع پر ہمارے وفد اور قائد اعظم کے درمیان متعدد موضوعات پر گفتگو ہوئی جس کی تفصیلات میں اس وقت میں نہیں جاؤں گا۔ صرف اتنا عرض کروں گا جب ہمارے وفد کے ایک رکن سعود زاہدی صاحب نے قائد اعظم سے دریافت کیا کہ اگر انگریزوں اور ہندوؤں نے مسلم لیگ کے مطالبات کو نظر انداز کر دیا تو اس صورت میں آپ کا لائحۂ عمل کیا ہوگا۔ اس کا قائدِ اعظم نے جو جواب دیا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہیں

اپنے موقف کی صداقت اور اس میں کامیابی کا کس قدر یقین تھا انہوں نے فرمایا کہ:۔

"اس مرحلے پر انگریز مسلم لیگ
کے مطالبات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

میں نے اپنی گذارشات کے آغاز میں عرض کیا ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی میں جب کبھی کوئی نازک اور اہم موڑ آیا، قائداعظم نے ہمیشہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو یاد فرمایا۔ ۱۹۴۶ء میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی ملی تاریخ کا ایک ایسا ہی نازک سال تھا جب انہیں ملک گیر انتخابات کے ذریعے اس امر کا فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اپنی قسمت ہندو کانگرس کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں۔ یا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد ہو کر اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر پھر قائداعظم کی نگاہ انتخاب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر پڑی۔ وہ خود علی گڑھ تشریف لانا چاہتے تھے لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ کر سکے۔ اور اپنی بجائے آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری نوابزادہ لیاقت علی خاں کو اپنے ذاتی نمائندہ کی حیثیت سے علی گڑھ بھیجا۔ نوابزادہ صاحب نے علی گڑھ تشریف لا کر مسلم یونیورسٹی کے بڑے اجتماع میں قائداعظم کا یہ پیغام پڑھ کر سنایا کہ:۔

"میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ طالب علموں کو
اپنی تعلیم قربان کر کے سیاست میں حصہ نہیں لینا
چاہیے۔ مگر کبھی ایک قوم کی موت اور زندگی کا
وقت آجاتا ہے۔ آج وہی وقت درپیش ہے۔
میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے سکولوں اور
کالجوں سے نکل آؤ۔ خواہ تمہارا ایک سال
ضائع ہی کیوں نہ ہو جائے آؤ اور انتخابات
میں ہماری مدد کرو۔"

قائداعظم کا یہ پیغام مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا کے لئے راکٹ ثابت ہوا۔ قائداعظم کے اس پیغام نے طلبائے علی گڑھ کے ملی احساسات میں ایسی آگ لگا دی جس نے ہندو سامراج اور انگریزی استعمار دونوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ علی گڑھ کے دو ہزار سے زائد طلبا نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہا، سروں سے کفن باندھا اور قائداعظم کا پیغام پہنچانے کے لئے سندھ کے ریگستانوں سے لے کر صوبۂ سرحد کی سلاخ چٹانوں پر کہیں اونٹوں پر کہیں پیدل ہزاروں میل کا سفر کیا اور ہندوستان کے قریہ قریہ شہر شہر پہنچ کر دور افتادہ مسلمانوں کو قائداعظم کے پیغام اور مطالبۂ پاکستان سے روشناس کیا۔ تحریک پاکستان کے ان جیالوں نے پاکستان کا پیغام پہنچانے میں جو تکلیفیں برداشت کیں تحریک پاکستان کے سندھ میں ایک ممتاز لیڈر جی الانہ صاحب کی کتاب "قائداعظم جناح دی اسٹوری آف اے نیشن" سے بطور مثال ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

"جب جی ایم سید کی نشست
سے مسلم لیگی امیدوار کے مقابلے کا مرحلہ
آیا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سو
طلبا، قائداعظم کے حکم پر سندھ گئے اور
قائداعظم کے پیغام اور نظریۂ پاکستان کی
تبلیغ دور دراز علاقوں میں کی۔ ان طلبا

نے اونٹوں پر سفر کیا اور کتنے کتنے
دن صرف چند کھجوروں پر اکتفا کیا۔
مسلم یونیورسٹی کے ایک بنگالی طالب علم
ٹی ایم مصطفیٰ بھی تھے جو گذشتہ مرکزی حکومت
میں وزیر تعلیم بھی رہے تھے۔"
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کا یہی وہ جذبہ ملی اور
گراں قدر قربانیاں تھیں جنہیں دیکھ کر
قائد اعظم نے ۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء کو علی گڑھ
میں مسلمانوں کی اس عظیم درس گاہ اور
اس کے طلبا کو خراج تحسین پیش کرتے
ہوئے فرمایا تھا کہ ۔
"علی گڑھ مسلم انڈیا کا اسلحہ خانہ ہے۔
اور اس کے طلباء بہترین سپاہی ہیں۔"
میری دعا ہے کہ ہماری نئی نسل علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی جانفشانیوں کو مشعل
راہ بنا کر تعمیر پاکستان میں دلی لگن اور سچے
جذبہ سے حصہ لے ۔ آمین!

قائد اعظم آنجہانی گاندھی کی نظر میں

"راجپوتانہ کے قومی ورکر اور لیڈر شری رام نرائن جی چودھری اپنا زیادہ وقت مہاتما گاندھی کے پاس گذارتے۔ جب کبھی وہ دہلی تشریف لاتے دفتر "ریاست" میں بھی آتے اور کئی کئی گھنٹے مہاتما گاندھی کے حالات کا ذکر ہوتا۔ ان کا بیان ہے کہ باوجود اس بات کے کہ مسٹر جناح کی مسلم لیگی پالیسی ملک اور کانگریس کے لئے انتہائی نقصان کا باعث ہے۔ مگر مہاتما گاندھی کے دل میں مسٹر جناح کے لئے انتہائی عزت ہے اور مہاتما گاندھی پرائیویٹ سے پرائیویٹ دوستوں میں بھی جب کبھی مسٹر جناح کا ذکر کرتے ہیں تو انتہائی عزت کے ساتھ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مہاتما جی یہ سمجھتے ہیں کہ مسٹر جناح کے اندر کیریکٹر ہے۔ گورنمنٹ کسی قیمت پر بھی ان کو خرید نہیں سکتی، اور یہی وجہ ہے کہ گورنمنٹ نے جناح کو کبھی بھی اپنا نہیں سمجھا اور آپ سے گورنمنٹ ہمیشہ بدکتی رہی۔ جناح کے مقابلہ پر جن کانگریسیوں کے اندر کیریکٹر نہیں۔ مہاتما جی ان کو چوروں سے بھی بدتر اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں۔ ان کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے۔"

قائد اعظم محمد علی جناح

از سید مصطفیٰ علی (علیگ) بی کام۔ ایل ایل۔ بی

اس دارِ فانی میں حیات و ممات کا سلسلہ ازل سے قائم ہے اور ابد تک باقی رہے گا۔ یہ قانون قدرت ہے۔ اس کلیہ سے کسی ذی روح کو مفر نہیں۔ دنیا کی اس بے ثباتی کے پیشِ نظر وہ ہستیاں یقیناً قابل رشک ہیں جن کو لوگ مرنے کے بعد بھی نہ صرف یاد رکھتے ہیں بلکہ ان کے خیالات و افکار کو اپنے نہاں خانۂ دل میں جگہ دیتے ہیں۔ کسی فرد کی یہ امتیازی حیثیت اس کی اعلیٰ قومی خدمت اور ہمہ گیر بشری صلاحیتوں کی مظہر شمار کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے قائد اعظم کی ذات میں یہ سب خوبیاں پیدا کر دی تھیں، چنانچہ وہ دنیا کے ان چند خوش نصیب انسانوں میں سے ایک تھے۔ جو اپنی زندگی میں عوام کے محبوب لیڈر بن گئے۔ اور انتقال کے بعد بھی عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کے ساتھی ہیں۔

قابلِ تقلید شخصیت

قائد اعظم محمد علی جناح ہمہ صفت انسان تھے ان کی اکثر باتیں ہماری نئی نسل کے واسطے شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہیں بشرطیکہ جذب و قبول کی معمولی سی صلاحیت بھی موجود ہو۔ قائد اعظم فطرتاً احتیاط پسند تھے۔ وہ پریس کو جو بیان جاری کرتے اس کے مسودہ اور صاف کاپی کو بار بار پڑھتے۔ ان کی تقریر بھی بے حد جامع اور نپے تلے الفاظ کا مرقع ہوتی تھی۔ اپنے مشن کی کامیابی میں قائد اعظم کو ان اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے بہت مدد ملی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ان کے مشیر اور کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر قائد اعظم سے گفتگو کرنے سے قبل بہت گھبرائے ہوئے نظر آتے تھے۔ کیونکہ ان کو بجا طور پر خدشہ رہتا تھا کہ نہ معلوم کس نکتہ پر قائد اعظم ان کو بے بس کر دیں۔

قائد اعظم ایک متوسط الحال خاندان کے فرد تھے۔ انہوں نے زندگی کے سرد و گرم کا بخوبی مطالعہ کیا تھا۔ اور انسانی نفسیات بالخصوص مسلمانوں کے فطری رجحانات کے مبصر تھے۔ وہ جس کام کا بیڑا اٹھاتے اس کو کامیابی تک پہنچا کر دم لیتے تھے۔ قائد اعظم بڑے سچے اور راست باز شخص تھے۔ احساس کمتری کی کیفیت ان میں کبھی پیدا ہی نہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی قیادت کامیابی کے ساتھ کر سکے۔ ان کو قریب سے دیکھنے والے ایک بزرگ کا بیان ہے کہ

"جب کبھی انھیں کسی بڑے سے بڑے برطانوی

سیاست دان سے باتیں کرتے دیکھا گیا تو دیکھنے والوں کے اذہان پر جو واحد تاثر مرتسم ہوا وہ یہ تھا کہ وہ برطانوی وزراء کی شخصیت اور ان کی قابلیت سے کچھ زیادہ متاثر نہیں تھے۔"

قائد اعظم کا گفتگو کرنے کا انداز بڑا سادہ دلنشیں اور واضح ہوتا تھا۔ ان کی بات چیت کی خوبی یہ تھی کہ وہ مختصر الفاظ میں اپنا مافی الضمیر سامع تک پہنچا دیتے تھے۔ قائد اعظم وقت کا استعمال بہت اچھی طرح کرتے تھے۔ دوران سفر بھی ضروری مطالعہ اور کام میں مشغول رہتے تھے۔

سیاسی قیادت

اپنی اصابت رائے اور منفرد کردار کی بنا پر برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں قائد اعظم کو ہمیشہ ایک نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ وہ ایک زمانہ تک دیانت داری کے ساتھ کانگریس میں شریک رہے۔ لیکن وقت نے ان کو بتا دیا کہ ہندو مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ اور یہ مل کر نہیں رہ سکتیں۔ اپنی عادت کے تحت جونہی وہ ایک نتیجہ پر پہنچے۔ انہوں نے اپنے موقف سے سرمو انحراف نہ کیا اور مسلسل جدوجہد کے بعد بالآخر مسلمانانِ ہند کے واسطے ایک "ہوم لینڈ" یعنی پاکستان بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستان کی جنگ درولبت ذہانت۔ قابلیت اور اعلیٰ قیادت کی رہون منت ہے اور یہ ساری خوبیاں صرف ایک شخص میں مرکوز تھیں جس کا نام محمدؐ علی جناح تھا چونکہ مسلمان قوم کو من حیث المجموع ان کی ذات پر اعتماد تھا اس لئے اتحاد ملت کے معاملہ میں صوبائی۔ مذہبی اور دیگر مسائل کا وجود بھی باقی نہیں رہا جب تک قائد اعظم اور قائد ملت لیاقت علی خاں زندہ رہے پاکستان ایک خالص نظریاتی مملکت کا بجا طور پر دعوی گیر رہا۔ یہ بات غیر ملکی طاقتوں بالخصوص یہودیوں اور ہندوؤں کو سخت ناگوار گذری۔ چنانچہ کامیاب سازشیں کی گئیں جو حسب پروگرام اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ آج ہمارا پاکستان نصف رہ گیا ہے۔ اغیار کو اب بھی صبر نہیں ہے۔ داخلی انتشار نے طرح طرح کے خدشات پیدا کر دیئے ہیں۔ نازک حالات میں روح قائد اعظم ہم سے پوچھتی ہے کہ تم نے پاکستان کی امانت کے ساتھ کیا انصاف کیا۔ مزار قائد پر حاضری دینے والے علماء، صلحاء، شرفاء کو اپنے ضمیر کا محاسبہ کرنا چاہیئے۔ اور دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے اپنی ذات اور خاندان کے علاوہ ملک و ملت کے مجموعی مفاد کے لئے کیا کام کیا ہے۔

قائد کی رحلت

کل کی بات تھی قائد اعظم پاکستان تشریف لائے اس عظیم شہر کی سڑکیں ان کی ایک جھلک دیکھنے والے عقیدت مندوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ابھی مملکت کا کاروبار شروع ہی ہوا تھا کہ ناگاہ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم کا انتقال ہو گیا۔ راقم السطور اس وقت بھارت ہی میں مقیم تھا۔ اس خبر کو سن مسلمانان بھارت کو شدید صدمہ پہنچا۔ مسلمانوں کی دارو گیر جاری تھی۔ فسادات کے لامتناہی سلسلے نے زندگی عذاب کر دی تھی۔ آئے روز گرفتاریاں، کرفیو یہ سب پاکستان بنانے کی سزا تھی۔ جو مسلمانوں کا مقدر ہو چکی تھی۔ لیکن ہندی مسلمانوں کو اس بات سے اطمینان تھا کہ قائد اعظم پاکستان کے گورنر جنرل ہیں وہ سب ٹھیک کریں گے۔ شاید یہ بات اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوئی۔ غیب کا عال

وہی جان سکتا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں قائد کی وفات کی خبر جب پہنچی تو فوراً ماتمی سائرن بجنے لگے۔ بالکل اسی طرح جیسے بادشاہوں کے سوگ میں بجائے جاتے تھے۔ طلبا نے ماتمی جلوس نکالا۔ ہر شخص کی زبان پر یہی سوال تھا کہ اب کیا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ قائد اعظم دلوں کے شہنشاہ تھے۔ ان کا ماتم کیوں نہ ہوتا۔

ایک خاتون کے تاثرات

لیڈی ڈاکٹر عبد الغفور

بسمل بیلی بھٹوی اور ان کے شوہر پاکستان سے محبت کے جرم میں جاسوس قرار پائے۔ اور چھ ماہ کے واسطے قید کر دیئے گئے۔ بیگم صاحبہ کو بنارس جیل بھیجا گیا۔ راستہ میں انہوں نے قائد اعظم کی وفات کی خبر سنی۔ اب یہ حال خود اُن کے الفاظ میں سُنئے جو انہوں نے اپنی کتاب "بھارتی جیل میں چھ ماہ" میں تحریر کئے ہیں۔

"میں نے ٹرین ہی میں نماز ادا کی۔ بنارس کے لئے گاڑی لکھنؤ سے تبدیل کی گئی: جیسے ہی بنارس جلنے والی ٹرین میں سوار ہوئی یکلخت سب ہندو مسافروں کی زبان پر یہ آوازیں سنائی دیں۔ رات جناح مر گیا۔ گاڑی میں سب ہندو مسافر تھے۔ سوائے میرے کوئی مسلمان نہیں تھا میرے ساتھ جو سپاہی بھیجے گئے تھے وہ بھی ہندو تھے یہ سب مسافر سرشار تھے اور سکھ تھے جو بہت ہی وحشیانہ طریقے سے شور مچا رہے تھے۔ بڑا خوش قسمت تھا جناح! پاکستان بنا کر مرا۔ کاش ایک سال پہلے مر جاتا۔ میں خاموشی یہ دردناک اور دلخراش خبر سن رہی تھی اور صبر و غم کے گھونٹ پی رہی تھی۔ میں نے اس منحوس خبر کی تردید کے لئے اسٹیشن سے ایک انگریزی اخبار خریدا۔ اس میں لکھا تھا کہ قائد اعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان رات دس بج کر ۲۰ منٹ پر انتقال فرما گئے۔ گاڑی پوری رفتار سے چل رہی تھی اور میں بھی اپنے دل و دماغ پر پورے طریقہ سے قبضہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہندو اخبارات کا خراج تحسین

قائد اعظم کی سیاست کی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ برادرانِ وطن کی غالب اکثریت ان کی شدید ترین مخالف تھی۔ لیکن ایک اچھے لیڈر کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ مخالف بھی اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً گاندھی جی آنجہانی کا کہنا تھا کہ "قائد اعظم کو نہ کوئی خرید سکتا ہے اور نہ وطن و ملت کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔

قائد اعظم کی وفات پر بھارتی پریس کا ردعمل قابل دید تھا۔ ذیل میں چند اقتباسات درج کئے جا

ہندوستان ٹائمز دہلی

اچھا کیا یا برا کیا اس سے قطع نظر اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ ان کے عزم بالجزم کے سامنے حقائق مٹ گئے اور خواب و خیال حقیقت کی شکل میں مجسم ہو کر دنیا

سامنے آگئے۔ انہوں نے اپنے زمانے کے عظیم ترین شخصیت (گاندھی جی) کو للکارا اور بازی جیتی۔ ان کے سیاسی مخالفین بھی تسلیم کئے بنا نہیں رہ سکتے کہ مسٹر جناح اپنے ارادہ کے پکّے اور پُرخلوص نیت کے مالک تھے۔

روزنامہ ویر بھارت (مہاسبھائی آرگن) "ہمیں یہ بھی اعتراف کرلینا چاہئے کہ متحدہ ہندوستان کی تمام طاقتیں اس ایک شخص سے شکست کھا گئیں۔ غیر جانبدار تاریخ لکھنے والے مجبور رہوں گے کہ محمد علی جناح کو دنیا کے بڑے آدمیوں میں شمار کریں۔ یقیناً وہ ایک بڑے آدمی تھے۔ نہ ہوتے تو تاریخ کا رُخ کیسے پلٹ سکتے۔

روزنامہ ملاپ دہلی "متحدہ ہندوستان نے مسٹر جناح سے زیادہ ارادہ کا مضبوط اور سخت کوش آدمی آج تک پیدا نہیں کیا۔ مسٹر جناح نے جو آدرش رکھا اُس پر چٹان کی طرح قائم رہے۔ مخالفتوں کے طوفان، نکتہ چینیوں کی آندھیاں، ناموافق حالات کے بھونچال کوئی بھی انھیں اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا۔ جہاں وہ ایک جگہ کھڑے ہوگئے ہوگئے۔ ...... آخر کار وہ دن آیا جب وہ بات جسے ہم لغویت کی انتہا کہتے تھے اصلیت بن کر ہمارے سامنے آگئی۔ .... یہ سب کچھ اچھا تھا یا بُرا، اس پر بحث کی آج ضرورت نہیں ۱۹۴۹ء لیکن اس بات کو کون تسلیم کرنے سے انکار کرسکتا ہے کہ مسٹر جناح ایک زبردست قوتِ ارادی کے مالک تھے۔

روزانہ پرتاپ ہمیں یہ ماننے میں چنداں تامل نہیں کہ مسٹر محمد علی جناح ان لوگوں میں سے تھے جو ایک انسٹیٹیوشن بن چکے تھے۔ پوربی پنجاب کے مسلمانوں نے پاکستان کے قیام میں اپنے جان و مال کی قربانی دی لیکن یہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اگر پاکستان آج دنیا کے نقشہ پر ہے تو مسٹر جناح کی بدولت ...... اس وقت کانگریسی لیڈروں کی کمزوری کا ذکر بے معنی ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر مسٹر جناح نہ ہوتے تو پاکستان نہ بن سکتا تھا۔ یہ ان کی دور درشتا تھی جس نے سات سال پہلے دیکھ لیا کہ کانگریسی لیڈران اُن کا مطالبہ رد نہ کرسکیں گے۔ اس بات کو دل میں بٹھا کر آپ نے ایک مُردہ قوم کو زندہ کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس مطالبہ کی بابت ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر (گاندھی جی وغیرہم) یہ کہتا تھا کہ پاکستان میری قبر پر بنے گا۔ وہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو حقیقی شکل میں ان کے سامنے آگیا۔

آپ نے قائداعظم کے متعلق ان کے بدترین سیاسی مخالفین کے بیانات ملاحظہ فرمائے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ قائداعظم کے پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی جمہوریہ پاکستان بنانے کی جدوجہد کریں۔ منافقانہ تقریروں، تحریروں اور اعلانات سے پرہیز کریں۔ اعلیٰ قومی مقاصد کے حصول کے واسطے اسی اخلاص، جذبہ اور دیانت کی ضرورت ہے جو قائداعظم کی بامراد زندگی میں کارفرما تھا۔

ہماری ناچیز رائے میں قائداعظم کے پیغام کو ہر پاکستانی بچہ کے کان میں اس طرح پھونکا جائے کہ وہ بڑا ہو کر صحیح معنوں میں پاکستان کو ایک فلاحی مملکت اور ایک اسلامی ریاست بنانے میں اہم کردار ادا کر سکے۔ قائداعظم کے ساتھ یہ شدید ناانصافی ہوگی کہ ہم سال میں دو مرتبہ ان کی یاد منا کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیں اور ان کی مقدس امانت پاکستان کے استحکام اور حفاظت کے واسطے کچھ نہ کریں۔ نظریاتی اعتبار سے بھی ہمیں قائداعظم کی تعلیمات پر عمل کرنا چاہیئے۔ آپ کا ایک پیغام ملاحظہ ہو جو آجکل ہمارے حالات کے عین مطابق ہے۔

"اب مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ متحد ہو جائیں۔ وہ شیعہ سنی اور وہابی کے امتیازات کو بالائے طاق رکھ دیں۔ وہ صوبائی تعصبات کو بھی خیرباد کہہ دیں۔ ایسا (متعصبانہ) طریقۂ فکر مسلمانوں کے لئے مصیبت کا باعث بنے گا۔ ہم صرف اسلام کے خادم ہیں۔"

جناح — ایک مینارِ نور

(ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم)

قائداعظم کی شخصیت ایک ایسی شخصیت تھی۔ ان کی شخصیت اس وقت کے حکمرانوں اور لیڈروں سے مابہ الامتیاز تھی۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر وزیراعظم برطانیہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے قائداعظم سے کہا کہ ملکی اختیارات اور انتظامات سنبھالنے کے لئے ہم کو قابل ہندوستانیوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ قائداعظم نے فوراً جواب دیا۔ مجھے آپ رشوت یا لالچ دے رہے ہیں۔ قائداعظم کو مخالفین مغرور کہتے تھے۔ مگر قائداعظم اپنے مخالف اور باطل کے سامنے نہیں جھکتے تھے۔ اگر یہی غرور ہے تو ایسا غرور اچھا ہے۔

انگریز حکمران اور ہندو سیاستدان سب اس بات کو مانتے تھے۔ کہ جناح ناقابلِ خرید ہے۔ محمد علی جناح کی شخصیت ایک نور کا مینار ہے۔ جب ہم راستہ بھٹک جائیں تو یہ روشنی کا مینار ہم کو صراطِ مستقیم دکھانے والا ہے۔

ہم سب چاہتے ہیں کہ پاکستان میں علوم و فنون کی ترقی ہو، عدل کی حکومت ہو، معاشی مساوات قائم ہو۔ غرض یہ کہ پاکستان ایک مثالی حکومت ہو جو دنیا کی حکومتوں کے لئے ایک نمونہ بنے۔ خدا کی ذات سے ہمیں امید واثق ہے کہ ہمارا مستقبل تابناک ہوگا۔

قیام پاکستان کا پس منظر

قائدِ اعظم کا کارنامہ

از جناب اخلاص حسین زبیری ایم۔ اے

ہم ساکنان پاکستان کو یہ موضوع قطعی پیش پا افتادہ اور غیر اہم معلوم ہو سکتا ہے لیکن تاریخ کے نقطۂ نظر سے قیام پاکستان نہایت عظیم الشان اور اہم واقعہ ہے۔ ایسا واقعہ جس کی مثال تاریخ میں باوجود تلاش و تفحص نہیں ملتی۔ ۱۲½ کروڑ انسانوں پر مشتمل ایک آزاد اور خود مختار مملکت کا قیام بہ ہر صورت بہت بڑا واقعہ تھا۔ لیکن اس کی اس خصوصیت نے کہ یہاں مسلمانوں کی عظیم اکثریت تھی جس کی بنا پر یہ مملکت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت قرار پا گئی تھی، اس واقعہ کو عظیم تر کر دیا۔ ایسا کیوں سمجھا گیا اس کی وضاحت ضروری ہے۔

پاکستان کی اہمیت

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اسلام ایک نعمت عظمیٰ ہے اور اس نعمت کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لئے کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض اولین ہے۔ اگرچہ ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کی بنیادی کتاب قرآن پاک کی حفاظت کا وعدہ خدا نے خود فرمایا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان اُس کی حفاظت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ چونکہ خدائی اصول یہ ہے کہ انسانوں کی اصلاح کا کام انسانوں سے ہی لیا جاتا ہے۔ محض فرشتوں سے نہیں، اسی نظریہ کے پیشِ نظر جب ۱۹۱۹ء میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ خلافت عثمانیہ کو بیخ و بن سے ختم کیا جا رہا ہے، تو ہندوستان کے مسلم عمائدین نیز عوام میں بہت بے چینی پھیلی۔ ترکی کو اس جنگ میں شکست ہو گئی تھی اور اتحادی یعنی برطانیہ، فرانس وغیرہ غالب آ گئے تھے۔ مسلم قائدین کا خیال تھا کہ برطانیہ ہندوستانیوں کی درخواست پر خلافت کو برقرار رکھنے پر رضامند ہو جائے تو غالباً یہ ادارہ کلیتہً ختم نہ ہو گا۔ لیکن مسلمانوں کی یہ کوشش باوجود بہت سی قربانیاں دینے اور ہندوؤں کا تعاون کرنے کے کامیاب نہ ہوئی کیونکہ اگرچہ حکومت برطانیہ ہندوستانیوں کی درخواست پر اس معاملہ پر ہمدردانہ غور کرنے کے لئے تیار ہو گئی لیکن خود ترکوں کے مشہور قائد اتاترک اس ادارے سے بددل ہو گئے تھے اور وہ اسے ہرگز باقی رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم اس پر بحث کرنا نہیں چاہتے کہ ان کا یہ خیال کیوں تھا لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس اقدام سے انہوں نے اسلام کے ایک

بنیادی اصول کی خلاف ورزی کی تھی۔ خلافت کے انہدام کے بعد ترکوں نے اپنی ایک قومی حکومت اناطولیہ میں قائم کرلی اور ۱۹۲۳ء کے صلح نامے میں اتحادیوں نے اس کی آزادی اور خود مختاری بخوشی قبول کرلی کیونکہ وہ جذبۂ قومیت کے حامی اور اسلام کے فروغ کے خلاف تھے۔ خلافت عثمانیہ کے بقیہ ممالک کو فاتحین نے آپس میں تقسیم کرلیا۔ شام اور لبنان بین الاقوامی نظام تولیت کے تحت فرانس کی تحویل میں دیدیئے گئے۔ عراق اور مصر برطانیہ کو دیئے گئے۔ شمالی افریقہ کی مملکتیں لیبیا، مراکو، الجیریا پہلے ہی سے یوروپین اقوام کے قبضہ میں تھیں صرف سعودی عرب کو سیاسی آزادی حاصل تھی لیکن اقتصادی اعتبار سے یہ مملکت بھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بُری طرح دست نگر تھی۔ دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵) کے اختتام تک عالم اسلام کی یہی حالت رہی۔ اس دوسری عالمی جنگ میں بھی اتحادیوں یعنی برطانیہ، فرانس اور روس کو فتح حاصل ہوئی لیکن جرمنی اور اٹلی نے جنگ کے دوران اتحادیوں کے خلاف جو پروپیگنڈا کیا تھا اُس کا اثر ان تمام ممالک پر جن کی آزادی پہلی عالمی جنگ کے بعد سلب کی گئی تھی، بہت پڑا اور سب کے دلوں میں حصول آزادی کی تڑپ پیدا ہوگئی۔ دیگر بین الاقوامی حالات نے بھی کچھ ایسی شکل اختیار کرلی کہ برطانیہ اور فرانس وغیرہ کو اپنے مقبوضہ ممالک پر وہاں کے باشندوں کی مرضی کے خلاف قبضہ جمائے رکھنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ چنانچہ تمام مقبوضات رفتہ رفتہ آزاد ہونے لگے۔ آزادی کی یہ لہر برصغیر میں بھی شدومد کے ساتھ پہونچی جس کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خلافت کے ختم ہونے کے بعد جو یاس انگیز حالات پیدا ہوئے ان کو دیکھ کر ہمارے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا کہ ۱۲½ کروڑ انسانوں کی آزاد مملکت پاکستان کے قیام سے عالم اسلام کو کس درجہ تقویت پہونچی ہوگی اور اس مژدۂ جانفزا کے اثر سے وہاں کے عمائدین اور عوام کے حوصلے کتنے بلند ہوگئے ہوں گے۔ اور اگر پاکستان وجود میں نہ آتا تو وہ کتنی عظیم تقویت سے محروم ہوجاتے۔

فروغ اسلام کے لئے موجودہ حکومت کی مساعی

ایک قوی اور خوشحال پاکستان کا وجود بلاشبہ پورے عالم اسلام کے لئے باعث طمانیت و تقویت ہونا چاہیئے۔ ہماری موجودہ حکومت نے فروغ اسلام کے لئے جو کارروائیاں کی ہیں مثلاً لاہور میں دوسری سربراہ کانفرنس کا انعقاد، سیرت کانگریس کا قیام جس کے اجلاس ہر سال مختلف اسلامی ممالک میں ہوا کریں گے اور حج کی فراخ دلانہ پالیسی کافی اہم کارگزاریاں ہیں، اور انہیں خلافت کے انہدام سے پیدا شدہ خلا کے پُر کرنے کی جانب ابتدائی اقدامات سمجھا جاسکتا ہے۔ سیرت کانگریس کے سالانہ اجلاسوں سے یقیناً بہت کچھ امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے حالات

دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر برصغیر

میں بھی جیسا اوپر ذکر کیا گیا حصول آزادی کے لئے شد و مد سے مطالبہ کیا گیا۔ ہندو پورے ہندوستان پر پارلیمانی جمہوریت کے طرز کی ایک متحدہ مملکت قائم کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ملک میں ان کی اکثریت تھی اور وہ جانتے تھے کہ جمہوری مملکت میں اقتدار اعلیٰ اکثریت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ مسلمان سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کے تحت رہنا انگریزوں کی ماتحتی میں رہنے سے بھی زیادہ دشوار ہوگا۔ چنانچہ ان کا مطالبہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی ایک خود مختار مملکت قائم کی جائے۔ اسی کو پاکستان کا مطالبہ کہا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ اس مطالبہ کی راہ میں کیا کیا دشواریاں تھیں :-

قیام پاکستان کی راہ میں دشواریاں

(۱) آل انڈیا نیشنل کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء میں ہو چکا تھا۔ ہندوؤں میں بڑے بڑے قابل زعما (نیتا) پیدا ہو چکے تھے اور وہ سب نیشنلسٹ یعنی ہندو قومیت کے جذبہ سے سرشار تھے۔

(۲) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد سے مسلمانوں کی حالت بہت سقیم ہو گئی تھی اور ہندو اپنے آپ کو دولت مندی، تعلیم اور تدبر میں مسلمانوں سے افضل سمجھنے لگے تھے اور تعدادی برتری تو ان کو حاصل ہی تھی۔

(۳) ہندو زعما کو سنگین خدشہ تھا کہ اگر مسلمانوں کی کوئی آزاد حکومت بن گئی۔ تو وہ دیگر اسلامی ممالک سے مل کر ان کے لئے ایک سخت مسئلہ بن جائیں گے

(۴) دولت مندی، تعلیم اور تعدادی برتری کے زعم میں ہندو یہ حوصلہ بھی رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو ایک اقلیت کی حیثیت میں رکھ کر وہ ان پر حکومت کر سکیں گے۔ اور محمود غزنوی اور اورنگ زیب جیسے فاتحین کی افسانوی سختیوں کا بدلہ بھی چکا سکیں گے۔

(۵) ہندوؤں کو ایک ایسے مہاتما بھی مل گئے تھے جن کا ہندو عوام پر بہت اثر قائم ہو گیا تھا۔ وہ چھوت چھات کو ختم کرنے کی تلقین کرتے تھے تاکہ نچلے طبقہ کے ہندو (شودر) بھی اوپر کے طبقہ کے ہندوؤں کے ساتھ مل جائیں۔ یہ مہاتما (مہاتما گاندھی جی) سب سے بڑے لیڈر ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ برطانوی ارباب حکومت بھی ان کی عوامی ہر دلعزیزی سے مرعوب ہو چلے تھے۔

(۶) تھیاسوفیکل سوسائٹی کے ممبران زیادہ تر کانگریس کے ہمنوا تھے۔ اس سوسائٹی کی پریزیڈنٹ اینی بیسنٹ نے ہندوؤں کے موقف کی تائید میں ہوم رول تحریک کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اس سے کانگریس کی نیشنلسٹ تحریک کو بہت تقویت پہونچی۔ مسلمانوں میں پڑھے لکھے لوگ کافی تعداد میں اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ یہاں تک کہ کثیر تعداد میں علما، مولانا ابوالکلام آزاد کی تقلید میں نیشنلسٹ ہو گئے۔

(۷) انگلستان کے اونچے طبقہ کے عمائدین ہندستان کو متحد رکھنے کے خواہشمند تھے۔ چونکہ وہ مسلمانوں کی کسی آزاد مملکت کے وجود کو پسند نہ کرتے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے متعلق یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ جواہر لال نہرو کے اس خیال کے حامی تھے۔

کہ پاکستان کو عارضی طور پر بننے دیا جائے اور بعد کو ایسے حالات پیدا کئے جائیں۔ کہ پاکستان شکست ہو جائے اور اکھنڈ ہندوستان کی واحد مملکت وجود میں آجائے۔

قیام پاکستان کے اسباب

لیکن مذکورہ تمام دشواریوں کے باوجود مسلمان ہندوستان کو دو حصوں میں منقسم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ کیا عوامل اور اسباب تھے، جن کے باعث مسلم لیگ کو یہ کامیابی حاصل ہوئی؟ یہ بھی ملاحظہ فرمائیے :۔

(۱) مسلمان تعداد میں دس کروڑ تھے اور واقعی ان کا مذہب اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے ہندوؤں سے الگ اور متمیز تھے۔ اور ماضی قریب میں وہ ہندوستان پر سات سو آٹھ سو سال حکومت کر چکے تھے۔ انہیں بطور ایک اقلیت ہندوؤں کے زیر اقتدار رہنا پسند نہ تھا۔

(۲) ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ چھوت چھات برقرار رکھی تھی۔ کانگریسی تعلیم یافتہ اشخاص کی کوششیں رجو وہ چھوت چھات کم کرنے کے لئے کر رہے تھے۔ ہنوز ہندو عوام میں مقبول نہیں ہوئی تھیں۔

(۳) ہندوؤں کے ایک سربرآوردہ نے جو آریہ سماجی کہلاتا ہے کچھ عرصہ سے مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن مجید پر حملے شروع کر دیئے تھے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی "رنگیلے رسول" جیسی احمقانہ اور دل آزار کتابیں لکھیں۔

۴۔ اردو کے رسم الخط اور اردو زبان کے خلاف ہندوؤں نے محض مسلمانوں کو معاشی نقصان پہونچانے کے لئے سخت مہم شروع کر دی۔

۵۔ مسلمانوں کو عام طور پر یہ احساس تھا کہ ان کی مالی حالت اس لئے خراب ہے کہ ہندوؤں نے تجارت اور صنعت پر غیر منصفانہ اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔

۶۔ ایک گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی تھا جو پاکستان کے قیام کو اسلام کی تقویت کا باعث سمجھتا تھا۔ اور یہ لوگ ذاتی سود و زیاں کا حساب لگائے بغیر پاکستان کے قیام کے حق میں تھے اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار تھے۔

۷۔ فوج میں مسلمانوں کی تعداد اس تناسب سے کافی زیادہ تھی۔ جو انہیں آبادی میں حاصل تھا۔ یہ چیز پاکستان کو ممکن بنانے میں بے حد موثر ثابت ہوئی۔

۸۔ تشکیل پاکستان کے سلسلہ کی تین کلیدی شخصیتیں ہیں۔ سب سے پہلی شخصیت علامہ محمد اقبال کی ہے جنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی عدیم المثال شاعری اور خطبات کے ذریعہ ذہنی اعتبار سے تیار کیا۔ اپنے ایک صدارتی خطبہ میں جبکہ وہ مسلم لیگ کے سنہ ۱۹۳۰ء کے اجلاس بمقام الہ آباد کی صدارت کر رہے تھے۔ قوم کو پاکستان کا تصور دیا۔ اپنی نظموں میں مسلمانوں کو حوصلہ مند اور اولالعزم بننے کی تلقین کی۔ ایک نظم "مرد مومن"

میں جس کا پہلا شعر ہے سہ

"ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان"

شروع سے آخر تک یہی تلقین کی گئی ہے نیز اس عنوان پر اور بہت سے اشعار میں مسلمانوں کو سخت کوشی کا درس بھی انہوں نے بہت جگہ دیا ہے۔ ایک شعر بطور نمونہ پیش ہے۔ سہ

"جو سختیٔ منزل کو سامانِ سفر سمجھے
اے وائے تن آسانی ناپید ہے وہ راہی"

آپ کا تیسرا محبوب موضوع ہے۔ "مال و متاعِ دنیوی اور تعیش سے مسحور نہ ہونا" اس موضوع پر ان کا ایک شعر نمونتاً پیش ہے سہ

"صیاد ہے کافر کا نخچیر ہے مومن کا
یہ دیر کہن یعنی بتخانۂ رنگ و بو"

سب سے بڑی شخصیت قائداعظم محمد علی جناح کی ہے۔ انہوں نے قیام پاکستان کے لئے جس قابلیت حوصلہ مندی اور مستقل مزاجی سے کام کیا اس کی جتنی بھی تعریف و توصیف کی جائے وہ کم ہے انہوں نے قابل ہندو لیڈروں اور حکمراں قوم کے چوٹی کے عمائدین اور افسروں کا بلا جھجک مقابلہ کیا اور اکثر کامیابی نے ان کے قدم چومے جس کے نتیجہ میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ سب سے اہم کام قائداعظم کے سامنے مسلم لیگ کو تمام مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنانا تھا۔ اس کے لئے انہیں انتھک محنت کرنی پڑی تقریباً تمام ملک کا انہوں نے دورہ کیا اور اپنی گفتار اور کردار سے ملک کے دیگر مسلم قائدین کو اپنا ہمنوا بنایا۔ حسرت موہانی جیسے راسخ العقیدہ لوگ بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔

قیام پاکستان کے بعد اس کی معیشت کو مستحکم کرنے میں بھی قائداعظم کے اثرات نے بے پناہ کام کیا۔ اور بھارتی وزیراعظم کی یہ ناپاک سازش کہ پاکستان کو معاشی دباؤ یا تشدد کے ذریعہ ختم کر دیا جائے گا۔ قطعاً ناکام اور بے معنی ہو گئی۔ تیسری کلیدی شخصیت شہید ملت لیاقت علی خاں کی ہے شہید ملت نے بے نظیر جذبہ خود سپردگی سے کام لیکر تعمیر پاکستان کے کام میں قائداعظم کے ساتھ تعاون کیا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد ملک کے کام کی پوری ذمہ داری ان کے کندھوں پر آگئی کیونکہ وہ پہلے وزیراعظم تھے۔ انہوں نے ہر کام کو مثالی محنت، دیانتداری اور دلیری سے انجام دیا۔ شہید ملت کی وہ تقریریں جو انہوں نے اسلام اور پاکستان پر اپنے دورۂ امریکہ کے زمانہ میں کیں بہت قابل قدر ہیں۔ شہید ملت کا جذبہ ایثار اور پاکستان سے عشق بے مثال تھا۔ ان کی زندگی کے آخری لمحہ میں ان کی زبان پر یہ جملہ تھا "خدا پاکستان کی حفاظت کرے" قیام پاکستان کے سلسلہ کی یہ تینوں شخصیتیں غیر فانی ہیں۔ دنیائے علم و ادب اور تاریخ انہیں کبھی فراموش نہ کرے گی

موجودہ حالات

۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد پاکستان کے دو حصے ہو گئے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے عاشق مجیب الرحمٰن نے پاکستان سے غداری کی اور بھارت کی مدد سے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل کر دیا۔ مجیب کو یہ غداری راس نہ آئی اور بھارت نے بھی ایک ہمسایہ ملک کے خلاف ایک غدار کی مدد کر کے اپنی کوتاہ نگہی اعتداد پروری اور مفاد پرستانہ ذہنیت کو بُری طرح فاش کر دیا۔ ہماری موجودہ حکومت نے ان دونوں جنگجو ملکوں سے صلح جوئی کا رویہ اختیار کیا۔ یہ اعتدال پسندانہ رویہ ہمارے وزیر اعظم کی دور اندیشی کا نتیجہ تھا۔ اور پاکستان کو اس میں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ بنگلہ دیش کے ساتھ تقریباً تمام معاملات دوستانہ فضا میں طے ہو رہے ہیں۔ بھارت کے ساتھ بھی کشمیر کے علاوہ امور نزاعی ختم ہو رہے ہیں۔ بھارت اگر سیاسی اقتدار سے وابستہ اکھنڈ بھارت کا خیال ترک کر دے تو پاکستان اور بھارت میں مکمل دوستانہ تعلقات پیدا ہو سکتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے باشندوں میں باہمی خیر سگالی اور ہمدردی موجود ہے اور ثقافت اور زبان میں بھی بہت کچھ یکسانیت ہے۔ کشمیر کا مسئلہ طے ہونے اور دوستانہ فضا پیدا ہو جانے کے بعد دونوں ملک کافی حد تک ایک دوسرے سے گھل مل سکتے ہیں۔ دونوں ملکوں کو دفاع پر کثیر سرمایہ صرف نہ کرنا پڑے گا اور آزادی کے خوش آیند ثمرات سے دونوں ملکوں کے غریب عوام بہرہ مند ہو سکیں گے۔

غزل

اختر الجاہدی حیدر آباد "سندھ"
(مدیر شعبۂ نظم ترجمان اہلسنت کراچی)

ہر ایک حرف ہے تصویر خونچکانِ حیات
کہاں سے کیجئے آغازِ داستانِ حیات

اسی کی راکھ سے کھلتے ہوئے چمن دیکھے
شرر بدوش رہا ہے جو گلستانِ حیات

ہیں ایک وہ کہ جو زندہ ہیں جان دے کر بھی
اور ایک ہم کہ ہیں جی کر بھی کشتگانِ حیات

ہوں جیسے جسم کی قبروں میں روح کے لاشے
یہ بے حسی کا سراپا یہ داعیانِ حیات

کچھ اور ہوگی عزائم میں پختگی پیدا
اٹھائے جاؤ ستم اے ستم کشانِ حیات

چھپے گا حال نہ صیاد ہم اسیروں کا
زباں کٹی ہے تو چہرے ہیں ترجمانِ حیات

تمام شب ہوئی تارے بھی سو گئے اختر
مگر نہ ختم ہوئی اپنی داستانِ حیات

قائد اعظم چند تاثرات چند تجربات

از
جناب پروفیسر جلیل قدوائی

میں نے بہت کچھ انگریزی پڑھی ہے۔ ضرورت کے پیش نظر مجبوری کے سبب اور شوق کی بنا پر دوستوں سے استادوں سے زندگی سے۔ علی گڑھ میں انگریزی کا برا طالب علم نہ تھا۔ میرے ہم عصر انگریزی کے بہترین طلبا نے مجھے منہ لگا رکھا تھا۔ شعر و ادب پر مجھ سے مذاکرات ہی نہیں کرتے تھے۔ اردو تحریروں کے لئے مجھے چوٹی کی انگریزی کتابوں اور بہترین انگریزی مصنفوں کی نشان دہی کرتے تھے۔ میرے زمانے کے انگریز پروفیسر مجھے اپنے گھر بلاتے تھے۔ ملازمت کے دوران انگریزوں کا ساتھ رہا۔ علی گڑھ میں میں نے مرکزی حکومت کی ملازمت میں انگریزوں کے ساتھ کام کیا وغیرہ وغیرہ ..... کیا آپ یقین کریں گے۔ یاد بھی تو نہیں آتا کہ ان میں سے کس سے میں نے کیا سیکھا؟

مگر یہ کبھی طرح اور کسی وقت نہیں بھولتا کہ انگریزی کے کم از کم دو محاورے میں نے خاص قائد اعظم سے سیکھے۔ اگرچہ ان کے ساتھ میرا براہ راست رشتہ پاکستان بننے سے قبل بالکل نہ تھا اور پاکستان کے بعد بھی ملازمت کے دوران میں کم و بیش یہ عالم رہا۔

جہان عشق میں ایسے بھی کچھ مجبور ہوتے ہیں
حریم ناز میں رہتے ہیں اور مہجور ہوتے ہیں

ایک محاورہ ہے TO DRAW THE CHESTNUTS OUT OF FIRE آڑے وقت کام آنا، کسی کو مصیبت سے چھٹکارا دلانا یا اسی طرح کا مفہوم۔ یہ ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔ قائد اعظم ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں فنانس بل کی ترمیم پر تقریر کر رہے تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں ٹھہر ٹھہر کر، ہلکے ہلکے لہجہ میں مگر کسی خاص موقع پر ایک جھٹکے بلکہ گلے کے ایک کھٹکے کے ساتھ ادائے مفہوم میں زور پیدا کرنے اور موضوع زیر بحث سے گہری ذاتی دلچسپی ظاہر کرنے کے لئے اپنی آواز بلند کر دیتے تھے۔ ایسے موقع پر وہ الفاظ کو خاص طور پر حلق اور ناک یا شاید اپنے سینہ سے نکلتی ہوئی آواز میں ورد لہجہ میں کچھ اس طرح ادا کرتے تھے۔ (ان کی آواز کو پائیدار یا گونجیلی تو نہیں کہہ سکتے) کہ ہال گونج اٹھتا تھا اور ہر طرف چھائی ہوئی خاموشی (اس زمانے کے مرکزی اسمبلی میں اعلیٰ پارلیمانی معیار پر مباحثے ہوتے تھے۔ مچھلی بازار کی فضا نہ ہوتی تھی) میں حرکت اور نشستوں میں سرسراہٹ پیدا ہو جاتی تھی۔

بجٹ کی مخالفت کرتے ہوئے قائد اعظم مسلم لیگ

پارٹی کے رویہ کی وضاحت فرما رہے تھے۔ کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ جو دھاندلی جاری رکھی تھی اور ریارا ماؤنٹ باور نے ان معاملات کی طرف سے جو سنگدلانہ چشم پوشی کی روش اختیار کر رکھی تھی اس کا شکوہ کرتے ہوئے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ خواہ بجٹ پر حکومت کو شکست ہو یا کانگریس کو فتح لیگ اصولی طور پر زیر غور مسئلہ سے بالکل بے تعلق رہے گی اور ہر قسم کے نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہے گی۔ وہ حکومت کے آڑے وقت میں ہرگز کام نہ آئے گی۔ ہاں انفرادی طور پر ارکان لیگ اپنی رائے کے اظہار کے لئے آزاد ہوں گے۔

جس ناقابل تقلید انداز میں مذکورہ محاورے سے قائد اعظم نے اپنا مفہوم ادا کیا تھا لوح دل پر آج تک نقش ہے۔ ان کی وہ آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔

دوسرا محاورہ FINE WORDS BUTTER NO PARSNIPS (خالی خولی باتوں سے کام نہیں چلتا یا اسی قسم کا مفہوم) یہ اُن کی کسی تقریر میں اخبار میں چھپا دیکھا تھا۔ اور دل میں ایسا گھر کر گیا کہ آج تک نہیں بھولتا۔ یاد نہیں آتا موقع کیا تھا۔ شاید کسی انگریز آنریبل ممبر کی تقریر میں کسی بلند بانگ دعوی کے جواب میں طنزیہ فقرہ کے طور پر چست کیا گیا تھا۔

فقرہ چست کرنے پر یاد آیا قائد اعظم علی الاعلان دھونس یا ریاکاری تو برداشت ہی نہ کر سکتے تھے مگر عالی الشان ہونے کے باعث مزاج ہمیشہ دھیما رکھتے تھے۔ گاندھی سے بڑھ کر سیانا ہندوستان کی سیاست میں کوئی ہندو لیڈر نہیں گزرا۔ وہ اپنی چرب زبانی اور چکنی چپڑی باتوں سے مسلمانوں کو دھوکا دے کر ان کے گلے میں ہندو راج کا جوا ڈال دینا چاہتا تھا۔ مگر لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ قائد اعظم جیسے گرگ باراں دیدہ کے سامنے جو انگریز کے دام فریب میں نہیں آئے بمصداق ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے!

گاندھی کس شمار قطار میں تھا۔ وہ گاندھی کی رگ رگ سے واقف تھے۔ ایک خط میں اس نے بڑی مکاری سے قائد اعظم کو لکھا آپ یہ بتائیں میں آپ کے نام کے ساتھ کون سا خطاب استعمال کیا کروں؟

قائد اعظم کا جواب ملاحظہ ہو۔ گاندھی کے دل کا چور پکڑ لیا مگر کیسے ٹھنڈے ٹھنڈے فقرے ہیں اور کیسی بھگو بھگو کر چپیاں لگائی ہیں۔ گاندھی کا جی ہی جانتا ہوگا:۔

"...... آخر میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ کہ میں اپنے نام کے ساتھ آپ کی طرف سے کون سے لقب کا استعمال پسند کروں گا۔ نام میں کیا رکھا ہے۔ گلاب کا کوئی دوسرا نام رکھ دیجیے۔ خوشبو اس میں سے گلاب ہی کی آئے گی۔ اس کا فیصلہ میں آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔ اور اس مسئلہ میں میری کوئی

خاص رائے یا خواہش نہیں ہے۔ نہ
میں واقفتاً یہ سمجھ سکا کہ اس بارے میں
آپ اتنے فکرمند کیوں ہیں؟ آپ کہتے
ہیں کہ میرے نام کے ساتھ موجودہ طریق
مخاطبت آپ نے حکیم (اجمل خاں)
مرحوم کے مشورہ کے مطابق اختیار
کیا ہے۔ مگر تعجب ہے ان کی اپنی زندگی
میں اور مرحوم کی وفات کے بہت بعد
تک آپ مجھے "مسٹر" کے لفظ سے مخاطب
کرتے رہے۔ پھر پچھلے کچھ دنوں آپ نے
مجھے "شری" سے خطاب کیا اور ان
دونوں کے درمیانی وقفہ میں "دوست"
کا لفظ استعمال کرتے رہے۔ مگر مہربانی
سے آپ اس بارے میں بالکل فکرمند
نہ ہوں۔"

---

۲۳ رجون ۱۹۴۷ء ایک نہایت پُرآشوب مگر
یادگار دن تھا۔ میں اسے کبھی نہ بھولوں گا۔ میرا قیام
لکھنؤ میں تھا اور ہم ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے جہاں
مسلمان برائے نام تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی
اکثریت تھی جو وہاں کی سوسائٹی کی بسوں میں انہیں
چاروں طرف علاقہ میں چکر دلا کر اسلحہ کی نمائش
کرتے تھے۔ عذر یہ تھا کہ قریب کے ایک مسلم گاؤں
سے ماڈل ٹاؤن پر حملہ کا خطرہ ہے۔ شہر میں کرفیو تھا۔
ہمارا دفتر مال روڈ (اب شاہراہ قائداعظم) پر نیڈوز
ہوٹل میں تھا اور ایک بار سرکاری گاڑی میں گھر سے
دفتر آتے ہوئے میں نے اس تمام طولانی راستہ میں
کوئی انسان درکنار ایک کتا یا بلی بھی تو بھاگتے نہ
دیکھی تھی۔ ایسی ویرانی تھی کہ خدا کی پناہ!

؎ جس طرف دیکھا مقامِ ہُو نظر آیا مجھے!

اب وہ وقت یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔
آج شام ۳ رجون پلان اور اس کا ترجمہ اخبارات
کو تقسیم ہونا تھا۔ ہم لوگ صبح سے اپنی اپنی قیام
گاہوں سے لاکر پنجاب گورنر ہاؤس میں بند کر دئے
گئے تھے۔ اور جب تک کام ختم نہ ہو جائے ہم وہاں
سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ کھانے پینے کا انتظام وہیں
کر دیا گیا تھا۔ دورانِ کار معلوم ہوا۔ شام کو دہلی
ریڈیو سے پلان نشر ہونے کے بعد نہرو اور قائداعظم
کی تقاریر ہوں گی۔ دل مچل گیا کہ سنا جائے مگر کام
ختم ہوا تو ایسے وقت کو گھر واپس پہنچ کر اطمینان سے
ریڈیو سننا ناممکن تھا۔ فوراً اسٹاف کار بھیج کر
بیوی بچوں کو وہیں بلوا لیا۔ تاکہ ہم سب قائداعظم کی
تقریر ایک ساتھ سنیں۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ کسی غیر
سرکاری شخصیت کو ریڈیو پر سیاسی تقریر کا موقع ملا تھا۔
اس تقریر میں دو مقامات پر میرا دل بڑے زور
سے دھڑکا یعنی تقریباً اس طرح کہ مجھے اس کی
آواز سنائی دی بلکہ دل کی دھڑکن نے جیسے میرے
جسم کو ایک جھٹکا دیا۔ دھچکا لگایا۔ ایک بار تو جیسے
کسی فوری ناگہانی خوف کی وجہ سے .... اُف کس
قدر نازک اور شدید آزمائش کا موقع تھا۔ اور میں

سوچنے لگا جب میرا یہ حال تھا تو خود قائد اعظم کے
دل کی کیا حالت ہو گی؟ مگر یہ میں نے کہا تھا وہ تو
فولاد کے اعصاب رکھتے تھے۔ قائد اعظم فرما رہے تھے:۔

"صوبۂ سرحد کے لوگوں سے اس بارے
میں استصواب رائے کیا جائے کہ وہ
پاکستان کی مجلس دستور ساز میں شمولیت
چاہتے ہیں یا متحدہ ہندوستان کی مجلس
میں ۔۔۔ میں مسلم لیگ کے تمام رہنماؤں
اور عام مسلمانوں کو دعوت دیتا ہوں
کہ وہ اس استصواب کا جرأت اور امید
کے ساتھ سامنا کرنے کے لئے ہمارے عوام
کو منظم کریں اور میں پورے وثوق کے
ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ سرحد کے عوام
بہ یک آواز پاکستان کی مجلس دستور
ساز میں شمولیت کے لئے رائے دیں گے۔"

خوف اس بات کا تھا کہ ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں
اور ان کے نمک خوار خدائی خدمت گاروں کی سازشوں
اور انگریزوں کی مکاریوں کے سبب خدانخواستہ اگر
استصواب کا نتیجہ ہمارے خلاف نکل گیا تو

دوسری بار میرا دل غرور کی حد تک پہنچے
ہوئے فخر و مباہات کے احساس سے دھڑکا! یہ تقریر
میں وہ موقع تھا جہاں قائد اعظم نے اپنی غیر جانبداری
اور بلند کرداری کو آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ اور مجھے
یاد نہیں آتا۔ دنیا نے سیاست کے میدان میں
دیانت کی ایسی کوئی اور مثال پیش کی ہے!

مسئلہ کی نزاکت کا وہ حال جو اوپر مذکور ہوا اور
ہمارے قائد اعظم استصواب میں رائے دہندگی کے
بارے میں یہ تلقین کر رہے تھے:۔

"ہم میں سے ہر شخص کو اس امر کی احتیاط
کرنی چاہیئے کہ سرحد کے عوام کی بے لاگ،
آزاد اور سچی رائے معلوم کی جائے!"

سبحان اللہ جیسے حضرت کو وہ گمان ہی نہ تھا جو میرے
نحیف دل کو کھائے جا رہا تھا۔ اور اگرچہ مسلمانان
ہند کے ساتھ خود ان کا اپنا مستقبل کتنے بڑے خطرہ
میں تھا۔ مگر وہ اپنی قسمت پر قانع اور اپنے خدا
پرست کرتے تھے۔ کیوں نہ ہو۔ یہ وہی قائد اعظم تھے
جنہوں نے ایک موقع پر انگریزی مثل EVERY
THING IS FAIR IN LOVE
AND WAR کا ترجمہ "عشق اور جنگ میں سب
کچھ جائز ہے" کی بجائے یہ کیا تھا کہ "عشق اور جنگ
میں ہر جائز چیز ہی جائز ہے"! ...... کم از کم
ہر صدی میں تو ایسا مرد مومن چشم فلک نے کاہے کو
دیکھا ہوگا!

مزا جب آیا کہ قائد اعظم نے اپنی تقریر
"پاکستان زندہ باد" کے نعرہ پر ختم کی۔ اصل
مسودہ میں یہ نعرہ نہیں تھا۔ بلکہ لیڈروں کو تاکید
تھی کہ ریڈیو پر اس قسم کے نعروں سے باز رہیں۔
مگر ضدی نہرو نے اپنی تقریر کو "جے ہند" پر ختم کیا
تھا۔ قائد اعظم جنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی
شکست نہیں کھائی۔ نہرو کی تو دوسری کے آگے ہتھیار

کیسے ڈال سکتے تھے۔

یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو قائداعظم زیارت سے جہاں وہ اپنی آخری علالت کے ایام میں اپنے معالجوں کے مشورہ کے مطابق آرام کر رہے تھے، اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کی غرض سے کراچی تشریف لائے۔ ماری پور ایرپورٹ پر میں نے اور بعد میں بخاری صاحب (مرحوم) نے اس موقع پر کمنٹری دے کی تھی۔ قائداعظم اس قدر نحیف و نزار ہو رہے تھے کہ استقبالیہ جماعت کے افراد کے افراد سے ہاتھ ملاتے ہوئے پتے کی طرح ہل ہل جاتے تھے۔ شام کو گورنر جنرل ہاؤس سے برنس گارڈن کے عقب میں اس عمارت کے احاطہ میں جہاں مرکزی اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر تھا۔ ہزاراں کروفر مگر مرجھائے ہوئے چہرے کے ساتھ شاہی سواری پر موصوف اور محترمہ فاطمہ جناح نے راہ میں لاکھوں مشتاقان دیدار کی دعائیں اور سلام لیتے ہوئے نزول اجلال فرمایا۔ زاہد حسین مرحوم (اسٹیٹ بنک کے پہلے گورنر) نے اس جلسے میں پڑھی جانے والی انگریزی تقاریر، ان کے ترجمہ اور خاص طرح کی طباعت نیز تقسیم وغیرہ کا تمام کام جو صرف چوبیس گھنٹوں میں انجام دے دیا گیا، میرے سپرد کر رکھا تھا۔ جلسہ کے آغاز سے پہلے ہی مطبوعہ کاپیاں حاضرین میں تقسیم کرنے کے بعد میں اور میری بیوی اپنی مقررہ جگہوں پر بیٹھ گئے۔ میری جگہ ڈائس کے قریب ہی تھی۔

اور مجھے کس قدر دکھ ہوا نہ صرف یہ دیکھ کر کہ قائداعظم کو اپنی انتہائی نقاہت کے سبب ڈائس پر آنے، بیٹھنے اور تقریر کرنے کے لئے پھر اٹھنے میں بڑی زحمت ہو رہی تھی، بلکہ تقریر پڑھنے کے دوران وہ دو مقامات پر ایک ایک سطر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے اور انہیں اس کا احساس کبھی نہ ہوا! کمال یہ تھا کہ حاضرین میں بھی شاید ہی کسی کو اس کا احساس ہوا ہو۔ کیونکہ جلسہ کے بعد جب میں نے بعض دوستوں سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے بڑے اچنبھے کے ساتھ میری بات سنی اور یہ کہہ کر ٹال دیا "کیا واقعی؟" سالہا سال تک یہ راز میرے اور میری بیوی کے سینوں میں دفن رہا۔ تا آنکہ ایک بار سید ہاشم رضا نے اس واقعہ کو تسلیم کیا اور پھر اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر کیا۔

اپنی شدید علالت کے سبب قائداعظم ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو پاکستان کی پہلی سال گرہ کی تقریب پر کراچی تشریف نہ لا سکے تھے مگر انھوں نے زیارت سے قوم کے نام اپنا پیغام بھیج دیا تھا۔ وہی انتہائی حوصلہ افزا اور آب زر سے لکھا جانے والا پیغام جس کا خاتمہ ان الفاظ میں ہوتا ہے:۔

"قدرت نے آپ کو ہر چیز عطا کی ہے۔
آپ بے حد و حساب وسائل کے مالک ہیں۔
آپ کی مملکت کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ اور اب
یہ آپ کا کام ہے کہ اس پر عمارت تعمیر

کریں۔ اور جتنی جلد اور جس قدر خوبصورت ممکن ہو سکے۔ لہٰذا آگے قدم بڑھائیں۔
اور خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ پاکستان زندہ باد!“

اخبارات کو بھیجنے کی غرض سے جب یہ پیغام میرے سامنے آیا تو میں نے دیکھا مسودہ نگار نے دو موقعوں پر جیسا کہ اس زمانے میں ہم لوگ پاکستان کو اپنے صدق خلوص کی بنا پر یا اپنے غیر معمولی جذباتی رو کے زیر اثر کہا کرتے تھے، ”دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت“ لکھ دیا تھا۔ قائداعظم نے اپنے دست مبارک سے دونوں جگہوں پر ترمیم کر کے (پیغام انگریزی میں تھا) اس عبارت کو ”دنیا کی سب سے بڑی مملکت“ بنا دیا تھا۔ اس طرح کہ THE LARGEST ISLAMIC STATE کی ابتدا میں ONE OF THE کے الفاظ اور آخر میں S کے حرف کا اضافہ کر دیا۔ اس زمانے میں مصر کے شاہ فاروق نے پاکستان کے لئے ہماری طرف سے ان الفاظ کے استعمال پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور ہمارے سفیر مقیم قاہرہ (غالباً میاں بشیر احمد مرحوم) سے کچھ اس قسم کے طنزیہ الفاظ کہے تھے ”آپ کو شاید معلوم نہیں اسلام پاکستان کی پیدائش سے قبل ظہور میں آچکا تھا!“ ظاہر ہے کہ قائداعظم ایک اہم مسلم ریاست سے پاکستان کے تعلقات خوشگوار کرنے کے کس طرح روادار ہو سکتے تھے۔ اس واقعہ کا بھی سید صاحب نے میرے حوالہ سے اپنے ایک مضمون میں مجملاً ذکر کیا ہے۔ میرے قلم سے اس کی مندرجۂ بالا تفصیل اب حاضر ہے۔

قائد اعظم محمدؐ علی جناح کے حالاتِ زندگی سے چند اقتباسات

از جناب ڈاکٹر محمد نذیر رانجھا

ہر چند باطل اپنی تمام تر قوت وطاقت کے بل بوتے پر کچھ مدت اپنے پیروکاروں کی شان وشوکت اور جاہ وحشمت کے مینار بلند کرنے میں کامیاب وکامران ہو جاتا ہے مگر آخر کار حق اپنے پرستاروں کی مجاہدت وریاضت اور ایثار وقربانی کے ذریعہ باطل پر غالب آجاتا ہے اور اس کی تمام جھوٹی چمک و دمک حق کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

تاریخ بنی نوع انسان کے قارئین اس نقطے سے بخوبی آگاہ ہیں کہ حق وباطل کے درمیان بے شمار ایسے معرکے ہوئے جن میں حق اپنی بے سروسامانی کے باوجود باطل کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہو گیا۔ تاریخ اسلام کے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے کا ایک سنہری ورق الٹیئے جس پر عرب کے یتیم کی دعوت حق کے زندۂ جاوید الفاظ رقم ہیں۔ جب اس نے اپنی قوم کو حق اختیار کرنے کا ارشاد فرمایا تو چند کے سوا تمام لوگ اس کے جانی دشمن ہو گئے۔ اس یتیم کو لوگوں پر مامور کرنے والا خود خدائے بزرگ و برتر تھا اور اس کی دعوت عین حکم خداوندی تھی۔ لہٰذا دنیا والوں نے دیکھ لیا کہ حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لال خاتم الانبیاء شفیع المذنبین حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے باطل قوتوں کی جھوٹی شہرت کے محلات کو کس طرح زمین بوس کر دیا۔ اور ان کے وجود مسعود کی بدولت حق کے پرستاروں میں کس قدر اضافہ ہوا۔

اس وقت میرا موضوع برصغیر کی مسلمان قوم کے محبوب اور اہل پاکستان کے راہنمائے عالی مقام قائد اعظم محمدؐ علی جناحؒ کی زندگانی ہے۔ لہٰذا میں اس سے چند اقتباسات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کروں گا۔

تاریخ مسلّمہ طور پر اس حقیقت کا اعتراف کر چکی ہے کہ سید احمد شہیدؒ۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے حامیوں کا ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے خلاف جہاد کرنا برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ آپ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے محرکات کو خواہ کچھ بھی نام دیں۔ اس کے پس منظر میں مسلمانوں کے جذبۂ آزادی کا راز ہر حالت میں موجود ہے۔ گو اس وقت مسلمان اور ہندو مل کر ہندوستان کو انگریزوں کے پنجہ سے آزاد کرانے کے متمنی تھے۔ مگر ہندوؤں نے

اپنی روایتی موقع شناسی کا دامن تھامتے ہوئے زندگی کے ہر شعبہ میں انگریز کی غلامی قبول کر لی لیکن مسلمان اپنی مذہبی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے انگریزی حکومت کے دربار میں مردود ٹھہرے اور حکومت کی نظر عتاب ان کا مقدر بن گیا۔ حکومت نے ان کے جذبۂ آزادی کو جوش بغاوت سے تعبیر کر کے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو غدر کا نام دے دیا۔

پھر کیا تھا۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے مل کر مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں ناکام بنانے کی جو سازش کی تھی وہ کامیاب ہوگئی۔ سب سے زیادہ مسلمان تعلیمی میدان میں روندے گئے۔ مگر جو بات آگے چل کر ان کی خوش بختی کا سبب بنی وہ یہ تھی کہ حالات کے انتہائی ناسازگار ہوتے ہوئے بھی مسلمان راہنماؤں نے مسلمانوں کی مذہبی بہتری کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوششیں جاری رکھیں۔ اُدھر مولوی کرامت علی جونپوریؒ نے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو مذہبی طور پر بیدار کرنے کی تحریک چلائی تو اِدھر دارالعلوم دیوبند کے قائدین مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے مذہبی اور دینی خدمات کے ذریعہ مسلمانوں کے جذبۂ آزادی کو انگیزش دی۔ سید احمد بریلویؒ اور ان کے خلفاء و مریدین کی قربانیاں آزادی ہند کا درخشندہ باب بن گئیں۔

اس کے بعد مرد مجاہد سر سید احمد خاںؒ میدان عمل میں آئے۔ انہوں نے نہایت مالی مشکلات کے باوجود ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں ایک مدرسہ کھولا جو دو سال بعد کالج بن گیا۔ (اور ۱۹۲۰ء میں اسے یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا) ان کی تمام کوششوں کا اصل مقصد مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے کرنا تھا۔ انہوں نے علم الکلام کی بنیاد رکھی اور اسلام کو جدید علوم سے ہم آہنگ کیا۔ پھر ایک وقت آیا جب علی گڑھ کالج برصغیر کے مسلمانوں کا مرکزی ادارہ بن گیا۔ بعض لوگوں کی اندھا دھند مخالفت کے باوجود سر سید احمد خاںؒ نے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ اور ۱۸۸۶ء میں انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانگرس (جو جلد ہی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم ہوگئی) کی بنیاد رکھی مسلم لیگ کے قیام سے قبل مسلمان اپنے مذہبی، قومی اور سیاسی خیالات کا اظہار اسی کانفرنس میں کیا کرتے تھے۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی۔ شروع میں ہندوؤں اور پارسیوں کے علاوہ بعض مسلمان بھی اس میں شامل ہوئے۔ مگر سر سید احمدؒ نے مسلمانوں کے کانگریس میں شامل ہونے کو مفید خیال نہ کیا۔ اور مسلمانوں پر اس کا خاطر خواہ اثر یہ ہوا کہ وہ کانگریس سے الگ رہے۔

جب مسلمانوں نے کانگریس کی مسلمان دشمنی کو اچھی طرح بھانپ لیا تو انہوں نے ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی جس کا سہرا ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہؒ اور سر سید احمد خاںؒ کے دو دوستوں محسن الملکؒ اور وقار الملکؒ کے سر ہے جب مسلمان ایک پلیٹ فارم پر متحد ہوگئے۔ تو ان میں ہمہ گیر بیداری کے اثرات بھی آہستہ آہستہ رونما ہونے لگے۔ بس

ایک چیز کی کمی تھی اور وہ تھی قیادت!

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں :-

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

۱۹۱۰ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں ہوا جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی باہمی کشیدگی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ قائد اعظمؒ نے بھی اس سلسلے میں بھرپور سعی کی مگر ہندوؤں کی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے اس کانفرنس کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ اس سے قائد اعظمؒ نے وقتی طور پر تو کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا لیکن بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ وہ اس واقعے سے سخت دل برداشتہ ہوئے۔

۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شامل ہونے کے لئے قائد اعظمؒ کو دعوت دی گئی۔ اس کے بعد جلد ہی قائد اعظمؒ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کے صفِ اوّل کے رہنما بن گئے۔ انہوں نے ۱۹۱۶ء میں "میثاق لکھنؤ" کی طرح ڈالی جس کی رو سے کانگریس کو مسلمانوں کے جداگانہ حقِ نیابت کو ماننا پڑا۔

اس طرح اب مسلم لیگ قائد اعظمؒ کی راہنمائی میں اپنے موقف کا بھرپور اظہار کرنے لگی۔ اور مسلمان اپنے محبوب کے پیچھے مرمٹنے کو تیار ہو گئے۔ قائد اعظمؒ کا عقیدہ تھا کہ مسلمان کامل کو بجز خدائے بزرگ و برتر کسی طاقت سے نہیں ڈرنا چاہیئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے فرمایا:۔

"اسلام ہمیشہ آزاد زندہ رہا ہے۔ اور اس کے بعد بھی اسے آزاد رہنا چاہیئے۔ میں آرزومند ہوں کہ مسلمان اپنے ہاتھ سے چھوڑے ہوئے ایمان کو دوبارہ ہاتھ میں لیں اور تحصیل استقلال کے لئے کسی رکاوٹ سے خوفزدہ نہ ہوں۔ خواہ ایک دنیا ان کی دشمنی پر اتر آئے۔ اس مقصد کے انجام کے لئے اس کے بعد ہمارا شعار یہ تین کلمے ہوگا۔ "اتحاد"۔ "ایمان" اور "تنظیم"۔

مسلمانوں نے قائد اعظمؒ کے اس بیان پر پوری طرح عمل کیا اور اس طرح مسلم لیگ کی قوت و جمعیت اتنی بڑھ گئی کہ ہندو بوکھلا اٹھے۔ لہٰذا گاندھی نے قائد اعظمؒ کو تقسیم ہند سے باز رکھنے کے لئے منطقی استدلال سے بھرپور ایک خط تحریر کیا جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"پہلی گفتگو کے ضمن میں آپ اس بات کے قائل تھے کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ یعنی ہندو اور مسلمان اور آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ مسلمان بھی ہند میں اسی طرح وطن رکھتے ہیں جس طرح ہندو۔ لہٰذا مسلمانوں کو بھی جداگانہ وطن کے قیام کا اختیار حاصل ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو پھر یوں دکھائی دیتا ہے کہ اس میں کسی سحر اور جادو کا ہاتھ ہے۔ میں نے تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں دیکھی کہ لوگوں کا ایک گروہ یا ان کے اخلاف ایک تازہ مذہب اختیار کر کے دعویٰ کریں کہ ہم مذہب

کی بنا پر اسی نسل کے الگ آدمی اور الگ قوم ہیں۔
اگر ہندوستان ظہور اسلام سے پہلے ایک قوم تھا تو
اسے اب بھی مذہبی اختلاف کے باوجود ایک قوم کی
حیثیت سے رہنا چاہیئے۔"

قائداعظمؒ گاندھی کے عزائم سے اچھی طرح
آگاہ تھے اور وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ مسلمانوں کی آزادی
کو کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا انہوں نے ایک جوابی خط
کے ذریعے اپنے عظیم موقف کو بیان کیا جس کا خلاصہ یہ ہے:

"ہم عقیدہ رکھتے ہیں کہ بر حسب تعریف
اور بموجب ایک میزان و مقیاس جو کہ 'قوم'
کے لئے مانا گیا ہے۔ مسلمان اور ہندو صریحاً دو قومیں
ہیں۔ ہم بھاری جمعیت سے مرکب ایک قوم ہیں علاوہ
ازیں ہم علیحدہ فرہنگ و تمدن، زبان و ادبیات،
ہنر و معماری اور اسامی و اصطلاحات رکھتے ہیں۔
ہم مخصوص نسبی، شرعی، اخلاقی اور تاریخی شعور کے
حامل ہیں۔ مزید یہ ہے کہ ہم الگ اور خاص مکتب فکر
رکھتے ہیں۔ اس طرح ہم بین الاقوامی قوانین کے
مطابق ایک الگ قوم ہیں۔"

جب ہندوستانی وزارتوں میں کانگریس
کی شمولیت کے غرور نے نہرو کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا
کہ "ہندوستان میں صرف دو فرقے وجود رکھتے
ہیں یعنی کانگریس اور برطانیہ"۔۔۔ تو قائداعظم
محمد علی جناحؒ نے نہایت برہم ہو کر جواب دیا کہ۔۔۔
"تیسرا فرقہ بھی موجود ہے اور وہ مسلمانوں سے
عبارت ہے۔ مزید یہ کہا کہ" ہم کسی کے تحت فرمان
رہنا نہیں چاہتے۔"

جب مسلمانوں کی مسلسل وپیہم کوششوں کے
نتیجے میں حکومت برطانیہ تقسیم ہند پر آمادہ ہوگئی
اور اس نے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم
کر لیا تو قائداعظمؒ نے انگریزی مزاج اور طبیعت
کی قلعی کھولتے ہوئے فرمایا:۔

"میں خوش وقت ہوں کہ انگلستان کے لوگ
اس طرح بیدار ہوگئے ہیں۔ انگریزی قوم کی رسم
و عادت ہے کہ یہ اس وقت بیدار ہوا کرتے ہیں جب
کسی خطرے کا احساس کرنے لگیں۔"

مسلمانوں کی علیحدہ حکومت کے قیام کو ہندو
کسی قیمت پر قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ انہوں
نے ہند کو دھرتی ماتا کہہ کر غوغا بلند کر دیا کہ سرزمین
ہند صرف ہندو قوم کے لئے ہے۔ اور مسلمان ہندوستان
میں علیحدہ حکومت قائم کرنے کا حق ہرگز نہیں رکھتے
قائداعظمؒ نے دوبارہ حکومت برطانیہ کو مخاطب
کرتے ہوئے واضح اعلان کیا:۔

"ہندوستان کی تقسیم کے سوا اب کوئی چارہ
نہیں رہا۔ مسلمانوں کو ان کا اپنا وطن دے دیجئے
اور ہندوؤں کو ان کا اپنا حصہ۔"

ساتھ ہی فرمایا:۔ "ہم اپنے لئے علیحدہ حکومت
کے خواہاں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسے ملک کے مالک ہوں
جس میں ہم اپنے نظریات و افکار کے مطابق زندگی
بسر کر سکیں۔ بھلا ہندوؤں کو اس سے کیا نقصان
ہوگا؟ نقشہ پر نگاہ کیجئے۔ ہند و ہندوستان کے

تین چوتھائی حصے کے مالک ہوں گے اور ہند کے
بہترین علاقے ان کے حصے میں آئیں گے۔"

آخر کار اللہ تبارک و تعالیٰ نے برصغیر کے
مسلمانوں کے حال پر رحم فرمایا اور ان کے رہنما قائد
اعظمؒ کو عزت و شہرت بخشی۔ لہٰذا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء
کو پاکستان معرض وجود میں آگیا۔

قائداعظم محمدؒ علی جناحؒ پاکستان کے پہلے
سربراہ مملکت مقرر ہوئے۔ ایک روز دفتر کی سیڑھیوں
پر چڑھتے ہوئے انہوں نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔

"آپ جانتے ہیں میں کسی وقت منتظر نہ
تھا کہ اپنی زندگی میں پاکستان کو دیکھوں۔ اس
کامیابی سے ہمکنار ہونے کی وجہ سے ہمیں خداوند کریم
کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔"

قائداعظمؒ نے اس محنت سے شب و روز
کام کیا کہ ان کی صحت گرنے لگی۔ جب محترمہ فاطمہ
جناح ان سے کہتیں کہ "آپ کو کسی ڈاکٹر سے
مشورہ کرنا چاہیئے" تو وہ فرماتے۔

"چھوڑیئے! مجھے بہت سے ایسے کاموں
سے واسطہ ہے جن کا کرنا نہایت ضروری ہے میں
اپنے وقت کو ضائع نہیں کر سکتا۔"

دیکھئے! انہوں نے اپنی زندگی کو کس طرح
برصغیر کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کیا
اور انہیں نعمت آزادی سے آشنا کرنے کے بعد
بھی پاکستان کی ترقی و خوشحالی کا فکر انہیں دامن گیر رہا۔
زندگی کے آخری ایام میں جب میجر ڈاکٹر الٰہی بخش
صاحب نے قائداعظمؒ کا معائنہ کیا۔ اور دیکھا کہ
ضعیف اور لاغر ہونے کے علاوہ ان کا رنگ بھی
زرد پڑ چکا ہے تو انہوں نے قائداعظمؒ سے ان کی
بیماری کے اسباب کے بارے میں باتیں کرنی شروع
کیں۔ اس پر قائداعظمؒ نے اعتراض کرتے ہوئے
سختی سے فرمایا۔

"میرے مزاج میں کوئی عیب اور خرابی نہیں،
بلکہ پرکاری اور آشفتگی فکر کے اثر سے میرا معدہ
زحمت سے دوچار ہو چکا ہے۔ چالیس برس ہونے
کو ہیں کہ میں نے رات دن چودہ گھنٹے کام کیا ہے۔
اور کسی وقت خیال تک نہیں کیا کہ بیماری کیا چیز ہے؟"

آخر کار یہ نابغۂ روزگار ہستی ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو
پاکستان کی نوزائیدہ سلطنت کو یتیم و بے سہارا چھوڑ کر
خالق حقیقی سے جا ملی انا للہ وانا الیہ راجعون۔
خدا تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔

قائداعظمؒ کے مقبرے پر ملکی اور غیر ملکی زائرین
کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اور وہ اپنے اپنے شوق
و وجدان اور عقیدہ و جذبہ کے مطابق انہیں
خراج عقیدت پیش کرتے رہتے ہیں۔ مصر کے پاکستان
میں سابق سفیر جناب ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے جب
قائداعظمؒ کے مزار پر گئے تو انہوں نے وہاں
قرآن مجید کا ایک نسخہ بطور ہدیہ پیش کیا اور
پھر یہ شعر کہے۔

"لقد نثر القصاد زهراً وادمعاً
فجئت دموع والقيت نضرة الزهر

فحیئتک اکباراً، لقد رلک مہدیاً

الیک کتاب الخلد، یاخالد الذکر

ترجمہ :۔ یعنی جو کوئی بھی تیری قبر کی زیارت کے لئے آتا ہے تو وہ پھول چڑھاتا ہے اور آنسو بہاتا ہے۔ لیکن آنسو خشک ہو جاتے ہیں اور پھول مرجھا جاتے ہیں۔ لہٰذا میں ہمیشہ رہنے والی اور جاوید کتاب "قرآن مجید" تیرے مزار پر ہدیہ کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کی طراوت، تازگی اور عطرافشانی جاوید اور پائیدار ہے۔ اے ایسے شخص تیرا نام صحیفۂ روزگار میں ہمیشہ رہنے والا اور جاوداں ہے۔ . .

ماخذ و منابع

۱۔ قائداعظم محمد علی جناح مؤسس پاکستان۔ تالیف ہکتور بولیتو۔ ترجمہ سید غلام رضا سعیدی انتشارات کتاب فروشی محمدی طہران ۱۳۳۶ ھ ش۔

۲۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (ج ۵) زیر اہتمام دانشگاہ پنجاب لاہور ۱۹۷۱ء۔

۳۔ مسلمانان در نہضت آزادی ہندوستان ترجمہ و تالیف سید علی خامنہ۔ انتشارات آسیا ایران ۱۳۴۷ ھ ش۔

۴۔ اقبال متفکر و شاعر اسلام نوشتہ محمد تقی مقتدری۔ انتشارات سازمان مستقل چاپخانۂ دوستی ایران ۱۳۲۶ ھ ش۔

۵۔ اقتباسات از زندگانی رہنمائی محبوب مسلمین حضرت قائداعظم محمد علی جناح۔ از محمد نذیر رانجھا۔ مجلۂ سروش۔ اسلام آباد بابت ماہ اپریل ۱۹۷۶ء۔

۶۔ ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی ۱۹۷۵ء

پناہِ قوم بے پناہ محمد علی جناح

جناب سید وصی احمد بلگرامی

۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ شہر کوئٹہ میں قائدِ اعظم کے اعزاز میں چائے کی دعوت تھی۔ قائدِ اعظم کی میز پر سر عبدالقادر بھی تھے۔ اس وقت مہمان والاشان نے ایک واقعہ بیان کیا جو سر عبدالقادر کی تحریر سے دنیا کو معلوم ہوا (مطبوعہ ماہِ نو کراچی نومبر ۱۹۴۸ء)۔ تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ قائدِ اعظم نے فرمایا:

ایک دن لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند نے ہم سے کہا کہ آپ مسلمانوں کو علیحدہ قوم منوانے اور پاکستان بنانے کا خیال چھوڑ دیں تو فریق ثانی اس کے بدلے میں مسلمانوں کو بہت کچھ دے سکتا ہے۔ ہم نے کہا اس کا جواب آئندہ ملاقات پر رہا۔

پھر ملاقات ہوئی تو ہم نے اپنی جیب سے ایک ریشمی رومال نکال کر وائسرائے کو دے دیا اور کہا کہ ــــ روہیلکھنڈ کا دورہ کرتے ہوئے ہم اس شہر میں پہنچے تو وہاں ایک شخص نے آکر کہا کہ ــــ "حضور ہماری لڑکی نے بڑی محنت سے پاکستان کا ایک نقشہ بنایا ہے اور اس کی آرزو ہے کہ آپ خود چل کر اس کے ہاتھ سے وہ نقشہ قبول فرمائیں۔"

لڑکی کی بات تھی۔ سب کام چھوڑ کر ہم کو اس کے گھر جانا پڑا۔ وہاں لڑکی نے ایک ریشمی رومال پیش کیا۔ جس پر اس نے پاکستان کا نقشہ سوزن کاری سے سبز رنگ میں کاڑھا تھا یعنی ان صوبوں کو جہاں مسلمان بکثرت آباد تھے سبز دکھایا تھا۔ ہم نے اس کے ہاتھ سے اس کا تحفہ قبول کیا۔ وہ رومال یہی رومال ہے!"

وائسرائے نے پاکستان کا نقشہ دیکھا تو لڑکی کی دستکاری کی تعریف کی۔

ہم نے کہا کہ:-

"یاد رہے کہ روہیلکھنڈ میں ایک گیارہ سال کی لڑکی ہے ــــ جو ایک پرانی وضع کے مسلمان گھر میں پیدا ہوئی ہے اور پلی بڑھی اور پردہ کی اتنی پابند ہے کہ آج تک کسی مدرسے میں نہیں گئی۔ یہ دستکاری اسی کی ہے۔"

وائسرائے کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا۔ تب ہم نے کہا کہ:

"یہ نقشہ بول رہا ہے کہ آج لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن بھی پاکستان پاکستان کہہ رہی ہے! —— لیکن آپ کا گمان ہے کہ یہ محمد علی جناح ہے۔ جو مسلمانوں کو سکھلاتا ہے کہ پاکستان مانگو۔ حالانکہ محمد علی جناح اپنی قوم کا صرف ترجمان ہے"

لارڈ ولنگڈن گفتگو اس نقشہ سے بہت متاثر ہوئے۔ اور ان پر واضح ہو گیا کہ پاکستان کا تخیل پردہ والی عورتوں اور چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے دلوں تک پہنچ گیا ہے۔ اور اب یہ خیال بدلا نہیں جا سکتا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ میں سالار جنگ کو غیبی امداد کہاں کہاں سے پہنچی تھی اس دشمن کے خلاف جس کی سلطنت میں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں اور اس دشمن کے خلاف جس کے دل نے آفتاب کبھی دیکھا نہیں۔ سلام اس گیارہ سال کی لڑکی کو جس کا رومال قائداعظم کے ہاتھ میں گیا اور ہاتھ سے جیب میں گیا۔ اور اس جیب سے لارڈ ولنگڈن گفتگو کی میز پر گیا۔ اور جاتے ہی شطرنج سیاست کا مہرہ بن گیا۔ حتیٰ کہ اسی رومالی چال سے شاطر نے شاطر کو زچ کیا۔

خدایا۔ وہ رومال کہاں ہے؟ رومال والی کہاں ہے؟

خدایا۔ وہ دیوانی کہاں ہے جس نے بقراط تک کو لاجواب کر دیا؟

خدایا۔ وہ پردہ والی کہاں ہے جس نے سالار قوم کی بات رکھ لی اور اکبر الہ آبادی کی لاج رکھ لی؟

خدایا۔ وہ رانی کہاں ہے جس نے خود پربت کو اپنے پاس بلا بھیجا اور جس کے پاس پربت کو جانا ہی پڑا؟
خود کیوں نہیں گئی؟ کیوں بلا بھیجا؟ کیوں جانا پڑا؟ —— ناز کر ناز بردار سے بسود اکر خریدار سے!

خدایا۔ وہ ایمان بالغیب والی کہاں ہے جس کو یاد کیا ہوگا پانی پت کی چوتھی لڑائی نے۔
اور فاتح پانی پت محمد علی جناح نے۔
اور پنجشنبہ ۲۷ رمضان ۱۳۶۶ھ نے۔
یعنی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء نے۔

کیوں یاد کیا ہوگا؟ اس کو پوچھنا چاہیئے۔ علم الیقین و عین الیقین و حق الیقین اللہ ناز پرور وہ رومالی کھنڈ سے اور سرشار عشق پاکستان سے اور گیارہ سال کی لڑکی سے جس کے سینے میں دل نہیں۔ پاکستان تھا!

کیا ہوا دامانِ گل میں قطرۂ شبنم جو تھا — وہ دُرِ نایاب نسیانِ چمن کیسا ہو گیا (وحید الہ آبادی)

سلام اس قطرۂ شبنم کو۔ اور سلام اس دُرِ نایاب کو!

قائداعظم کی ذات اور ہمارا تاریخی سرمایہ

ڈاکٹر وحید قریشی۔ ایم اے پی ایچ ڈی

قائداعظم کا انتقال ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوا۔ ہماری تحریک آزادی کی اس عظیم شخصیت اور محبوب رہنما کے انتقال کو ایک ربع صدی ہو گئی۔ اُس وقت سے لیکر اب تک پاکستان کی جدوجہد آزادی، قائداعظم کے حالات اور افکار کے بارے میں تلاش و جستجو اور تحریر و ترتیب کے کئی منصوبے وجود میں آ چکے ہیں۔ تحریک پاکستان سے متعلق مواد کا کچھ حصہ انگلستان اور ہندوستان میں شائع بھی ہو چکا ہے خود پاکستانی مورخ بھی اس کی اہمیت سے غافل نہیں ہیں۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو پاکستانی نقطۂ نظر سے نہ تو تحریک پاکستان کا تفصیلی جائزہ ابھی تک ممکن ہوا ہے نہ قائداعظم کے سوانح کے بارے میں کوئی ایسا تسلی بخش کارنامہ ضبط تحریر میں آیا ہے۔ حد یہ ہے کہ قائداعظم کی تقاریر اور اخباری بیانات کا بہت سا سرمایہ فی الحال غیر مدون صورت میں بکھرا پڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ قومی سطح پر اس سارے ذخیرے کو مرتب کر کے شائع کر دیا جائے۔ پاکستان کی تحریک میں حصہ لینے والے بہت سے افراد ابھی ہمارے درمیان زندہ ہیں۔ ان کی یادداشتیں محفوظ کئے بغیر تحریک پاکستان کی بہت سی کڑیوں کے غائب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لحاظ سے چودھری خلیق الزماں کی کتاب (PATHWAY TO PAKISTAN) اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کی کتاب (THE STRUGGLE FOR PAKISTAN) تحریک آزادی کی جدوجہد کو بیان کرتی ہیں۔ اور اس میں لکھنے والوں نے اپنے ذاتی مشاہدات اور ردِعمل بھی قلم بند کر دیئے ہیں۔ اسی طرح بیرون پاکستان کی شخصیتوں میں ابوالکلام آزاد نے INDIA WINS FREEDOM) میں کانگریسی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے تحریک آزادی کے بارے میں بعض یادداشتیں محفوظ کی ہیں۔ (V.P.MENON) نے (THE TRANSFER OF POWER IN INDIA لکھ کر بعض نئے حقائق کا انکشاف کیا ہے۔ نرود چودھری نے (THE AUTOBIOGRAPHY OF AN UNKNOWN INDIAN) شائع کی۔ اسی طرح برطانوی باشندوں نے بھی اپنے چشم دید واقعات کو کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ (COUPLAND) نے کئی کتابیں لکھیں جن میں (THE CRIPPS MISSION) اہمیت رکھتی ہے۔ لارڈ ازمے

کی یادداشتیں بعنوان (MEMORIES OF
GENERALE THE LORD ISMAY)
اسی طرح (MOSLEY) کی (THE LAST DAY
SYMONDS) اور (OF THE BRITISHRAJ)
نے (THE MAKING OF PKISTAN)
تحریر کی اسی طرح سر فرانسس ٹکسر نے (WHILE
MEMORY SERVES) کیمبل جانسن نے
(MISSION WITHMOUNT BATTAN)
لکھ کر ہماری تاریخ کی بعض کڑیاں مہیا کی ہیں۔ تحریک
آزادی کے سلسلے میں سب سے زیادہ منظم کام ہندوستان
میں ہوا ہے۔ چنانچہ تاریخی دستاویزوں کو (INDIA'S
STRUGGLE FOR INDEPENDENCE)
کے عنوان سے جگدیش شرما نے ترتیب دیا۔ اسی طرح فاضل
مرتب نے مہاتما گاندھی، جواہر لال اور انڈین نیشنل
کانگریس پر تین جلدوں میں کتابیات ترتیب دیں۔ تاریخی
دستاویزوں کی ترتیب کا کام یورپ میں بھی ہوا چنانچہ
فلپس نے یہ کام انجام دیا ہے۔ اس کی تعریف اس تحریک
پر کام کرنے والے ہر شخص نے کی ہے۔ اسی طرح
INSTITUTE OF PACIFIC RELATION
نے DOCUMENTS ON THE INDIA
SITUATION SINCE CRIPPSMISSION
امریکہ سے شائع کی اور MAURICE GWYER
اور APPADORAI نے SPEECHES AND
DOCUMENTSOF INDIA CONSTITU-
-TION 1921-1947.

لکھی۔ ان کے مقابلے میں پاکستان میں اے آر غنی نے
(PAKISTAN ASELECT BIG RATHY)
شائع کی لیکن یہ کام ادھورا اور ناقص ہے۔ ابھی تک تحریک
پاکستان سے متعلق افراد پر کتابیات بھی شائع نہیں ہوئی
اور تحریک پاکستان سے متعلق مفصل کتابیات بھی توجہ
کی محتاج ہے۔ ابھی تک مسلم لیگ کے شائع کردہ کتابچے
اور سالانہ جلسوں کی رودادیں بھی ایک جا کر کے نہیں
چھاپی گئیں۔ قائداعظم کی تقریروں اور اخباری بیانات
کا کام بھی بڑی محنت اور توجہ چاہتا ہے۔ ان کی تقریر
کے اب تک جو چھوٹے بڑے کتابچے شائع ہو چکے ہیں
ان کی تعداد ۲۹ تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن ان سے بڑا
ذخیرہ فی الحال بکھرا پڑا ہے۔ اگر صرف مرکزی اسمبلی
اور بمبئی اسمبلی کی رودادوں سے قائداعظم کی تقریریں
کو بقید سنین یکجا کر کے چھاپ دیا جائے تو کم و بیش
دس ضخیم جلدیں ترتیب پا سکتی ہیں۔ ANNUAL
REGISTER) کی شخصیات اور اخباروں میں منتشر
بیانات بھی جن میں اخبار ٹریبون اور (CIVIL
کے فائل بڑے مفید ہو سکتے ہیں۔ جمع کئے جائیں تو یہ
سلسلہ کافی کارآمد ہوگا۔ محترمہ فاطمہ جناح کی تحویل
میں قائداعظم کے جو کاغذات ہیں انہیں بھی قومی امانت
خیال کرتے ہوئے بغیر کسی قطع و برید کے شائع کرنا
چاہئے۔ اور انتخابات کا کام فی الحال آئندہ نسلوں
پر چھوڑنا ہوگا۔ اس کی تعبیر اور تشریح بھی فی الحال
غیر جذباتی انداز میں ممکن نظر نہیں آرہی ہے۔ ان
میری دانست میں تقاریر و بیانات اور خطوط کا

یہ بیش قیمت سرمایہ پورے کا پورا محفوظ ہونا چاہئے۔ سارے سرمائے کے بیک وقت سامنے نہ ہونے کی وجہ سے جتنی کتابیں بھی اس وقت تک شائع ہوئی ہیں ان میں کمیاں اور کوتاہیاں نظر آتی ہیں۔ خود پاکستانی مورخین کی کتابیں بھی نقائص سے خالی نہیں ہیں۔ سبب یہ ہے کہ تحریک پاکستان سے متعلق سارا مواد اور قائد اعظم کی تقریروں کا کل سرمایہ بیک وقت ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تحریک پاکستان کے مخالفین کی تحریریں بھی مورخین کے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔ اور وہ بھی ہمارے تاریخی سرمائے کا ایک حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن کی اہمیت تحریک پاکستان کے سلسلہ میں جزوی اور ضمنی ہے ان ماخذ سے استفادہ بھی ضروری ہے اور ان کی تلاش و جستجو بھی ضروری ہے۔ لیکن اس وقت جبکہ پاکستان کی تحریک سے براہ راست متعلق مواد کی تدوین کا صحیح پس منظر اجاگر نہیں ہو سکتا میری دانست میں سر سید، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، سر سکندر حیات، سر فضل حسین اور سر محمد شفیع کے کارنامے اگرچہ تحریک پاکستان کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے اذکار کی قدر و قیمت قائد اعظم کے کارناموں کے برابر نہیں۔ پہلے تین بزرگوں کا تعلق ہمارے جدوجہد آزادی کے ابتدائی ادوار سے ہے۔ اور اس کی نوعیت بھی پوری طرح متعین نہیں۔ باقی تین کا رشتہ ہماری جدوجہد آزادی سے کیا ہے۔ اس میں بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے۔ کیونکہ ان تینوں بزرگوں کے سیاسی کارناموں کا ایک رشتہ برطانوی حاکموں کی خوشنودی کے ساتھ منسلک ہے۔ سر فضل حسین اور سر سکندر نے مسلم لیگ کے ساتھ جو رویہ صوبے کے اندر برقرار رکھا اور یونینسٹ پارٹی کی مدد سے شہری اور دیہاتی آبادی کے درمیان جو افتراق پیدا کیا اس کے بارے میں مستقبل کا مورخ شاید زیادہ ذمہ دارانہ انداز میں کوئی رائے دے سکے۔ اتنا یقینی ہے کہ اس سرمائے کی وقعت ہمارے نزدیک قائد اعظم کے کام کے برابر نہیں ہو سکتی۔ یوں تو تحریک پاکستان کے حامی اور مخالف دونوں طبقوں کے بیانات تحریک آزادی کی تحریک میں اہم ہیں اور اس لحاظ سے پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی اور بعض دوسرے کانگریسی اکابر کے کارنامے بھی توجہ طلب ہیں لیکن تاریخی مواد کی صحیح جانچ پڑتال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تحریک پاکستان سے براہ راست متعلق افراد کے نام اور کام کو پوری طرح سے واضح نہیں کیا جاتا اور ان شخصیتوں میں قائد اعظم سب سے زیادہ اہم ہیں۔

ان کی تقریروں کو شائع کرنے کا کچھ کام ولیسج سوامی نے شروع کیا تھا۔ دو برس ہوئے پانچ سو صفحات کی پہلی جلد تیار رکھی ہوئی تھی۔ پورا منصوبہ نو دس جلدوں کا تھا۔ معلوم نہیں یہ کام اب کس مرحلے پر ہے اس زمانے میں یہ خیال بھی ہو رہا تھا کہ تمام تقریروں کو سن وار چھاپنے کی بجائے ان کا صرف انتخاب شائع کیا جائے اگر یہ ہوا تو یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہوگی۔ تاریخی دیانت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم قائد اعظم کی تقریروں

کے وہ حصے بھی محفوظ کر دیں جو ہمارے ذاتی معتقدات
کے خلاف ہوں۔ جب تک حق و صداقت کے بنیادی اصول
تاریخ میں بحال نہیں ہوتے پاکستانی قومیت کا تصور
مستحکم بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتا۔ ہم لوگ تقسیم
برِ اعظم کے اتنے قریب ہیں کہ آزادی سے اور غیر جذباتی
ہو کر ہمارے لئے اپنے سرمائے کو دیکھنا مشکل ہے۔ اس
لئے تاریخی واقعات کی تعبیر اور تشریح سے زیادہ
اہم یہ پہلو ہے کہ ہم تاریخی سرمائے کو فی الحال چھاپ
دیں۔ اور پھر پورے ذخیرے کو سامنے رکھ کر نتائج کے استخراج
کی سعی کریں۔ تحریک پاکستان سے متعلق اب تک پاکستانی
مورخین کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان افراط و تفریط کے
یہ عناصر پائے جاتے ہیں اور نقائص بھی ہیں کسی نہ کسی سیاسی
مکتبہ فکر سے متعلق ہونے کے باعث مصنفین کے ہاں
واقعات میں کھینچ تان کا احساس بھی ہوتا ہے۔ چودھری
خلیق الزماں کی متذکرہ بالا کتاب میں ساری تحریک کا مرکزی
نقطہ انہوں نے اپنی ذات کو بنایا ہے۔ اس لئے ان کے
کارناموں کی صحیح قدر و قیمت مسلم لیگ کا سارا ریکارڈ سامنے
رکھ کر ہی متعین کی جا سکتی ہے۔ جمیل الدین احمد، قاضی
سعید اللہ اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی پاکستان کی جدوجہد
کا مرکز علی گڑھ کو قرار دیتے ہیں۔ تحریک کے اس پہلو کی
چھان بین بھی ضروری ہے، کہ پورے برِ اعظم کی جدوجہد
آزادی میں علی گڑھ کا حصہ کس قدر ہے۔ ڈاکٹر واسطی کی
کتاب (　　　) صرف لارڈ منٹو کے
دور سے متعلق ہے اور اس میں انگلستان میں سربمہر
دستاویزوں کے مواد کو پہلی دفعہ عام پڑھنے والوں سے
روشناس کرایا گیا ہے۔ شریف الدین پیرزادہ تحریک
پاکستان پر لکھ چکے ہیں (EVOLULION
OF PAKISTAN) K.K. AZIZ نے برطانیہ میں موجود مواد سے
کام لیا۔ اور ڈاکٹر وحید الزماں نے بھی تحریک پاکستان کا
تجزیہ کیا ہے (TOWARDS PAKISTAN) یورپ کے
تعلیمی سفر میں لکھی گئی یہ کتابیں اپنی اپنی حدود میں مفید اور
کارآمد ہیں لیکن ان میں متعلقہ برطانوی یونیورسٹیوں کی چھاپ
اتنی گہری ہے کہ صحیح پاکستانی نقطۂ نظر پوری طرح نہیں ابھر سکا۔
(K.K. AZIZ) کی کتاب اس لحاظ سے باقی کتابوں پر
ترجیح رکھتی ہے اور اس میں پاکستانی نقطۂ نظر ایک حد تک
مثبت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
کی کتاب (THE STRUGGLE FOR PAKISTAN)
ایک ماہر مورخ اور ذہین رہنما کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے اور
اس میں پاکستانی زاویۂ نظر کو پہلی بار بھرپور نمائندگی ملی
ہے۔ ڈاکٹر قریشی ہر چند کہ خود بھی تحریک پاکستان سے متعلق
تھے اور جا بجا ان کے جذباتی ہو جانے کا امکان تھا لیکن
تاریخی مواد کے تجزیے اور ترتیب میں ان کی بصیرت نے
ہر جگہ انہیں ایک کامیاب مورخ ثابت کیا ہے۔ اس کے
مقابلہ میں ایس ایم اکرام کی کتاب MODERN MUSLIM
INDIA AND THE BIRTH OF
PAKISTAN سے یونینسٹ اکابر کی طرف جھکنے کا
میلان اتنا قوی ہے کہ کہیں کہیں تاریخی تناسب اپنی
اصلی شکل میں باقی نہیں رہا۔ علی گڑھ تحریک سے متعلق
شیخ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ البتہ بڑی حد تک
صحیح اور قابل قدر ہے۔

تحریک پاکستان کے بعد قائداعظم کی سوانح عمری کی تشکیل و تدوین کا مرحلہ آتا ہے لیکن جب تک پاکستان تحریک کی کتابیات تیار نہ ہو جائے جب تک قائداعظم کی پوری تقریریں منضبط صورت میں ہمارے سامنے نہ ہوں جب تک پاکستان کی جدوجہد سے متعلق مسلم لیگ کا ریکارڈ شائع نہیں ہو جاتا جب تک تحریک سے متعلق افراد کی یادداشتیں اور قائداعظم کے ذاتی کاغذات مورخین تک نہیں پہونچتے سوانح عمری کا کام ادھورا رہے گا اور اس کے ہر لحاظ سے مکمل ہونے کی کوئی ضمانت نہیں بلکہ اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت بھی دی جائے کہ جب تک تحریک پاکستان کی تاریخ صحیح دیانت دارانہ خطوط پر مرتب نہیں ہو سکتی اس وقت تک سوانح عمری کی تحریر کا کام ملتوی رہنا چاہیئے حکومت کی تائید سے (ہیکٹر بولائیتھو) نے جو سوانح عمری مرتب کی اور جس کا حال ہی میں ایک نہایت عمدہ اردو ترجمہ شائع ہو چکا ہے اس میں علاوہ اس بات کے کہ تحریک پاکستان کا کل مواد پیش نظر نہیں تھا۔ مرتب نے برطانوی باشندہ ہونے کی وجہ سے تقسیم سے متعلق واقعات کو صحیح رنگ میں پیش نہیں کیا۔ (V.P. MENON) کی بیان کردہ تفصیلات کی کارگزاری اب کسی ثبوت کی محتاج نہیں رہی۔ برطانوی افسروں کی صلح پسندانہ کوششوں کا جو تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ بھی حقیقت کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں مرتب نے مواد کی کمی کو بعض مقامات پر تخیل کی کارگزاری سے پورا کیا ہے جس سے قائداعظم کے ابتدائی حالات میں ان کی جیتی جاگتی شکل و صورت تو ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن لکھنے والے کے تحقیقی عمل نے واقعات کی شکل کو کہیں کہیں مسخ کر دیا ہے۔ اس سوانح عمری کو شخصیت نگاری کے ذیل میں شمار کرنا زیادہ موزوں ہوگا۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی روشنی میں میری تجویز یہ ہے کہ پاکستانی مورخوں کا ایک بورڈ ہونا چاہیئے جو کتابیات کے کام کو سب سے پہلے مکمل کرے۔ قائداعظم کی تقریروں کو قطع و برید کے بغیر شائع کرے اور ڈاکٹر قریشی کی کتاب کو بنیاد بنا کر تحریک پاکستان پر کئی جلدوں میں تاریخ مرتب کرے اور اس کام کے بعد قائداعظم کی سوانح عمری کی ترتیب و تدوین کا نازک کام اپنے ہاتھ میں لے۔ اگر قائداعظم سے متعلق تاریخی سرمائے کو نظرانداز کر کے ہم نے ذیلی اور ضمنی شخصیتوں کی طرف توجہ مبذول کر دی تو آئندہ مورخ ہمیں معاف نہیں کرے گا۔ اس کام کے لئے جو وسائل میسر ہیں چند برس کے بعد وہ باقی نہ رہیں گے۔ سیاسی راہ نماؤں کی ایک پوری نسل ابھی زندہ ہے جس نے بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اخبارات کے فائل بھی فی الحال میسر آ سکتے ہیں۔ لیگ کا ریکارڈ بھی باقی ہوگا۔ اس لئے آج کے مورخ کے فرائض اور ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور ہر پاکستانی ان سے بجا طور پر توقع کرتا ہے کہ اس ملک کا باشندہ ہوتے ہوئے وہ اپنے فرض کو پورا کریں۔

قائداعظم کا نعرۂ جہاد

پیام شاہجہانپوری

جہاد کی کئی قسمیں ہیں۔ جہاد باللسان، جہاد بالقلم، جہاد بالسیف اور جہاد بالنفس تاریخ اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ملت اسلامیہ سب حالات جہاد کی ان ساری صورتوں پر عمل کرتی رہی ہے۔ جس زمانہ میں مسلمان تعداد کے لحاظ سے کمزور تھے اور مکہ میں مظلومانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس زمانے میں انہیں جہاد بالسیف کا حکم نہیں دیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب ہے اور بے حد رحیم و کریم ہے جانتا تھا کہ مسلمانوں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ کفار کا مقابلہ کر کے انہیں میدان جنگ میں شکست دے سکیں۔ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے اور نہ ایسی شجاعت کو پسند کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کے پیارے بندوں کی قیمتی جانیں ضائع ہو جائیں اور نتیجہ کچھ نہ نکلے۔ یہ تہور ہے شجاعت نہیں اور اللہ تعالیٰ کو تہور نہیں شجاعت پسند ہے۔ پس اللہ نے مسلمانوں کی حالت پر رحم فرما کر اور ان کی کمزوری پر نظر رکھتے ہوئے جہاد بالسیف کا حکم نہیں دیا۔ ہاں جہاد باللسان اور جہاد بالمال کا حکم دیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے جہاد کی ان دونوں صورتوں پر عمل کیا اور اسلام کی تبلیغ کے لئے زبان اور اموال دونوں کو محیر العقول طریقہ سے صرف کیا۔ پھر جب کفار کے مظالم کی وجہ سے مسلمانوں کا مکہ میں رہنا ناممکن ہو گیا تو انہیں ہجرت کا حکم دیا گیا۔ اور مسلمان اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ چلے گئے یہ بھی جہاد ہی کی ایک قسم ہے۔ مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں نے اتنی طاقت جمعیت فراہم کر لی جو جہاد بالسیف کے لئے ضروری تھی تو اس وقت حکم نازل ہوا کہ اللہ کی راہ میں قتال کرو۔ چنانچہ مسلمان بدر کے معرکہ سے لے کر بالاکوٹ کی رزم تک جہاد بالسیف میں مصروف رہے۔ زمانہ برابر کروٹیں بدلتا رہا اور مسلمان عروج و زوال کے متعدد مراحل سے گذرتے رہے۔ ان کی دنیوی وجاہت پر زوال آ گیا۔ ان کی حکومت کا دائرہ روز بروز تنگ ہونے لگا۔ برصغیر پاک و ہند جو سات سو سال سے تمدن اسلامی کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ اور وہاں ہر طرف ان کی عظمت کے علم لہرا رہے تھے۔ اب ان کے لئے گہوارہ

اودار بن چکا تھا۔ ان کی سلطنت جاتی رہی، اتفاق
و اتحاد کی برکت ان کے درمیان سے اٹھ گئی۔ اور وہ
غلامانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ اورنگ زیب عالمگیر
کی رحلت کے بعد سے لے کر ۱۸۵۷ء کی بغاوت تک
مرہٹوں، جاٹوں سکھوں اور انگریزوں کے ساتھ ان کی
مختلف جنگیں ہوئیں اور انہوں نے اپنی عظمت رفتہ
اور شوکت گم گشتہ بحال کرنے کے لئے جدوجہد
جاری رکھی۔ حضرت سید احمد شہید اس سلسلہ کی
آخری کڑی تھے۔ جنہوں نے سکھوں کے خلاف
علم جہاد بلند کیا۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے
کہ انہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد نہیں کیا۔
حالانکہ ان سے جہاد کرنے کے لئے انہیں اس طویل
اور دشوار گذار سفر کی بھی ضرورت نہ تھی۔ جو
سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے انھوں نے اختیار
کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں
انگریزوں سے جہاد کرنا مسلمانوں کی طاقت سے
باہر تھا۔ اور وہ شرائط بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔
جو جہاد کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ ان کے بعد
مسلمانوں کے ایک اور سیاسی رہنما سرسید احمد
خاں مرحوم نے بھی مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف
تلوار اٹھانے سے روکا۔ کیونکہ حضرت سید احمد شہید کی
طرح ان کی دوربین نگاہیں بھی اس معرکہ آرائی کے
انجام تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت
نے ثابت کر دیا کہ سید احمد شہید اور سرسید احمد خاں
کے اندازے درست تھے۔ اس کے بعد قدرت نے ایسے
حالات پیدا کر دیئے کہ برصغیر میں کچھ عرصہ کے لئے جہاد
بالسیف ختم ہو گیا۔ ہاں جہاد باللسان، جہاد بالقلم اور جہاد
بالمال باقی رہا۔ پھر سرسید احمد خاں کی قیادت میں
مسلمانوں کی ترقی اور ان کی عظمت رفتہ کی بحالی
کے لئے جو تحریک جاری ہوئی اسے جہاد باللسان جہاد
بالقلم اور جہاد بالمال کے بہترین نمونے کہنا غلط نہ
ہوگا۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو خواب غفلت
سے جھنجھوڑنے کے لئے علی گڑھ مسلم کالج قائم کیا۔
تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ شہر شہر پھر کر قوم کو ان
کی تہذیبی مذہبی اور رسم و رواج کی خرابیوں سے
آگاہ کیا۔ جو اس میں جڑ پکڑ گئی تھیں۔ انہوں نے
حالی اور نذیر احمد سے ایسی حیات افروز نظمیں اور
اصلاحی ناول لکھوائے جنہوں نے مسلمانوں کو اپنے
ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور
کر دیا۔ سرسید کے جاری کردہ تہذیب الاخلاق اور
ان کے قائم کردہ کالج نے مسلمانوں کی ایک ایسی نسل کو
پروان چڑھایا جس میں ملک کی آزادی کے لئے انتھک
جدوجہد کی۔ اس قافلے میں سے ایسے ایسے لوگ
نکلے جنہوں نے جہاد باللسان، جہاد بالقلم اور جہاد
بالمال کے ذریعہ قوم میں حرکت و عمل کی روح پیدا کی۔
مگر اس قافلہ کو منزل مقصود سے ہمکنار کرنے کا شرف
ایک ایسی شخصیت کے حصہ میں آیا۔ جو علی گڑھ کالج کا تعلیم یافتہ
تو نہ تھا لیکن اس تحریک سے متاثر ضرور تھا۔ جو سرسید
احمد خاں نے جاری کی تھی بلکہ ان کے خواب کی تکمیل
تعبیر تھا۔ ہماری مراد قائد اعظم محمد علی جناح سے ہے

جو نصف صدی تک اس ملک کی سیاسیات پر چھائے رہے۔ اور جنہوں نے اپنے پیشرو سر سید احمد خاں کی طرح انگریزوں کے خلاف پُرامن جد و جہد جاری رکھی مگر قوم میں ایسا جذبہ پیدا کر دیا جس نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جہاد بالسیف کا ناقابلِ فراموش کارنامہ سرانجام دیا۔

قائدِ اعظم کی عوامی زندگی کا آغاز ۱۹۰۹ء سے ہوتا ہے۔ اس سال وہ بمبئی کے حلقہ سے امپیریل کونسل کے ممبر ہو کر پہلی بار منظرِ عام پر آئے یہ وہ دور تھا جب انگریز استعمار کے خلاف زبان کھولنے کا یارا بڑے سے بڑے لیڈر کو نہ ہوتا تھا۔ مگر قائدِ اعظم نے اس زمانہ میں بھی قانون کی حدود میں رہتے ہوئے حکومت پر بڑی سخت تنقید کی۔ وہ پہلے رہنما تھے جنہوں نے نہایت واشگاف الفاظ میں حکومت کو بتایا کہ اس کونسل میں غیر سرکاری ممبروں کا تناسب اتنا کم ہے کہ اس کی نمائندہ حیثیت تقریباً صفر کے برابر ہے اور جب تک اس میں غیر سرکاری ممبروں کی تعداد بڑھائی نہیں جائے گی۔ اس وقت تک اس کی افادیت مشتبہ رہے گی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مفید تجاویز اور ترامیم پیش کیں۔ اس وقت برصغیر میں دو ہی سیاسی جماعتیں تھیں۔ ایک کانگریس اور دوسری مسلم لیگ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ اس وقت مسلم لیگ سروں، خان بہادروں، نوابوں اور جاگیرداروں کی جماعت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت مسلم لیگ کا عوام سے رابطہ نہ تھا۔ مگر واقفانِ حال جانتے ہیں کہ اس دور میں کانگریس پر بھی بڑے بڑے سیٹھ، تعلقہ دار، لکھ پتی، پارسی چھائے ہوئے تھے۔ عوام الناس کا اس جماعت سے قریبی تعلق نہ تھا۔ حد یہ ہے کہ اس جماعت کا بانی ایک انگریز تھا جسے کچھ ہندوستانیوں کی اعانت ضرور حاصل تھی مگر اس میں شک نہیں کہ کانگریس کا دائرہ اثر مسلم لیگ سے زیادہ وسیع تھا اس لئے قائدِ اعظم نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کانگریس ہی کے پلیٹ فارم سے کیا۔ وہ کانگریس میں شامل ضرور ہو گئے مگر ایک بات انہیں مسلسل کھٹکتی رہی اور وہ یہ کہ مسلمان کانگریس میں شامل ہو کر کہیں اپنی جداگانہ حیثیت ختم نہ کر دیں وہ چاہتے تھے کوئی ایسی تنظیم ضرور ہونی چاہئے جو خالص مسلمانوں کی ہو یہی وجہ ہے کہ جب مولانا محمد علی جوہر نے انہیں مسلم لیگ میں شامل ہونے کی تحریک کی تو انہوں نے ۱۹۱۲ء میں بلا پس و پیش اس کی رکنیت قبول کر لی۔ اس واقعہ کے دو سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں حکومت برطانیہ کی طرف سے برصغیر میں بعض اصلاحات جاری کرنے کا اعلان کیا گیا اس مرحلہ پر کانگریس نے ایک وفد تشکیل دیا جس کا مقصد لندن جا کر برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں کو یہ بتانا تھا کہ ہندوستان برائے نام اصلاحات قبول کرنے پر رضامند نہ ہوگا۔ تا وقتیکہ اسے حکومت میں برابر کا شریک نہ بنایا جائے۔ اس وفد میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو بھی شامل کیا گیا۔ لندن پہنچ کر انہوں نے جس جرأت و بیباکی سے برطانوی حکومت کے سامنے برصغیر کے عوام کا موقف واضح کیا۔ اس کی نظیر

عہد کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ ان کے ایک
بیان کے یہ فقرے جو انہوں نے لندن ٹائمز کے
نمائندے سے کہے۔ کبھی فراموش نہیں کئے جاسکیں گے۔
"سلطنت برطانیہ کے ممبر ملکوں میں ہندوستان وہ
واحد ملک ہے جہاں غیر ذمہ دارانہ اور غیر نمائندہ
حکومت قائم ہے۔ ہمارے خیال میں اس عہد کی
تاریخ اس قسم کے نعرۂ رندانہ سے تقریباً خالی ہے۔
لندن میں بیٹھ کر کسی بند کمرے میں نہیں بلکہ دنیا کے
ایک بہت بڑے اخبار کو حکومت کے خلاف ایسا
سخت بیان دینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اس وقت
کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ جہاد باللسان کا بہت
بڑا کارنامہ تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر کارنامہ قائد
اعظم نے ۱۹۱۸ء میں انجام دیا
جب حکومت نے رولٹ ایکٹ نافذ کیا۔ تفصیل
اس اجمال کی یہ ہے کہ جب برصغیر میں آزادی کا نعرہ
بلند ہوا اور عوام نے حکومت کے دیئے ہوئے کھلونوں
سے بہلنے سے انکار کردیا تو حکومت نے "شوریدہ سروں"
"سرکوبی" کے لئے ایک کمیشن بنایا جس کے چیرمین
مسٹر رولٹ تھے۔ اس کمیشن سے کہا گیا تھا کہ
وہ آزادی کا مطالبہ کرنے والوں کے لئے ایسی
سزائیں تجویز کرے اور اس قسم کے قانون بنائے کہ
کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ مسٹر رولٹ نے
سرکاری ہدایات کی پوری پابندی کی۔ اور ایسی سفارشات
پیش کیں جن کے منظور ہوجانے کے بعد حریت پسندوں
اور عام اخلاقی مجرموں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا
تھا۔ جب رولٹ کمیشن کی یہ سفارشات مرکزی اسمبلی
میں پیش ہوئیں تو قائد اعظم نے پھر ایک بار نعرۂ جہاد
بلند کیا۔ انہوں نے اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے ان
سفارشات پر نہایت سخت تنقید کی اور کہا کہ

"رولٹ کمیشن نے سیاسی مجرموں کے
مسئلہ کو اس قدر بھیانک شکل میں پیش کیا
ہے کہ گویا وہ عام اخلاقی مجرم ہیں جن کا
پیشہ لوٹ مار کرنا ہے اور گروہ در گروہ ہمارے
ملک میں داخل ہوگئے ہیں جنہیں قانون کے
ذریعہ صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہیئے حالانکہ
یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ مرض کا علاج قانون
سازی سے نہیں ہوتا۔ حکمراں طبقہ کو چاہیئے
کہ وہ اپنے طرز عمل میں تبدیلی پیدا کرے۔
اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سیاسی ہنگامہ آرائی
خود بخود ختم ہوجائے گی۔ یہ سفارشات جو
رولٹ کمیشن نے پیش کی ہیں ایسی احمقانہ
اور ناقابل قبول ہیں کہ کسی متمدن حکومت
کا انہیں قبول کرنا تو درکنار وہ ان کا تصور
بھی نہیں کرسکتی۔"

لیکن افسوس کہ قائد اعظم کی اس تنبیہہ
کے باوجود جولائی ۱۹۱۸ء میں سفارشات منظور
کرلی گئیں۔ یہ دیکھ کر انہوں نے وائسرائے کے نام
ایک خط لکھا اور اس میں نہایت جرأت سے کام لیتے
ہوئے اسے بتایا کہ آپ کی حکومت نے رولٹ ایکٹ
منظور کرکے انصاف کا خون کردیا ہے اور عوام کے

بنیادی حقوق کو سلب کر لیا ہے۔ ان حالات میں
ایک ایسے شخص کا آپ سے تعاون کرنا ممکن نہیں
رہا جسے عزت ونفس عزیز ہو۔ اس لئے میں اسمبلی
کی رکنیت سے مستعفی ہوتا ہوں۔

ایک اور موقع پر قائداعظم نے حکومت کو
متنبہ کیا کہ اگر رولٹ کمیشن کی سفارشات کو قانون
کی شکل دیدی گئی تو ملک میں سخت فساد رونما ہوگا۔
ان کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ اس قانون کے نافذ ہوتے
ہی سارے ملک میں حکومت کے خلاف آگ لگ گئی۔
پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جب انگریزوں نے
ہندوستانیوں کو آزادی دینے کے بجائے ان کی
آواز کو دبانا شروع کیا تو ملک میں زبردست انقلاب
برپا ہوگیا۔ ہندوؤں میں مسٹر گاندھی اور موتی لعل
نہرو اور مسلمانوں میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی
جوہر اور مولانا شوکت علی اس انقلاب کی قیادت
کر رہے تھے لیکن قیادت کی مکمل باگ ڈور گاندھی جی
کے ہاتھ میں تھی۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا
مقاطعہ، ڈگریوں کی واپسی، سرکاری ملازموں سے
استعفٰے اور ترک وطن کے ہنگاموں نے سارے ملک
کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یہ خالص جذبات کا دور
تھا اور سارا ملک جذبات کی اس رو میں بہہ رہا
تھا۔ چھوٹا بڑا شاید ہی کوئی لیڈر ایسا ہو جس نے
جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کی کوشش کی
ہو۔ اور اگر کسی نے ان مسائل پر حقیقت پسندانہ

نقطۂ نگاہ سے غور کر کے صحیح نتیجہ نکالا تو عوام
کی شدت کے پیش نظر اس سیلاب کا مقابلہ کر
سے قاصر رہا۔ غرض یہ بڑا نازک وقت تھا۔ ہند
اور مسلمان سب ایک نقطہ پر متفق ہو چکے تھے او
نقطہ یہ تھا کہ انگریزی حکومت کا مکمل مقاطعہ کیا
اس میں شک نہیں کہ مقصد نہایت اچھا تھا لیک
مشکل یہ آپڑی تھی کہ اس کے حصول کے لئے
ذرائع اختیار کئے گئے تھے۔ وہ غلط تھے۔ اور ا
ذرائع سے سراسر ہندوؤں کو فائدہ پہنچ رہا تھ
مسٹر گاندھی برصغیر کے سیاست دانوں میں سب
زیادہ چالاک اور شاطر سیاستدان گذرے ہیں
اس حقیقت کا ادراک ہوگیا تھا کہ خلافت کا مس
مسلمانوں کے لئے بڑا اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ ا
اس کے ساتھ ان کے نازک جذبات وابستہ ہ
جب انگریزوں نے خلافت عثمانیہ پر ہاتھ ڈالا ت
کے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ اور وہ قدر
طور پر مشتعل ہو گئے، گاندھی جی نے موقع سے فائدہ
اور مسلمانوں کو ترک موالات پر اکسا کر انہیں تب
اقتصادی اور سیاسی طور پر زک دینے کی گ
سازش کی۔ مسلمان جذبات کی رو میں بہہ کر گاندھ
کی سازش کا شکار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہجرت
ترک موالات کی تحریکیں جاری ہوئیں اور مسلمان
نے اپنی جائدادیں حتیٰ کہ اثاث البیت تک فروخ
کر کے اسلامی ممالک کو ہجرت کرنے کا پروگرام بنا
ہندو جو ایسے مواقع کے منتظر رہتے تھے فوراً میدا

میں آگئے اور انہوں نے مسلمانوں کی جائدادیں کوڑیوں
کے مول خرید کر انہیں قلاش کر دیا۔ سادہ لوح مسلمان
گھر بار اور مال متاع سے ہاتھ دھو کر افغانستان کی
طرف روانہ ہوئے مگر کچھ راستہ کی دشوار گذاریوں
کی تاب نہ لا سکے۔ کچھ راہ زنوں کی راہزنی کا شکار
ہوئے۔ باقی ماندہ جو افغانستان پہونچے، ان کی
وہاں پذیرائی نہ ہوئی بلکہ انہیں ملک میں داخل
ہونے سے روک دیا گیا۔ جو کسی نہ کسی طرح داخل
ہو گئے کچھ ہی دن کے بعد انہیں وہاں سے نکلنا پڑا۔
غرض اس طرح شکستہ دل، پریشان حال اور
دانہ دانہ کو محتاج ہو کر یہ بدنصیب پھر اسی ملک میں
واپس آگئے۔ جہاں سے گاندھی جی کی انگیخت اور
علماء کے فتووں سے متاثر ہو کر ہجرت کرنے نکلے
تھے۔ یہی نہیں کتنے ہی مسلمان وکیلوں نے اسناد
پھاڑ دیں اور وکالت ترک کر دی۔ معلوم نہیں
کتنے مسلمانوں نے سرکاری ملازمت سے استعفٰے
دے دیا۔ اور ان کی جگہوں پر ہندو ملازمت میں
رکھ لئے گئے۔ بے شمار مسلمان نوجوان اسکولوں
اور کالجوں کو خیرباد کہہ گئے۔ حتیٰ کہ علی گڑھ یونیورسٹی
بھی بے رونق ہو گئی لیکن اس کے برعکس ہندوؤں
نے نہ تو اپنی جائدادیں فروخت کیں نہ ترک وطن
کی تحریک کو اپنایا۔ نہ وکالت نہ سرکاری ملازمتیں
ترک کیں اور نہ ہندو یونیورسٹی بنارس کی رونق
میں کسی قسم کی کمی آئی۔ ہجرت اور ترک موالات کے
یہ وہ بھیانک پہلو تھے۔ جو قائداعظم کی دوربین
نگاہیں بہت پہلے دیکھ چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ
ان تحریکوں سے بہت الگ رہے۔ نہ صرف الگ رہے
بلکہ انہوں نے اس طریقۂ کار کی برملا مخالفت کی۔
اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی بہت بڑا جہاد تھا۔
قوم کو غلط راستے پر جاتے دیکھ کر شدید مخالفت
کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کے خلاف آواز اٹھانا
جہاد نہیں تو اور کیا ہے۔ مگر یہ توفیق ہر کسی کو
میسر نہیں آتی۔ غیروں کی مخالفت کرنا آسان ہے مگر
ان لوگوں کی مخالفت میں آواز اٹھانا بڑا مشکل
کام ہے۔ جو اپنے ہم وطن اور ہم قوم ہوں، جن سے
ذہنی اور جذباتی وابستگی بھی ہو اور پھر ایسے زمانے
میں جب سارا ملک یک زبان ہو رہا ہو اور اپنے
موقف کے خلاف ایک لفظ سننا گوارا نہ کرتا ہو۔
یہ انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے
طبع سلیم کے ساتھ ساتھ جرأت مندانہ اور غیر معمولی
دل و دماغ لے کر آتے ہیں۔ قائداعظم بلاشبہ
ان ہی لوگوں میں سے تھے جو قدرت کا عطیہ
ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہجرت اور ترک موالات کے مضر
رساں پہلوؤں پر سخت تنقید کی اور لگی لپٹی رکھے
بغیر ان تحریکوں کو ملک اور خصوصًا مسلمان قوم
کے لئے تباہ کن قرار دیا۔ انہوں نے اپنی ایک
تقریر میں فرمایا۔

"مجھ سے سوال کیا جا رہا ہے کہ ان
"نازک حالات میں میں قومی تحریکوں سے
لاتعلق کیوں ہوں؟ اس میں شک نہیں

کہ حکومت کی ظالمانہ روش نے ملک کو
نہایت خطرناک صورت حال سے دوچار
کردیا ہے۔ سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا ہر
شخص حکومت کی اس روش کی مذمت کرے گا۔
جس قوم نے اس عالمگیر جنگ میں اپنی جانوں
اور اموال سے حکومت کی مدد کی اسے حکومت
نے رولٹ ایکٹ کا تحفہ دیا۔ لیکن اس کے
ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ مسٹر گاندھی
نے اس صورتحال کا جو علاج تجویز کیا ہے
وہ گمراہ کن ہے۔ (اس پر حاضرین نے یک زبان
ہو کر قائداعظم کے خیالات سے اختلاف کیا
اور جلسہ گاہ "نہیں نہیں" کے نعروں سے
گونج اٹھا) قائداعظم متانت اور وقار کا
کوہ گراں بنے اپنی جگہ پر کھڑے رہے
اور نعرے ختم ہونے کے بعد انہوں نے
سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا:
مجھے معلوم تھا کہ آپ لوگ میری رائے
سے اختلاف کریں گے لیکن میں یہی کہوں گا
کہ موجودہ طریقۂ کار تباہ کن ہے۔ اگر میرے
خیال میں یہ تحریکیں قوم کی صحیح رہنمائی
کرتیں تو میں سب سے پہلے ان میں شریک
ہو جاتا۔ میرے دل میں مسٹر گاندھی
اور ان کے ساتھیوں کے لئے بڑی عزت
ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا
کہ انہوں نے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے
وہ قوم کو تباہی کے گڑھے میں گرا دے گا۔
کونسلوں کا مقاطعہ۔ اسکولوں اور کالجوں
کا مقاطعہ اور برطانوی مال کا مقاطعہ یہ
سب جذباتی باتیں ہیں۔ میری رائے میں
کونسلوں کا مقاطعہ کرنے کی بجائے کونسلوں
میں جاکر حکومت کا مقابلہ کرنا چاہیئے تھا۔
اگر سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا
مقاطعہ ضروری تھا تو پہلے ملک بھر میں
قومی اسکول اور کالج قائم کرنے چاہئیں
تھے۔ اگر برطانوی مال کا مقاطعہ ضروری تھا
تو پہلے ملک بھر میں قومی کارخانے قائم کرنے
ضروری تھے۔

قائداعظم کی اس تقریر کو عام طور پر ناپسند کیا گیا۔ مگر وہ اپنے وقت کے بہت بڑے مجاہد تھے۔ انہوں نے سوداباز ی کی پرواہ کئے بغیر نعرۂ رندانہ بلند کر دیا۔ اور پھر واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کی رائے سو فی صدی درست تھی۔ پنڈت نہرو، ڈاکٹر امبیدکر اور دوسرے تمام بڑے بڑے لیڈروں نے اعتراف کیا کہ یہ تحریکیں غلط تھیں۔ حتیٰ کہ خود مولانا محمد علی جوہر نے بھی جو ترک موالات اور ہجرت کے روح رواں تھے اعتراف کیا کہ یہ پروگرام قوم کے لئے سودمند ثابت نہیں ہوئے۔ اس کے بعد ملک کی سیاست میں بڑے نشیب و فراز آئے۔ میثاق لکھنو، نہرو رپورٹ، سائمن کمیشن، انڈیا ایکٹ اور قرارداد پاکستان خواہ کوئی مرحلہ ہو اور حالات کتنے ہی ناخوشگوار اور

ناساعد ہوں، قائداعظم نے ہر موقع پر جہاد باللسان اور جہاد بالقلم کا فریضہ ادا کیا۔ انہوں نے برطانیہ کے بڑے بڑے جابر و تابر حاکموں کے سامنے قانون کی حدود میں رہتے ہوئے اس کے خلاف طرز عمل کی نہایت شد و مد سے مخالفت کی۔ انہوں نے ہر موقع پر اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں سے بھی اختلاف کیا اور بعض دفعہ یہ اختلاف اتنی نازک صورت اختیار کر گیا کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے مگر انہوں نے جان کی مطلق پروا نہ کی۔ وہ اپنے طرز عمل سے اپنی قوم کو یہ سبق دیتے رہے کہ حق کی خاطر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکرا جاؤ۔ اپنوں اور غیروں سب کی مخالفت مول لے لو مگر سچائی سے نہ ہٹو۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اس بڑے جہاد کی تیاری ہے جسے ہم جہاد بالسیف کہتے ہیں۔ کیونکہ جب تک انسان اپنی زبان، اپنے قلم، اپنی ذات اور اپنے اموال کی قربانی کرنے کا عادی نہ ہو جائے اس وقت تک وہ میدان کارزار میں جا کر اپنی جان کی قربانی دینے کا حوصلہ پیدا نہیں کر سکتا۔ قائداعظم کی اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ قوم میں وہ کس بل پیدا ہو گیا کہ وہ ہندو اور انگریز کی متحدہ طاقت کے سامنے پہاڑ کی طرح ڈٹ گئی اور ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک سات سال مسلسل جہاد کرتی رہی۔ اس جہاد میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو اسے دوسرا بڑا جہاد پیش آیا جب بزدل دشمن نے سوتے ہوئے نہتے عوام پر اچانک حملہ کر دیا۔ قائداعظم کی تربیت کی بدولت قوم اس جہاد کے قابل ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ اللہ کا نام لے کر میدان میں آ گئی اور اس نے اپنے سے کئی گنا طاقت رکھنے والے دشمن کو ایسی عبرتناک شکست دی کہ رہتی دنیا تک یاد رہے گی۔

ترتیب:- حبیب اللہ اوج * عرفان چغتائی

آج سے عرصہ پہلے اردو کے مشہور صحافی مسٹر حبیب اللہ اوج نے مسٹر عرفان چغتائی کے تعاون سے ایک ضمیمہ مرتب کیا تھا جس میں قائداعظم کی زندگی، ان کے نظریات اور جدوجہد آزادی کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا۔ یہ مضمون وہی ضمیمہ ہے۔

"اس برِعظیم ہندوستان میں ایک تیسری قوم بھی ہے۔ اور وہ ہے مسلمان ـــــ جس کا اپنا تمدن اپنی معاشرت اور اپنا نظامِ زندگی ہے۔ جس کی روایات شاندار ہیں۔ اور جس کا ماضی درخشندہ ہے، جس نے ہندوستان میں ایک ہزار سال تک اناولاغیری کا ڈنکا بجایا ہے۔ جس کی تہذیب و تمدن کے نشانات اس برِعظیم کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس عظیم روایات و تمدن کی حامل قوم کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہ آواز کس پیکرِ عزم و عمل کی تھی جس نے اسلامیانِ ہند کو ایک مرکز پر مجتمع ہونے کا احساس دلایا۔ یہ جرنیل کون تھا۔ جس کی للکار سے ملت کے رگ و پے میں حوصلے اور ولولے نے جنم لیا۔ یہ کس قافلہ سالار کے جواں ارادے تھے جنھوں نے مسز وجے لکشمی پنڈت سے یہ الفاظ کہلوا لئے "اگر مسلم لیگ میں ایک سو گاندھی اور دو سو مولانا آزاد ہوتے اور ان کے مقابلہ پر کانگرس میں صرف ایک جناح ہوتے تو ملک تقسیم نہ ہوتا۔" یہ کس مردِ حق آگاہ کی سیاسی بصیرت تھی جس نے سر سٹیفورڈ کرپس سے یہ خراج وصول کیا ـــــ" قائداعظم محمد علی جناح ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے اصولوں میں کسی قسم کی نرمی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جس سختی سے وہ اپنے نظریہ پر قائم تھے اس سے غیرمعمولی استقلال وفکر کا پتہ چلتا ہے جس سے ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں کام لے رہے تھے۔ اور جن کی بنا پر وہ دل سے چاہتے تھے کہ ملک کے دور دراز گوشوں میں پھیلی ہوئی اقلیت کے لئے پوری طرح سیاسی تحفظ حاصل کیا جائے۔ اگرچہ قدم قدم پر وہ مشکلات سدِّراہ ہوئیں جو تقسیمِ ہند کے سلسلہ میں پیش آسکتی تھیں مگر یہ ان کا عزمِ راسخ تھا کہ انہوں نے حالات کی ہر دعوتِ مقابلہ کو منظور کیا اور اپنی قوم کی آزادی کی منزل تک پہنچا دیا۔ زیادہ سے زیادہ جرأت اور استقلال

ان کے کردار اور شخصیت کا امتیاز تھا۔"

حکیم الامت شاعر مشرق مفکر پاکستان کے اس عظیم
میں بے پایاں تڑپ کس کے لئے تھی ـــ کہ

"ہندوستان میں صرف آپ کی ذات
ایسی تھی جس سے قوم کو یہ توقعات البتہ
کرنے کا حق حاصل ہے کہ مستقبل میں جو
سیلاب آنے کا خدشہ ہے اس وقت صرف
آپ ہی ملت کی صحیح رہنمائی کر سکتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی منتشر قوت کو مجتمع
کرنے کے لئے کس معیار، کن صفات اور کس شان
کے قائد کی ضرورت تھی۔ سر آغا خاں مرحوم
نے بجا طور پر نشان دہی کی کہ انھیں [illegible]
قائد اعظم کو اپنی استعداد [illegible]
میں لازوال یقین [illegible]
اور اپنے فیصلے [illegible]
کے صائب [illegible]
ہونے کا [illegible]
غیر متزلزل [illegible]
اعتماد تھا۔ خدا نے [illegible] انھیں تدبر
اور دانش سے بہرہ وافر [illegible] دیا تھا اور وہ اس
عطیہ کو اپنی قوم بلکہ انسانیت کی فلاح کے لئے وقف کرنے
کا عزم رکھتے تھے۔ اس یقین و اعتماد کا نتیجہ یہ تھا کہ
قائد اعظم اپنے موقف میں بیرونی دباؤ سے ترمیم یا تبدیلی
یا مصالحت پر آمادہ نہیں کئے جا سکتے تھے۔ سیاسی قائدین
میں سے کوئی شخص بھی قائد اعظم سے مضبوط سیرت
کا مالک نہیں تھا۔"

شیرازہ بندی اور اجتماعی زندگی کے لئے یہ گر
کن حالات میں [illegible] روشنائی دی تھی۔ جب ہندوستانی
مسلمان [illegible] تاریخ کے اس موڑ
پر تھے کہ مغل تاجدار
شاہنشاہ
اورنگ زیب
عالمگیر
کی وفات
سلطنت مغلیہ کے
لئے پیام مرگ لائی
تھی۔ انگریز تاجروں اور شاطروں
کو پاؤں پسارنے کا موقع مل گیا تھا۔
برصغیر کے مسلمان قعر مذلت میں گرتے چلے
جا رہے تھے۔ اس نازک دور میں شاہ ولی اللہ کی
بصیرت نے سہارا دیا۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں پر
ضرب کاری لگائی، پنجاب میں سکھوں کی چیرہ دستیوں سے
نجات حاصل کرنے کے لئے سید احمد بریلوی میدان میں
کودے اور مولانا شاہ اسمٰعیل کی رفاقت میں آخری دم
تک استبداد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

پھر جب ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ حریت نے سلطنت مغلیہ
کے آخری چراغ کو بھی بجھا دیا۔ بہادر شاہ ظفر اسیر فرنگ
ہوئے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کا اقتدار اپنے

[illegible]

ہاتھوں سے لیا اور تو وہ ملکہ وکٹوریہ کے تاج کی زینت بن گیا۔ تاریخ کے اسی موڑ پر جب برصغیر کے مسلمان کو دو شاطروں انگریز اور ہندو سے سابقہ پڑا تھا ایسی قد آور شخصیت ملی جس کی پکار میں کشش تھی، ہم اپنے سارے جھگڑے بھول کر اس کے پیچھے چل دئیے۔ موجودہ انسانی یادداشت میں کسی شخص میں ایسی فہم و فراست وفاداری ایسی غیر مشروط جاں نثاری اور اس قدر بے اندازہ یقین پیدا نہیں کیا گیا۔ یہ شخص جو اصل تھا کہ ملت کا سیاسی لیڈر ہی نہیں اس کا شفیق باپ، جاں نثار بھائی، مخلص دوست، معتمد مشیر، رہبر اور رفیق ہو۔ وہ کون تھا جو اپنی زندگی کا بہترین حصہ قوم کے تمام تفکرات کا بوجھ کندھوں پر اور تکالیف کا درد دل میں لئے ملت کی تمام محنتوں اور مشقتوں کی تکان اپنی بوڑھی ہڈیوں میں محسوس کرتا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح جن کی شخصیت سے والہانہ عقیدت کے ترجمان علی اصغر حکمت سابق سفیر ایران نے یہ الفاظ لکھے ہیں۔

"ایسے عظیم الشان انسان فلک کے ان
نجوم کی مانند ہیں جن کی روشنی ہم تک
بعید از قیاس فاصلے طے کرکے پہنچتی ہے۔
اور اگرچہ وہ انسان آنکھوں سے اوجھل
ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے نور سے ہمیشہ
اکتساب فیض کیا جا سکتا ہے۔ قائداعظم
کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لئے مینارۂ نور
کا کام دے گی۔"

ولادت باسعادت ۱۸۷۶ء میں ۲۵ دسمبر اتوار کو وزیر مینشن نیو نہم روڈ کراچی میں ہوئی۔ آپ کے والد محترم کراچی کے خوش حال تاجر اور متمول شخص مسٹر جناح پونجا تھے۔ جس دن کے تھے دہلی کے تخت پر ملکہ وکٹوریہ کے قیصر ہند ہونے کا اعلان کیا گیا۔ گویا اسی برس ولادت ہوئی جب برٹش انڈیا نے جنم لیا اور یہی ولادت باسعادت امپیریلزم کی شکست۔ وہ جھگڑ کر دو آزاد مملکتوں کے قیام کا باعث بنی۔ سات برس کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد خاندان بمبئی منتقل ہو گیا۔ ایک سال تک وہاں کے گوکل داس تیج پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ کراچی واپس آنے پر سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل ہو کر تعلیم جاری رکھی۔ پندرہ سال کے تھے۔ جب کرسچین مشن سوسائٹی ہائی اسکول میں گئے۔ بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ہونہار تھے۔ ذہانت کا جوہر نمایاں تھا۔ ان کے خاندان کے مخلص انگریز دوست سر فریڈرک کرافٹ نے آپ کے والد محترم کو مشورہ دیا کہ مسٹر محمد علی جناح کو اعلیٰ کی تعلیم دلائیں۔ یہ صائب مشورہ قبول کر لیا گیا۔ چنانچہ ۱۶ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ عازم لندن ہوئے ۱۸۹۲ء میں "لنکن ان" میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۶ء میں بیرسٹری کے امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ اس وقت عمر صرف بیس سال تھی۔ گویا انگلستان کی بار کے امتحان سب سے کم سن تھے۔

اگر آپ کو لندن جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے وہاں کی مشہور نمائش گاہ "اولمپیا" ضرور دیکھی ہوگی۔ اس کی ایک بغلی سڑک کا نام رسل روڈ ہے۔ اس چھوٹی سی سڑک کے ایک طرف انیسویں صدی کے مکان

ہیں اور دوسری جانب اولمپیا سٹیشن ۳۵ رسل روڈ کی دیوار پر آپ کو "لندن کونٹی کونسل" کے نیلے رنگ کی ایک تختی نظر آئے گی۔ لندن کے چند اور پرانے مکانوں پر آپ کو ایسی تختیاں دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن یہ تختی پڑھنے کے بعد ایک پاکستانی کا سر خود بخود احتراماً جھک جائے گا اور ممکن ہے اس کی آنکھیں بھی پرنم ہو جائیں۔۔۔۔ "اس مکان میں بابائے قوم حضرت قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ طالب علمی میں رہ چکے ہیں۔ اور اس گول نیلی تختی پر یہ عبارت ہے:" قائد اعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء ۱۹۴۷ء) بانی پاکستان نے ۱۸۹۵ء میں یہاں قیام فرمایا۔"

قائد اعظم نے اپنی ۷۱ سالہ زندگی کے بارہ سال انگلستان میں گذارے۔ نو مرتبہ وہاں تشریف لے گئے ہر مرتبہ بحری جہاز سے سفر کرنا پڑا۔ اس طرح آپ کے کم از کم ایک سال ان سفروں میں بھی گذرا ہوگا۔ لندن کے بارہ سالہ قیام میں آپ نے سیاسی لڑائی لڑنے کے داؤ پیچ بھی سیکھ لئے۔ قیام لندن کا ایک اور اثر قائد اعظم کی زندگی پر یہ بھی ہوا کہ آپ کسی انگریز سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے تھے۔ خواہ وہ گورنر بمبئی یا وائسرائے ہند ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ جہاں بڑے بڑے انگریز قائد اعظم کی جرأت اور ہمت کے معترف تھے وہاں ان کے خلاف اپنے جذبۂ نفرت کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتے تھے۔

جن انگریز سیاسی مدبروں کو تقسیم ہند کی بات چیت کے دوران قائد اعظم کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے بہت کم قائد اعظم کے دوست ہیں۔ انگریز جرنلسٹ بیورلی نکلس کے ان الفاظ میں قائد اعظم کی سیرت کے چند پہلو کتنے درخشاں ہیں کہ

"مسٹر جناح انگریز کی پالیسی پر ہمیشہ بے دردی سے تنقید کیا کرتے تھے لیکن ان کی تنقید بڑی واضح اور حقیقی ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی طرح وہ ناموزوں اور نفرت آمیز الفاظ کی معجون مرکب نہیں ہوتی تھی۔ مسٹر جناح اور ایک ہندو سیاستداں میں وہی فرق تھا جو ایک سرجن اور ٹونے ٹوٹکے کرنے والے کے درمیان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک ماہر سرجن تھے جن کی باتیں اگرچہ تلخ ہوتی تھیں لیکن ان پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔"

برسبیل تذکرہ ـــــ اس بلند پایہ شخصیت کے متعلق "ٹائمز" لندن کا وفاتی نوٹ بھی قابل مطالعہ ہے، جناح اور گاندھی کے موازنے میں لکھا گیا ہے۔ مسٹر جناح گاندھی کے مقابلہ میں ایک نمایاں تضاد پیش کرتے تھے۔ وہ عالیشان مکانوں میں رہائش پذیر رہے، ایک سرو قامت، خوش وضع، خوش پوشاک اور صاحب ذوق تھے۔ ان کے سفید بالوں میں سیاہ رنگ کی ایک لٹ عجیب شان پیدا کرتی تھی۔

انھوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصا ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور متعین ہوتے تھے۔

ان کے دلائل میں ہندوؤں جیسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطہ کو ہدف بناتے تھے اس پر براہ راست نشان باندھ کر وار کرتے تھے وہ ایک ناقابل تسخیر حریف تھے۔

طالب علمی میں بیشتر وقت دارالعوام میں ممبران کی تقریریں سننے میں صرف ہوتا تھا۔ آپ نے لبرل مکتب فکر کے ممتاز قائدین سے ملاقات کی اور لارڈ موسلے کے لبرل ازم کا اثر قبول کیا۔ انہی ان میں آپ کو آئرش ہوم رول پر دارالعوام میں مسٹر گلیڈسٹون کی پرجوش تقاریر سننے کا اتفاق ہوا۔ آپ نے آزادی نسواں کا غلغلہ بھی بلند ہوتے دیکھا یہ وہ زمانہ تھا جب لبرل پارٹی اقتدار کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک اور واقعہ بھی ہوا جس نے مسٹر جناح کے قومی جذبات کو بیدار کر دیا اور وہ [illegible] وطن کا جذبہ لئے ہندوستان واپس آئے۔ ملکہ وکٹوریہ کے وزیر اعظم لارڈ سالسبری نے ایک موقعہ پر ہندوستان کے مشہور سیاسی لیڈر دادا بھائی نوروجی کو نسلی تعصب کے جذبہ کے تحت "کالا آدمی" کہہ دیا۔ حالانکہ دادا بھائی نوروجی لارڈ سالسبری سے کم گورے نہ تھے۔ اس واقعہ نے یورپ میں مقیم ہندوستانیوں خصوصاً وہاں کے طالب علموں میں اشتعال پیدا کر دیا اور دادا بھائی نوروجی نے لارڈ سالسبری کے اس اہانت آمیز طعنے کے جواب میں مرکزی فنسبری کے حلقہ سے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ لندن کے ہندوستانی طلباء نے دادا بھائی نوروجی کے لئے بہت کام کیا۔ مسٹر سی آر داس اور مسٹر جناح بھی اس معرکے میں پیش پیش رہے۔ آپ ۱۸۹۶ء میں وطن لوٹے تو حالات دگرگوں تھے۔

ان دنوں باپ کی تجارت ختم ہو چکی تھی اور خاندان کو مالی مشکلات درپیش تھیں۔ ان حالات کے تحت مسٹر جناح نے کراچی کی بجائے بمبئی میں پریکٹس کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ بمبئی پہنچ کر ۱۸۹۷ء میں آپ نے بیرسٹری شروع کر دی ابتدائی تین سال بڑے کٹھن تھے اسی زمانہ میں۔ ایک انگریز بیرسٹر مسٹر میکفرسن آپ کی ذہانت سے متاثر ہوئے اور اپنی ذاتی قانونی لائبریری کے دروازے مسٹر جناح پر کھول دیے

> آپ کے ڈرائیور محمد حنیف آزاد کا کہنا ہے کہ ''اندرون خانہ کھیلوں میں قائداعظم کو صرف بلیرڈ سے دلچسپی تھی۔ بارہ گیندیں ان کی خدمت میں پیش کی جاتیں ان میں سے وہ انتخاب کرتے اور کھیل شروع ہو جاتا۔ محترمہ فاطمہ جناح پاس ہوتیں۔ قائداعظم سگار سلگا کر ہونٹوں میں دبا لیتے اور اس گیند کی پوزیشن کو اچھی طرح جانچتے جس کے ٹھوکر لگانا ہوتی۔ اس جانچ پڑتال میں وہ کئی منٹ صرف کر دیتے۔ کبھی ایک زاویہ سے دیکھتے کبھی دوسرے زاویے سے اپنے ہاتھ میں کیو کو تولتے، اُسے پتلی پتلی انگلیوں پر ستار کے گز کی طرح پھیرتے۔ زیر لب کچھ کہتے۔ نشست باندھتے مگر کوئی دوسرا مناسب اور موزوں زاویہ ذہن میں آجاتا۔ اپنی ضرب روک لیتے۔ ہر طرح سے پورا اطمینان کر کے پھر جب گیند کے ساتھ ٹکراتے تو نتیجہ ان کے حساب کے مطابق ٹھیک نکلتا۔ اس وقت اپنی ہمشیرہ کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھ کر مسکرا دیتے۔''

آپ تین ماہ کے لئے بمبئی کے پریزیڈنسی مجسٹریٹ منتخب ہوئے۔ اس مدت میں حسنِ کارکردگی کی بنا پر تین ماہ کی توسیع کر دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد پندرہ سو روپے ماہانہ معاوضے پر یہ منصب مستقل طور پر آپ کو پیش کیا گیا۔ لیکن آپ نے عدلیہ کے انچارج سر چارلس اولیونٹ کی پیش کش مسترد کر دی اور کہا میں کم سے کم پندرہ سو روپے روزانہ کمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔ یہ سن کر سر چارلس چونکے، مسکراہٹ ضبط کی۔ مگر بہت جلد انہوں نے سن لیا کہ نوجوان بیرسٹر کی پریکٹس پندرہ سو روپے روزانہ سے بھی زائد ہے۔ مسٹر جناح نے ۱۹۰۶ء میں دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکریٹری کی حیثیت میں کچھ عرصہ کام کیا اور کلکتہ کانگریس میں بھی شریک ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں سپریم امپیریل کونسل کے رکن بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں مسٹر جناح نے انڈیا کونسل کی ہیئت ترکیبی پر شدید احتجاج کیا اور اس میں بعض ترامیم پیش کیں۔

اسی سال مولانا محمد علی مرحوم اور سر سید وزیر حسن کی ترغیب پر مسٹر جناح نے مسلم لیگ میں شرکت کی۔ آپ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے رکن تھے۔ ۱۹۱۴ء میں کانگریس نے اپنا ایک وفد لندن بھیجا تو مسٹر جناح اس وفد کے قائد تھے۔ اس زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے جو پُر خلوص کوششیں کیں ان سے متاثر ہو کر مسز سروجنی نائیڈو نے آپ کو "سفیرِ صلح" اور "ہندو مسلم اتحاد کا پیغمبر" کے نام سے یاد کیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین مفاہمت کے اس روز افزوں جذبہ کا محسوس نتیجہ ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس میثاق میں جملہ آئینی مسائل آ گئے تھے۔ جن میں جداگانہ انتخاب کا اہم مسئلہ بھی جسے مسلمانوں نے اٹھایا تھا شامل تھا۔

اسی سال ۳۱ دسمبر کو لکھنؤ کے سالانہ اجلاس مسلم لیگ کی صدارت کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح نے کہا: مسلم لیگ کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی علیحدہ قومیت اس قدر مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے کہ کسی قسم کی سیاسی اصلاحات اسے نقصان نہ پہنچا سکیں۔ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے اپنے سالانہ اجلاسوں میں میثاق لکھنؤ کے ضمن میں متوازی قراردادیں منظور کیں۔ اس اسکیم میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ مجالس آئین ساز میں مسلمانوں کے لئے پنجاب میں ۵۰ فی صد، بنگال میں ۴۰ فی صد، بہار میں ۲۵ فی صد سی پی و مدراس میں دس دس فی صد اور بمبئی میں ۳۳ فی صد نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔ اس اسکیم نے مسٹر جناح کو سارے ہندوستان کا ہیرو بنا دیا۔

۱۹۱۸ء کی مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم اس مشترکہ قومی مطالبہ کو پورا کرنے کی ادھوری کوشش تھی۔ انہیں دنوں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے قائد اعظم محمد علی جناح کی بلند پایہ شخصیت کے بارے میں اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔

ایک صاف ستھرا بہت با سلیقہ نوجوان جس کی چال ڈھال دل پر بہت اثر ڈالتی ہے۔ گفتگو میں منطقی داؤ پیچ کا زبردست ماہر اور اپنی بات کو سولہ آنے منوانے پر زور دینے والا۔ وہ اپنی بات میں کسی ترمیم کو منظور نہیں کرتا۔ اس کی پوری بات اگر نہ مانی جائے تو آدھی بات ماننے پر راضی نہیں ہوگا۔ میں اس سے باتیں کر کر کے عاجز آ گیا۔ چیمسفورڈ (وائسرائے ہند) نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی لیکن جناح کی منطق نے اسے قدم قدم پر الجھا کر رکھ دیا۔

جناح بڑا ہی ذہین آدمی ہے۔ اور یہ بات واقعی بڑی ہی شرمناک ہے کہ ایسے آدمی کو اپنے ملک کی حکومت میں دخل نہ ہو۔ عوام میں مسٹر جناح کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ اہل بمبئی نے ایک ہال تعمیر کیا اسے ان سے منسوب کیا گیا۔

کانگریس سے علیحدگی کے باوجود آپ نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی کوششیں برابر جاری رکھیں، چنانچہ آپ نے دہلی میں مسلمان قائدین کا ایک اجلاس طلب کیا اور ہندو مسلم اتحاد کے خواب کو پورا کرنے کے لئے حسب ذیل مطالبات پر آمادہ کیا۔

(۱) سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنایا جائے۔

(۲) شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔

(۳) پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے۔ قائد اعظم نے اس مقصد کے لئے مسلمانوں سے مخلوط انتخاب کو بھی منوا لیا۔ ان مطالبات پر مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری نے بھی دستخط کر دیئے مگر تنگ نظر لیڈروں نے اس کی مخالفت کی۔ مسٹر جناح کی ان مساعی کو سراہنے اور ان کی امداد کرنے کی بجائے آل پارٹیز کانفرنس مقرر کردہ نہرو کمیٹی نے جوابی تجاویز پیش کر دیں، جو مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول تھیں

قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۱۹ء میں بہت تھوڑی سی اصلاحات منظور کی گئی تھیں، اس لئے اسے کامیابی نہ ہوئی ۱۹۲۷ء میں حکومت نے قانون مذکورہ پر نظر ثانی کرنے اور حکومت خود اختیاری کو مزید وسعت دینے کے لئے برطانوی ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا یہ سائمن کمیشن کہلاتا ہے۔ مسٹر جناح کے ایما پر ہندو مسلم قائدین نے اس کمیشن کے مقاطعہ پر اس لئے زور دیا کیونکہ اس میں ہندوستانی شامل نہیں کئے گئے دستور اساسی کے متعلق مسلمانوں کے زاویۂ نگاہ کی وضاحت ضروری تھی۔ اس لئے مسٹر جناح نے مارچ ۱۹۲۷ء میں اپنے معروف چودہ نکات میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کر دیئے۔ ان میں سے بعض اہم نکات یہ تھے: سندھ اور بلوچستان کے دو نئے صوبے قائم کئے جائیں، تمام صوبوں کو خود مختار بنایا جائے، جداگانہ انتخابات کو برقرار رکھا جائے، مسلمانوں کے مذہب، تمدن اور زبان وغیرہ کی سلامتی کے لئے آئینی تحفظات نافذ کئے جائیں۔ تمام مسلم نے آپ کی حمایت کی مگر ہندوؤں کی طرف سے آپ پر نکتہ چینی کی گئی۔ سائمن کمیشن کے بعد جب نہرو رپورٹ سامنے آئی تو قائد اعظم کو احساس ہوا کہ اس میں ان چودہ نکات کو یکسر ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود دسمبر ۱۹۲۸ء میں جب کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن منعقد ہوئی تو یہ قائد اعظم محمد علی جناح کی مساعی تھیں کہ ان کی قیادت میں، ایک کمیٹی تشکیل پائی جس کے مطالبات

(۱) مرکز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی۔

(۲) پنجاب اور بنگال میں کم سے کم دس سال مسلمانوں کی نمائندگی تناسب آبادی کی بنا پر۔

(۳) قوت مرکز کی بجائے صوبائی حکومتوں کے پاس ہے۔ آل انڈیا نیشنل کنونشن کی سب کمیٹی نے یہ مطالبات نامنظور کر دیئے۔ اور کانگریس نے اس رپورٹ کو قومی

کا نام دے کر برطانوی پارلیمان میں پیش کر دیا۔ گاندھی جی نے دھمکی دی کہ اگر وہ رپورٹ منظور نہ کی گئی تو کانگریس پُرامن ترک موالات کی تحریک شروع کرے گی۔ ان حالات میں قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں طلب کیا۔ مارچ ۱۹۲۹ء کے اجلاس میں مسلم لیگ نے نہرو رپورٹ مسترد کر دی۔ حکومت نے نہرو رپورٹ منظور نہ کی تو مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے ڈانڈی (بمبئی) میں نمک بنا کر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔

۱۹۳۰ء وہ تاریخی سال ہے جب مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد میں علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مفکر پاکستان نے الگ مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا۔ ازیں پیشتر ۱۹۲۹ء میں مسٹر جناح نے برطانوی وزیراعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کے نام ایک خط میں زور دیا تھا کہ وہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری اور درجہ مستعمرات عطا کرنے کی پالیسی کا واضح طور پر اعلان کر دیں۔ آپ نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ جب سائمن کمیشن کی رپورٹ اور حکومت ہند کی آرا موصول ہو جائیں تو وزیراعظم ہندوستان کے نمائندوں کو برطانیہ آنے کی دعوت دیں تاکہ اختلافات کا ایسا حل معلوم کیا جا سکے جسے ہندوستانی رہنما خوشی سے قبول کر لیں۔ اس نوع کی تجویز سر جان سائمن نے بھی پیش کی تھی لہٰذا فیصلہ کیا گیا کہ لندن میں حکومت برطانیہ اور ہندوستان کی سیاسی جماعتوں اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے۔ تاکہ ایسا دستور مرتب کیا جا سکے جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانگریس نے اس کا مقاطعہ کیا۔ بعد ازاں برطانوی حکومت نے کانگریس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ گاندھی جی نے تحریک سول نافرمانی ترک کر دی اور دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ اس مرحلہ پر بھی مسٹر جناح کی مضبوط قیادت اور غیر معمولی ذہانت نے مسلمانوں کے موقف کو بے حد تقویت پہنچائی تاہم ہندوؤں کی غیر مصالحانہ روش کے باعث کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ برطانوی وزیراعظم کی جانب سے کمیونل ایوارڈ کا اعلان ہوا جسے مسلمانوں نے تو قبول کر لیا۔ لیکن ہندوؤں نے مسلمانوں کو اپنے برابر حقوق دینے کی ہر تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔

تیسری گول میز کانفرنس میں جو ۱۹۳۵ء میں ہوئی وفاق کی تجویز پیش کر دی گئی۔ ان دنوں قائداعظم لندن میں مقیم تھے مگر انہیں اس کانفرنس میں نہیں بلایا گیا۔ مگر اس سے قبل فروری ۱۹۳۴ء میں قائداعظم کو مرکزی اسمبلی کے ایک مباحثہ میں فتح نصیب ہوئی۔ ایوان میں آئینی اصلاحات کے متعلق جائنٹ پارلیمانی رپورٹ پر بحث کے دوران آپ نے اس مضمون کی ترمیم پیش کی کہ اسمبلی کمیونل ایوارڈ کو اس وقت تک کے لئے منظور کرے جب تک مختلف فرقے متفقہ طور پر اس کا نعم البدل تجویز نہ کریں۔ یہ ترمیم کانگریس اسمبلی پارٹی کی مخالفت کے باوجود منظور ہو گئی۔ کانگریس اس وقت سب سے بڑی پارٹی تھی۔ دوسرے تمام راہنماؤں سے زیادہ قائداعظم کو اس امر کا احساس تھا کہ مسلم اکثریت والے صوبوں کے لئے ایسی حکومت خطرہ کا باعث ہوگی جس میں ہندوؤں

کو غلبہ حاصل ہو۔

قائداعظم جنوری ۱۹۳۵ء میں لندن سے ہندوستان واپس آئے۔ اس عرصہ میں پریوی کونسل میں وکالت کرتے رہے۔ آپ کی عدم حاضری میں مسلم لیگ کا عوام پر اثر کمزور ہو گیا تھا۔ مسٹر جناح نے واپس آکر قوم کی تنظیم کی جانب توجہ دی۔ اسی سال برطانوی حکومت نے قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی منظوری دے دی۔ یہ قانون قیام پاکستان تک جاری رہا۔ اس کے تحت انڈیا کونسل ختم کر کے مشیروں کی ایک مختصر جماعت بنائی گئی اور وفاقی نظام حکومت کو رائج کر دیا گیا۔

۱۹۳۷ء تک مسٹر محمد علی جناح نے قوم کو منظم کرنے اس میں سیاسی شعور پیدا کرنے اور ہندوؤں کی مسلم کش پالیسی سے سادہ لوح مسلمانوں کو آگاہ کر دینے کی غرض سے ان تھک محنت کی، شبانہ روز کاوش طویل سفروں اور مدلل تقریروں سے ان پر واضح کیا کہ اگر وہ ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں تو انہیں متحد و منظم ہو جانا چاہیئے۔ مسلم لیگ کی ابتدائی جماعتیں قائم ہوئیں۔ اس طرح مسلم لیگ کی تنظیم جمہوری اساس پر رکھی گئی۔ مسلم لیگ اعلیٰ اور محدود ــــ طبقے کے علاوہ مسلم عوام کے قریب آگئی۔ مسٹر جناح مسلمانوں کے ہیرو اور ملی اتحاد کے مظہر تھے۔ اس لئے قوم نے انہیں قائداعظم کا خطاب دیا۔ مسلم لیگ کی اجتماعی قوت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ جنگ کے دوران کانگرسی وزارتوں نے مسلم عوام پر جو مظالم کئے تھے اس کی بنا پر انہیں یقین ہو گیا کہ جہاں ہندو آبادی کو غلبہ حاصل ہو وہاں مسلمانوں کو

کو انصاف اور غیر جانبداری کی کوئی امید نہیں ہو سکتی لئے علاوہ کانگرسی قیادت کے متکبرانہ رویہ نے مسلمانو زیادہ برہم کر دیا۔ جواہر لال نہرو ایسے کانگرسی لیڈرو نے مسلم قوم یا اس کے مطالبات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا یہ متکبرانہ روش اختیار کی کہ اس وسیع براعظم میں صرف فریق ہیں کانگرس اور برطانوی حکومت اور انہی دو کے مابین ہی سمجھوتہ اور مفاہمت کی بات چیت ہو سکتی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب خدائے ذوالجلال کو اسلامیان کی سیاسی فلاح مطلوب تھی۔

اس مرحلہ پر فرزندان توحید کے منتشر شیرازہ کرنے کے علاوہ ان میں اعتماد، یقین اور ایمان کی قو پیدا کی گئی۔ شاطر حکومت اور عیار کانگرس کی ملی بھگ کے ماحول میں مرد مومن کی للکار سنائی دی، "نہیں میں صرف دو فریق نہیں بلکہ تیسری جمعیت مسلمانوں عظیم قوت بھی ہے جس کا تمدن اور نصب العین کانگ ہندوؤں اور مہاسبھائی فرقہ پرستوں سے قطعی جدا اور ناقابل تسخیر ہے۔ حصول پاکستان کی جنگ کا آغ فی الحقیقت اسی اعلان حق سے ہوا۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت انتخابات ۷ میں شروع ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں کانگرس نے گیارہ سے سات صوبوں میں اکثریت حاصل کر لی، مسلم لیگ بھی کامیابی حاصل کی مگر سندھ اور بنگال کے سوا اور صوبہ میں خالص مسلم لیگی حکومت نہ بن سکی۔ قا نے اپنی بے پناہ سیاسی بصیرت کی بنا پر ہندو غلبہ جس خدشہ کا اظہار چند برس قبل کیا تھا وہ درست

ثابت ہوا۔ یو۔پی۔ بہار۔ اڑیسہ۔ مدراس، بمبئی اور
سی پی میں کانگرسی وزارتیں جب برسر اقتدار آئیں تو
ان کی فرقہ پرستی بالکل عریاں ہوگئی۔ انھوں نے مسلمانوں
پر مظالم کے پہاڑ توڑ کر عملی طور پر ثابت کر دیا کہ ان کے
نزدیک مسلمانوں کا وجود ناقابل برداشت ہے اور
ان کے نظریہ کے مطابق اس ملک میں انتقال
اقتدار صرف ہندو کانگرس کے لئے ہو سکتا ہے
قوموں کی تاریخ بتاتی
ہے کہ چیرہ دستیوں کے اسی
گھٹا ٹوپ اندھیرے میں حق اور
صداقت کی قندیل ضرور جگمگاتی ہے
کسی تشدد، ظلم اور دباؤ کو عمر دوام نہیں۔
استمداد کی یہی
گھٹن نئے راستوں
کی نشاندہی کرتی
ہے اور مظالم کی
انہی طوفانی لہروں
میں برگ گل کے
سفینوں پر ناتواں
چیونٹیوں تک کے
قافلے ساحل مراد
تک پہنچ جاتے ہیں
شرط یہ ہے کہ قوم کی
کشتی کو ایسا ناخدا
مل جائے جس کی

دیانت، شجاعت اور بصیرت پر بھروسہ کیا جا سکے۔ قائد
اعظم ان صفات کے حامل تھے اور ان کے اپنے ارشاد
کے مطابق
"اخلاقی قوت، دلیری، محنت اور
استقلال وہ چار ستون ہیں جن
پر انسانی زندگی کی پوری عمارت
تعمیر کی جا سکتی ہے ناکامی
وہ لفظ ہے جسے میں جانتا
ہی نہیں۔"
یہ اسی مرد جری کی ناقابل
شکست اخلاقی قوت تھی جس نے
قوم کا حوصلہ بڑھایا اور پیغام دیا۔
صعوبتوں رکاوٹوں
اور بد اخلاقیوں
کو پھلانگتے ہوئے
آگے بڑھیے۔ مجھے
یقین ہے کہ
ایک عظیم کلچر اور
تاریخ کی حامل
باہمت قوم کے لئے
کسی قسم کا کوئی
خطرہ نہیں ہے
کام کیجئے، کام اور
کام جو ہماری
کامرانی کی ضمانت ہے
اور خدا پر بھروسہ رکھئے۔

عوامی
رابطہ کے مؤثر
ذریعہ۔ اخبارات کی اہمیت
اور آزادی تحریر کے تقاضے قائد اعظم
کی بصیرت سے اوجھل نہیں تھے۔ اپریل ۱۹۴۷ء
میں دہلی میں ہندوستان کے مسلم
اخبارات کی ایک کانفرنس منعقد
ہوئی تھی۔ مسٹر لیاقت علی
خاں نے اس

کانفرنس کے مندوبین کے اعزاز میں ایک دعوت دی تھی جس میں
قائد اعظم نے بھی شرکت کی تھی۔ اس مجلس میں بعض مدیران جرائد
نے قائد اعظم سے استدعا کی کہ وہ انھیں کوئی پیغام دیں، پہلے تو
قائد اعظم مسکرا کر ٹال گئے جب ذرا اصرار بڑھا تو اپنے مخصوص انداز
میں انگشت شہادت سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "قلم ایک زبردست
قوت ہے جس کے امین آپ لوگ ہیں۔ اس قوت سے صحیح کام لیں۔ خوف
اور لالچ سے بے نیاز ہو کر قومی جذبات کی ترجمانی کریں۔ تو آپ قوم کی
تقدیر بدل سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ خود گمراہ ہو جائیں تو قلم کی ہی
قوت قوم کو گمراہ کر دے گی۔ اتنا کہہ کر قائد اعظم چند ساعتوں کے
لئے خاموش ہو گئے۔ پھر ایک ایک لفظ پر زور دے کر فرمایا۔ اپنے اندر
یہ بات پیدا کرو۔ آپ کے مخالف بھی یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس شخص
کو کسی قیمت پر خریدا نہیں جا سکتا۔"

مجبور اور مقہور ملت اسلامیہ کے لئے قدرت
الٰہی اسباب پیدا کرتی ہے۔ ربّ لم یزل کی شان
کریمی جوش میں آئی اور اس کی بے پایاں شفقت نے
اسلامیانِ ہند کو ایک ایسا قائد عطا کیا جس نے ۱۹۳۷ء
میں لکھنؤ کے اجلاس میں مسلمانوں کو حیاتِ نو کی نوید
سنائی، انہیں خود اعتمادی کا درس دیا اور سیاسیات
میں نئے مقام اور نئی منزل سے روشناس کرایا۔ قائد
اعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلم لیگ کی سیاسی
پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے اعلان فرمایا کہ مسلم لیگ
کا سیاسی موقف مکمل آزادی ہے۔ کانگریس کی روش
پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے آپ نے واشگاف الفاظ میں
اس جماعت کی نیت بیان کی اور فرمایا کہ

> کانگریس نے اپنے طرز عمل سے
> ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان صرف
> ہندوؤں کے لئے ہے۔ اور اگر کانگریس
> یہ خیال کرتی ہے کہ مسلمانوں کی پریشانی
> اور افتراق سے فائدہ اٹھا کر چند ٹکڑوں
> پر راضی کر لے گی تو وہ بہت بڑی غلط
> فہمی میں مبتلا اور خود فریبی کا شکار ہے۔
> مسلم لیگ میں نئی روح پیدا ہو چکی ہے
> اور وہ ہندوستان کی سیاست میں حصہ
> لے گی۔ اس حقیقت کو جس قدر جلد سمجھ لیا
> جائے مفادِ عامہ کے لئے مناسب ہوگا۔
> اب کوئی طاقت اور مخالفانہ نعرے ہمیں اپنے
> عزائم سے باز نہیں رکھ سکتے۔

قائد اعظم کا یہ ارشاد اور مسلم لیگ کا یہ تاریخی
اجلاس مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تمہید ثابت ہوا۔ مسلم لیگ
حقیقی معنوں میں عوامی جماعت اسی اجلاس کے بعد بنی،
ازیں پیشتر مسلم لیگ کا نصب العین یہ تھا کہ حکومت
کے زیر سایہ خود اختیاری قوت منتقل کر دی جائے۔
لیکن اجلاس لکھنؤ میں آزادی کامل جب منزل مقصود
قرار پائی تو چند ماہ کے دوران لوگ دھڑا دھڑ اس
میں شامل ہوتے چلے گئے۔ اسی عوامی اعتماد اور
اجتماعی قوت نے اس انتخابات میں بھی کامیابی دلائی،
سر سکندر حیات مرحوم اور مولوی فضل الحق اپنی
پارٹی کے ہمراہ اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ ہندو
کانگریس نے اپنے عہد اقتدار میں مسلمانوں پر جو مظالم
کئے تھے ان کی تلخ یاد محو نہیں ہوئی تھی، چنانچہ مسلم لیگ
نے ایک مجلس تحقیقات مرتب کی۔ راجہ سید محمد مہدی
(آف پیرپور) اس کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ آٹھ ماہ
تک مظالم کی تحقیقات کرنے کے بعد ۵ر نومبر ۱۹۳۸ء
کو پیرپور رپورٹ منظر عام پر آئی، تو دنیا کو معلوم ہوا
کہ عدم تشدد اور اہنسا کے پجاریوں نے نہتے اور
معصوم مسلمانوں پر ظلم و ستم کے کتنے پہاڑ توڑے تھے۔
یہ دل سوز رپورٹ صداقت سے اتنی بھرپور تھی
کہ اس میں درج واقعات کو جھٹلانے کی جرأت کسی
کو نہیں ہوئی۔ کانگریسی حلقے تلملا کر رہ گئے، اس
مرحلہ پر گاندھی جی نے ایک بار پھر اپنی مہاتمائیت
کا لبادہ اوڑھا اور قائد اعظم کے نام ایک خط
لکھا، لکھنؤ میں آپ نے جو تقریر کی ہے وہ شروع سے

آخر تک اعلان جنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ دونوں جماعتیں مجھ سے رابطہ خیال کریں گی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ تجویز پسند نہیں، اس کا مجھے بےحد افسوس ہے۔ نزاع میں فریقین ہوتے ہیں، اگر میں آپ میں صلح نہ کرا سکا تو آپ مجھے فریق نہیں پائیں گے۔

مومن کی فراست نے اس خط میں گاندھی جی کا کافی ضمیر بھانپ لیا، قائداعظم نے جواب میں لکھا "میری تقریر لکھنؤ کو آپ اعلان جنگ سمجھ رہے ہیں، حالانکہ یہ قطعی مدافعانہ تھی، اسے دوبارہ پڑھیں اور اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ افسوس ہے کہ گذشتہ ایک سال میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان پر آپ کی نظر نہیں۔" اسی خط وکتابت کے دوران گاندھی جی نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ قائداعظم نے انہیں ایک اور خط میں واضح کیا کہ ——" اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ آپ مسلم لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرلیں اور دوسری طرف ہم یہ مان لیں کہ آپ کانگریس اور ملک کے دوسرے ہندوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طرح ہم آگے قدم بڑھا اور متنازعہ مسائل کا حل سوچ سکتے ہیں۔"

اس اثنا میں مسلمانوں کو طالب علموں کے پرجوش خون اور ناقابل تسخیر جذبے کی گراں قدر امداد بھی میسر آگئی۔ قائداعظم نے علی گڑھ میں مسلمان طلباء کے سامنے تقریر میں انہیں ملی تقاضوں اور قومی ضرورتوں کا احساس دلایا۔ اس وقت تک مسلم طلبا کی کوئی الگ جماعت نہیں تھی، صرف اسٹوڈنٹس کانفرنس تھی جس پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ اس تقریر نے طالب علموں میں زندگی کے آثار پیدا کردیئے اور انہوں نے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے اپنی الگ تنظیم قائم کی۔ قیام پاکستان کے لئے طالب علموں نے جس والہانہ عقیدت اور سرگرمی سے کام کیا تاریخ کے آغوش میں اس کے لئے خاص جگہ ہے۔

واقعات عالم نے ۱۹۳۹ء میں نئی کروٹ لی۔ یکم ستمبر کو برطانیہ نے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ کانگریس کی —— فرقہ پرست حکومتیں ابھی تک برسر اقتدار تھیں۔ حکومت ہند کی خواہش تھی کہ مسلمانوں کی شجاعت کی صفات سے جنگ عظیم کے دوران استفادہ کیا جائے، دوسری جانب کانگریس نے اس پریشانی اور مصروفیت سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اور مطالبہ کیا کہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء تک ہندوستان کی مکمل اور غیر مشروط آزادی کا اعلان کیا جائے۔ اور مجلس دستور ساز کے ذریعہ سے ہندوستانی مسائل کا تصفیہ، ہندو مسلم حقوق کا فیصلہ، نظام حکومت اور آئینی معاملات کا خاکہ تیار کیا جائے۔ برطانوی حکومت نے یہ مطالبہ مسترد کردیا تو ۱۵ نومبر ۱۹۳۹ء کو کانگریسی وزارتیں ساتوں صوبوں میں مستعفی ہوگئیں، ظالم کا طلسم ٹوٹا۔ اقتدار اس کے ہاتھ سے چھن گیا۔ مظلوموں کی فریاد اثر پذیر ہوئی، مسلمانوں نے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ہندو کانگریس کی چیرہ دستیوں

سے نجات کا دن منایا، دوسری جانب کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ بلند کیا۔ اور اس سلسلہ میں تحریک شروع کرکے ملک کے نظام کو معطل کرنے کی کوشش کی۔ راجہ جی کے سوا قابل ذکر تمام کانگریسی رہنما نظر بند کر دیئے گئے۔

مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں منٹو پارک میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں اسلامیان ہند کے عزم و عمل کے لئے نئی راہ متعین ہوئی ــــ قرارداد میں نصب العین کی نشان دہی ان الفاظ میں کی گئی:

"مسلمان اپنے مخصوص فلسفۂ حیات کے نشو و ارتقا اور استحکام کے لئے ایک الگ خطہ چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک علیحدہ اور مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا اگر مسلمان ہندوستان میں ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے آرزو مند ہیں تو ضرورت ہے کہ وہ ایک الگ اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کریں جہاں وہ ہندوؤں سے علیحدہ رہ کر اپنی قومی اور ملی روایات کو قائم رکھ سکیں۔"

قرارداد لاہور کا اہم حصہ یہ تھا ــــ کوئی دستوری خاکہ اس ملک میں قابل عمل یا مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا جب تک وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصول کے تحت مرتب نہ کیا گیا ہو ــــ

جغرافیائی حیثیت سے متصل ارضی وحدتوں کے مابین حدود قائم کرکے ان کو جداگانہ علاقوں میں منقسم کیا جائے جن رقبہ جات میں بہ لحاظ تعداد مسلمان اکثریت میں ہیں۔ مثلاً شمال مغربی اور مشرقی علاقوں کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے ایک دوسرے سے اس طرح متحد کرنا چاہیئے کہ ان میں سے ہر ایک وحدت خود مختار رہے۔ ان آزاد علاقوں اور خود مختار وحدتوں کے دستور میں اقلیتوں اور ان کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کی حفاظت خود ان کی مشاورت کے ذریعہ ہو سکے۔ یہ اجلاس مجلس کو اختیار دیتا ہے کہ متذکرہ صدر بنیادی اصولوں کے بموجب ایسی دستوری اسکیم مرتب کرے جس میں ان مختلف مجوزہ ریاستوں کو سارے مسائل مثلاً دفاع، خارجی معاملات، رسل و رسائل، چنگی اور دوسرے ضروری امور کا اختیار دیا گیا ہو"۔

یہ قرارداد ہند کانگریس اور فرقہ پرست مہا سبھا کے خرمن سیاست پر بجلی بن کر گری۔ ان کے اضطراب ہی سے یہ واضح ہوگیا کہ الگ مملکت کے مطالبہ میں ہم نہ صرف حق بجانب ہیں بلکہ ہماری سیاسی منزل مقصود یہی ہے۔ لیکن اس کٹھن سفر میں قیادت کے فرائض مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ادا کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس پلیٹ فارم اور متحدہ طاقت سے حکمراں انگریز اور عیار کانگریسی حریفوں کو شکست دے سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس امر کا اطمینان بھی تھا کہ ان کی بقا کا واحد امکان یہی ہے کہ ان کی آزاد اور خود مختار مملکت ہو۔ اُن کا سیاسی مستقبل کسی بھی مصلحت یا منافقت، دباؤ یا لالچ سے متاثر نہ ہو۔

اس قرارداد کی منظوری کے بعد قائد اعظم علیہ الرحمۃ پر سوالات کی بوچھاڑ ہونے لگی، ــــ کہ ــــ بتلایئے یہ پاکستان کیا ہے؟ اس کی وضاحت اور حد بندی

کیجیے؟ اس کی تعریف اور حدود اربعہ بتائیے۔ قائداعظم ان سوالوں کا بالعموم یہ جواب دیا کرتے تھے۔ "پہلے تقسیم ہند اور قیام پاکستان کا اصول تسلیم کیجیے، مسلمانوں کا حق خود ارادیت مان لیجیے، پھر ہم مل بیٹھیں گے اور یہ تفاصیل طے کرلیں گے۔ اسی ضمن میں مشہور پارسی مصنف اور اخبار نویس مسٹر ڈی ایف کراکا کے بارے میں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ قیام پاکستان سے قبل مسٹر کراکا شدید مخالفت کرتے رہے اور اسی زمانہ میں آپ نے قائداعظم سے ایک انٹرویو حاصل کرنا چاہا مگر اس درخواست کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ جب قیام پاکستان کا خواب رنگین تعبیر ہونے لگا تو مسٹر کراکا کو قائداعظم کے سکریٹری کا خط اچانک موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ مسٹر جناح آپ سے فلاں وقت ملاقات کریں گے۔ اس ملاقات میں وزیراعظم نے مسٹر کراکا سے کہا ــــــ

"میں پاکستان کے خلاف آپ کے اعتراضات کا عملی جواب دینا چاہتا تھا، اس سے پہلے اگر ملاقات ہوتی تو شاید آج کی ملاقات سے زیادہ مؤثر نہ ہوتی۔

قرارداد لاہور کی منظوری کے بعد تقسیم ہند کی چند اور تجاویز بھی منظر عام پر آئیں۔ سر سکندر حیات کی تجویز تھی کہ ہندوستان کو مختلف حصوں میں تقسیم کرکے ایک وفاق قائم کردیا جائے۔ مولانا حسرت موہانی صوبوں کے کامل اختیارات، مکمل آزادی اور لامرکزیت کے حامی تھے۔ ملک فیروز خاں نون نے مسلم یونیورسٹی میں ایک تقریر کے دوران کمزور مرکز کو اپنانے کا مشورہ دیا تھا۔ حیدرآباد دکن کے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے ہندوستان کو مختلف منطقوں میں بانٹ دینے پر زور دیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ڈاکٹر افضال قادری اور ڈاکٹر ظفرالحسن نے اقلیتی فرقوں کے لئے پاکستانی حلقوں کا خاکہ مرتب کیا تھا لیکن ان میں سے کسی تجویز اور مشورے کو قبولیت عامہ حاصل نہ ہوسکی۔ دو برس تک اس قرارداد کو "قرارداد پاکستان" کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن غیر مسلم جرائد کی جانب سے شدید مخالفت میں اسے پاکستان سے موسوم کیا گیا۔ یکم مارچ ۱۹۴۲ء کو قائداعظم نے اسلامیہ کالج کے میدان میں قوم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ــــــ ہم نے قرارداد لاہور کو پاکستان کا نام نہیں دیا تھا لیکن ہمارے دشمن ہمیں چڑانے کے لئے اس نام کو استعمال کررہے ہیں، تو ہم اس سے چڑیں گے نہیں۔ بلکہ اب سے اس کو قرارداد لاہور کے بجائے قرارداد پاکستان کے نام سے پکارا کریں گے۔

سر سٹیفورڈ کرپس ۱۹۴۲ء میں برطانوی حکومت سے چند تجاویز لے کر دہلی آئے۔ خلاصہ یہ تھا کہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات دے دیا جائے گا۔ انہوں نے یہ اصول تسلیم کرلیا تھا کہ ایک سے زائد وفاق بن سکتے ہیں۔ ان تجاویز کو کانگریس نے یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ زمام اقتدار اسی کے حوالے کی جائے۔ قائداعظم نے مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں ارشاد فرمایا۔

"ہندوستانی مسلمان پاکستان کے سوا کسی دوسری تجویز کو ہرگز منظور نہیں کریں گے۔" سر کرپس اپنے مشن میں ناکام لوٹ گئے۔

دسمبر ۱۹۴۳ء ایسوسی ایٹڈ آف کامرس کلکتہ کے سالانہ خطبہ میں لارڈ لنلتھگو نے کہا ——— کہ ہندوستان کی جغرافیائی وحدت کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ جب لارڈ ویول آئے تو انہوں نے یہی نعرہ لگایا کہ "ملک کے جغرافیہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی"———

قائداعظم پر ۲۶ر جولائی ۱۹۴۳ء کو ایک خاکسار نوجوان رفیق صابر نے قاتلانہ حملہ کر دیا۔ خدائے ذوالجلال نے ملت اسلامیہ کی رہنمائی اور مملکت خداداد پاکستان کی تاسیس کا کام آپ سے لینا تھا۔ آپ نے ملزم کو پکڑ لیا۔ ہاتھ پر خراشیں آئیں۔

مئی ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی نے دو برس نظر بندی کے بعد رہائی پائی لیکن اس عرصہ میں مسلمانوں کے الگ وطن کے بارے میں ان کے خیالات میں کوا تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ قائداعظم کو پاکستان کے مطالبہ سے دستبرداری پر آمادہ کر سکیں گے اس نیت سے گاندھی جی نے ایک خط میں قائداعظم سے ملاقات کی درخواست کی۔

(پہلی قسط اخبار جنگ)

تعلیم بالغان اور اُس کی قومی اہمیت

مولانا مظہر الرحمٰن بھیراوی کی تصنیف ہے

یہ کتاب جو آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہمہ گیر تحقیق و تفتیش اور عمیق غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ پہلے باب میں مصنف نے پاکستان کے اُن سرکاری محکموں اور قومی اداروں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جو تعلیم بالغان اور سماجی فلاح و بہبود کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ابواب مابعد میں مصنف نے قدیم نظام تعلیم، مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم اور عالمگیر مسئلہ ناخواندگی پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے ان سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ عوام اور سماجی کارکنوں کے لئے شمع ہدایت ہیں۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں پی ایچ ڈی کے مقدمہ نے کتاب کی افادیت کو اور بڑھا دیا ہے۔ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

10/45-J-1 ناظم آباد۔ بی روڈ۔ کراچی

قائدِ اعظم کی راہِ عمل

از
جناب نصیر احمد نصیر

فرد ہو یا قوم اس کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس کی راہِ عمل پر ہوتا ہے۔ اگر راہِ عمل حسین، سیدھی یا قرآنی اصطلاح میں "مستقیم" ہوگی تو اس پر چلنے والے کے لئے اپنی منزل مراد کو پا لینا یقینی ہے۔ اس کے برعکس جس فرد یا جماعت کے راہِ عمل مستقیم نہیں ہوگی تو اس کا گمراہ و نامراد ہونا ناگزیر ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور اسی لئے قرآن حکیم نے افرادِ نسلِ انسانی کو یہ دعا سکھائی ہے۔

"اے پروردگارِ عالمین ہمیں صراطِ مستقیم دکھا اور اس پر چلا اور یہ راہ ان انسانوں کی ہے جن پر تونے لطف و کرم کیا، لیکن ان لوگوں کی (غیر مستقیم) راہ پر نہ چلانا جن پر تیرا قہر و غضب ہوا اور نہ ان کی راہ جو گمراہ ہو گئے۔"

(سورہ الفاتحہ)

اس سے ظاہر ہوا کہ انسان کے لئے سب سے اہم مسئلہ راہِ عمل کے انتخاب کا ہے کیونکہ اسی پر اس کی کامرانیٔ حیات اور ہلاکت و نامرادی کا دارو مدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب عالم میں انبیاء کرام، اولیاء عظام اور بزرگان دین کی راہِ عمل پر چلنے کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسلام میں بالخصوص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلعم کی راہِ عمل اتنی حسین و منزہ اور سیدھی تھی کہ اس پر چل کر آپ نے زندگی کے ہر گوشہ میں فقید المثال کامیابی حاصل کی۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ دنیا میں کسی بھی انسان نے ۲۳ برس کی قلیل مدت میں ایک مشرک و بت پرست، وحشی و درماندہ اور جاہل و غیر منظم قوم میں ایسا روحانی اور مادی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ جیسا کہ انقلاب حضور اکرم صلعم نے پیدا کیا۔ اس انقلاب کی بدولت عرب کے بدوی جو توحید کے مفہوم سے نا آشنا تھے، نہ صرف موحد بن گئے بلکہ توحید کے علم بردار بن کر دنیا پر چھا گئے، وہ وحشی تھے متمدن بن گئے۔ وہ جاہل تھے لیکن اسلام نے ان کے دل و دماغ کو علم و حکمت کی روشنی سے منور کر دیا۔ وہ غیر منظم قبائل میں منقسم تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے، لیکن اب وہ اسلامی وحدت سے ایک ایسی امت بن گئے جو اخوت و محبت کے سلسلہ میں منسلک ہو گئی۔ وہ سیاسی، معاشی اور ثقافتی لحاظ سے نہایت پسماندہ تھے لیکن اسوۂ حسنہ کی بدولت انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں وہ ترقی کی کہ اقوام عالم کی امامت انہیں سونپ دی گئی۔ وہ اب سیاسی اعتبار سے اتنے مضبوط و منظم

تھے۔ قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں، ان کی قوت
کی حریف نہ ہو سکیں۔ اقتصادی دنیا میں کوئی قوم
ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ علم و حکمت اور صنعت و فن میں
اتنی ترقی کرلی کہ اقوام عالم ان کی تقلید میں ایک گونہ افتخار
محسوس کرتی تھیں۔ ان کی تعلیمات دنیا کے لئے ماڈل اسکول
بلکہ ماڈل یونیورسٹیاں تھیں۔ اور ان کی علمی و ادبی
تصانیف سے تمام دنیا مستفید ہوتی تھی۔ مسلمانوں کی اس
حیرت انگیز ترقی کا راز فقط یہ تھا کہ ان کی راہِ عمل کامرانی
کی حسین و مستقیم راہ تھی جو درحقیقت پیغمبر اسلام صلعم کی
سنتِ حسنہ تھی۔

جہاں تک سیاسی زندگی کا تعلق ہے قائدِ اعظم
نے بھی کامرانی کی یہی حسین و مستقیم راہ اختیار کی تھی، یہ
توحید کی راہ تھی، اس کی دلیل وہ نعرہ ہے جو قائدِ اعظم
اور اس کے سیاسی پیروکاروں کا تھا اور وہ یہ تھا۔

پاکستان کا مطلب کیا ہے
لا الٰہ الا اللّٰہ

یہ اس نعرۂ توحید کی برکت تھی کہ مسلمانانِ ہند
کے دلوں میں ایمان کے سوتے پھوٹ پڑے اور ان میں
اتحاد و تنظیم پیدا ہو گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ اس وحدتِ
اسلامی کا اثر تھا کہ غیر مسلم اقوام اس قدر ڈر گئیں کہ انہوں
نے مسلمانوں کا مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لیا۔ حقیقت یہ ہے
کہ اس نعرۂ توحید نے اگر ۱۸ برس پہلے مسلمانانِ ہند کو
دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت عطا کی تھی تو ۱۸ برس
بعد اسی نعرۂ توحید نے پاکستان کو اس اسلام دشمن قوم کے
جارحانہ حملے سے محفوظ رکھا۔ یہ نعرۂ توحید مسلمانوں کے
دلوں کی پکار ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا
کوئی اور طاقت نہیں جس سے ڈرا جائے یا جس کی عبادت
تسلیم کی جائے۔ وہ چونکہ غیر اللہ سے نہیں ڈرتے چاہے اس کے
پاس فوج کی کثرت ہو یا اسلحہ کی فراوانی، لہٰذا وہ اپنی
قلیل تعداد اور قلیل سامانِ حرب کے ساتھ بھارت کے
لشکرِ جرار سے ایسے ٹکرائے کہ اسے پاش پاش کر دیا۔ یہی
ہندو تھے جنہوں نے پاکستان کے مطالبہ کی حد سے زیادہ
مخالفت کی تھی۔ لیکن جب وہ مسلمانوں کے نعرۂ توحید کے
حریف نہ ہو سکے تو انہوں نے اسے تسلیم کر لیا۔ حقیقت یہ ہے
کہ توحید ایک زبردست قوت ہے۔ جس کی کفر و شرک
کی کوئی قوت تاب نہیں لا سکتی۔ یہ اسلام کی ایک معمولی قوت
ہے، جو امتِ مسلمہ کے تمام افراد اور فرقوں کو ایک مرکز پر
لا کر انہیں حریفوں کی آنکھوں میں ناقابلِ تسخیر سیاہ بنا
دیتی ہے۔ یہ توحید ہی ہے جو اسلام کی روحِ عمل اور
کی ناقابلِ تسخیر قوت اور کفر و شرک کی تمام بیماریوں
کی تریاق ہے۔ اسلام کی فتح و کامرانی کی تاریخ اس
حقیقت کا زندہ ثبوت ہے کہ توحید کی راہ ہی فقط کامرانی
کی راہ ہے۔ اور یہی راہ تھی جس پر قائدِ اعظم نے چل کر
اس منزلِ مقصود کو پا لیا جو اب دنیائے اسلام کی سب سے
بڑی مملکت ہے۔ اور جسے دنیا پاکستان کہتی ہے اور جس نے
اسی جذبۂ توحید کی بدولت اپنے پرانے حریف کے عیارانہ
حملوں کو کامیابی سے پسپا کر کے نام پیدا کیا ہے۔

قائدِ اعظم کی تحریکِ پاکستان کی کامیابی کی
دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ صحیح معنوں میں عوامی تھی کیونکہ
وہ ہمہ گیر تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائدِ اعظم کو

جمہور کی بے پناہ قوت کا پورا احساس تھا اور انہوں نے
اس قوت سے پورا پورا کام لیا۔ وہ عوام کے صرف رہنما
ہی نہیں تھے، ان کے دوست اور محبوب بھی تھے۔ وہ عوام
کی آنکھوں کے تارے، ان کی امیدوں کے سہارے اور
برطانوی اور بھارتی سامراج سے مسلمانوں کو نجات دلانے
والے بھی تھے۔ عوام کو ان کی دیانت، تدبر اور خلوص پر یقین
تھا۔ اور انہیں عوام کے تعاون اور حمایت پر مکمل اعتماد
تھا۔ قائدِ اعظم عوام کی قومی آرزوؤں سے آشنا تھے۔
اور عوام ان کی بصیرت سے واقف تھے۔ قائدِ اعظم
اگر اپنی قوم کی آزادی کے لئے کوشاں تھے تو قوم ان
پر جان چھڑکتی تھی۔ غرض یہ باہمی خود اعتمادی اور
خود فروشی کی راہ تھی جس میں امیرِ کارواں یعنی قائدِ اعظم کو
منزلِ مقصود پر پہنچا دیا۔

علامہ اقبال اور قائدِ اعظم دونوں اس نظریہ
پر یقین رکھتے تھے کہ کسی قوم کی قسمت کا فیصلہ نوجوان
اور فقط نوجوان ہی کیا کرتے ہیں۔ یہ نوجوان خون ہے
جس کی حرارت سے زندگی کے بطن سے ایمان و قوت کے
سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہ نوجوان ہیں جو ایثار و قربانی کی
راہ میں سرفروشانہ آتے ہیں۔ اور اپنے خون سے گلزارِ
حیات کی آبیاری کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے جوانی اور
سرگرمیٔ عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چنانچہ یہی
وجہ تھی کہ قائدِ اعظم نوجوان طبقہ کو بہت عزیز رکھتے
تھے۔ اور انہوں نے اس طبقہ سے سب سے زیادہ کام لیا۔
خود انہوں نے بھی طلبا میں بہت زیادہ کام کیا۔ وہ طلبا
سے خطاب کرنے میں بڑی خوشی محسوس کرتے تھے۔ وہ طلبا
سے ملنے اور ان سے بات چیت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ
سے نہیں جانے دیتے تھے۔ مخالف جماعتوں کے غلط
پروپگنڈے کے باوجود طلبہ ان سے والہانہ محبت کرتے
تھے۔ اور ان کے ایک اشارے پر جان دینے کو تیار
رہتے تھے۔ اگر میں یہ کہوں کہ تحریک پاکستان کے اصلی
ہیرو طلبہ ہیں تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ بلکہ اعتراف ہوگا۔

ارتقائے حیات بغیر کسی واضح نصب العین کے
ممکن نہیں۔ فرد ہو یا قوم وہ ایک معین نصب العین کے
بغیر زندگی میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔
حقیقت یہ ہے کہ افراد و اقوام کی ترقی و کامیابی کا انحصار
نصب العین ہے۔ نصب العین جتنا بلند ہوگا اس کی ترقی بھی
اتنی ہی ارفع ہوگی۔ بہر حال نصب العین کے بغیر کوئی
راہرو بھی منزل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ اسے پہنچنا ہی
چاہئیے۔ وجہ یہ ہے کہ نصب العین ہی تو اصل میں مقصود
نظر ہوتا ہے جسے منزلِ مقصود سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان
حقائق کی روشنی میں جب ہم تحریک پاکستان کا مطالعہ کرتے
ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قائدِ اعظم کے سامنے ایک معین
منزل تھی جہاں وہ کاروانِ قوم کو لے جانا چاہتے تھے۔
وہ ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں میں ایک آزاد
و خود مختار اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتے تھے جہاں مسلمان
ہندو سامراج کی چیرہ دستیوں سے دور امن و سلامتی
سے زندگی گزار سکیں۔ قائدِ اعظم جانتے تھے کہ پاکستان
کے حصول کے بغیر اسلام کا ہندوستان میں مستقبل
تاریک ہے۔ انہیں یقین تھا کہ متحدہ ہندوستان میں
مسلمانوں کی حیثیت محض اچھوتوں کی سی ہوگی وہ بیت کے

ہندو دھرم کی رو سے فقط ہندو ہی پوتر یعنی پاک ہیں۔
اور ان کے سوا باقی تمام اقوام ناپاک ہیں۔ اس لئے
وہ اچھوت ہیں۔ قائد اعظم کو اسلام اور اس کے فرزندوں
کے لئے یہ صورت حال نہ گوارا ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔
انہوں نے اپنی قوم کے لئے ایک آزاد وطن حاصل
کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ یہ ان کی تحریک آزادی کا
نصب العین تھا۔ یہ ان کی منزل مقصود تھی جس کے
حصول کے لئے انہوں نے قوم کو ذہنی اور عملی طور پر تیار
کیا اور صبر آزما رکاوٹوں اور مخاصمانہ مزاحمتوں کے
باوجود وہ اس کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔

قائد اعظم کی سیاسی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی
تھی کہ انہیں اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم
تھا۔ اور یہ ان کا یقین محکم تھا جس کے باعث وہ کسی
مشکل، کسی رکاوٹ، کسی مخالفت کی ہرگز پروا نہ کرتے تھے۔
وہ جس بات کا ارادہ کر لیتے تھے اسے پورا کر کے دم
لیتے تھے۔ بعض لوگ جو قائد اعظم کی نفسیات کے اس
پہلو سے کم آشنا ہیں، انہیں ضدی کہتے ہیں۔ وہ اس
معنوں میں ضدی نہیں تھے کہ اپنی بات پر خواہ مخواہ
اڑ جاتے تھے۔ وہ بیشک اپنی بات کے دھنی تھے اور
اس پر اڑ جاتے تھے لیکن وہ بات حق و صداقت کی
آئینہ دار ہوتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ حق و صداقت
کے معاملہ میں ضدی تھے اور یہ ایسی صفت ہے کہ اس
کے بغیر کوئی بڑا انسان عظمت و رفعت کے مقام پر رسائی
حاصل نہیں کر سکتا۔ اور نہ وہ اپنے نصب العین کو حاصل
کر سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے ارادہ کی اس پختگی اور عمل
کے اس جذبے کو "صبر" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔
یعنی مشکلات و مصائب اور ناسا عد حالات میں ثابت
قدم رہنا اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے مسلسل
کوشش کرتے رہنا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قائد
اعظم کی فقید المثال کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ
انہوں نے تحریک پاکستان کے سلسلہ میں بڑے ہی صبر
کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان کے تمام مہاجن اپنے بے پناہ
مالی وسائل کے ساتھ قائد اعظم کے خلاف نبرد آزما
تھے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کی وہ جماعتیں بھی
سرگرم عمل تھیں جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ کہتی تھیں۔
اس کے علاوہ برطانوی حکومت بھی ہندوؤں کی پشت
پناہی کر رہی تھی۔ لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود
قائد اعظم اپنے مطالبۂ پاکستان پر ڈٹے رہے یہ ان
کی ثابت قدمی تھی جس کی حریف کوئی مخالفت نہ ہو سکی۔
صبر و استقامت کی اس خصوصیت کو قرآن حکیم
نے ان الفاظ میں بیان کیا۔۔۔ ان اللہ مع
الصابرین۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں
کا ساتھ دیتا ہے۔ تو پھر اس کی کامیابی یقینی اور حتمی
کیوں نہ ہو۔ اس جگہ اس نکتہ کی صراحت کر دینا
ضروری ہے کہ اخلاص کے بغیر ایمان یا یقین پیدا
نہیں ہو سکتا۔ اخلاص قلب کی ایک ایسی کیفیت
کا نام ہے جس سے یقین پیدا ہوتا ہے۔ اس سے یہ
نتیجہ نکلا کہ یقین پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلے
اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس اعتبار سے
یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یقین و اخلاص ایک ہی حقیقت

گے دو رخ ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قائدِ اعظم کی سیرت میں اخلاص اور یقین کا رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے کردار کی یہ صفت ہی ان کی شخصیت کی رفعت اور ان کی کامیابی کی وجہ حقیقی ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم قائدِ اعظم کی راہِ عمل کو اپنی قوم کے رہنماؤں اور خصوصاً نوجوان طلبہ کے لئے مثالی نمونہ قرار دیں تو یہ مبالغہ نہ ہوگا بلکہ حقیقت کا اظہار ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ قائدِ اعظم کی راہِ عمل ہی واقعتاً کامیابی کی راہ تھی۔ ہمارے نوجوانوں کے لئے تقلید و تتبع کا ایک مثالی نمونہ موجود ہے۔ قائدِ اعظم ایک عظیم شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی نظر میں رفعت و وسعت تھی۔ ان کے کردار میں صلاحیت و استقامت تھی۔ ان کے حوصلے میں توانائی تھی۔ اور ان کے ارادہ میں پختگی تھی۔ وہ بڑھاپے میں جواں ہمت تھے۔ ان کے دل میں قوم کا درد اور اسلام کی محبت تھی۔ غرض ان میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو انسان کو کامیابی سے ہمکنار کرتی اور اسے حیاتِ جاوداں بخشتی ہیں۔

---

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء قائد اعظم کی وفات سے متاثر ہو کر

سید ہاشم رضا

اٹھے ہیں کر کے بڑا کام قائدِ اعظم
جو سو گئے ہیں سرِ شام قائدِ اعظم

وہ کام کر کے چلے جو کسی سے ہو نہ سکا
ہوا یہ فیصلۂ عام قائد اعظم

غریب قوم تو خدمت کا کیا صلہ دیتی
خدا سے پائیں گے انعام قائد اعظم

محمدؐ اور علیؓ کا رہا سدا سایہ
ملا نصیب سے کیا نام قائد اعظم

چھپی تھیں صدیوں سے جو عظمتیں مسلماں کی
پھر ان کو لائے لبِ بام قائد اعظم

وہ فاصلے جو نہ صدیوں میں طے ہوئے ہوتے
بنا گئے وہ بیک گام قائد اعظم

ہوا تھا ہند میں آغاز جس کا ٹیپو سے
تھے اس امید کے انجام قائد اعظم

کہیں ہیں جال بچھائے رہے بہت صیاد
مگر نہ آئے تہ دام قائد اعظم

تھا سامراج ادھر اور رام راج ادھر
چلے سنبھل کے خوش اندام قائد اعظم

یہ طرزِ خاص یہ انداز ہمسفر برسوں
تھے رہ نوردِ رہِ عام قائد اعظم

بہار کو لئے خود آپ کی تلاش میں تھی
چمن کی گردشِ ایام قائد اعظم

یقینِ محکم و تنظیم و اتحاد و عمل
رہے گا یاد یہ پیغام قائد اعظم

عوام جہدِ مسلسل کا عہد کرتے ہیں
اب آپ کیجئے آرام قائدِ اعظم

ملیں گے جام پہ جام آج حوضِ کوثر پر
ہمیں بھی دردِ تہ جام قائد اعظم

تحریک پاکستان کی تاریخ کا ایک ورق

از

جناب ڈاکٹر سید معین الحق

تاریخ کا ہر طالب علم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ تھی۔ ہم اس کے تاریخی اور نفسیاتی پہلوؤں کا سرسری جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

تحریک پاکستان کے دوران جب قائداعظم اور دیگر مسلم رہنما اس نظریہ کو دلائل کے ساتھ پیش کرتے تھے تو بعض حلقے جو اس کی تردید تو نہیں کر سکتے تھے، لیکن بہرحال اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ مسلم لیگ کی ایک سیاسی چال (اسٹنٹ) ہے۔ واقعات کی تیز رفتاری و ہنگامی حالات نے اس وقت اتنا موقع نہیں دیا کہ تاریخ اور سیاست کے طلباء اس کا تفصیلی مطالعہ اور تجزیہ کرتے، تاہم مسلم دانشور اس نظریہ کی حقیقت اور گذشتہ تاریخ سے ناواقف نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ آئینیت کے مغربی تصور پر عقیدہ رکھنے والوں کو اس پر حیرت ہوتی تھی کہ برصغیر کے ہندو اور مسلمان جو تقریباً ہزار سال سے ساتھ رہتے چلے آئے ہیں اور جن میں سے اکثر کے اجداد ہندو تھے، کیونکر دو قومیں [illegible] اس لئے کہ ان کے مذہبی عقائد اور رسوم ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مغرب کے کتنے ملک ہیں جہاں ایک سے زائد مذہب کے ماننے والے رہتے ہیں مگر اس بنیاد پر اُن کو کبھی یہ شک نہیں ہوا کہ وہ سب ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ اس تصور کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد اور اعمال کا تعلق انسان کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی سے نہیں بلکہ یہ ہر فرد کا ذاتی اور نجی معاملہ ہے اور اس سے پیدا شدہ حالات اور نتائج کو ان کی قومی زندگی پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس سلسلہ میں قابل غور یہ امر ہے کہ اسلام کو مذہب کی تعریف کے اس محدود اور تنگ دائرے میں محصور نہیں کیا جا سکتا جو عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے، اور جس کا تعلق صرف چند عقائد اور عبادات وغیرہ سے ہے۔ انگریزی میں ریلیجن کا یہی مفہوم ہے اور ہم اس کا ترجمہ مذہب کرتے ہیں۔

اسلام درحقیقت ایک نظام ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر مسئلہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے، خواہ اس کا تعلق روحانیت اور اخلاقیات سے ہو خواہ دنیاوی امور سے۔ اسلام کا نظام مکمل ہے اس لئے

اس کے کسی ایک پہلو کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہی سبب ہے کہ اسلامی نظام میں طبقاتی تقسیم کی قطعی گنجائش نہیں، نہ رومی معاشرے کی طرح نسل و خاندان کی بنیاد پر، نہ ہندو معاشرے کی طرح خاندان اور پیشہ کی بنیاد پر، اور نہ دور جدید کی طرح اقتصادی اور مالی حیثیت کے اختلافات کی بنیاد پر۔ اسی طرح اسلامی تصورات کے پیش نظر، یہ تصور بھی بے معنی ہے کہ سیاست اور مذہب دو الگ الگ چیزیں ہیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ان تصورات کو سامنے رکھ کر ہم ایک نظر برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ پر ڈالتے ہیں، اس خطہ میں اسلام کے داخلے کا آغاز تو بہت پہلے ہوگیا تھا۔ لیکن باقاعدہ فتوحات کا سلسلہ محمد بن قاسم کے زمانہ (۷۱۱ء) سے شروع ہوا۔ اس وقت سے مختلف علاقے مسلمان حکمرانوں کے زیر حکومت آتے گئے اور ایک منزل وہ آئی جب ہمالیہ سے راس کماری تک سارے برصغیر پر مسلمان ہی حکمران تھے، صدیوں کی حکمرانی کے بعد پھر ان کا زوال شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اقتدار کی باگ کمزور ہوتی گئی، بالآخر ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حکومت کا چراغ گل ہوگیا۔ عہد قدیم میں مختلف قومیں، برصغیر میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے بعض علاقے فتح کئے اور ان کو اپنا وطن بنا لیا، ان میں آریہ سب سے زیادہ اہم اور طاقتور تھے۔

چنانچہ ان کی تہذیب سب پر غالب آگئی ابتدائی دور میں ان کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں اسی نام سے کیا جاتا رہا، بعد میں برہمنوں کے اقتدار کی وجہ سے برہمن مت (برہمنزم) کی اصطلاح رواج پاگئی، بدھ مت کے وجود میں آنے کے بعد دونوں میں مدت تک سیاسی و مذہبی اقتدار کے لئے کشمکش کا سلسلہ جاری رہا، جس کا آخری نتیجہ برہمن مت کی کامیابی میں ظاہر ہوا، بدھ مت کے پیرووں کا اقتدار اور ان کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ جس وقت مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا، یہ لوگ محدود تعداد میں، کچھ مشرقی اور کچھ مغربی علاقوں میں موجود تھے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندو مت کی اصطلاح کب سے رائج ہوئی لیکن یہ ظاہر ہے کہ ابتدائی دور کی فارسی تاریخی تصانیف میں کبھی ہندوستان کا ذکر پایا جاتا ہے اور یہاں کی آبادی کے ان لوگوں کے لئے جو اسلام کے حلقہ بگوش نہ تھے، ہندو کا لفظ استعمال ہوتا تھا، بہ الفاظ دیگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے دور اقتدار میں اُس وسیع سلطنت میں جس کا دارالحکومت دہلی یا آگرہ رہا، اکثریت ہندوؤں کی تھی، مسلمان اقلیت میں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ صوفیائے کرام کی تبلیغی کوششوں کے نتیجہ میں مرور ایام کے ساتھ مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا رہا لیکن ہندوؤں کی غالب اکثریت ہمیشہ قائم رہی حکمران اور محکوم قوموں کے اس تناسب میں جو ہزار سال سے زیادہ برصغیر کی آبادی کی نمایاں خصوصیت

رہی ہمیں اس امر کی بیّن شہادت ملتی ہے کہ مسلم سلاطین اور بادشاہوں نے مذہبی رواداری کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتے ہوئے محکوم اقوام کو اس سلسلہ میں مکمل آزادی دی۔ ان کے لئے شاید مشکل نہ تھا کہ تلوار کے ذریعہ اپنے ہم مذہبوں کی تعداد اس حد تک بڑھا دیتے کہ ان کی اکثریت مسلم ہو جاتی۔ عہد قدیم قرون وسطیٰ اور دور جدید کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ برصغیر کے مسلم حکمرانوں کو خراج تحسین پیش کرنے پر مورخ مجبور ہو جاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ انھوں نے اپنی حکمت عملی کی بنیاد اسلام کے زریں اصول "لا اکراہ فی الدین" (دین کے معاملہ میں کسی پر جبر کرنا روا نہیں) پر رکھی اور صدیوں اسی پر قائم رہے۔ بہرحال اسلامی اقتدار کے وسیع دور کی تاریخ کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی نمایاں خصوصیت یہی نظر آتی ہے کہ شخصی اور علاقائی بغاوتیں تو ہوتی رہیں لیکن ہندوؤں کی بغاوت کسی مذہبی بنیاد پر نہیں اس وجہ سے کہ ان کے مذہبی عقائد اور عبادات یا مذہبی قوانین اور رسوم میں حکومت نے مداخلت کی ہو، کسی دور میں ثابت نہیں۔ تاریخ کی نظر میں یہ ایک عظیم کارنامہ ہے اور یہ امر قابل افسوس ہے کہ اکثر مورخین نے اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے کی کوشش نہیں کی۔

--- ※ ---

انیسویں صدی عیسوی میں برطانوی اقتدار قائم ہونا شروع ہوا اور کم و بیش پچاس سال کے عرصہ میں سارے برصغیر پر انگریز مسلط ہو گئے، بیرونی اقتدار کے قیام نے یہاں کی زندگی کا نقشہ یکسر پلٹ دیا۔ جنگ آزادی سے قبل مسلمانوں کو جو تفوق حاصل تھا وہ ختم ہو گیا اور ان کی حیثیت ایک ایسی لاچار و مجبور اقلیت کی ہو گئی جس کو بیرونی حکومت بے اعتمادی اور نفرت کی نظر سے دیکھتی تھی، چنانچہ اس زمانہ میں برطانوی حکام نے وہ سب اقدامات کئے جو مسلمانوں کی اقتصادی زندگی اور سیاسی اہمیت کو ختم کرنے کے لئے ضروری سمجھے گئے۔ برخلاف اس کے ہندوؤں نے ابتدا ہی سے بیرونی حکومت سے وفاداری اور عملی تعاون کو اپنی فلاح و بہبود کے لئے ضروری سمجھ کر اس کو اختیار کر لیا تھا مغربی انداز پر تعلیم حاصل کرنے اور اس کے ذریعہ برطانوی حکام سے قریب تر ہو جانے کے لئے انھوں نے اپنے بچوں کو سرکاری مدارس ہی میں نہیں بھیجا بلکہ خود اپنے تعلیمی ادارے بھی کھولنا شروع کر دیئے تھے۔ ان اقدامات کے نتیجہ میں ہندو قومیت کا احساس مضبوط ہوتا رہا۔ خاص طور پر شمال میں بنگال اور جنوب میں مرہٹی علاقوں میں یہ سیاسی شعور کافی حد تک بڑھ گیا تھا۔ اس پر ہمیں تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں بنگال کے ہندوؤں نے بہت کم حصہ لیا۔

انقلاب سے قبل اور اس کے بعد کے زمانہ کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ حکومت سے وفاداری اور اس کے حکام سے عملی تعاون اور اس کے نتائج سے جو ذہنی

فوائد اور رعایتیں حاصل ہو سکتی تھیں یعنی تعلیمی و اقتصادی
ترقی اور سیاسی شعور کا ارتقا، ان تمام میدانوں میں
ہندو قوم بہت زیادہ پیش پیش نظر آتی ہے۔ مسلمان ایک
مدت تک مغربی تعلیم کو حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے
اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے اس فتوے کے باوجود
کہ انگریزی تعلیم کے حاصل کرنے میں شرعاً کوئی قباحت
نہیں اور مسلمانوں کے لئے جائز ہے، من حیث القوم
مسلمانوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی
اور انگریزی تعلیم کو درخور اعتناء نہ سمجھا۔

جنگ آزادی کے بعد سید احمد خان، پہلے
مسلم رہنما تھے جنہوں نے گذشتہ پچاس سال
کی تاریخ کا بغور جائزہ لیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ اگر ان
کے ہم قوموں نے اپنے مستقبل کے لئے راہ متعین کرنے
میں غفلت سے کام لیا تو نتائج مسلمانوں کے حق میں خطرناک
ہوں گے۔ ایک عرصہ تک وہ اس خیال کے حامی رہے
کہ دونوں قومیں، ہندو اور مسلمان، ساتھ ساتھ
رہ کر اسی طرح باہمی تعاون سے خوشحالی کی
زندگی بسر کر سکتی ہیں، جیسی مسلمانوں کے عہد حکومت
میں، اختلاف مذہب کے باوجود ہر میدان میں دوش
بدوش رہتی تھیں، لیکن جلد ہی واقعات نے سید
احمد خان کو اپنے نظریات بدلنے پر مجبور کر دیا۔ ان
کے سامنے راجہ رام موہن رائے کی زندگی اور اس
کے کارناموں کی مثال موجود تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت
اسلامی طرز تعلیم کے زیر سایہ ہوئی تھی اور ان
کے طرز رہائش میں بھی مسلمانوں کی معاشرت کا
اثر نمایاں طور پر نظر آتا تھا، لیکن جب انھوں نے
اصلاح کے لئے قدم اٹھایا تو مسلمانوں کو قطعاً نظر انداز کر دیا
اور ان کے سامنے صرف اپنی ہندو قوم ہی رہی، اور
اس انداز فکر کو انھوں نے چھپانے کی بھی کوشش
نہیں کی، چنانچہ انگریزی تعلیم کے لئے جب ایک کالج
قائم کیا تو اس کا نام ہندو کالج ہی رکھا۔ یہ تمام
واقعات سید احمد خاں کے علم میں تھے مگر جس چیز نے
ان کی فکر کے دھارے کو قطعی طور پر موڑ دیا وہ ۱۸۶۷ء
میں شروع ہونے والی وہ ہندو تحریک تھی جس کا
مقصد اردو کو اسی قدر پیچھے ہٹا دینا تھا جتنا مسلمان
اقتصادی زندگی میں ہندوؤں سے پیچھے رہ گئے تھے۔
اردو، ہندو اور مسلمانوں کی مشترک زبان تھی عرصہ
سے عدالتوں اور دفتروں میں رائج ہو چکی تھی اور
حقیقت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے
سے قریب تر لانے کا ایک موثر اور اہم ذریعہ تھی، ان
واقعات کے باوجود ہندوؤں نے اس کی پوری مخالفت
کی اور اس کے مقابلے میں ہندی کو پیش کیا۔ ہندوؤں
کے اس اقدام نے سید احمد خاں کے ذہن پر گہرا
اثر کیا اور ان کو یقین ہو گیا کہ ہندو اور مسلمان ایک
قوم نہیں بلکہ جداگانہ دو قومیں ہیں۔ اور بحیثیت
مسلمان کے ان کا فرض اولین یہی ہے کہ وہ مسلمانوں
کی فلاح و بہبود کے لئے پوری کوشش کریں۔ ان کا
یہ خیال بھی صحیح تھا کہ سب سے پہلے مسلمانوں کو تعلیمی
میدان میں آگے بڑھنے کی ضرورت ہے چنانچہ ان

کے پروگرام میں تعلیم ہی کو پہلا مقام حاصل تھا۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی اِس ادارہ کی تشکیل و تعمیر میں ابتدا ہی سے ایک تضاد تھا۔ وہ لیڈر جنھوں نے اس کی بنیاد رکھنے میں نمایاں حصہ لیا تھا اپنے ذہن میں قومیت کا مغربی تصور رکھتے تھے۔ اگرچہ اس وقت ان کی رہنمائی ایک انگریز مسٹر ہیوم نے کی اور ان کے پیش نظر مغربی سیاسیات ہی کے بنیادی اصول تھے، لیکن ان سب خیالات کا پس منظر ہندو قومیت کا تصور تھا۔ چنانچہ چند ہی برس گزرے تھے کہ بال گنگا دھر تلک اور ان کے ہم خیال ہندو لیڈروں نے اس ادارہ پر اپنا اقتدار قائم کرلیا اور ہندو قومیت کا تصور اپنی مکمل عریانی کے ساتھ سامنے آگیا۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ان لیڈروں نے ہندو قومیت کو مستحکم اور منظم کرنے کی غرض سے جو طریقہ اختیار کیا تھا اس کے مقاصد میں ایک اہم مقصد مسلمانوں کی قومی حیثیت کو ختم کرنا بھی تھا کیوں کہ ہندوؤں کی نظر میں مسلمان ملیچھ (ناپاک) تھے اور معاشرے یعنی ہندو معاشرے کو پاک کرنے کیلئے مسلمانوں کو راستہ سے ہٹانا ضروری تھا۔ اس تحریک میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لئے شیواجی کو بطور نمونہ اور ہیرو کے منتخب کیا گیا، باوجودیکہ مغلوں کے خلاف اس کی بغاوت ذاتی مفاد کی بنیاد پر تھی نہ کہ قومی اور مذہبی تصورات کی بنیاد پر، لیکن پھر بھی اس کی شخصیت کو ابھارنے کی ضرورت تھی کیونکہ بہرحال اس نے مسلم اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، سوراجیہ کی اصطلاح میں یہی یہی خوبی تھی کہ شیواجی نے مغلوں کے خلاف جو اپنی مختصر خود مختار حکومت قائم کی تھی۔ اس کو یہی نام دیا تھا۔ تلک کی یہ تحریک ۱۸۹۰ء کے بعد منظر عام پر آئی لیکن سید احمد خاں کی دور بین نگاہ نے ۱۸۸۵ء ہی میں مستقبل کی تاریخ کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا اور اسی وقت سے انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دینا شروع کردیا تھا کہ وہ کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل نہ کریں ورنہ بحیثیت ایک قوم کے ان کا وجود ختم ہو جائے گا۔

اپنے مقالات اور تقریروں میں سید احمد خاں نے نہایت غیر مبہم اور صاف الفاظ میں اس نکتہ کی تشریح کی کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ قومیں ہیں اور کانگریس نے ہندوستان میں ایک قوم کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ بعض مسلمان بھی ان کے اس نقطۂ نظر سے ہم خیال نہ ہو سکے۔ لیکن تاریخی واقعات نے سید احمد خاں کے پیش کردہ تصور کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ آج بھی بعض مورخ تلک کو شدت پسند کہہ کر ان کے خیالات کی اصلی تصویر پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، مگر حقیقت چھپانے کی کوشش کے باوجود وہ ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ اس صدی کے ابتدائی سالوں میں جب لارڈ کرزن کی حکومت نے بنگال کو تقسیم کرکے مشرقی بنگال کا ایک نیا صوبہ بنانا چاہا تو ہندوؤں نے اور سب سے زیادہ کانگریس کے

لیڈروں نے اس کی مخالفت کی، مسٹر گوکھلے نے جو ہندو لیڈروں میں اپنی انصاف پسندی، میانہ روی اور وسیع القلبی کے لئے خاص شہرت رکھتے تھے، کانگریس کی اس تحریک کی مخالفت کرنے کے بجائے کہ وہ مسلمانوں کے ایک جائز حق کے خلاف تھی، اپنے کانگریس کے صدارتی خطبہ میں تحسین آمیز انداز میں ذکر کرتے ہوئے کہا "تقسیم بنگال کے نتیجہ میں اس علاقہ کے عوام میں جوش و خروش کا جو ہنگامہ خیز طوفان اٹھا ہے وہ ہماری قومی ترقی کی راہ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے...... قومی شعور کی ایک لہر اس سارے صوبے پر دوڑ گئی ہے...... اس تحریک کو وہ نوکر شاہی کے اقتدار کے خلاف ایک جرات مندانہ اقدام قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "(ہندو) بنگالیوں نے جو مصائب برداشت کئے ہیں ان کے نتیجہ میں ملک کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے حوصلہ مندی اور ہمدردی کے میدان میں ایک دوسرے سے نزدیک تر ہوگئے ہیں۔"

گوکھلے کے ان الفاظ میں وہ حقیقت صاف نظر آتی ہے جس کی نشان دہی سید احمد خان دس سال قبل کر چکے تھے۔ تلک اور گوکھلے ہندو سیاست کے دو مختلف مکاتیب فکر کے نمائندہ ہونے کی شہرت رکھتے ہیں۔ اول الذکر متعصب، تنگ نظر اور تشدد پسند تھے گوکھلے کے متعلق عام طور پر یہ خیال تھا کہ ان کے اقوال و افعال کی نمایاں خصوصیت اعتدال پسندی تھی، یہ جائزہ غلط نہیں ہے لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ ہندو لیڈروں بلکہ ساری قوم کے ذہن میں بنیادی طور پر یہی تصور نشوونما پا رہا تھا کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم ہے اور وہ ایک قوم ہندو ہے، دوسرے مذاہب کے پیرو، اقلیتوں اور صرف اقلیتوں کی حیثیت سے یہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ یا تو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کو ہندو اکثریت میں اسی طرح ختم ہو جانا چاہیئے جیسے قدیم عہد میں آریاؤں کے علاوہ یہاں آنے والی دوسری قومیں، مثلاً سیتھین، شاک، یونانی، اور ہن وغیرہ یہاں کی آبادی میں مدغم ہو کر تاریخ کے صفحات سے غائب ہوگئیں اور ان کی تہذیبوں اور کارناموں کا علم صرف مورخوں کے دائرۂ معلومات میں محصور ہو کر رہ گیا، یا پھر ہندو قوم یعنی اکثریت کی اتباع اور خدمت گذاری کے لئے شودروں کی طرح خود کو وقف کر دیں۔

—— * ——

اس تصوراتی اور سیاسی کش مکش میں جو اقلیت اپنی آزاد قومی حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے اکثریت سے ٹکر لینے اور اس راہ میں ہر قربانی دے کر اس کو برقرار رکھنے کے لئے تیار ہو سکتی تھی وہ مسلم قوم تھی، اس لئے یہ امر باعث حیرت نہ ہونا چاہیئے کہ ہندو قوم کی مخالفت اور ایک حد تک نفرت کا نشانہ مسلمان ہی بنے، ہاں اس پر ضرور حیرت ہے کہ ہندو مفکرین بالخصوص سیاسی لیڈروں

نے برصغیر کی تاریخ کے اس پہلو پر غور نہیں کیا کہ ہندو اور مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک ساتھ رہنے اور اشتراکِ عمل کے اصول پر زندگی بسر کرنے کے باوجود اپنی مذہبی اور قومی حیثیت کو جدا رکھا۔

سید احمد خاں کا عظیم کارنامہ یہی تھا کہ مسلمانوں کو انھوں نے اس راستہ کی نشان دہی کی کہ ان کے قومی نظریہ کی بنیاد اسلام ہی ہے۔ صرف عقائد ہی نہیں، بلکہ برصغیر کی سیاسی زندگی جو رخ اختیار کر رہی تھی اس کا تقاضا بھی یہی تھا۔

سید احمد خاں کا انتقال تو ۱۸۹۸ء میں ہو گیا لیکن جو سیاسی شعور اور قومی احساس انھوں نے اپنے ہم مذہبوں میں پیدا کیا تھا وہ ترقی پاتا رہا اور ان کے رفقین اس راستہ پر ان کی رہنمائی کرتے رہے۔

سرسید کی وفات کے آٹھ سال بعد اس تصور نے آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی شکل میں عملی جامہ پہنا۔ لیگ کا وجود میں آنا اس بات کی دلیل تھی کہ مسلمانوں کو اپنی جداگانہ قومی حیثیت قائم رکھنے اور اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے ان کو خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیئے۔ اسی سال یعنی ۱۹۰۶ء میں تین ماہ قبل وہ جداگانہ انتخاب کا حق حاصل کرنے کے لئے... وائسرائے ہند کو ایک محضرنامہ پیش کر چکے تھے تین سال کے اندر نئی اصلاحات کے ساتھ یہ حق تسلیم کر لیا گیا۔ لیگ کی حیثیت اب مستحکم ہو رہی تھی اور ۱۹۱۶ء میں ہندو اور مسلم لیڈروں کی کوشش سے جن میں قائداعظم محمد علی جناح کا نام سرفہرست ہے، لکھنؤ میں ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے اس کے ذریعہ کانگریس کے لیڈروں نے جداگانہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر کے مسلمانوں کی علیحدہ .... قومی حیثیت کو اصولاً مان لیا۔ ۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں نے شانہ بہ شانہ کام کر کے نتیجہ میں دونوں قوموں کے لیڈرز زیادہ قریب ہو گئے، لیکن جلد ہی بعض ہندو لیڈروں نے جن میں پنڈت مالویہ، شردھانند اور خود کانگریس کے بعض رہنما شامل تھے یہ محسوس کیا کہ جنگ آزادی کی راہ پر ہندو اور مسلم قوموں کی مشترکہ کوشش کے نتیجہ میں جس تیز رفتاری سے لوگ آگے بڑھ رہے ہیں اس سے مسلمانوں کی تنظیم اور جداگانہ حیثیت کو بہت مدد مل رہی ہے۔ چنانچہ تاریخ کے پہیوں کو الٹا پھیر دینے کے لئے چند اقدام کئے گئے اور ان مسائل پر پھر زیادہ زور دیا جانے لگا جن سے دونوں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔ تاریخ کے تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود گاندھی جی بھی جو ہندو لیڈروں میں اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ گئے تھے، اسی انداز فکر سے متاثر نظر آتے ہیں۔

یہ سلسلہ بڑھتا ہی رہا اور رفتہ رفتہ کانگریس کے وہ رہنما جو قوم پرستی کے آسمان پر ستارے سمجھے جاتے تھے، اپنے اصلی رنگ میں نظر آنے لگے، مثلاً نہرو کمیٹی کے صدر پنڈت موتی لال نہرو جن کے صحیح خیالات کا اندازہ نہرو رپورٹ کے اندراجات سے لگایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد گول میز کانفرنسوں کے اجلاسوں میں یہ ساری پوزیشن صاف طور پر عیاں ہوگئی۔ شروع میں تو کانگریس شرکت کے لئے تیار نہیں ہوئی اور جب تیار ہوئی تو گاندھی جی نے جن کو تنہا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا تھا، اس موقعہ پر اقلیتوں کے حقوق کے سلسلہ میں جو رویہ اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی [1]۔

اب مسلمانوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا کہ وہ اپنی منزل مقصود کا تعین کریں اور اس کے حصول کے لئے ایک لائحہ عمل سوچیں۔ ان کے سامنے سب سے پہلے اپنے واحد نمائندہ ادارے مسلم لیگ کی تنظیم نو کی ضرورت تھی۔ اس کے احیاء کی عظیم اور اہم ذمہ داری قائداعظم نے سنبھالی اور ۱۹۳۶ء سے اس کی کوشش شروع کر دی۔

قائداعظم کی دور بینی اور دور اندیشی اور ان کے عزم و استقلال اور بے مثال کردار کی بدولت مسلم لیگ نے ان کی رہنمائی میں حیرت انگیز ترقی کی اور چار سال کی قلیل مدت میں اس نے مسلمانوں کے لئے نصب العین بھی متعین کر دیا اور ان کو اپنے جھنڈے کے نیچے اس حد تک منظم کر دیا کہ وہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ایک کامیاب اور موثر تحریک چلا سکیں۔

لاہور کے اجلاس میں جو ۱۹۴۰ء میں منعقد ہوا تھا یہ مطالبہ کیا گیا کہ برصغیر کو ہندو اور مسلم علاقوں میں اس بنیاد پر تقسیم کیا جائے کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی خود مختار ریاست ہو اور جہاں ہندو اکثریت میں ہیں وہ علاقے ان کے پاس رہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جو تحریک چلائی گئی اس کو اب تاریخ میں "تحریک پاکستان" کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ تحریک سات سال بعد یعنی ۱۹۴۷ء میں بار آور ہوئی اور اس کے نتیجہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کا وجود دنیا کے سیاسی نقشہ پر نمودار ہوا۔

تحریک پاکستان کے سلسلہ میں دو نظریے قابل ذکر ہیں اور ان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے حقیقت یہ ہے کہ ان ہی کی بدولت تحریک میں استحکام پیدا ہوا اور بالآخر کامیابی حاصل ہوئی۔ برصغیر کی تقسیم کا تصور اور اس مطالبہ کی بنیاد دو قومی نظریہ پر رکھی گئی۔ تقسیم کا تصور لاہور کے اجلاس سے بہت پہلے مختلف گوشوں سے پیش کیا جا چکا تھا اور سیاسی حلقوں میں مقبول ہوتا [2] جا رہا تھا چنانچہ مختلف تصانیف اور رسالوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ سے فرضی نام سے ایک پمفلٹ شائع ہوا جس کا اصل موضوع متنازعہ مسئلہ گاؤکشی تھا، لیکن اس کے مضمون نگار نے صاف الفاظ میں یہ تجویز پیش کی تھی۔ اس پمفلٹ کو جس کا ہیڈنگ "کھلا خط گاندھی کے نام" تھا، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے کتابچہ کی شکل میں ضیاء الاسلام مرحوم کے دیباچہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ لیکن اس تصور کو سب سے

---

[1] اس سلسلہ میں وہ بیانات دیکھئے جو قائداعظم کے صدارتی خطبہ (لیگ کا اجلاس منعقدہ دہلی ۱۹۴۳ء) میں موجود ہیں۔

طریقہ سے علامہ اقبال مرحوم نے ۱۹۳۰ء میں اپنے اُس خطبہ صدارت میں پیش کیا، جو مسلم لیگ کے اکیسویں سالانہ اجلاس میں انھوں نے الہ آباد میں دیا تھا۔ اگرچہ یہ اتفاق تھا لیکن اس واقعہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خطبۂ صدارت مسلم اقلیتی صوبوں سے ایک اہم صوبہ کے دارالحکومت میں دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد دونوں قوموں کے لیڈروں کی توجہ گول میز کانفرنس کے اجلاسوں اور ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ پر مبذول ہو گئی۔ لیکن پھر بھی یہ تصور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبولیت حاصل کرتا رہا۔ اس اثناء میں انگلستان میں چند مسلم طلبہ نے چودھری رحمت علی کی سرکردگی میں اس تصور کو ایک مختصر تحریک کے ذریعہ آگے بڑھایا اور آنے والی نئی مملکت کا نام بھی تجویز کر دیا جس میں پنجاب، سندھ اور کشمیر وغیرہ کے پہلے حروف شامل تھے، اور معنی کے لحاظ سے ظاہر ہے کہ پاکستان کے نام میں ایک خاص دلکشی موجود ہے۔ یہی سبب تھا کہ یہ نام تیزی کے ساتھ شہرت پاتا رہا۔ ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال نے قائد اعظم کو خط لکھا کہ اب تقسیم کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ۱۹۳۸ء میں سندھ مسلم لیگ کانفرنس نے سب سے پہلے اس کا باضابطہ مطالبہ کیا اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں دو سال بعد یعنی ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے اس کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔ تحریک کے دوران مطالبہ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر رکھی گئی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس کے حق میں جو دلائل پیش کئے گئے ان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم دانشور بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور ان کو اقلیت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کے لئے یہ صرف سیاسی مسئلہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس کی اہمیت کو کسی حالت میں کم نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام میں ملت کا جو تصور ہے، اس کے پیش نظر اسلامی مملکت یقیناً نظریاتی مملکت ہوگی۔ پاکستان کے دانشوروں کا یہ فرض ہے کہ وہ قوم کے نوجوانوں میں اس کی اصلیت اور اہمیت کا اندازہ لگانے کی صلاحیت پیدا کریں اور ان کے ذہنوں میں یہ حقیقت اچھی طرح بٹھا دیں کہ کہیں مغربی زندگی کی رَو میں بہ کر وہ اپنے صحیح مقام سے دور نہ ہو جائیں۔ ان کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارا قومیت کا تصور ملت کی بنیاد ہے جو مغربی تصورات سے بالکل مختلف ہے :-

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

(علامہ اقبالؒ)

۲۱ے قارئین کے لئے یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندو مسلم مسئلہ کے حل کے لئے برصغیر کو ہندو اور مسلم علاقوں میں تقسیم کرنے کا ذکر، سلطان معزالدین کے اس خط میں ہمیں ملتا ہے جو اس نے ۱۱۹۲ء میں ترائن کی دوسری جنگ سے قبل پرتھوی راج کی دھمکی کے جواب میں لکھا تھا، راجہ مذکور نے اپنی افواج کی تعداد اور ان کی قوت کا ذکر کر کے سلطان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ واپس چلا جائے اور خود کو اور اپنی فوج کو ہلاکت کے بھنور میں نہ ڈالے۔ سلطان نے مدبرانہ انداز میں جواب دیا کہ وہ اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کی ہدایت کے بغیر کوئی اقدام نہیں کر سکتا اس لئے اس کو اتنا وقت ملنا چاہیئے کہ وہ اس کو پیغام بھیج کر اس اصول پر صلح کرنے کی اجازت حاصل کر لے کہ سرہند تک کا سارا علاقہ مع ملتان جس میں شمالی سندھ بھی شامل تھا سلطان کو دیدیا جائے اور بقیہ علاقہ پر راجہ کی حکومت قائم رہے۔ راجہ کا خط مبنی بر خلوص تھا بلکہ اس لئے بھیجا گیا تھا کہ اس کے جواب سے، راجہ کو سلطان کے حوصلے اور اس کی فوجی طاقت کا اندازہ لگانے میں سہولت ہوگی۔ سلطان نے بھی تدبر کی بنا پر اسے جواب دیا، خط ملنے پر ہندو سردار یہ سمجھ کر غافل ہو گئے کہ سلطان کی طاقت کمزور ہے اور وہ جنگ سے بچنا چاہتا ہے۔ چنانچہ سلطان کی فوج نے جب علی الصباح حملہ کیا تو ہندو سپاہی حوائج ضروری سے فراغت حاصل کرنے اور ہاتھ دھونے میں مصروف تھے، جلدی میں وہ میدان میں آئے اور آخرکار شکست فاش کھائی۔ (اس خط کا ذکر تاریخ فرشتہ بمبئی ایڈیشن جلد اول صفحہ ۵۸ پر ہے)

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسّس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ!
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ!

اقبالؔ

اکبرِ اعظم اور قائدِ اعظم

از

عالی جناب سید ہاشم رضا صاحب

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء ہماری عید آزادی کا دن ہے۔ اس دن ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے تاج برطانیہ کا اقتدار پاکستان کے ہر باشندے کو سونپ دیا۔ اقتدار کی منتقلی کے وقت اہل پاکستان کی نمائندگی دستور ساز اسمبلی کے ممبروں نے کی۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں منعقد ہوا جس میں قائداعظم محمد علی جناح کو صدر منتخب کیا گیا۔ اس انتخاب پر ممبروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا۔

"آپ نے مجھے اپنا پہلا صدر منتخب کر کے جس طرح میری عزت افزائی کی ہے، اس کے لئے میں آپ کا صدق دل سے شکر گزار ہوں۔ یہ خود مختار اور صاحبِ اقتدار اسمبلی جو اعزازات دے سکتی ہے ان میں یہ سب سے بڑا اعزاز ہے۔"

اس اقتدار کو منتقل کرنے کے لئے جو دو سو برس تک برطانیہ کے بادشاہ اور پارلیمنٹ کی گرفت میں رہا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۱۳ر اگست کو کراچی آئے اور ۱۴ر اگست کو اسمبلی چیمبر میں مجلس دستور ساز کا اجلاس ہوا جس میں انہوں نے انگلستان کی پارلیمنٹ کا فیصلہ اور بادشاہ کا پیام پڑھ کر سنایا۔ قائداعظم نے اپنے جواب میں بادشاہ جارج ششم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مخاطب کر کے کہا۔

"عظیم شہنشاہِ اکبر نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ جس رواداری اور خوش خلقی کا برتاؤ کیا، وہ کوئی نئی بات نہ تھی، اس کی بنا تیرہ سو برس پہلے پڑ چکی تھی جب رسول کریم نے نصرانیوں اور یہودیوں کو شکست دینے کے بعد سے انتہائی رواداری اور شفقت کا سلوک کیا اور ان کے مذہب اور عقائد کا احترام صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر کیا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں وہاں اپنے غیر مسلم باشندوں سے ایسا مثالی برتاؤ کیا جس کی تقلید ہم پر فرض ہے۔"

قائداعظم جس وقت یہ تقریر کر رہے تھے میں ایوان کی وزیٹرز گیلری میں بیٹھا ہوا ایک مغل شہنشاہ اور برصغیر کے مسلمانوں کے ایک بے تاج بادشاہ کا تقابل کر رہا تھا۔

شہنشاہ اکبر اپنی فتوحات، انتظامی صلاحیت اور غیر مسلموں سے رواداری کی وجہ سے مشہور ہیں۔

اس کی شہرت دور دور تک پہونچی، وہ نہ عالم تھا نہ فاضل لیکن عالموں اور فاضلوں کا بڑا قدر دان تھا۔ اس کی محفل میں مسلمان عالم، پنڈت اور عیسائی راہب اپنے اپنے عقائد دلیلوں کے ساتھ بیان کرتے۔ اکبر کے شوق جستجو کی کوئی انتہا نہ تھی۔

اکبر کی پیدائش کے وقت اس کا باپ ہمایوں مغل شہنشاہ نہ رہا تھا بلکہ ایک ایسا مسافر بن گیا تھا جس کی منزل کا پتہ نہ تھا۔ راجپوتانہ کا ریگستان طے کرکے جب وہ سندھ کے حدود میں داخل ہوا تو عمرکوٹ کے مقام پر خدا نے اسے ایک بیٹا عطا کیا جس نے مغلیہ تاج کو برطانیہ تاج کا مد مقابل بنا دیا۔ ہمایوں افغانستان و ایران پہونچا جہاں کے بادشاہ نے حق ہمسائگی و دوستی ادا کیا اور اپنی فوج ہمایوں کے ساتھ بھیج دی اور اس طرح پندرہ برس مسافرت میں گذار کر ہمایوں تزک و احتشام کے ساتھ ایک مرتبہ پھر دلی پہونچ کر تخت پر بیٹھا جسے شیر شاہ سوری نے اسے ہرا کر حاصل کیا تھا۔ اکبر نے دلی جب پہلی مرتبہ دیکھی تو اس کی عمر پندرہ برس کی تھی۔ یہ سن ۱۵۵۵ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت سلطنت مغلیہ کا مستقبل مبہم تھا۔ لیکن ۵۰ برس جب ۱۶۰۵ء میں اکبر کا انتقال ہوا تو اس سلطنت کو ایسا استحکام اور ایسا وقار حاصل ہو چکا تھا جو کسی پیشرو سلطنت یا بادشاہ کو حاصل نہ ہوا تھا۔

جب سولہ برس کی عمر میں اکبر نے زمام سلطنت سنبھالی تو مغل مملکت شمالی ہندوستان اور راجپوتانہ میں گوالیار تک محدود تھی۔ اکبر نے اس کی حدیں شمال میں کشمیر تک بڑھائیں، جنوب میں مالوے اور چتوڑ تک، مشرق میں بنگال اور آسام تک اور مغرب میں سندھ تک۔ اس کی تابناک زندگی پر دین الٰہی کا دھبہ ضرور ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ پیران مذہبی پرز مریداں می پرانند والا معاملہ تھا۔ خوشامد کسی کا بھی دماغ خراب کر سکتی ہے نہ کہ ایسے لوگوں کی خوشامد جو یکتائے زمانہ تھے۔ بہرحال تاریخ یہی بتلاتی ہے کہ وہ ایک مسلمان کی موت مرا اور دیگر طرح لاتعداد مسلمانوں نے سکندرہ میں اس کی قبر پر فاتحہ پڑھی ہوگی۔

اگر نورتن کا لفظ استعمال کیا جائے تو بات اکبر کے نورتن تک پہونچتی ہے۔ یہ وہ تو ارباب کمال تھے اکبر کے مقربان خاص میں سے تھے۔

ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) مرزا عبدالرحیم خان خاناں پسر بیرم خان ترکمان یہ وہ بیرم خاں تھے جنھوں نے ہمایوں کے مرنے کے بعد اکبر کی سیاسی تربیت کی تھی۔

(۲) خان اعظم مرزا کوکلتاش ہفت ہزاری

(۳) حکیم ابوالفتح گیلانی

(۴) ملک الشعراء علامہ ابوالفیض فیضی

(۵) مؤتمن الدولہ ابوالفضل جنھوں نے آئین اکبری کی ترتیب دی۔

(۶) حکیم ہمام

(۷) راجہ ٹوڈرمل صدر دیوان جن کے لگان اور محصول کے بنائے ہوئے اصولوں پر انگریز بھی کاربند رہے اور جن کی تخلیق "پٹواری" کی عملداری اب بھی

جاری ہے۔

(۸) راجہ بیربل سہ ہزاری

(۹) راجہ مان سنگھ پنج ہزاری جن کو اکبر نے وائسرائے بنا کر کابل بھیجا۔

ان نورتن میں دو باکمال شاعر تھے فیضی اور عبدالرحیم خان خاناں، فیضی کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

امروز نہ شاعرم حکیم — دانندۂ حادثِ قدیم
ہر موئے زمین تمام گوش است — خاموشیِ من بصد خروش است
ایں کار من است و کار کس نیست — اندازہ و اختیار کس نیست
ایں بادہ کہ جوش زد از ایاغم — خون است چکیدہ از دماغم
بالک قلم درین شب تار — صد معنیِ خفتہ کرد بیدار

آخری شعر میں تو فیضی نے قلم توڑ دیا ہے۔

عبدالرحیم خان خاناں کی شخصیت بڑی دلکش تھی، انہیں سپہ گری اور شاعری دونوں میں کمال حاصل ہوا۔ ان کے اشعار کا نمونہ یہ ہے۔

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند است
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزو مند است

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار است
نگاہِ اہلِ محبت تمام سوگند است

ندیم دانم و نے دانہ ایں قدر دانم
کہ پائے تا بہ سرم ہر چہ ہست در بند است

مرا فروخت محبت و لے ندانستم
کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است

ادائے حق محبت عنایتے ست ز دوست
وگرنہ خاطرِ عاشق بہ ہیچ خورسند است

ازاں خوشم بہ تمنائے دلکش تو رحیم
کہ اندکے ز ادا ہائے عشق مانند است

جس وقت قائداعظم دستور ساز اسمبلی میں تقریر کر رہے تھے ہمارے دل فرطِ مسرت سے اچھل رہے تھے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد جو مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا، وہ خاندان مغلیہ کے آخری چشم و چراغ شاہ ظفر کی اسیری پر ختم تھا۔ اس کے بعد انگریزوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ برٹش امپائر رومن امپائر سے کہیں زیادہ وسیع اور مستحکم ثابت ہوا۔ اگر دو عظیم جنگیں نہ ہوئی ہوتیں جنھوں نے انگریزی سامراج کی کمر توڑ دی تو معلوم نہیں کہ ہمیں کب تک آزادی کی جنگ لڑنی پڑتی۔ ہندو لیڈروں کے مقابلے میں قائداعظم کا کام بڑا کٹھن تھا۔ کانگریس کے کیسے میں ٹاٹا اور برلا کا پیسہ تھا، گاندھی جی کی "مہاتمایت" تھی۔ ولبھ بھائی پٹیل کی انتظامی صلاحیت تھی۔ جواہر لال نہرو کی جوانی اور خاندانی وجاہت اور ان سب کے مقابلے میں قائداعظم چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ کانگریس کے سارے لیڈروں کا جواب قائداعظم کی زبان، اور ان کے ٹائپ رائٹر سے ملتا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس پیسہ نہ تھا لیکن انگریزوں کے دست برد سے ایمان کی دولت بچ گئی تھی۔ انگریز حکمراں تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ وائسرائے لارڈ لن لتھ گو نے کئی مرتبہ کہا کہ وہ متحدہ ہندوستان کے حامی ہیں۔ لارڈ ویول بھی جنھوں نے پہلی مرتبہ مسلم لیگ کی طاقت کا اعتراف کر کے

لیگ اور کانگریس میں 'پیرٹی' کا اعلان کیا تھا،
تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان
سے واپس جاکر اپنی تقریروں اور تحریروں میں تقسیم
ہند پر تاسف کا اظہار کیا۔ برطانوی لیبر پارٹی کے
سربراہ اور انگلستان کے وزیر اعظم ایٹلی نے جب
ہندوستان کی آزادی کا بل پارلیامنٹ میں پیش
کیا تو یہ امید ظاہر کی کہ ایک دن دونوں ملک ہندوستان
اور پاکستان متحد ہو جائیں گے۔ قائد اعظم کو بہ یک
وقت ہندوؤں کی اکثریت اور انگریزوں کی طاقت
سے ٹکرانا پڑا لیکن ان کے قدم جمے رہے اور ان
کے حریفوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ تحریک
خلافت کے روح رواں مولانا محمد علی کہا کرتے تھے
کہ ہندو دو چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔ گائے اور
ہندوستان کا نقشہ۔ اگست ۱۹۴۷ء میں یہ نقشہ بدل
گیا اور اس پر پاکستان کا نقشِ دوام قائم ہو گیا۔

قائد اعظم کی عظمت اور طاقت کا راز ان
کی ہمالیہ جیسی استقامت میں تھا جس کی وجہ سے
مسلمان عوام ان کی قیادت میں ایک جھنڈے کے
تلے جمع ہو گئے۔ اور ان کی ہر صدا پر لبیک کہتے ہوئے
آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ اپنی منزلِ مقصود
پر پہنچ گئے۔

حکیم الامت علامہ محمد اقبال نے مردِ مومن
کا جو تصور پیش کیا ہے، قائد اعظم اس کی عملی تصویر
تھے۔ مرنے سے دس مہینے پہلے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو
علامہ اقبال نے قائد اعظم کو جو خط لکھا تھا اس
کے چند جملے یہ تھے۔

"میں نے آپ کو اپنے خیالات سے اس لئے
مطلع کیا کہ آپ ان پر غور کریں اور مسلم لیگ کے آئندہ
سیشن میں اپنے صدارتی خطبے یا بحث مباحثے میں
ان پر نظر رکھیں۔ ہندوستان کے ہر مسلمان کو یہ
امید ہے کہ اس نازک موقع پر آپ اپنی فطری ذکاوت
اور ذہانت سے ان کی مشکلات کا حل تلاش کر لیں گے۔"

جمعیۃ العلمائے ہند نے مسلم لیگ اور پاکستان
کی مخالفت کی لیکن اسی جماعت سے قائد اعظم کی
اپیل پر مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع،
مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا عبدالماجد بدایونی
جیسے مقتدر حضرات نکلے اور پاکستان کے حامی
بن گئے۔

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جمعیۃ علمائے اسلام کا قیام
عمل میں آیا اور مولانا شبیر احمد عثمانی اس کے
صدر منتخب ہوئے، ان کی سیاسی بالغ نظری کا
اندازہ اس تقریر سے ہوگا جو انہوں نے مئی ۱۹۴۷ء
میں اعظم گڑھ کے ایک بہت بڑے جلسے میں کی تھی
اور جس میں قائد اعظم کا ذکرِ خیر ان الفاظ میں کیا۔

"مسٹر جناح مسلمانوں کے صحیح رہنما ہیں۔ مسلمان
رہبروں میں وہی سب سے زیادہ سیاست کے
داؤں پیچ سے واقف ہیں۔ نہ وہ کسی قیمت پر خریدے
جا سکتے ہیں اور نہ وہ کسی دباؤ کے سامنے سر
جھکاتے ہیں۔"

۱۴ اگست کو دستور ساز اسمبلی کی گیلری میں

بیٹھے ہوئے ہیں۔ سوچ رہا تھا کہ قائداعظم نے برصغیر کے مسلمانوں کو وہ عظمت رفتہ دلائی جو شہنشاہ اکبر کے دور میں حاصل ہوئی تھی جب مملکتِ خداداد پاکستان وجود میں آئی تو مسلمانوں کی ریاستوں میں سب سے بڑی اور دنیا کی ریاستوں میں پانچویں نمبر کی ریاست بنی۔

اکبر بادشاہ اور قائداعظم دونوں خطہ سندھ میں پیدا ہوئے۔ اکبر ریگستان کے کنارے پر اور قائداعظم سمندر کے کنارے پر دونوں نے مسلمانوں کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا کیا، ان میں خود اعتمادی پیدا کی اور انھیں بام عروج کی بلندیوں پر پہونچا دیا۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ قائداعظم کے 'نورتن' کون تھے تو میں انہیں لوگوں کے نام گناؤں گا جو ان کے قریب تھے۔ ان کی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح سب سے قریب تر تھیں اور ان کا مرتبہ نورتنوں سے بڑھ کر تھا۔ اکبر کی کسی بہن کا تاریخ میں تذکرہ نہیں ہے، البتہ اکبر کے والد ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کا تذکرہ ہے۔ جو صاحب طرز ادیبہ تھیں اور جن کی تصنیف "ہمایوں نامہ گلبدن بیگم" پڑھنے کے قابل ہے۔ قائداعظم کی بیگم "رتن بائی" کے انتقال کے بعد مس فاطمہ جناح ان کے ساتھ مستقل طور پر رہیں اور انھوں نے حق رفاقت ادا کر دیا۔ کراچی بوٹ کلب میں اگست ۱۹۴۷ء کے دوسرے ہفتے میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا تھا کہ "فاطمہ کی نگہداشت اور رفاقت کے بغیر میں وہ کام سرانجام نہیں دے سکتا تھا جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے لیا۔" میں اس مضمون میں تحریک پاکستان کے رہبروں کی فہرست مرتب نہیں کر رہا ہوں،

قائداعظم نے اکبر بادشاہ کی طرح اپنے مقربین کی نشاندہی نہیں کی، لیکن قائداعظم کے بارے میں مجھے جو واقفیت حاصل ہوئی اس کی بنا پر میں ان کے نورتنوں کی فہرست اس طرح مرتب کروں گا۔

(۱) قائد ملت لیاقت علی خاں جن کو قائداعظم نے اپنا دست راست کہا تھا۔

(۲) راجہ محمد امیر احمد خاں آف محمود آباد جو قائداعظم کو چچا اور مس جناح کو پھوپھی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

(۳) نواب بہادر یار جنگ جن سے قائداعظم اپنی انگریزی تقریروں کا اردو میں ترجمہ کراتے تھے اور انہیں سن کر خوش ہوا کرتے تھے۔

(۴) خواجہ ناظم الدین جو مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے اور قائداعظم کی وفات پر گورنر جنرل کی حیثیت سے ان کے جانشین بنے پھر قائد ملت کے بعد پاکستان کے وزیر اعظم بنے اور جنھیں گورنر جنرل غلام محمد نے برطرف کر کے جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا جس کے بعد وہ گوشہ نشین ہو گئے۔

(۵) سردار عبدالرب نشتر، جنھیں قائداعظم نے ایک مرتبہ "میر نشتر" کہہ کر ان کی عزت افزائی کی تھی۔ اور جنھوں نے سرحد میں سرخ پوشوں کا

زور توڑا اور رائے شماری سے پہلے صوبہ سرحد کے لئے پاکستان میں شمولیت کی راہ ہموار کی۔

(۶) میرٹھ کے نواب محمد اسمٰعیل خاں جن کی ایک نئی وضع کی ٹوپی قائداعظم کو بہت پسند آئی، نواب اسمٰعیل نے وہ ٹوپی نذر کے طور پر پیش کی۔ قائداعظم نے اسے اپنے سر پر رکھا اور اس دن سے وہ جناح کیپ کہلائی۔

(۷) آسام کے مسٹر عبدالمتین چودھری جنہوں نے سلہٹ کی رائے شماری میں پاکستان کی شمولیت کے لئے جد و جہد کی اور کامیاب ہوئے۔ وہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔

(۸) نواب محمد احمد سعید خاں جو چھتاری سے ہیں قائداعظم کے ساتھ سائے کی طرح رہے اور جن کی قیام گاہ کئی مرتبہ قائداعظم کا مسکن بنی۔

(۹) قاضی محمد عیسیٰ جن کے ساتھ قائداعظم بلوچستان میں قیام کرتے تھے۔ قاضی محمد عیسیٰ مرحوم نے قائداعظم کے کئی شفقت بھرے خطوط دکھلائے جن کو وہ اپنا سرمایۂ حیات کہتے تھے۔

اکبر کے نورتنوں میں دو عظیم شاعر تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں اور فیضی۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ میں نے قائداعظم کے نورتنوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس میں بھی دو شاعر تھے۔ ایک سردار عبدالرب جن کا تخلص نشتر اتنا مشہور ہوا کہ وہ ان کا نام بن گیا۔ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور اردو میں بھی۔ اور دوسرے راجہ امیر احمد خاں جنہوں نے غزلیں بھی کہی اور مرثیے بھی۔ میں جب ان کے برادر خورد مہاراج کمار امیر حیدر خاں سے کراچی میں ملا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ راجہ صاحب مرحوم کا کلام جمع کر رہے ہیں۔ خدا کرے کہ وہ جلد شائع ہو جائے۔ میں جب مرحوم سے آخری مرتبہ لندن میں ملا تھا اس وقت انہوں نے پانچ شعر لحن میں سنائے تھے وہ دل پر نقش ہو گئے

اٹھے گا اے چمن والو کلیجے سے دھواں برسوں
مٹا وہ ایک لمحے میں بنا جو آشیاں برسوں
نشیمن لٹ گیا دھبہ سا شاخِ گل پہ باقی ہے
رہے گا داغ دل میں کر نشانِ آشیاں برسوں
نوائے تو گرفتارِ محبت کیا مقابل ہو
زمانے کے اسیروں سے کہاں دو دن کہاں برسوں
یہ آرزو ہے کہ دل بھر کے آج رو لیجے
کہ کل یہ دیدۂ پرنم رہے رہے نہ رہے
ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوکِ گیاہ
مثالِ قطرۂ شبنم رہے رہے نہ رہے

(مابعد)" ـــــــــــــ

اگر "نورتن" کے بجائے میں قائداعظم کی "سیاسی الیون" کے نام گناتا تو دو ناموں کا اور اضافہ کرتا۔ (۱) ملک برکت علی جو ۱۹۳۷ء کے انتخاب میں صوبۂ پنجاب سے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور جہاں مسلمانوں کا وقار تھا۔ یہاں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے تھے اور ملک برکت علی ان میں سے ایک تھے (۲) مرزا ابوالحسن اصفہانی جنہوں نے قائداعظم کی جد و جہد اور ان کی عظیم شخصیت پر ایک بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔

قائد اعظم محمد علی جناح

از
جناب مرزا علی اظہر برلاس
سابق جنرل منیجر "ڈان" دہلی

۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کے ہندو مسلم معاہدہ نے محمد علی جناح کو مسلمانوں کا مسلمہ لیڈر منوا لیا تھا جس کا لوہا ہندو بھی مانتے تھے۔ اس سے پیشتر مسلمانوں میں لیڈروں کی کمی تو نہ تھی بلکہ اس قدر بہتات تھی کہ الامان و الحفیظ اور ان کی مختلف رائیں جو دراصل ذاتی مفادات اور آپس کی چپقلش پر مبنی ہوتی تھیں اور اس قدر ایک دوسرے سے متضاد اور متصادم ہوتی تھیں کہ سمجھدار مسلمان یہ کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ

ع۔ شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

غیر مسلموں میں ایک سے ایک بڑا لیڈر موجود تھا جن کی ہندوستان تو ہندوستان انگلستان میں بھی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ مثلاً دادا بھائی نوروجی، سر فیروز شاہ مہتا، گوکھلے، بال گنگا دھر تلک، سر سریندر ناتھ بنرجی، بپن چندر پال، سر تیج بہادر سپرو، سری نواس شاستری، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ وغیرہ وغیرہ

سر سید احمد خاں مرحوم کی پالیسی کے بموجب مسلمان سیاسی میدان سے اس قدر دور رہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں کوئی نمایاں سیاسی شخصیت نمودار نہیں ہوئی۔ نواب محسن الملک و نواب وقار الملک وغیرہ کی سر سید کے نظریہ کے مطابق زیادہ تر توجہ تعلیم پر مرکوز رہی۔ بلکہ تعلیمی دوڑ میں مسلمان اس قدر پیچھے رہ گئے تھے کہ سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ محسن الملک و وقار الملک نظام حیدر آباد کے پنشنر تھے۔ اور اس حالت میں ظاہر ہے کہ وہ کھل کر انگریزوں کے خلاف میدان سیاست میں نہیں آ سکتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ۱۹۰۶ء تک مسلمانوں کی سیاست برائے نام تھی۔ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی مگر دراصل وہ رئیسوں، جاگیرداروں اور تعلقداروں کی جماعت تھی جس کا عوام سے کوئی تعلق نہ تھا۔

سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن

ہندوستان میں سب سے پہلے جہاں تک مجھے علم ہے سید امیر علی مرحوم (مصنف "اسپرٹ آف اسلام" جو بعد کو رائٹ آنریبل اور پریوی کونسلر ہوئے) تھے۔ جنھوں نے مسلمانوں کی سیاسی زبوں حالی کو شدت سے محسوس کیا اور ہندوؤں کی سیاسی سبقت کو مد نظر رکھتے ہوئے ۱۸۷۷ء میں "نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ میں قائم کی اور جب اس کی تقریباً ۳۴ شاخیں ہندوستان بھر میں کھل چکیں تو اس کا نام "سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" رکھا (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے اپنی تازہ ترین کتاب "کشمکش برائے پاکستان" کے صفحہ ۳۱ پر لکھا ہے کہ مسلمانوں نے ۱۹۰۶ء تک جب مسلم لیگ قائم ہوئی ہے۔ کوئی سیاسی جماعت نہیں بنائی تھی مگر واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔) سید امیر علی کی ذہانت اور سیاسی سوجھ بوجھ کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے آل انڈیا نیشنل کانگریس سے آٹھ سال قبل مسلمانوں کی سیاسی جماعت قائم کردی۔ جب کہ کانگریس کو ایک انگریز اے۔ ڈبلو ہیوم (آئی۔ سی۔ ایس پنشنر) نے ۱۸۸۵ء میں قائم کیا سرسید احمد خاں ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج قائم کر چکے تھے۔ اور وہ تعلیمی مسائل میں اس قدر الجھے ہوئے تھے اور شاید اس وقت تک دہلی اور یو۔پی کے مسلمانوں میں ۱۸۵۷ء کی خون ریزی کے بعد سے جو انگریزوں سے دلی نفرت پیدا ہوگئی تھی اس کو دیکھتے ہوئے انہوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ مسلمانوں کو سیاسی میدان میں لے آئیں جب تک کہ وہ ہندوؤں اور پارسیوں کے ساتھ تعلیمی دوڑ میں قدم ملا کر نہ چل سکیں۔ بہر حال سید امیر علی نے نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کرکے مسلمانوں کو تقاضائے وقت کے مطابق عملی سیاست میں حصہ لینے کی طرف متوجہ کیا ۱۸۸۵ء میں کانگریس قائم ہوئی مگر مسلمان سرسید کے زیر اثر کانگریس سے من حیث المجموع الگ تھلگ رہے۔

مسلم ڈیفنس ایسوسی ایشن

ہندو جاتی جو موقع سے فائدہ اٹھانے میں جواب نہیں رکھتی اور جس نے ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمتے ہی انگریزوں سے ساز باز کرکے مسلمانوں کو نیچا دکھا دیا تھا اب انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعہ جس کا بانی انگریز تھا۔ آنے والی اصلاحات سے جس کی سُن گُن اس کو لگ چکی تھی زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے اور مسلمانوں کو نقصان پہونچانے کے لئے اس نے انگریزوں پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیئے۔ اس دوران سرسید کی بھی آنکھیں کھل چکی تھیں اور ہندو مسلم اتحاد کا خواب جو وہ دیکھتے تھے اس کو زمانے کی زد و خورد نے خواب پریشان بنا دیا تھا۔

مجبوراً سر سید نے بھی مسلم ڈیفنس ایسوسی ایشن کانگریس کے علی الرغم قائم کردی۔

انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء

۱۸۹۲ء میں جب انڈین کونسل ایکٹ پاس ہوا اور وائسرائے کی کونسل کی توسیع ہوئی تو اس وقت مسلمان سیاست دانوں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۸۸۳ء میں سید امیر علی وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے (اس کے پہلے وہ بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممبر رہ چکے تھے) مگر ۱۸۹۲ء میں ہائیکورٹ کے جج مقرر ہونے پر اس دانشور کی ساعی جمیلہ سے مسلم قوم محروم ہو گئی۔

یہ ہلکا سا سیاسی خاکہ اس لئے پیش کیا گیا کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں مسلمان سیاست دانوں کی کمی کا سبب سمجھ میں آسکے۔ اس دور میں ہز ہائینس آغا خاں مرحوم جنھوں نے ۱۹۰۶ء میں لارڈ منٹو وائسرائے کے سامنے شملہ وفد کی قیادت کی تھی اور سید علی امام مرحوم (جو بعد کو سر اور وائسرائے کی کونسل کے پہلے مسلمان ممبر قانون ہوئے) کے علاوہ کوئی دوسرا مسلمان کل ہند سیاسی اسٹیج پر نمایاں نظر نہیں آتا۔

ابتدائی تعلیم کا قانون

گوکھلے مشہور ہندو لیڈر نے ابتدائی تعلیم کا مسودہ قانون امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں پیش کیا تو اس وقت مسٹر جناح نے بحیثیت مسلمانان بمبئی کے نمائندے کے اس کی بڑی زور دار حمایت کی اور اب مسٹر جناح آل انڈیا مسلم لیڈر کی حیثیت سے نمایاں ہو گئے۔

وقف علی الاولاد ۱۹۱۳ء

محمد علی جناح کا نام بحیثیت اعلیٰ درجہ کے مقنن کے پہلی مرتبہ ۱۹۱۳ء میں وقف علی الاولاد کے سلسلہ میں سنا گیا اور انہوں نے اپنی قانونی مہارت کا ثبوت دے کر پریوی کونسل کے اس فیصلہ کو جس کی رو سے مسلمانوں کے وقف علی الاولاد کو ناجائز قرار دیا گیا تھا، مرکزی اسمبلی میں قانون پاس کرا کے کالعدم کرا دیا اور اس طرح سے مسلمانوں کے کروڑہا روپیہ کے اوقاف کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

ہندو مسلم معاہدہ (۱۹۱۶ء)

قانونی حیثیت سے تو مسٹر جناح کی قابلیت اور ذہانت ہندوستان بھر میں مسلّم ہو چکی تھی۔ سیاسی میدان میں ابھی تک کوئی شخصیت ایسی نہ تھی جس کا لوہا ہندو بھی مانتے۔ جناح کٹر کانگریسی تھے۔ طالب علمی کے زمانہ میں جناب دادا بھائی نوروجی پارلیمنٹ کا انتخاب لڑے تو نوجوان جناح نے ان کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ بیرسٹری پاس کر کے جب ہندوستان پہونچے تو سر فیروز شاہ مہتا کو اپنا سیاسی گرو سمجھنے لگے۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تو اس کو فرقہ وارانہ جماعت سمجھ کر اس سے بالکل الگ تھلگ رہے یہاں تک کہ جب مولانا محمد علی مرحوم اور سید وزیر حسن مرحوم نے (جو بعد کو "سر" اور اودھ چیف کورٹ کے چیف جج ہوئے) ۱۹۱۳ء میں لندن میں لیگ کا ممبر بننے کے لئے اصرار کیا۔ تو بجبر و اکراہ لیگ کی رکنیت منظور تو کی مگر اس شرط کے ساتھ کہ اگر کوئی تجویز ایسی پاس کی گئی جو ہندوستان کے

متحدہ قومی نظریہ کے خلاف ہوئی تو وہ الگ ہو جائیں گے اس وجہ سے ممبر بنتے ہی انہوں نے انتہائی کوشش کی کہ لیگ اور کانگریس کے اختلافات دور ہو جائیں۔ اور دونوں متحد ہو کر برٹش گورنمنٹ کا مقابلہ کریں۔ ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں تو عرصہ سے جاری تھیں مگر ہندوؤں کی اڑنگے بازیوں کے خلاف مسلمانوں کی ایک نہ چلتی تھی۔ سب تھک کر بیٹھ گئے تھے۔ مظفر الحق مرحوم جو اس زمانہ کی نمایاں ہستی تھی اور جنہوں نے ہندوؤں کا بہت ساتھ دیا تھا وہ بھی تھک کر صداقت آشرم میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ جناح نے اتحاد کی کوشش جب شروع کی تو لوگ مذاق اڑانے لگے کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ جہاں بڑے بڑے "بقراط" شکست کھا گئے ہوں وہاں "یہ نوخیز صاحبزادے" کیا کر پائیں گے۔ مگر تین برس کی مسلسل کوشش کے بعد جب ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کے اجلاس میں ہندو مسلم معاہدہ ہو گیا تو ہندوستان کے کونے کونے میں مسٹر جناح کا نام لیا جانے لگا اور ان کی شخصیت کی ہمہ گیری تسلیم کر لی گئی۔

ابھی تک میں نے مسٹر جناح کا نام سنا تھا مگر زیارت نہیں ہوئی تھی۔ ہوسٹل میں دن رات جناح کا تذکرہ رہتا تھا۔ ان کی قابلیت اور ذہانت کے مختلف قصے سننے میں آتے تھے۔ اور بلا پس و پیش یقین کر لئے جاتے تھے۔ کہیں انہوں نے تقریر کی اور ہوسٹل (کلکتہ کا مشہور بیکر ہوسٹل (BAKER HOSTEL) میں ہر لڑکا اخبار لئے فقروں کی چستی، ظرافت کی چاشنی اور انگریزی محاوروں کی برجستگی پر سر دھن رہا ہے اگرچہ کسی کی سمجھ میں خاک نہیں آتا تھا کہ انھوں نے کیا کہا اور صحیح کہا یا غلط مگر چونکہ جناح مسلمانوں کے لیڈر تھے اور انہوں نے ہندوؤں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا تھا اس لئے ہر لڑکا اپنا فرض کفایہ سمجھ کر ان کے ہر فقرے کو دہرا دہرا کر سر دھنتا تھا۔

اجلاس مسلم لیگ (کلکتہ ۱۹۱۷ء)

کچھ عرصہ سے مسلم لیگ کانگریس کا پُر چھلاوا بن گئی تھی۔ دونوں کا اجلاس ایک ہی شہر میں اور ہر ہی زمانہ میں ہوتا تھا تاکہ ہندو اور مسلمان لیڈروں کو دونوں جماعتوں میں شرکت کی آسانی ہو سکے۔ ۱۹۱۷ء میں حسب دستور مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں ہوئے۔ لیگ کے جلسے ہالیڈے (HOLIDAY) پارک (جو شاید اب مولانا محمد علی پارک کہلاتا ہے) میں ہوئے۔ لیگ کے منتخب صدر مولانا محمد علی تھے مگر چونکہ وہ چھندواڑہ میں قید تھے۔ اس لئے کرسی صدارت پر سیاہ چادر ڈال دی گئی تھی اور مولانا محمد علی کی تصویر کرسی پر رکھ دی گئی تھی۔ خطبۂ صدارت راجہ محمد علی محمد خاں صاحب والی محمود آباد (جو بعد کو مہاراجہ ہوئے) نے پڑھا۔

پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور مجمع کی بیچینی کا عجیب عالم تھا۔ سر رضا علی۔ نواب محمد اسحٰق خاں۔ مولوی فضل الحق۔ المامون عبد اللہ سہروردی۔ سروجنی نائیڈو۔ بپن چندر پال مولوی ابوالقاسم بردوانی مولوی اکرم خاں وغیرہ وغیرہ ڈائس پر موجود تھے۔ اتنے میں ڈائس کے پشت پر سے محمد علی جناح اور بال گنگادھر تلک

ہودار ہوئے۔ پھر کیا تھا مارے تالیوں کے پنڈال گونج
اٹھا۔ جناح بہترین سوٹ میں ملبوس تھے۔ دو قدم آگے
بڑھے اور ایک خاص انداز سے سر جھکا دیا۔ یعنی
خوش آمدید کا جواب BOW سے دیا۔ اس نوجوان
نے (اگرچہ جناح کی اس وقت عمر چالیس سے متجاوز
ہو چکی تھی مگر چہرے سے نوجوان ہی معلوم ہوتے تھے۔)
رئیسانہ ٹھاٹھ، گورا رنگ بلکہ میدہ وشہاب، چمکیلی اور
دل میں اتر جانے والی آنکھیں اور ہونٹوں پر ہلکی سی
مسکراہٹ کے ساتھ، جب مجمع کا انداز کج ادائی سے
سر جھکا کر شکریہ ادا کیا تو پنڈال لوٹ پوٹ ہو گیا اور
مسٹر جناح کی تقریر کے لئے پورے مجمع نے پنڈال سر پر
اٹھا لیا۔ مجبوراً جناح آگے بڑھے اور دائیں بائیں دیکھ کر
سر رضا علی مرحوم (جو برابر میں بیٹھے تھے) کے سر
ترکی ٹوپی اُچک لی اور خود پہن لی اور تقریر شروع کر دی۔
اس جسارت بیجا سے سر رضا علی بھی چونک پڑے مگر
خفا ہونے کے بجائے ہنسنے لگے اور مجمع بھی اس جرأت
رندانہ یا انداز دلربائی سے جناح پر فریفتہ ہو گیا۔

بیکر ہوسٹل ڈیوٹی شاپ

پہلی نشست ختم ہوئی اور مولوی
ابو القاسم مرحوم اور فضل الحق مرحوم نے جن سے
میں پہلے ہی ساز باز کر چکا تھا کہ وہ مسٹر جناح کو
ہماری ڈیوٹی شاپ (بیکر ہوسٹل ڈیوٹی شاپ) میں
لے آئیں گے۔ آگے بڑھ کر انہیں میرے سپرد کر دیا۔ اس
وقت وہ بال گنگا دھر تلک کے ساتھ ہندوستان کی
ڈیفنس پالیسی پر گفتگو کر رہے تھے۔ دونوں بحث
مباحثہ میں گتھے ہوئے میرے پیچھے پیچھے آ گئے۔ ان کا
آنا تھا کہ سب کو دیکھئے جناح کو پوچھتا ہوا ہماری طرف
چلا آ رہا ہے۔ ....
.... سروجنی
نائیڈو نے بھی ناز و انداز سے جناح کو پوچھا اور ان کے
پہلو میں بیٹھ کر چہکنے لگیں۔ یوں بے تکلفی کے ساتھ
دونوں کو بیٹھا دیکھ کر ان کے باہمی اخلاص کے مختلف
قصے سننے میں آئے۔

جناح اور تلک

مسٹر جناح کے ساتھ بال گنگا دھر تلک کو دیکھ کر
حیرت ہوتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔
جناح کی اعلیٰ پوشاک ان کے مردانہ حسن کو دوبالا کرتی
تھی جبکہ وہ تو چلتے پھرتے اور بولتے چالتے نقاضیں
تھے کہ جدھر سے نکل گئے سب کے چہرے بے ساختہ
ان کی طرف مڑ گئے۔ بخلاف اس کے تلک TILAK
انتہائی متعصب اور متشدد ہندو تھا جس نے سب سے
پہلے شیواجی کا تہوار منا کر ہندو مسلم فسادات
کی باضابطہ نیو رکھ دی۔ چہرہ بھی اندرونی قساوت کا
آئینہ تھا۔ جھلسا ہوا رنگ، چہرے پر جھریاں پڑی ہوئیں
سر پر مرہٹوں کی کھڑکی دار پگڑی، کھدر کا کرتہ اور
مرہٹی انداز سے بندھی ہوئی دھوتی چھوٹا قد مگر
گفتگو اور چال ڈھال سے عزم کی پختگی اور عزم
احتیاط نمایاں تھی۔ مسلمانوں کا دشمن جانی تھا مگر جناح
کا ممنون احسان اس لئے تھا کہ جب گورنمنٹ نے اس
کے اخبار "کیسری" کے سلسلہ میں تلک پر مقدمہ چلایا تو

مسٹر جناح نے مفت پیروی کی تھی۔ اس لئے ان کا ادب اور لحاظ کرتا تھا۔

کانگریس کا خصوصی اجلاس کلکتہ

سنہ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کا اجلاس خصوصی لالہ لجپت رائے کی صدارت میں کلکتہ کے ولنگٹن پارک میں ہوا۔ ہندوستان بھر کے چوٹی کے لیڈر موجود تھے۔ میں بحیثیت رضاکار کے ہر ایک لیڈر کی گاڑی کا دروازہ بصد تبختر و افتخار کھولتا اور مارے خوشی کے پھولے نہ سماتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا و مافیہا کی عزت و توقیر اسی فرض منصبی میں ہے۔ مسٹر جناح بھی مع اپنی بیگم صاحبہ کے تشریف لائے۔ بیگم صاحبہ سرخ و سفید نازک چہرہ۔ چھریرا بدن۔ بوٹا سا قد سرخ ساڑی میں لپٹی ہوئی تھیں۔ ہر شخص دلی احترام کے ساتھ ٹکٹکی باندھے ان کو دیکھ رہا تھا

ترک موالات کی تحریک

گاندھی جی نے ترک موالات کا شہرۂ آفاق رزولیوشن پیش کیا۔ مگر مسٹر جناح نے کھڑے ہو کر اس کی مخالفت کی۔ لوگوں نے بڑا شور و شغب کیا۔ کہ جناح تقریر نہ کر سکیں مگر وہ بات کے دھنی تقریر کر کے ہی ہٹے۔ تقریر معرکۃ الآرا ہونے کے علاوہ عجیب مؤثر انداز میں کی گئی تھی۔ دوران تقریر مسٹر جناح ایک خاص دلکش انداز سے رومال سے اپنا منہ پونچھتے اور ہلکی سی جنبش دے کر بائیں ہاتھ کی آستین میں گھڑس لیتے تھے۔ مسٹر جناح کی مخالفت کے باوجود گاندھی جی کا ترک موالات کا رزولیوشن پاس ہو گیا۔

کانگریس کا سالانہ اجلاس سنہ ۱۹۲۰ء

ناگپور میں گاندھی جی نے اسی سال ناگپور کے سالانہ اجلاس میں ترک موالات کی تجویز حسب قاعدہ دوبارہ پیش کی اور اس عرصہ میں پنڈت موتی لال نہرو اور سی۔ آر۔ داس کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ مولانا محمد علی بھی گاندھی جی کے دمساز تھے۔ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی کی وہ نشست میری نظروں میں پھرتی ہے جس میں مولانا محمد علی نے تجویز کی موافقت اور مسٹر جناح نے اس کی مخالفت کی۔ دونوں با اثر لیڈر اور انگریزی کے بہترین مقرر تھے۔ کوئی کسر کسی نے اٹھا نہیں رکھی۔ مگر یہ صاف ظاہر تھا کہ مولانا کی جذباتی تقریر کے جواب میں مسٹر جناح کے منطقی دلائل کو دماغ تو قبول کرتا ہے مگر دل ماننے کو تیار نہیں۔ گاندھی جی کی راہبانہ زندگی کے جادو اور مذہبی ملمع سازی نے جناح کی ایک نہ چلنے دی۔ اور تجویز پاس ہو گئی۔ پھر جناح صاحب نے ہمیشہ کے لئے کانگریس کو خیرباد کہہ دیا اور وہ پھر کبھی کانگریس کے پلیٹ فارم پر دکھائی نہیں دیئے۔

مسٹر جناح کی لندن میں وکالت

سنہ ۱۹۳۱ء میں مسٹر جناح نے

سیاسی اکھاڑ پچھاڑ سے اکتا کر ہندوستان کو چھوڑ دیا اور لندن میں مقیم ہو گئے اور پریوی کونسل میں بیرسٹری کرنے لگے۔ ہیکٹر بولائتھو نے اپنی کتاب "جناح معمار پاکستان" میں بیگم لیاقت علی خاں کی زبانی لکھا ہے کہ ان کے شوہر نے ۱۹۳۳ء میں لندن میں مسٹر جناح پر زور دیا کہ وہ ہندوستان جا کر مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں کیونکہ لیگ کمزور ہو چکی تھی۔ اور اس میں کوئی سکت باقی نہ رہی تھی۔

مسٹر لیاقت علی خاں کے خیال میں جناح ہی ایک ایسے شخص تھے جو خریدے نہیں جا سکتے تھے۔ اور وہی لیگ اور مسلمانوں کو بچا سکتے تھے۔ انہوں نے میرے ایک دوست سے علامہ اقبال کی بھی یہی رائے بیان کی کہ خداوند عالم جب چاہے گا جناح کے دل میں ڈال دے گا اور وہی مسلمانوں کو اس ابتلا سے بچائے گا۔ کوئی دوسرا شخص مجھے دکھائی نہیں دیتا۔

لندن سے واپسی

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پاس ہونے کے بعد مسٹر جناح مسلمانوں کے اصرار پر لندن سے ہندوستان لوٹے اور مسلمانوں کی قیادت سنبھالی۔ جب ۱۹۳۶ء کے سالانہ اجلاس کا سوال آیا تو علامہ اقبال نے انتہائی کوشش کی کہ لاہور میں منعقد ہو مگر سر سکندر حیات خاں کی مخالفت کی وجہ سے جو اس وقت پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے لاہور میں لیگ کا اجلاس نہ ہو سکا۔ علامہ اقبال نے مجبوراً مسٹر جناح کو مطلع کر دیا۔ انھوں نے فوراً راجہ امیر احمد خاں صاحب مرحوم والئی محمود آباد کو لکھا کہ لکھنؤ میں انتظام ہو جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ راجہ صاحب موصوف نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے لیگ کا اجلاس دیانندھان پارک۔ لال باغ لکھنؤ میں کیا اور لیگ پر روپیہ کی بارش شروع کر دی۔

لکھنؤ کا اجلاس

۱۹۳۷ء کا لکھنؤ لیگ کا اجلاس مجھ کو یاد ہے۔ ہندوستان بھر کے مسلمان لیڈر جمع تھے۔ پنجاب سے سر سکندر حیات خاں۔ راجہ غضنفر علی خاں ملک برکت علی۔ مولانا ظفر علی خاں وغیرہ بنگال سے مولوی فضل الحق۔ عبدالمومن چودھری وغیرہ شریک ہوئے تھے۔ سر سکندر نے مسٹر جناح سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اپنی گورنمنٹ کے مسلمان ممبروں کو لیگ کا ممبر بنا دیں گے مگر جب لاہور پہنچے تو سب وعدے بھلا دیئے۔ چنانچہ ملک برکت علی مرحوم نے جو سچے مسلم لیگی تھے بڑا اچھا فقرہ کسا کہ سکندر حیات پنجاب کے باہر مسلم لیگی ہیں اور پنجاب کے اندر یونینسٹ ہیں۔"

سید حسین مرحوم

اس اجلاس میں سید حسین مرحوم (انڈیپنڈنٹ کے ایڈیٹر بھی) آ گئے۔ مولانا شوکت علی مرحوم نے بڑھ کے پیار کیا اور گلے سے چمٹا لیا۔ مجمع نے تقریر کرنے پر اصرار کیا۔ مسٹر جناح نے کارروائی جلسہ روک کر تقریر کی اجازت دے دی۔ سید حسین جو کھڑے ہوئے تو مسلم لیگ کی بھرپور مخالفت کی جو

کچھ کہہ سکتے تھے کہ ہندو قوم کے ... ہوتے تھے۔ لیکن سید حسین کو کیا ہو گیا ہے۔ انہوں نے تو اسی گنگا بہادی جانے والوں سے مسکرا کر کہا کہ بھئی، تم لوگ بچے ہو، تم کیا جانو۔ یہ ... نہیں، یہ کشمیری پنڈت بول رہے ہیں۔" تقریر ختم ہوئی تو سید صاحب نے اپنی کاپی اٹھائی اور صرف اتنا کہا "ایجنڈے کی دوسری شق چلئے" پیش ہوئی۔ کارروائی شروع ہو گئی۔ پھر سید صاحب اجلاس سے رخصت ہوئے۔ اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی پوری قوم نے انہیں بھلا دیا۔ اور اسی اجلاس کے بعد سے پوری قوم نے مسٹر جناح کو محبت سے قائداعظم کہنا شروع کر دیا۔

قائداعظم کی دور بینی

یوں تو قائداعظم کی ذہانت اور دور بینی کے سیکڑوں واقعات ذہن میں آتے ہیں۔ جو خالی از طول نہیں۔ مگر ایک واقعہ ضرور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جب مسٹر اٹیلی ATTLEE وزیر اعظم انگلستان نے قائداعظم، پنڈت جواہر لال نہرو، نوابزادہ لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو سنگھ کو دسمبر ١٩٤٦ء میں لندن بلایا اور وہاں سے جواہر لال نہرو کو شکست دینے کے بعد اور اپنی رائے کی برٹش کیبنٹ سے تصدیق کرانے کے بعد قائداعظم لوٹے تو قاہرہ (مصر) میں وہاں کے وزیر اعظم نحاس پاشا سے ملاقات ہوئی۔ چلتے وقت قائداعظم نے نحاس پاشا سے کہا کہ "ہندوؤں کی چال بازیوں سے ہوشیار رہیے گا۔ کانگریس صرف ہندوستان کی آزادی نہیں بلکہ مسلمان ملکوں کو غلام بنانے کا خواب دیکھ رہی ہے۔" ہندوؤں کی ذہنی کیفیت کو قائداعظم نے کس قدر صحیح سمجھا تھا۔ بھارت کے ہندو اس وقت جس منصوبے پر عمل کر رہے ہیں اس کو قائداعظم سمجھ چکے تھے اور اسی وقت پاکستان کو قائم کر کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے فتنے سے محفوظ کر دیا تھا۔

پاکستان پائندہ باد
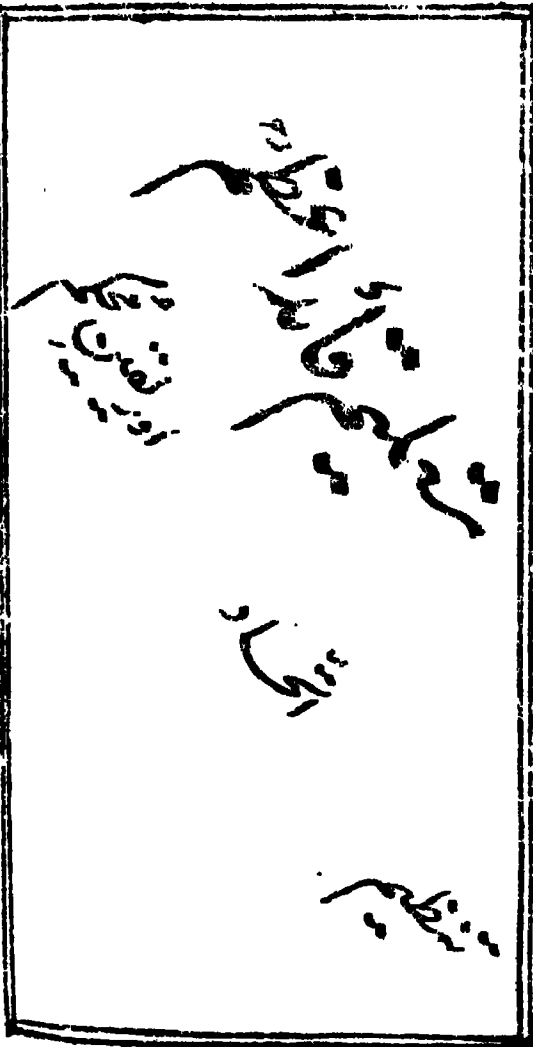
مولانا شرر لکھنوی اور پاکستان کا بنیادی تصوّر

از

(جناب نادم سیتاپوری)

متحدہ قومیت اور اکھنڈ بھارت کی بنیاد
پر انگریزوں نے برصغیر پر کئی صدیوں تک "لڑاؤ اور
حکومت کرو" کا پرچم لہرایا لیکن یہ کھوکھلے نعرے
زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے مسلمان تو مسلمان
خود ہندوؤں کو ان کے "بے جان" ہونے کا یقین ہونے
لگا۔ چنانچہ آل انڈیا کانگریس کے "کراچی سیشن" میں
ایک تجویز پاس کی گئی ہندوستان کو اکیس لسانی
منطقوں میں تقسیم کردیا جائے۔ اس تجویز میں پہلی بار
مانوں کے ثقافتی اور تہذیبی وجود سے انکار کرتے
وئے پنجابی، سندھی، پشتو، اردو اور اسی قسم کی
تمام دوسری زبانوں کے وجود سے انکار کردیا جن پر
ربی اور فارسی زبانوں کے اثرات کا غلبہ تھا۔ "کراچی رزولیوشن"
ے ذریعہ ایک تیر سے دو شکار کئے گئے تھے۔ ایک تو اردو
بان کا خاتمہ دوسرے آریائی بولیوں کو فروغ دے کر
انی تعصبات کا زہر پھیلایا گیا تھا۔ حالانکہ یہ مقامی
لیاں یہاں نہ تو "علم اللسان" کی رو سے کسی زبان
ا درجہ رکھتی تھیں اور نہ ان کا کوئی ادب تھا۔
ن بولیوں میں زیادہ تر وہ آریائی بولیاں تھیں
ڈاکٹر گنا ولی بان کی تحقیق کے مطابق ڈھائی سو

تک پہنچ چکی تھیں۔ کراچی رزولیوشن جو لسانی منطقوں "
درحقیقت ایک تقسیم نامہ تھا جب سے کانگریس کے کھلے اجلاس
میں پیش کیا گیا تو ایک کھلبلی سی مچ گئی اور اس کا
اندیشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں اس تقسیم نامہ کے ردعمل کی
وجہ سے ہندو سامراج کسی بحران کا شکار نہ ہوجائے!
اس لئے اس تجویز کو آئینی زد سے بچانے کے لئے نہ تو
کسی قسم کی رائے شماری کرائی گئی اور نہ کانگریس کی "لسانی
پالیسی" پر تنقید کی اجازت دی گئی یہاں تک کہ اس
قرارداد کو آل انڈیا کانگریس کی دفعہ چار میں جگہ دے کر
بستۂ خاموشی میں دبا دیا گیا اور برسہا برس کانگریس
نے کراچی رزولیوشن کا نام تک نہیں لیا۔ "تحریک
پاکستان" کے سلسلہ میں کانگریسی لیڈر مختلف زاویوں
سے اس لسانی پالیسی کا پرچار تو کرتے رہے مگر
بھارت میں "لسانی صوبوں" کی تشکیل تقسیم ہند کے دس
برس بعد عمل میں آئی۔ ریاست حیدرآباد دکن کے
ٹکڑے کر کے مہاراشٹرا اور مدھیہ پردیش وغیرہ میں
شامل کردیئے گئے۔ اور مملکت آصفیہ کا نام بدل کر
آندھرا پردیش کردیا گیا۔
"کراچی رزولیوشن" باوجود کھٹکھٹانے میں الجھا ڈالا گیا۔

لیکن مشہور کانگریسی لیڈر مولانا عبید اللہ سندھی ۱۹۲۲ء میں تقسیم کی ایک نئی تجویز سامنے لے آئے جس کے تحت "اکھنڈ بھارت" کو ریاست ہائے امریکہ و ریاست ہائے بلقان کی طرح بہت سی "خود مختار" ریاستوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پیش کیا گیا تھا تاکہ ایشیا میں مغرب کے ناکام اور ناقص جمہوری نظام سے نجات حاصل کرکے یہاں کے رہنے والوں میں ایک باوقار زندگی اور آزادی کی صلاحیت پیدا کی جا سکے۔ مگر جن حلقوں سے یہ آواز اٹھی تھی انھوں نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دبا دیا۔ اور آج اس منصوبے کے آثار ہماری نئی تاریخوں میں بھی نہیں ملتے۔

"تقسیم ہند" کا سب سے زیادہ مفصل اور جامع منصوبہ حکیم الامت ڈاکٹر اقبال کے اس تاریخی خطبۂ صدارت کے سالِ دو برس کے اندر ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے پیش کیا تھا جو ڈاکٹر اقبال نے مسلم لیگ کے الہ آباد سیشن میں پیش کیا تھا۔ چودھری رحمت علی نے اس سلسلہ میں دو کتابیں ۱۔ ملت اسلام اور ہندوستانیت کی لعنت۔ ۲۔ ملت اور اس کا مشن بھی تصنیف کی تھیں جن میں اعداد و شمار سے ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمان اپنی تہذیبی اور ثقافتی روایات کے اعتبار سے ایک علیحدہ قوم کا درجہ رکھتے ہیں اور انھیں حق حاصل ہے کہ وہ ان علاقوں پر ایک خود مختار ریاست قائم کریں جہاں وہ اکثریت میں ہیں۔

حکیم الامت ڈاکٹر اقبال کی زندگی میں تخمیناً ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں نے بھی "تقسیم ہند" کا ایک خاکہ پیش کیا تھا جس میں ہندوستان کو سات متجانس حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

ایسی ہی دو تجویزیں علی گڑھ کی طرف سے بھی سامنے لائی گئیں جنھیں "علی گڑھ اسکیم" نمبر ۱-۲ کا نام دیا جاتا ہے۔ علی گڑھ اسکیم نمبر ایک پروفیسر سید ظفر الحسن اور ڈاکٹر افضال حسین قادری نے پیش کی تھی اور دوسری اسکیم ڈاکٹر قاضی سعید الدین کے نام سے موسوم ہے۔ ان دونوں اسکیموں میں "تقسیم ہند" کے ان بنیادی مضمرات کا ذہن موجود ہے جو "تحریک پاکستان کی روح"

مطالبۂ پاکستان کی تائید میں حیدرآباد دکن کے ڈاکٹر عبد اللطیف نے بھی ایک منصوبہ بنایا جو حیدرآبادی اسکیم کے نام سے موسوم ہے۔ اس اسکیم کے تحت ہندوستان کو طبعی اعتبار سے پندرہ منطقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

آسام کے مشہور مسلم لیگی رہنما سر سعد اللہ مرحوم نے بھی تقسیم ہند کا ایک خاکہ بنایا تھا جو "سر سعد اللہ اسکیم" کہلاتا ہے۔ آسام کے سر سعد اللہ مرحوم نے یہ اسکیم آبادی کی بنا پر ترتیب دی تھی۔ اور وہ چاہتے تھے کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمان جلد سے جلد ان حصوں میں جاکر آباد ہو جائیں۔ تاکہ سیاسی۔ اقتصادی اور سماجی کشمکش ختم ہو جائے۔

سر سکندر حیات کے علاوہ ایک پنجابی بزرگ نے اپنی کتاب "کانفیڈریشن آف انڈیا" میں ہندوستان کو پانچ منطقوں میں تقسیم کر دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ اور مضبوط دلائل کے ساتھ تحریک پاکستان کی پرزور تائید کی تھی۔

لیکن یہ تمام اسکیمیں، تجاویز اور منصوبے ڈاکٹر
اقبال کے خطبۂ صدارت کی بنا پر تیار ہوتے رہے اور
مختلف لوگوں نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے تحریک پاکستان
میں زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور یہ سب افراد
اپنے مخلصانہ جذبہ کی چھاؤں میں شکریے کے مستحق ہیں
اور تحریک پاکستان انہیں ہمیشہ خراج تحسین پیش کرتی
رہے گی۔

تحریک پاکستان مسلمہ طور سے ردعمل تھا ماضی کے
ان تاریخی حقائق کا جس کے پیچھے "شام راج" اور "رام
راج" کی ایک گہری سازش رقص کناں تھی۔ انگریزوں
نے ہندوستان کا اقتدار اعلیٰ دلی۔ بنگال۔ میسور
اور لکھنؤ کے مسلمان حکمرانوں سے جبراً چھینا تھا۔ اور
ان کا دل دماغ مسلمانوں کی کدورت سے بھرا ہوا تھا۔
اس لئے وہ "پاکستان تحریک" سے کسی طرح ہم آہنگ
نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے مقابلے پر "ہندو
سامراج" کو ہندوستان کے اقتدار اعلیٰ کی چابی سپرد
کر دینے پر تیار رہتے تھے۔

ان بنیادی حقائق کی روشنی میں جب اس
ردعمل کا جائزہ لیا جائے گا تو اس کے پیچھے ایک ہی مہیب
چہرہ نظر آئے گا ——— "ہندو سامراج"

اس چہرے پر چاہے رواداری کی نقاب پڑی
ہو یا سیکولرازم کا پردہ۔ ہندو تاریخ کے ہر دور میں
ہندو ہندو ہی ثابت ہوتا رہا۔ انقلاب سن ستاون
کے بعد مسلمان جس سیاسی اور سماجی پستی کا شکار ہو چکا
تھا۔ اس نے کم و بیش چالیس برس تک ان میں صحت مند
سیاسی شعور پیدا نہیں ہونے دیا۔ اس دور میں گو کئی
مسلم تحریکوں نے جنم لیا۔ مگر حالات نے ان کا ساتھ نہیں
دیا۔ اس دور کی صحافت بھی کچھ زیادہ جاندار نہیں تھی۔
لیکن اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کی سیاسی
سطح اتنی پست بھی نہ تھی کہ وہ آنے والے خطرات سے
بے خبر تھے۔

تقسیم ہند کی یہ تجاویز اور تحریک پاکستان کا
جامع منصوبہ جو آج "مملکت خداداد" کی شکل میں سامنے
آچکا ہے۔ اس کے بارے میں شاید آج اس حقیقت
کے جاننے والے کم ہی ہوں گے کہ اس کا بنیادی تصور
پاکستان بننے سے نصف صدی پہلے اردو کے مشہور
صحافی، ادیب اور ناول نگار مولوی عبدالحلیم شرر
لکھنوی نے پیش کیا تھا۔ جو اس زمانہ میں ایک ہفت
روزہ "مہذب" (لکھنؤ) کے نام سے نکال رہے تھے۔

اب سے تیس سال قبل میں نے تحریک پاکستان
پر ایک مدلل و مبسوط اور ضخیم کتاب "ہمارا پاکستان"
لکھی تھی۔ جو چھپتے ہی حکومت ہند نے ضبط کر لی۔ اور
اس کتاب کے تمام چھپے ہوئے نسخے پولیس اٹھا لے گئی۔
میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ خاموش ہو کر بیٹھ رہا لیکن
اپنی دیرینہ عادت کے مطابق میں اس موضوع پر تحقیقی
کام کرتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے لکھنؤ میں ہفت روزہ
"مہذب" کے کچھ بوسیدہ شمارے مل گئے۔ انھیں الٹ
پلٹ کر دیکھا۔ تو اس میں مولانا شرر کا ایک اداریہ
نوٹ مل گیا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ اسی دن حیدر آباد
دکن سے میرے ایک دوست مولوی عبدالرزاق راشد

(D.C.H.) کا خط آیا جس میں انھوں نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اس تاریخی خطبے کے متعلق کچھ باتیں پوچھی تھیں۔

مولانا عبد الرزاق راشد حیدر آبادی (وفات ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۷ء) اقبال کے اُن پرستاروں میں تھے جنھوں نے ڈاکٹر اقبال مرحوم سے تحریری اجازت حاصل کر کے سب سے پہلے "کلیات اقبال" شائع کیا تھا۔ اقبال کے فکر و فن سے راشد مرحوم کو جو والہانہ عشق تھا اس کا اندازہ شاید کم ہی لوگوں کو ہوگا۔ میں نے راشد مرحوم کے خط کا جواب لکھتے وقت مشرر لکھنوی کے اس ادارتی نوٹ کا بھی تذکرہ کیا۔ ایک ہفتے کے بعد ہی ان کا خط آیا کہ اخبار "مہذب" کا یہ تراشہ مجھے جلد بھیج دیں۔ چنانچہ وہ تراشہ انھیں بھیج دیا گیا۔ راشد مرحوم نے اپنی آخری تصنیف "اصلاحات غالب" (مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد دکن ۱۹۶۶ء) میں مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"مولانا شرر کی تصنیفات و تالیفات سے ملک کے تمام علمی و ادبی طبقے خوب واقف ہیں۔ آپ کثیر التصانیف ہونے کے علاوہ ماہوار رسالہ "دلگداز" اور ہفتہ وار اخبار "مہذب" نکالتے تھے۔ "دلگداز" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور برسوں جاری رہا۔ اور ادبی دنیا پر اپنے اثرات چھوڑ گیا۔"

قبل اس کے کہ میں راشد حیدر آبادی مرحوم کی عبارت کے ساتھ اخبار "مہذب" (لکھنؤ) کا مذکورہ بالا ادارتی نوٹ نقل کروں اُس فٹ نوٹ کا نقل کر دینا بھی ضروری ہے جس میں انہوں نے اخبار "مہذب" لکھنؤ کے اس تراشے کی دستیابی کا ذکر کیا ہے۔

"میں ملک کے مشہور ادیب جناب نادم سیتاپوری کا ممنون ہوں کہ آپ نے (اخبار "مہذب" لکھنؤ) کا تراشہ جس میں یہ شذرے مندرج تھے، ارسال کرنے کی زحمت گوارہ فرمائی۔"

یہ فٹ نوٹ اس لئے شائع کرنا ضروری تھا کہ اب اخبار "مہذب" لکھنؤ کا متذکرہ بالا شمارہ میری دسترس میں نہیں ہے اور راشد مرحوم کی "اصلاحات غالب" بھی نایاب ہو چکی ہے۔ شاید حیدر آباد دکن میں کسی کے پاس ہو تو ہو۔ کم از کم پاکستان میں اس کا واحد نسخہ میرے ہی پاس ہے یا دوسرا میرے مرحوم دوست مولانا غلام رسول مہر کے کتب خانے میں موجود ہو۔ جو میں نے ہی انھیں مستعار بھیجا تھا مگر مولانا مہر کو موت نے اس کی واپسی کا موقع نہیں دیا۔

"اصلاحات غالب" چھپنے کے بعد کس طرح نایاب ہو گئی یہ عبرت ناک کہانی خود مصنف کتاب مولوی عبد الرزاق راشد مرحوم کے ایک نجی خط میں ملاحظہ فرمائی جو انہوں نے ۲۲ر نومبر ۱۹۶۷ء کو وفات سے تین ہفتے قبل مجھے لکھا تھا۔

"گوناگوں پریشانیوں کے باوجود میں نے ایک کتاب "ملاقات غالب" کے نام سے مرتب کر دی اور پروفیسر سید محمد صاحب

کو ان کے ذاتی مطبع میں چھپنے کو دی۔
کتاب اس قدر غلط چھپی ہے کہ ضائع
کر دینا چاہتا تھا۔ مگر قصہ یہ ہوا کہ کتاب
کی پانچ سو کاپیاں سید صاحب نے کسی
جلد ساز کو دی تھیں۔ اس جلد ساز کی
دوکان پر کرایہ ادا نہ کرنے کے سبب عدالت
کی ڈگری آئی اور عدالت کے کارکنوں نے
کتاب (اصلاحات غالب) کے تمام نسخے
ضبط (قرق) کر لئے، خدا جانے پھر ملے بھی یا نہیں۔
(ملاحظہ خیابان غالب مطبوعہ مشہور آفسٹ

(پریس کراچی)

شاید راشد مرحوم اس کتاب کی بازیابی کے
لئے کوئی کوشش کرتے مگر ۱۵ دسمبر ۱۹۶۷ء کو اچانک ایک
حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا اور ان کے ساتھ ہی ان
کی یہ آخری تصنیف بھی دفن ہو گئی۔ اس کتاب میں مولانا
راشد حیدر آبادی نے مولوی عبد الحلیم شرر لکھنوی
کے ہفت روزہ "مہذب" لکھنؤ کے اس ادارتی نوٹ کو
نقل کیا ہے جو شرر مرحوم نے ۱۸۹۰ء میں لکھا تھا اور
اس کا تراشہ میں نے انھیں فراہم کیا تھا۔

۱۸۹۰ء تک نہ آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی تھی،
نہ ہندوستانی مسلمانوں میں کوئی ایسی تحریک جگہ پا سکی تھی جو
ان اسباب و عوامل کا جائزہ لیتی جس کا ردعمل "پاکستان"
کی شکل میں نصف صدی بعد ظاہر ہوا۔ ہندوؤں کے
استحصالی معاشرے کو اس زمانے میں بھی مسلمان شدت
کے ساتھ محسوس کر رہے تھے مگر مولانا شرر لکھنوی کے شاید
کسی نے بھی اس انداز میں اس کا حل نہ سوچا ہوگا اور
اسے ہم بلاخوف تردید "پاکستان کا بنیادی تصور" کہہ سکتے ہیں۔
راشد حیدر آبادی مرحوم لکھتے ہیں۔

"مولانا شرر ہی نے اہل ملک کے سامنے
"پاکستان کا تخیل" پیش کیا۔ ۱۸۹۰ء میں اخبار
"مہذب" (لکھنؤ) میں ملک کی سیاست پر
کبھی کبھی شذرے لکھا کرتے تھے۔ ۱۸۹۰ء
کے شذرے میں بتایا گیا ہے کہ
"امام باڑہ ہگلی (بنگال) کے پاس ایک بنگالی بابو
بعض مسلمانوں کو چھیڑنے اور اشتعال دلانے کی غرض سے گھر
اور گھنٹے بجا کر ان کی عبادت کی توہین کرتے ہیں اس قسم کے
اشتعال سے فساد ہو جایا کرتے ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۸۹۰ء
کے شمارے میں آریہ سماج سبھا کی خدمت میں گذارش کی ہے کہ
وہ مسلمانوں سے لڑائی جھگڑا نہ مول لیں۔

۳۰ اگست ۱۸۹۰ء کے پرچے میں عید الضحیٰ کے موقع پر
فسادات کا ذکر کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ۔

"جو لوگ یہاں کی قوموں کو ایک بتلاتے ہیں
وہ سخت غلطی پر ہیں بعض مقامات پر
ہندوؤں نے مسلمانوں کا معاشی مقاطعہ
کیا تھا اس سے متاثر ہو کر یہ "تاریخی تصور"
نہایت سنجیدہ اور شریفانہ الفاظ میں پیش
کرتے ہیں کہ ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی
وقت آگیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر کسی
کی توہین اور دل شکنی کئے پوری نہیں ہوتیں
اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں

کو طرح دے ــــ "تو ہندوستان کے
اضلاع کو ہندو و مسلمان آپس میں تقسیم
کرلیں اور اپنی آبادی علیحدہ کرلیں۔"
صہ۳۲ اصلاحات غالب مطبوعہ
اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد دکن

اس کے بعد راشد مرحوم نے حکیم الامۃ ڈاکٹر اقبال
کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مولانا شرر کے اس خیال کو اقبال
نے ۱۹۳۰ء میں وضاحت کے ساتھ اپنے
خطبۂ صدارت مسلم لیگ میں ظاہر کیا۔ اور
نصف صدی کے بعد مولانا شرر کی تجویز
۱۹۴۷ء میں "تقسیم ہند" پر منتج ہوئی۔
اور "پاکستان" عالم وجود میں آگیا۔"
(صہ۳۳ اصلاحات غالب)

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی سیاسی آدمی نہیں تھے۔
ان کی زندگی میں "خلافت تحریک" شروع ہوئی مگر
ان کا نام اس سلسلے میں کہیں نظر نہیں آتا۔ جہاں تک میری
معلومات کا تعلق ہے انہوں نے اپنی وفات (۱۹۲۶ء)
تک کسی ملکی اور سیاسی تحریک میں عملی حصہ نہیں لیا۔ لیکن
برصغیر کے مسلم صحافیوں میں وہ اپنا ایک خاص مقام رکھتے
تھے۔ اور ان کا انداز فکر صحافیوں میں انفرادی تھا۔
یہ اور بات ہے کہ ان کی شہرت ہوئی تو ایک ناول نگار کی
حیثیت سے، ڈرامہ نویس کی حیثیت سے اور اچھے تاریخ داں
کی حیثیت سے ـــ!

اپنے اداراتی نوٹ میں شرر نے "تقسیم ہند"
کا کوئی جامع منصوبہ تو نہیں پیش کیا لیکن یہ بات صاف
ظاہر ہے کہ وہ ہندو مسلم آبادی پر مشتمل اضلاع کو آبادی
کی اکثریت میں علیحدہ کردینے کا تصور رکھتے تھے ـــ اور
پاکستان تحریک و قائداعظم کے سب سے بڑے موقف
پر ایک خاص زاویہ نگاہ کے حامل تھے کہ برصغیر کے
مسلمان کسی "متحدہ قومیت" کی کڑی نہیں ہیں بلکہ اپنے ایک
"علیحدہ قومیت" کا وجود رکھتے ہیں۔

ترے عزمِ مصمم کی قسم

روحی کنجاہی

نہ بھولیں گے کبھی تیرا کرم اے قائداعظم
ترے عزمِ مصمم کی قسم اے قائداعظم

وہ ہمت اور جرأت جو دلائی تو نے ملت کو
وہ عظمت اور شوکت جو دلائی تو نے ملت کو
اسے ہرگز نہ ہونے دیں گے کم اے قائداعظم

شہیدوں کے لہو سے جس چمن کو زندگی بخشی
شہیدوں کے لہو سے جس چمن کی آبیاری کی
اُسے غارت نہ ہونے دیں گے ہم اے قائداعظم
ترے عزمِ مصمم کی قسم اے قائداعظم

عدو نے آج للکارا ہے تیرے نوجوانوں کو
مگر باطل ہلا سکتا نہیں حق کی چٹانوں کو
عدو کا سر کچل ڈالیں گے ہم اے قائداعظم
ترے عزمِ مصمم کی قسم اے قائداعظم

وہ آپہنچی ترے ہر خواب کی تعبیر کی منزل
نہیں کچھ دور اب آزادیٔ کشمیر کی منزل
ہیں شمع رہ ترے نقش قدم اے قائداعظم
ترے عزمِ مصمم کی قسم اے قائداعظم

تقسیم ہند؟ گاندھی یا جناح

از جناب محمد انیس الرحمن ایڈووکیٹ کراچی

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ ۱۷۲۰ء میں مصلح اعظم شاعرِ مشرق مفکرِ ہندوستان مرشد اقبال و غالب مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی نے بھی چمنِ رنگ و بو سے رخت سفر باندھا جنہوں نے اپنے اشعار میں انحطاط سلطنت کی نشاندہی کی اور نشانِ منزل کی طرف قوم کی رہنمائی فرماتے رہے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد برصغیر پاک و ہند میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ سلطنتِ مغلیہ اندرونی انتشار، بیرونی سازش اور درباری چپقلش کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

نظامت بنگالہ سلطنت مغلیہ کا عظیم الشان صوبہ تھا۔ سب سے زیادہ زرخیز، متمدن، تعلیم یافتہ، صنعت و حرفت کے میدان میں بلند و بالا، مالیات اور تجارت میں بے مثال اور فوجی قوت میں اپنی آپ مثال۔ غرض ہر شعبۂ حیات میں عظیم ترین مقام کا حامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزوں نے سب سے پہلے نظامت بنگالہ پر ضرب کاری لگانے کی ٹھانی۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر نظامت بنگالہ پر قبضہ کر لیا گیا تو سارا ہندوستان ان کے قدموں میں آگرے گا۔ اس وقت کا نظامت بنگالہ آسام، بنگال، بہار، اڑیسہ کے صوبوں پر مشتمل تھا اور اس وقت کے صوبہ بہار کا طول و عرض تقریباً جونپور تک پھیلا ہوا تھا۔

مغلوں کی غلط خارجہ پالیسی:۔ انگریزوں کی کامیابی کی ذمہ دار مغل بادشاہوں کی وہ غلط خارجہ پالیسی تھی جس کی بنا پر یورپی قوموں کو صرف ہندوستان میں تجارت کرنے کی سہولتیں حاصل تھیں بلکہ انہیں بندرگاہوں کے قریب ساحل سمندر پر قلعوں کی تعمیر کی اجازت بھی دیدی گئی تھی۔ آج کا مورخ مغلوں کی اس خارجہ پالیسی کی دانائی کو سمجھنے سے قاصر ہے اس لئے کہ بالآخر اسی قوم نے ان ہی قلعوں میں بیٹھ کر سلطنت مغلیہ کو تہ و بالا کیا مغل شاہزادوں کی گردنیں اڑا کر شہنشاہِ ہندوستان کے سامنے تحفتاً پیش کیا۔

انگریزوں کی پالیسی:۔ انگریز قوم جب ہندوستان آئی تو وہ نہ صرف سازش اور دھوکے بازی کے ہتھیاروں سے لیس تھی بلکہ اس کے پاس نئی نئی ایجادیں بھی تھیں۔ انگریزوں نے اپنے نت نئے ہتھیاروں سے بنگالہ کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ نظامت بنگالہ کے مسلمان بہادری اور جرأت مندی سے نبرد آزما ہوئے۔ اپنی جان جوکھم میں ڈال کر انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن ہندو قوم کی طوطا چشمی اور بے ایمانی نے مسلمانوں کو نقصان عظیم پہنچایا۔ برطانوی قوم اپنی سازش کے جال میں جو ارمنی مسلمان ارکین سلطنت اور ہندو امرائے مملکت کو پھانسنے میں کامیاب ہوگئی۔ مسلمانوں نے پلاسی، بکسر اور سرنگاپٹم کے میدان

میں انگریزوں کا بے جگری سے مقابلہ کیا لیکن ہر جگہ ہندوؤں نے پیٹھ میں چھرا گھونپا اور اپنوں نے میر جعفر اور میر صادق کا کردار ادا کیا اس لئے اسلامیانِ ہند کو شکست فاش ہوئی۔ انگریز آخر کار ہندوستان کا بادشاہ بن بیٹھا۔

۱۸۵۸ء میں ہندوستان کی عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد انگریزوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" (DIVIDE AND RULE) کی پالیسی پر عمل درآمد شروع کیا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے ہر صوبے میں اقلیتی فرقے کی ترقی اور فروغ کی راہ ہموار کی گئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی امتیاز موجود تھا۔ انگریزوں نے مذہبی امتیاز کو دونوں کے درمیان کشیدگی میں تبدیل کر دینے کی سعی کی، غلط تاریخیں لکھوائی گئیں، ایک کو دوسرے کے خلاف کرنے کیلئے جھوٹا پروپگنڈہ کیا گیا۔ ہندو مسلم فسادات کی بنیاد رکھی گئی۔ غرض ایک کو دوسرے کا دشمن بنا دیا گیا۔

ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ انگریزوں نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں کو ہندوؤں کیساتھ مدغم کرنے کی کوشش کی تاکہ مسلمانوں کا اپنا الگ وجود ہمیشہ کیلئے نابود ہو جائے۔ مختلف اسکیموں اور قوانین کے ذریعہ مسلمانوں کو ہندوستانی قومیت کا جزو بنانے کی سعی کی گئی تاکہ اسلامی آفاقیت کا تصور گم ہو جائے اور مسلم قومیت کی انفرادیت فنا۔ انگریزوں نے ایک ایسی جمہوری طرز حکومت کے قیام کی کوشش کی جس میں اکثریت کی حکومت کارفرما ہوتی ہے تاکہ مسلمانانِ ہند ہمیشہ کیلئے ہندوؤں کے دست نگر بن جائیں۔ انگریزوں نے اسی تصور کے پیش نظر جب ۱۸۸۲ء میں لوکل سلف گورنمنٹ میں ہندوستانیوں کو شریک کرنے کا فیصلہ کیا تو انتخابات ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر عمل میں آئے۔

متحدہ قومیت کا تصور مسلمانوں کیلئے نقصان رساں ثابت ہوا جن حلقوں میں ہندو قوم اکثریت میں تھی ان حلقوں سے کوئی مسلمان منتخب نہ ہو سکا۔ آخر کار مسلمانوں نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی تاکہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی نگہداشت کی جا سکے۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۰ء تک مسلمانانِ ہند نے مسلسل ہندوستان میں اپنی سیاسی جدوجہد جاری رکھی اور مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا مطالبہ آبادی کے پیش نظر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کیا جاتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخابہ کا حق مل گیا۔ (SEPARATE ELECTORATE)

۱۹۳۵ء انڈیا ایکٹ کے بعد کانگریس صوبوں میں برسر اقتدار آئی اور مسلمانوں کے جائز حقوق کو نظر انداز کرنا شروع کیا۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم نو کیلئے لکھنؤ میں اجلاس منعقد ہوا۔ لکھنؤ سیشن کے بعد کانگریسی وزارتوں میں مسلمانوں پر مظالم کی داستان مرتب کی گئی۔ [illegible]ء میں شریف رپورٹ اور سارے ہندوستان کی پیرپور رپورٹ مرتب ہو کر سامنے آئی جنہوں نے ہندوؤں کی تنگ نظری، تعصب، انسانیت سوز مظالم اور تنگ ظرفی کو بے نقاب کیا۔ یہ بات بڑی حد تک واضح ہو گئی کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور ہندوؤں کی حکومت میں مسلمان آرام و چین کی زندگی نہیں بسر کر سکتے ہیں لہٰذا ۱۹۴۰ء لاہور سیشن میں آل انڈیا مسلم لیگ نے یہ مطالبہ کیا کہ ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان کی آزاد مملکتیں قائم کی جائیں اور ان خطوں کا سیاسی

اقتدار مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائے۔

مسلمانانِ ہندوستان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ برصغیر پاک وہند کے مشرقی و مغربی گوشوں میں آبادی کے لحاظ سے ان کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ مسلمانانِ ہند کی یہ اکثریت بدھ تحریک کی مرہونِ منت ہے۔ گوتم بدھ نے ہندوستان کے مشرق و مغرب کے خطوں میں مسلمانوں کی اکثریت قائم کر دی ورنہ آج پاکستان کا قیام ناممکن تھا۔ اگر آج یہ دعویٰ کیا جائے کہ گوتم بدھ نے پاکستان بنوایا تو اس کی تردید محال ہے۔ گیتا دور میں جب گوتم بدھ کے ماننے والوں پر برہمی مذہب کے پیروؤں نے مظالم کے پہاڑ توڑے تو وہ بہار کی سرزمین سے بھاگ کر ہندوستان کے مشرق و مغرب کے گوشوں میں پناہ گزین ہوئے۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت ہندوستان کے مشرق و مغرب کے ان خطوں میں جہاں آج پاکستان بن گیا، بدھوں کی حکومتیں قائم تھیں اور آبادی میں ان ہی کی اکثریت تھی۔ ان ہی بدھوں نے اسلام قبول کر لیا اور اس کے بعد ان حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت قائم ہو گئی۔

۱۹۴۶ء میں آخری دفعہ برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کیلئے کیبنٹ مشن روانہ کیا۔ جس کے تین ممبر تھے۔ ۱۔ لارڈ پیتھک لارنس ۲۔ سر اے الگزنڈر ۳۔ سر اسٹیفورڈ کرپس۔ مئی ۱۹۴۶ء میں اس مشن نے ایک پلان پیش کیا جسے کیبنٹ مشن پلان کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ کیبنٹ مشن پلان نے ہندوستان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اے۔ بی اور سی، مشرقی اور مغربی حصے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی ان کو دو گروپس میں تقسیم کر دیا گیا اور ہندو اکثریت کے صوبوں کو ایک گروپ میں۔ لیکن تینوں گروپس کو ایک سیاسی مرکز کے تابع فرمان رکھا گیا۔ کیبنٹ مشن پلان میں مسلمان اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی سیادت تسلیم کی گئی تھی اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں کی لیکن مرکز ایک ہی تھا جس کی وجہ سے ہندوستان متحد تھا۔

اس اسکیم کو گاندھی جی اور کانگریس نے سب سے پہلے قبول کیا اس لئے کہ اس اسکیم میں ہندوستان متحد تھا اور گاندھی جی اور کانگریس کو یہ یقین تھا کہ مسٹر جناح متحدہ ہندوستان کی کوئی اسکیم تسلیم نہیں کر سکتے ہیں۔ کانگریس اور گاندھی جی کے منظور کر لینے کے بعد ہندوستان میں ہندوؤں نے خوب بغلیں بجائیں۔ اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں سے خبریں شائع ہوئیں کہ پاکستان نامنظور ہو گیا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ نہیں تسلیم کیا گیا۔ ہندوؤں نے پروپیگنڈہ کیا کہ اس اسکیم کے ذریعے مسلمانوں کی علیحدہ سلطنت کے قیام کا مطالبہ رد کر دیا گیا۔ مسٹر جناح نے تقریباً ایک ہفتہ کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کیا اور مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے سامنے کیبنٹ مشن پلان پیش اور اس کو منظور کر لینے پر مجبور کیا۔ مسٹر جناح کی تشریحات کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لیا۔ مسلم لیگ کی منظوری کے بعد اخباروں میں پھر مسٹر جناح کے خلاف پروپیگنڈہ شروع ہوا۔ دنیا یہ سن کر انگشت بدنداں تھی کہ مسٹر جناح نے بھی کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لیا۔ اخبارات میں خبریں شائع ہوئیں۔ اداریے لکھے گئے کہ مسٹر جناح اپنی منزل سے دور جا پڑے۔ مسٹر جناح نے متحدہ ہندوستان کو منظور کر لیا۔ طرح طرح کی چہ

میگوئیاں ہوئیں اور مسٹر جناح پر مسلسل تنقیدیں کی گئیں۔

مسٹر جناح کی سیاسی بصیرت:۔ مسٹر جناح نے کیبنٹ مشن پلان کو تسلیم کر کے تاریخ کے دھارے کا رخ پھیر دینا چاہا تھا۔ انہوں نے اپنے کردار اور عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ ہندوستان کو متحد دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم سے ہندوؤں اور مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑیگا۔ اسی لئے انہوں نے متحدہ ہندوستان کی اسکیم کو شرف قبولیت بخشا حالانکہ وہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک مسلمانوں کی دو آزاد مملکتوں کے قیام کی جدوجہد میں مصروف تھے اور سارے ہندوستان کے مسلمان ان کی آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن پلان کو دس سال کیلئے منظور کر کے انہوں نے متحدہ ہندوستان میں دس سال تک ہندوؤں کے ساتھ رہنا قبول کر لیا تھا۔ اس کے باوجود ہندوستان کی بدقسمتی ملاحظہ کیجئے۔

گاندھی جی کا کردار و عمل:۔ جب مسٹر جناح نے کیبنٹ مشن پلان منظور کر لیا تو گاندھی جی کی آنکھ کھلی۔ انہوں نے سی گروپ کے متعلق اعلان کیا کہ "بنگال کے ساتھ آسام کی گروپنگ لازمی (COMPULSORY) نہیں ہے اور میں نے اسے اختیاری (OPTIONAL) سمجھ کر منظور کیا ہے"۔ تمام لوگوں نے ان کی تشریح کی تردید کی۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ہندو اور مسلمان زعماء کو لندن طلب کیا اور لازمی اور اختیاری گروپنگ کی تشریح کی اور واضح طور پر اعلان کیا کہ بنگال کے ساتھ آسام کی گروپنگ لازمی ہے۔ گاندھی جی تو بہانے ڈھونڈ ہی رہے تھے۔ انہوں نے ہندوستان آ کر کانگریس کو مجبور کیا کہ منظور شدہ کیبنٹ مشن پلان کو منسوخ کر دیا جائے لہٰذا کانگریس نے اپنے فیصلے پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔

صوبہ آسام کی اہمیت:۔ آسام کے صوبے میں مسلمانوں کی صرف اڑتیس ۳۸ فی صد آبادی تھی لیکن مقامی باشندوں کو اپنے ساتھ ملا کر سر محمد سعد اللہ نے ابتدا میں وزارت قائم کر لی تھی۔ اس زمانے میں بنگال سے کثیر تعداد میں مسلمانوں کی ہجرت آسام کی طرف ہو رہی تھی اور یہ امید بندھ گئی تھی کہ دس سال کے اندر مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت آسام میں قائم ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو آسام اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت سے ہندوستان کا مشرقی بازو بھی مسلمانوں کیلئے بہت مضبوط ہو جاتا اور بنگال میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا۔ گاندھی جی نے جب دیکھا کہ کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لینے کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت آسام میں قائم ہو جائے گی تو گاندھی جی نے کیبنٹ مشن پلان کو منسوخ کر دینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے سی گروپ کی ایسی تشریح کی جو نا قابل قبول تھی۔ اس کے علاوہ گاندھی جی نے آسام کے وزیر اعلیٰ مسٹر باردولی کو بھی اس کے لئے راضی کر لیا تھا کہ اگر کانگریس کیبنٹ مشن پلان کو منسوخ نہیں کرتی تو تم بحیثیت وزیر اعلیٰ آسام کانگریس سے بغاوت کر دو۔ غرض گاندھی اور کانگریس نے آسام میں مسلمانوں کی اکثریت قائم نہیں ہونے دی اور ہندوستان کو تقسیم کرا دیا۔

اس سیاسی انتشار کے باوجود مسٹر جناح ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں ہندو اکثریت کے ساتھ بیٹھنے کے

کرنے کو تیار تھے اور متحدہ طور پر ہندوستان کی مملکت کا آئین بنانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن اس وقت جواہر لال نہرو نے اعلان کیا کہ آئین ساز اسمبلی میں ہم جس طرح کا قانون چاہیں گے بنائیں گے۔ جواہر لال نہرو کے اس بیان کے بعد مسٹر جناح نے اعلان کیا کہ کانگریس اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ایسا قانون نہیں بنا سکتی جو مسلمانوں کو منظور نہ ہو۔ اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ پاکستان کی قانون ساز اسمبلی اپنا قانون الگ بنائے گی۔

ہندوستان کی تقسیم کا ذمہ دار صرف گاندھی اور جواہر لال نہرو کو قرار دینا پڑتا ہے۔ تحریک آزادی ہند کے آخری دور میں مسٹر جناح نے ہندوستان کو متحد رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ہندوؤں کے لیڈروں نے اتحاد کی ہر اسکیم کو نذر آتش کر دیا اور ہندوستان کو تقسیم کرا دیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم سے مسلمانان ہندوستان کو زبردست نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ جب تقسیم ہند کی اسکیم کامیاب ہو گئی تو ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر پنجاب اور بنگال کو بھی مزید تقسیم کرا دیا۔ اس کے علاوہ باونڈری کمیشن نے اپنے فیصلے میں مسلمانوں کی اکثریت کے بعض علاقوں کو بھی ہندوؤں کو دیدیا۔ غرض اسلامیان ہند کو تباہ کرنے کے لئے قدم قدم پر کھائیاں کھودی گئیں۔ ہندوؤں اور انگریزوں کی سازشوں، گٹھ جوڑ اور ناپاک عزائم کی وجہ سے ہندوستان تقسیم ہوا ورنہ آج ہندوستان اسی طرح متحد رہتا جس طرح امریکہ (U.S.A.)۔ مسلمان اپنے اکثریت کے علاقوں میں آزاد مملکتوں کے اسی طرح مالک تھے جس طرح امریکہ کی تمام ریاستیں آزاد ہیں لیکن ان کا مرکز ایک ہے۔ اسی طرح متحدہ ہندوستان کا بھی مرکز ایک رہ سکتا تھا لیکن گاندھی کے جیسے تنگ نظر انسان اور جواہر لال اور پٹیل کی طرح متعصب اور خود غرض شخصیتوں نے انگریزوں سے مل جل کر ہندوستان کے ٹکڑے کروا دیئے۔

پاکستان کی تقسیم:- ہندوستان کی تقسیم کے بعد بھی ہندو دنیا مطمئن نہ ہو سکی۔ لاکھوں مسلمانوں کی بربادی کے بعد بھی ہندوؤں کی تلواریں پیاسی رہیں۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی ان کی ریشہ دوانیاں جاری و ساری رہیں۔ وہی طاقتیں جنہوں نے ہندوستان کو تقسیم کروایا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد خاموش نہیں بیٹھیں بلکہ مسلسل عمل سازشوں اور چال بازیوں کو ہوا دیتی رہیں۔ اور مسلمانوں کو کمزور سے کمزور تر کر دینے کی فکر میں پیہم غلطاں اور پیچاں۔ پاکستان بن جانے کے بعد لاکھوں مہاجرین کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ صرف پنجاب سے نوے ۹۰ لاکھ مسلمانوں نے ہجرت کی۔

پاکستان مہاجرین کی آباد کاری سے ابھی دم بھی نہیں لینے پایا تھا کہ پاکستان کی یک جہتی پر ضربیں پڑنے لگیں۔ دنیا کے مفکرین کٹا پھٹا پاکستان کو بھی قوت کا سرچشمہ خیال کرنے لگے۔ امریکہ کے ہرورڈ یونیورسٹی کے طلبہ نے ۱۹۴۹ء۔۵۰ء میں ہی اپنی گورنمنٹ کو باخبر کر دیا کہ پاکستان کی یکجہتی دنیا کے لئے خطرہ ثابت ہو گی۔ یہ خبر اخبارات میں میری نظروں سے گذری۔ ایک چھوٹا سا مضمون تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہرورڈ یونیورسٹی کے طلبہ کا خیال ہے کہ پاکستان کا اتحاد عالمی امن کے لئے خطرہ ہے HARVARD GRADUATES

ARE OF OPINION THAT THE
UNITY OF TAKISTAN IS A
THREAT TO THE WORLD PEACE.

۱۹۶۵ء کی جنگ میں دنیا نے پاکستان کی قوت
کا اندازہ کیا۔ اس کے بعد امریکہ کھل کر سامنے آگیا۔
تاکہ پاکستان کو تقسیم کر دیا جائے۔ ایوب خاں کے دورِ حکومت
میں امریکی سفیر نے ڈھاکہ میں تقریر کی کہ اگر مشرقی
پاکستان اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہتا ہے تو امریکہ اس
کی ہر قسم کی مدد کر سکتا ہے۔ اس کی تقریر کے بعد ایوب
خاں نے امریکی سفیر کو ملک بدر کرا دیا۔ لیکن مقامی طور
پر صوبائی خود مختاری PROVINCIAL
AUTONOMY کی تحریک زور پکڑتی رہی
جسے ہندو اور انگریز ہوا دے رہے تھے۔ مغربی پاکستان
والے بھی مشرقی پاکستانیوں کو کم درجہ سمجھنے لگے اردو داں
طبقہ بنگالی لب و لہجے اور بنگالی زبان کا مذاق اڑاتا رہا۔
پنجاب کے چند ناکارے بنگال کو پاکستان کی ایک ذمہ داری
LIABILITY قرار دیتے رہے۔ بنگالی مسلمانوں
کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نوکریاں نہیں دی جاتی
رہیں۔ تقریباً پچیس سال تک آپس میں آویزش
رہی۔ ایک دوسرے سے نفرت بڑھتی رہی لہٰذا تصادم
کے لئے میدان ہموار کر دیا گیا۔ وہی قوتیں جو پلاسی کے
میدان میں سراج الدولہ کی مخالف تھیں پاکستان
میں پیدا ہوئیں اور اسے تقسیم کروا دیا۔ کسنجر امریکی
وزیر خارجہ نے ۲۳ر نومبر ۱۹۷۳ء کو بیان دیا جسے
نوائے وقت راولپنڈی نے ۲۴ر نومبر ۱۹۷۳ء کو
شائع کیا جس کا حوالہ "ہماری مسلمان" جیسی کتاب
میں انور بیگ اعوان نے دیا ہے۔ اپنی تقریر میں
امریکی وزیر خارجہ نے اقرار کیا ہے کہ "امریکہ کو مشرقی
پاکستان کی علیحدگی اور خود مختاری سے مکمل اتفاق
تھا لیکن بھارت نے جو طریقہ کار اختیار کیا اس سے
ہمیں اختلاف تھا"

جواہر لال نہرو، گاندھی اور انگریزوں نے
اپنی سازشوں سے ہندوستان کو تقسیم کرا دیا اور جواہر
لال نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی نے برطانیہ، روس اور
امریکہ کا سہارا لے کر مشرقی پاکستان میں فوجی مداخلت
کی اور پاکستان کو دو ٹکڑے کر دیا۔

ہندوؤں نے ہندوستان کو کیوں تقسیم کروا دیا

(۱) صوبہ آسام کو مسلم اکثریت کا صوبہ بننے
کا موقع ہندو قوم کیسے فراہم کر سکتی تھی؟
تاکہ مشرقی ہندوستان میں مسلمانوں کی عظیم الشان
مربوط آبادی قائم ہو جائے۔

(۲) اگر امریکہ کی طرح ہندوستان ایک مرکز
کے ماتحت متحد رہتا اور مسلمان اکثریت کے صوبوں کو
اسلامی قوانین کے نفاذ کا حق ہوتا تاکہ اسلامی
معاشرہ پھولے پھلے تو ایسے معاشرے سے ساری ہندو
دنیا متاثر ہوتی اور اس وقت ہندو قوم کا اسلام
قبول کر لینا حیرت انگیز نہ ہوتا۔ اسی لئے کٹر ہندو
ذہنیت رکھنے والے لیڈروں نے ہندوستان کے ان خطوں کو
الگ کر دیا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ تاکہ ہندو دنیا پر
اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے کے اثرات براہِ راست

نہ پڑیں۔ ملک پاکستان بن جانے کے بعد مسلمانوں کی اجتماعی آبادی کا بہت بڑا حصہ پنجاب میں آباد ہے جن کی فوجی قوت کی بھی شہرت ہے اس لئے دشمنانِ اسلام یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کو مزید تقسیم کروا دیا جائے۔ بلوچستان اور سرحد کو الگ کر دیا جائے اور سندھ کو الگ کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کمزور سے کمزور تر ہو جائے اور ان کی قوت طاقت انتشار کا شکار۔

دشمنانِ اسلام مسلمانوں کی اجتماعی قوت سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ اور وحدت ملی سے لرزہ براندام۔ کاش مسلمان کو یہ سیاسی تقاضے نظر آتے!

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریمِ کبریا سے آشنا کر

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

اقبال

سید بحیثیت اخبار نویس

مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں شروانی مرحوم

دنیا مانتی ہے کہ سر سید (احمد) ایک جامع حیثیات شخص تھے۔ ایک حیثیت ان کی اخبار نویس کی بھی تھی۔

ان کو مسلمانوں میں تعلیم جدید کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا تو اول اسے تراجم کے ذریعہ سے پورا کرنا چاہا، مگر جب یہ سوچا کہ جب تک کسی کتاب کا ترجمہ ہو اور چھپے وہ علم کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اس خیال کے ماتحت انہوں نے مختلف علوم پر کچھ کتابیں چھاپیں تھیں۔

اب انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کے ممبر مسلمان، ہندو اور انگریز تینوں تھے۔ اس کے لیے سنہ ۱۸۶۴ء میں ایک وسیع اور خوش منظر عمارت بنائی۔ اس پر سنہ ۱۸۶۴ء کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ اور آج کل اس میں یونیورسٹی کے طبیہ کالج کا دوا خانہ ہے۔

سوسائٹی کی طرف سے سنہ ۱۸۶۶ء میں سائنٹفک سوسائٹی اخبار کے نام سے اخبار نکلا جو بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے موسوم ہوا۔ پھر سنہ ۱۹۲۰ء میں کالج کے یونیورسٹی ہو جانے پر مسلم یونیورسٹی گزٹ ہو گیا ہے۔

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ابتدا میں ہفتہ میں دو بار نکلا۔ پھر ایک بار مستقل ہو گیا۔ بدھ (چہار شنبہ) کا دن یوم اشاعت تھا۔

اس میں سیاسی، تعلیمی، معاشرتی، تاریخی، مذہبی غرض ہر قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ بعض اردو بغیر انگریزی ترجمہ کے۔ ایسا مضمون کوئی نہ ہوتا تھا کہ صرف انگریزی ہو اور اس کا اردو ترجمہ نہ ہو۔ اور گورنمنٹ کی جس رائے سے وہ رعایا کو واقف کرنا چاہتے، وہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوتا۔ ماخذ موقر انگریزی اخبارات کی یا ذمہ دار حکام کی ہوتیں۔ زبان ادبیت اور شائستگی اور تہذیب کے لحاظ سے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر ہوتی۔

وہ رعایا کے مختلف فرقوں اور رعایا اور گورنمنٹ کے مابین کامل اتحاد کے خواہاں و جویا تھے۔

سوسائٹی میں جو لکچر مختلف علوم و مضامین پر ہوتے وہ بھی اخبار میں چھاپے جاتے۔ ایک بہت بڑے اور تجربہ کار انگریزی مصنف کی کتاب "پریس آف دی انڈین ایمپائر" میں لکھا گیا تھا کہ اس اخبار میں جو رائیں ہوتی ہیں وہ ضرور ذمہ دارانہ اور قابل لحاظ ہوتی ہیں۔

گورنمنٹ کی نظر میں جو وقعت اس اخبار کی تھی

کسی ہندوستانی اخبار کی نہ تھی۔

مثل دوسرے اخبارات کے اس اخبار میں کبھی کوئی ایسا مضمون نہیں آتا تھا۔ جس میں مسلم و غیر مسلم سرکاری ملازموں کے عہدوں اور ترقی وغیرہ کے معاملات کے متعلق بے انصافی یا غیر واجب رعایت کی شکایت ہوتی ہو۔

خوشی اور غمی کے مضامین مسلم وغیر اصحاب کے متعلق یکساں ہوتے تھے۔ منشی نول کشور (صاحب مطبع و اخبار) کی وفات کا ماتم انھوں نے ایسا لکھا ہے جیسا کہ کسی اسی درجہ کے مسلمان کا لکھتے۔

ریاستوں پر بھی غیر مذہب رعایا کے ساتھ ناانصافی کی شکایت نہ ہوتی۔

ہندوستان شمالی بڑے حصہ کی عام رائے کا نقیب اسی اخبار کو سمجھا جاتا تھا۔ اور اس پر لحاظ ہوتا تھا۔

دنیا کے کسی حصہ کی کوئی مفید خبر ایسی نہ ہوتی جو اخبار میں نہ آجاتی۔

برطانیہ اور اسلامی سلطنت ٹرکی کے اتحاد پر ہمیشہ زور دیتے۔ اور صاف کہتے کہ اگرچہ ہم مذہب ہونے کی حیثیت سے ہم مسلمانوں کو ترکی کے ساتھ ہمدردی ہے۔ مگر اس سے اپنی گورنمنٹ کے ساتھ وفاداری میں مطلق ذرہ بھر فرق نہیں ہے۔ برٹش گورنمنٹ کو ترکی کے ساتھ مصالحت و رواداری کے فوائد ناقابل تردید دلائل سے بتاتے۔

اپریل ۱۸۶۹ء میں سرسید انگلستان گئے اور لندن میں مقیم ہوئے۔ وہاں سے بھی وہ اخبار کے لئے اپنے مفید و قابل اطلاع مضامین بھیجتے رہتے تھے۔

سرسید کی شہرت انگلستان کے سیاسی حلقوں میں بوجہ ان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" اور علمی جماعتوں میں بذریعہ "آثار الصنادید" پہلے سے پہونچی ہوئی تھی۔ اور وہاں کے قیام کے زمانہ میں بھی انھوں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزی گورنمنٹ کے متعلق عام جلسوں میں بعض ایسی تقریریں کیں کہ ان کے بیان کردہ واقعات بڑے بڑے روشن دماغ لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ ہندوستان میں چھپنے والے اخبارات جو ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھے اُن میں سے صرف سرسید کا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ایسا تھا جس کے حوالے اور اقتباسات انگریزی اخباروں میں چھپتے نتیجہ یہ کہ اکابر و اعاظم برٹش مدبر اُس کے (بالفاظ دیگر سرسید کے) خیالات سے واقف ہوتے۔

چنانچہ لارڈ سالسبری جو بمقابلہ گلیڈسٹن کے (جو ترکی کا شدید ترین مخالف تھا) ترکی کے بے حد معترف تھے۔ اور ان کا یہ اعتراف اس سبب سے معتبر اور ذاتی واقفیت پر مبنی تھا۔ کہ وہ وہاں بحیثیت برٹش سفیر کے کافی عرصہ رہ چکے تھے۔ لارڈ سالسبری اپنی گورنمنٹ بمقابلہ گلیڈسٹن کے وقتاً فوقتاً وزیر اعظم بھی ہوتے رہتے تھے۔ اس زمانہ میں برٹش وزارت عظمیٰ تین افراد میں دائر رہتی تھی۔ (۱) گلیڈسٹن (۲) سالسبری اور (۳) روزبری۔ روزبری بمقابلہ گلیڈسٹن اور سالسبری کے بین بین تھا۔ اور واقعات بیان شدہ سے بخوبی ثابت ہے کہ یہ سب سرسید کی سیاست

اور صحافت کا نتیجہ تھا۔

بعض واقعات انہوں نے اخبار میں ایسے لکھے ہیں کہ ان پر یقین لانا نہایت ہی مشکل ہے۔ مثلاً ایک واقعہ لکھا ہے کہ علی گڑھ شہر کے مشہور "چیل تالاب" (واقع گوشۂ جنوب مغرب) میں ایک شخص اترا ہوا ہے جو پانی میں اس طرح ہے گویا پانی میں نہیں ہے بلکہ کسی ٹھوس اور سخت چیز تخت یا زمین پر ہے۔ وہ پانی پر چار زانو بیٹھتا ہے، لیٹتا ہے، لیٹ کر کروٹیں بدلتا ہے، بیٹھ کر حقہ پیتا ہے۔ یہ واقعہ کثرت سے ملکی و غیر ملکی اخبارات میں نقل ہوا اور اس پر صرف اس سبب سے اعتبار کیا گیا کہ وہ سرسید کے اخبار میں تھا۔

سرسید کسی دوسرے کا مضمون بھی بغیر خود دیکھے اور پاس کے نہ چھاپتے تھے۔ میں (محمد مقتدیٰ خاں شروانی) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اڈیٹر تھا۔ نواب وقارالملک بھی میرا مضمون پروف کی شکل میں دیکھتے اور پاس کرتے تھے۔ اور بوجہ اپنے اعلیٰ اخلاق کے انھوں نے معذرۃً یہ واقعہ بیان فرمایا تھا سید صاحب بھی میرے مضمون کا پروف دیکھا کرتے تھے۔ سرسید باآں ہمہ متانت اعلیٰ درجہ کے ظریف اور بذلہ سنج بھی تھے۔ بحیثیت صحافی کے اُن کی شوخی کی ایک نہایت دلچسپ مثال یہ ہے کہ ایک بار یہ خبر عام ہوئی کہ سرسید نے ایک ڈاکٹر کے ہاتھ دس ہزار روپے میں اپنا سر بیچا ہے۔ اور ڈاکٹر نے اس غرض سے خریدا ہے کہ اُن کے مرنے پر وہ سر کاٹ کر اور اُس کا تجزیہ کر کے یہ دیکھے گا کہ اس میں وہ کیا چیز زیادہ ہے جس کے سبب سے یہ عقل کا پتلا بنا ہوا ہے۔ اس خبر کی اشاعت کے زمانہ میں میں طفل مکتب سے بھی بہت زیادہ کم سن تھا۔ مگر مجھے یہ چرچا اب تک بخوبی یاد ہے۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ اخبار کا یوم اشاعت چہار شنبہ (بدھ) تھا۔ ایک سال یکم اپریل کو پڑا۔ اس پر سرسید کو "اپریل فول" کی سوجھی اور انھوں نے اخبار میں واقعہ دیا کہ فلاں تاریخ سید احمد خاں کا سر فلاں ڈاکٹر کے ہاتھ فلاں غرض سے اس قیمت میں بکا۔ اور اس کی ضلع کے دفتر رجسٹری میں رجسٹری ہوئی۔ اس پر منجملہ حاشیہ کے گواہوں کے ایک گواہ مولانا (بعد کے شمس العلماء) عباس حسین شیعہ مجتہد اور کالج کے شیعہ ڈین بھی تھے۔ اخبار صبح صادق میں تیار ہو کر آفتاب کے ساتھ طلوع ہو جایا کرتا تھا۔ اخبار پڑھ کر تو چل ہی چل کے ساتھ مولانا عباس حسین پر چڑھائی ہوئی۔ اسرار سے ناواقف لوگ تو محض تصدیق کے لئے آئے۔ مگر سید محمود (جو واقف راز تھے) انہوں نے آ کر مولانا کو بڑا ڈانٹا اور اُن کے خلاف سخت سے سخت عدالتی چارہ جوئی کی اُن کو دھمکی دی۔ مولانا کی حالت قابلِ دید بتائی جاتی ہے۔ اس ساری لطف اندوزی کے بعد مقامی طور پر تو یہ علم ہو گیا کہ یہ اپریل فول تھا مگر بیرونجات میں واقعہ ہی سمجھا جاتا رہا۔

اس نسل کو سر ولیم میور کا حال کیا معلوم
ہوگا۔ یہ اس صوبہ کے لفٹنٹ گورنر تھے۔ عربی
داں تھے۔ انھوں نے رسول اللہ صلعم کی سیرۃ پر
ایک کتاب لکھی۔ اور چونکہ اس میں اصل تفسیر
حدیث، تاریخ اور تمام اسلامی دینی عربی کتابوں
کے حوالے اور مقولے ہیں۔ گو تاویلات محض غلط
ہیں جن کی ظاہر ہے کہ ناواقفوں کو خبر نہیں ہوسکتی۔
اس کتاب نے بڑی شہرت حاصل کی۔ دنیا کی
بمشکل کوئی علمی زبان ہوگی جس میں اس کا ترجمہ
نہ ہوا ہو۔ شام اور مصر اور دوسرے عربی بولنے
والے ممالک کے عیسائیوں نے اس کا ترجمہ سیر قلیم الیم
کے نام سے کیا۔ سرسید نے اس کا نہایت دندان شکن
جواب شائع کیا۔ اب کہنا یہ ہے کہ سرسید نے اس
صریح دشمن اسلام شخص کا ذکر اخبار میں کبھی بے لطفی
اور بد مذاقی کے ساتھ نہیں کیا۔ اکتوبر ۱۸۷۶ء میں کالج
آئے۔ ان کو ایڈریس عربی زبان میں دیا گیا۔ انہوں نے
جواب اردو میں دیا۔ ان کی عربی دانی اس سے ثابت
ہے کہ جواب میں "لونرخنا" "مرکوزات دلی" "تودلیع"
"نقش فی الحجر" جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان
کے نام سے ایک پارک بھی موسوم "ولیم میور پارک"
جو فیض گیٹ سے بالکل ملا ہوا بجانب جنوب ہے۔
وہ اخبار میں آریہ سماج اور قادیانی مذاہب سے
بھی تعارض نہیں کرتے تھے۔ راجہ جے کشن داس
کٹر آریہ تھے۔ مگر سرسید کا ان سے بھائی چارہ تھا۔
کوٹھی میں ان کا مستقل رسوئی خانہ (باورچی خانہ)
تھا۔ سید محمود ان کو راجہ چچا اور سید راس مسعود
ان کو راجہ دادا کہتے تھے۔ راس مسعود کی رسم بسم اللہ
(۱۸۹۳ء میں) راجہ جے کشن داس اور پروفیسر
(بعدہٗ سر) ٹی۔ ڈبلو آرنلڈ کے بیچ میں بیٹھا کر کی گئی۔
سرسید کی حیات ہی میں طالب علموں کا ایک اخبار
رسالہ جاری ہوگیا تھا جس کا نام ایم۔ اے۔ او
کالج میگزین تھا۔ اس کے اردو اور انگریزی حصے
بالکل جدا مشترک سرورق کے اندر ہوتے تھے۔
سیدھی طرف انگریزی اور انگریزی ہی میں سرورق،
بائیں طرف اردو اور اردو ہی میں سرورق۔ انگریزی
حصے کے اڈیٹر مسٹر بک پرنسپل اور اردو کے مولانا
شبلی تھے۔ یہ بھی نہایت متین اور غیر فرقہ وارانہ
تھا۔ اکثر خریدار طلبہ (مسلمان، ہندو، عیسائی) تھے۔
بیرونی اہل ذوق خال خال لیتے تھے۔ اس میں بھی
سرسید کی صحافی پالیسی علانیہ نمایاں تھی۔
انگلستان کے دوران قیام میں انھیں خاص
مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔
اور اس کے لئے ہفتہ وار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ
کے علاوہ ایک ماہوار رسالہ نکالنا تجویز کیا۔ اس
کا نام اردو میں تہذیب الاخلاق اور انگریزی میں
محمڈن سوشل ریفارمر رکھا۔ اور سرورق کا بلاک بھی
خوش وضع لندن سے بنوا کر لائے۔ یہ صرف اردو
میں ہوتا تھا۔ سرسید کے علاوہ دوسرے دیگر
(صرف مسلمان) اہل قلم کے بھی مضامین ہوتے
تھے۔ مگر زیادہ سرسید ہی لکھتے تھے۔ اس میں ایسے

اسلامی مضامین جیسے مثلاً چھری کانٹے سے کھانا، میز پر کھانا، انگریزوں کے ساتھ کھانا، انگریزوں کو نجس نہ سمجھنا کہ بعض اصحاب انگریزوں سے مل کر اور ان سے ہاتھ ملا کر آتے ہیں تو گھر آ کر نہایت مبالغہ کے بیسن رپنے کے آٹے سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ کیونکہ صابن کو ناپاک جانتے ہیں۔ انگلستان اور دوسرے غیر اسلامی ممالک کا سفر اس لئے ناجائز سمجھنا کہ جہاز پر منخنقہ (گردن مروڑی ہوئی) مرغی کھلائی جاتی ہے۔ اور غیر مسلم کا مذبوحہ بھی ناجائز ہوتا ہے۔ الشاء اللہ کی مٹی کی آڑ میں کتنے تنکا رہتے ہیں۔ بعض لوگ کھانے کے بعد منہ میں انگلی ڈال ڈال کر صاف کرتے ہیں اور برتن میں نہایت غلیظ لعاب ڈالتے ہیں۔ جو تنباکو کی طرح تیز ہوتا ہے اور دیکھنے والوں کو گھن آتی ہے۔ اور زیادہ کیا عرض کیا جائے۔ اتغافل تکفیہ آکا شارکرو۔

دامانِ نگہ تنگ گلِ حسنِ تو بسیار
گل چینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

صبح

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اقبال

علی گڑھ تحریک اور ذہنی تربیت

از
پروفیسر مسز زبیر ایم۔ اے (علیگ)

یہ تصور عام ہے کہ علی گڑھ تحریک محض ایک تعلیمی و سیاسی تحریک تھی جو مسلمانان ہند کی نشاۃ الثانیہ کا باعث ہوئی۔ درحقیقت یہ ایسی ہمہ گیر تحریک تھی جس نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو دور جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا۔ اسلامی تعلیمات کو عقل کی روشنی میں سمجھنا اور مجموعی طور پر انھیں اس قابل بنانا تھا کہ وہ اپنے مذہبی معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور تعلیمی مسائل کو وقت کے تقاضوں کے مطابق حل کر سکیں۔ اس تحریک کے بانی سرسید احمد خاں تھے۔ سرسید کے مقصد کے خلوص نے اور ان کی مقناطیسی شخصیت نے اس زمانے کے بہت سے علما، شعراء اور ادباء کو متاثر کیا۔ سرسید کی شریفانہ گفتگو اور منطقی استدلال کا ایسا اثر ہوتا کہ جو بھی سنتا ان کا حامی اور گرویدہ ہو جاتا۔ جن صاحبوں نے سرسید کی تحریک میں ان کا ہاتھ بٹایا ان میں مولانا حالی۔ نواب وقار الملک مولانا شبلی، مولانا چراغ علی۔ خواجہ محسن الملک سمیع اللہ خاں اور ڈاکٹر نذیر احمد پیش پیش ہیں۔

سرسید کا ابتدائی زمانہ مسلمانوں کی خانہ جنگی، جمود اور انتشار کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں پر مایوسی، بے اطمینانی اور نحوست طاری تھی۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمہ سے ان کی معاشرتی و تمدنی زندگی پر ایک کاری ضرب لگی تھی۔ علاوہ ازیں انگریزوں کے تسلط اور ان کی پالیسیاں مسلمانوں کے لئے ناگوار اور تلخ تھیں۔ انگریزوں کی جانب سے ان کے دلوں میں غم و غصہ اور نفرت کے جذبات بھڑک رہے تھے مگر دماغ ایسے ماؤف تھے کہ نہ کوئی تدبیر سمجھ میں آتی تھی اور نہ کچھ کرتے بنتا تھا۔ ایسے کڑے وقت میں سرسید نے مسلمانوں کی رہبری کا عزم کیا اور اپنی تمام صلاحیتیں اور ذرائع مسلمانوں کی بہبود کی جد و جہد میں لگا دیں۔ قدرت کا اٹل اصول ہے کہ "ہر کمالے را زوالے و ہر زوالے را کمالے"۔ ہر تخریب کے بعد تعمیر کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ کوئی کار آمد راہ عمل پیدا ہو نہیں سکتی۔ شاید اسی اصول کے تحت خداوند تعالیٰ نے سرسید کو غیر معمولی ذہانت، دردمند دل اور نگاہ دور بیں عطا فرمائی۔

سرسید نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ کوئی تحریک

اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک ہندوستان کے باشندوں کے ذہنوں میں انقلاب برپا نہ کیا جائے اور اس جمود کو نہ توڑا جائے جو ان پر مسلط ہے۔

سرسید اپنی قوم سے ناامید نہ تھے ان کی نظر مستقبل کی طرف تھی وہ قوم کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ وہ وقت کے تقاضوں کو بھی خوب پہچانتے تھے چنانچہ قوم کی تشکیل نو کے لئے سب سے ضروری بات ان کے نزدیک یہ تھی کہ تعلیم و تہذیب کو عام کیا جائے تاکہ ذہن بیدار ہوں۔ احساس زیاں پیدا ہو اور مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا وقار اور عزت دوبارہ حاصل ہو جائے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جسے ایک صدی تک غدر کے نام سے پکارا گیا انتقامی جذبے کے ماتحت انگریزوں نے ہندوستانیوں پر اور خاص طور پر مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے اس کے نتیجے میں دو مکتب خیال کے گروہ پیدا ہو گئے ایک گروہ وہ تھا جو انگریزوں کے ظلم و ستم سے نا جرم کرا تھے ان نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا جبکہ دوسرے گروہ کی رائے یہ تھی کہ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب مغربی تہذیب کی مفید باتوں اور اس کے علوم و فنون سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ملک و قوم کی موجودہ حالت کو سدھارنے کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ سرسید اسی دوسرے گروہ کے نظریات کے حامی تھے ان کا کہنا تھا کہ خرابیاں انگریزوں میں بھی ہیں۔ لیکن ہم ان کے عیب کیوں دیکھیں۔ کیوں نہ ان کی اچھی باتوں کو دیکھیں۔ ساتھ ساتھ اپنے عیوب اور کمزوریوں پر بھی کیوں نہ نگاہ ڈالیں کہ اصلاح کا یہی طریقہ ہو سکتا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے پانچ نمایاں پہلو ہیں۔
۱۔ سیاسی پہلو۔ ۲۔ معاشیاتی پہلو۔
۳۔ ادبی پہلو ۴۔ تعلیمی پہلو اور ۵۔ مذہبی پہلو۔

یوں تو اس تحریک کا ہر پہلو اہم ہے اور اگر کسی ایک پہلو کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا تو یہ تحریک نامکمل رہ جاتی۔ مگر تنگی وقت کی وجہ سے ہر ایک کو تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں لہذا میں سرسری نظر ڈال کر اس تحریک کے تعلیمی و مذہبی پہلوؤں پر زور دوں گی کیونکہ یہی دو پہلو ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے دماغوں کو روشن کیا اور اس طرح مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوا۔

آپ کو معلوم ہے کہ جس زمانے میں سرسید نے معاشرے کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اس وقت مسلمان جہالت۔ افراتفری اور بدحالی میں مبتلا تھے۔ سرسید نے اپنی حکمت عملی سے انگریزوں سے مراعات دلوائیں اور معاشرے کی اصلاح کے لئے رسائل و اخبارات نکالے۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ جو ان کے افکار و تصورات کا بہترین آئینہ ہے رسم و رواج مذہبی مباحث۔ مسائل حاضرہ۔ توہم پرستی پر صاف و سلیس اردو میں مضامین لکھے اس طرح اس پرچے سے دو اہم مقصد پورے ہونے

ایک طرف تو مسلمانوں کو غلط رسوم، بے جا توہمات اور مذہب کے نام پر اندھی تقلید سے نجات دلائی گئی تاکہ ان کے اخلاقی اور تہذیبی معیار کو بلند کیا جائے۔ دوسری طرف اردو زبان و ادب کی بھی اصلاح ہوئی۔ سرسید کے رفقاء نے بھی سادہ اور آسان مگر پُر اثر انداز میں اپنے خیالات و پیغامات لوگوں تک پہنچائے۔ حالی نے مسدس لکھ کر نظم کو ایک نئی جان بخشی۔ آگے چل کر عبدالحلیم شرر، مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد، ڈاکٹر ذاکر حسین، علامہ اقبال وغیرہ نے اس طرز کو اپنا کر اردو زبان کی بے بہا خدمات انجام دیں۔

اردو کے خلاف ہندوؤں کی تحریک سے سرسید کے خیالات بدل گئے تھے اور اس کے بعد سے انھوں نے صرف مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ ان کا کہنا تھا کہ "مجھے اس امر کا پورا یقین ہے کہ ہندو مسلم سیاسی معاملات میں ایک دوسرے کے ہمرکاب نہیں ہو سکتے"۔ سرسید وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے جرأت سے کام لے کر حکومت کو اس کی پالیسیوں کی کمزوریوں کا احساس دلایا۔ اسباب بغاوت ہند جیسی لاجواب کتاب لکھی۔ مسلمانوں کی علیحدہ نمائندگی پر زور دیا اور انھیں ووٹ ڈالنے کا حق دلوایا۔ ذہنوں کی یہ بیداری آگے چل کر پاکستان کے قیام کا باعث ہوئی۔

سرسید دل سے مسلمانوں کی ترقی و بہبود کے خواہاں تھے، ان کو یقین تھا کہ اگر مسلمان جدید علوم حاصل کریں تو وہ ترقی کی طرف گامزن ہو سکتے ہیں۔ تعلیم ذہنوں کو جلا بخشے گی اور ان میں سمجھ بوجھ پیدا ہوگی۔ اس طرح رفتہ رفتہ جہالت بھی دور ہو جائے گی اور قوم ترقی کرے گی۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید نے تعلیم و تربیت پر بہت زیادہ توجہ دی اور قومی تعلیم کے مختلف پہلوؤں سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں جب سرسید برطانیہ گئے تو وہاں کے تعلیمی نظام کا بغور مطالعہ کیا اور واپس آکر علی گڑھ میں ایک اعلیٰ درجہ کی اقامتی درسگاہ کی بنیاد ڈالی جس میں مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ مغربی ادب و سائنٹیفک مضامین پڑھانے کا بھی انتظام کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی اور اسلامی روایات پر پابند رہنے کی بھی ہدایت کی تاکہ نوجوانوں کی صحیح تربیت ہو اور ان میں تہذیب اور شائستگی بھی پیدا ہو۔ اس سے بیشتر ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں ایک اسکول سرسید ہی کی کوششوں سے قائم ہو چکا تھا۔ غازی پور میں بھی ایک ہائی اسکول اور سائنٹیفک سوسائٹی کی ابتدا ہو گئی تھی۔ اخباروں کا اجراء اور مختلف ادبی، سائنسی اور دیگر مضامین کی کتابیں بھی ترجمہ کر کے چھاپی جاتی تھیں مگر سرسید کا اہم اور روشن کارنامہ علی گڑھ میں ایم۔ اے۔ او۔ کالج کا قیام ہے۔ جہاں مسلمان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا تھا۔

یہ علمی تحریک تیزی سے پھیلی اور مغربی تعلیم کو بہت جلد مقبولیت حاصل ہو گئی۔ اس طرح علی گڑھ مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا مرکز بن گیا، جہاں ایسی علمی و ادبی فضا پیدا ہوئی جس کے ذریعہ قوم کی فطری مگر خوابیدہ

صلاحیتیں بیدار ہوئیں جو لڑکے یہاں سے تعلیم پاکر نکلے وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں مفید کام کرکے ملک اور قوم کی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس طرح ایک حد تک سرسید کا مشن کامیاب ہوا۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں جو اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں ان کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی طرف بے توجہی کرلی تھی اور اکثر ایسے عقائد و نظریات اپنا لئے تھے۔ جو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے۔ دین سے ناواقفیت کی بنا پر وہ انہیں اسلام کا ایک جزو سمجھتے تھے۔ یہ غیر اسلامی اثرات اس حد تک سرایت کر گئے تھے۔ کہ خود اسلام کو خطرات کا سامنا تھا۔ چنانچہ ترقی و اصلاح کے لئے حقائق و نظریات کو درست کرنا نہایت ضروری تھا۔ مسلمانوں کی دینی و ذہنی اصلاح کے لئے سرسید احمد خاں نے دینی تعلیم لازمی قرار دی۔ انہوں نے مختلف مذہبی عنوانات پر کتابیں لکھیں۔ طعام اہل کتاب، "مبین الکلام" "نادان خدا پرست و دانا" جیسے عنوانات پر مضامین لکھے۔ کلام پاک کی تفسیر لکھی اور اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ایک کمیٹی اس غرض سے ترتیب دی کہ وہ دورہ کرکے تبلیغ کرے اور مذہبی تعلیم دے۔ اس کمیٹی میں یوں تو بہت سے لوگ شامل تھے۔ مگر مولانا چراغ علی، شاہ ولی اللہ اور مولانا شبلی پیش پیش تھے۔ علاوہ ازیں بعض انگریز مصنفوں نے اسلام و بانی اسلام پر جو اعتراضات کئے تھے ان کے نہایت مدلل اور واضح جواب دیئے۔ غرض کہ ہر طرح سے اسلامی تعلیمات کو عقل کی روشنی میں سمجھنے اور ان پر عمل کرنے پر زور دیا گیا۔

نوجوان نسل سب سے زیادہ اس تحریک سے متاثر ہوئی گھر گھر علم کے چرچے ہونے لگے اور نوجوانوں کو اپنے خاندانوں کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا اور دانستہ یا نادانستہ طور پر جہالت دور کی جانے لگی کچھ روشن خیال لوگوں نے اپنے گھروں میں یا نجی مجلسوں میں تعلیم نسواں کے متعلق بھی اظہار خیال کرنا شروع کیا۔ مولانا سید کرامت حسین جو علی گڑھ میں قانون کے پروفیسر تھے خواجہ غلام الثقلین سید امیر علی جج ہائی کورٹ اور بدرالدین طیب جی بمبئی ہائی کورٹ کے جج تعلیم نسواں کے حامی ضرور تھے مگر اب تک کسی نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا تھا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ ۱۸۹۶ء میں شعبہ تعلیم نسواں تعلیم کو کر دیا گیا تھا مگر ۱۹۰۲ء تک کوئی کام ہونا تو درکنار رہا اس شعبہ کا ایک جلسہ تک نہ ہوا تھا۔ سرسید نے بڑی کاوش اور جانفشانی سے لڑکوں کے لئے علی گڑھ میں کالج قائم کیا تھا۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ وہ زمانہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے سازگار نہیں ہے۔ بہرحال وہ تعلیم نسواں کی موافقت میں نہ تھے یہی وجہ تھی کہ ان کے رفقاء نے بھی اس طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سرسید ہی کے ایک شاگرد رشید شیخ محمد عبداللہ نے تعلیم نسواں کو اپنا مقصد زندگی

بنا لیا۔ انہیں خدا کی مہربانی سے اپنی شریک حیات کا پورا پورا تعاون ملا اور اس طرح دونوں کی پیہم کوششوں سے بے شمار رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود علی گڑھ میں ۱۹۰۶ء میں ایک مسلم گرلس اسکول کی بنیاد پڑ گئی اور مسلمان لڑکیوں کی ترقی کے امکانات بھی روشن ہو گئے۔

اگر علی گڑھ تحریک سے مراد پوری مسلمان قوم کی ترقی و تنظیم ہے تو یقیناً عورتوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کی آدھی آبادی کو تعلیم و ترقی سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ آج یہ چھوٹا سا مدرسہ یونیورسٹی ہائی اسکول اور یونیورسٹی کالج کی شکل میں قائم ہے۔ اور ہندوستان کی مسلمان لڑکیوں کے لئے سب سے بڑی تعلیم گاہ ہے۔ جہاں تقریباً سائنس اور آرٹس کے ہر مضمون کے پڑھانے اور سکھانے کا خاطر خواہ انتظام ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پیشتر تو باہر کے ملکوں سے بھی مسلمان لڑکیاں یہاں بغرض تعلیم آیا کرتی تھیں۔ اس لئے کہ یہاں کی تعلیم اور رہائشی انتظام سے بہتر اور کہیں انتظام نہ تھا۔ دوسرے شیخ محمد عبداللہ جنہیں علی گڑھ والے پاپا میاں کہتے ہیں اور ان کی بیگم جو ہماری اعلیٰ بی تھیں، لوگوں کو اعتماد تھا۔ اور ان کی نگرانی اطمینان بخش تھی۔ یہ دونوں تمام عمر تعلیم نسواں کی ترویج و ترقی میں کوشاں رہے۔ اور اپنی تمام قوتیں عورتوں کو ان کا جائز مقام دلوانے میں صرف کر دیں۔

اس ادارے کی تعلیم یافتہ طالبات ہندوستان پاکستان کے علاوہ باہر کے ملکوں میں مختلف شعبۂ زندگی میں قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ محبت، خلوص اور کچھ کرتے رہنے کا جذبہ اسی علی گڑھ تحریک کا سکھایا ہوا ہے جس کے متعلق ہم بات کر رہے ہیں۔ سرسید نے جو تحریک شروع کی تھی وہ وہ کسی زمانے میں بھی ختم نہیں ہونی چاہیے تھی۔ پاکستان کو آج بھی سرسید جیسی لگن اور جذبہ کی صداقت کی ضرورت ہے تاکہ وطن عزیز برابر ترقی کرتا رہے۔ اور ہم دنیا میں سرخرو رہیں۔ شکریہ۔

آزادی کا سفر

از جناب حکیم شرف الحق صدر آل پاکستان یونانی رجسٹرڈ پریکٹیشنرز ایسوسی ایشن راولپنڈی

قوم کو آزادی کی فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے
۲۹ سال ہو چکے ہیں، غلامی کی ایک لمبی اور تاریک
رات کے بعد پاکستان کی صورت میں آزادی کی جو
روشن صبح ہمارے لئے طلوع ہوئی ہے ہم ابھی تک
اس کی اہمیت سے پوری طرح باخبر نہیں ہو سکے ہیں۔
آزادی کس نعمت کا نام ہے؟ اس کا صحیح اندازہ وہی
لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے غلامی کی زنجیروں میں مقید
ہو کر غلامی کے زخموں کو اپنی روحوں اور جسموں پر تڑپتے
دیکھا ہو۔ ان ۲۹ سالوں میں غلامی کی زنجیروں کو
توڑ کر آزادی کی نعمت عظیم سے بہرہ ور ہونے والی
نسل نے ایک نئی نسل کو جوان بنا کر مملکت پاکستان
کی سرحدوں کے اندر پھیلا دیا ہے۔ چونکہ اس نئی نسل
نے غلامی کا زہر نہیں چکھا، تو جوانوں نے تحریک پاکستان
کے پس منظر کو اپنی چشم بینا سے نہیں دیکھا۔ اس
لئے وہ مملکت پاکستان کی اس قدر و قیمت سے
پوری طرح واقف نہیں ہیں جس کا اپنے قیام سے
لے کر اب تک پاکستان بجا طور پر مستحق ہے۔

آزادی کے دوراہے پر کھڑے ہو کر اگر آج
ہم اپنے ماضی کی طرف نگاہ کریں تو تلخیوں اور وطن
سے بیگانگی کے سلسلے ہمارے ذہن کا بوجھ بن جائیں گے۔
ہم نے ترقی کی شاہراہوں پر گامزن ہونے کا عزم لے کر
اپنی آنے والی نسلوں کے لئے ایک آزاد ملک کا مطالبہ
کیا تھا اور اپنے قائد کی قیادت میں آزادی کی عظیم
جدوجہد کے بعد پاکستان کا حصول ممکن ہو سکا تھا۔
اگر ہم بانیٔ پاکستان کے بتائے ہوئے اصولوں پر کاربند
رہتے تو ہمیں ہزیمت، عبرت اور تلخیوں کے احساس
سے کبھی واسطہ نہ پڑتا۔ اب عظیم تر پاکستان کی نئی
تعمیر و ترقی کے لئے ضروری ہے کہ نئی نسل کو تحریک
پاکستان کی تمام جدوجہد سے روشناس کرایا جائے۔

پاکستان کا قیام ایک عارضی انقلاب کا نام نہیں
بلکہ یہ مسلمانوں کی ایک طویل جدوجہد آزادی کا شیریں
ثمر ہے۔ اگر یہ تاریخی عمل اپنے ارتقا کو نہ پہنچتا تو آج
برصغیر کی تاریخ مختلف ہوتی اور مسلمان سر چھپانے
کے ٹھکانے سے بھی محروم ہو جاتے۔ پاکستان کے قیام
سے پہلے متعصب ہندوؤں کی نظر میں مسلمان کانٹے
کی طرح کھٹکتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان
کی سرزمین پر خدا اور اس کے رسول کے نام لیوا موجود
نہ رہیں اور ہر طرف ہندو ازم کا بول بالا ہو۔ ہندوستان
پر اپنے طویل دورِ اقتدار میں مسلمان حاکموں نے ہندوؤں
سکھوں اور دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ

جو منصفانہ، مساویانہ اور عدل و انصاف پر مبنی
سلوک روا رکھا تھا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں
لیکن اسلامی دورِ حکومت میں امن و سکون کے گیت
الاپنے والے ہندوؤں نے مشفقانہ اور حسن سلوک
کا جو بدلہ مسلمانوں کو دینے کی کوشش کی ہے اس کا اگر
بغور جائزہ لیا جائے تو ہندو ازم کے ناپاک عزائم سامنے
آنے کے علاوہ ہندوؤں اور انگریزوں کی مسلمانوں سے
ازلی نفرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے حقیقت
یہ ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کی رواداری، عدل
اور مساوات جیسے احسانات کو یکسر فراموش کر کے مسلمانوں
کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سازش کی اور اس طرح
ان کا نام تاریخ عالم میں ایک احسان فراموش اور
انسان دشمن کے نام سے موسوم ہوا۔

انگریزوں نے مسلمان حاکموں سے ایک تاجر
کی حیثیت سے ہند کی سرزمین پر قدم رکھنے کی اجازت
طلب کی اور قدم جماتے ہی ہندوستان پر حکومت
کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اور بالآخر چند وطن
فروشوں کا ایمان خرید کر مسلمانوں کے عدم اتحاد، نااتفاقیوں
خانہ جنگیوں اور غداران وطن کی ریشہ دوانیوں
کے سبب ہندوستان پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔
انگریزوں نے مسلمانوں کے ذہنوں سے آزادی اور
شعور کے ہر احساس کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔
مگر قدرت نے غلامی کے اندھیروں میں بھٹکنے والی مسلمان
قوم کو ایسے عظیم راہنما عطا کئے جنہوں نے انگریزوں
کے رعب اور دبدبے کو للکارا اور اعلان کیا کہ روئے
زمین کی کوئی طاقت مسلمانوں کی آزادی کو سلب
نہیں کر سکتی۔ غیر مسلموں کو مسلمانوں سے جو نفرت تھی
اور اسلام کے دشمن، اسلامی روایات کو مٹانے، تہذیب
و تمدن کو نیست و نابود کرنے کی جن مذموم سازشوں
میں مصروف تھے ان سے باشعور مسلمان بے خبر نہیں
تھے۔ اور جب انگریزوں کے لئے ہندوستان میں
مزید قیام ممکن نہ رہا تو انگریزوں اور ہندوؤں نے
باہمی گٹھ جوڑ سے ایسے اسباب پیدا کرنے چاہے
کہ انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد
حکومت کے عملاً اختیارات ہندوؤں کے ہاتھ میں چلے
جائیں اور مسلمان بدستور بے دست و پا رہ کر غلامی
کی زندگی بسر کریں۔

مسلمانوں کے قائد اور حریت پرست ان خطرناک
عزائم کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ ہواؤں کا رخ
پہچان کر اپنی منزل کا تعین کرنے کے عظیم مشن سے
بھی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ دو ملکوں کا نہیں
حق و باطل کا ٹکراؤ ہے۔ دو تہذیبوں دو متضاد
مذہبوں کا سامنا ہے اور اگر مسلمانوں نے یہ بالادستی
تسلیم کر لی تو آنے والی نسلوں کو ذلت آمیز غلامی
سے واسطہ پڑے گا۔ ہندوؤں کی منفی جدوجہد کا
واضح مقصد پورے ہندوستان پر ان کی حکمرانی
اور مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم ختم کرنا تھا۔ جب کہ
مسلمان صرف یہ چاہتے تھے کہ جداگانہ تہذیب و تمدن
اور مختلف مذہب ہونے کی وجہ سے ان کا ایک الگ
وطن ہو جہاں کسی کی بالادستی نہ ہو۔ اور مسلمان اپنے

خدا اور رسول کے احکامات کے مطابق آزاد زندگی بسر کرسکیں مسلمان اسی مقصد کے لئے کوشاں تھے لیکن اس مقصد کی راہ میں دیوار کھڑی کرنے کے لئے انگریزوں نے ہندوؤں کے ایما پر "انڈین نیشنل کانگریس" کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں رکھوادی اور اس کے پلیٹ فارم سے اعلان ہوا کہ انڈین کانگریس تمام مذاہب کے ماننے والوں کے حقوق کا تحفظ کرے گی لیکن اس پُرفریب نعرے کے باوجود اس جماعت کے اکابرین کی آستینوں میں چھپے ہوئے وہ خنجر پوشیدہ تھے جو مسلمانوں کی پشت میں گھونپنے کے لئے ہندو راہنماؤں نے حسین الفاظ کے فریب میں چھپا رکھے تھے مسلمان راہنما جان گئے کہ مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کو ختم کروانے کے لئے محبت اور اخوت کا یہ سنہرا جال بچھایا گیا ہے خصوصاً سرسید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کو کانگریس کے عزائم سے بروقت آگاہ کرکے اس جماعت میں شامل نہ ہونے کی ہدایت کی۔

انہی وجوہات کی بنا پر مسلمانوں نے محسوس کیا کہ آزادی کی جدوجہد کو تیز تر کرنے کے لئے ان کی اپنی ایک جماعت ہونی چاہیئے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں "آل انڈیا مسلم لیگ" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ مسلمانوں کی منظم اور فعال، سیاسی جماعت تھی جو مسلمانوں کے حقوق کا دفاع اور مذہب کی سلامتی کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کانگریس سے بھی تعاون کرتی رہی۔ اس دوران مسلمان اپنے راہنما قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں برصغیر ہند میں ہی اپنے لئے ایک الگ اور خودمختار ملک کے حصول کے لئے کوشاں رہے۔ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی نو کروڑ تھی لیکن ہندو ازم کے متعصب داعی یہ اعلان کر رہے تھے کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کی مستحق صرف دو ہی قومیں ہندو اور انگریز ہیں۔ یہ ایک ایسی عظیم قوم کو نظرانداز کرنے کی بدترین مثال تھی، جس نے ایک طویل عرصہ تک ہندوستان کے طول و عرض پر شاہانہ حکومت کی تھی۔ اس موقع پر قائداعظم بپھرے ہوئے سمندر کی طرح آگے بڑھے اور انہوں نے ہندو لیڈروں کو للکار کر کہا کہ ہندوستان میں ان دو قوموں کے علاوہ ایک اور قوم مسلمان بھی موجود ہے، ہندوستان کے نو کروڑ مسلمان ایک قوت کے مالک ہیں۔ اور کوئی اور قوم ان پر حکمرانی نہیں کرسکتی اور مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن ہندو ازم سے قطعی مختلف ہے۔

قائداعظم اپنی قوم کی زبوں حالی دیکھ کر خون کے آنسو، رو رہے تھے وہ عظیم قوم جس کی عظمت اور سطوت کی داستانیں اور جس کے عظیم الشان دورِ حکومت کی بے شمار یادگاریں ہندوستان کے چپے چپے پر بکھری ہوئی تھیں، ہندوؤں اور انگریزوں کی سازشوں سے اس حد تک نیچے آچکی تھی کہ ہندو راہنما مسلمانوں کی کثیر آبادی کے باوجود ان کی کوئی حیثیت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس پر ستم یہ کہ مسلمانوں پر اہم سرکاری اور کلیدی ملازمتوں کے دروازے بند کردیئے گئے تھے مسلمانوں سے ناروا سلوک اختیار کیا جاتا تھا۔

اور ان کی تہذیب و تمدن اور عظمت کے ہر نشان کو مٹانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔

قوم ذلت کی جتنی بھی گہرائی میں کیوں نہ ہو اگر قدرت اسے کوئی مخلص لیڈر عطا کر دے تو وہ گئی گذری قوم کو بھی خواب غفلت سے جگا کر نئی زندگی دے سکتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بھی گم گشتہ ماضی سے دور ہو چکے تھے لیکن ان کی جرأت ایمانی اور جذبۂ غیرت ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ بے دست و پا اور غلام ضرور تھے مگر ان کے سینوں میں عزم کے جو چراغ روشن تھے، انہیں نہ تو ہندوؤں کی سازشیں بجھا سکتی تھیں اور نہ ہی انگریزوں کا اسلحہ اور جاہ و جلال ان سے روشنی چھین سکتا تھا۔ دشمنانِ اسلام کی سرگرمیاں عروج پر تھیں، مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنے کے حربے آزمائے جا رہے تھے مسلمانوں نے جب بھی آزادی کی کسی تحریک کی ابتدا کی تو طاقت کے بل بوتے پر اسے کچلنے کی کوشش کی گئی لیکن ـــــ مسلمان جنہوں نے اس کائنات میں خدائے عزوجلال کے سوا کسی اور کے سامنے سر جھکانا نہیں سیکھا، وہ اپنے سینے پر گولیاں کھا کر اپنے لہو سے آزادی کی تاریخ لکھتے رہے۔ اور مسلمانوں کے الگ دیس کا مطالبہ حریت پرستوں کے خون میں ڈوب کر اس حد تک نکھرتا رہا کہ ہر مسلمان کو الگ خطۂ زمین کے حصول کا یقین ہوتا چلا گیا۔ ایک ایسا خطہ زمین جہاں خدا اور اس کے رسول کی حکمرانی ہو، جہاں مسلمان عزت اور آبرو سے زندگی بسر کر سکیں۔

۲۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجتماع منعقدہ الہ آباد میں حکیم الامت، شاعر مشرق علامہ محمدؒ اقبال نے اپنے صدارتی خطبہ میں یہ تاریخی اعلان کیا تھا کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک علیحدہ مملکت بنا کر اس کا نظم و نسق مسلمانوں کے سپرد کیا جائے (بعد میں علامہ اقبالؒ نے کشمیر کو بھی ان علاقوں میں شامل کر لیا تھا۔) اس تاریخی جلسے کے بعد چوہدری رحمت علی نے علامہ اقبال کے ارشاد کو "پاکستان" کا نام دے کر قوم کے سامنے پیش کیا۔

پاکستان اپنے پاکیزہ نام اور مسلمانوں کے لئے موزونیت کے سبب ہندوستان کے گلی کوچوں میں گونجنے لگا اور بچہ بچہ "لے کے رہیں گے پاکستان" کا نعرہ لے کر میدانِ عمل میں نکل آیا۔ یہ آزادی کی روشنی کا وہ سیلاب تھا جسے روکنا ہندوؤں اور سکھوں کے بس کا روگ نہ تھا۔ اگر کاروانِ آزادی رواں دواں نہ رہتا تو انگریزوں اور ہندوؤں کی خواہش کے مطابق آزادی کے بعد مسلمان ہندوؤں کے زیر تسلط آ جاتے۔

بالآخر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک لاہور میں قائداعظم کی صدارت میں منعقد ہونے والے تاریخی اجلاس میں وہ مبارک ساعت آگئی جب مسلمانوں نے ایک قرارداد کی صورت میں "قیام پاکستان" کا باقاعدہ مطالبہ کر دیا۔ یہ قرارداد تاریخ کے اوراق میں "قرارداد پاکستان" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس تاریخ ساز قرارداد کو پیش کرنے کا فخر شیر بنگال مولوی فضل الحق کو حاصل ہوا تھا۔

قرار داد پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی مخالفین
کی صفوں میں تلاطم برپا ہو گیا۔ مسلمانوں کے اس مطالبے
کا مقصد نہایت واضح اور روشن تھا۔ یہ مطالبہ پورا
ہونے کی صورت میں، نہ صرف ہندوؤں کی تمام سازشیں
ناکام ہو جاتیں بلکہ مسلمانوں کو ایک مرتبہ پھر اقوام
عالم میں نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہو جاتا۔ یہی
قائد اعظم اور ہند کے مظلوم مسلمانوں کا مقصد حیات
تھا مگر ہندو، سکھ اور انگریز ایسا ہرگز نہیں چاہتے
تھے۔ انہوں نے قرار داد پاکستان کی شدید مخالفت
کرتے ہوئے مختلف چالوں اور حیلے بہانوں سے اس
قرارداد کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر جب مسلمان
جان ہتھیلی پر رکھ کر اور سر سے کفن باندھ کر میدان
میں نکل آئے تو قیام پاکستان کے راستے کی ہر دیوار
ریت کے گھروندے کی طرح مسمار ہوتی چلی گئی۔ نہ
ہندوؤں اور سکھوں کی خونریزیاں مسلمانوں کو راہ حق
سے ہٹا سکیں اور نہ ہی انگریزوں کی عیاری اور مکاری
جد وجہد آزادی کو ختم کر سکی۔

قائد اعظم پر ہر طرف سے اندرونی اور بیرونی
دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ "پاکستان" کا نعرہ ترک
کر دیں لیکن قائد اعظم اپنے قومی موقف پر ڈٹے رہے۔
انہوں نے اعلان کیا کہ پاکستان کروڑوں مسلمانوں کے
دل کی آواز ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں دبا
سکتی اور اس مطالبے کو ہر صورت تسلیم کرنا پڑے گا۔
۵ رجون ۱۹۴۶ء کو قائد اعظم مسلم لیگ کے دہلی میں منعقد
ہونے والے اجلاس میں واشگاف الفاظ میں گرجے۔

"مسلمانانِ ہند۔ اس وقت تک چین
کا سانس نہیں لیں گے جب تک آزاد
پاکستان قائم نہیں کر لیتے۔ میں ایک مرتبہ
پھر پوری قوت کے ساتھ اعلان کر دینا
چاہتا ہوں کہ ہم اپنی منزل کو حاصل
کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں اور ہم ہر
مشکل کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہیں۔
ہمیں پاکستان قائم کرنے میں اب دنیا کی
کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"

اس اثنا میں انگریزوں نے اپنی سیاست کی بساط
پر ایک اور چال چلی۔ اور انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں
کے مابین سیاسی وسماجی کشمکش کو قطعی طور پر نظر
انداز کر کے ۲ر ستمبر ۱۹۴۶ء کو پنڈت جواہر لال نہرو
کو ہندوستان کا عبوری وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اس
عبوری حکومت میں مسلمانوں کو دبانے اور کچلنے کے
لئے جو مظالم کئے گئے ان کی تفصیل سن کر حیرت سے
رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ کیا انسان، انسانوں
کے ساتھ ایسا سلوک بھی روا رکھ سکتا ہے؟ کانگریس
کی وزارت کے دوران ہندوستان بھر میں مسلمانوں کو
گاجر مولی کی طرح کاٹنے کی وحشیانہ مہم جاری رہی۔
ہندو سمجھتے تھے کہ یہ غیر انسانی حرکات شمع آزادی کے
پروانوں کے جذبۂ شوق کو کچل دیں گی مگر یہ ان کی
خام خیالی تھی۔ اس ظلم وستم کو مسلمانوں نے ایک ایسا
امتحان سمجھ کر برداشت کر لیا جس میں سے گذر کر بالآخر
انہیں عروس آزادی کا دیدار کرنا تھا۔ الغرض ظالموں

ے ظلم جاری رہے اور آزادی کے مسافروں نے کبھی
اپنا سفر ختم نہیں کیا۔

یکم دسمبر ۱۹۴۶ء کو قائداعظم انگریزوں سے
مذاکرات کرنے لندن تشریف لے گئے۔ راستے میں انہوں
نے ایک مرتبہ پھر اپنے اس موقف کا اعلان کیا کہ "میں
کسی ایسے آئین کو ہرگز قبول نہیں کروں گا جس سے
ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوؤں
کے غلام بن کر رہ جائیں۔ اور میں آزادی کی اس جدوجہد
سے کسی صورت دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

لندن سے واپسی پر قائداعظم نے عرب لیگ
کے ایک خصوصی اجتماع میں شرکت کی اور عربوں سے
ارشاد فرمایا کہ

"عالم اسلام کا وقار اور حقیقی سکون
پاکستان کے قیام میں پوشیدہ ہے اور
مشرق وسطی کی اسلامی ریاستوں کو
غیر ملکی تسلط کے اثرات سے بچانے کے
لئے پاکستان کا قیام لازمی امر ہے!"

اس موقع پر قائداعظم نے تمام مسلم ممالک سے قیام
پاکستان کی حمایت کرنے کی اپیل کی اور آگاہ کیا کہ اگر
پاکستان قائم نہ ہو سکا تو ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں
کو انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی کا طوق اپنے گلے
میں ڈالنا پڑے گا۔

کانگریس کی وزارت کی صورت میں فرنگی
چال ناکام ہو چکی تھی۔ کیونکہ پاکستان کے قیام کے مسئلے
کو ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اپنی زندگی اور موت
کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ مسلمانوں نے ہر ظلم اور ہر فریب کے
جواب میں صرف ایک ہی نعرہ بلند کیا۔ آزادی یا موت
اور جب موت کا تصور لے کر کوئی قوم میدان میں اتر
آئے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے مرعوب نہیں کر سکتی۔

۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان
کے نئے وائسرائے مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنا عہدہ سنبھالتے
ہی اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ جون ۱۹۴۸ء تک حکومت
کے تمام اختیارات ہندوستان کے سپرد کر دے گی۔
انگریزوں کی طرف سے حکومت سے دستبرداری کے
اس اعلان نے مسلمانوں کے جذبۂ آزادی کو زبردست
تقویت دی لیکن اس اعلان کے فوراً بعد ہندوؤں
اور سکھوں نے باہمی سازش سے مسلمانوں کا قتل
عام شروع کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں نے آزادی
کی جس جنگ کو تقریباً ایک صدی سے شروع کر رکھا ہے
وہ بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو جائے اور انگریزوں کے
چلے جانے کے بعد وہ مسلمانوں پر حکمرانی کر کے ان کے
لئے عرصۂ حیات تنگ کر دیں۔ مگر ان تمام سازشوں
اور رکاوٹوں کے باوجود ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دنیا کے
نقشے پر سب سے بڑے اسلامی ملک "پاکستان"
نے ابھر کر قائداعظم محمد علی جناح ان کے ساتھیوں اور
کروڑوں مسلمانوں کے خیالوں اور خوابوں کو عملی صورت
عطا کر دی اور اس طرح جد و جہد کے ایک طویل اور
کٹھن دور سے گزر کر مسلمان آزادی کی نعمت سے
بہرہ ور ہوئے۔

مولانا آزاد لائبریری

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(از محمد عبدالشاہد خاں شروانی اسسٹنٹ لائبریرین شعبۂ مخطوطات وانچارج اورینٹل ڈویژن مولانا آزاد لائبریری)

یہ عظیم المرتبت اور رفیع المنازل کتاب خانہ احاطۂ مسلم یونیورسٹی کے وسط میں اپنی وسیع و عریض ہفت منزلہ عمارت اور شرقی طرز کے خوشنما صدر دروازہ کے ساتھ بڑی شان و عظمت لئے ہوئے ہر زائر کو کچھ دیر کے لئے ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

اس عمارت کا نقشہ مشہور انجنیئر مسٹر فیاض الدین حیدرآبادی نے بنایا تھا جس کا سنگ بنیاد پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند نے ۲۲ نومبر ۱۹۵۵ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے دور وائس چانسلری میں رکھا تھا اور افتتاح ۶ دسمبر ۱۹۶۰ء کو کرنل سید بشیر حسین زیدی وائس چانسلر کے عہد میں کیا تھا۔ حکومت ہند کا بارہ لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ اس پر صرف ہوا۔ اس عمارت کا رقبہ تین لاکھ بیس ہزار ایک سو بائیس فٹ مربع گز ہے۔ اگر اس کے مشرقی مغربی اور جنوبی وسیع شاداب اور خوش منظر لانوں کو شامل کرلیا جائے تو یہ رقبہ بہار پند ہو جائے گا۔

دسمبر ۱۹۶۰ء ہی سے یہ کتاب خانہ ۷۸ سال لٹن لائبریری کے نام سے موسوم رہنے کے بعد

"مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری"

کے نام پر مبدل ہوگیا اور اب "مولانا آزاد لائبریری" کے نام سے شہرت پاتا ہے۔

اس لائبریری کی موجودہ رفعت و منزلت تمام تر مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند کی رہین منت ہے۔ فروری ۱۹۴۹ء میں جب مولانا وزیر تعلیم کی حیثیت سے کانووکیشن ایڈریس کے سلسلے میں مسلم یونیورسٹی میں تشریف لائے اور لٹن لائبریری کی عمارت میں پہنچکر اس کا سرسری جائزہ لیا تو عمارت کو ناکافی محسوس کرتے ہوئے اسکی جدید شاندار و متکفل ضروریات عمارت کے تخیل کا اظہار فرمایا۔ اور واپس جاکر اس کو عملی جامہ پہنانے کی تدابیر شروع کیں جسے اپنی زندگی ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ کسے خبر تھی کہ فروری ۱۹۵۸ء میں وہ رہگزار عالم جاودانی ہوجائیں گے اور پنڈت جواہر لال نہرو ہی کو اس کا افتتاح بھی کرنا پڑے گا اور انھیں کے نام سے یہ لائبریری موسوم بھی کرنا ہوگی۔

مسلم یونیورسٹی کی اس لائبریری سے مولانا آزاد کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اسی آثر یف آوری کے موقعہ پر جب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی سے ملنے ان کی کوٹھی "حبیب منزل" میرس روڈ تشریف لے گئے تو انہے صدیق مکرم کو ہم لوگوں کی موجودگی میں توجہ دلائی کہ اپنا نادر الوجود اور بیش بہا کتاب خانہ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری کو مرحمت فرما دیں۔ نواب صاحب

نے اس شرط پر یہ مشورہ قبول کیا کہ مولانا آزاد خود حبیب گنج آکر اس کارِ خیر کو انجام دیں۔

افسوس کہ مولانا آزاد اپنی ملکی و قومی سرگرمیوں کی وجہ سے یہ وعدہ پورا نہ فرما سکے اور نواب صاحب ڈیڑھ سال بعد اگست ۱۹۵۰ء میں جوارِ رحمتِ خداوندی میں پہنچ گئے۔ مولانا آزاد کو اسکا افسوس رہا۔ اس کے بعد جب میں حاضر خدمت ہوا، تو نواب صاحب کے خلف الصدق مولوی حاجی محمد عبیدالرحمن خاں شروانی کو میرے ذریعہ پیغام بھیجا۔ بالآخر یہ کتاب خانہ دسمبر ۱۹۶۰ء میں نئی لائبریری میں آگیا اور اس کی وجہ سے مولانا آزاد لائبریری کی اہمیت میں دو چند اضافہ ہوگیا۔ اس کتاب خانہ کو حبیب گنج سے علی گڑھ منتقل کرانے میں راقم الحروف بھی ذاتی و صفاتی طور پر شریک رہا۔

آغاز | اس لائبریری کی ابتداء بانیِ درسگاہ سرسید احمد خاں اور ان کے خلف الرشید سید محمود کی کتابوں سے مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ (قائم شدہ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء) کے ایک کمرہ میں ۱۸۷۷ء میں ہوئی۔ جب اسی سال "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے لارڈ لٹن وائسرائے ہند علی گڑھ آئے، تو ان کی منظوری سے اس کا نام "لٹن لائبریری" رکھا گیا اور موجودہ سرسید ہال میں اسٹریچی ہال سے متصل ایک ہال اور پانچ کمروں پر مشتمل عمارت میں ۱۹۶۰ء تک اسی نام سے موسوم رہی۔

سرسید کی کتابوں میں مخطوطات بھی تھے جن میں حمد اللہ مستوفی قزوینی متوفی ۷۵۰ھ کی تاریخ گزیدہ مصنفہ ۷۳۰ھ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ہر ورق پر سات مہریں ہیں ایک مہر "تابع شرعی محمد اسحاق" کی ہے۔ یہ نسخہ ابوالفیض فیضی فیاضی متوفی ۱۰۰۴ھ کی ملکیت میں رہا ہے۔ سرورق پر ان کی مہر اور دستخط ہیں۔ اول و آخر اوراق پر "سید احمد" کی مہریں ہیں۔

یہ نسخہ باریک نستعلیق خط میں خوشخط لکھا ہوا ہے ناقص الآخر ہونے کی وجہ سے سال کتابت کا پتا نہیں چل سکا۔ مصنف نے یہ کتاب لکھکر وزیر غیاث الدین بن رشید الدین صاحب جامع التواریخ کی خدمت میں پیش کی تھی۔

سید محمود کی کتابوں میں القانون فی الطب اور کتاب النجاۃ بھی شامل تھے جو باریک نسخ ٹائپ میں ۱۵۹۳ء کے مطبوعہ روم ہیں۔ پونے چار سو سال گزرنے پر بھی ان کا کاغذ پائدار اور مضبوط ہے۔ یہ دونوں کتابیں مصنفہ بوعلی ابن سینا متوفی ۴۲۸ھ ہیں اور لائبریری میں قدیم ترین مطبوعات ہیں۔

رفتارِ ترقی | یہ لٹن لائبریری ۸۴ سال (۱۹۶۰ء تک آہستہ خرامی پر قدم فرسا رہی یعنی جب یہ پرانی عمارت سے منتقل ہو کر نئی عمارت میں آئی تو اسکا اسٹاف ۱۸ افراد پر مشتمل تھا اور کتابوں کی تعداد بہ تفصیل ذیل ۱۸۲۰۱۶ تھی۔

انگریزی وغیرہ	۱۱۵۰۳۹
عربی	۸۲۸۴
فارسی	۵۵۰۵
اردو	۳۰۷۸۵
ہندی و سنسکرت	۶۴۱۹
مخطوطات	۸۹۸۴ (قلمی نسخے، فرامین، دستاویزات وصلیات، تصاویر وغیرہ)
	۱۸۲۰۱۶

"مولانا آزاد لائبریری" ہونے کے بعد ۱۹۶۱ء سے اس کتابخانہ نے تیزگامی اختیار کی۔ اس کا اندازہ اس رفتارِ ترقی سے ہوسکتا ہے کہ مالی سال ۷۱-۱۹۷۰ء کے خاتمہ پر ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء کو ۱۱ سال میں اسکے اسٹاف اور کتابوں کی تعداد علی الترتیب ۱۱۹ اور ۳۹۲۵۳۵ تھی۔ لٹن لائبریری نے ۸۴ سال میں جتنی ترقی کی تھی مولانا آزاد لائبریری نے ۱۱ سال میں اس سے سہ چند

ترقی کی۔ ۶۱-۱۹۶۰ء میں ۴۱ ملازمین میں عہدیداروں میں لائبریرین کے علاوہ ایک اسسٹنٹ لائبریرین، ایک اور پرنسپل اسسٹنٹ اور دو لائبریری اسسٹنٹ تھے اور منظور شدہ بجٹ ۱۹۵۶۹۲ تھا۔ ۷۲-۱۹۷۱ء میں یہ بجٹ ۹،۰۷،۴۵۰ روپیہ پہنچ گیا۔ اسٹاف اور کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے:۔

اسٹاف

لائبریرین	۱
ڈپٹی لائبریرین	۱
اسسٹنٹ لائبریرین	۵
پروفیشنل اسسٹنٹ	۱۲
سیمی پروفیشنل	۲۲
دفتری عہدیداران	۵
فرسٹ گریڈ کلرک	۴
سکنڈ "	۱۲۰
تھرڈ "	۳۶
جلد ساز	۱۲ (مختلف گریڈ)
خاکروب	۴
	۱۲۰

کتب

انگریزی	۳۱۸۴۶۵
اردو	۶۱۱۸۹
عربی	۲۱۱۸۳
فارسی	۱۳۱۲۸
ہندی	۱۶۹۳۰
سنسکرت	۴۲۸۰
ملیالم	۱۹۰۵
تلگو	۱۷۶۵
تامل	۳۱۰
ترکی	۲۶۱ (مع روسی)
پشتو	۴۷
مراٹھی	۷۹
بھاشا	۵
بنگالی	۲
مخطوطات	۱۳۲۸۱
	۴،۵۳،۵۵۰

سہولتِ مطالعہ | طلبہ و اساتذہ کے لئے خصوصاً اور دیگر مقامی و بیرونی دانشوروں کے لئے عموماً اس لائبریری میں تین بڑے ہال جنھیں کرسیوں، میزوں، اور ہر ہال کے مناسب و موزوں الماریوں میں کتابوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ دار المطالعہ کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ دو ہالوں کے بالائی حصوں میں ۴۰ کیبن بھی بنائے گئے ہیں جو ریسرچ اسکالروں کو الاٹ کر دیئے جاتے ہیں جہاں بیٹھکر وہ تنہائی میں سکون و یکسوئی سے رات تک کام کر سکتے ہیں۔ نیچے کے یہ دونوں ہال بطور ریڈنگ روم علی العموم ۶ بجے شام تک اور امتحانات کے زمانے میں ۱۰ بجے رات تک کھلے رہتے ہیں جبکہ لائبریری ۴ بجے شام بند ہو جاتی ہے۔ ان تینوں ہالوں کے علاوہ، اورینٹیل ڈپارٹمنٹ، پیریڈیکل سیکشن اور ہندی و سنسکرت سیکشن کے ہالوں میں بھی مطالعہ و ریسرچ کا انتظام ہے۔ یہاں خاصی تعداد میں میزیں اور کرسیاں مطالعہ کرنے والوں کے لئے مہیا کر دی گئی ہیں اور ضرورت مند برابر

سرگرم مطالعہ رہتے ہیں۔

مشرقی شعبہ

اس لائبریری کا وقار اور اہمیت اس کے مشرقی شعبے کی وجہ سے ہے۔ یہ شعبہ جو عربی، فارسی، اردو، بھاشا، ترکی اور پشتو پر مشتمل ہے۔ تقریباً ایک لاکھ دس ہزار کتابوں کا ذخیرہ عظیمہ رکھتا ہے۔ اس کی تقسیم مطبوعات اور مخطوطات دو حصوں پر ہے۔ دونوں حصے اپنے نوادر و خصوصیات کی بناء پر دوسرے مشرقی کتاب خانوں سے بڑی حد تک ممتاز و منفرد ہیں۔ یہ شعبہ زیادہ تر اکابر ملت اور ارباب علم و خیر کے عطیات کا رہین منت ہے۔ قابل ذکر معطیان میں حسب ذیل اسماء گرامی سرفہرست ہیں:

ان حضرات نے جن میں اداروں کے ناظمین بھی شامل ہیں اپنی مادر درسگاہ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری کو مزین کرنے کے ساتھ اپنے ذخیروں کو محفوظ کر دینے کا سروسامان بھی کیا ہے:-

(۱) سبحان اللہ گلشن، عطیہ مولوی سبحان اللہ خاں رئیس گورکھپور،
(۲) سلیمان گلشن۔ عطیہ سر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد
۳۔ منیر عالم " " شاہ منیر عالم غازی پور
۴۔ احسن " " سید علی احسن مارہرہ
۵۔ عبدالحی " " مہدی انصاری فرنگی محل لکھنؤ
۶۔ شیفتہ " " نواب محمد اسحاق خاں رئیس جہانگیرآباد۔ میرٹھ
۷۔ قطب الدین " " ابوالقاسم (جج) اناؤ
۸۔ آفتاب " " مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ
۹۔ حبیب گنج " " مولوی حاجی حبیب الرحمن خاں شروانی رئیس حبیب گنج علی گڑھ
۱۰۔ جواہر میوزیم " " اسلامیہ کالج اٹاوہ

مالی سال مختتم ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو مطبوعات کی تعداد بہ تفصیل ذیل تھی:"

عربی	۲۱۱۸۳	بھاشا	۵
فارسی	۱۳۱۲۸	ترکی	۳۹
اردو	۹۱۸۹	پشتو	۸۵۳۷
			۹۵۵۸۱

ان مطبوعات میں ہر قسم کے نوادر آپ کو ملیں گے اور اکثر ایسی کتابیں بھی ملیں گی جن کا اب دستیاب ہونا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوگا۔ کچھ ایسی کتابوں کا تذکرہ جو قدیم مطبوعات کا درجہ رکھتی ہیں فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

مطبوعات عربیہ

۱۔ القانون فی الطب۔ ابن سینا۔ مطبوعہ روم ۱۵۹۳ء
۲۔ کتاب النجاۃ " " " "
۳۔ مقامات الحریری مع ترجمہ لاطینی۔ الحریری مطبوعہ روستاخ ۱۶۳۹ء
۴۔ انجیل یوحنا " " پیٹاوہ ۱۶۵۲ء
۵۔ نظم الجوہر کتاب المجموع علی التحقیق التصدیق۔ سعید ابن بطریق مطبوعہ آکسفورڈ ۱۶۵۶ء
۶۔ التاریخ المشرقی۔ جان ہنری کوہ ہیتنگر و۔ ۱۶۶۰ء
۷۔ بائبل۔ عربی و لاطینی۔ مطبوعہ روم ۱۶۷۱ء
۸۔ العہد الجدید و وصایا اثنا العشر ۱۶۷۲ء
۹۔ سیرۃ السلطان صلاح الدین ایوبی۔ بہاء الدین شداد مطبوعہ ہولینڈ ۱۷۳۲ء
۱۰۔ مورد اللطافہ۔ جمال الدین تغری بردی۔ " لندن ۱۷۹۲ء
۱۱۔ تشنیف العقود فی ذکر النقود۔ المقریزی احمد بن علی " " ۱۷۹۶ء
۱۲۔ ذکر فتح جزیرۃ ذودوس۔ احمد بن قاسم الکوفی " " ۱۷۹۷ء
۱۳۔ الف لیلۃ و لیلۃ " " ۱۷۹۸ء
۱۴۔ البغیۃ الباحث عن جمل المواریث " " ۱۷۹۹ء
۱۵۔ التواریخ القدیمۃ من المختصر فی اخبار البشر۔ " نیبرک ۱۸۳۱ء

قدیم مطبوعات عربیہ، ہند

۱۔ مجموعۃ الکتاب المتداولۃ لدرس النحو سبحان بیلی۔ مطبوعہ کمپنی پریس کلکتہ ۱۸۰۵ء
۲۔ نفحۃ الیمن۔ احمد الشروانی مطبوعہ ہندوستانی پریس " ۱۸۱۱ء
۳۔ رسالۃ من رسائل اخوان الصفا " " " " ۱۸۱۲ء
۴۔ السلاطین انسا بالیمنہ۔ جواد ساباط " " " ۱۸۱۳ء
۵۔ دیوان المتنبی۔ المتنبی " " " ۱۸۱۴ء
۶۔ القطبی۔ قطب الدین الرازی " " " ۱۸۱۶ء

۷ - الفوائد الضیائیہ - عبدالرحمن جامی مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۱۸ء
۸ - شرح السبع معلقات - عبدالرحیم " " ۱۸۱۷ء
۹ - سورہ یٰسین - مطبوعہ غازی الدین حیدر لکھنؤ ۱۸۲۰ء
۱۰ - حل ابیات احادیث و آیات الفوائد الضیائیہ
عبدالرحیم مطبع ہندوستانی کلکتہ ۱۸۲۰ء
۱۱ - السور الخمس الشریفہ - مطبع سلطانی لکھنؤ ۱۸۳۰ء
۱۲ - الاشباہ والنظائر - ابن نجیم " ہندوستانی کلکتہ ۱۸۲۶ء
۱۳ - البہجۃ المرضیہ شرح الالفیہ - السیوطی " " ۱۸۳۱ء
۱۴ - عنوان الشرف - شرف الدین اسماعیل الیمنی " محمدی لکھنؤ ۱۸۴۰ء

مطبوعات قدیمۂ فارسیہ

۱ - گلستان با ترجمہ لاطینی - سعدی شیرازی - مطبوعہ Clem. ۱۶۵۱ء
۲ - توزکات تیمور - ابوطالب حسینی مترجم مطبوعہ اوکسفورڈ Clem. Less ۱۷۸۳ء
۳ - تذکرہ سلاطین ایران بجمال الاسلام با مقدمہ و ترجمہ زبان لاطینی
میر خواند ہروی مطبوعہ وائنا ۱۷۸۲ء
۴ - ایضاً ایضاً " غوتنجن ۱۸۰۸ء
۵ - کتاب زبور ولیم گلن مترجم مطبوعہ لندن ۱۸۳۰ء
۶ - کتاب المقدس توریت - توس کنسبل مترجم " ادن برغ ۱۸۴۵ء

قدیم مطبوعات فارسیۂ ہند

۱ - کشف اللغات ۲ جلد - عالمان ہند باستصلاح جوزف
مطبوعہ ہندوستانی پریس کلکتہ ۱۸۰۶ء
۲ - ہدایہ چار جلد - غلام یحییٰ خاں مترجم " " ۱۸۰۷ء
۳ - شاہنامہ - فردوسی " " ۱۸۱۱ء
۴ - فرائض سراجیہ " " ۱۸۱۱ء
۵ - محامد حیدریہ - محمد صادق اختر " لکھنؤ ۱۸۳۰ء
۶ - گلدستۂ نشاط - منولال - مرتب " کلکتہ ۱۸۳۶ء

۷ - سیر المتاخرین - غلام حسین طباطبائی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۶ء
۸ - دیوان زخمی - رتن سنگھ زخمی " لکھنؤ ۱۸۳۷ء
۹ - نزہۃ الناظرین - کندن لال اشکی الٰہی " " ۱۸۳۹ء
۱۰ - جام جم - سرسید احمد خان " اکبرآباد ۱۸۴۰ء
۱۱ - حدائق النجوم - رتن سنگھ زخمی " لکھنؤ ۱۸۴۰ء
۱۲ - نفائس اللغات - اوحد الدین بلگرامی " " ۱۸۴۱ء
۱۳ - شرح گل کشتی - رتن سنگھ زخمی " مصطفائی لکھنؤ ۱۸۴۲ء
۱۴ - دستور محبت - یحییٰ نرائن " " ۱۸۴۳ء
۱۵ - مفردات اہلیہ - فرید الدین مراد آبادی " اکبرآباد ۱۸۴۳ء
۱۶ - انشائے مادھو رام - مادھو رام " لکھنؤ ۱۸۴۷ء
۱۷ - مرآۃ الخیال - شیر خان " عمدۃ الاخبار ۱۸۴۸ء
۱۸ - کلیات فرد - ابوالحسن النعمتی پھلواروی " کلکتہ ۱۸۵۱ء
۱۹ - مہر نیمروز - اسد اللہ خاں غالب " دہلی ۱۸۵۴ء
۲۰ - تضمین گلستان سعدی - ہرگوپال تفتہ " نولکشور ۱۸۵۷ء

(قدیم مطبوعات اردو)

۱ - اخلاق ہندی ترجمہ مفرح القلوب میر بہادر علی مترجم مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء
۲ - بیست شمسیہ محمد فخر الدین خاں مترجم " حیدرآباد دکن ۱۸۳۱ء
۳ - تاریخ ابوالفدا - کریم الدین " " دہلی ۱۸۴۶ء
۴ - آثار الصنادید - سرسید احمد خاں " " ۱۸۴۷ء
۵ - اصول قواعد ما لغات - پنڈت اجودھیا پرشاد " " ۱۸۵۰ء
۶ - زبدۃ التواریخ - عالم علی " کلکتہ ۱۸۵۳ء
۷ - اسباب بغاوت ہند - سرسید احمد خاں " آگرہ ۱۸۵۹ء
۸ - یونان کے قدیم زمانے کی تاریخ بسین سائنٹفک سوسائٹی " علی گڑھ ۱۸۶۵ء
۹ - تزک جہانگیری - سید احمد علی مترجم مطبوعہ نظامی کانپور ۱۸۶۳ء
۱۰ - گلستان الفت - صفدر علی خان " رامپور ۱۸۷۸ء

۱۱۔ بزم سخن۔ علی حسن خاں مطبوعہ آگرہ ۱۸۸۰ء
۱۲۔ تذکرہ آثار الشعراء۔ امتیاز علی ،، بھوپال ۱۸۸۶ء
۱۳۔ منشور سخن۔ میر اعظم علی ربط ،، آگرہ ۱۸۸۸ء
۱۴۔ صدق البیان۔ شاہجہاں بیگم ،، ،، ۱۸۹۳ء
۱۵۔ حیات جاوید۔ الطاف حسین حالی ،، کانپور ۱۹۰۱ء
۱۶۔ اسباب بغاوت ہند۔ سر سید احمد خاں ،، ،، ۱۹۰۱ء
۱۷۔ ،، ،، ،، ،، آگرہ ۱۹۰۳ء

(کتب مشتملہ بر صنائع مختلفہ)

لائبریری میں مختلف صنائع پر مشتمل کتابوں کا کافی اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ چند صنائع کا بطور نمونہ ذکر کیا جاتا ہے:

صنعت غیر منقوطہ | عربی و فارسی کی مندرجہ ذیل چھ کتابیں پیش خدمت ہیں۔ ہر کتاب کے سامنے تعداد صفحات بھی دے دی گئی ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ صنعت گروں نے اپنی صنعت میں کتنی عرق ریزی کی ہے۔

۱۔ موارد الکلم (عربی)۔ ابو الفیض فیضی متوفی ۱۰۰۴ھ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۲۵ء صفحات ۱۰۸
۲۔ سواطع الالہام (تفسیر قرآن) ،، ،، ،، لکھنؤ ۱۸۶۲ء ،، ۸۰۰
۳۔ سبیل الاصول (،،) محمد الکرمانی۔ ،، ایران ۱۹۰۱ء ،، ۲۵۸
۴۔ دیوان واضح فارسی۔ واضح عبد الرحمن جامی متوفی ۱۰۸۹ھ لکھنؤ ۱۸۸۴ء ،، ۸۴
۵۔ انشائے بے نقاط۔ نادان۔ کامتا پرشاد۔ ،، لکھنؤ ۱۸۸۲ء ،، ۱۱
۶۔ سحر حلال۔ (،،) حاذق غلام حضرت خاں اسری ،، رامپور ۱۹۰۵ء ،، ۴۲

صناعۃ الترصیع | ۷۔ السور الخمس الشریفۃ (عربی)

مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۳۰ء صفحات ۵۵

یہ مجموعہ غازی الدین حیدر شاہ اودھ کی ہدایت پر ۱۲۳۶ھ مطبع سلطانی میں چھاپا گیا۔ یہ پانچ سورتوں (یٰسین، الفتح، الواقعہ، الملک، النباء) پر مشتمل ہے۔ اس میں چار جدولیں بعض تقریباً ہر درمیانی جدول کی ابتداء و انتہا ایسے حروف پر ہے جو کھڑے لکھے جاتے ہیں مثلاً ا۔ ل، م۔ اور یہ حروف جداول کا حصہ بن جاتے ہیں۔

صنعت ثلثہ |

۸۔ عنوان الشرف۔ عربی۔ شرف الدین اسماعیل الیمنی متوفی ۸۳۷ھ

مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۴۰ء صفحات ۱۱۶

مصنف نے عجیب فنی صنعت میں یہ کتاب مرتب کی ہے مسلسل پڑھی جائے تو علم فقہ کا رسالہ ہے۔ پہلی جدول میں فن عروض دوسری میں تاریخ، تیسری میں نحو، اور چوتھی جدول میں فن قافیہ اس طرح یہ کتاب پانچ فنون کے مسائل پر مشتمل ہے۔

۹۔ گنج گنج خسروی۔ (فارسی)۔ ذکیر حیدر امروہوی مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۸۲ء صفحات ۲۸

اس رسالہ میں مصنف نے بڑی صنعت رکھی ہے مسلسل بلا لحاظ جداول پڑھا جائے تو نثر میں قصہ عشق و محبت ہے جس میں طائر ہنس کی مدد سے کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ پہلی جدول سے لے کر چوتھی جدول تک مختلف بحور و قوافی میں مثنویاں ہیں۔ مندرجہ بالا عربی کتاب میں بھی یہی صنعت ہے مگر اس میں نثر ہی میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس رسالہ فارسی میں نثر و نظم دونوں کو سمو دیا گیا ہے جو بہت مشکل کام ہے۔

(غیر مسلم مصنفین کی فارسی تصانیف)

برادران وطن نے خصوصاً ہندو شعراء و ادباء نے اردو ادب میں جو چار چاند لگائے وہ اہل علم و ادب سے پوشیدہ نہیں۔ اس دور قحط الرجال میں بھی ہمارے ملک میں شعراء و ایسے ہندو ادیب نظر آتے ہیں جو ہمارے اردو ادب کی بقا و ترقی میں سرگرم کار ہیں۔

فارسی زبان و ادب کی ان برادران وطن نے بیسویں

۴۶۔ متاکشرا۔ وگیانیشور مطبوعہ ۱۸۶۹ء
۴۷۔ گاتھا۔ پورداؤد (پارسی) ترجم ؍؍
۴۸۔ تحفۃ الاسلام۔ اندرمن ؍؍
۴۹۔ اوستا پورداؤد (پارسی) ترجم ؍؍
۵۰۔ رہنمائے سنسکرت۔ ابندرشیکھر ؍؍ ۱۳۳۰
۵۱۔ پرشین سانسکرت گرامر۔ کہنن راجہ ؍؍ ۱۹۵۴ء
۵۲۔ بیان ابطال ضرورت۔ بہار، ٹیک چند ؍؍ ۱۸۵۱ء
۵۳۔ بہار عجم۔ ؍؍ ؍؍ ۱۸۹۴ء
۵۴۔ دریائے عقل۔ گنگا پرشاد ؍؍ ۱۸۶۷ء
۵۵۔ جواہر الحروف۔ بہار، ٹیک چند ؍؍ ۱۸۵۰ء
۵۶۔ مفتاح اللغات۔ رام نرائن ؍؍ ۱۸۶۹ء
۵۷۔ مصباح العلم۔ لعل بہادر ؍؍ ۱۸۷۹ء
۵۸۔ جواہر منظومہ دولت رائے ؍؍ ۱۸۷۰ء
۵۹۔ مرآت الصرف۔ ؍؍ ؍؍
۶۰۔ مخزن اخلاق۔ درگا پرشاد ؍؍ ۱۸۹۹ء
۶۱۔ محیا میر پسند بیر رائے چند ؍؍ ۱۸۹۷ء
۶۲۔ نازک خیالات یعنی ترجمہ ہلم بلاس جگناتھ کرا چارج۔ منسارام خوشابی ؍؍ ۱۹۰۲ء
۶۳۔ منتخب المصادر سنت پرشاد ؍؍ ۱۸۶۶ء
۶۴۔ منتخب تنقیح الاخبار۔ کندن لال۔ راجہ بہادر ؍؍ ۱۸۵۱ء
۶۵۔ شرح گل کشتی۔ زخمی، رتن سنگھ ؍؍ ۱۸۴۲ء

(نظم)

۱۔ بہارستان بہار، ٹیک چند۔ مطبوعہ ۱۸۸۳ء
۲۔ دیوان الفتی۔ الفتی، پیارے لال ؍؍ ۱۸۷۰ء
۳۔ دیوان انور۔ انور، کانکا پرشاد ؍؍ ۱۸۹۵ء
۴۔ دیوان انس انس، لال چند ؍؍ ۱۸۵۲ء
۵۔ خیال بیخودی۔ بیخود، سیتل سنگھ مطبوعہ ۱۸۶۲ء
۶۔ دیوان تفتہ۔ تفتہ، ہرگوپال۔ ؍؍ ۱۸۵۷ء
۷۔ مطلع خورشید جوہر، جواہر سنگھ ؍؍ ۱۸۶۱ء
۸۔ دیوان ضمیر ضمیر، نرائن داس ؍؍ ۱۸۹۰ء
۹۔ دیوان مائل۔ مائل، چھنی لال۔ ؍؍ ۱۸۸۹ء
۱۰۔ دیوان موزون ـ موزوں، راجہ رام نرائن ؍؍ ۱۸۱۷ء
۱۱۔ دیوان وقار، وقار، جوالا پرشاد ؍؍ ۱۸۵۱ء
۱۲۔ قصائد پرفوائد۔ بہجت، نتھن لال ؍؍ ۱۸۵۱ء
۱۳۔ بھرتری ہری شتک مول۔ گھنشیام سنگھ ؍؍
۱۴۔ دیوان زخمی۔ زخمی، رتن سنگھ۔ ؍؍ ۱۸۳۷ء
۱۵۔ دیوان گویا۔ گویا، بھائی نند لال ؍؍
۱۶۔ رامائن۔ امانت رائے، ؍؍ ۱۸۷۱ء
۱۷۔ سری بھاگوت ؍؍ ؍؍ ۱۸۵۵ء
۱۸۔ مناجات سنت بیکر اومان پرشاد ؍؍ ۱۸۹۵ء
۱۹۔ ریاض بہار آگیں۔ (سہوا ماچرتر)۔ بخشی ایم ؍؍ ۱۸۸۳ء
۲۰۔ سنبلستان۔ تفتہ، ہرگوپال۔ ؍؍ ۱۸۶۰ء
۲۱۔ منظر الحسن۔ شاد، شری کرشن۔ ؍؍
۲۲۔ رامائن رام چرتر، گوپی ناتھ۔ ؍؍
۲۳۔ دستور محبت۔ لچھمی نراین۔ ؍؍ ۱۸۴۳ء
۲۴۔ گوہر عرفان فروغ۔ فروغ، بدری کرشن ؍؍ ۱۹۲۱ء
۲۵۔ دیوان نانک شاہ۔ نانک شاہ ؍؍ ۱۹۳۵ء
۲۶۔ اختراع جدید۔ وقار، رائے کشن کمار ؍؍ ۱۸۷۷ء
۲۷۔ رامائن ہربلبھ سنگھ ؍؍ ۱۹۰۲ء
۲۸۔ ظفر نامہ رنجیت سنگھ ہندی، کنھیا لال ؍؍ ۱۸۷۶ء
۲۹۔ یادگار ہندی۔ ہندی، کنھیا لال ؍؍ ۱۸۷۳ء

۳۰۔ تضمین گلستان سعدی، تفتہ، ہرگوپال مطبوعہ ۱۸۵۱ء
۳۱۔ ترجیع بند، خود نیتہ بہاری لال۔ " ۱۸۸۱ء
۳۲۔ نوحہ وفات و مدرس ساتھ ہزار خوب عروج۔ بندہ کرشن ۱۸۹۸ء
۳۳۔ بندگی نامہ، ہندی، کنھیا لال مطبوعہ ۱۸۷۹ء
۳۴۔ گلدستۂ نشاط۔ منولال مرتب۔ " ۱۸۳۶ء
۳۵۔ حدیقۂ عشرت۔ درگا پرشاد۔ " ۱۸۹۸ء
۳۶۔ سفینۂ ہندی۔ ہندی، کنھیا لال۔ ۱۹۵۰ء
۳۷۔ سفینۂ خوشگو خوشگو، بندرابن داس " ۱۹۵۹ء
۳۸۔ ایمانی شاد۔ شاد، سرکشن پرشاد۔ "
۳۹۔ مثنوی آئینہ وجود۔ " " " " ۱۹۱۹ء

مشرقی شعبۂ مطبوعات میں اکثر کتابوں کے مختلف متعدد ایڈیشن موجود ہیں جس سے ریسرچ اسکالروں کو اپنی تحقیقات میں بڑی مدد ملتی ہے اور شعبۂ مخطوطات میں کسی مخطوطہ پر کام کرنے والے دانشوروں کو بھی شعبۂ مطبوعات سے استفادہ ناگزیر رہتا ہے اس طرح یہ دونوں شعبے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(شعبۂ مخطوطات)

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس لائبریری کی ابتدا بانی درسگاہ سرسید احمد خاں اور ان کے خلف الرشید جسٹس سید محمود کی کتابوں سے ہوئی۔ اور جب مختلف ارباب دانش اور اہل علم کے عطیات کا اضافہ ہوا تو مشرقی و مغربی شعبوں کی تقسیم ناگزیر ہوئی۔ پھر جب قلمی نسخوں کی بہتات ہوئی تو مشرقی شعبے کو مطبوعات و مخطوطات دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک مطبوعات کا حصہ اور ڈیلی ڈویژن اور مخطوطات کا حصہ مینوسکرپٹس ڈویژن کہلاتا ہے۔ دونوں کا اسٹاف اور محل و توع علیحدہ ہے .... باہمی ربط قائم رکھنے کے لئے آخر الذکر شعبے کا اسسٹنٹ لائبریرین ہی اول الذکر شعبے کا انچارج بھی ہے۔ دونوں شعبوں میں تقریباً ایک لاکھ دس ہزار مطبوعات و مخطوطات ہیں۔
شعبۂ مخطوطات اس وقت گیارہ کلکشنوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ یونیورسٹی کلکشن ۶۔ سر سلیمان کلکشن
۲۔ سبحان اللہ " ۷۔ احسن "
۳۔ عبدالسلام " ۸۔ آفتاب " (علیہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)
۴۔ شیفتہ " ۹۔ جواہر میوزیم " (اسلامیہ کالج اٹاوہ)
۵۔ منیر عالم " ۱۰۔ فرنگی محل " ۱۱۔ جناب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی
۱۱۔ حبیب گنج کلکشن

ان سبھی کلکشنوں پر نظر ڈالنے والا بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اگر ان کے نوادر خصائص کو قلمبند کیا جائے تو مستقل ضخیم کتاب تیار ہو جائے ہم اپنی کوتاہ دستی کے پیش نظر حتی الوسع ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہوئے قابل ذکر گوشوں پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

(قرآن مجید و ادعیہ)

لائبریری میں مطبوعات و مخطوطات قرآن پاک کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔

چند نسخوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا جاتا ہے مخطوطہ قرآنوں کی تعداد ۱۹۰ ہے۔ تقریباً ہر نسخہ خصوصیات کا حامل ہے۔

(۱) قرآن شریف مترجم فارسی تقطیع کلاں طول ۲۴ انچ،

عرض ۴/۱ ۱۰ انچ۔ کشمیری بخط کشمیری بین السطور ترجمہ فارسی شنگرفی بر حاشیہ تفسیر حسینی۔ دو دو صفحات اول و آخر و ابتدائے ہر منزل مطلا و لاجوردی رنگ آمیزی، جداول مطلا و لاجوردی۔ ع شنگرفی، اسمائے سور در ضمن مطلا، خط گوشہ لاجوردی۔ در آخر تفسیر نوشتہ در بندہ محمد مختار۔ ۲۵ رجمادی الآخر ۱۲۸۲ھ

۲۔ قرآن مجید بخط اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ ہند۔ خوشخط بہ خط نسخ۔ ورق آخر کی پشت پر مکتوبہ ۱۰۸۰ھ مرقوم ہے لیکن خود عالمگیر کی مہد جو ذیل عبارت تاریخ کتابت کی نفی کرتی ہے۔

"من یک دو مصحف کہ نوشتہ ام تمام نوشتہ ام
تاریخ ہم نوشتن در کار نیست اگر برائے او سبحانہ نوشتہ
الحمد علیم و حسبی و کفی"

(کلمات طیبات عالمگیر (۱) ص ۳۲۲/۹۲ عبد السلام گلگشت ورق ۶۳)

۳۔ قرآن مجید تقطیع کلاں مطلا و مجدول مترجم فارسی۔ بہت ہی رنگ کام بنایا گیا ہے بہت ہی دیدہ زیب ہے۔ کاتب مولانا عبدالرحمٰن احمد آبادی کے شاگرد ہیں جو اکبر شاہ کے معاصر تھے

۴۔ قرآن مجید با صنعت تزئین حروف، مترجم فارسی ترجمہ بحرف روشنائی سے تحریر کیا گیا ہے۔ نیز صنعت کتابت یہ ہے کہ ہر صفحہ میں طاق سطریں ہیں اور درمیانی سطر کو اس کی بالائی و تحتی سطروں کی حد فاصل قرار دے کر ان کو جفت کر دیا ہے اور ان تمام سطروں کے اول حروف میں اس طرح کی یکسانیت رکھی ہے کہ جو حرف اول سطر کے شروع میں ہے وہی حرف صفحے کی آخری سطر کی ابتدا میں ہے اور جو دوسری سطر میں اول حرف ہے وہی آخر کی دوسری سطر میں ہے اس طرح تمام سطروں میں اس صنعت کا التزام ہے۔

۵۔ قرآن شریف۔ بخط ثلث۔ یہ نسخہ ۱۰۰۰ھ میں ہرات سے اورنگ زیب کے لئے ہدیہ بھیجا گیا ہے

۶۔ قرآن مجید۔ سی ورقی۔ ابتدائی دو سورتوں کے عنوانات مطلا و منقش، جدول طلائی، علامات آیات مطلا، یہ نسخہ بھی اورنگ زیب عالمگیر کو ہدیہ کیا گیا۔ آخر میں ان کی مہر ثبت ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر پارہ ایک ورق پر ہے اور پاروں کے اختلاف حجم کے باوجود خط کی یکسانیت میں فرق نہیں آیا ہے۔ سورۂ فاتحہ و ابتدائی صفحہ سورہ بقرہ برنگ سفید۔

۸۔ قرآن شریف مُرقّع و مذہّب بخط نسخ نہایت اعلیٰ ہر سورہ کا عنوان مطلا۔

۹۔ قرآن شریف صرف سورۂ فاتحہ و سورہ بقرہ۔ بخط کوفی خوشخط مکتوبہ بر چرم آہو قدیم و نادر۔

۱۰۔ حمائل شریف۔ جداول و علامات آیات مطلا، بین السطور کی لکیریں زرّیں، حاشیہ پر مابین سیاہ خطوط نقش زرّیں، ہر سورہ کا عنوان مطلا، نام سورہ برنگ سفید خوشخط بخط ایران، عنوان اور ساتوں منزلوں پر نہایت عمدہ صنعت کی گئی ہے۔ بخط نسخ نہایت اعلیٰ نسخہ خصوصی صفت پر ناخن سے ابھارے ہوئے پھولوں کی رنگ آمیزی۔

۱۱۔ قرآن شریف۔ مطلا و مذہب منقش، بین السطور ترجمہ فارسی برنگ سرخ۔ بر حاشیہ تفسیر بخط نستعلیق شکستہ آمیز، ابتدائی و آخری دو دو اوراق نہایت دیدہ زیب۔ ہر صفحہ کی جداول مرصع و منقش۔ ابتدا میں نو اوراق پر ہر سورہ کے فوائد و خواص و تعداد حروف وغیرہ۔ آخر میں تین صفحات پر فالنامہ حروف منظوم بزبان فارسی۔ ایک ورق سادہ پر مہر مکتب خود محمد عبدالرحیم

۱۲۔ قرآن شریف۔ مکتوبہ ۱۲۰۶ھ بر حاشیہ متون دیگر خوشخط تفسیر عربی بر ورق اول یک مہر مربع و دو مہر مدور در صفحہ آخر۔

۱۳۔ مخبور۔ لوح وجداول وخطوط بین السطور مطلا، حواشی منقش ومطلا، نہایت خوشخط بخط نسخ مکتوبہ محمد طاہر بن شیخ عبد اللہ احمد آبادی ۱۰۸۰ھ بر ورق آخر یک مہر مدور قابل خاں خانہ زاد عالمگیر بادشاہ و دو مہر بیضوی نیکنام صادق خاں "محی الدین علی خاں" شاہی کتابخانہ میں داخل رہا ہے۔

۱۴۔ قرآن شریف۔ نہایت خوشخط بخط نسخ۔ جداول وعلامات آیات، وخطوط بین السطور مطلا غادین مصور برنگ سفید مکتوبہ ۱۱۰۶ھ

۱۵۔ طومار۔ بخط غبار یہ ۱۸ فٹ ۳ انچ طویل اور ۳۔ انچ عریض کاغذی پٹی ہے جسکے نیچے کپڑا لگا کر محفوظ کر دیا گیا ہے تعوذ وتسمیہ نصر من اللہ وفتح قریب اور کلمات درود کے ہر حرف ونقطہ وحملہ میں پورا قرآن پاک بخط غبار لکھا گیا ہے۔

۱۶۔ قرآن شریف۔ بخط غبار بشکل کتبہ۔ یہ کتبہ پارچہ مومی پر قرآن پاک کی سات منزلوں میں سے چار منزلوں پر بخط غبار مشتمل ہے سر کتبہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا طغرا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارت
"حضرت قطب شیخ فرید صاحب شکر گنج قدس اللہ سرہ"
میں ابتدائی چار منزلیں لکھی ہوئی ہیں۔ اس کتبہ کا طول ۴ فٹ ایک انچ اور عرض دو فٹ پانچ انچ ہے۔ نیچے یہ عبارت درج ہے۔ "از سید شوکت حسن خفی رقم امروہوی ۱۳۳۳ھ"

۱۷۔ قرآن پاک بشکل صدری یعنی القمیص الجوشن المصحفی لحرز الملوک والابطال فی الحروب والمعارک۔ یہ صدری خفی خط نسخ میں پورے قرآن پر مشتمل ہے۔ اس کا گلا اور دامن بڑے خوشنما طرز پر بنایا گیا ہے۔ نیلا اور سرخ رنگ نے خوشنمائی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ پوری صدری مرصع ہے۔ یہ بڑی نادر اور نایاب چیز ہے طول ۲ فٹ ۲ انچ، عرض ایک فٹ ۴ انچ، آستین طول وعرض ۱۰ انچ۔

سر راس مسعود نبیرۂ بانی درسگاہ سر سید احمد خاں نے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانے میں دورۂ یورپ کے موقعہ پر اپنے دوست لارڈ لوتھین کے ذریعہ ۱۹۳۳ء میں یہ تحفہ حاصل کیا۔ (ریکارڈ رجسٹرار آفس)

قرآن شریف کا تحفہ

یو۔ پی گورنمنٹ نے اعلان کیا ہے کہ لارڈ لوتھین کے ایک دوست نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ایک قبا نذر کیا جس پر تمام قرآن شریف لکھا ہوا ہے۔ یہ غلاف ۱۸۵۷ء کے زمانے میں کوئی افسر انگلستان لے گیا تھا اب پھر مسلمانوں کو واپس دے دیا گیا۔ (ہفت روزہ الایمان سیرت کمیٹی پٹی لاہور ۳۱۔ مارچ ۱۹۳۳ء)

(بحوالہ ہفتہ وار المنبر لائل پور۔ پاکستان۔ جلد ۱۳۔ شمارہ ۱۰۹، مورخہ ۳ و ۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء)

ادعیہ | (۱) دلائل الخیرات۔ مؤلفہ محمد بن سلیمان الجزولی المتوفی ۸۷۰ھ۔ نہایت خوشخط نسخہ بخط نسخ۔
(۲) جوشن صغیر وکبیر بخط نسخ۔ نہایت اعلیٰ نسخہ۔ مکتوبہ قاسم الداعوی۔ اول بیاض اوراق تمام مرصع، بین السطور و برحواشی گلکاری بطلا۔ تمام عنوان مرقومہ بر روشنائی سفید۔
(۳) ادعیہ، بخط نسخ۔ مکتوبہ باقی محمد ۱۰۶۲ھ۔

قدیم نسخے

عربی | (۱) قرآن شریف (سورۂ فاتحہ وسورۂ بقرہ) برچرم آہو، معرّی بارہ نقاط واعراب۔ بخط کوفی، مطلا ومنقش وخوشخط۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کا مکتوبہ
(۲) عیون الاجوبۃ فی فنون الاسئلۃ۔ تصنیف ابوالقاسم عبدالکریم القشیری المتوفی ۴۶۵ھ ۱۰۷۲ء بخط المصنف۔

پانچویں صدی ہجری کی تصنیف و ترقیم۔

(۳) نہج البلاغۃ۔ مرتبہ الشریف الرضی المتوفی ۴۰۶ھ/۱۰۱۶ء
دو جلد، مکتوبہ ۵۳۰ھ/۱۱۳۶ء کاتب علی بن ابی القاسم بن علی۔
چھٹی صدی ہجری کے ربع ثانی میں اس کی کتابت کا اختتام اسی سال ہوا ہے جس سال کاتب نے حج کیا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی کی دو عظیم یادگاریں اس سال سے وابستہ ہیں۔ یہ نسخہ مختلف کتابخانوں کی زینت رہا ہے۔ دونوں جلدوں کے اول و آخر اوراق پر ۱۱ تحریریں ہیں۔ تین پر سنہ ۱۰۲۶ھ/۱۶۱۷ء سنہ ۱۱۵۴ھ تاریخ پڑی ہے۔ ۷ تحریروں کے ساتھ دستخط بھی ہیں۔ ۱۶ مہریں ہیں، ۵ مکوک ہیں، ۸ مربع مہریں سید ابوجعفر باسطی کی ہیں۔ ۲ مکعب و مدور مہریں "الواثق بالملک المتعالی عبدہ مبارک بن عبداللہ العالی الاوالی" کی ہیں اور ایک مربع مہر سید محمد عباس الموسوی کی ہے۔ اس کا مقابلہ الادیب افضل الدین الحسن کے ذاتی نسخے سے ہوا ہے۔

(۴) صحاح جوہری (لغت) تالیف ابونصر اسماعیل بن حماد الجوہری المتوفی ۳۹۶ھ۔ بخط نسخ مکتوبہ ۵۶۸ھ۔ روشنائی خیرہ، دو جلد۔

جلد اول کے سرورق پر کچھ تحریریں اور مہریں ہیں اگرچہ تحریریں مٹا دی گئی ہیں، باقی ماندہ تحریروں میں اہم تحریر محمود بن احمد بن مسعود القونوی متوفی ۷۷۱ھ کی ہے۔ عبارت یہ ہے:
"من کتب العبد الفقیر الی اللہ الغنی محمود بن احمد بن مسعود القونوی الحنفی متعہ اللہ بہ"
صمصام الملک کی مہر بھی ہے۔ سید نور الحسن نادر کی بھی تحریر اور مہر ہے "نور چشم اصفیا نادر حسن"۔ ایک مہر "قادر الیہ ۱۲۷۲" بھی ہے۔ دوسری جلد کے آخر میں یہ عبارت ہے:

"بلغ مقابلتہ بخط ابن الجوالیقی"

(۵) شرح سبعہ معلقہ۔ تالیف ابوعبداللہ الحسین بن احمد الزوزنی المتوفی ۴۷۵ھ، کاتب ابوالعلا بن ابی الفوارس النطری مکتوبہ ۶۳۶ھ بخط بہاری۔ ورق اول پر مہر بیضوی "محمد یوسف" ابتدائی ۸ ورق محمد یوسف الحسینی بن میر عبدالجلیل بلگرامی کے لکھے ہوئے ہیں، مورخہ سنہ ۱۱۵۵ھ۔

(۶) اختیار دواوین المتنبی والبحتری وابی تمام۔ تالیف عبدالقاہر الجرجانی المتوفی ۴۷۱ھ۔ کاتب ابوالعلا بن ابی الفوارس النطری۔ مکتوبہ سنہ ۶۲۹ھ بخط بہاری۔

(۷) صراح (لغت) از ابوالفضل محمد بن عمر المعروف بجمال القرشی بخط نسخ، مکتوبہ ۸۷۴ھ سال تصنیف ۶۸۱ھ۔ مختلف کتابخانوں میں داخل رہی ہے۔ سر ورق کی عبارتیں اس پر شاہد ہیں۔ اول و آخر ورق پر ۱۲ مختلف مہریں ہیں جن میں سے اکثر مکوک و مندرس ہیں۔ تین بیضوی مہریں "یحییٰ خاں" کی ہیں اور ایک مہر مدور "فدوی محمد بندۂ شاہ عالم ۱۱۷۸ھ" کی ہے۔

(فارسی)

(۱) مثنوی معنوی۔ از جلال الدین رومی متوفی ۶۷۲ھ مکتوبہ ۷۱۲ھ بخط نسخ خوب۔ لائبریری میں فارسی کا قدیم ترین مخطوطہ، وفات مصنف سے ۴۰ سال کا مکتوبہ۔ چھ مہریں ثبت ہیں پانچ مکوک و غیر مقروء، ایک مہر مدور کلاں "بسم اللہ و حمد اللہ الہ الٰہی شیخ عبدالقادر القادری الرفاعی"۔ دفتر اول و ششم کے آخر میں ۴ مہریں "محمد اورنگ زیب بادشاہ" کی ہیں۔ یہ نسخہ ان کے کتابخانے میں داخل رہا ہے۔ حواشی ۱۰۵۳ھ کے لکھے ہوئے ہیں۔

(۲) قصائد شمس طبسی متوفی ۶۲۶ھ خط نستعلیق نسخ آمیز مکتوبہ ۷۲۱ھ

(۳) ترجمہ عوارف المعارف۔ از قاسم محمود خطیب قصبہ چہرام مرید شیخ

بہاء الدین زکریا ملتانی متوفی ۶۶۱ھ - بخط بہاری بقلم
دلشاد بن ... مال - مکتوبہ ۸۵۰ھ

(۴) غزلیات سعدی مشتمل بر خواتیم و بدائع و طیبات
مکتوبہ ۸۳۸ھ جداول و عنوانات مطلا، خط پختہ۔
متوفی ۶۹۱ھ۔

(۵) چہل ناموس - از ضیاء الدین نخشبی متوفی ۷۵۱ھ مکتوبہ
محمد اسلم ۹۱ خط نستعلیق پختہ سال تصنیف ۷۳۰ھ۔

(۶) کلیات سعدی بخط نستعلیق مکتوبہ ۸۱۴ھ۔

(۷) مثنوی معنوی بخط نستعلیق مکتوبہ ۸۶۲ھ

(۸) خمسۂ نظامی مشہور بخط نستعلیق مکتوبہ ۸۳۰ھ

(۹) مثنوی معنوی بخط نستعلیق - مکتوبہ ۸۵۰ھ

(۱۰) مثنوی ... از خسرو دہلوی متوفی ۷۲۵ھ خط نستعلیق
جدول طلائی۔

(۱۱) انتخاب از اشعارات بدایع - از حاجی زین الدین عطار
مکتوبہ ۸۸۰ھ بقلم حسن علی مشہور بہ صبوری۔

(۱۲) کلیات عماد فقیہ متوفی ۷۷۳ھ مکتوبہ قبل از ۸۸۰ھ

(۱۳) رسالہ اسامی الادویہ مکتوبہ ۸۸۹ھ بقلم حسن علی
مشہور بہ صبوری۔

(۱۴) رسالہ توشیح - بخط نسخ - مکتوبہ ۸۹۰ھ۔

(۱۵) معارف العوارف ترجمہ عوارف المعارف - از عبد الرحمن
بن علی بزغش بخط نسخ - مکتوبہ ۸۹۱ھ۔

(ہندی بھاشا - اردو)

(۱) نوطرز مرصع - از مرصع رقم میر عطا حسین خان تحسین مکتوبہ ۱۱۸۱ھ

(۲) ہشت گلشت ترجمہ ہشت بہشت خسرو از غلام احمد دہلوی
مکتوبہ ۱۱۲۷ھ۔

(۳) پدماوت - از ملک محمد جائسی مکتوبہ ۱۱۳۵ھ۔

(۴) ترجمہ بھگوت گیتا - از راجہ بیر بر ندیم اکبر بادشاہ مکتوبہ ۱۱۳۵ھ

(۵) رس گاہک چندر کا شرح رتنگ پریا کیشوداس - مکتوبہ
۱۱۵۹ھ کاتب سید غلام نبی رسلین بلگرامی۔

(۶) امر چندر کا - مکتوبہ ۱۱۶۲ھ کاتب سید غلام نبی رسلین بلگرامی

(۷) دہ مجلس دکنی منظوم از ولی دکنی مکتوبہ ۱۱۹۰ھ

(۸) دیوان سودا - مکتوبہ ۱۱۹۰ھ۔

(۹) دیوان ولی دکنی - مکتوبہ ۱۱۹۰ھ۔

(۱۰) فقہ ہندی منظوم - از عبدی سال تصنیف ۱۰۷۲ھ

(۱۱) رسالہ دیدار ہندا - از فیاض الحق سال تصنیف ۱۰۶۰ھ

کتب عربیہ ساتویں صدی ہجری کتب فارسیہ آٹھویں
اور نویں صدی ہجری اور کتب اردو و ہندی بھاشا
گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری تک کی پیش کی گئی
ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ مذکورہ زبانوں کا قدامت
کتابت کے لحاظ سے کیسا نایاب ذخیرہ شعبۂ مخطوطات
میں موجود ہے۔

(فارسی)

نادر نسخے | (۱) حالنامہ بایزید انصاری (فارسی) مرتبہ
علی محمد بن ابی بکر قندھاری مرید و خادم خاندان بایزید
انصاری - بایزید عہد اکبری کے مشہور بزرگ تھے جنھیں لوگ
پیر روشن ضمیر کہتے تھے اور جنھوں نے پہاڑوں میں ایک
دینوی حکومت قائم کر رکھی تھی اور جن سے شاہان دہلی
پریشان اور حکومت کا امن پراگندہ تھا۔ یہ کتاب روشنیہ
تحریک کی بہترین تاریخ ہے۔ اس نسخے کے علاوہ دنیا میں
کسی اور نسخے کے وجود کا علم نہیں۔ مکتوبہ بخط نستعلیق۔

(۲) نفائس المآثر (فارسی) از مرزا علاء الدولہ کامی
قزوینی۔ سال تالیف ۹۷۳ھ۔ اس کتاب کا دوسرا نام
تذکرہ علاء الدولہ بھی ہے۔ ابتدا میں دسویں صدی ہجری
کے فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔ پھر تیموریوں کی تاریخ بابر سے
اکبر تک کی لکھی گئی ہے۔ اس تذکرے کے کسی اور مکمل
نسخے کا بھی علم نہیں۔ برٹش میوزیم کے دو مجموعوں میں کچھ
کچھ اقتباسات ملتے ہیں، رضا لائبریری رامپور میں بھی غیر مکمل
نسخہ موجود ہے۔ نیز ازبکستان، اور لاہور، لکھنؤ، راس
اور پٹنہ میں۔ یہ نسخہ بخط نسخ مکتوبہ ۹۹۵ھ ہے۔ یہ نسخہ
مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کے پاس رہ چکا ہے۔ جابجا انکی
بھی تصحیحات اور حواشی درج ہیں، سرورق پر ان کی تحریر دستخط
اور مہر بھی موجود ہے۔

(۳) مونس الاحرار فی دقائق الاشعار مشتمل بر ہفتاد و پنج شعرا
از احمد بن محمد کلاتی تصنیف ۷۴۱ھ بخط نستعلیق غنیمت
اوراق ہے، تقطیع کلاں۔ اس تذکرہ کے کسی دوسرے نسخہ کا
علم نہیں۔

(۴) قصائد نعتیہ۔ از عمید فضل اللہ لویکی (معاصر سلطان
ناصر الدین محمود متوفی ۶۶۴ھ) بخط نستعلیق خفی بہتر یہ
نسخہ بھی نایاب ہے۔

مصور نسخے (۱) خمسہ نظامی گنجوی متوفی ۵۹۹ھ مکتوبہ
حسین عبداللہ ۸۷۳ھ تصاویر ۱۷ بخط نستعلیق خوشخط
ابتدائی دو صفحات مطلا سرورق پر ۴ مہریں۔

(۲) دیوان حافظ مکتوبہ ۱۰۱۷ھ بخط نستعلیق نفیس مرقعہ ۳

(۳) مثنوی معنوی مکتوبہ ۱۰۱۹ھ بخط نستعلیق مزین بہ تصاویر
کثیرہ کاتب عبداللہ بن قنبر سمرقندی۔ میر نور اللہ کے
حواشی بھی درج ہیں۔

(۴) مثنوی حسینی مصنفہ ۱۱۶۳ھ تصاویر ۲۹

(۵) گلستان برحاشیہ بوستان سعدی شیرازی متوفی ۶۹۱ھ
مکتوبہ ۱۲۵۰ھ تصاویر ۱۹۔ تمام مطلا و مجدول و مرصع
کاتب حامد ساکن مہی۔

(۶) حملۂ حیدری۔ ۳ جلد از محمد رفیع باذل مشہدی مصور
و مطلا بخط نستعلیق پاکیزہ تصاویر ۲۰۔

(۷) شاہنامہ فردوسی (۴ نسخے) مصور۔

مرصع و منقش نسخے (۱) کریما۔ از سعدی شیرازی متوفی
۶۹۱ھ مکتوبہ بدر علی تلمیذ آغا مرزا
۱۲۷۷ھ نہایت خوشخط زرافشاں، خط نستعلیق۔

(۲) ہفت بند کاشی۔ مکتوبہ عطارد رقم و مرصعہ محمد علی ۱۲۸۰ھ
بخط نستعلیق خوشخط۔ زمین سنہری۔

(۳) ہفت بند کاشی۔ مکتوبہ محمد حسن کاظمی۔ مرصع بہ طلا
بخط نستعلیق خوشخط زمین سنہری۔

(۴) ملفوظات صاحبقران۔ حالات امیر تیمور از افضل
بخاری در عہد شاہجہاں۔ مکتوبہ ہدایت اللہ ۱۲۳۲ھ۔
ابتدائی دو صفحوں پر نہایت خوبصورت سنہرا کام ہے اس
نسخہ کی کتابت مرزا ایزد بخش بہادر خلف شاہ عالم بادشاہ
غازی کے لئے کی گئی ہے۔ آخر میں انکی مہر ثبت ہے۔

(۵) چہل حدیث با ترجمہ فارسی منظوم۔ بخط نستعلیق خوشخط
جلی۔ تمام صفحات مرصع و مذہب و مطلا۔ بر حواشی گلکاری بطلا
مکتوبہ نعمت اللہ گوہر رقم ۱۲۱۰ھ

(۶) مرغوب القلوب (مثنوی) بخط نستعلیق خوشخط تمام صفحات
مرصع و مذہب مطلا، بر حواشی گلکاری بطلا۔ مکتوبہ نعمت اللہ

نعمت اللہ گوہر رقم ۱۲۱۰ھ

خوشخط نسخے | (۱) دیوان لسانی - از وجیہ الدین عبد اللہ لسانی شیرازی متوفی ۹۴۰ھ بخط نستعلیق نفیس، مکتوبہ حسن قلی [illegible]ھ
(سال کتابت واضح نہیں ۹۱۳ اور ۹۴۳ بھی پڑھا جا سکتا ہے)

(۲) خمسۂ نظامی گنجوی - مکتوبہ فیروز محمد بن سلیمان بخط نستعلیق خوب تر

(۳) کلیات - مکتوبہ سبحان اللہ ۹۶۳ھ،

(۴) مثنوی معنوی - مکتوبہ ۱۰۹۰ھ بخط نستعلیق نہایت خوشخط مطلا -

(۵) زاد المعاد - مکتوبہ ۱۱۳۵ھ کاتب طاہر شیرازی خوشخط مطلا مجدول طلائی، لوح زرجدی

(۶) طبقات اکبری - از خواجہ نظام الدین احمد بخش، مکتوبہ ۱۰۳۰ھ کاتب عبد الغنی قریشی۔

(۷) مجموعۃ الرسائل الاربعۃ فی المناظرۃ المذہبیۃ - از نور اللہ شوستری و حسین بن عبد الصمد العاملی وغیرہما، مکتوبہ ۱۱۱۱ھ بخط نسخ خفی بہتر - برحواشی گلکاری، لوح مطلا، نسخہ مجدول بطلا مشتمل بر چہار رسائل سرورق پر دو مہر مربع محکوک کاتب عبد الوہاب بن محمد طاہر مقام کتابت احمد آباد گجرات۔

خود نوشت نسخے | (۱) عیون الاجوبۃ فی فنون الاسئلۃ - از ابو القاسم عبد الکریم القشیری المتوفی ۴۶۵ھ بخط المصنف۔

(۲) فتح المتعال فی مدح النعال - از احمد بن محمد المغربی المتوفی ۱۰۴۱ھ بخط المصنف۔

(۳) تحفیص الشفاء از فضل امام خیر آبادی المتوفی ۱۲۴۳ھ مکتوبہ ۱۲۲۷ھ بخط المصنف۔

(۴) حاشیۃ افق المبین - از فضل حق خیر آبادی المتوفی ۱۲۷۸ھ ناقص الآخر - بخط المصنف۔

(۵) دیوان صائب، متوفی ۱۰۸۰ھ مکتوبہ ۱۰۸۰ھ بخط المصنف

(۶) شرح خطبۃ القواعد از فخر الدین محمد، مکتوبہ ۹۰۳ھ بخط المصنف

(۷) چار چمن - از غلام محی الدین مبتلا عشق - مکتوبہ ۱۲۰۸ھ بخط المصنف

(۸) ارتیاح الاکباد بارباح فقد الاولاد - از الحافظ البخاری المتوفی ۹۰۲ھ بخط المصنف۔

(۹) حالات خود نوشت - از نجم الدین علوی کاکوروی قاضی القضاۃ کلکتہ متوفی ۱۲۲۹ھ بخط المصنف۔

(۱۰) مجموعۃ الرسائل - از ابن طولون، محمد بن علی بن احمد الصالحی الدمشقی المتوفی ۹۵۳ھ بخط النسخ بخط المصنف

(۱۱) ترغیب السالک (مسودہ) از مصطفیٰ خاں شیفتہ متوفی ۱۲۸۶ھ بخط المصنف۔

(۱۲) ضیاء الایمان آداب القرآن - از سید عبد الجبار بن سید علاء ا... بخط نسخ معمولی، مکتوبہ ۱۰۴۱ھ بخط المصنف۔

حامل خصوصیات | (۱) ہفت بند کاشی - بخط ناخن نستعلیق خوشخط - کاتب مہتاب رائے روشن نگار، مکتوبہ ۱۲۳۶ھ۔

(۲) قصیدۂ حافظ شیرازی بخط ناخن، نستعلیق خوشخط در منقبت حضرت علی۔

(۳) ذکر شہادت نواب علاء الدولہ - از ابن ناصر بخط شکست مکتوبہ مرلی دھر ۱۲۴۲ھ ہر جملہ سے تاریخ شہادت مرحوم انشا برآمد ہوتی ہے۔

(۴) قصیدہ در تعزیت میر عبد الجلیل بلگرامی، از غلام علی آزاد بلگرامی متوفی ۱۲۰۰ھ مشتمل بر چہار مطالع و یک صد و یک بیت۔ ہر مصرع بیت سے تاریخ وفات مرحوم (۱۱۳۸ھ) نکلتی ہے۔

(۵) مجموعہ منتخبات شعراء اردو - یہ کسی ضخیم مجموعہ کا حصہ ہے شعراء اردو کے منتخبات ہیں بخط نستعلیق پاکیزہ تمام صفحات زرافشاں روشنی میں جھل مل کرتے ہیں۔

(۶) اشعار دیوان ترکی۔ ترکی زبان کے کسی شاعر کے دیوان کا ایک خوشخط صفحہ، جس کے صفحہ اول پر جہانگیر کی تحریر اور مختلف مغل امراء کی تحریریں اور مہریں ثبت ہیں، جہانگیر کی تحریر ذیل میں درج کی جاتی ہے:

" اللہ اکبر۔ نجم آذر سنہ ۱ داخل کتابخانۂ این نیازمند درگاہ الٰہی شد۔ حررہٗ نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ ۱۰۱۴ھ "

عنایت خاں شاہجہانی کی مہر اور عبداللہ چلپی کے دستخط ثبت واضح ہیں۔ ایک دوسری تحریر سے جو اس صفحہ پر درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ سلاطین خراسان و ہرات کے کتب خانوں سے منتقل ہوتا ہوا مغل بادشاہوں کے کتب خانوں تک پہنچا ہے۔ صفحہ اول پر "خامۂ اول" بھی لکھا ہوا ہے۔

(۷) بہارستان جامی متوفی ۸۹۸ھ اس نسخہ پر جامی کی تحریر موجود ہے مکتوبہ ۸۹۵ھ بعہد مصنف، بخط نستعلیق فنیمت لوح وجدا ول مطلا۔

(۸) دیوان صائب۔ مکتوبہ عارف تبریزی ۱۰۵۸ھ۔ اس کے حاشیہ پر صائب کے قلم کی تازہ غزلیں ہیں اور آخر میں "بلغ سماعاً صائب" لکھا ہے۔ یہ نسخہ شاہی کتابخانہ کی زینت رہا ہے۔ ۱۱۳۶ھ کا عرض دیدہ موجود ہے۔

(۹) دیوان صائب۔ مکتوبہ قبل از ۱۰۷۰ھ اس نسخہ پر صائب کی تصحیحات اور حاشیہ پر ان کے قلم سے غزلیں درج ہیں۔ ورق ۱۰۱ کے حاشیہ پر آخری مکمل غزل لکھ کر عبارت بھی لکھی ہے تاریخ ۱۰۷۰ھ و تعلیٰ ہے۔ (یہ نسخہ شاہی کتب خانوں میں رہ چکا ہے مختلف تحویلداروں کی تحریریں درج ہیں، قدیم ترین تحریر ۳ ر جمادی الاول ۱۰۸۳ھ درج ہے۔ تین غیر مقروء مہریں ہیں۔

(۱۰) جمہرۃ اشعار العرب، مرتبہ ابوالخطاب القرشی۔ مکتوبہ ۹۹۶ھ

اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے کہ متداول نسخوں میں اور اس نسخہ میں نمایاں اختلافات ہیں۔ اس سے قدیم نسخہ کا کا بھی علم نہیں۔

(۱۱) سہو المصلین مصنفہ حسن بن محمد بن احمد، مکتوبہ ۸۳۱ھ فقہ کی ایک عسیر الحصول کتاب۔

(۱۲) کتاب الامتاع باحکام السماع مصنف کمال الدین ابوالفضل جعفر بن ثعلب الادفوی الشافعی المتوفی ۷۴۸ھ مکتوبہ ۱۰۲۷ھ

(۱۳)۔ چاول۔ اس چاول پر ایک طرف ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی تصویر ہے اور دوسری جانب ان کا نام مع خطابات تحریر ہے۔

(۱۴) حقیقتہائے ہندوستان (در احوال ماخل و مخارج صوبجات ہندوستان)۔ از لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی، سال تصنیف ۱۲۰۴ھ مکتوبہ ۱۲۰۸ھ سرورق پر مصنف کی تحریر اور دستخط ہیں۔

(۱۵) ذکر الملوک (تاریخ حقی) مختصر تاریخ ہند از عہد معز الدین محمد بن سام متوفی ۶۰۲ھ تا عہد اکبر بادشاہ، از شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ مکتوبہ ۱۰۲۲ھ سال تصنیف ۱۰۱۵ھ۔

(۱۶) اشعۃ اللمعات۔ از شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ مکتوبہ محمد علی الدہلوی ۱۰۴۸ھ بخط نسخ خفی پاکیزہ در آخر ترقیمہ بقلم المصنف ۱۰۴۹ھ۔

(۱۷) تاریخ گزیدہ۔ از حمد اللہ مستوفی قزوینی متوفی ۷۵۰ھ سال تصنیف ۷۳۰ھ سرورق پر ۷ مہریں، یہ نسخہ ابوالفیض فیضی متوفی ۱۰۰۴ھ کی ملکیت میں رہا ہے، سرورق پر ان کی مہر اور دستخط بھی ہیں، سر سید احمد خاں کی ملکیت میں بھی رہا ہے ان کی مہریں بھی ہیں۔

(۱۸) المطول از سعد الدین التفتازانی المتوفی ۷۹۲ھ بخط نسخ مکتوبہ ۹۳۱ھ کاتب سیف شریف، بر سرورق عبارت و

دستخط نور الدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ بسلسلۂ دخول نسخہ بہ کتب خانۂ
شاہی در صفت مہر مدوّر و بیضوی عنایت خاں شاہجہانی،
"محمد حسین بندۂ شاہجہان" و "عبداللہ خانہ زاد عالمگیر بادشاہ"
وغیرہم و دستخط جائزہ: عبداللہ چلپی ۲۶ سنہ جلوسی و دیگر جائزہ
سنہ ۱۰۹۰ھ در بر ورق آخر چیج مہر مدوّر و مربع "صادق جان
بندۂ بجہان بندۂ شاہجہان" وغیرہ جائزہ جات متفرقہ۔

ہندو مذہب سے متعلق خصوصی مخطوطات

(۱) یجر وید۔ بزبان تیلگو بر بھوج پتر۔
(۲) ڈرامہ ہائے بھاس۔ بزبان ملیالم۔ بر بھوج پتر۔

یہ دونوں نسخے بہت قدیم اور اہم ہیں۔ کاغذ مہیا ہونے
سے قبل مخصوص درخت کی چھال کو چھیل کر باریک بنایا جاتا
تھا اور اس پر لکھا جاتا تھا جس طرح ہرن اور دوسرے جانوروں
کی کھال صاف کر کے کتابت کے کام میں لائی جاتی تھی۔
قرآن پاک کے ڈھائی پارے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے بخط کوفی
ایسی ہی کھال پر لکھے ہوئے ہیں۔

(۳) شرح فارسی شتری گیتا جی۔ از روی شنکر بھاس تصنیف
شنکراچاریہ مؤلفہ دھرگیائیں سنیاسی۔ مصوّر لوح و صفحہ اول
مطلّا۔ بر حواشی گلکاری بطلا۔ نسخہ مجدول بخط نستعلیق خوشخط
متن بزبان سنسکرت شرح بزبان فارسی۔

(۴) شرح رام چرتر چنیم تیرہ بزبان سنسکرت خوشخط مصوّر۔

(۵) ترجمہ فارسی مہابھارت۔ از نقیب خاں بن عبداللطیف
الحسینی۔ سال تصنیف سنہ ۹۹۲ھ بعہد اکبر بادشاہ۔ مکتوبہ
عبدالرحمٰن سنہ ۱۱۱۲ھ بمقام کشمیر بخط نستعلیق۔ سر ورق پر دو مہر
مدوّر غیر مقروء۔ یہ ترجمہ ڈیڑھ سال میں بمعاونت چند برہمنان و
ملا عبدالقادر بدایونی و شیخ بھاون کیا گیا۔

(۶) ترجمہ فارسی بھگوت مہاپران۔ از ابوالفیض فیضی متوفی سنہ ۱۰۰۴ھ
مکتوبہ ہرنیج مائے کھتری ساکن لسارہ سنہ ۱۱۴۴ھ بمقام چھاؤنی
سبا ہتھودہ۔ لوح مطلا بین السطور نیز مطلا۔ نسخہ مجدول بخط
نستعلیق غنیمت۔

(۷) ترجمہ بھگوت گیتا۔ در ہندی بھاشا۔ از راجہ بیربر ندیم اکبر بادشاہ
مکتوبہ در دولت شاہ سنہ ۱۲۳۵ھ بمقام شاہجہاں آباد بخط نستعلیق
بر ورق دوم مہر مربع "بچھمن داس"

شعبۂ مخطوطات میں فرامین شاہی، دستاویزات، قبالہ جات،
تصاویر، کتبات، وصلیات اور مکاتیب وغیرہ کا بھی معتد بہ
ہے جن کی مجموعی تعداد ۲ ہزار سے متجاوز ہے۔ (۹۶۰) سکے بھی
جن میں نقرئی و طلائی بھی ہیں، ہندو پیریڈ سے آخر عہد مغلیہ
فرمانوں میں بابر بادشاہ سے لے کر آخر عہد مغلیہ تک کے فرمان
بابر بادشاہ مکتوبہ سنہ ۹۳۳ھ اور فرمان اکبر بادشاہ مکتوبہ سنہ ۹۷۵ھ
کے کتبات و وصلیات ہند اور بیرون ہند کے مشہور خطاطوں
کے شاہکار بھی ہیں، مکاتیب بھی رہنمایان قوم، ادبا، شعرا، علما
اور صلحاء ہر طبقہ کے ملیں گے۔ اسی طرح تصاویر بھی شاہان مغلیہ
نادر شاہ، تانا شاہ، مولانا فخر الدین، طوطی بیگم وغیرہ جیسی
مشاہیر کی ملیں گی۔ فوٹو بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں، سا میں
دور سر سید احمد خاں کے کمیاب گروپ بھی ہیں۔

شعبۂ مخطوطات کو حبیب گنج کلکشن نے چار چاند لگائے ہیں
قدیم ترین مخطوطات عربیہ و فارسیہ اسی کلکشن سے تعلق رکھتے ہیں
اس کلکشن کے جامع نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن
خاں شروانی رئیس حبیب گنج و صدر الصدور مملکت حیدرآباد
دکن نے اپنے قلم سے اپنے کتب خانہ کے اہم نسخوں کی جو عنوان وار
فہرست بنائی ہے اس سے اس بیش بہا ذخیرہ کا اندازہ ہوتا ہے

کچھ خاص عنوان درج ذیل ہیں ۔

۱- الذہبیات: اس کے تحت ۹۹ وہ نسخے ہیں جو طلائی کام کے لحاظ سے امتیاز رکھتے ہیں، ان کی مدد سے ماوراء النہر عرب، ایران، ترکی، کشمیر، ہندوستان وغیرہ ممالک کے ہنر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۲- الخطاطیات: اس کے تحت بڑے بڑے خطاطوں کے قلم کے ۱۵ نسخے درج ہیں، مثلاً میر عماد، میر علی کاتب وغیرہ

۳- الخطیات: اس کے تحت ۳۵ وہ نسخے درج ہیں جو اعیان ملک کے لکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً مناجات امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ بدرگاہ قاضی الحاجات۔ مکتوب مرزا ابوالحسن آصف خان برادر نورجہاں ۱۰۲۵ھ بخط نستعلیق خوشخط مطلا، مجدول، زرافشاں۔

۴- المجلدات: قدیم جلد سازی کے ۱۶ نمونے۔

۵- السلاطینیات: جن ۴۱ مخطوطات کا سلاطین اور وزراء سے تعلق رہا ہے وہ اس کے تحت درج ہیں۔ مثلاً ابراہیم عادل شاہ کے کتب خانے کی صحیح بخاری وغیرہ۔

۶- الفتوحیات: وہ دو نسخے جو سلاطین کے کتب خانوں میں مال غنیمت کے طور پر داخل ہوئے۔

(۱) صحیح البخاری۔ از فتح بیدر، بردست ابراہیم عادل شاہ مکتوبہ ھ۔

(۲) مثنوی گوئے و چوگان ملا عارفی نوشتہ میر علی کاتب۔ از فتح گولکنڈہ بردست اورنگزیب عالمگیر بادشاہ۔

۷- المقامیات: جن ۹۶ نسخوں پر مقام کتابت درج ہے

۸- الختمیات: جن ۲۶۳ نسخوں پر مہریں ہیں۔

۹- الحسینات: ان میں ۴۱ وہ نسخے ہیں جو بلحاظ خط نادر ہیں (غیر خطاطیات)

۱۰- القرطاسیات: اس کے ذیل میں کاغذ کے ۱۱ اقسام دکھائے گئے ہیں۔

۱۱- المعلقات: اس کے ذیل میں ۲۳ قدیم مخطوطات درج ہیں۔ نویں صدی یا اس سے قبل کے نسخے۔ سب سے قدیم نسخہ پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کا ہے۔

۱۲- الخطوط: اس میں ۱۶ مختلف خطوں کی تاریخ ہے۔

۱۳- المصنفیات: اس میں ۳۸ وہ نسخے ہیں، جو بخط مصنف ہیں۔ یا نسخۂ مصنف سے منقول یا مقابلہ شدہ ہے۔

مخطوطات کی ترتیب فہرست میں ڈاکٹر پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کی مرتبہ فہرست نمائش گاہ مخطوطات نوادر" مطبوعہ ۱۹۵۳ء، پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد کے مجموعۂ مقالات "تاریخی و ادبی مطالعے" مطبوعہ ۱۹۶۱ء میں شامل مضمون "کتب خانہ حبیب گنج" اور حاجی محمد زبیر، سابق اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" کے مضمون "مولانا آزاد لائبریری" الزبیر دور کتب خانہ نمبر مطبوعہ ۱۹۶۱ء سے بھی حسب مواقع مدد لی گئی ہے۔

امید ہے کہ اس مضمون سے ارباب علم اور اہل دانش کی نظریں "مولانا آزاد لائبریری" سے متعلق مفید معلومات کا اضافہ ہو سکے گا۔

محمد عبد اللہ خاں شیرانی
اسسٹنٹ لائبریرین شعبۂ مخطوطات و انچارج اورینٹل ڈویژن
مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۲۰ دسمبر ۱۹۷۵ء

اختر جوناگڑھی کے سانٹ کی مزید تحقیق

از

جناب سید دی ایم ترمذی ایم بی بی ایس

اب سے چند سال پہلے کی بات ہے۔ روزنامہ "حریت" کے سنڈے ایڈیشن میں "اُردو کا پہلا سانٹ" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ صاحبِ مضمون "قاضی محمد" نے شروع میں ایک تعارفی نوٹ بھی دیا تھا جس میں مرقوم تھا۔

"اب سے چند سال پیشتر ماہنامہ "جدید" کے نظم نمبر میں مشہور شاعر اور نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی کا ایک نہایت تحقیقی اور اہم مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ کا مضمون تھا "اُردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ" اس مقالہ کا آخری پیراگراف یوں شروع ہوتا ہے؛

"اختر شیرانی نے پہلے پہل سانٹ کو
اُردو میں متعارف کرایا جو نیرنگ اور
دوسرے رسالوں میں شائع ہو کر
مقبول عام ہوا"

حاشیہ پر ایک وضاحتی نوٹ درج تھا جس میں مضمون نگار نے تحریر فرمایا تھا کہ ن۔م۔ راشد نے اپنی خود نوشت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اردو میں پہلا سانٹ اختر جوناگڑھی نے لکھا۔ یہ سانٹ تلاش کے باوجود نہ مل سکا؛

بعدہٗ "قاضی محمد" نے انگریزی سانٹ پر ایک تفصیلی نوٹ لکھا تھا۔ اور قارئین کو اس سے روشناس کرا کر پھر قاضی اختر جوناگڑھی کا پہلا اُردو سانٹ بحوالہ رسالہ زبان اگست ۱۹۲۹ء شائع کیا تھا۔

ہم "قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی مرحوم" کے پہلے سانٹ کے سلسلہ میں جناب قاضی محمدؐ صاحب کی فراہم کردہ معلومات پر اسی قدر اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اصل موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے قاضی صاحب کی تقلید میں چند باتیں سانٹ کے بارے میں بتانا ضروری سمجھتے ہیں۔

"سانٹ یورپی زبانوں کی ایک اہم صنفِ نظم ہے۔ جو نہ صرف اپنی ہیئت یا اپنے پیکر کے لحاظ سے منفرد ہے بلکہ مضمون کے اعتبار سے بھی ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ سانٹ کی حیثیت کچھ اس طرح کی ہے جیسی اُردو۔ فارسی اور عربی میں رباعی کی ہے۔ اس صنفِ نظم میں چودہ (۱۴) سطریں ہوتی ہیں جن کو اُردو یا فارسی کی اصطلاح میں چودہ مصرعے کہہ سکتے ہیں۔

سانٹ کی ابتداء اطالیہ میں ہوئی تھی وہاں کے دو مشہور شعراء پیٹرارک اور بوکیشو نے اس کو کافی ترقی

دی تھی۔ انگلستان کے دو شاعر سر ٹامس وائٹ
اور ارل آف سرے اُسے اطالیہ سے اپنے ملک میں
لائے۔ اور ان کے ذریعہ سے اس کا رواج انگریزی
زبان میں ہوا۔ ان شعراء کے اثر سے اس صنفِ نظم
نے انگلستان میں کافی مقبولیت حاصل کی۔ اور
انگریزی زبان کے بڑے بڑے شاعروں نے اس صنف
میں طبع آزمائی کی۔ ان شعرا میں اسپنسر، سڈنی،
ڈینیل، شیکسپیئر، ملٹن، ورڈس ورتھ اور کیٹس
کے نام قابل ذکر ہیں۔

جس قسم کے سانٹ کا اطالیہ میں رواج تھا
وہ اپنی ہیئت یا بناوٹ کے اعتبار سے دو حصوں میں
منقسم ہوا ہے۔ پہلا حصہ آٹھ مصرعوں کا ہوتا ہے
اور آکٹیو (مثمن) کہلاتا ہے۔ دوسرے حصے میں چھ
مصرعے ہوتے ہیں اور اس کو سیسٹیٹ (مسدس)
کہا جاتا ہے۔ ان دونوں حصوں میں قافیوں کی ترتیب
مقرر ہے۔ آکٹیو میں پہلے، چوتھے، پانچویں اور آٹھویں
مصرعوں کا قافیہ ایک ہوتا ہے۔ اور دوسرے، تیسرے
چھٹے اور ساتویں مصرعوں کا ایک۔ انگریزی میں
قافیوں کی اس ترتیب کو اس طرح ظاہر کیا جاتا ہے
"اے بی بی اے، اے بی بی اے"۔ سسٹیٹ میں
قافیوں کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے مصرع کا قافیہ
چوتھے سے، دوسرے کا پانچویں سے اور تیسرے کا
چھٹے سے ملتا ہے۔ انگریزی میں اس بات کو اس طرح
ظاہر کریں گے "سی ڈی ای۔ سی ڈی ای"۔

مضمون یا خیال کے اعتبار سے سانٹ کی اُس
قسم میں جس پر اطالوی طرز کا اطلاق ہوتا ہے۔ آکٹیو
یعنی پہلے حصہ میں مضمون کا ارتقا دکھایا جاتا ہے اور
سسٹیٹ یعنی دوسرے حصہ میں تخیل کی رنگ آمیزی
کر کے شاعر اپنے جذبات و تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔

انگریزی زبان کے کئی شاعروں نے سانٹ کی
اطالوی طرز کو اختیار کیا لیکن سسٹیٹ میں قافیوں
کی ترتیب کو عام طور پر بدل دیا۔ بیشتر تو ترتیب یہ رہی
کہ پہلے مصرع کا قافیہ تیسرے سے، دوسرے کا چوتھے
سے اور پانچویں کا چھٹے سے ملتا ہے لیکن کبھی کبھی پانچویں
اور چھٹے مصرعوں کا قافیہ ایک دوسرے سے مختلف
بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرز کو اپنانے والے انگریزی زبان
کے شعراء میں اسپنسر اور سڈنی کے نام سر فہرست ہیں۔
کیٹس نے بھی اپنی اس سانٹ میں یہی طرز اختیار کی
تھی جو اس نے ہومر کی نظم کے اس ترجمے سے متاثر
ہو کر لکھی تھی، جو مشہور شاعر چیپ مین نے انگریزی
زبان میں کیا تھا۔ لیکن چونکہ انگریزی شاعری جس
ماحول میں پروان چڑھ رہی تھی وہ اطالوی شاعری
کے ماحول سے خاصا مختلف تھا، اس کے علاوہ بعض
اوقات اطالوی طرز کی سانٹ کے قافیوں کی ترتیب
خیال کی روانی میں رکاوٹ کا باعث ہوتی تھی اس لئے
انگریزی شاعروں نے اطالوی طرز سے اختلاف کرتے
ہوئے اس صنف شاعری میں بعض نئے تجربات کئے۔
ان میں سب سے پہلا تجربہ شیکسپیئر کا تھا اور چونکہ
اس نے قافیوں کی ترتیب ہی میں نہیں بلکہ سانٹ کی
ہیئت میں بھی کافی تبدیلی کر دی اس لئے اس کی سانٹ

کی ایک جداگانہ قسم قرار دی گئی۔ اس طرز کی سانٹ شیکسپیرین یا انگریزی طرز کی سانٹ کہلاتی ہے شیکسپیرین سانٹ میں چودہ سطریں چار حصوں میں منقسم ہوتی ہیں۔ پہلے تین حصے چار چار مصرعوں کے تین بند ہوتے ہیں جن کو اردو میں مربعے کہا جا سکتا ہے۔ آخری حصہ جو صرف دو مصرعوں کا ہوتا ہے ایک شعر (کپلیٹ) کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان چودہ مصرعوں کے قافیہ کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے پہلے مصرع کا قافیہ تیسرے سے، دوسرے کا چوتھے سے پانچویں کا ساتویں سے، چھٹے کا آٹھویں سے، نویں کا گیارہویں سے، دسویں کا بارہویں سے اور تیرہویں کا چودھویں سے ملتا ہے (اے بی اے بی، سی ڈی سی ڈی، ای ایف ای ایف، جی جی) جہاں تک مضمون کا تعلق ہے شیکسپیرین طرز کی سانٹ میں شاعر پہلے تین بندوں میں خیال کو پھیلاتا ہے اور آخر کے شعر یا بیت میں نتیجہ پیش کر دیتا ہے۔ اس نقطہ پر پہنچ کر اس کے جذبات شدت اختیار کر لیتے اور انتہائی بلندیوں کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

انگریزی زبان میں جتنے سانٹ لکھے گئے ان کی مشہور ہئیتیں تو یہی دو ہیں یعنی اطالوی طرز اور انگریزی یا شیکسپیرین طرز۔ لیکن شعری ضرورتوں کے پیش نظر ملٹن اور ورڈس ورتھ نے بھی اطالوی طرز سے جزوی طور پر انحراف کر کے اپنی جداگانہ طرزیں نکالی تھیں جو ان عظیم شاعروں کے ناموں سے ملٹونک اور ورڈس ورتھین کہلاتی ہیں۔

سانٹ ان نظموں میں شامل کی جاتی ہے جو داخلی یا موضوعی شاعری کے لئے مخصوص ہیں۔ اس میں زیادہ تر محبت کے نغمے الاپے جاتے ہیں۔ چنانچہ شیکسپیر نے اپنی ۱۵۴ سانیٹس میں صرف اپنے جذبات محبت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن دیگر شعراء نے دوسرے جذبات بھی ظاہر کئے ہیں مثلاً ملٹن نے ایک سانٹ میں اپنی بینائی سے محرومی پر انتہائی رنج و ملال کا اظہار کیا ہے، ورڈس ورتھ نے اپنی ایک سانٹ میں انسان کے دنیا داری میں ضرورت سے زیادہ انہماک کا نوحہ کیا ہے۔ اور کیٹس نے چیپ مین کے ترجمہ کو پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

سانٹ اردو کی اصناف نظم میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے اردو میں اس صنف کے بہت کم نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض شعراء نے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے انگریزی کے تتبع میں چند سانٹ لکھے ہیں ان میں احمد میاں اختر جوناگڑھی کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کا سنہ ولادت ۱۸۹۷ء ہے۔ اس لحاظ سے جب ان کا یہ سانٹ "رسالہ زبان" میں شائع ہوا اس وقت ان کی عمر ۲۹ سال تھی لیکن یہ بات غالباً کسی قدر حیرت سے سنی جائے گی کہ شاعر نے یہ نظم ۱۹۱۵ء میں لکھی تھی جب ان کا سن مشکل سے اٹھارہ سال تھا۔ اس حقیقت کا انکشاف بہاء الدین کالج جوناگڑھ کے میگزین کے شمارہ فروری ۱۹۱۶ء سے ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ بہاء الدین کالج جوناگڑھ سے

جو میگزین نکلتا تھا اس کا نام بہار الادبین تھا۔
اس میگزین کے اردو سیکشن کے مدیر سید محمد علی
ترمذی تھے۔ اور بی اے کے ایک طالب علم محمد عمر منشی
کی حیثیت معاون مدیر یا طالب علم ایڈیٹر کی تھی۔
اس میگزین کے شمارہ فروری ۱۹۱۵ء میں جناب
محمد عمر منشی نے اختر جوناگڑھی کا یہ سانٹ درج کرنے
سے پہلے اس پر مندرجہ ذیل تعارفی نوٹ لکھا تھا۔

"ہم اختر کا ایک سونٹ درج کرتے ہیں
تاکہ ناظرین کرام آپ کی اس جدت کو
ملاحظہ کریں اور سونٹ لکھ کر اردو ادب
کو ممنون فرمائیں۔ وھو ھذا۔"

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے جب اختر کا یہ سانٹ جو لفظاً
اردو زبان میں سب سے پہلا تجربہ تھا، ۱۹۱۵ء میں
شائع ہوا اس وقت ان کی عمر بمشکل ۱۸ سال تھی۔
اس قدر کمسنی میں ایسا پختہ کلام پیش کر کے ایک جدت
پیدا کرنا واقعی حیرت انگیز اور قابل تحسین امر ہے
لیکن اس سے بھی زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ
اس پہلے تجربہ کے بعد ہی اختر نے اپنی توجہ اس
صنف شاعری سے ہٹالی اور دیگر اصناف میں طبع
آزمائی کرتے رہے۔ ایک کامیاب تجربہ کے بعد اپنے

. . . .

. . . .

اشہب خامہ کی عنان کو دوسری سمت میں موڑ دینا
یقیناً نہایت عجیب بات ہے لیکن جب اختر کے
بعض حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس تبدیلی کی
وجہ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے اور حیرانی و پریشانی
کے یہ بادل خود بخود چھٹ جاتے ہیں۔

ان حالات کا مختصر خاکہ اس طرح مرتب ہوتا ہے۔
شعر و سخن میں قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی
کے استاد سید حسین میاں المتخلص بہ "سید"[1] تھے
جن کا سنہ وفات ۱۹۲۶ء ہے۔ صوفی منش اور پرانی
وضع کے بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے عزیز شاگرد
اختر کا یہ سانٹ میگزین میں دیکھا تو انہیں یقیناً
ملال ہوا ہوگا اور محسوس کیا ہوگا کہ ابھی سے انھوں
نے روایت سے بغاوت شروع کر دی ہے۔ سعادت مند
شاگرد کی تنبیہ کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ چنانچہ شفیق
استاد کی زندگی میں انہوں نے نہ کوئی اور سانٹ
لکھا اور نہ اس سانٹ کو دوبارہ چھپوایا۔ استاد
کے انتقال کے بعد خود اختر ہی نے یا ان کے احباب
میں سے کسی نے اس سانٹ کو رسالہ "زبان" میں شائع
کرادیا۔ اس طرح سانٹ لکھنے کا سلسلہ منقطع ہوگیا
اور ایک ہی سانٹ کی دوبارہ اشاعت میں ۱۱ سال
کا وقفہ رونما ہوا۔

رسالہ "زبان" جس کے حوالے سے قاضی محمود صاحب
نے اختر مرحوم کا سانٹ "حریت" میں شائع کیا ہے،
۱۹۲۶ء میں شروع ہو کر ۱۹۲۸ء میں بند ہوگیا۔ یہ رسالہ
جناب "خوشتر" نے مانگرول سے نکالنا شروع کیا تھا۔

---

[1] سید حسین میاں سید کو مولانا عبدالاحد شاد فرنگی
محلی لکھنوی سے شاعری میں تلمذ تھا۔

موصوف اس وقت کبیر السن اور بقید حیات ہیں۔ قیام
مانگرول ہی میں ہے۔ جب مولانا ابو ظفر ندوی نے ۱۹۲۸ء
میں جوناگڑھ سے "شباب" جاری کیا تھا تو اس کے پہلے
شمارے کے ایڈیٹوریل نوٹ "لمعات" میں لکھا تھا:۔

"......... اگرچہ ۱۹۲۶ء میں یہاں کے
بعض علم دوست احباب خصوصاً خوشتر مانگرولی کی
مساعیٔ جمیلہ سے ایک رسالہ زبان کے نام سے شائع
ہونے لگا تھا مگر بعض وجوہ کی بنا پر صرف دو سال تک
شائع ہوکر یہ قابل قدر علمی رسالہ ہمیشہ کے لئے خاموش
ہوگیا۔ ان ہی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک عرصہ سے
یہ خیال تھا کہ گجرات یا کاٹھیاواڑ سے ایک اخبار یا رسالہ
اردو زبان میں شائع کیا جائے۔ ادھر اتفاق سے کاٹھیاواڑ
جانا ہوا اور میرے قدیم دوست فخر جوناگڑھ جناب قاضی
احمد میاں اختر جوناگڑھی سے اس معاملہ میں متعدد بار
مشورہ ہوا اور آخر کار اس رسالہ کے اجراء کا مصمم
ارادہ کر لیا۔"

اختر جوناگڑھی کے استاد "سید" جناب
خوشتر کے ہم عصر تھے۔ ان کی فرمائش پر "سید" صاحب
نے رسالہ زبان کے لئے مندرجہ ذیل قطعہ بھی لکھا تھا۔

عزیز خاطر خوشتر جو تھی بہت دل کو
یہ چند شعر کہے پرچۂ زباں کے لئے
ازل میں آہ سے میری شرر جو نکلے تھے
وہی ستارے بنے نیلے آسماں کے لئے

جب ۱۹۲۸ء میں رسالہ "زبان" کو بند کرنا پڑا
تو خوشتر نے حسب ذیل شعر کہہ کر اپنے دلی رنج و
ملال کا اظہار کیا ؎

"زباں" کی قدر اگر ہم وطن نہیں کرتے
نکل ہی آئیں گے کچھ قدر داں زباں کے لئے

اب ہم اختر کا وہ تاریخی سانٹ پیش کرتے ہیں جس کے لئے
یہ تمہید لکھی گئی۔

شہر خموشاں

کیا ہی یہ شہر خموشاں دل شکن نظارہ ہے
کیسی عبرت خیز ہے یہ اس کی پُر غم خامشی
حسرت و بیچارگی ہے ہر طرف چھائی ہوئی
دیکھ کر جس کو دل مضطر بھی پارہ پارہ ہے
خاک کے تودے پڑے ہیں جابجا کس شان سے
قبر ہے کوئی شکستہ اور کوئی اجڑی ہوئی
سبزۂ خوردہ کہیں ہے اور کہیں کائی جمی
ہیں پڑے سنگ لحد بھی قالب بے جان سے
چھوٹ کر قید مصیبت سے ہر اک آکر یہاں
سو رہا ہے فکر عیش جاودانی چھوڑ کر
ان کی تربت پر فقط سبزہ ہے تنہا سوگوار
صرف اک شبنم ہے ان کے حال پر گریاں کناں
بے کسی چھائی ہوئی ہے خفتگانِ خاک پر
آہ یہ شہر خموشاں بھی ہے کیا اجڑا دیار

اس سانٹ میں شاعر نے خالص اطالوی طرز اختیار
کیا ہے۔

البیرونی اور جدید خلائی تحقیقات

از

جناب شیخ محمد علی

قسط (۲)

البیرونی کو اپنی تمام تر تصانیف و تخالیق پر بڑا فخر تھا اور وہ ان کو اپنی اولاد کی مانند سمجھتا تھا۔ ایک جگہ وہ اس موضوع پر رقمطراز ہے،

"یہ تمام تصانیف میرے "لخت جگر" کی مانند ہیں اور اکثر لوگ اپنے کلام اور اپنی اولاد پر فریفتہ ہوتے ہیں۔"

ہم البیرونی کی تصانیف کو موضوع کے لحاظ سے حسب ذیل احصا میں منقسم کر سکتے ہیں۔

۱۔ علم ھیئت۔ اٹھارہ طویل و ضخیم کتابیں اور بے شمار رسائل
۲۔ جغرافیہ۔ پندرہ کتابیں اور چند رسائل
۳۔ علم المناظر۔ چار کتابیں
۴۔ آلات علم ھیئت۔ پانچ کتابیں اور چند رسائل
۵۔ دربارہ اوقات و ازمنہ۔ پانچ کتابیں
۶۔ دم دار و گیسو دار ستاروں سے متعلق۔ چار کتابیں
۷۔ احکام النجوم۔ سات کتابیں
۸۔ ھزل و مزاح۔ چودہ کتابیں اور چند رسائل

۹۔ عقاید و روایت۔ چھ کتابیں اور چند رسائل

۱۰۔ متفرقات۔ بائیس کتابیں

۱۱۔ پانچ وہ کتابیں جو البیرونی کی زندگی میں بعد از تکمیل ضائع ہو گئی تھیں۔ درج بالا صرف وہ تصانیف ہائے البیرونی تحریر ہیں جن کا اب تک سراغ لگایا جا چکا ہے۔ ابتداً کہیں تفصیل سے اور کسی جگہ اختصاصی انداز اختیار کرتے ہوئے البیرونی کی عظمت وہمہ گیری اور تاریخی پس منظر کو دائرۂ تحریر میں لایا گیا ہے۔ البیرونی کے معاصرین اور اس کے بعد کے ماہرین نے اس پر قلم اٹھاتے ہوئے اسے ایک صلح وحق پسند اور تعصب وعصب سے مبرا انسان قرار دیا ہے اور یقیناً سوانح البیرونی سامنے رکھتے ہوئے اس کی آفاقیت سے انکار وگریز ممکن نہیں۔ ہر دور اور ہر قوم میں تعصب اغیار و تعصب کے مظاہرے دیکھنے میں آتے رہے ہیں، لیکن ہمیں ایسی سطحی کوئی چیز اس شخص عظیم کے دامن سے وابستہ نظر نہیں آتی۔ اس کے حلقۂ احباب میں ہر قوم و ہر مذہب کے لوگ شامل تھے جو اس کی عظمت ومحبت کے گن گاتے تھے۔ البیرونی کی حق پسندی وبے تعصبی خواہ وہ اپنوں سے ہو یا غیروں سے کا اندازہ اس کی مختلف موضوع پر تحریروں سے بخوبی ہوتا ہے، مثلاً یہ اپنے ایک ہمعصر دوست ابوسعید احمد محمد عبدالجلیل السجزی کی ایک ایجاد "اصطرلاب" پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "استیعاب" میں مبصر ہے۔

"ابوسعید السجزی نے ایک بڑا اصطرلاب بنایا جس کا عمل مجھے بہت پسند آیا اور میں نے اس کی بہت تعریف کی، کیونکہ جن اصول و نظریات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بنایا گیا تھا وہ ارض کو متحرک تسلیم کرتے تھے۔"

مذکورہ بالا تحریر اس امر کی بھرپور شاہد ہے کہ یہ شخص ایک بے تعصب و معصوم ذہنیت کا فرد تھا جس کو جھوٹ، طمع، بغض اور سطحی کردار سے شدید نفرت تھی۔ کیا ایسا شخص دنیا کی تمام اقوام کے لئے قابل محبت نہیں؟ اب تک ہم نے البیرونی کے پرآشوب و دشوار گزار کٹھن زمانہ کا مطالعہ کیا اور انسانی عظمت کے اس کردار کی ماہیت پر غور کیا جو تاریخ کے سنگین وخون آشام حالات میں بھی مبداء منور بن کر علوم وفنون کی شعاعوں سے کائنات کو منور کرتا رہا۔ اب ہم مختصراً اس بات کا جائزہ لیں گے کہ اس نے سائنس میں کیا کارہائے نمایاں وگراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

اس عظیم سائنس دان کی یہ حالت کہ ذہن و روح کی وہ بالیدگی، شعور وفکر کی ایسی بلندی، فہم وادراک کی اتنی گہرائی، صدق وصفا میں بے مثال پختگی، اخلاق وکردار میں غیر متنزل عظمت اور عقل ودانش میں وہ روشنی جس سے کل کائنات جگمگا اٹھی۔ فکر انسانی کو دریائے حیرت میں غوطہ زن کرنے

کے لئے کافی ہے۔ اس کی ذات میں علوم کائنات کی یہ حالت البیرونی کی جامعیت و گہرائی کی قسم کھاتی ہے۔ مشہور و معروف امریکی ماہر طبیعیات رابرٹ آر نیوٹن ROBERT R. NEWTON نے ایک ملاقات کے دوران راقم الحروف سے البیرونی کی فاضلانہ علمی قابلیت و مشاہداتی بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

"علی یہ شخص وہ عظیم مسلمان تھا جس کی ذات سے ہر دور اور ہر ماحول میں علم کے سوتے پھوٹتے رہے۔ مطالعۂ تاریخ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ اس کی ذات، اس کے دور کے تمام ماہرین سائنس و فکر و محیط نظر، اس کی علمی آگہی کی مثال ناپید ہے۔ اس بنا کہ یہ ایک لامحدود و محیط علم کا مالک تھا، یہ بنی نوع انسان کے لئے قدرت کا وہ تحفہ ہے جس کے کام نے سائنس کو راہ جدید سے روشناس کیا، آج وہ منزل جو عالم انسانیت کا وطیرہ ہے۔ اسی کی رہین منت ہے۔"

آگے کہتے ہیں۔

"یہ وہ شخص تھا جس نے اپنے دور کے تمام تصوراتی مفکرین یعنی اہل سائنس و علم جو صرف ذہنی تصورات کی بنا پر نظریات کا انعقاد عمل میں لاتے تھے۔ پر بھر پور مدلل طرز فکر کے ساتھ تنقیدیں کیں اور ان کے سائنسی نظریات کو سخت تحقیقات کے بعد جھٹلا دیا۔ ان اہل فکر میں الکوہی کا نام قابل ذکر ہے، میں پھر بھی کہوں گا کہ یہ قدرت کا بہت بڑا عطیہ عالم انسانیت کے لئے تھا۔"

قارئین رابرٹ آر نیوٹن Robert R. Nevton وہ مشہور امریکی ماہر طبیعیات و فلکیات ہیں جو زمینی گردش Earth Acceleration اور دیگر مختلف النوع فلکی مظاہر Astrenemical Phenomenon سے متعلق وہ نظریات و اکتشافات جو البیرونی کے فکر و اجتہاد کا ثمرہ ہیں، پر محو فکر و جستجو اور رواں تحقیق و نتائج ہیں۔ یہاں اس امر کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی یہ محنت جدید سائنس میں البیرونی کو زندہ و پائندہ ہستی بنانے میں ایک اہم اور ناقابل فراموش کردار ادا کر رہی ہے، مسٹر نیوٹن نے اپنے گراں قدر و طویل تحقیقی مقالہ "The Earth's Acceleration As Deduced From Al-Biruni's Solar Data" میں جس کو انھوں نے ۱۹۷۲ء میں The Memoirs of the Royal Astronomical Society میں پیش کیا تھا، البیرونی کی شہرۂ آفاق تصنیف Coordinates کے گراں قدر افکار و نظریات اور اس کی اس جان فشاں سعی و کاوش جو اس نے دوپہر کے وقت زاویۂ آفتاب کے

مطالعہ سے غزنی سے کعبہ تک صحیح سمت معلوم کی تھی، کی مدد سے زمینی گردش اور اس کی رفتار پر دقیق و فکر انگیز تجربات و مشاہدات سے تجزیاتی و تمراتی امور کو نہایت وضاحت و روشن انداز میں طشت ازبام کیا ہے۔ آج کل بھی آپ البیرونی کے خلائی و فلکیاتی نظریات و افکارات پر کام کر رہے ہیں۔ مسٹر نیوٹن کے خیال پر البیرونی کے فلکیاتی نظریات و افکارات جدید خلائی سائنس کو ترقی و نمو کے میدان میں بہت کچھ دے سکتے ہیں عہد حاضر میں آپ کی یہ سائنسی تحقیقات جن کی اساس نظریات ہائے البیرونی پر قائم ہے جدید خلائی سائنس کے لئے نہایت قیمتی و بیش بہا خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایک موقع پر آپ نے راقم الحروف سے اس میں کا اظہار کیا کہ

"انشاء اللہ میں جلد ہی کسی خاص اہم نتیجہ پر پہنچ جاؤں گا۔"

البیرونی کے فلکیاتی نظریات Astronowieal Theories کیا ہیں اور ان کو مسٹر نیوٹن کس طرح استعمال کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر ہمارے مابین ایک طویل گفتگو کا آغاز ہوا۔ میں یہاں اس گفتگو کے اہم و مختصر ٹکڑے کو قلم بند کرتا ہوں جس سے جدید خلائی تحقیقات میں البیرونی کے کردار پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ اقتباسی شکل میں

"The work that I am doing is a study of force that are slowly changing the behaviour of the Solar System. Al-Biruni's work has a large amount of Astronowical Data that is quite valuable in my work. The best way to summarize, The result is! Suppose thet the Atomic clock had been invened Then, and that some one atsred and set an Atomie Clock in the year that Al-Biruni was born. Thc clock would now appear fest by about "70" minutes. This is not the fault of the clock. However, the time that we live by is measured by the Rotation of the earth, and the earth (As a clock) has lost about "70" minutes in the last 1000 year.

بعض مستشرقین و مورخین رقم طراز ہیں کہ البیرونی نے فلسفہ کو مرکز تحقیق و جستجو نہیں بنایا۔ ان کا یہ بیا

نہایت لغو اور لاحاصل فکر انگیزی کا نتیجہ ہے، بقول رابرٹ آرنیوٹن کے

"ذات البیرونی میں فلسفہ و سائنس یکجا نظر آتے ہیں۔"

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ شخص فلسفہ میں اس کامل بصیرت کا حامل تھا کہ اقوام و مذاہب، مختلف تہذیب و تمدن، اسماجیات و عمرانیات اور سیاسی و ثقافتی خیالات فلسفہ سے آگاہی کے سبب فلسفہ میں اس کی حدود اس قدر وسیع و کشادہ نظر آتی ہیں کہ نظریں مطالعاتی و مشاہداتی قوت سے درماندہ لوٹتی ہیں۔ کیا مظاہر قدرت اور قوانین قدرت پر غور و فکر میں فلسفہ کو دخل نہیں؟ ذرا دیکھئے یہاں بھی اس کے فلسفہ نے کتنی اہم ایجادات واختراعات اور مدلل مسلمات پیش کی ہیں۔ ہم دراصل فلسفہ کو دو بنیادی احصاء میں تقسیم کر سکتے ہیں جس میں ایک "تصوراتی فلسفہ" کی شکل ہے اور دوسری "اطلاقی فلسفہ" کی۔ فلسفہ کے تصوراتی نکتۂ نگاہ کی وضاحت درج ذیل شعر بخوبی کرے گا۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

مجملاً اس امر کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ تصوراتی فلاسفر کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ حقیقتی یا وجودی طریقہ پر اس کا فلسفہ نوع انسان کو کچھ دے سکے گا یا نہیں، وہ خود ہی مسئلہ اٹھاتا ہے اور ذاتی اطمینان و سکون کی خاطر خود ہی اس کا جواب دہ ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس "اطلاقی فلسفہ" میں انسان ہمیشہ "مخلوق" کی فلاح و بہبود کے بارے میں سوچتا ہے اور اس کے بنیادی مسائل کا قابل قبول حل بھی پیش کرتا ہے، چنانچہ اس تشریح کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ البیرونی اہلِ یونان کی طرح تصوراتی دنیا کا باسی نہیں بلکہ ایک حقیقی و اطلاقی کائنات کا وجود تھا جس کے دامن کی اطلاقی فلسفہ سے وابستگی تھی۔

علوم مظاہر قدرت کا اس سا عظیم محقق سابقین و متاخرین میں کہیں دور دور تک دکھائی نہیں پڑتا۔ علوم ریاضیات میں اس کی قابلیت و اعلیٰ تربیت کمال بلندی کا پتہ دیتی ہے۔ اس علم میں اس نے تمام سابقہ خیالات وافکارات اور ریاضی نظریات کا مطالعہ نہایت باریک بینی اور ذکاوت فکر کے ساتھ کیا اور ہزاروں جگہ درستگی، ترمیم، جامعیت و گہرائی اور قوانین کی درجہ بندی کی اور ان کو سہل طریقوں پر استوار کیا۔

علم حساب و ہندسہ کے بغیر ہیئت Astronomy میں انکشافات و اختراعات اہل سائنس کے نزدیک ناممکن و محال تصور کئے جاتے ہیں۔ ان دو علوم کی باہمی وابستگی کے سبب ہی البیرونی کو علوم ریاضی حساب و ہندسہ میں اتنا عبور تھا کہ سینکڑوں مسائل چٹکی بجاتے حل کئے اور نہ جانے کس قدر رازہائے سربستہ حشت از بام کئے۔ یہ انھیں علوم میں کمال بلندی کا نتیجہ ہے کہ تاریخ پر قلم چاہے مغرب کا چلا ہو یا مشرق کا اس کو بابائے فلکیات Father of Astronomy کے نام سے اوراق میں جگہ دی جاتی ہے۔

"قانون المسعودی فی الہیئت والنجوم" اس کی وہ عظیم و ضخیم شہرت یافتہ تصنیف ہے جس کی قلم روکی پر خوش ہو کر سلطان غزنی نے ایک ہاتھی کے ساوی الوزن چاندی کے سکے اس مجتہد عالم کی خدمت میں پیش کئے لیکن اس عظیم سائنسدان کی غیرت و حمیت نے علم کی اس خریداری کو پسند نہ کیا اور انہیں اسی حالت میں جیسے کہ یہ آئے تھے واپس لوٹا دیا۔ قانون المسعودی میں سینکڑوں رازہائے فطرت و قوانین فطرت، ہیئت و متعلقات ہیئت اور تبدل ہائے ارض و سما پر نہایت واضح و روشن انداز میں مدلل گفتگو عمل میں لائی گئی ہے۔ اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سابقین صنادید کی علمی و فنی غلطیوں کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے اور تجزیاتی تحقیقاتی امر کے بعد درست نشان دہی کی گئی ہے۔ اور ان کی صحیح درجہ بندی کا انعقاد عمل میں لایا گیا ہے جس کا اس سے قبل کوئی تصور نہیں ملتا۔ رابرٹ آر نیوٹن Robert R. Newton اور کینیڈی E.S. Kennedy کے خیال میں یہ اس کی معرکۃ الآرا تصانیف میں سر فہرست حیثیت کی حامل ہے۔

آلاتِ ہیئت Astronomical Instruments میں بھی البیرونی نے سینکڑوں جدت آمیز اصلاحات کیں اور ان کا مؤثر استعمال کیا۔ ان آلات اور طریقہ کار کے متعلق اس کی کئی بہترین گراں قدر تصانیف و رسائل موجود ہیں جن کو آئندہ نسل کی راہ نمائی کا اختیار ایک طویل عرصہ تک حاصل رہا۔ الاسطرلابی اصطرلاب، البیرونی کی گراں قدر ایجادات میں وہ حیثیت رکھتا ہے جو فلکیات و ہیئت میں جدت پسندی کے احساس کو بخوبی ابھارتا ہے۔ البیرونی نے ان اپنی تخالیق کی مدد سے اجرام سماوی کا ارتفاع Elevation ارتفاع شمسی، اوقات شب، ارتفاع کواکب، دریا و زمین کی گہرائی اپنے سیاروں کی دریافت، الغرض یہ کہ سینکڑوں مختلف النوع مسائل حل کئے۔ اگر ہم البیرونی کی جغرافیائی تحقیقات و کاوشات پر نگاہ دوڑائیں تو ہمیں نظری و علمی دونوں پہلوؤں سے اس کے کمال فضل و بصیرت اور جغرافیہ آگہی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ البیرونی کی جغرافیائی قابلیت اور کچھ اپنے کام پر روشنی ڈالتے ہوئے مسٹر رابرٹ آر نیوٹن اپنے مقالہ Biruni's Solar Data کی شروعات میں رقمطراز ہیں۔

"البیرونی نے جو کچھ Coordinates میں بتلایا اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ غزنی سے مکہ تک کی صحیح سمت معلوم کرے۔ حقیقت میں اس کے پس پشت یہ مقصد کارفرما تھا کہ مذہبی لوگ صحیح سمت معلوم کر کے اپنے مقام پر پہنچ جائیں اور اس چیز کو ابن یوسف[1] نے بھی استعمال کیا۔ البیرونی کو دیگر کچھ شہروں کے مابین اسی قسم کے تعلق معلوم تھے۔ اس نے طول البلد و عرض البلد معلوم کئے اور ان کے مابین تقابل و تفاوت کو واضح کیا۔ شمسی مشاہدے

---

[1] ایک مشہور مسلمان سائنس دان۔

سے بیشتر مقامات پر اس نے طول البلد کی سمتیں بھی دریافت کیں۔

زیر نظر مقالہ کا مقصد یہ ہے کہ زمینی اسرارع معلوم کیا جائے۔ ان اعداد و شمار کی مدد سے جو البیرونی نے Coordinates میں بتائے ہیں" البیرونی کہتا ہے کہ وہ عرض البلد کے فرق معلوم کرنے کے بعد اور مقامی سمتی فرق کو شمار کرنے کے بعد وقت کے فرق کو باآسانی معلوم کر سکتا ہے۔"

گو ان جغرافیائی اصولوں اور ان کے طریقۂ کار پر کئی رسالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر یہاں بھی "قانون المسعودی" کا نام اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے۔ اس کتاب میں جغرافیائی سرمایے کا طریقۂ کار طول البلد و عرض البلد، تراب، ترابی کیفیات، سمندر، دریا، جھیل و چشمہ سب ہی دائرۂ قلم زدگی میں ہیں۔ اور ہر ہر موضوع پر تفصیلی بحث کا انضمام عمل میں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی کتابوں میں کئی مقامات پر وضاحت کی خاطر نقشے Maps بھی بنائے، بلکہ جغرافیائی نقشہ جات پر مبنی ایک گراں قدر فنی کتاب "تجدید المعورہ و تصحائی المورہ" بھی چھوڑی ہے۔ اس میں البیرونی نے یہ بتایا ہے کہ کس طرح قواعد ریاضی کی مدد سے کروی اشیا Spherical Objects کو پھیلایا جائے کہ کچھ حسابی تقابل بھی واقع نہ ہو۔ یہ ماہرین علم ہئیت Astronomers کے نزدیک ایسی کارآمد چیز تھی جس کی مدد سے انہوں نے سیاروں، ستاروں اور زمین کے نقشہ جات بنائے۔ البیرونی نے بذات خود اس اصول اور طریقۂ کار پر زور دیا ہے۔ وہ اپنی کتاب "الآثار الباقیہ" میں زیر بحث موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"یہ وہ کارآمد بحث ہے جس پر سابقین نے قلم تک نہ اٹھایا اور یہ وہ پہلا موقع ہے جبکہ میں اس تفصیلی بحث کو دنیا کے روبرو پیش کر رہا ہوں۔"

البیرونی نے جو جغرافیائی تحقیقات کیں، ان کو آج تک درجۂ اسناد سے نوازا جاتا ہے۔ ماہرین کے نزدیک جہاں یہ ایک بہت بڑا ماہر فلکیات تسلیم کیا جاتا ہے وہاں اسے ایک شہرۂ آفاق جغرافیہ دان بھی مانا جاتا ہے۔ زیر بحث و موضوع کے اشتمال سے یہ امر نہایت مناسب رہے گا کہ ہم اس کے ان جغرافیائی نظریات پر ایک سرسری نظر ڈالیں جو علم جغرافیہ کے بنیادی اساس پر مشتمل تصور کئے جاتے ہیں۔

زمین۔ قشر الارض پر انسان کیونکر عدم سے وجود میں آیا ہے۔ اس لئے یہ ہمیشہ سے اس کے زیر بحث رہی ہے۔ اہل یونان زمین کے بارے میں جو دیو مالائی تصورات رکھتے تھے وہ نہایت دلچسپ و سنسنی خیز دیو مالائی کہانیوں کا ایک جز محسوس ہوتے۔ البیرونی سے پہلے کا تمام دور یونانی ماہرین کے ان نظریات ارض پر یقین کامل رکھتا تھا۔ باعث حیرت تو یہ امر ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں آج تک یہ نظریات موجود ہیں، جن کا

سبب صرف جہل آگہی وجہل پسندی میں مضمر ہے۔ اس لئے اس موقع پر ان نظریات کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ رہے گا ساہل یونان کے تصوراتی فلاسفر، جن کو تاریخ ماہرین سائنس بھی لکھتی ہے، زیر نظر دو ارضی نظریات کا انعقاد عمل میں لاتے ہیں۔

۱۔ زمین کو دراصل چار ہاتھی اٹھائے ہوئے ہیں، یہ چاروں ہاتھی ایک بڑے کچھوے پر سوار ہیں جو لامتناہی سمندر میں تیر رہا ہے۔

۲۔ زمین کو ایک ہزار سر والا ناگ اٹھائے ہوئے ہے جو اپنے بوجھ سے کبھی نہیں تھکتا۔ زمین کے وجود پر ان کا تبصرہ اور مضحکہ خیز ہے۔

۳۔ سمندر سے اچانک ایک انڈا نمودار ہوا جو دو حصوں میں بٹ گیا، ایک حصہ آسمان کی شکل اختیار کر گیا اور دوسرا زمین کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔

مذکورہ بالا نظریات یونانی ماہرین کے عطا کردہ وہ زرخیز ثمرات ہیں، جن سے سائنس کا استفادہ نہ کرنا ہی بہتر رہا ورنہ عہدِ حاضر کا ایک سائنس دان دیو مالائی کہانیوں کا تخلیق کار کہلانے کے علاوہ کیا کہلا سکتا تھا۔ البیرونی نے ان تمام لغو و بے بنیاد نظریات کو سختی سے رد کیا اور تراب کے گول ہونے پر زور دیا اور اس نظریہ کی یہ دلیل پیش کی کہ اگر زمین گول نہ ہوتی تو زمین شمالی سمندر کی جانب اور پانی جنوبی سمندر کی سمت بڑھ جاتا۔ البیرونی نے جہاں زمین کے گول ہونے پر سائنسی دلائل دیئے ہیں، وہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ "میرے اس نظریہ کو نگاہوں کی صداقت سے بخوبی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں، جبکہ اس نے زمین کو کرہ ثابت کیا" اہل مغرب زمین کو چپٹا تصور کرتے تھے۔

البیرونی نے زمین کے وجود پر اس نظریہ کا انعقاد کیا کہ یہ کبھی مائع صورت کی حامل تھی اور رفتہ رفتہ اس نے پختگی کے مراحل طے کئے اور اس کی سطح ٹھوس شکل اختیار کر گئی۔ اس ضمن میں دلائل دیتے ہوئے اس نے آتش فشاں پہاڑوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ مائع کی شکل میں یہ لاوا اب بھی زمین کی نچلی سطح پر موجود ہے جو دھوئیں اور آگ کے ہمراہ گاہے بگاہے ان پہاڑوں سے نکلتا رہتا ہے۔ اس نے اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ زمین اس وقت اپنی ابتدائی حالت میں نہیں بلکہ سینکڑوں تبدیلیوں کے بعد موجودہ شکل میں دکھائی پڑتی ہے۔ اور اب بھی اس میں تبدیلیوں کے امکانات روشن ہیں۔

زمین کی پیمائش

جیسا کہ میں نے قلم بند کیا کہ مفکرین یونان زمین کے بارے میں کیا کیا نظریات رکھتے تھے، ان نظریات کو دیکھتے ہوئے یہ تصور محال ہے کہ ان میں کوئی شخص ایسا بھی گزرا ہو جس نے زمین کی حقیقت کو سمجھا ہو اور اس کی ساخت و ماہیت پر تحقیقی عمل بروئے کار لایا ہو اور

اس کی پیمائش وغیرہ کی ہو۔ تاریخ سائنس کے مطالعہ سے اس امر سے آشنائی ہوتی ہے کہ البیرونی وہ مبتدی جغرافیہ دان ہے جو زمین کو حیطۂ پیمائش میں لایا اور اس کے قواعد و ضوابط مقرر کئے۔ البیرونی نے اپنی تحقیقات کی مدد سے زمین کا محیط Circumference of Earth چوبیس ہزار سات سو اناسی میل بتایا جبکہ موجودہ پیمائش چوبیس ہزار آٹھ سو ستاذن میل تسلیم کی جاتی ہے۔ اٹھتر میل کے اس فرق کا سبب نظام پیمائش میں کمی و ردوبدل قرار دیا جاسکتا ہے۔

گردش ارض زمین کو متحرک تسلیم کرنے والا پہلا شخص البیرونی ہی ہے۔ اس سے قبل یہ تصور ناپید تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین ساکن اور فضا میں معلق ہے۔ البیرونی اس موضوع پر لکھتا ہے کہ زمین اپنے ایک فرضی محور کے گرد گردش عمل میں رہتی ہے اور یہ محور عمودی نہیں بلکہ ایک چھوٹے زاویہ پر جھکا ہوا ہے۔

سمندر البیرونی کو کچھ تو گردش زمانہ اور کچھ اس کی افتادِ طبع نے زمین کے مختلف حصوں کی سیر کرائی برصغیر پاک و ہند میں اس کی موجودگی اسی طبع افتاد کی ایک کڑی ہے۔ سرزمین ہند کے مطالعات و مشاہداتی سفر کے دوران اس نے بہت کچھ دیکھا اور "کتاب الہند" جیسی ضخیم تصنیف عمل میں آئی۔ ایک جگہ یہ سرزمین ہند پر اپنی تحقیقاتی رپورٹ لکھتے ہوئے اشارہ کناں ہے۔

"اگر آپ ہندوستان کی سرزمین کھود کر اس کی اصلیت پر غور کریں یا ان گول پتھروں کو جو کھدائی سے نکلتے ہیں، نگاہ غور سے دیکھیں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ سرزمین ابتدائی عہد میں زیر آب تھی۔ کیونکہ پتھر عموماً پہاڑوں کے دامن میں پائے جاتے ہیں اور جب بارش ہوتی ہے اور تیز رفتار پہاڑی ندیاں انہیں ساتھ ساتھ بہائے لئے جاتی ہیں جو متواتر رگڑ اور حرکت میں گول ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور حجم گھٹتا جاتا ہے۔ کچھ تو راستے میں ہی رہ جاتے ہیں اور کچھ دریا کے دہانہ کے قریب پہنچ کر ریت کے ذروں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ نتیجتاً یہ سمندر بھی ریت سے بھرتا چلا گیا۔ اور آخر وہ وقت آگیا کہ پانی خشک ہو گیا اور سمندر نے ریگستان یا وسیع میدان کی صورت اختیار کرلی۔"

مندرجہ بالا بیان سے یہ امر واضح و مروق ہوتا ہے کہ البیرونی اس صداقت سے بخوبی واقف تھا۔ کہ سالوں پہلے زمین کا اکثر یتی حصہ سمندر تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سمندر کا خشک ہونا اور اس کا پیچھے ہٹنا خشکی کی اضافتی علامت قرار پایا۔ یہ اپنی دیگر کتب جغرافیائی تصانیف میں اس موضوع کو حیطۂ تحریر میں لایا ہے کہ زمین کا ایک بڑا حصہ پہلے سمندر تھا اور پھر اس سمندر سے خشکی میں تبدل کے اسباب و علل کیا ہیں؟

البیرونی نے اپنی تحقیقات میں جن سمندروں کا ذکر کیا ہے ان میں خلیج فارس، بحیرۂ عرب، بحیرۂ قلزم، بحیرۂ خزر، بحیرۂ اسود، بحیرۂ ہند اور بحیرۂ ارال وغیرہ کا ذکر تفصیل سے موجود ہے جن میں پیدائش، محل وقوع اور دیگر مشاہدات سے واقفیت کا بھرپور اظہار موجود ہے۔ اس نے سمندری مد و جزر پر بھی اپنے تحقیقی قدم آگے بڑھائے ہیں اور اس امر کی وضاحت کی ہے کہ مد و جزر کے ساتھ جو یونانی و ہندی دیومالائی اساطیری تصورات وابستہ ہیں وہ غلط اور راہ سے بھٹکا دینے والے ہیں۔ اس کی حقیقت صرف چاند اور سورج میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ مد و جزر کے آثار چڑھاؤ چاند اور سورج کی کشش کے سبب وجود میں آتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے دریاؤں پر البیرونی کی معلومات قابل رشک و ستائش ہیں۔ اسی موضوع کو مرکز مان کر یہ اپنی ان تصانیف میں جہاں برصغیر کا ذکر ہے لکھتا ہے کہ

"اس کے تین حصے بلند و بالا پہاڑوں سے پر ہیں اور جنوب کی سمت سمندر متموج ہے۔ ان پہاڑوں اور سمندر کے درمیان پھیلے ہوئے میدان میں دریا بہتے ہیں" ہند شمالی اطراف کے نواح میں موجود پہاڑوں پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ ایک جگہ رقمطراز ہے کہ

"یہ پہاڑی سلسلہ ترکستان تک پھیلا ہوا ہے اور اس پر جمی ہوئی برف جو موسم گرما میں پگھلتی ہے تو یہ اور چشموں کا دیگر پانی شمال کی جانب گرتا ہے اور دریاؤں کی صورت اختیار کرتا ہوا بحیرہ خزر یا بحیرۂ ارال میں جا گرتا ہے اور وہ پانی جو جنوب کی سمت گرتا ہے وہ برصغیر کے دریاؤں کی شکل میں بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔"

ہندوستان کے دریاؤں کا وجود یہ شمالی یا مشرقی پہاڑ قرار دیتا ہے اس کے نزدیک یہ تمام پہاڑ ایک ہی سلسلے سے مربوط ہیں۔ پاکستانی دریاؤں سے متعلق اس کی معلومات اتنی ہی مستند ہیں جتنی کہ دیگر معلومات۔ دریائے نیل کے بارے میں یہ مغالطہ کہ اس کے منبع کی دریافت شہرۂ آفاق مغربی سیاح لونگسٹن Livingsten رہین منت ہے، درست نہیں۔ البیرونی کی وہ تصانیف جن میں مصر کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، اس امر کے عیاں کا سبب ہیں کہ وہ شخص اول ہے جس نے سب سے پہلے دریائے نیل کا مبدا جبل قمر بتایا ہے۔

البیرونی اپنی شہرۂ آفاق "الآثار الباقیہ" Chronology میں فلکیات سے متعلق امور پر مدلل و مبسوط انداز گفتگو اختیار کرتے ہوئے بحث کرتا ہے اور اہم ترین انکشافات قلمبند کرتا ہے جن میں دن و رات کی ماہیت اور ان کا طرز عمل طلوع آفتاب و غروب آفتاب، چاند اور سورج گرہن، ماہ و سال کا کا ذکر، شمسی و نوری، قمری و عطاردی سالوں پر بحث اور ان کے مابین تقابل کی تفسیر، زمینی و ترابی ماہیت، پانی کے سرچشمے، سمندر، دریا، چشمے اور جھیلوں پر بحث، جیسے موضوعات پر دقیق نکتۂ فکر و دوررس نگاہ

بروئے کار لاتے ہوئے گفتگو کرتا ہے۔ دن و رات کے وجود پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھتا ہے کہ

"دن و رات کی پیدائش میں سورج کا کردار مرکزی ہے اس لئے کہ رات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سورج زمین کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ وگرنہ حقیقتاً سورج کبھی غروب نہیں ہوتا"

البیرونی کی یہ مستند تحقیق اس کے دو زمینی نظریات کو قانونی شکل دیتی ہے جن میں ایک زمین کا گردش کرنا ہے اور دوسرا زمین کا گول ہونا۔ قطبین Poles پر دن و رات کی طوالت سے البیرونی بخوبی آشنا تھا، اس موقع پر وہ واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا جو اسی موضوع کا ارتباط رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ سلطان محمود غزنوی کی خدمت میں ایک سیاح اپنے گزرے شب و روز کی داستان بیان کر رہا تھا۔ اس نے اپنی داستان کے ایک حصہ میں اس بات کا ذکر کیا کہ وہ ایک ایسے علاقہ کی سیاحت کر چکا ہے جہاں کئی کئی ماہ کا دن اور کئی کئی ماہ کی راتیں ہوتی ہیں۔ ابتداء میں عرض کر چکا ہوں کہ سلطان محمود ایک ضدی و جھکی مزاج ذہنیت کا حامل تھا۔ چنانچہ آگے کچھ سنے بغیر یہ حکم صادر کر دیا کہ

"اس شخص کو قتل کر دیا جائے اس لئے کہ یہ ملحد ہے جو قوانین فطرت کا مذاق اڑا رہا ہے"

میں اس سیاح کی اسے خوش نصیبی قرار دوں گا کہ اس موقع پر البیرونی وہاں موجود تھا۔ اس نے محمود کے اس فعل میں مداخلت کی اور اس پر قطبین کی طول طویل دن و رات کی حقیقت کو آشکارا کیا اور اس طرح اس مظلوم سیاح کی جان بچی۔

اسی طرح البیرونی نے سورج و چاند گرہن کی حقیقت واضح کی اور اس مظہر پر مبنی تمام سابق دیومالائی تصورات کی پر زور تردید کی۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ

"جب سورج، زمین اور چاند گردش کرتے ہوئے ایک مدار پر آجاتے ہیں تو زمین کا سایہ چاند پر پڑتا ہے اور وہ گرہن ہو جاتا ہے لیکن جب چاند دوران گردش زمین اور سورج کے درمیان آجائے تو سورج لگا ہوں سے غائب ہو جاتا ہے"

اپنے نظریہ پر دلیل دیتے ہوئے البیرونی نے اس امر کی وضاحت بھی کی کہ چاند گرہن کبھی بھی مغرب سے شروع نہیں ہوتا اور اسی طرح سورج کو گرہن کبھی مشرق سے نہیں لگتا۔ اس نے اس حقیقت پر سے بھی پردہ اٹھایا کہ گرہن خواہ وہ چاند کا ہو یا سورج کا، وہ پوری زمین سے یکساں نہیں دیکھا جا سکتا۔ اور مختلف علاقوں سے اس مظہر کی کمی و بیشی قطعی ممکن ہے۔

ہیئت و جغرافیہ پر البیرونی کی کئی فقید المثال و نادر کتابیں ہیں جن میں دم دار و گیسو دار ستاروں ٹوٹنے والے ستاروں اور ہوا میں روشنی پیدا کرنے والے اجسام کے متعلق مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ انھیں میں

اس نے پہلی ارسیاروں Planetes اور ستاروں Stera کے مابین فرق کو واضح کیا اور اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ سیارے گردش عمل میں رہتے ہیں، جبکہ ستارے ساکن حالت میں قیام پذیر رہتے ہیں، ان موضوعات سے ہٹ کر دیگر کئی دلچسپ موضوعات کو اس نے اپنی تحاریر میں اپنایا ہے۔

علم طبعیات Physics میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ کثافت اضافی Specific Gravity کی وضاحت اور اس کے میکینزم کی دریافت پر مبنی ہے۔ اس نے کثافت اضافی کی وضاحت کے لئے ایک ایسا برتن استعمال کیا جس میں پیچھے کی جانب جھکی ہوئی ایک "ٹونٹی" لگی تھی۔ اس نے برتن کو پانی سے بھرا اور پھر اس میں وہ ٹھوس ڈالا جس کی کثافت اضافی درکار تھی۔ اس ٹھوس کے ڈالنے سے جو پانی ٹونٹی کی راہ نکلا اس کا وزن کرلیا۔ اور پھر ہوا میں ٹھوس کی کثافت اضافی معلوم کرلی۔ اس طرح اس نے اٹھارہ ... زائد قیمتی جواہرات اور دھاتوں کی کثافت اضافی معلوم کی جو آج تک معمولی ردو بدل[۵] کے بعد صحیح تسلیم کی جاتی ہے۔ اس نے قدرتی چشموں اور ارتیسی کنوئیں Artisian Wall کی علمی توضیح نہایت مروق انداز میں ماسکونی اصولوں پر کی۔ اس موضوع پر اس کے خیالات جدید تحقیق کا کلی انطباق کرتے ہیں یہ لکھتا ہے کہ:

"... یہ ایسے پہاڑی علاقوں میں موجود ہوتے ہیں جہاں زیر زمین سخت چٹانیں پانی کو ... ائی میں بہنے سے روک دیتی ہیں اور پانی کی سطح Water Table بلند ہونی شروع ... ہاتی ہے، اور جیسے جیسے اس کی سطح بلند ہوتی ہے دباؤ میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اور نشیبی ... مقامات پر زمین کی نرمی دیکھتے ہوئے یہ پانی فواروں کی شکل میں پھوٹ پڑتا ہے۔"

طبعیات ... دیگر جن موضوعات پر البیرونی نے شروعات کی اور بحث و دلائل کے ساتھ ساتھ ثبوت کا ... م کیا ان کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

۱۔ ثابت کیا ... روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے کہیں زیادہ تیز ہے۔

۲۔ کشش ثقل Force of Gravity کی مکمل وضاحت کی۔ اس ضمن میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اہل سائنس نیوٹن کو نظریہ کشش ثقل کا دریافت کنندہ گردانتے ہیں جو صحیح نہیں ہے کیونکہ البیرونی نے اس موضوع کو قلم زد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہر بھاری جسم زمین کے مرکز کی جانب کشش کرتا ہے اور یہ فعل جسم کے گراؤ کا موجب ہے"۔ چنانچہ البیرونی کی تصانیف مدنظر رکھتے ہوئے اس نظریہ کا دوسروں کی ذات سے وابستہ کرنا حقائق کی تردید کرنے کے مترادف ہے۔

---

[۵] اس ردو بدل کی وجہ نظام اوزان و پیمائش میں ترمیم وتبدل قرار دیا جاسکتا ہے۔ (مصنف)

۳۔ تجاذب مادہ Gravitation پر دقیق طرز فکر کے ساتھ روشنی ڈالی۔
۴۔ اکثر قیمتی پتھروں کی کثافت اضافی دریافت کی اور اس عمل کی وضاحت کی۔
۵۔ اس مسئلہ پر بحث کی کہ آیا زمین اپنے مدار پر محو گردش ہے یا نہیں۔
۶۔ آواز اور روشنی کے موضوع پر تحقیقات کیں اور چند رسائل قلمبند کئے۔
۷۔ ماسکونی اصولوں پر بحث کی اور ان کے طریقۂ کار کی مبسوط وضاحت منظر عام پر لایا۔
اس کے علاوہ دیگر سینکڑوں ایسے طبیعیاتی مسائل ہیں جن پر اس عجوبۂ روزگار شخص نے بڑی محنت وجانفشانی سے تحقیقات کیں۔ اور نوخیز ثمرات سے نسل انسانی کو بہرہ ور کیا۔

طب میں اس کا شاندار کارنامہ "المحیط فی الطب" اور "کتاب الصیدلہ" کی شکل میں سامنے ہے، اس میں وہ تمام جڑی بوٹیاں اور دوائیں، مفردات ومرکبات کی شکل میں قلم بند ہیں جو ایک طویل عرصہ سے ہمارے استعمال میں ہیں۔ ان کتب کو نہایت سائنسی طریقہ پر ترتیب دیا گیا ہے۔ اور ہر بوٹی کے بارے میں قدیم ومعاصر اطبا کے خیالات رقم کئے گئے ہیں، بالفاظ دیگر اں ہم اس تحقیق کو تاریخ الادویہ کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ "کتاب الصیدلہ فی الطب" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ پہلی کتاب ہے جسے نہایت منظم ومنضبط طریقہ پر دائرۂ قلم زدگی میں لایا گیا ہے۔

کچھ طبیعی وحیاتیاتی علوم پر ہی منحصر نہیں، بلکہ نفسیاتی علوم پر بھی البیرونی کے کارہائے نمایاں آج بھی نوع انسان کے لئے باعث فکر واستعجاب بنے ہوئے ہیں۔ "کتاب الہند" اور "الآثار الباقیہ" اسی قسم کی قیمتی ومستند معلومات سے مالامال ہیں۔ "کتاب التحقیق الہند من مقولتہ مقبولتہ فی العقل" اس کی اس زبردست وحیرت انگیز سعی وکاوش کا ثمرہ ہے جو علمی وتحقیقی دولت سے لبریز ہے۔ اس سے قبل اتنی جامع ومکمل تاریخ، جو اقوام کی معاشرت وتہذیب، رہن سہن، انداز فکر وعمل، طرز حکومت، اقتصادیاتی نظریات، مذہبی امور، قانونی وسیاسی نفاذ اور دیگر قومی موضوعات پر مبنی ہے، کسی نے نہیں لکھی تھی۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خاصیت ہندوستانی عقائد وروایات کا تفصیلی تجزیہ ہے۔ خود ہندوؤں میں آج تک کسی نے اتنی تفصیل سے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس کتاب کی ایک اور بڑی خصوصیت وہ دلچسپ وحیرت انگیز واقعات ہیں۔ جو ہندوؤں کی ذات سے وابستہ ہیں۔ راقم الحروف اس کتاب سے چند دلچسپ اقتباسات ضرور پیش کرتا لیکن مضمون کی طوالت کے سبب یہ ایسا کرنے سے معذور رہے۔

البیرونی کے حالات زندگی کا مطالعہ اس امر کی کھلی وضاحت کرتا ہے کہ یہ شخص تمام شعبہ ہائے حیات

کی تحقیق و جستجو اور ان کے مطالعہ و مشاہدہ میں ہمیشہ مصروف عمل رہا۔ فکر انگیزی اور جستجو کا یہ عالم تھا کہ چالیس سال کے طویل عرصہ تک یہ ایک تصنیف "کتاب الاسرار" کی تلاش میں مسلسل سرگرم عمل رہا، اور اس وقت تک سکون کا سانس نہیں لیا۔ جب تک اس کو حاصل نہ کر لیا۔ اپنے اس فعل کو یہ اپنے دوست الرازی کے نام ایک مکتوب میں یوں لکھتا ہے۔

"مجھے "کتاب الاسرار" کے نام سے ایسا عشق ہوا جیسے دیگر نفوس کو کیمیا گری سے ہوا کرتا ہے۔ مجھے نوعمری ہی میں اس کتاب کی طلب محسوس ہوئی اور میں چالیس برس سے کچھ زیادہ اس تپش کا شکار رہا۔ آخر کار مجھے یہ کتاب ایک شخص سے حاصل ہوگئی۔ مجھے اس کے حصول سے اس قدر خوشی ہوئی جیسے کسی پیاسے کو پانی دیکھ کر ہوا کرتی ہے۔"

آگے لکھتا ہے۔ قارئین یہ حصہ کچھ غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے۔ میں گذارش کروں گا کہ اس کا مطالعہ بغور کیا جائے تاکہ وہ پوشیدہ الفاظ جو یہ کہنا چاہتا ہے منظر عام پر آسکیں۔

"لیکن آخر کار مجھے ایسا غم ہوا جیسے کوئی نہایت ناگوار چیز کھانے کے بعد خراب ڈکار آتی ہے۔ میں نے خدا کے اس قول کو سچا پایا کہ خدا جس کو روشنی کی نعمت سے محروم رکھتا ہے۔ اس کے پاس روشنی نہیں ہوتی۔ میں نے اس کتاب کی لغو و بیہودہ باتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ تاکہ جو شخص میری طرح گرفتار مصیبت ہو وہ اس سے یہ پڑھ کر چھٹکارا حاصل کرلے۔"

البیرونی ایک سائنس دان ہی نہیں بلکہ ایک سیاح اور بڑا شاعر بھی تھا۔ اگر اس کی سیاحت و شاعری کو مدوجزر ہائے زمانہ سے منسوب کروں تو بیجا نہ رہے گا۔ اس لئے کہ اس کی امن و حق پسندی نے اس کو سیاح بنایا اور اس پر پڑنے والے مصائب و آلام نے اس کے الفاظ کو شاعری کی شکل دی باوجود اس کے اس حقیقت سے انکار و گریز ممکن نہیں کہ یہ وہ شخص ہے جس کی قوت مشاہدہ "اجتہاد و جدت کی بدولت نہایت دوربین و دوررس ہے۔ اس کا کلام جذبات و خیالات عالیہ کے لحاظ سے جس کا حامل ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ اس کے کلام کا مطالعہ اس کی زندگی کے ان ادوار پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔ جو ایک طویل عرصہ تک "حوادث" کا شکار رہے۔ ایک مقام پر اپنی ذات کو دائرۂ فکر کے اندر رکھ کر

میرے من کی نرمی تمہیں دھوکہ میں نہ ڈال دے
وہ نرمی جو تم درس و اقتباس میں دیکھتے ہو۔
میں انسان اور جن میں تیز ترین شخص ہوں
جنگ کے وقت ہلاکت میں گھستے ہیں

اپنے احباب کی تعریف اور اغیار سے ان کے اوصاف کا تقابلی جائزہ کچھ اس طرح لیتا ہے۔

کیا تم ایک جوان کو اپنی زیارت کی اجازت دیتے ہو؟
اگر تمہاری محفل لوگوں سے خالی ہے۔
اس لئے تم وہ انسان ہو جن کا بدل میں تلاش نہیں کرتا
تم سِرّ سے ہو اور انسان سر سے ہے۔
تمہاری کوشش ان مقامات عالی تک پرواز کرنے کی ہے
جن کے لئے تم کھڑے ہو
اور تمہارے سوا دوسرے لوگ کھانے پینے اور لاحول پڑھنے والے ہیں۔
وہ لوگ زندگانی کا مقصد عیش پرستی اور شراب نوشی کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتے۔
مکاریوں کے وقت گران کی مکاریاں چل جائیں
تو وہ خدا کو بھی دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ خدا دھوکا نہیں کھا سکتا۔

ہجر و فراق کی داستان کچھ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

تمہارے فراق میں لطف زندگی تمام ہے
فراق سے بڑھ کر کوئی چیز تلخ نہیں
تمہارا تصور میری امید کا باعث ہے
یہ بیمار کے لئے جھاڑ پھونک کرنے والوں سے زیادہ مفید ہے

خاطر دلچسپی میں نے یہاں اس کے چند اشعار کو لیا ہے، اس کے کلام کا مکمل مطالعہ اس کے خالص ادبی فضل کی نشان دہی کرتا ہے۔ ذرا دیکھئے سائنس و ادب کا کتنا پیارا ملاپ ہے۔

انسان کی ذہنی تاریخ میں البیرونی کے کارہائے نمایاں ایک محیر العقول حیرت انگیز کارنامہ کی حیثیت سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس کی نظیر نہ تو سابقین میں ملتی ہے اور نہ دور جدید میں اس عظیم مشاہیر اسلام میں سائنسی ترقی کے لئے اسلام کی وضع کردہ جو صفات عالیہ ضروری ہیں یعنی زبردست قوت مشاہدہ، باریک بینی، صبر و تحمل، عقل و فراست، استقلال و مذہبی اکد و کاوش، آگاہ دوررس اور طرز ہائے افہام و تفہیم وغیرہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ آج اگر ہم اسی راہ کو اختیار کریں تو یقیناً کامیابیاں سائنسی میدان میں ہمارے قدم چومیں گی۔ یہ بات عالم انسانیت کے لئے باعث خوشی ہے کہ رابرٹ آر نیوٹن وہ پہلا جدید ماہر علم و سائنس ہیں جو البیرونی کے نقش پا پر اپنی منزل کے حصول کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں اور البیرونی کی تحقیقات و کاوشات سے بھرپور استفادہ کر رہے ہیں۔ آئیے ہم مسٹر نیوٹن کے طرز عمل کو اپناتے ہوئے اپنی منزل کے حصول کی جد و جہد کریں۔

---

۵۱ سر سے مراد ذہن ہے۔ (مصنف)

لندن ٹو قاہرہ

(از جناب مولانا ماہر القادری مدیر فاران)

قاہرہ - ۸ اگست ۷۶ء

مکرمی جناب سید صاحب - السلام علیکم

یہ خط قاہرہ سے لکھ رہا ہوں آج دوپہر کے وقت ایکا ایکی یہ بات جی میں آئی یا یوں کہئے کہ راقم الحروف کے ذہن میں یہ خیال القا کیا گیا کہ اپنے سفر کی چند جھلکیاں قارئین "العلم" کو بھی دکھلا دوں۔ سفر کے مفصل واقعات فرصت سے لکھوں گا یہ تو اس مرتبہ کی چند لکیریں ہیں۔

برمنگھم کا "پاک فورم" مشاعرہ کیسا رہا؟ لندن میں کیسی کیسی ادبی نشستیں اور دعوتیں رہیں، اس تفصیل کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ بہرحال شائقین شعر و ادب نے راقم الحروف کی خاصی پذیرائی کی۔ ٹیلی ویژن اور بی۔بی۔سی پر بھی میرا کلام ریکارڈ ہوا۔ یہ ادارے جب مناسب سمجھیں گے اس کو نشر کریں گے۔

انگلستان کے بڑے بڑے شہروں میں وہ پاکستانی مسلمان ہوں یا ہندوستان کے مسلمان، ہندو اور سکھ اردو سے سب کو لگاؤ ہے۔ اردو کے امتحانات کو لندن یونیورسٹی نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ بریڈ فورڈ، برمنگھم اور لندن کے شعراء کی خاصی اچھی غزلیں سننے میں آئیں، ایک ہندو شاعر سوہن راہی صاحب نے تو "حلقۂ سخن" قائم کر رکھا ہے۔ اردو کے کئی اخبار اور رسالے بھی انگلستان میں چھپتے رہتے ہیں۔ شعر و ادب کے ساتھ مسلمانوں میں دین سے شغف بھی پایا گیا۔ برمنگھم کی نو تعمیر جامع مسجد پر ساٹھ لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے۔ برمنگھم کی ایک مسجد میں راقم الحروف نے نماز جمعہ سے قبل مختصر سی تقریر بھی کی اور جن بچوں کا قرآن ختم ہو چکا تھا ان کو انعامات تقسیم کئے۔ مسجد کے منتظمین انعامی کتب دینے کا پہلے سے اہتمام کر چکے تھے۔ لندن کے ایک بہت بڑے علاقے کا نام "کرائیڈن" ہے، اس کی جامع مسجد میں بھی نماز جمعہ سے قبل دین کی باتیں بیان کیں۔

برمنگھم سے تقریباً بیس میل دور ایک بستی Stratford ہے جہاں انگلستان کا سب سے بڑا شاعر اور ڈرامانسٹ ولیم شیکسپیئر پیدا ہوا تھا۔ اسکی جائے پیدائش محفوظ کر دی گئی ہے۔ ہم گھنٹہ سوا گھنٹہ اس عمارت میں رہے، اس میں داخلہ کا ٹکٹ تقریباً چھ روپیہ میں ملتا ہے۔ وہ سیاح جو علم و ادب اور شاعری کا ذوق رکھتے ہیں بڑے شوق سے یہاں آتے ہیں۔ یہ عمارت انگلستان کے چار سو برس قبل کے قصباتی تمدن کی یادگار ہے۔

۲۶ اپریل ۱۵۶۴ء کو ولیم شیکسپیئر کو بپتسمہ دیا گیا۔ ۱۵۶۸ء میں اس کا باپ اسٹریٹ فورڈ کا بیلف مقرر ہوا۔ انگریزی دور حکومت میں "بیلف" امین کو کہتے تھے، خاص طور سے "قرق امین" کے لئے یہ لقب استعمال ہوتا تھا۔ بیلف سے غالباً

چودھری یا مکھیا مراد ہے۔ ۱۵۸۲ء میں ANNE HATHAWAY سے شیکسپیر کی شادی ہوئی۔ بعد میں شیکسپیر نے ایک نیا مکان خرید لیا پھر اس کی شاعری اور ڈرامہ نگاری کی شہرت خوشبوئے گل کی طرح پھیلی۔ ۱۵۹۹ء میں گلوب تھیٹر کی مہورت ہوئی۔ ۲۳ اپریل ۱۶۱۶ء شیکسپیر کی زندگی کا آخری ڈراپ سین تھی۔ ۱۶۷۰ء میں لیڈی برنارڈ کی موت کے بعد شیکسپیر کے شجرۂ نسب کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۹۶۹ء میں راقم الحروف اب سے سات برس پہلے لندن آیا تھا مگر جی بھر کے سیر کرنے کا موقع اب کے ملا۔ دریائے ٹیمز میں لانچ کے ذریعے سیر کی۔ گرین وچ کی آبادی کے قریب جا کر ملاح نے لانچ واپسی کے لئے موڑی! ٹیمز کے ایک کنارے پر قدیم عمارتیں ہیں، جو اپنی کہنگی کے سبب ایسی لگتی ہیں کہ بہت جلد زمین بوس ہوا چاہتی ہیں۔ دوسری طرف کشادہ سڑک پر جدید طرز کی شاندار عمارتیں ہیں۔ ان میں ایک بلڈنگ پر "SAVOY" لکھا تھا یہ لندن کا مشہور ترین ہوٹل ہے!

لندن کے بوٹانیکل گارڈن کی بھی سیر کی۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے ہر خطہ کا پودا اور درخت اس میں موجود ہے۔ کیسے کیسے عجیب و غریب درخت، پودے اور بیلیں اس باغ میں دیکھیں۔ جس ملائم لکڑی کی ڈاٹ سے شیشی کو بند کرتے ہیں اس کے درخت بھی اس باغ نباتات میں موجود ہیں۔ بعض پودوں کے پتوں کی کئی کئی فٹ کی چوڑائی اور بعض ایسے مہین و نازک پودے بھی ان نگاہوں نے دیکھے جو نقطہ کی طرح باریک ہیں جن کا عرض و طول برائے نام ہے۔ وقت واحد میں ہزاروں سیاح اس باغ میں گھومتے پھرتے ہیں مگر یہ باغ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ سیاحوں کی بھیڑ کسی ایک مقام پر نظر نہیں آتی۔ اس علاقہ کا نام "KEW" ہے۔ اور "کیو گارڈن" ہی کے نام سے مشہور ہے۔ اس باغ کو دیکھ کر فتبارک اللہ احسن الخالقین بے ساختہ زبان پر آتا ہے۔ سورہ الرحمٰن میں گل و برگ اور سبزے کی جن نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس کی جھلک اس باغ میں نظر آتی ہے۔ وہ شخص بڑا بد توفیق اور کم نظر ہے جس نے صنعت کو دیکھ کر صانع کو نہ پہچانا اور وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ کائنات خود بخود پیدا ہو گئی ہے۔

خیال و فکر کی شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں
یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں

۱۹۶۹ء میں راقم الحروف جب ساؤتھ افریقہ اور نیروبی سے لندن آرہا تھا تو ان دنوں دار العوام اور دار الخواص کے اجلاس ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر گیلریوں سے ان دونوں ایوانوں کی کارروائیوں کو دیکھا مگر اس بار اندر جا کر ایک ایک چیز دیکھی۔ کس قدر شاندار، سنگین اور بلند و بالا عمارت ہے۔ یورپ کا فن تعمیر پاکستان اور ہندوستان کے فن تعمیر سے مختلف ہے۔ پتھروں کے جوڑنے میں جو صفائی نظر آئی وہ درجۂ کمال کو پہونچی ہوئی ہے۔ انگلستان کا بادشاہ یا ملکہ ہاؤس آف لارڈز کے جس صدر مقام سے افتتاح و خطاب کرتے ہیں وہ عمارت مطلا و مذہب ہے۔ اس سنہری کرسی پر بادشاہ کے علاوہ اور کوئی نہیں بیٹھ سکتا، یہاں تک کہ وزیر اعظم بھی اس شرف سے محروم ہے۔ اسے حسن اتفاق ہی کہا جائیگا کہ ان ایوانوں میں جو گارڈ پہرے اور حفاظت کے لئے مقرر ہیں ان میں ایک پاکستانی بھی ہیں۔

خاصی ذمہ داری اور اعتماد و اعتبار کی پوسٹ ہے، ان صاحب نے مجھے دیکھکر خاصے محبت آمیز لہجے میں السلام علیکم کہا اور جب میں نے اپنا نام بتایا تو یہ محافظ صاحب بے اختیار بغل گیر ہو گئے، پھر انھوں نے ہر دفتر، گیلری اور لائبریری وغیرہ کی کنجیاں انگریز محافظین سے لیکر وہ عمارتیں دکھائیں جہاں کوئی سیاح جا ہی نہیں سکتا۔ دونوں ایوانوں کے اسپیکرز کے دفاتر، ارکان کے بیٹھنے، مشورہ کرنے اور کافی پینے کے کمرے، شاندار لائبریری، سکریٹریوں کے کام کرنے کے کمرے، ان کی آرام گاہیں، مختلف کمیٹیوں کے ممبروں کے آفس اور گیلریاں۔ ان عمارتوں کا ساز و سامان اور فرش فروش دیدنی ہے۔

اس کے بعد ویسٹ منسٹر ایبے پہونچے۔ راقم الحروف روم کے عظیم الشان گرجاؤں کو دیکھ چکا ہے جن کے حسن و جلال کی کوئی حد و نہایت نہیں، مگر لندن کا یہ شاہی گرجا بھی اپنی جگہ خوب نہیں بہت خوب ہے۔ فولاد اور مرمر کو اس عمارت میں کپڑے کی طرح موڑ دیا ہے۔ نہ جانے کتنے بادشاہ، ان کی بیگمات اور کتنے لارڈ اور فوجی جنرل یہاں دفن ہیں جن کے مقبروں پر بہت کچھ دولت صرف کی گئی ہے۔ نام و نمود اور شہرت آدمی کی سب سے بڑی کمزوری ہے، اسی کمزوری نے تاریخی عمارتوں کو وجود بخشا ہے اور یادگاروں کو محکم بنایا ہے۔ ویسٹ منسٹر ایبے میں لکڑی کی بنی ہوئی کئی سو برس پہلے کی وہ کرسی بھی ہے جس پر انگلستان کے فرمانرواؤں کی تاج پوشی ہوتی ہے۔

لندن کی کشادہ و مصفا سڑکیں، شاندار دکانیں، بلند و بالا عمارتیں، یوں سمجھئے کہ ایک نمائش سی لگی ہوئی ہے۔ خرید و فروخت کے مراکز Shopping Centre کی عمارتیں کئی کئی منزل کی، جن میں ضرورت کی ہر چیز ملتی ہے، ہاں، ایک چیز حیا ہے جو یہاں نہیں ملتی، مرد و زن کے بیباک اختلاط کے نظارے ریلوں، بسوں، میدانوں، پارکوں اور ہوٹلوں میں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ حسین اور نوجوان لڑکیاں مردوں کے قریب بیٹھی ہوئی ہیں مگر تاک جھانک اور نظارہ بازی نہیں ہوتی! حبشیوں (نیگروز) کے ساتھ انگریز لڑکیوں کو دیکھکر ہر پاکستانی اور ہندوستانی کو حیرت ہوگی کہ ان سفید تیتریوں کے ذوقِ جمال کو آخر کیا ہو گیا ہے۔

کسی انگریز سے کسی مقام کا پتہ پوچھئے تو بڑی ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ پتہ بتائے گا اور پوری کوشش کریگا کہ مقام مقصود کا نقشہ اور حدود اربعہ آپ کی سمجھ میں آجائے اور آپ بھٹکتے نہ پھریں۔ چیزوں میں ملاوٹ جو ہمارے یہاں کاروبار بن کر رہ گئی ہے انگلستان میں وہ جرم ہے، ہر چیز خالص ملتی ہے۔

لندن میں دروازوں پر دودھ کی بوتلیں رکھی رہتی ہیں اور کوئی ان کو ہاتھ تک نہیں لگاتا، سودے کے لین دین میں انگریز دھوکا نہیں دیتا۔ یہ لوگ وقت کے پابند اور فرض شناس ہیں مگر سیاست و حکومت کی سطح پر ایمانداری کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں، اس کا تجربہ مشرقی پاکستان پر بھارت کے جارحانہ اور ظالمانہ حملہ کے زمانے میں ہو چکا ہے۔ بی بی سی پاکستان کے خلاف جھوٹ ہی بولتا رہا۔

یہاں کے احباب میں زبان و ادب کی بحث بھی چل پڑتی ہے ایک صاحب کے لندن کے اخبار کا نام لیتے ہوئے گارڈین کہا میں نے ٹوکا کہ ہم تو ہمیشہ سے "گارجین" ہی سنتے اور بولتے آئے ہیں۔ انھوں نے فرمایا مگر انگریز "گارڈین" ہی بولتے ہیں۔ میں نے عرض کیا Graduate کا بھی کیا "گریڈویٹ" تلفظ کرتے ہیں۔ جواب دیا گیا کہ نہیں اسے وہ "گریجویٹ" ہی بولتے ہیں۔

ہائیڈ پارک لندن کا سب سے بڑا میدان ہے رقبہ کئی میل کا وسیع ہوگا یہاں شام کو تپائیوں اور کرسیوں پر کھڑے ہو کر لوگ تقریریں کرتے ہیں۔ ان تقریروں میں سامعین اور مقررین کے درمیان فقرے بازی بھی ہو جاتی ہے اور خوب تالیاں بجتی ہیں۔ تقریر و تحریر کی انگلستان میں پوری آزادی ہے۔

برٹش میوزیم کی بھی سیر کی۔ قرآن کریم کے مطلا و مذہب نسخے بھی دیکھے۔ اس عجائب خانے میں نوادر بے شمار ہیں۔ یہاں کی حکومت نے میوزیم کے داخلہ پر ٹکٹ لگا دیا تھا اس پر یہاں کے عوام نے شدید احتجاج کیا۔ انگلستان اس پر فخر کرتا ہے کہ ہمارے میوزیم کو لوگ کسی فیس کے بغیر دیکھتے ہیں اس فخر کو باقی رہنا چاہیئے حکومت نے بالآخر اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔

میوزیم کو دیکھ کر سڑک کے دوسری طرف کتابوں کی دکان ہے وہاں سے راقم الحروف نے دو پونڈ اور بیس پنی میں ایک فارسی لغت مول لی۔ لغت کا نام "فرہنگ آموزگار" ہے، حبیب اللہ آموزگار اس کے مؤلف ہیں، تہران میں یہ لغت تین بار چھپ چکی ہے، سرورق پر لکھا ہے:

"شامل الفاظ و کلمات معمول و متداول در زبان فارسی امروز"

اس لغت کے چند الفاظ نمونہ کے طور پر نقل کرتا ہوں:-

جناغ : بفتح استخوان دوشاخ درمیان سینۂ حیوان۔

بوم ہن : بکسر ہا، زمین لرزہ جائے زلزلہ خیز۔

نظربازی : شیفتگی، شیدائی، عشق ورزی، غمازی۔

قاص : قصہ گو، داستان سرا۔

کمیاب[1] : نایاب، خیلے اندک۔

یہ بڑے کام کی لغت مل گئی۔ آج کل ایران میں جس فارسی کا چلن ہے اس کے ہزاروں الفاظ اس میں درج ہیں۔

انڈیا آفس لائبریری میں جانا ہوا یہاں اردو زبان کے مخطوطات کا شمار مشکل ہے۔ یہاں کے نادر و قدیم نوادر سے سلیقہ کے ساتھ استفادہ کیا جائے تو اس ریاضت و مشقت کے نتیجہ میں کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ میں جب ۱۹۶۹ء میں لندن آیا تھا تو انڈیا آفس لائبریری میں صرف یہ دیکھنے کے لئے گیا کہ مرزا غالب نے

آہ کو چاہیئے اِک عمر اثر ہونے تک

لکھا ہے یا "آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہوتے تک"۔

قدیم ترین نسخہ میں "ہوتے تک" (نون کے ساتھ نہیں "ت" کے ساتھ) ہی ملا۔ ڈاکٹر مالک رام کی بھی یہی تحقیق ہے موصوف غالبیات کے ماہر جانے جاتے ہیں، انڈیا آفس لائبریری میں شیخ محمد اکرام مصنف "رود کوثر" سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ مگر اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔

سر سید رضا علی مرحوم کا نام اردو دنیا کے لئے

---

[1] فارسی میں "کم" انگریزی کے A little کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔

کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس جامع قابلیت کے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اُن سے ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ میں سب سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اُن کے داماد مسٹر اے۔ ٹی۔ نقوی علی گڑھ میں کلکٹر تھے۔ کلکٹر کا خیمہ علیگڑھ نمائش کے فرنٹ گیٹ سے متصل نصب ہوتا تھا۔ وہاں ایک دن شام کو خیمہ میں سر سید رضا علی، نقوی صاحب اور راقم الحروف بیٹھے ہوئے تھے۔ نقوی صاحب چائے بنانے لگے۔ اتنے میں سر سید رضا علی بے ساختہ بول اُٹھے،

"ماہر! یہ ابوطالب شاید نہ مانے مگر میں شروع کی دونوں خلافتوں کو حق پر سمجھتا ہوں"

پھر اُن سے کہیں نہ کہیں نیاز حاصل ہوتا رہتا۔ مشاعرہ کی صدارت اس شان اور آن بان سے کرتے گویا بادشاہت کرتے ہیں، دلی کی ہارڈنگ لائبریری میں مشاعرہ تھا۔ جب تمام شعراء اپنا کلام سنا چکے تو حضرت سائل دہلوی کی باری آئی۔ رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ لوگ مشاعرے سے اُٹھنے لگے۔ اس پر سر سید رضا علی نے گرجتی اور لڑکتی ہوئی آواز میں فرمایا۔ آپ کو باہر نہیں جانے دیا جائے گا حضرت سائل سب کے مخدوم و محترم ہیں۔ (اور پولیس کے سپاہیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہال کے دروازے بند کر دئیے جائیں۔ ۔ ۔ ۔

پاکستان بننے سے قبل جب راقم الحروف کا دلی میں قیام تھا تو ایک دن شام کے وقت سر سید رضا علی مرحوم سے اُردو بازار میں ملاقات ہوئی، وہ اپنی کار میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہاں مچھلی مول لینے کے لئے آئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔ "

باقی آئندہ

"تمہیں زبان سے بہت دلچسپی ہے،
"سانجھ بھئی گھر آئیو" سے تم کیا سمجھے؟"

میں کیا جواب دیتا، یہ اصطلاح میں نے کبھی نہیں سنی
جاتے ہوئے فرمایا۔

"ٹھگوں کی اصطلاح"

اُس دن سے یہ بات دل میں بیٹھ گئی کہ ٹھگوں کی [illegible]
اُردو زبان کا سرمایہ ہیں، اور بہت کم لوگ ان [illegible]
واقف ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں مخطوطات [illegible]
فہرست دیکھی تو "مصطلحات ٹھگی" نام سامنے آ [illegible]
دل نے کہا اس پر "جوئندہ یابندہ" کی ضرب المثل [illegible]
آتی ہے۔ اردو سیکشن کے انچارج نے فرمایا آپ ر [illegible]
روم میں تشریف رکھیں، کتاب آپ کو وہیں [illegible]
چند منٹ میں یہ مخطوطہ آ گیا: اس کے مصنف کا [illegible]
اکبر آبادی ہے۔ ٹھگوں کے استیصال کے لئے [illegible]
مقرر ہوا تھا اُس کا جنرل سپرنٹنڈنٹ کپتان [illegible]
نام کا انگریز تھا، مصنف اسی دفتر میں ملازم تھے۔ [illegible]
کا واقعہ ہے یہ دفتر جبل پور میں تھا۔

مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں بڑی [illegible]
ریاضت اور طلب و جستجو کا ثبوت دیا ہے۔ موضوع [illegible]
اچھوتا ہے جس کا زبان و ادب کے مشہور علما [illegible]
اسکالروں کو پتہ نہیں ہے، اور کسی کو ہو گا بھی تو [illegible]
موضوع پر ایک لفظ بھی کسی رسالہ یا کتاب میں راقم [illegible]
کی نگاہ سے نہیں گزرا۔

ہندوستان کو تو وارن ہیسٹنگز نے ختم کیا تھا [illegible]
استیصال کا سہرا غالباً لارڈ ولزلی کے سر ہے۔ یہ [illegible]

ت چند پیسوں کے لئے آدمی کو ہلاک کر دیا کرتے تھے۔
اپنی اصطلاحیں اور اشارے (Code Words)
تھے اور ٹھگی با قاعدہ ایک تنظیم بن گئی تھی۔
ٹھگوں کی اصطلاح میں مسلمان کا نام کسمان تھا، آخر
کے کوچ کو کٹھپ اور آخر روز کے کوچ کو جلب کہتے تھے۔
اہ اُس مسافر کے لئے بولا جاتا تھا کہ جب ٹھگ، لوگ
مارنے کا ارادہ کریں اور وہ کسی طرح بھاگ جائے۔
روپے کو سُستلی کہتے تھے، ڈھر ڈالنا پھانسی دے کر
لنا۔ دھدن لانا یعنی مسافر کو دھوکا دے کر اپنے
نے پر لانا۔ پھانسی کے رومال کی گانٹھ کو "گرگانٹھ"
تھے۔ (گرو کی سکھائی ہوئی گانٹھ)۔
بل" اُس جگہ کو کہتے تھے جو مسافر کے مارنے اور گاڑنے
ے پہلے سے تیار کی گئی ہو (مصنف نے "تجویز" لکھا ہے)
مصنف نے لکھا ہے:۔

آنسو توڑ — بن موسم کے مینہہ کو کہتے ہیں جو برسات
کے سوا برسے۔ تو یہ شگون ٹھگوں کے اعتقاد میں
ہوتا ہے اور گھر سے نکلتے وقت برسنے لگے تو اپنے
کو لوٹ آویں۔ روپیہ کو بھو یا اور ایک سو عدد
کہتے تھے۔"

کتاب میں ایک عجیب بات لکھی ہے کہ حضرت
الدین اولیا جن کا مزار غیاث پور میں ہے (بستی
الدین کا پرانا نام) وہ ٹھگی کا پیشہ کرتے تھے پھر ٹھگی
کر کے متقی بن گئے۔ ٹھگ اُن کو اپنا گرو سمجھتے ہیں،
خیال میں یہ مصنف کی "ایجاد و اختراع" ہے۔ اگر ایسا
کتابوں میں کسی نہ کسی عنوان سے اس کا ذکر ضرور آتا۔

جس طرح حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کے حالات
میں ملتا ہے کہ وہ ڈاکہ ڈالا کرتے تھے اور ڈاکوؤں کے
سردار اور سرخیل تھے۔ ڈکیتی سے توبہ کرنے کے بعد اُن کی
زندگی اخلاق و ہدایت کی روشنی بن گئی۔ حضرت نظام الدین
محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ٹھگوں کا وجود ہی
کہاں تھا اور ٹھگوں کی یہ زبان جو خالص اردو ہے
اُس وقت کہاں پیدا ہوئی تھی' یہ روایت بے اصل
معلوم ہوتی ہے۔

سفر کے حالات لکھتے لکھتے زبان و ادب کا ذکر نکل آیا۔
ہاں تو صاحب سُنئیے، میں ۵ ستمبر کو قاہرہ پہونچا اور تین
دن اور چار راتیں رہنے کے بعد آج صبح سویرے جدہ
کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ مصری ایر لائن سے سفر ہوگا۔
جہاز کی روانگی کا وقت ۷ بجے صبح ہے۔ ایر پورٹ ہوٹل سے
کافی دور ہے' مجھے ۵ بجے وہاں پہونچنا ہے' یہ رات جاگتے
سوتے ہی گزرے گی۔

یہاں اندازے سے بہت زیادہ خرچ ہو گیا۔ ہوائی
اڈے سے ہوٹل تک کا کرایہ ٹیکسی ڈرائیور نے سات مصری
پونڈ لیا۔ میں نے ایک دن دس بارہ آنے کا ناشتہ بھی کیا
خمیری روٹی اور دال کی طرح پکا ہوا شوربہ دار سالن! اور ایک
دن دوپہر کے کھانے کے ڈھائی مصری پونڈ بھی ادا کرنے
پڑے، اور کھانے میں لذت کچھ آئی بھی اور نہیں بھی آئی۔
انگلستان میں اسپین کے نہایت شیریں خربوزے کھائے
تھے' یہاں قاہرہ میں آم کی فصل ہے' طوطا پری سے زیادہ
وزنی آم جو میٹھے ہیں مگر گٹھلی لطافت نام کو نہیں' ہاں آم
کا شربت جب بھی پیا مزہ آگیا۔

جامعہ الازہر کے دیکھنے کی بڑی تمنا تھی سو وہ پوری ہو گئی مگر میں نے اس کے فرش اور در و بام کو دیکھا، علماء اور طلباء کو نہیں دیکھا۔ رمضان کے سبب الازہر بند ہے۔ اس کی عمارت بہت پرانی ہے اور کہنگی کے آثار نمایاں ہیں۔ کاش، کسی تعارف کے ذریعہ الازہر کے علماء سے ملاقات ہو سکتی۔ آثار قدیمہ کی قاہرہ میں کمی نہیں ہے، جدھر نکل جائیے پرانی مسجدیں اور قلعہ نما سنگین عمارتیں نظر آئیں گی۔

حضرت سیدنا حسین ابن علی رضی اللہ عنہ کا سر مبارک قاہرہ میں دفن ہے۔ یہ مقبرہ اور ملحقہ مسجد فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ روضہ کے چاروں طرف جالی بہت حسین و دیدہ زیب۔ قیمتی جھاڑ فانوس آویزاں۔ اس مقبرے میں بہت سے لوگ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ حضرت سیدہ زینب بنت علی اور حضرت سیدہ سکینہ بنت حسین رضی اللہ عنہما کے مزارات کی بھی زیارت کی۔ سیدہ نفیسہ رحمۃ اللہ علیہا بھی خانوادۂ سادات سے تعلق رکھتی ہیں اُن کے مزار پر بھی جانا ہوا۔ مگر سفر میں قلب کے انتشار کا جو عالم ہے اور ٹیکسی کے ذریعہ سفر میں رواروی کی جو کیفیت ہے اُس نے دل و دماغ کو سراپا معذرت و ندامت بنا دیا کہ زیارت قبور کا تھوڑا سا حق بھی ادا نہ ہو سکا۔ ایک آدھ آنسو کی ان مقامات پر کیا قدر و قیمت ہے، یہاں تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جانی چاہیئے تھی۔ ان مزارات و مشاہد پر بعض مردوں کو اور خاص طور سے عورتوں کو قبروں کی جالیوں کو چومتے ہی دیکھا۔ بدعات کا ہر جگہ چلن ہے۔

محمد علی کی مسجد نہایت شاندار ہے اور دنیا کی حسین ترین عمارتوں میں شمار کیئے جانے کے قابل ہے۔ اس مسجد کے لیئے لاکھوں ٹن سنگ مرمر اٹلی سے لا کر لگایا گیا تھا۔ چھت کی گلری پر جو منبت کاری ہے اور سونے کی پتریں چڑھائی گئی ہیں اُس نے اس عمارت کے حُسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

ابن طولون کی مسجد قدیم اور کُہنہ ہونے کے باوجود دیکھنے کے قابل ہے۔ قاہرہ کے اخبار "المقطم" کا نام بچپن سے سُن رکھا تھا۔ ڈرائیور نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ "جبل مقطم" ہے اس پہاڑی پر کوٹھیاں اور بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ قصر عابدین کے سامنے سے ٹیکسی میں گزرنا ہوا اسی قصر سے شاہ فاروق کو ولیس نکالا ملا تھا۔ اس محل کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

دریائے نیل پر اہل مصر فخر کرتے ہیں اس کا پاٹ جمنا کے پاٹ کے برابر ہے۔ نیل کے کنارے پر ریسٹورنٹ ہیں شوقین لوگ دریا میں کشتیاں چلاتے ہیں، جگہ جگہ پل بنے ہوئے ہیں۔ "نیل" پر مصر کے مشہور شعراء کی معرکہ آرا نظمیں ہیں۔

الاہرام کا شمار عجائب عالم میں ہوتا ہے۔ جس نے اس عمارت کو نہیں دیکھا وہ محض نقشوں اور تصویروں سے اس عمارت کے بڑے ہونے کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ حیرت ہے کہ ہزاروں سال پہلے جب کہ "جر ثقیل" کا وجود نہ تھا، ہزاروں من کے پتھر سیکڑوں فٹ کی بلندی پر کس ترکیب سے پہنچائے گئے۔ پتھروں کو آخر کس مسالہ سے جوڑا ہے کہ فولاد بنے ہوئے ہیں۔ ابو الہول، قد و قامت کی وجہ سے مشہور ہے مگر بت تراشی اور مجسمہ سازی کا بھدا نمونہ ہے۔ گائیڈ نے بتایا کہ نپولین نے اپنی توپ سے اس کا منہ توڑ دیا تھا۔

قاہرہ کا میوزیم قدیم نادر اشیاء کا سچ مچ عجائب گھر ہے۔

فراعنۂ مصر کی قبروں سے ساڑھے تین ہزار قبل کا جو سامان برآمد ہوا ہے وہ لیس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے میں سیاح کس چیز کو دیکھے اور کس کو نہ دیکھے اور دیکھنے کے بعد نگاہ اور حافظہ میں ہزاروں چیزیں محفوظ کہاں رہ سکتی ہیں۔ ایک بڑے کمرے میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"آثار من مقبرة توت عنخ آمون
١٣٥٠ قبل المسیح"

بادشاہوں کے پلنگ، کرسیاں، سونے کے زیورات، اسلحہ، شاہی عصا، طرح طرح کے جواہرات کی مینا کاری، کھانے پکانے اور کھانے پینے کے برتن، سیکڑوں مجسمے، غرض کہ یہ میوزیم فکر و نگاہ کو عجائب میں غرق کر دیتا ہے۔ ایک تصویر رنگین ہے جس میں طہورث سوم آگ اور پانی کو پیش کر رہا ہے۔ نہ جانے یہ رنگ کن اجزا سے بنائے گئے تھے جو ابھی تک قائم ہیں۔ فراعنہ کے عہد حکومت میں سونے کی دھات کی بہتات تھی۔ صندوقوں اور تابوتوں پر سونا لگا ہوا ہے۔

حنوط شدہ لاشوں کے کمرے میں داخل ہوا تو بادشاہوں کی بگڑی ہوئی صورتوں کو دیکھنا ناگوار ہوئی۔ فرعون کی لاش کو اللہ تعالےٰ نے دنیا کے لئے عبرت کی تصویر بنا دیا ہے۔ بت اور مجسمے چاہے فن بتگری کا معجزہ ہی کیوں نہ ہوں مگر ایک مسلمان ان کو نگاہ حقارت ہی سے دیکھتا ہے۔ مسلمان بت گر نہیں بت شکن ہوا ہے۔

قاہرہ کا سب سے زیادہ پر رونق اور مشغول مرکز "التحریر" ہے۔ ایک بڑے وسیع باغیچے کے اوپر مدور شاہراہ ہے جس پر ہزاروں لوگ چڑھتے اترتے ہیں۔ ٹیکسیوں کی کوئی حد و شمار نہیں۔ یہاں ہر وقت اور خاص طور سے دفتروں کے آمد و رفت کے اوقات میں قیامت کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ "التحریر" کے چاروں طرف بلند و بالا عمارتیں ہیں۔ یہاں کے بازار خاصے شاندار ہیں۔ دکانیں سامان سے پٹی ہوئی ہیں۔

قاہرہ میں ٹرام بھی چلتی ہے مگر ٹرام کی کھڑکیاں چلنے میں بجتی ہیں جو اس کے قدیم و فرسودہ ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے ایک حصہ میں "لسیدات" (عورتوں کے لئے) بھی لکھا ہے گویا اب بسوں اور لاریوں میں مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ نشستیں نہیں ہیں۔ قاہرہ نے یورپ کے تمدن کا خاصہ اثر قبول کیا ہے کاش اس دبا سے مسلمانوں کا یہ خطہ محفوظ رہتا۔

جس طرح کراچی میں ڈیفنس سوسائٹی اور لیاری اور بہار کالونی میں معیار زندگی اور آرائش و تمدن کا غیر معمولی فرق پایا جاتا ہے یہاں بھی وہ فرق نمایاں ہے۔ یہاں بھکاری بھی ہیں، ایسے لوگ بھی ہیں جن کے کپڑوں میں پیوند لگے ہوئے ہیں۔ غریبوں کے محلوں سے گزرنا ہوا تو ایسا لگا کہ لیاری میں آگیا۔ گندی سڑکیں اور گلیاں بوسیدہ اور خستہ مکان۔ دوسری طرف مالداروں کی کوٹھیاں، بنگلے، اور فلیٹ جنت نشان۔ یہی شان دفتروں کی ہے۔

سرجن کو یہاں "جراح" کہتے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں سول سرجن کو جراح کہنا ایک طرح کی گالی ہے "ج" کو مصری "گ" بولتے ہیں "جیزہ" کو "گیزہ" کہیں گے اور حاجی کو "حاگی"۔

اس وقت رات کے ڈھائی بجے ہیں۔ اب میں

سفر کے لئے سامان درست کر رہا ہوں۔ یہ مرحلہ مجھ پر بڑا شاق گزر رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو صبح نو بجے اس مقدس زمین میں پہنچ جاؤں گا جس کی حاضری کی ہمیشہ تمنا رہی ہے۔ مکہ اور مدینہ کے ناموں ہی میں کس قدر محبوبیت، نغمگی اور عظمت و تقدس ہے۔ "ویزا" میں توسیع ہو گئی۔ مدینہ منورہ میں عید کرنے کا ارادہ ہے۔ کویت سے بھی بلاوے کے خط آ چکے ہیں۔ مگر وہاں کا ویزا نہیں ہے، دیکھئے کیا رہتا ہے۔

اس سفر کا مقصود اور حاصل عمرہ اور روضۂ رسول کی زیارت ہے۔ فکر و نگاہ اور ذہن و قلب پر مکروہاتِ دنیا کا جو غبار چھایا ہوا ہے وہ ندامت کے اشکوں سے حرمین شریفین ہی میں انشاء اللہ دھلے گا۔

کبھی تا سلطانی خودی کی
کبھی دہرِ نبیں الٰہی خودی کی
مجھے از قصر و شاہی کا تباہ دوں
غریبی ہے نگہبانی خودی کی

اقبال

نقد و نظر

از
جناب نثار الحق صدیقی ایم اے

مجلہ
بسلسلہ آل کراچی ٹیچرز مشاعرہ

سرپرست جناب محمد اسماعیل میمن ناظم تعلیمات برائے مدارس کراچی۔ ترتیب و پیش کش۔ ذکیہ سلطانہ ذکی انیس الرحمٰن خاں، نواب بیگ طالب۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۵۰ صفحات۔

یہ مجلہ یوم جشن آزادی کے موقع پر منعقد ہونے والے آل کراچی ٹیچرز مشاعرے کے سلسلہ میں شائع کیا گیا ہے۔ مشاعرے کی صدارت ڈائریکٹر تعلیمات برائے مدارس کراچی جناب محمد اسماعیل میمن صاحب نے فرمائی تھی۔ اس مشاعرے کی کئی خصوصیات تھیں۔ اول یہ کہ تمام شعراء شعبۂ تعلیم کراچی سے متعلق تھے۔ دوم یہ کہ مشاعرہ غیر طرحی تھا۔ سوم یہ کہ شعراء کو مکمل آزادی تھی کہ وہ اپنا کلام جس صنف شاعری میں چاہیں پیش کریں۔ چہارم یہ کہ وزن، قافیہ اور ردیف کی پابندیاں زیادہ سخت نہیں تھیں جس کی وجہ سے بعض شعراء کو اپنے افکار و خیالات و جذبات کو نہایت آزادی سے پیش کرنے کا موقع ملا۔ مشاعرہ نہایت کامیاب رہا۔ حاضرین نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ مبصرین نے اپنے مشاہدات اور تاثرات نہایت اچھے الفاظ میں پیش کیے۔ پھر یہ کہ پوری کارروائی اور تمام مواد کو یکجا کر کے مجلہ کی شکل میں پیش کر دیا گیا جس کی وجہ سے یہ سب چیزیں محفوظ ہو گئیں۔

زیر تبصرہ مجلہ کی ترتیب یہ ہے۔

(۱) پیش لفظ (۲) تعارف (۳) پیغام (۴) آل کراچی ٹیچرز مشاعرہ (۵) تقاریر (۶) کارروائی (۷) اختتام (۸) مشاعرہ میری نظر میں (تاثرات) (۹) حرف آخر مشاعرے کی کارروائی اس ترتیب سے عمل میں آئی۔

پہلے ذکیہ سلطانہ ذکی صاحبہ نے تین اشعار کے ذریعہ مشاعرے کا تعارف کرایا۔ پھر انیس الرحمٰن خاں صاحب نے چند الفاظ میں ابتدائی تقریر کی۔ بعدہٗ ڈاکٹر امیر احمد صاحب نے معاشرے میں استاد کے مقام اور اس کی اہمیت کو واضح کیا۔ اور ان سب کے بعد جناب محمد اسمٰعیل صاحب میمن ناظم تعلیمات نے اپنے خیالات اور تاثرات بیان فرمائے اور اس نوع کے علمی و ادبی اجتماعات کے انعقاد پر اپنی

خوشنودی کا اظہار کیا۔

میمن صاحب کی حوصلہ افزا تقریر کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا اور ۲۶ شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔ درمنقولات کے علاوہ باقی تمام کلام اردو میں تھا۔ اس میں بعض چیزیں بڑی اچھی اور قابل قدر ہیں۔

مجلہ کا آخری حصہ تاثرات کے لئے مخصوص ہے جس میں حسب ذیل حضرات نے مشاعرے کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔

(۱) محترم پروفیسر منظور حسین شور (۲) محترمہ انور جہاں بشیر الدین (۳) محترم عبدالسلام اختر (۴) محترم عبدالمجید فاروقی (۵) محترم ساقی جاوید (۶) محترم خدائے رحیم بیتاب۔ (۷) محترم پروفیسر شاکر عظیم (۸) محترم اقبال شجاع (۹) محترم سراج صدیقی۔

آخر میں انیس الرحمٰن خاں صاحب کی جانب سے "حرف آخر" ہے۔ پھر چند فوٹو گراف ہیں۔ اور ان ہی پر مجلہ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

مجلہ کی پیشکش اساتذہ صاحبان کی جانب سے ایک اچھا اور مبارک شگون ہے۔ خدا کرے یہ پیشکش اس سے بڑے کاموں کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

آسان اسلامی آئین

از ظہیر احمد تاج۔ غزالی پبلشرز ۵/۶ غزالی روڈ۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی۔ بلاک ۲ کراچی ۲۹ سائز ۲۳×۳۶/۱۶ ضخامت ۱۰۰ صفحے قیمت ۵ روپے

ظہیر احمد تاج ایک کہنہ مشق ادیب مصنف اور شاعر ہیں۔ مختلف موضوعات پر کئی درجن کتابیں اور کتابچے لکھ چکے ہیں۔ اشعار کے بھی کئی مجموعے زیر طبع ہیں۔ اب بھی ان کا سلسلۂ تصنیف و تالیف جاری ہے اور وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کچھ نہ کچھ پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن ان تمام کد و کاوش سے ان کا مقصد مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور تعمیر و اصلاح ہے۔ ان کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ نام و نمود سے بے نیاز اور جلب منفعت سے بے پروا رہ کر وہ خاموشی سے مسلمانوں میں ذہنی بیداری و اصلاح کا کام کرتے رہتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب بھی ان کے اسی جذبہ کی آئینہ دار ہے۔ یہ اگرچہ ضخامت کے اعتبار سے بھاری بھر کم نہیں ہے۔ لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت وقیع ہے۔ کوئی ملک اسی وقت اسلامی کہا جا سکتا ہے جب وہاں اسلامی آئین و قانون نافذ و جاری ہو۔ پاکستان کا قیام بھی اسی غرض سے کیا گیا تھا کہ یہاں مسلمان اپنے مخصوص آئین و قانون کے زیر سایہ اپنی زندگی گزاریں قیام پاکستان سے پہلے ہر مسلمان کا یہ عقیدہ اور ایمان تھا کہ اسلام کا ایک مرتب و مدون آئین ہے جو آغاز اسلام سے چلا آرہا ہے اور اس کی ترتیب قرآن کی روشنی میں کی گئی ہے۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد مختلف تعبیریں کر کے

اس مسئلہ کو الجھا دیا گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے اس کی صحیح عملی تفسیر لوگوں کے سامنے نہیں آسکی۔ کتاب ہذا میں تاج صاحب نے اس مسئلہ کی توضیح و تشریح کی ہے۔ انھوں نے قرآن کو بنیاد بنایا ہے اور آیات قرآنی کی روشنی میں آئین کے اصول و ضوابط سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے آئین کے بنیادی اصول بتائے ہیں۔ پھر سمجھایا ہے۔ کہ اسلام کے آئین میں انفرادیت ہے اس لئے آئین میں کسی دوسری قوم کی نقل مفید نہیں۔ اسی بات کو علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

بہر حال یہ اہم نکتہ سمجھانے کے بعد تاج صاحب نے آئین اسلامی کے دیگر اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ہر بات کو نہایت کھول کر بیان کیا ہے۔ اس کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اسلامی آئین کی برکتوں سے متمتع ہونا چاہتا ہے۔ مطالعہ سے بھی اہم بات اس کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ کاش یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو سکے!۔

یادِ حرمین

از جناب علی حسین سالک نقوی
سال اشاعت مئی سنہ ۱۹۷۰ء

سائز ۲۰ × ۳۰ / ۱۶، ضخامت ۱۱۴ صفحات قیمت غیر مجلد دو روپے

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے شعائر اور نعت سرورِ کائنات سے متعلق نظموں کا مجموعہ ہے۔ تعارف نگار جناب خواجہ حمید الدین شاہد کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ان نظموں کے خالق جناب علی حسین سالک نقوی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اور سالہا سال سے دادِ سخن دے رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کے اس بیان کی توثیق و تصدیق سالک صاحب کے نظموں کے اس مجموعہ سے ہوتی ہے۔ یہ نظمیں جذبات صادقہ کی آئینہ دار ہیں۔ اکثر نظموں کی بحریں نہایت مترنم ہیں۔ جن کی وجہ سے ایک نغمگی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس چیز نے خلوصِ جذبات کے ساتھ مل کر اثر و تاثیر میں بے حد اضافہ کر دیا ہے۔ ہر نظم گلہائے رنگا رنگ کا ایک حسین گلدستہ معلوم ہوتی ہے اور ایک کو دوسری پر ترجیح دینا ممکن نہیں ہے۔ نعتوں کا ایسا اچھا مجموعہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ہر نظم اور ہر شعر پر اظہار خیال کرنا تو مشکل ہے۔ اس لئے صرف چند شعر جن میں تاثیر کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے نقل کئے جاتے ہیں۔ اسی سے اور کلام کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کسی شاعر نے ایسے ہی موقعوں کے لئے یہ مصرع کہا تھا۔

ع قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

اشعار ملاحظہ ہوں۔

شہنشاہ دو عالم ہے امیر کارواں میرا
فلک میرے ملک میرے زمیں میری زماں میرا

ریاضِ نعت میں ہوں نغمہ خواں میں بھی
خدا شاہد کہ جبریلِ امیں ہے ہم زباں میرا

یا دِ طیبہ بے قرار آئی ہے اک مدت کے بعد
زلفِ یادِ یار لہرائی ہے اک مدت کے بعد
جا رہا ہوں پھر مدینے کی زیارت کے لئے
سالکؔ اس در کی جبیں سائی ہے اک مدت کے بعد

اٹھا ان کے در سے نہ دربان مجھ کو
میں سالک ہوں سالک ہوں پہچان مجھ کو
میں پروانہ شمعِ قبرِ نبیؐ ہوں
نہ بہکا سکا انجمن جان مجھ کو
جو مدت سے مہمان تھے میرے دل میں
انہیں نے بلایا ہے مہمان مجھ کو

حرفِ حق از حسین اعظمی۔ ناشر دانش اکیڈمی ون۔ ای ۹/۸ ناظم آباد کراچی۔
پاکٹ سائز، ضخامت ۹۶ صفحات قیمت ۵۰/۱ روپے

یہ حسین اعظمی صاحب کا تحریر کیا ہوا ایک مرثیہ ہے جس میں کل ۶۷ بند ہیں۔ اس میں حضرت عباس علمدار کے حضرت حسینؓ سے اجازت لے کر میدان جنگ میں جانے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے اور آخر میں جام شہادت نوش کرنے کے واقعہ کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ زبان صاف و رواں ہے، سلاست، روانی اور زور بیان ایسا ہے بعض جگہ میر انیس کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ ادب کی چاشنی بھی خاصی ہے۔ لیکن بعض جگہ زبان میں ضرورت سے زیادہ تلخی پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً سرورق پر جو بند دیا گیا ہے۔ اس میں حضرت ابو ذر غفاریؓ کی مثال دے کر خلیفۃ الرسول کی شان میں یہ الفاظ کہہ دینا مناسب نہیں ہے

آمرِ وقت سے ٹکرائے ابو ذر کی طرح
سختیاں جھیلے نہ گھبرائے ابو ذر کی طرح

یا ۴۳ واں بند کافی تند و تیز ہو گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔
نبی سفیان بنیں دینِ محمدؐ کے امیر
ایسا ہے جیسے سحر شام سے مانگے تنویر
جیسے گونگے سے کوئی خواب کی پوچھے تعبیر
جیسے قرآن کی لکھے کوئی مشرک تفسیر
ہاتھ پر تیرے یزید، ابن علی کی بیعت
دستِ بوجہل پہ ہو جیسے نبی کی بیعت

اسی طرح کے تیر و نشتر اور بھی کئی جگہ استعمال کئے گئے ہیں۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے میر انیس نے اس طرح کی زبان استعمال نہیں کی۔ کیا اچھا ہوتا کہ حسین اعظمی صاحب بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلتے جس سے ایسے اچھے مرثیہ کی لطافت مجروح نہ ہوتی۔ ایک ہی بات کو کہنے کے مختلف طریقے نکالے جا سکتے ہیں۔ اسی کا نام بلاغت ہے۔

مذکورہ بالا بند کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے مصرع میں جو تشبیہیں کام میں لائی گئی ہیں وہ بھی موزوں اور مناسب نہیں معلوم ہوتیں۔

بہرحال یہ مرثیہ مجموعی طور پر ایک اچھی کوشش ہے۔ اور شاعر کے کلام کی پختگی پر دلالت کرتا ہے۔

پندارِ غزل مجموعہ کلام۔ احساس مرادآبادی ناشر۔ ابوالحسن۔ زیر اہتمام ادارۂ یادِ جگر۔ ۴۰۵ وزیر مینشن نکل روڈ۔ کراچی۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت بارہ روپے

احساس مرادآبادی کہنہ مشق اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کے وہ حضرات بھی قائل ہیں جو اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں اور خوبیوں کی وجہ سے خود لائق ستائش ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احساس صاحب زیادہ تر ایک سطح پر رہ کر اپنے کمالِ فن کا اظہار کرتے رہے ہیں جس کی وجہ سے خواص تو ان سے متعارف بھی ہوئے اور متاثر بھی لیکن عوام میں ان کا زیادہ چرچہ نہ ہو سکا۔ پھر اس کہنہ مشقی کے باوجود ان کا شعری سرمایہ بھی نہایت مختصر رہا۔ غالباً ان کی زندگی بھر کی پونجی بھی مختصر سا مجموعہ ہے۔ جو پندارِ غزل کے نام سے پیش کیا گیا ہے، ۹۶ صفحات میں سے انتساب پیش لفظ تعارف اور حرف مدعا کے صفحات کو نکال دیا جائے تو کل ۸۰ صفحے بچتے ہیں۔ ان ہی صفحات پر احساس صاحب کے دُرِ افکار بکھرے ہوئے ہیں۔ محترم مشفق خواجہ نے پیش لفظ میں احساس صاحب کے شعری سرمایہ کے مختصر ہونے کی دو وجوہ بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ احساس صاحب زود گو نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ دو مرتبہ ان کا کلام ضائع ہو چکا ہے۔

زیر تبصرہ مجموعہ میں کل ۸۱ غزلیں ہیں اور سوائے ایک غزل کے جس میں ۶ شعر ہیں باقی ہر غزل ۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس طرح اشعار کی مجموعی تعداد ۵۶۶ ہوتی ہے۔ احساس صاحب کی ہر غزل میں ۷ اشعار کے التزام کو دیکھ کر معاً جوانا مرگ شاعر العام اللہ خاں یقین یاد آگئے۔ اُن کی ہر غزل میں ۵ اشعار ہوتے تھے۔ لیکن جس طرح ان کے یہاں بھرتی کا کوئی شعر نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح احساس صاحب کی غزلیں بھی اس عیب سے تقریباً پاک ہیں۔ اُن کے اس مختصر شعری سرمایہ پر " بقامت کہتر بقیمت بہتر" کی مثل صادق آتی ہے۔

احساس صاحب کی شاعری قمر، صہبا، اثر اور جگر مرادآبادی کے حلقے میں پروان چڑھی اس لئے اس میں شعری محاسن بدرجۂ اتم پیدا ہوگئے۔ اُن کی شاعری سے جگر صاحب بھی متاثر ہوئے۔ ان کے علاوہ دیگر ہمعصر شعراء نے بھی احساس صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا احساس اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ زیر تبصرہ مجموعہ کلام پر پیش لفظ جناب مشفق خواجہ صاحب نے لکھا ہے۔ اور رآز مرادآبادی پروفیسر ذوالفقار مصطفٰے اور ڈاکٹر ذوالفقار احمد زبیری نے تعارف اور تاثرات قلم بند کئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے احساس صاحب کی کی شخصیت کو سراہا۔ اور ان کے کلام کی دل کھول کر داد دی ہے۔ مشفق خواجہ صاحب لکھتے ہیں" احساس صاحب کی غزل ان کی اپنی زندگی کی ترجمان ہے"۔

راز مراد آبادی کہتے ہیں "پہلے ان کا تخلص متور تھا اب احساس ہے لیکن تخلص کی تبدیلی کے بعد بھی ان کے کلام میں وہی سوز، وہی درد، وہی تڑپ وہی یاس اور وہی گم گشتگی موجود ہے۔"

ان ارباب بصیرت اور اہل نظر حضرات کی رائیں پیش کرنے کے بعد ناچیز تبصرہ نگار کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ کچھ کہے بغیر اپنی بساط لپیٹے اور احساس صاحب کا یہ شعر گنگناتا ہوا رخصت ہو جائے ؎

میری نوازشوں نے بکھیرے ہزار گل
لیکن میں اپنی تنگئ داماں کو کیا کروں

ناظرین اس ایک شعر سے شاعر کے جذبات و احساسات اور ان کے شاعرانہ حسن و لطافت کا خود اندازہ لگائیں۔

ماہنامہ سب رنگ ڈائجسٹ مدیر شکیل عادل زادہ پتہ ۴۷۱-۴۸ پریس چیمبرز آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔ ذیلی دفتر۔ لطیف ہاؤس، کرشن پورہ پشاور۔ چندہ سالانہ ۴۸ روپے قیمت فی پرچہ ۵/ روپے۔

ماہنامہ سب رنگ ڈائجسٹ نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان کے کثیر الاشاعت رسالوں میں سے ایک ہے۔ اس کو جاری ہوئے تقریباً ۷ سال گزرے ہیں۔ اب سے چند سال پیشتر اس کے ایک شمارہ پر "العلم" کے صفحات میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اس وقت اس کی اشاعت صرف چند ہزار تھی لیکن اب لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ ناچیز تبصرہ نگار کو اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ پرچہ غیر معمولی ترقی کرے گا۔ ترقی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کے نام کے ساتھ "ڈائجسٹ" کی ہاضمہ کی گولی نما نمک ہے جو فی زمانہ نہایت مؤثر بلکہ زود اثر ثابت ہوئی ہے۔ لیکن اس کی مقبولیت کا اصل سبب اس کے مشمولات اور اس کی عمدہ ترتیب ہے۔ اس کا دامن زیادہ تر افسانوی ادب سے بھرا رہتا ہے اور یہ افسانے عموماً نہایت معیاری ہوتے ہیں۔ جن پر بدمذاقی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا جاتا۔ زبان دھلی دھلائی اور صاف ستھری ہوتی ہے۔ سوقیانہ اور بازاری الفاظ اور فقروں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مدیر خود نہایت با مذاق انسان ہیں اور افسانوی ادب کے محاسن و معائب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لئے جو چیز بھی پیش کرتے اس کو مذاق سلیم کی چھلنی میں چھان لیتے ہیں۔

زیر نظر شمارہ جس کو تازہ ترین کہنا بیجا نہ ہوگا ان تمام خوبیوں کا حامل ہے جو آجکل کسی پرچہ کی مقبولیت کی ضامن ہیں۔ اس کے مشمولات کی تعداد ۲۲ ہے اور یہ سب تقریباً افسانے ہیں۔ تمام افسانوں میں موجودہ زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ بیچ بیچ میں تراشے دے کر یکسانگی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتابت، طباعت اور گٹ اپ سب اعلیٰ درجے کے ہیں۔ لیکن بعض بعض مقامات پر لکھائی بہت باریک ہو گئی ہے جس کو پڑھنے کے لئے کبھی کبھی خورد بین کی ضرورت پڑتی ہے۔

نظمانے از محسن بھوپالی۔ ناشر۔ عوامی دار الاشاعت ۸۷ بی نرسری پی ای سی ایچ ایس کراچی

باہتمام۔ ادبستان جدید ۸ سی محمد علی سوسائٹی کراچی
سائز ۲۲×۳۶/۱۶ ضخامت ۱۰۴ صفحات قیمت ۱۰ روپے

محسن بھوپالی بحیثیت شاعر کسی تعارف اور تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کی بدولت معاشرے میں خاصا بلند مقام حاصل کرلیا ہے ان کے اشعار اکثر لوگوں کی زبان پر رہتے ہیں۔ وہ غزلوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ منظوم افسانے بھی لکھتے ہیں۔ چنانچہ زیر نظر مجموعۂ کلام "نظمانے" ان کے مختصر منظوم افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ ہر افسانہ ایک ہی صفحہ پر ختم ہوجاتا ہے۔ افسانوں میں اس قدر اختصار برتنا شاعر کے کمال فن پر دلالت کرتا ہے۔ ان افسانوں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ان میں ذریعہ اظہار و ابلاغ آزاد شاعری کو بنایا گیا ہے۔ پھر ایمائیت و اشاریت سے کام لے کر شاعر نے افسانوں کے معمولی واقعات میں گہرائی اور لطافت کے عنصر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

سحر انصاری صاحب نے اس مجموعہ پر ایک جامع تعارف لکھا ہے جس میں محسن کی شاعرانہ خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی نظمانہ نگاری کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"محسن کے اکثر نظمانوں میں کہانی کہنے کا انداز موجود ہے۔ کہانی کہنے کے بیشتر اسالیب ان کے یہاں نظر آتے ہیں۔ ہر نظمانہ اپنی جگہ ایک ایسا مکمل اور دلچسپ پلاٹ ہے جسے پھیلا کر طویل افسانہ بنایا جاسکتا ہے۔ اور چونکہ سارے موضوعات ہماری مانوس زندگی کی تصویریں پیش کرتے ہیں اس لئے ہیں ان میں اپنے عہد کے خدوخال اور اپنے احساس کی پرچھائیاں نظر آجاتی ہیں۔ بعض نظمانے اپنے مزاج کے اعتبار سے PROSAIC (نا ثرانہ) ہوگئے ہیں لیکن بعض میں شعریت بھی نمایاں ہے۔"

یہ تبصرہ مختصر لیکن جامع ہے کتاب کی کتابت طباعت اور گیٹ اپ نہایت عمدہ ہے۔ ٹائیٹل میں تجریدیت پیدا کرکے اس کو کتاب کے مضمون کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے۔

توازن

از محمد علی صدیقی ادارہ عصر نو ۲۲۴ ہمایوں کالونی کراچی ۱۸ فون نمبر ۴۳۶۳۸
سائز ۲۳×۳۶/۱۶ ضخامت ۲۷۲ صفحات قیمت بیس روپے۔

یہ کتاب جناب محمد علی صدیقی کے تنقیدی مضامین کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔ محمد علی صاحب روزنامہ "ڈان" کراچی کے ادارہ تحریر کے ایک اہم رکن ہیں۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ ڈان کا ادبی حصہ ان ہی کی نگارشات سے جلا پاتا ہے اور ان ہی کی وجہ سے اس کا معیار اس قدر بلند ہے۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور ماشاء اللہ خوب لکھتے ہیں۔

زیر تبصرہ مجموعہ کے کل مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ نظری تنقید کا ہے جس میں کل ۱۱ مضامین ہیں۔ دوسرے حصہ کا عنوان تنقید و تاریخ ہے اس میں کل پانچ مضامین شامل ہیں۔ تیسرا حصہ شاعری کے عنوان سے ہے۔ اس کے تحت

۸ مضامین آگئے ہیں۔ آخری حصہ کا عنوان افسانہ ہے جس میں صرف دو مضامین ہیں۔

مضامین کے موضوعات نہایت اہم ہیں اور لائق مضمون نگار نے ہر موضوع پر نہایت قابلیت سے روشنی ڈالی ہے۔ اور اکثر جگہ نہایت گہرائی میں اتر کر جائزہ لیا ہے۔ جس کی وجہ سے انداز تحریر فلسفیانہ ہوگیا ہے۔ حرفے چند میں جو کتاب ہذا کا پیش لفظ ہے مضمون نگار نے خود اپنی تحریر کی بعض خصوصیات کا اظہار کیا ہے۔ ان خصوصیات کو پسند یا ناپسند کرنا ہر فرد کا انفرادی مسئلہ ہے تاہم اس تحریر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ لائق مضمون نگار کی نظر ادب کے ہر پہلو پر ہے۔ البتہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بعض جگہ انھوں نے اردو کی تحریر میں اردو کے انداز تحریر سے اختلاف کیا ہے۔ مثلاً اطہر نفیس کی غزل پر لکھتے ہیں

"...... کہر کے پہرے بٹھا دیتے ہیں"

دوسری جگہ تحریر ہے " ذات کے نہ خانہ تک رسائی ضروری ہے۔" غالباً اس قسم کی تراکیب اور محاورے اردو زبان میں داخل کرکے وہ اس زبان میں وسعت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اندیشہ ہے کہ اس طرح کی کوشش سے کہیں اردو زبان سوء مزاج کا شکار نہ ہوجائے۔

(ثناء الحق صدیقی)

اعجاز التواریخ (منتخب)

از علامہ سید شرافت نوشاہی (مرتبہ سید عارف نوشاہی) سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۴۸+۱۱ کاغذ سفید، کتابت وطباعت آفسیٹ، ناشر: مکتبہ نوشاہیہ ساہن پال شریف ضلع گجرات۔ قیمت سات روپیہ (طباعت ۱۹۷۶ء)

مسلمان اصحاب علم وفضل نے تاریخ گوئی کو ایک فن کی حیثیت دی ہے۔ انہوں نے حروف ابجد کے ذریعہ اہم تاریخی واقعات پیدائش واموات وغیرہ کو محفوظ کرکے مستقل دوام بخشا ہے۔ کسی اہم واقعہ کے سال وسنہ کو یاد رکھنا مشکل ہوتا ہے مگر کوئی لفظ یا مصرعہ وشعر میں اگر تاریخ وسال کو قلم بند کر دیا جائے تو اکثر حافظہ میں محفوظ رہتا ہے۔ علامہ شرافت نوشاہی صاحب نے بھی بہت سی تاریخیں کہی ہیں جو دو مجلدات میں محفوظ ہیں۔ اس کی ایک جلد اعجاز التواریخ کے نام سے موسوم ہے ان کے لائق برادر زادہ سید رضاء اللہ شاہ عارف نوشاہی نے نہایت سلیقہ سے اس کتاب کا انتخاب شائع کیا ہے جس میں پہلے اکابر علماء اور مشائخ کے انتقال کی تاریخیں ہیں دوسرے باب میں بعض احباب ومتعلقین کے بچوں کے پیدائش کے مادہ ہائے تاریخ نظم کیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں بعض کتابوں کی ترتیب وطباعت کی تاریخیں چوتھے باب میں دوسری مختلف تاریخیں ہیں۔ یہ تمام مادہ ہائے تاریخ فارسی زبان میں کہے گئے ہیں۔ کاش مکمل کتاب چھپ کر سامنے آتی تو بڑا تاریخی سرمایہ محفوظ ہوتا۔ کتاب کے شروع میں فاضل مصنف کے پیش لفظ کے علاوہ عارف نوشاہی نے ایک معلوماتی مقدمہ اور آغا سے یحیی نے پیش لفظ رقم فرمایا ہے اس کے علاوہ ایک مستشرق رچرڈ ایم ایٹن نے بھی انگریزی میں تعارف لکھا ہے۔

(پروفیسر ایوب قادری)

مطبوعات

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

نظامت تعلیمات (ڈائرکٹریٹ آف ایجوکیشن)

کراچی سے منظور شدہ کتابیں

۱۔ گلشن بے خار۔ مصنفہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۲۴ روپے

۲۔ رومن رسم الخط اور پاکستان۔ مصنفہ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی ۱ روپیہ

۳۔ قدیم شہنشاہیاں۔ مصنفہ مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) ۶ روپے

۴۔ نقدِ ادب۔ مترجمہ ل احمد اکبر آبادی ۶ روپے

۵۔ سرسید کا علمی کارنامہ۔ مصنفہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۳ روپے

۶۔ اردو زبان اور اسالیب۔ مصنفہ سید محمد محمود رضوی مخمور اکبر آبادی ۱۸ روپے

۷۔ مشرقی اور مغربی تہذیب۔ مصنفہ ڈاکٹر احسان محمد خاں ایم اے پی ایچ ڈی (لیڈز) ۶ روپے

۸۔ راہی اور راہ نما۔ مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۲ روپے

۹۔ ثقافت و انتشار۔ مترجمہ اخلاص حسین زبیری ایم اے و انعام عظیم برنی ایم اے ۱۲ روپے

۱۰۔ طالب علم کی ڈائری۔ مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۶ روپے

۱۱۔ مسلم خواتین کی تعلیم۔ مصنفہ محمد امین زبیری ۴ روپے

۱۲۔ نواب خان بہادر خاں شہید۔ مصنفہ سید مصطفیٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۸ روپے

۱۳۔ عہدِ بنگش کی علمی سیاسی اور ثقافتی تاریخ۔ مصنفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی مترجمہ حکیم شریف الزماں شریف اکبر آبادی ۲۴ روپے

۱۴۔ اصول تدریس۔ مترجمہ اخلاص حسین زبیری ایم اے ۱۰ روپے

۱۵۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔ مولفہ علامہ سید سلیمان ندوی ۵ روپے

۱۶۔ مشاہیر کے علمی نظریئے۔ مصنفہ محمد حسین خاں زبیری ایم اے ۸ روپے

۱۷۔ سِرِّ اسرار کائنات۔ مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر "جنگ" ۱۲ روپے

۱۸۔ مفکرین تعلیم۔ مصنفہ پروفیسر ضیاء الدین احمد ۱۴ روپے

۱۹۔ اصول و اساس تعلیم۔ مترجمہ انعام عظیم برنی ایم اے اخلاص حسین زبیری ایم اے وغیرہ ۱۲ روپیے

۲۰۔ تعلیمی نفسیات کا۔ مصنفہ پروفیسر وحید الحق بنیادی خاکہ صدیقی سابق پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۸ روپیے

۲۱۔ عظیم علمائے نفسیات۔ مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی ۲۴ روپیے

۲۲۔ مادری زبان کی تعلیم۔ مصنفہ پروفیسر یونس حسن فروغ علوی ایم اے ۶ روپیے

۲۳۔ جان ڈیوی کا فلسفۂ تعلیم۔ مترجمہ سید عین الدین علوی ایم اے (علیگ) ۵ روپیے

۲۴۔ تعلیمی مسائل (پس منظر و پیش منظر) مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۲ روپیے

۲۵۔ مقاصد تعلیم مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر "جنگ" ۲ روپے

۲۶۔ ارتقائے انسانی مصنفہ مولانا سید طفیل احمد (موجودہ سائنس کی روشنی میں) منگلوری (علیگ) ۴ روپیے

۲۷۔ چند عظیم علمائے جراثیم۔ مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی ۲۰ روپیے

۲۸۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم۔ مصنفہ پروفیسر سعید احمد رفیق ایم اے ۶ روپیے

۲۹۔ خط و خطاطی مصنفہ شیخ ممتاز حسین جونپوری ۳ روپیے

۳۰۔ جمہوریت اور تعلیم مترجمہ سید محمد تقی ایڈیٹر "جنگ" جلد اول قیمت ... ... ۲۰ روپیے

۳۱۔ جمہوریت اور تعلیم۔ مترجمہ سید محمد تقی جلد دوم (ایڈیٹر "جنگ") ۱۵ روپیے

۳۲۔ انگریزوں کی لسانی پالیسی۔ مصنفہ سید مصطفٰی علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۱۶ روپیے

۳۳۔ بچہ کا ذہنی و نفسیاتی ارتقاء مرتبہ اخلاص حسین زبیری ایم اے و پروفیسر وحید الحق صدیقی قیمت ... ... ۱۲ روپیے

۳۴۔ تعلیم و تربیت۔ مصنفہ ضیاء الدین احمد برنی قیمت ... ... ۱۰ روپیے

۳۵۔ سائنس کے کرشمے۔ مصنفہ مسرور احمد نوقیر ایم اے ۸ روپیے

۳۶۔ علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں۔ مرتبہ سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے قیمت ... ... ۲۴ روپیے

۳۷۔ آن کی کہانیاں۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ۴ روپیے

حوالیات منظوری

+ 1. NO. D. I. G. S./.A(12164)/67 DATED 28.5.1967.

+ 2. NO. D. E/F—PUB/(126)/(7820-8170)/69 DATED 20.5.1969.

+ 3. NO. D. E/F—PUB/(11-A)/(1306-1630)/72 DATED 8.1.1972.

۳۸۔ **مسلمانانِ کراچی و سندھ کی تعلیم** ۔ تالیف سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی۔ مقدمہ مرزا علی اظہر برلاس بی اے بی ایل ۱۰ روپیے

۳۹۔ **تعلیم و تعلم** ۔ مرتبہ سید الطاف علی بریلوی مقدمہ سید عبدالقدوس ہاشمی ندوی ۱۴ روپیے

۴۰۔ **تعلیم بالغان اور اس کی قومی اہمیت** تصنیف مولوی مظہر الرحمٰن بچھرایونی۔ مقدمہ پروفیسر ڈاکٹر محمود حسین پی ایچ ڈی ۶ روپیے

۴۱۔ **تعلیم کے ابتدائی اصول** ۔ تصنیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین (حصہ اول و دوم) ایم اے پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ۔ مترجمہ مولوی سبطین احمد بدایونی ۲۰ روپیے

۴۲۔ **پاک و ہند میں تعلیمی ترقی** ۔ مترجمہ سید احسن مارہروی ایم اے (علیگ) ۵ روپیے

۴۳۔ **اقبال کے تعلیمی نظریات** ۔ تصنیف محمد احمد صدیقی بی۔ اے (آنرس) ایم اے بی ٹی (علیگ) تعارف و مقدمہ سید الطاف علی بریلوی و اخلاص حسین زبیری ایم اے ۱۶ روپیے

۴۴۔ **ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن** ۔ تصنیف (بزبان انگریزی) پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے (جلد اول ۷۱۲ء تا ۱۷۵۰ء) ۲۴ روپیے

۴۵۔ **رفقائے عظیم** (گریٹ کمپینیس)۔ تصنیف میکس ایسٹ مین مترجمہ۔ پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے (علیگ) ۲۰ روپیے

۴۶۔ **حیات مابعد** تصنیف سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی۔ مقدمہ ڈاکٹر ایم ایم احمد چیئرمین شعبہ فلاسفی کراچی یونیورسٹی ۷ روپیے

۴۷۔ **تجددِ امثال** تصنیف سید ضامن حسین نقوی گویا جہاں آبادی۔ مقدمہ ڈاکٹر ایم ایم احمد ایم اے پی ایچ ڈی ۴ روپیے

۴۸۔ **مقدر انسانی** (ہیومن ڈسٹنی)، تصنیف لی کامتے دو نوائے مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی (علیگ) ۱۶ روپیے

۴۹۔ **یادیں اور خاکے** ۔ تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی مقدمہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ۹ روپیے

۵۰۔ **تاثرات و مشاہدات** تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی مقدمہ پروفیسر ڈاکٹر شوکت سبزواری ایم اے پی ایچ ڈی ۶ روپیے

۵۱۔ **پاکستان کا معاشی پس منظر** تصنیف سیدہ انیس فاطمہ بریلوی پیش لفظ ڈاکٹر سید ظہیر الدین ایم اے ڈی لٹ ۷ روپیے

۵۲۔ **مولانا محمد علی جوہر ۔ حیات اور تعلیمی نظریات** مصنفہ ثناء الحق صدیقی ایم اے ۸ روپیے

۵۳۔ **مسلمانان پنجاب کی تعلیم** ۔ مصنفہ سید مصطفےٰ علی بریلوی بی کام ایل ایل بی ۳۰ روپیے

۵۴۔ **تجزیہ کلام غالب** ۔ مصنفہ سید رفیع الدین بلخی ایڈووکیٹ مقدمہ سید علی الحسنین زیبا ردولوی ایم اے ۱۳ روپیے

۵۵۔ **ادب منزل بمنزل** ۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی مقدمہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی ۱۲ روپیے

۵۶۔ **مکاشفات کشفی** ۔ مصنفہ میر خان بہادر مرزا ابوجعفر کشفی پیش لفظ خان بہادر رضا علی وحشت

تعارف و تبصرہ سید الطاف علی بریلوی و پروفیسر
جمیل مظہری ایم اے ۶ روپیے

۵۷۔ وادیٔ نیل۔ تصنیف محمد قطب الدین
ایم۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)
مقدمہ پروفیسر شمیم اختر (کراچی یونیورسٹی) ۲۴ روپیے

۵۸۔ تاریخی شہ پارے۔ از مرزا علی اظہر
برلاس بی اے بی ایل ۲۰ روپیے

۵۹۔ مسلمانانِ بنگال کی تعلیم از سید مصطفیٰ علی
بریلوی بی کام۔ ایل ایل بی ۲۰ روپیے

۶۰۔ فرحت الناظرین مصنفہ محمد اسلم خلف
محمد حافظ پسروری۔ مترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری
ایم اے ۱۶ روپیے

۶۱۔ ....

....

۶۲۔ مقالاتِ بریلوی از سید الطاف علی
بریلوی بی اے (علیگ) ۲۰ روپیے

۶۳۔ چند محسن چند دوست۔ مقدمہ ڈاکٹر
ممتاز حسن ایم اے ایل ایل ڈی (ستارۂ پاکستان)
تصنیف سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۰ روپے

۶۴۔ حکیم عمر خیام تالیف ابو المکارم سلیم اللہ فہمی
مقدمہ سید الطاف علی بریلوی ۵ روپیے

۶۵۔ صوفیائے بہار اور اردو تصنیف پروفیسر
محمد معین الدین دردائی ایم اے (علیگ) ۱۲ روپیے

۶۶۔ صوفیائے سندھ اور اردو ...... ۳۰ روپے

۶۷۔ مسئلہ علم مسلم مفکرین کی نظر میں از پروفیسر
محمد یعقوب بخش راغب بدایونی ۴ روپیے

۶۸۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں مترجمہ ڈاکٹر
زبید احمد ایم اے پی ایچ ڈی
(انگریزی ترجمہ)
و مرزا عاشق حسین ایم اے ۱۴ روپیے

۶۹۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں از مولانا
غلام محی الدین
(بنگالی ترجمہ)
ایڈیٹر آج، ڈھاکہ ۳ روپیے

۷۰۔ مشاہیر کے تعلیمی نظریے (تالیف مولوی
محمد حسین خاں (انگریزی ترجمہ)
زبیری ایم اے مترجمہ عظیم الدین خاں ایم۔ اے
(علیگ) اخلاص حسن زبیری ایم اے پیش لفظ
سید الطاف علی بریلوی ۱۶ روپیے

۷۱۔ حاصل مطالعہ۔ تصنیف۔ سید الطاف علی
بریلوی۔ مقدمہ۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ایم اے
پی ایچ ڈی۔ ڈی لٹ ۱۶ روپیے

۷۲۔ انشائیے۔ تصنیف فضل احمد صدیقی
ایم اے مقدمہ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی
تعارف سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۱۰ روپیے

۷۳۔ غالب نمبر (العلم) مرتبہ سید الطاف علی
بریلوی .. — .. .. ۲۰ روپیے

۷۴۔ علمائے سلف و نابینا علماء تصنیف۔ نواب صدر یار جنگ مولانا
حبیب الرحمٰن خاں شروانی تعلیقات و حواشی
مفتی انتظام اللہ شہابی و ثناء الحق صدیقی ایم اے تعارف

علامہ سید سلیمان ندوی ۱۸ روپیے

۷۵۔ حیات حافظ رحمت خاں تالیف سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) مقدمہ۔ مولوی نظام الدین حسین نظامی (بدایونی) ۲۰ روپیے

۷۶۔ لائف آف حافظ رحمت خاں (انگریزی ترجمہ) تالیف سید الطاف علی بریلوی، مترجمہ پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے ۳۲ روپیے

۷۷۔ علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) مولفہ مولوی عبدالقادر بریلوی جلد اول و دوم ترجمہ مولوی معین الدین افضل گڑھی۔ ترتیب و حواشی پروفیسر محمد ایوب قادری۔ تعارف نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی ۳۲ روپیے

۷۸۔ مولانا محمد علی جوہر از شاہ الحق صدیقی ایم اے ۸ روپیے

۷۹۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات تعارف سید الطاف علی بریلوی مولفہ مولانا اعجاز الحق قدوسی۔ تعارف۔ ڈاکٹر اینی میری شمیل پروفیسر بون یونیورسٹی (مغربی جرمنی) پیش لفظ جمیل جالبی ایم اے ناشر سید الطاف علی بریلوی ۲۰ روپیے

۸۰۔ عہد اسلامی میں علمی ترقی مصنف ڈاکٹر این این لا مترجمہ اخلاص حسین زبیری ایم اے سلطان فاطمہ ملتی ایم اے ۱۶ روپیے

۸۱۔ تعلیمات حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ مولف۔ الحاج (تلخیص و ترجمہ فوائد سعدیہ) محمد منصلت حسین صابری ایم اے (علیگ) مقدمہ مفتی محمد انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی ۶ روپیے

۸۲۔ ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن۔ از پروفیسر محمد حامی الدین خاں (حصہ دوم) ۱۷۵۱ء / ۱۸۵۴ء ایم اے ۳۲ روپیے

۸۳۔ مقالات بریلوی۔ از سید الطاف علی بریلوی بی اے (علیگ) ۲۰ روپیے

۸۴۔ چوتھی دنیا۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ۸ روپیے

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

کی

لائبریری ۔ ریڈنگ روم اور میوزیم

جس طرح علی گڑھ میں سرسید علیہ الرحمۃ کی ۱۸۸۶ء میں بنا کردہ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا ایک شاندار کتب خانہ تھا۔ اسی طرح اپریل ۱۹۵۱ء میں جب اس ادارہ کا کراچی میں "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے احیا ہوا تو اجرائے سہ ماہی مجلہ "العلم" انعقاد مجالس و مذاکرات علمی و تعلیمی۔ قیام سرسید گرلس کالج اور شعبۂ تصنیف و تالیف کے ماسوا اس کے صدر دفتر بمقام سندھ مدرسہ (اپریل ۱۹۵۱ء تا مئی ۱۹۵۶ء) سعیدہ منزل رضویہ کالونی (جون ۱۹۵۶ء تا دسمبر ۱۹۷۱ء) اور اب ذاتی عمارت واقع بی روڈ ناظم آباد کراچی میں جنوری ۱۹۷۲ء سے "یوسف میموریل لائبریری" کے نام سے ایک فری پبلک لائبریری قائم ہے جس میں سال بسال جملہ علوم و فنون پر کثیر تعداد میں کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا ہے اور ان کی تعداد دس ہزار سے متجاوز ہو گئی ہے۔ بڑی تعداد میں انگریزی، اردو اور دیگر زبانوں کے ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل بھی مہیا کئے جاتے ہیں۔ ہر موسم میں آرام دہ خوبصورت ہال اور نفیس فرنیچر اس پر مستزاد ہے۔ جس کے نتیجہ میں لائبریری کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ دور دور سے طالبان علم اور علمائے تحقیق جوق در جوق مطالعہ کے لئے آتے ہیں۔

اوقات دفتر کانفرنس کے بعد ۴ ½ بجے شام سے ۹ بجے شب تک۔ لائبریری، ریڈنگ روم اور میوزیم کھلا رہتا ہے، جن خواتین و حضرات کو اب تک علم نہ ہو تشریف لاکر استفادہ فرمائیں۔

ع صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

سید الطاف علی بریلوی
سکریٹری

(ایجوکیشنل پریس کراچی)

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

کی

لائبریری۔ ریڈنگ روم اور میوزیم

جس طرح علی گڑھ میں سرسید علیہ الرحمۃ کی ۱۸۸۶ء میں بنا کردہ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا ایک شاندار کتب خانہ تھا اسی طرح اپریل ۱۹۵۱ء میں جب اس ادارہ کا کراچی میں "آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس" کے نام سے احیا ہوا تو اجرائے سہ ماہی مجلہ "العلم" انعقاد مجالس و مذاکرات علمی و تعلیمی۔ قیام سرسید گرلس کالج اور شعبہ تصنیف و تالیف کے ماسوا اس کے صدر دفتر بمقام سندھ مدرسہ (اپریل ۱۹۵۱ء تا مئی ۱۹۵۷ء سعیدہ منزل رضویہ کالونی (جون ۱۹۵۷ء تا دسمبر ۱۹۶۱ء) اور اب ذاتی عمارت واقع بی. روڈ۔ ناظم آباد کراچی، میں جنوری ۱۹۶۲ء سے "یوسف میموریل لائبریری" کے نام سے ایک فری پبلک لائبریری قائم ہے جس میں سال بسال جملہ علوم و فنون پر کثیر تعداد میں کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا ہے اور ان کی تعداد دس ہزار سے متجاوز ہو گئی ہے۔ بڑی تعداد میں انگریزی، اردو اور دیگر زبانوں کے ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل بھی مہیا کئے جاتے ہیں۔ ہر موسم میں آرام دہ خوبصورت ہال اور نفیس فرنیچر اس پر مستزاد ہے جس کے نتیجہ میں لائبریری کی مقبولیت روز افزوں ہے۔ دور دور سے طالبان علم اور علمائے تحقیق جوق در جوق مطالعہ کے لئے آتے ہیں۔

اوقات دفتر کانفرنس کے بعد ۴½ بجے شام سے ۹ بجے شب تک لائبریری ریڈنگ روم اور میوزیم کھلا رہتا ہے، جن خواتین و حضرات کو اب تک علم نہ ہو تشریف لا کر استفادہ فرمائیں۔

ع صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

سید الطاف علی بریلوی
سکریٹری

OFFICE BEARERS

President
Juctice (Qadeeruddin) Ahmad.
Vice-President
Sayyid Hosain Imam.
Ex-President Council of State
General Secretary
Hassanally A Rahman,
Bar-at-Law
Treasurer
Iftikhar Ali Kazi, Advocate
Secretary
Syed Altaf Ali Brelvi, (Alig)

Bureau of Education
Chairman
Prof. A. M. Kureishy
Secretary
Syed Hamid Ali Jafri, M. A

Academy of Educational Research
Chairman
Mirza Ali Azhar Barlas, B.A.,B.L.
Secretary
Prof. Mohd. Hamiduddin Khan, M. A.
Director Academy & Editor "Al-Ilm"
Syed Altaf Ali Brelvi, (Alig)

Institute of Islamic Studies
Secretary
Moulana Syed Abdul Quddus Hashmi Nadvi

Bureau of Military & Physical Education
Chairman
Major General Mohd. Akbar Khan (Retd)

Female Education Section
Chairman
Lady Ghulam Hussain Hidayatullah
Secretary
Begum Syed Abdul Hafiz

Members of the Working Committee
Begum Lt. Col Shahabuddin Ahmed Siddiqi
Mr I. Hosain, Retd. Asstt General Manager, ESSO
Alhaj Pirzada Syed Asghar Ali Shah, Retd. Judge
Nawab Syed Shamsul Hasan
Khawaja Hamiduddin Shahid, M.A.
Alhaj Ghulam Mohd. Swaleh, Retd. Engineer.
Aqil Ahmed Khan, M.A. (Alig). Advocate.
Mirza Mohd Shabbir Qizilbash.
Advocate
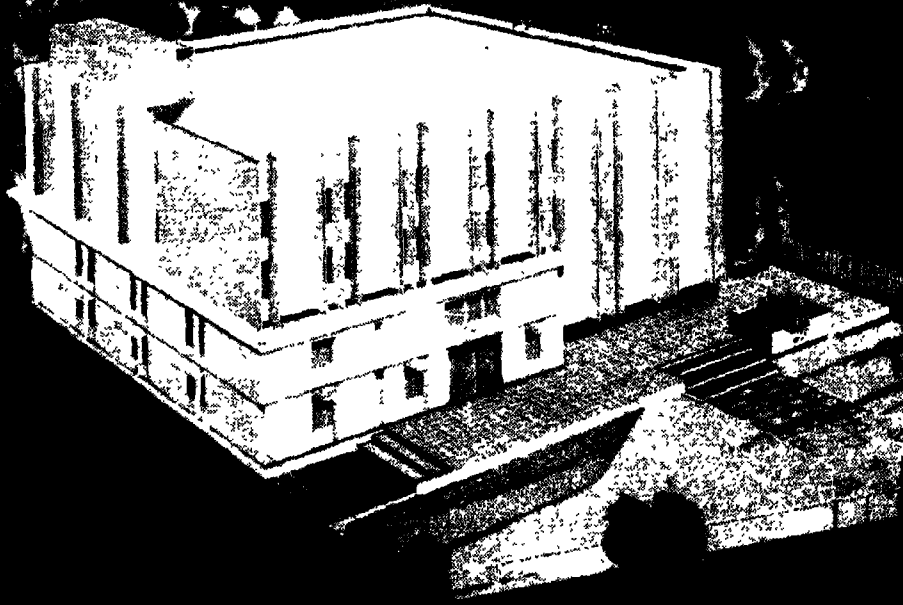
دی پبلک لائبریری صدر دفتر آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی